جواہر عزیزی
اردو ترجمہ
تفسیر عزیزی
تصنیف لطیف:
حضرت شاہ عبد العزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ
مترجم:
صاحبزادہ پیر سید محمد محفوظ الحق شاہ چشتی صابری قادری
نوریہ رضویہ پبلی کیشنز

اُردو ترجمہ

پہلا پارہ، دوسرا پارہ

تَصنیفِ لَطِیف:

حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

مترجم:

[illegible]

صاحبزادہ پیر سید محمد محفوظ الحق شاہ چشتی صابری قادری

نوریہ رضویہ پبلی کیشنز

۱۱۔ داتا گنج بخش روڈ لاہور 042-7313885

نام کتاب	——	تفسیر عزیزی (پہلا پارہ، دوسرا پارہ)
مصنف	——	شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی علیہ الرحمۃ
مترجم	——	صاحبزادہ سید محمد محفوظ الحق شاہ صاحب چشتی صابری قادری
زیر اہتمام	——	صاحبزادہ پیر سید محمد محمود الحق شاہ قادری
کمپوزنگ	——	ورڈز میکر
اشاعت	——	جمادی الاول ۱۴۲۹ھ، جون ۲۰۰۸ء
تابع	——	سید محمد شجاعت رسول شاہ قادری
مطبع	——	اشتیاق اے مشتاق پرنٹرز لاہور
کمپیوٹر کوڈ	——	1N-131

ملنے کے پتے

ضیاء القرآن پبلی کیشنز
انفال سنٹر اُردو بازار کراچی
021-2630411

مکتبہ غوثیہ ہول سیل
پرانی سبزی منڈی کراچی
021-4910584

مکتبۃ المدینہ
فیضانِ مدینہ کراچی
021-4126999

احمد بک کارپوریشن
اقبال روڈ کمیٹی چوک راولپنڈی
051-5558320

اسلامک بک کارپوریشن
اقبال روڈ کمیٹی چوک راولپنڈی
051-5536111

مکتبۃ المدینہ
اندرون بوہڑ گیٹ ملتان

مکتبہ رضویہ
آرام باغ روڈ کراچی
021-2216464

شبیر برادرز
زبیدہ سنٹر 40 اُردو بازار لاہور
042-7246006

مکتبہ بستان العلوم
کذحالہ آزاد کشمیر (براستہ گجرات)
0344-5084292

نوریہ رضویہ پبلی کیشنز داتا گنج بخش روڈ لاہور فون 7313885-7070063
مکتبہ نوریہ رضویہ بغدادی جامع مسجد گلبرگ اے فیصل آباد فون: 2626046

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم
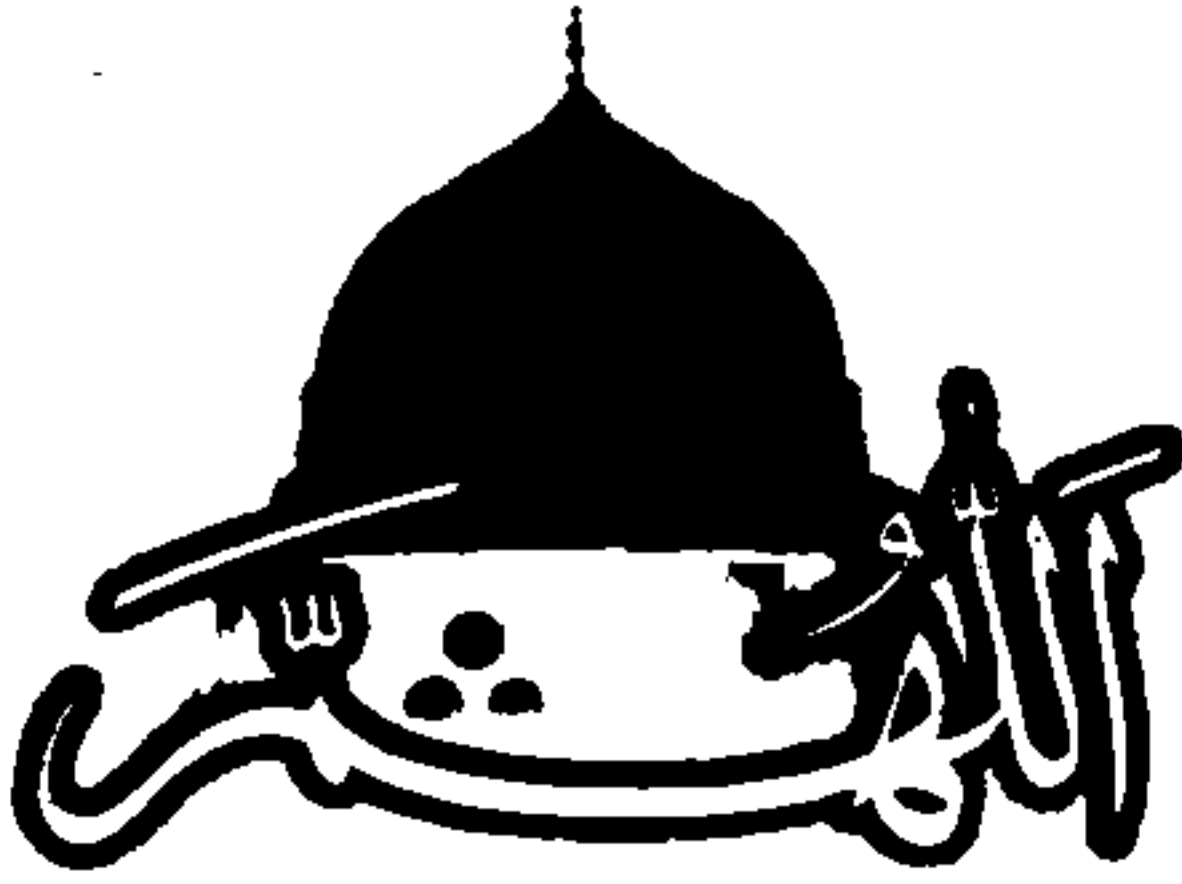
اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰی سَیِّدِنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اٰلِهٖ
وَصَحْبِهٖ وَبَارِكْ وَسَلِّمْ

مَوْلَایَ صَلِّ وَسَلِّمْ دَائِمًا اَبَدًا
عَلٰی حَبِیْبِكَ خَیْرِ الْخَلْقِ كُلِّهِمِ

مُحَمَّدٌ سَیِّدُ الْكَوْنَیْنِ وَالثَّقَلَیْنِ
وَالْفَرِیْقَیْنِ مِنْ عُرْبٍ وَّمِنْ عَجَمِ

فہرست مضامین

چند تحقیق طلب باتیں

کلمہ ویل اور اس کی اُخوات کا بیان

باقی رہ گئیں یہاں چند تحقیق طلب باتیں۔ پہلی بات یہ ہے کہ لغتِ عرب میں وَیْلٌ ایک ایسا کلمہ ہے۔ جو کہ مصیبت زدہ پر بولتے ہیں۔ اور اس کے بُرے انجام پر دلالت کرتا ہے۔ گویا یہ کلمہ کہنے والے کو یوں منظور ہوتا ہے کہ مصیبت زدہ اس مصیبت سے خلاصی نہ پائے۔ اور اس سے زیادہ گرفتار ہو۔ اور ویح اور ویس بھی اسی طرح مصیبت زدہ پر استعمال کرتے ہیں۔ لیکن منظور رحم کھانا اور اس مصیبت زدہ کی اس مصیبت سے خلاصی چاہنا ہوتا ہے۔ اور دیب وَیْلٌ کے ہم معنی ہے اس کا استعمال بھی بدخواہی کے مقام پر ہے۔ ابونعیم کتاب دلائل النبوۃ میں امیر المومنین حضرت مرتضٰی علی کرم اللہ وجہہ سے روایت کرتے ہیں الویح والویل بابان ناما الویح فباب رحمة واما الویل فباب عذاب یعنی ویح اور ویل دو دروازے ہیں۔ ویح رحمت کا اور ویل عذاب کا دروازہ ہے۔ اور ابراہیم عربی نے اپنے فوائد میں اُم المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت کی کہ ایک دن حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میرے ساتھ مصروفِ گفتگو تھے کہ مجھے ویحك فرمایا' میں بہت بے چین اور تنگ دل ہوئی۔ فرمایا اے کھٹل ویحك اور ویسك رحمت ہے اس سے تنگ دل مت ہو۔ لیکن ویل تنگ دل ہو بہر حال یہ کلمہ جو کہ اللہ تعالیٰ کے کلام میں کفار اور فجار کے بعض فرقوں کے حق میں وارد ہوا ہے قیامت کے دن اس وعید کا پورا کرنا مختلف رنگوں میں ظاہر ہوگا۔

محرّفین کتاب اللہ۔ بے دین چودھریوں' بے ایمان سرداروں اور شرابیوں کے عذاب کا بیان

یہود اور کتاب تحریف کرنے والوں کے حق میں عذاب آگ کے ایک پہاڑ کی شکل

میں نمودار ہو کر ان پر گرے گا اور پاش پاش کرے گا جس طرح انہوں نے اللہ تعالیٰ کی کتاب کو اپنی تحریف کے ساتھ پاش پاش کیا اور آپس سے جدا کر دیا۔ اور دوسرے متکبر کافروں کے حق میں ایک غار کی شکل میں نمودار ہوگا۔ اور اس کافر کو تکبر اور بلند پروازی کے عوض اس کی تہہ میں ڈالیں گے۔ اور بے دین چودھریوں کے حق میں جو کہ اپنے فرقہ پر ظلم وستم کرتے تھے' ایک پتھر کی شکل میں ظاہر ہوگا۔ اور انہیں اس پتھر پر چڑھنے اور اُترنے کی سزا دی جائے گی جس کی سوزش شدید ہوگی۔ اور دوسرے فاسقوں خصوصا شراب پینے والوں کے حق میں ایک جاری نہر کی شکل میں ہوگا جس میں دوزخیوں کی بدبودار پیپ جاری ہوگی۔ اور انہیں اِس کے پینے کی سزا دی جائے گی۔

امام احمد اور ترمذی صفت النار کے باب ہیں۔ ابو یعلیٰ' طبرانی' ابن حبان اپنی صحیح میں۔ حاکم مستدرک میں۔ اور بیہقی کتاب البعث میں حضرت ابوسعید الخدری رضی اللہ عنہ وغیرہ کی روایت لائے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ ویل جہنم میں ایک کنوئیں کا نام ہے۔ جس میں کفار کو ڈالیں گے۔ اور چالیس (۴۰) سال تک اس میں چلتے جائیں گے۔ اور رسی اس کی تک نہ پہنچیں گے۔

اور ابن جریر نے امیر المومنین حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے فویل لھم مما کتبت ایدیھم کی تفسیر میں نقل کیا کہ ویل ایک آگ کا پہاڑ ہے۔ اور یہ وہی پہاڑ ہے۔ جو کہ یہود پر گرے گا۔ کیونکہ اُنہوں نے تورات کی تحریف کی ہے۔ اور کلامِ الٰہی میں کمی بیشی کی ہے۔ اور بزار اور ابن مردویہ نے حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ دوزخ میں ایک بہت بڑا آتشیں پتھر ہے' اسے ویل کہتے ہیں۔ بے دین چودھریوں اور بے ایمان قبرداروں کو اس پتھر پر چڑھائیں' اُتاریں گے۔ اور طبرانی اور بیہقی نے کتاب البعث میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے اور ابن ابی حاتم نے نعمان بن بشیر سے روایت کی ہے کہ ویل دوزخ میں بہنے والی ایک ندی کا نام ہے۔ جس میں دوزخیوں کی پیپ جاری ہے۔ اور صحیحین کی حدیث میں وارد ہے کہ جو شراب نوشی میں توبہ کیے بغیر مر جائے' اللہ تعالیٰ کے ذمہ ہے کہ اسے دوزخیوں کے

جسموں کا نچوڑ پلائے۔ اور عبداللہ بن مبارک نے کتاب الزہد میں اور بیہقی نے کتاب البعث میں عطاء بن یسار سے روایت کی ہے کہ ویل دوزخ کی ایک ندی کا نام ہے کہ اگر دنیا کے پہاڑوں کو اس میں پھینکیں اس کی گرمی کی شدت سے پگھل کر پانی بن جائیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ جب اس کلام میں امیین کے عذاب سے محرفین کے عذاب کی زیادتی بیان کرنا منظور ہے۔ تو چاہیے تھا کہ زیادتی کی ساری وجہیں جو کہ تین ذکر کی گئی ہیں' ذکر فرمائی جاتیں' دو وجہوں کے بیان پر کیوں اکتفا فرمایا؟ مِمَّا كَتَبَتْ اَيْدِيْهِمْ وَمِمَّا يَكْسِبُوْنَ اور وَيَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدَ اللّٰهِ کو کیوں گرایا؟ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ کتاب میں کلامِ محرف لکھنا صرف اسی لیے تھا کہ جاہلوں کے پاس کہیں هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ اور اس بدبخت گروہ کا اس منحوس حرکت سے مقصود یہی ناپاک گفتگو تھی۔ اور جو کچھ صرف لکھنے پر کہنے کے بغیر ہی مرتب ہوتا تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ کسی دوسرے کو دھوکہ لگ جائے۔ ان کے خیال میں نہ تھا۔ اور نہ اس کا قصد رکھتے تھے۔ اور نہ ابھی مرتب ہوا تھا۔ اور نہ قطعی طور پر واقع ہونے والا تھا اس بناء پر اس لکھنے اور کہنے کو ایک گناہ اعتبار کیا اور اس کی تعبیر اس کے پہلے جزو کے ساتھ جو کہ لکھنا ہے' اختیار کی گئی کیونکہ انہوں نے جب یہ کہنے کے لیے لکھا تھا گویا کہنے سے فارغ ہو گئے۔ پس اس لکھنے کے ذکر نے کہنے کے ذکر کی حاجت نہ چھوڑی۔

تیسری بات یہ ہے کہ بظاہر یوں معلوم ہوتا تھا کہ وَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا كَسَبُوْا فرمایا جاتا۔ اور اگر اس حال کی قباحت کو ذہن میں حاضر کرنے کی غرض سے ماضی کی حکایت لیے مضارع کو ماضی کی جگہ لائے تو دونوں جگہ یہی مناسب تھا۔ کہنا چاہیے تھا وَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا يَكْتُبُوْنَ بِاَيْدِيْهِمْ وَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا يَكْسِبُوْنَ جیسا کہ آیت کی ابتدا میں اسی طرح فرمایا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ چونکہ ان کی کتابت ایک دفعہ ہوئی اور ختم۔ اور وہ کلام محرف ایک نسخہ میں لکھ کر رکھ دی اس کی تعبیر ماضی کے ساتھ مناسب ہوئی۔ جبکہ ان کی رشوت ستانی ختم نہیں ہوتی تھی بلکہ جب بھی اس مضمون کا طالب ان کے پاس آتا اس محرف نسخے کا پتا دیتے تھے۔ پس اس کی تعبیر مضارع کے صیغے کے ساتھ ضروری ہوئی جو کہ

استمرار تجددی پر دلالت کرتا ہے۔

اور کتابوں کی تحریف کرنے والوں۔ جعل سازوں' بادشاہوں کے فرامین اور احکام میں دھوکہ دینے والوں۔ اور دغاباز مہر لگانے والوں کا یہی معمول ہے کہ ایک دفعہ ان چیزوں کو درست کر کے رکھ دیتے ہیں۔ اور ضرورت کے وقت اس سے دولت اکٹھی کرتے ہیں۔

چوتھی بات یہ ہے کہ آیت کی ابتدا میں فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ يَكْتُبُوْنَ الْكِتَابَ بِاَيْدِيْهِمْ واقع ہے۔ تو اس کے آخر میں اس مضمون کا تکرار کیوں فرمایا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ آیت کے ابتدائی حصہ کا مدلول اس کے آخر کے مدلول سے دو وجہوں سے جدا ہے۔ پہلی وجہ یہ کے آیت کی ابتدا سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ جو لوگ ان صفات سے موصوف ہیں بُرا حال رکھتے ہیں۔ اور یہ معلوم نہیں ہوتا کہ یہ صفات ان کے انجام کی بُرائی میں بھی دخل رکھتی ہیں یا نہیں کیونکہ احتمال ہے کہ ان صفات کا ذکر علامت اور تعریف کے لیے ہو جیسے یا غلام اعط درھما صاحب الثوب الحمر جبکہ آیت کے آخر سے ان صفات کا ان لوگوں کی بدبختی میں دخل معلوم ہوا۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ تعلیق الحکم بالوصف یشعر بعلیته کہ (یعنی حکم کو صفت پر معلق کرنا اس وصف کے اس حکم کی علت ہونے کا پتہ دیتا ہے) کہ قاعدے کے مطابق ان صفات کا دخل آیت کی ابتدا سے بھی سمجھ میں آتا ہے۔ لیکن مجموعی صفات کا ان کی بدبختی میں دخل سمجھا جائے گا۔ جبکہ ہر صفت کا جدا جدا اور دونوں جہتوں سے اُمیوں کے عذاب سے ان کے عذاب کی زیادتی صرف آیت کے آخر سے سمجھی جاسکتی ہے۔ کیونکہ ہر جہت کے مقابل کلمہ ویل لایا گیا ہے۔

مصاحف کی خرید و فروخت کے جواز اور عدم جواز کا بیان

پانچویں بات یہ ہے کہ پرانے ظاہرین' مفسرین میں سے بعض اس آیت کی ظاہری بیان کی وجہ سے جو کہ تحریف وافتراء کا ذکر ہے۔ جبکہ تھوڑی قیمت کا تعین کہ کس جنس سے اور کس چیز پر ہے کاغذ' سیاہی' قلم اور محنت کتابت کے عوض ہے یا مضمون اور اس سے نکالے جانے والے حکم کے عوض۔ آیت میں اس کا ذکر نہیں ہے۔ دلیل لے کر قرآن پاک کی

خرید وفروخت کی حرمت کے قائل ہوئے ہیں۔ عبدالرزاق اور ابن ابی داؤد نے مصاحف میں ابراہیم نخعی سے انہوں نے امام اعمش سے روایت کی ہے کہ وہ کہتے تھے کہ اُجرت کے ساتھ مصاحف لکھنا مکروہ ہے۔ اور استدلال کے لیے یہ آیت پڑھتے تھے فویل للذین یکتبون الکتاب بایدیھم الخ نیز ابوالضحیٰ سے روایت ہے کہ اس نے کہا کہ میں نے کوفے کے تین جلیل القدر علماء سے مصحف خریدنے کے متعلق پوچھا' عبداللہ بن یزید خطمی' مسروق بن الاجدع اور شریح سے۔ تینوں نے کہا کہ کتاب پر قیمت نہ لے۔ اور ابن ابی الدنیا نے قتادہ عن زرارہ بن اوفی عن لطرف کے طریق سے روایت کی کہ تستر شہر کی فتح کے وقت حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کے ہمراہ حاضر ہوا اس مالِ غنیمت میں میں نے کتان (ایک قسم کا باریک کپڑا جس کے متعلق بعض کا خیال ہے کہ چاند کے سامنے آنے سے پھٹ جاتا ہے) کے دو دوپٹے پائے۔ اور ایک چھوٹا صندوقچہ جس میں کتاب اللہ کی جنس سے ایک کتاب تھی' تورات یا زبور یا انجیل۔ اور ہمارے لشکر میں قوم نصاریٰ کا ایک مزدور تھا اس نے کہا کہ یہ صندوقچہ میرے ہاتھ بیچ دو کہ اس کتاب کا قدردان اور اسے سمجھنے والا میں ہوں۔ اور اسے نعیم کہتے تھے۔ پس مسلمانوں نے مکروہ جانا کہ اس کے ہاتھ کتاب اللہ کو بیچیں' وہ صندوقچہ میں نے اس کے ہاتھ دو درم میں فروخت کر دیا۔ اور کتاب مذکورہ اسے ہبہ کر دی۔ قتادہ جو کہ اس واقعہ کے راوی ہیں' کہتے تھے کہ یہیں سے مصاحف بیچنے کی کراہت ثابت ہوئی کیونکہ حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ اور ان کے دوستوں نے اس کتابِ الٰہی کو فروخت کرنا جائز قرار نہیں دیا۔ نیز ابن ابی داؤد نے سعید بن المسیّب اور حسن بصری رضی اللہ عنہما سے روایت کی کہ دونوں بزرگ مصحف کی فروخت کو مکروہ جانتے تھے۔ اور حضرت حماد بن ابی سلمان جو کہ حضرت امام اعظم رضی اللہ عنہ کے اُستاد محترم ہیں' سے روایت لائے کہ کسی شخص نے ان سے پوچھا کہ مصحف کو بیچنے کے بارے میں آپ کیا فرماتے ہیں؟ آپ نے فرمایا کہ ابراہم نخعی مصحف کی خرید وفروخت کو مکروہ سمجھتے تھے۔ اور سالم کی روایت سے لائے کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما جب بازار سے گزرتے اور دیکھتے کہ کوئی مصحف بیچ رہا ہے۔ تو فرماتے کہ یہ تجارت بُری تجارت ہے۔ اور سعید بن جبیر

کی روایت کے ساتھ لائے کہ ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے تھے اے کاش میری زندگی میں ایسا حاکم پیدا ہو جو مصاحف فروخت کرنے پر لوگوں کے ہاتھ کاٹنے کا حکم دے۔ اور اس سودے کی کراہت حضرت امیر المومنین عمر اور عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما سے بھی روایت کی گئی۔ ابن ابی داؤد کی کتاب میں جو کہ کتاب المصاحف کے نام سے معروف تھی۔ اور عبداللہ بن شفیق عقیلی سے عبدالرزاق اور ابن ابی داؤد ایک روایت لائے ہیں کہ کان اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یشددن فی بیع المصاحف ویرونہ عظیماً یعنی رسول کریم علیہ السلام کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم مصاحف کی فروخت میں سختی کرتے تھے۔ اور اسے بہت بڑا گناہ جانتے تھے۔ حضرت امام زین العابدین رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے زمانہ میں مصاحف کی فروخت کا رواج نہ تھا۔ عادت یوں تھی کہ جسے مصحف لکھنا منظور ہوتا' خالی اوراق اور قلم دوات لے کر منبر شریف کے پاس آ کر بیٹھ جاتا جو مسلمان بھی آتا اس سے لکھنے کی درخواست کرتا اور جو لکھنا جانتا تھا' ایک ورق لکھ کر دے دیتا پھر دوسرا لکھتا اور اسی طریقے سے چند دنوں میں مصحف پورا ہو جاتا تھا۔ اور عطاء اور دوسرے تابعین سے بھی یہی مضمون مروی ہے۔

مختصر یہ کہ اس قدر درست ہے کہ مصحف کو لکھ کر بیچنا یا ان کے لکھنے پر اُجرت لینا خلفائے راشدین کے چاروں زمانوں میں معمول نہ تھا' اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے لکھتے تھے۔ یہ بدعت سب سے پہلے حضرت معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہما کے آخری دور میں رائج ہوئی جیسا کہ ابوعبیدہ وغیرہ نے ابو مجز تابعی جو کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے شاگرد ہیں' سے روایت کی ہے۔ لیکن یہ بدعت حسنہ ہے' بدعت سیئہ نہیں ہے۔

(اقول وباللہ التوفیق) ان لوگوں کے لیے تازیانہ عبرت ہے۔ جو کہ معمولات اہلِ سنت از قبیل میلاد شریف' گیارہویں شریف' عرس شریف' وجوہ ایصالِ ثواب از قبیل فاتحہ سوم' ہفتم' چہلم' صلوٰۃ وسلام عند الاذان وغیرہا من المبرات والمستحسنات کو صرف اس لیے بدعت اور ناجائز کہتے ہوئے کوئی شرم محسوس نہیں کرتے کہ اس وضع خصوصی کے ساتھ حضور علیہ السلام کے زمانہ میں نہ تھیں۔ اگر یہ ناجائز ہونے کی دلیل ہے۔ تو حضرت مفسر

علام قدس سرہ العزیز کی صراحت کے مطابق اُجرت پر قرآن پاک کی طباعت' کتابت اور خرید وفروخت بھی معاذ اللہ حرام قرار پائے گی۔ بلکہ مخالفین معمولات اہلِ سنت کے خلاف جو فتویٰ بھی لگاتے ہیں صرف اس بناء پر کہ یہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ میں اور خلفائے راشدین کے دور میں نہ تھے تو ذرا وہی فتویٰ اور وہی زبان قرآن پاک سے متعلق مذکورہ معمولات میں استعمال کریں۔ نیز جو لوگ سیاق وسباق کا لحاظ کیے بغیر کل بدعة ضلالة کا مفید مطلب معنی کر کے کہتے ہیں کہ ہر بدعت گمراہی ہے' وہ بھی حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ان الفاظ پر غور کریں جن میں آپ نے بدعت کو حسنہ اور سیئہ پر منقسم فرمایا ہے۔ (محمد محفوظ الحق غفرلہ ولوالدیہ)

مصحف کی خرید وفروخت کا جواز

پہلی مرتبہ اس دور کے علماء نے اس کا انکار فرمایا تھا۔ اور اس آیت سے دلیل لی جب دوسرے علماء نے غور کیا تو اس میں حرمت کی کوئی وجہ نہ پائی اور اس کے جواز پر اجماع ثابت ہو گیا۔ اور اس آیت سے اس کی حرمت ثابت نہیں ہوئی کیونکہ اگر لِيَشْتَرُوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا سے کتابت کی اُجرت یا کاغذ اور سیاہی کی قیمت لینا مراد ہوتا تو لفظ ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ محض ضائع اور بے معنی ہوتا۔ اور اسی لیے حضرت عبداللہ بن عباس اور محمد بن حنیفہ رضی اللہ عنہما نے اس کی اباحت کا فتویٰ دیا۔ ابن ابی الدنیا نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی کہ آپ سے یہ مسئلہ پوچھا گیا' آپ نے فرمایا لاباس انما یاخذون اجورا ایدیھم یعنی کوئی حرج نہیں' وہ تو اپنے ہاتھوں کی مزدوری لیتے ہیں۔ اور محمد بن حنیفہ رضی اللہ عنہ سے روایت لائے کہ آپ نے فرمایا لاباس انما بیع الورق وعمل یدیہ کوئی ڈر نہیں یہ تو صرف ورق اور اس کے ہاتھوں کا سودا ہے۔ اور حضرت امام جعفر الصادق رضی اللہ عنہما سے روایت کی کہ آپ نے امام محمد الباقر رضی اللہ عنہ سے روایت کی کہ لاباس بشراء المصحف وان لعطی الاجر علی کتابتھا یعنی مصحف بیچنے کا کوئی حرج نہیں۔ اور اس میں کہ اس کی کتابت پر اُجرت دی جائے۔ اور حسن بصری رضی اللہ عنہ اور مطرف سے بھی اس مذہب سے صحیح روایت کے ساتھ رجوع روایت کیا گیا ہے۔

جیسا کہ کتاب المصاحف میں موجود ہے۔

اور عجیب تر یہ ہے کہ حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما اور بعض دوسرے فقہاء سے مروی ہوا کہ مصاحف کو خریدنا جائز قرار دیتے تھے۔ اور اس کی فروخت کو حرام یا مکروہ جانتے تھے اس جہت سے کہ اس آیت میں لفظ اشتری بمعنی بیع ہے ثمنا قلیلًا کی دلیل سے لیکن جس چیز کی فروخت مطلق احرام ہوگی اسے خریدنا بھی جائز نہیں ہے۔ کیونکہ خریدنا فروخت کرنے کا باعث ہوتا ہے۔

مختصر یہ کہ اس معاملہ کی خرید وفروخت کی کراہت کا قول پہلی مرتبہ غور کیے بغیر سلف صالح میں رائج ہوگیا تھا۔ اور آخر یہ مسئلہ اعتبار کے درجہ سے گر گیا اور اس کے صحیح ہونے پر اجماع منعقد ہوگیا۔ حاصلِ کلام یہ کہ جب فرقہ بنی اسرائیل کے علماء کا حال اس قدر خراب ہے کہ دینوی اغراض کے لیے کھلے بندوں کتاب کی تحریف کرتے ہیں۔ اور ان کے عام لوگوں کا حال ان کی تقلید میں اس حد تک پہنچ چکا۔ تو ان سے ایمان لانے کی طمع فضول ہے۔
اور حال یہ کہ سب کے سب خواہ علماء ہوں' خواہ عوام جرائم کے ارتکاب' تحریف کتاب اور اپنے پیشواؤں کی تقلید میں باوجود یہ کہ ان کے اقوال قطعی دلائل کے خلاف ہیں۔ بہت جرأت اور بے باکی کرتے ہیں' کہتے ہیں کہ اگرچہ ہلاکت کی وجوہ اور عذاب کے اسباب ہر طرف سے کثرت کے ساتھ ہم پر ہجوم کیے ہوئے ہیں۔ لیکن ہمیں کوئی ڈر نہیں ہے۔ کیونکہ ہمیں عذاب نہیں ہوگا مگر تھوڑی سی مدت۔

یہودیوں کے اقوال کا بیان

وَقَالُوْا اور ان سب نے کہا۔ علماء نے بہتان باندھ کر اور جاہلوں نے تقلید کر کے کہ لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ ہمیں دوزخ کی آگ ہرگز نہیں پہنچے گی۔ اگرچہ ہم کفر کی کئی قسموں کا ارتکاب کریں۔ اور محرمات کو حلال اور فرائض کا انکار کریں اِلَّآ اَیَّامًا مَّعْدُوْدَةً مگر چند گنے ہوئے دن۔ اور ان دنوں کے تعین میں انہوں نے ایک دوسرے کے ساتھ اختلاف کیا ہے۔ بعض نے کہا کہ سات روز کیونکہ نوع انسان کی خلقت کی مدت سات ہزار سال ہے۔
اور کلامِ الٰہی میں آیا کہ وَاِنَّ یَوْمًا عِنْدَ رَبِّكَ كَاَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ پس ایک ہزار

سال کے بجائے ایک دن عذاب کا ہوگا۔ اور بعض نے کہا ہے کہ چالیس (۴۰) دن کیونکہ ہمارے اسلاف اتنی ہی مدت جو کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا وقت مقرر تھا' نبی علیہ السلام کے انوار و برکات سے محروم ہو کر بچھڑا پوجنے میں گرفتار ہوئے تھے۔ اور وہ گناہ کفر کی قسموں میں سب سے زیادہ شدید گناہ تھا۔ جب چالیس (۴۰) دن کی مدت میں اس کا اثر زائل ہو گیا تو دوسرے گناہوں اور کفر کی قسموں کا اس مدت میں کیونکر اثر زائل نہ ہوگا۔ اور بعض نے کہا کہ چالیس (۴۰) سال کیونکہ میدانِ تیہ میں ہماری سرگردانی کی مدت اسی قدر تھی۔ اور نیز انبیاء علیہم السلام کے صحائف میں ہم نے سنا ہے کہ جہنم کی دو طرفوں کے درمیان چالیس (۴۰) سال کا فاصلہ ہے۔ اور جب قیامت کے دن ہمیں آگ میں ڈالیں گے تو ہم اپنے آباؤ اجداد کی سفارش کے زور پر اس کنارے سے اس کنارے تک گزر جائیں گے۔ اور اس مدت میں وہ فاصلہ طے کرلیں گے اگر اس کا کوئی جلانے والا عذاب ہمیں پہنچے گا اس مدت سے آگے نہ بڑھے گا۔

اور بعض کہتے تھے کہ ہر کسی کو بالغ ہونے کا وقت نکال کر اس کی عمر کے برابر عذاب ہو گا۔ کیونکہ دنیا میں نافرمانی کی مدت اسی قدر رہی ہے۔ اور عذاب اس سے زیادہ بڑھانا اللہ تعالیٰ کے عدل کے تقاضے کے خلاف ہے۔ اور ان میں سے بعض یونان کے فلسفیوں سے سیکھ کر کہتے تھے کہ اگرچہ روحیں بدنی تعلقات کی وجہ سے بُرے اعمال کے ساتھ غبار آلود ہو جاتی ہیں۔ لیکن اصل میں طہارت وقدس کی دنیا سے ہیں۔ اور جب ان بدنوں سے جدا ہوں گی تو بُرے اعمال کے نتائج کو اپنے اندر پائیں گی اور تکلیف اُٹھائیں گی۔ یہاں تک کہ ان عارضی تعلقات کے نشان مٹ جائیں گے۔ اور پھر عذاب سے نجات پائیں گی۔ اور اپنی اصلی حالت کی طرف لوٹ آئیں گی۔ جیسے کہ پانی طبعی طور پر ٹھنڈا ہے۔ اگر اس کے نیچے آگ جلائیں تو گرم ہو جاتا ہے۔ اور جب چولہے سے اُتار لیں تو اس آگ کا اثر ایک وقت تک جاری رہتا ہے۔ اور اس مدت کے بعد پانی کی اصلی طبیعت غلبہ کرتی ہے۔ اور ٹھنڈک میں ڈھال دیتی ہے۔ جو کہ اس کا اصلی تقاضا ہے۔ اور یہ سب ان کے فاسد خیالات ہیں۔ صحیح وجدان نہیں رکھتے کہ ارواح کس طرح مذمومِ اخلاق بھیمیہ اور سبعیہ سے مکدر

ہوتی ہیں اور استعداد کا آئینہ کس طرح زنگ پکڑتا ہے۔ کہ کبھی اصلاح پذیر نہیں ہوتا۔ اور کفر کس قدر زہریلا ہے۔ جو کہ طبیعت کو تصرف اور اپنی اصلی حالت پر آنے سے معطل کر دیتا ہے۔

ایک جواب طلب سوال

یہاں ایک جواب طلب سوال باقی رہ گیا اور وہ یہ ہے کہ غیر ذوی العقول کی جمع کی صفت میں واحد مؤنث اور جمع مؤنث دونوں کا صیغہ لانا صحیح ہے۔ پس کہا جا سکتا ہے کہ اَیَّامًا مَّعْدُوْدَةً اور اَیَّامًا مَّعْدُوْدَاتٍ تو اس سورت میں پہلا صیغہ کیوں ارشاد ہوا جبکہ صورت آلِ عمران میں دوسرا صیغہ' دونوں سورتوں میں یکساں کیوں نہ فرمایا یا برعکس کیوں نہ کیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اگر چہ دونوں صیغوں کا مدلول ایک ہے۔ لیکن پہلے کی صورت مفرد کی صورت ہے۔ اس لیے وحدت پر دلالت کرتا ہے۔ اور دوسرے کی صورت جمع کی صورت ہے پس کثرت پر دلالت کرتا ہے۔ یہاں اس سورت میں یہ ذکر ہے کہ ان سے ایمان کی طمع نہ رکھو کیونکہ وہ اس قسم کا فاسد عقیدہ رکھتے ہیں۔ کیونکہ وَقَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ معطوف ہے وَقَدْ كَانَ فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ پر اور اس غرض میں مدتِ عذاب کی قلت کا بیان صورت اور معنی کے اعتبار سے زیادہ مناسب ہے۔ جبکہ سورت آلِ عمران میں ذکر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی آیات کے ساتھ کفر کرتے ہیں۔ اور انبیاء علیہ الاسلام اور واعظوں کو ناحق قتل کرتے ہیں۔ پھر ان میں سے ایک گروہ اللہ تعالیٰ کے اس حکم سے جو ان کی کتاب میں آیا ہے روگردانی کرتے ہیں۔ اور یہ سب اس جرأت کی وجہ سے ہے۔ جو کہ اس فاسد عقیدہ کی وجہ سے انہیں حاصل ہوئی ہے۔ اور چونکہ وہاں بہت سے ایسے افعال شمار کیے گئے جو کہ عذابِ شدید کا باعث ہو سکتے ہیں تا کہ مدتِ عذاب میں بھی لفظی اور صوری کثرت کو ملاحظہ کریں اگر چہ معنوی طور پر قلت ہو۔ کیونکہ کثیر افعال جزا کی کثرت کی لازم کرتے ہیں۔ اگر معنی کے اعتبار سے نہ ہو' صورت کے اعتبار سے خود رعایت کرنی چاہیے۔ نیز اس آیت کے بیان میں وہاں لفظ اذا جمعناھم واقع ہوا۔ پس جمع کا صیغہ وارد کرنا اس کے مناسب ہوا۔ حاصلِ کلام یہ کے پیغمبر وقت کو فرمایا ہے کہ اگر اس قسم کے بوگس عقیدے کو آپ کے سامنے پیش کریں۔ اور ایمان اور عمل صالح سے اپنی لاپرواہی بیان کریں تو جواب میں قُل کہہ دیجئے

کہ آخرت مدت عذاب کے قلیل ہونے کا تعین اس قبیلے سے نہیں کہ عقل خود بخود اس تک راہ پائے۔ پس تم جو یہ یقین رکھتے ہو دلیل سمعی سے حاصل کیا ہوگا۔ اَتَّخَذۡتُمۡ عِنۡدَ اللّٰهِ عَهۡدًا کیا تم نے اللہ تعالیٰ کے ہاں کوئی عہد باندھا ہے۔ کہ تمہیں تمہارے کفر اور گناہوں پر چند روز سے زیادہ عذاب نہیں فرمائے گا۔ تو اس عہد کا نشان دو کہ کس کتاب میں ہے۔ تا کہ ہم دیکھیں اور اقرار کریں۔ اور اگر چہ اللہ تعالیٰ کے بارے میں جو کہ خبر کا سچا ہے' عہد لینے کی ضرورت نہیں اس کا صرف خبر دینا ہی یقین کے لیے کافی ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کی خبر پختہ عہد کا حکم رکھتی ہے پس اگر خبر بھی ہے۔ تو عہد کے حکم میں ہے۔

فَلَنۡ يُّخۡلِفَ اللّٰهُ عَهۡدَهٗ پس اللہ تعالیٰ اپنے اس عہد حکمی کا خلاف ہرگز نہیں فرمائے گا۔ کیونکہ اس کا ازلی کلام ہے۔ اور کلام میں جھوٹ بہت بڑا نقصان ہے۔ جو کہ اس کی صفات میں ہرگز راہ نہیں پا سکتا۔

اور وہ جو بعض ظاہر بینوں نے کہا ہے کہ اچھے وعدے کے خلاف کرنا نقصان ہے۔ اور بُرے وعدے کے خلاف کرنا کرم و لطف ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کے بارے میں غائب کو حاضر پر قیاس کرنا ہے۔ کیونکہ اس کے لطف و کرم کی بہت سی راہیں ہیں۔ اور یہ جائز ہے لطف و کرم کا معاملہ فرمائے اور وعید کا خلاف بھی ہو۔ بخلاف آدمیوں کے کہ عجز بشری کی وجہ سے وعید کے خلاف کیے بغیر ان سے لطف و کرم ممکن نہیں۔ پس ان کے بارے میں وعید کی مخالفت ایک نقصان کو دوسرے نقصان پر ترجیح کے ساتھ ہے۔ جو کہ پہلے نقصان سے زیادہ شدید ہے۔ جبکہ اللہ تعالیٰ کے حق میں تکمیل کی احتیاج کے بغیر نقصان محض ہے۔ پس دونوں جدا جدا ہو گئے۔ اور اگر کوئی نص اس مدت کو کم کرنے کا پتہ نہیں دیتی تو معلوم ہوا کہ بے دلیل بات کرتے ہیں۔ اور بے دلیل بات تو کسی کے بارے میں نہیں کرنی چاہیے چہ جائیکہ اللہ تعالیٰ کا تعلق ہو۔

اَمۡ تَقُوۡلُوۡنَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعۡلَمُوۡنَ آیا تم اللہ تعالیٰ کے بارے میں وہ بات کہتے ہو جو جانتے نہیں ہو کہ سچی ہے یا جھوٹی۔ کیونکہ اس دعوے میں تمہارے دلیل پکڑنے کی انتہا ایک حدیث ہے۔ جو کہ حضرت یعقوب علیہ السلام سے تمہاری اخبار میں روایت ہوئی اس کا

مضمون یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے حضرت یعقوب کے ساتھ یہ عہد باندھا ہے کہ ان کے بیٹوں کو عذاب نہیں کرے گا مگر قسم اُتارنے کے لیے۔ اور اوّل تو یہ حدیث صحیح نہیں کہ حضرت یعقوب نے فرمائی ہو اس کی سند معتبر نہیں۔ دوسرے تم نے یہ کہاں سے جانا کہ یعقوب کے بیٹوں سے مراد بنی اسرائیل کا سارہ گروہ ہو۔ بلکہ ظاہر یہ کہ ان کے صلبی یعنی حقیقی بیٹے مراد ہیں۔ کیونکہ لفظ پسراں بولنے سے یہی معنی معروف ہے۔ تیسرے یہ کہ ان کے بیٹوں کو عذاب نہ کرنے کی بھی ایک شرعی وجہ ہے۔ کیونکہ ان کے بیٹے ان گناہوں پر صحیح توبہ اور قوی ندامت رکھتے تھے۔ جن کے وہ حضرت یعقوب اور حضرت یوسف علیہ السلام کے بارے میں مرتکب ہوئے تھے۔ جیسا کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے واقعہ میں ان کا ذکر ہے کہ انہوں نے حضرت یعقوب علیہ السلام کی خدمت میں اپنے گناہ کا اقرار کیا اور آپ سے بخشش کی دعا کے طالب ہوئے۔ اور حضرت یوسف علیہ السلام کی بارگاہ میں بھی خطا کا اقرار کیا اور حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنا حق انہیں معاف کر دیا۔ اور حضرت یعقوب علیہ السلام نے بھی ان کے لئے استغفار کیا۔ پس اللہ تعالیٰ کا حق اور بندے کا حق دونوں ان کے ذمہ سے گر گئے اگر تم بھی اسی قسم کی خالص توبہ کرو اور حق تلفیوں سے ندامت کرو۔ اور اپنے وقت کے رُسل علیہم السلام سے اپنے حق میں معافی کی دعا کراؤ تو تم بھی اس خوش خبری کے ضرور مستحق بن جاؤ گے۔ جب تک کہ تم یہ کام بجا نہیں لاتے' تمہارا معاملہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ اصل قاعدہ کے مطابق ہے۔ جیسا کہ فرماتا ہے: بَلٰی اس طرح نہیں کہ تمہیں تمہارے کفر اور نافرمانی پر عذابِ ابدی نہ ہوگا۔ کیونکہ کوئی کفر بخشش کے قابل نہیں۔ اور شریعت کا طے شدہ قاعدہ ہے۔ مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً جس نے کوئی گناہ کیا اگر چہ وہ گناہ صغیر ہو۔ اور کتاب کی تحریف اور رشوت ستانی سے کم تر ہو۔ اور لفظ سَيِّئَةً اصل میں سیوءۃ تھا' ساد یسوء سے جو کہ وادی ہے' یائی نہیں۔ واؤ کو یا لیا اور یا کو یا میں ادغام کیا سَيِّئَةً ہوا وَاَحَاطَتْ بِهٖ خَطِيْٓئَتُهٗ اور اس کا احاطہ کر لیا اس کے گناہ نے۔ اور احاطہ کی حد یہ ہے کہ پہلے وہ گناہ اعضاء سے دل تک پہنچتا ہے۔ اور وہ اس سے بہت لذت حاصل کرتا ہے۔ اس کے بعد اس گناہ کی اچھائی دل میں گھر کر لیتی ہے۔ اور اس کی قباحت کا انکار دل میں بیٹھ جاتا ہے۔

پس کفر ہوا۔ اور اس حد کے بغیر احاطہ متحقق نہیں ہوتا کیونکہ احاطہ کا معنی یہ ہے کہ انسان کو ہر طرف سے چھپا لے اور انسان اس سے چھٹکارا نہ پائے۔ اور گناہ نے جب تک کہ وہ اسے دل سے اچھا اور جائز نہ جانے' دل کو قبضہ میں نہیں کیا ہے۔ اور نیکیوں کو برباد نہیں کیا۔ اور اس سے توبہ وندامت کے ذریعے چھٹکارا پانا ممکن ہے۔ اور جسے گناہ نے گھیر لیا' کافر ہو گیا۔

فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ پس وہ لوگ دوزخ والے ہیں کہ اس سے کبھی جدا نہیں ہوتے۔ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ وہ اس دوزخ میں ہمیشہ رہنے والے ہیں۔ اس مدت تک جس کی انتہا نہیں چہ جائیکہ چند گنتی کے دن ہوں۔ کیونکہ جب تک کہ وہ گناہ کرتے تھے۔ اور دلی طور پر اس سے بیزار تھے۔ اور اس پر نادم تھے' ان کا دل گناہ گار نہ تھا۔ تو گناہ نے انہیں گھیرا نہیں تھا۔ اور نہ ہی ان کی نیکیاں برباد اور مستور تھیں۔ توقع یہ تھی کہ عذاب چکھنے کے بعد چھٹکارا پالیں گے۔ اب چھٹکارے کی کوئی صورت باقی نہ رہی اور ان کا عذاب ہمیشہ اور دائمی کیوں نہ ہو حالانکہ وہ مومنین صالحین کی مقابل سمت میں پڑے ہیں۔

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اور وہ جو ایمان لائے۔ اور انہوں نے شائستہ عمل کیے۔ پس ان کے دل بھی گناہ سے پاک ہیں۔ اور ان کے جسم بھی عمل صالح سے منور ہیں۔ لازماً اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ وہ لوگ جنت والے ہیں جو کہ پاک اور طاہر مقام ہے۔ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ وہ اس بہشت میں ہمیشہ رہیں گے۔ تو جس طرح اس فریق کی جزا دائمی ہے نہ ختم ہونے والی۔ دوسرے فریق کی جزا جو کہ دونوں امور یعنی ایمان اور عمل صالح میں ان کے مخالف واقع ہیں' بھی دائمی ہوگی۔ ورنہ باہمی مقابلہ اُٹھ جائے گا۔ ہاں جو لوگ ایمان رکھتے ہیں۔ اور عمل صالح نہیں رکھتے' ان کی جزا دونوں فریقوں کی جزا سے مرکب ہے۔ لیکن اس طرح کہ پہلے انہیں عذاب دیں گے پھر ثواب کی جگہ منتقل کر دیئے جائیں گے۔ اگر اس کے برعکس ہوتا تو خلاف حکمت ہوتا کیونکہ جسے نوازا جائے اسے گرانا نہیں چاہیے۔ اور جو عمل صالح رکھتا ہے۔ لیکن ایمان نہیں رکھتا' بظاہر احتمال ہے۔ لیکن فی الحقیقت محال ہے۔ کیونکہ عمل صالح کا عمل صالح ہونا ایمان کے ساتھ مشروط ہے۔ اور جب شرط نہیں تو مشروط نہیں۔ اور اسی لیے کفار کے صدقات اور خیرات کو عمل صالح نہیں کیا

جا سکتا۔ اگرچہ صورت میں عمل صالح کے ساتھ مشابہت ہے۔ جیسے لکڑی کے گھوڑے اور قالین کے شیر کی صورت۔ اور اسی لیے ان کے اعمال کے بارے میں فرمایا: **اعمالھم کسراب بقیعة یحسبه الضمآن ماء** (النور آیت ۳۹)

حاصلِ کلام یہ کہ جہان کا نظام پورا نہیں ہوتا مگر ثواب دائمی اور عذاب دائمی کے وعدے کے ساتھ۔ اور اس کا تقاضا ہے کہ اسے پورا کیا جائے اگر اس کے خلاف کا بھی احتمال ہو تو کوئی موجبات ثواب کی طرف متوجہ نہ ہو۔ اور اسباب عذاب سے نہ ڈرے۔

اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے عہد کی تفسیر میں منقول ہے کہ آپ نے فرمایا ہے کہ اس سے مراد کلمہ طیبہ ہے۔ یعنی اگر تم نے یہ کلمہ کفر اور شرک کے بغیر کہا ہے۔ اور دل و جان سے قبول کیا ہے۔ پس اگر عذاب ختم ہو جانے کے امیدوار ہو تو بجا ہے۔ کیونکہ جو شخص اس کلمہ کو بغیر کفر اور بغیر شرک کے دل و جان کے ساتھ پڑھے' عذابِ ابدی سے چھٹکارا پا لیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے عہد کے مطابق ورنہ وہ خدا تعالیٰ پر جھوٹ باندھتا ہے۔

بنی اسرائیل کے عقیدہ میں غلطی کا منشا

یہاں جاننا چاہیے کہ فرقہ بنی اسرائیل کی اس فاسد عقیدہ میں غلطی اور تحریف کا منشا یہ تھا کہ ہر شریعت میں گناہوں کے دو درجے رکھے گئے ہیں۔ ایک درجہ یہ ہے کہ عقیدہ میں ملت حقہ کے مطابق ہو۔ اور عمل میں مخالفت کرے۔ مثلاً یقین کے ساتھ جانتا ہے کہ شراب پینا' زنا' چوری' لواطت اور غیر کا مال غصب کرنا حرام ہے۔ اور اس پر عذاب کا خوف رکھے لیکن طبعی یا رسمی حجاب کے غلبے کی وجہ سے اس سے یہ چیزیں صادر ہوتی ہیں۔ اور اس درجے کو فسق' فجور اور عصیاں کہتے ہیں۔ اور اس کے لئے آخرت میں منقطع عذاب کا وعدہ کیا گیا۔ کیونکہ صحیح عقیدہ سے اس کی مطابقت ضائع نہیں جائے گی کار آمد ہو گی۔ اور عذاب سے نجات بخشے گی۔ اور دوسرا درجہ یہ ہے کہ عقیدہ میں بھی مخالفت کرے۔ اور جو چیز حقیقت میں ثابت ہے' خواہ الٰہیات سے ہو' خواہ آخرت سے۔ خواہ شعائر اللہ سے جیسے اللہ تعالیٰ کی کتابیں اور اس بارگاہِ عالی کے رُسل علیہم السلام اور خواہ اس دین کے متواتر و مشہور احکام ہوں۔ کا انکار کرے۔ اور دیدہ دانستہ نہ مانے اور اس مرتبے کو کفر' زندہ اور الحاد کہتے ہیں۔

اور اس پر آخرت میں دائمی عذاب کا وعدہ فرمایا ہے۔ اور ان دو مسئلوں کو مسلمانوں کی اصطلاح میں اس عبارت کے ساتھ تعبیر کرتے ہیں۔ الفاسق لایخلد فی النار والکافر مخلد فی النار۔ فاسق آگ میں ہمیشہ نہیں رہے گا۔ جبکہ کافر ہمیشہ آگ میں رکھا جائے گا۔ اور ملت حقہ کی موافقت اور اس کی مخالفت کے بیان میں غالباً اس فرقہ کا نام جو کہ اس ملت حقہ پر قائم رہے ہیں۔ اور اس کے مخالفین کا نام لیا گیا ہے۔ پس بنی اسرائیل کے زمانے میں جبکہ ملت حقہ ملت یہودیہ تھی۔ اور اس ملت پر قائم رہنے والے فرقہ بنی اسرائیل کی اس مسئلے میں تعبیریوں کی گئی ہوگی کہ بنی اسرائیل کو عذاب دائمی نہ ہوگا۔ اور غیر بنی اسرائیل کو دائمی عذاب ہوگا۔ ان لوگوں نے کند ذہنی اور کم فہمی کی وجہ سے عنوان اور اس عنوان سے موصوف لوگوں میں فرق نہ کر کے اپنے فرقہ کی خصوصیت سمجھ کر یوں بات کر دی کہ لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّا اَیَّامًا مَّعْدُوْدَةً حق تعالیٰ نے اس شبہ کے جواب میں پہلے منع فرمایا۔ اور دلیل طلب کی کہ اَتَّخَذْتُمْ عِنْدَ اللّٰهِ عَهْدًا۔ کیونکہ اصل کلام میں بنی اسرائیل کی تخصیص اور یہودیوں کا نام نہ تھا۔ بلکہ نصوص الٰہیہ نے مطلقاً اہلِ حق اور اس وقت کے دین کے پیروکاروں کا ذکر فرمایا تھا۔ اور چونکہ اس وقت بنی اسرائیل اور یہود کے سوا کسی میں یہ صفت نہ تھی' انہوں نے ان نصوص سے اس فرقہ کی ایک قسم کی اطلاع سمجھ کر تخصیص کر لی تھی۔ پس نص صریح جس کی تاویل وغیرہ نہ کی گئی ہو جو کہ اس عہد سے عبارت ہے' یہاں مفقود تھی۔ اور اپنے فہم کے مطابق تاویل کی گئی۔ نص قابل نہیں کہ اعتقادیات' اصولِ دین اور آخرت کی بحث میں اس سے دلیل پکڑنا جائز ہو۔ اور اسی لیے فرمایا: اَمْ تَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَالَا تَعْلَمُوْنَ۔ پھر اس امر کی تحقیق بیان کر کے شبہ کو حل فرمایا کہ خطاؤں کا نفس کو گھیر لینا جو کہ علم و عمل کے فساد اور عقیدہ وافعال کے اس حد تک خراب ہونے سے عبارت ہے کہ ایمان کا ایک ذرہ بھی نہیں رہتا' عذاب میں ہمیشہ رہنے کا سبب ہے۔ جس گروہ میں بھی پایا جائے بغیر کسی تخصیص اور امتیاز کے اگرچہ کلمہ گوئی اور دین داری کے ساتھ ملا ہوا ہو۔

گناہ کو جائز سمجھنا کفر ہے

نیز جاننا چاہیے کہ کسی گناہ کو جائز سمجھنا کفر ہے۔ اور استباحت کا معنی یہ ہے کہ دل میں

اس گناہ پر عذاب کا خوف نہ رہے۔ اور عقیدے میں اس کی قباحت زائل ہو جائے۔ اگرچہ یہ جانے کہ اس گناہ کو شریعت میں حرام قرار دیا گیا ہے۔ اور اس سے شدت کے ساتھ منع کیا ہے۔ اور زبان سے اقرار بھی کرے کہ یہ معصیت' معصیت ہے۔ کیونکہ استباحت کا معنی مباح جاننا ہے نہ کہ مباح کہنا۔ اور جب معصیت سے عذاب کا خوف زائل ہو گیا۔ اور وہ معصیت اعتقاد میں قبیح نہ رہی تو مباح ہو گئی۔ اور اس معصیت کے ساتھ مباحات والا معاملہ وقوع پذیر ہوا۔

فقہ کے ظاہر بین سمجھتے ہیں کہ شرع میں اس کی حرمت کے وارد ہونے کا انکار بھی استباحت میں لازم ہے۔ اور یہ معنی وقوع کے اعتبار سے نادر ہے۔ احادیث اور آیات کی رو سے استباحت کی تحقیق میں اسی قدر کافی ہے۔ شرع میں اس کی حرمت کے وارد ہونے کا دل یا زبان سے انکار ضروری نہیں ہے۔ بسا اوقات ایک شخص اس طرح اعتقاد رکھتا ہے کہ مصلحت عام کی بناء پر تاکہ بُری رسم نہ پھیلے اور ہوتے ہوتے دوسری قباحت تک نہ لے جائے' شرع میں اس فعل کو حرام قرار دیا گیا ہے۔ اور ڈرانے دھمکانے کے لیے عذاب کا وعدہ کیا گیا۔ ورنہ فی نفسہ اس کام میں کسی قسم کی قباحت نہیں ہے۔ اور اس پر کوئی عذاب مرتب نہیں ہوتا ہے اس فرق کی دل سے نگہبانی کرنا چاہیے۔ کیونکہ اس مسئلہ میں اکثر احادیث و آیات کو سمجھنے میں کام آئے گا۔

اہلِ قبلہ کے اختلاف کا بیان

نیز جاننا چاہیے کہ اہلِ قبلہ کے درمیان اس مسئلہ میں عظیم اختلاف رونما ہوا ہے۔ ان میں سے بعض کبیرہ کے مرتکب کے لیے قطعی دائمی عذاب کی وعید ثابت کرتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ اگر کبیرہ گناہ والا توبہ کے بغیر مر گیا تو اس کا حکم کافروں والا ہے۔ اور معتزلہ اور خوارج کا یہی مذہب ہے۔ اگرچہ معتزلہ کہتے ہیں کہ ھو فی منزلۃ بین المنزلتین یعنی وہ دونوں درجوں (کفر و اسلام) کے مابین ایک درجے میں ہے۔ اور خوارج کہتے ہیں ھو کافر یعنی وہ کافر ہے۔ لیکن چونکہ ایمان سے نکل گیا اور اس لیے معتزلہ کے نزدیک بھی اس نے کافروں کا حکم حاصل کیا۔ پس اسے مسلمانوں کے قبرستان میں دفن نہیں کرنا چاہیے۔ اس کی

نمازِ جنازہ نہیں پڑھنا چاہیے۔ اور اس کے لئے صدقات' فاتحہ' درود' تلاوتِ قرآن اور استغفار نہیں کرنا چاہیے۔ کیونکہ ان کے لیے ایمان شرط ہے۔ اور جب شرط ہی نہیں تو مشروط نہیں۔ (اقول وباللہ التوفیق معلوم ہوا کہ مندرجہ بالا وجوہ ایصالِ ثواب کافر کے لیے جائز نہیں بلکہ صرف اور صرف مسلمانوں کا حق ہے۔ تو جو لوگ ان چیزوں کو ناجائز کہتے اور حرام جانتے ہیں' وہ غور کریں کہ وہ اپنے مرنے والوں کے متعلق لاشعوری طور پر کیا گمان کرتے ہیں۔ کیونکہ درود و فاتحہ اور قرآن خوانی مسلمان کے لیے تو ہر صورت جائز ہے۔ اور اس مسئلہ فاتحہ مرّوجہ کے جواز کے بارے میں شیخ العرب والعجم مجدد دین وملت مولانا الامام احمد رضا بریلوی قدس سرہ العزیز کا عظیم فتویٰ الحجة الفائحه يطيب التعيين والفاتحه کا مطالعہ کریں بغایت مفید ہے۔ محمد محفوظ الحق غفرلہٗ۔ فَاعْتَبِرُوْا يٰاُولِي الْاَلْبَابُ وَالْاَبْصَارُ۔

اور ان میں سے بعض اس کے قطعی مگر منقطع ہونے والے عذاب کی وعید ثابت کرتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ وہ معافی کے قابل نہیں' اسے عذاب ضرور ہوگا لیکن اس کا عذاب منقطع ہو جائے گا۔ اور آخرکار وہ جنت میں جائے گا۔ اور بشر مریسی' خالدی اور دوسرے جاہل بے وقوفوں کا مذہب یہی ہے۔ اور بعض کہتے ہیں کہ فساق کے عذاب کی وعید بالکل نہیں ہے۔ اور قرآن و حدیث میں جو وعید وارد ہے' کافر کے لیے ہے۔ جو کہ فسق کے ساتھ کفر بھی رکھتا ہے۔ اور جب ایک شخص ایمان پر مرا' اسے کسی گناہ سے کوئی خطرہ نہیں۔ ان کا قول یہ ہے کہ لايضر مع الايمان معصية كما لاينفع مع الكفر طاعة ایمان کے ہوتے ہوئے کوئی گناہ نقصان نہیں دیتا جس طرح کفر کے ساتھ کوئی نیکی فائدہ نہیں دیتی۔ اور یہی مرجیہ کا قول ہے۔ اللہ انہیں ذلیل کرے۔ اور ان کے حق میں صحیح حدیث وارد ہے کہ صنفان من امتي ليس لهما في الاسلام نصيب المرجيه والقدريه میری اُمت سے دو گروہ ایسے ہیں جن کا اسلام میں کوئی حصہ نہیں ہے: مرجیہ اور قدریہ۔

اہلِ سنت و جماعت کا مذہب

مذہب صحیح جسے صحابہ کرام رضوان علیہم اجمعین اور تابعین نے وضاحت سے بیان فرمایا

ہے۔ اوراہل سنت و جماعت نے اسی کو اختیار کیا ہے کہ مرتکب کبیرہ معافی کے قابل ہے۔ اگر چہ توبہ کے بغیر فوت ہو جائے۔ اور وہ نمازِ جنازہ' استغفار اور صدقات و احسان کے ساتھ امداد کرنے میں سب مسلمانوں کی طرح ہے۔ اور اس کے حق میں حضرت پیغمبر کی شفاعت اور اللہ تعالیٰ کی رحمت کا امیدوار ہونا چاہیے۔ بلکہ یقین کرنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ اپنی بے پایاں رحمت یا رسول پاک کی شفاعت کی وجہ سے بعض کبیرہ گناہ کرنے والے بعض لوگوں کو معاف فرما دے گا۔ نیز یقین کرنا چاہیے کہ ان میں سے جسے عذاب دیا جائے گا اس کا عذاب منقطع ہو جائے گا' ہمیشہ کا عذاب کفر کے ساتھ خاص ہے۔ کسی گناہ کی وجہ سے اس کا مستحق نہیں ہو سکتا لیکن معلوم نہیں کہ کبیرہ گناہوں پر عذاب کی مدت کتنی ہو گی۔ نیز یہ بھی معلوم نہیں کہ کبیرہ گناہ والوں میں سے کسے عذاب ہو گا۔ اور کسے بالکل معاف فرمایا جائے گا۔ اسی وجہ سے ہم ڈر اور امید میں رہتے ہیں' بے خوفی اور ناامیدی نہیں کرتے۔ قرآنی آیات جیسے اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ (النساء آیت ۴۸) اور اس جیسی اور آیات اس مذہب میں صریح نص ہیں۔ نیز قرآن پاک ان صفات سے پُر ہے۔ كَانَ اللّٰهُ عَفُوًّا غَفُوْرًا رَّحِيْمًا' كَرِيْمًا۔ اور اگر ہم احادیث میں نظر کریں تو اس مضمون کو حد تواتر سے بالاتر پائیں گے۔ اور اسی لیے یحییٰ بن معاذ رازی نے اپنی مناجات میں کہا ہے الٰہی جب ایک گھڑی کا ایمان ستر (۷۰) سالہ کفر کو نیست و نابود کر دیتا ہے۔ تو ستر (۷۰) سالہ ایمان ایک گھڑی کے گناہ کو نیست و نابود کیوں نہ کرے گا۔ نیز جب آیات اور احادیث بخشش کے وعدے اور عذاب کی وعید پر منہ بولتی دلالت کرتی ہیں۔ اور ایک دوسرے کے منافی دو چیزوں میں جمع محال ہے۔ تو کوئی مطابقت دینا امر ضروری ہے۔ اور مطابقت میں دو احتمال ہیں: ایک تو یہ کہ پہلے آدمی کو ثواب کا انعام عطا کریں اس کے بعد عذاب میں گرفتار کر لیں۔ اور یہ معنی اجماع کے بھی خلاف ہے۔ حکمت کے بھی اور کرم کے بھی۔ کیونکہ نوازے گئے کو گرانا نہیں چاہیے۔ دوسرا احتمال یہ ہے کہ پہلے اسے عذاب میں گرفتار کریں جب اپنے بُرے کردار کی سزا چکھ کر عبرت حاصل کر لے اور پھر اسے عفو و کرم سے بخش دیں اور ثواب انعام عطا فرما دیں اور یہی تقاضائے حکمت اور قانون کرم کے

مطابق ہے۔ پس یہ مقرر ہو گیا۔ اور یہی مذہب ہے۔

اور اس مقام پر معتزلہ کے طرف داروں میں سے بعض کہتے ہیں کہ اہلِ سنت و جماعت کا مذہب اگرچہ ادب کے زیادہ قریب ہے۔ کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کے لیے دونوں صفات جمال و جلال' عفو و انتقام اور لطف و قہر ثابت کرتے ہیں۔ اور ان دونوں صفتوں میں سے کسی ایک کو بندوں کے حق میں واجب نہیں جانتے۔ اور کہتے ہیں کہ وہ مالک ہے۔ يَفْعَلُ مَا يَشَآءُ وَيَحْكُمُ مَا يُرِيْدُ جو چاہتا ہے' کرتا ہے۔ اور جو ارادہ کرتا ہے' فیصلہ کرتا ہے۔ اور متعین نہیں کرتے کہ فلاں واجب العفو ہے۔ اور فلاں واجب العقاب اس جہت سے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے افعال کو اغراض اور اسباب سے مبرا مانتے ہیں۔ لیکن معتزلہ کا مذہب احتیاط کے زیادہ قریب ہے۔ کیونکہ فی الواقع امن کے ہوتے ہوئے ڈرانا اور پرحذر رکھنا بہتر ہے یا کہ واقعی خوف سے بے خوف کر دیں اور مطمئن رکھیں۔ لیکن اس بات سے ایک خدشہ ہے۔ کیونکہ قابلِ تعریف احتیاط مذہب اہلِ سنت و جماعت میں منحصر ہے۔ کیونکہ وہ تعین نہیں کرتے کہ معافی کسے ہوگی اور بدلہ کس سے لیا جائے گا۔ دونوں صفتوں کو تخصیص کے بغیر ثابت کرتے ہیں۔ پس ہر ایک کو خوف عام اور شامل ہوتا ہے۔ بخلاف معتزلہ کے مذہب کے کہ گناہِ صغیرہ والے کے بارے میں بے خوف ہونے کا موجب اور گناہِ کبیرہ والے کے حق میں نا امید ہونے کا سبب ہے۔ اور یہ احتیاط قابلِ تعریف نہیں ہے۔ بلکہ علاج سے نا امید کرنا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے مردے استغفار' صدقات اور نیکیوں کی شفاعت جو کہ نجات کا قوی وسیلہ ہے' سے محروم ہیں۔ نیز وہ احتیاط جو کہ عمدہ منافع سے محرومی کا سبب ہو۔ اور وہ منافع بھی اسی امر میں کار آمد ہوں جس سے احتیاط منظور ہے۔ تمام عقلمندوں کے نزدیک بہت مذموم ہے۔ اور اللہ تعالیٰ ہادی ہے اسی پر میرا بھروسہ اور میرا اعتماد ہے۔

اور اگر بنی اسرائیل اس مدعا پر سمعی دلیل قائم کرنے سے عاجزی اور تمام دینوں اور شریعتوں کے درمیان متفقہ قاعدہ کلیہ جو کہ ان کے دوزخ کے عذاب میں ہمیشہ رہنے پر دلالت کرتا ہے' سننے کے باوجود اس دعوے سے دستبردار نہیں ہوتے تو انہیں ان کی کتاب کی رو سے الزام دیں۔ کیونکہ ہم نے اس کتاب میں بعض احکام قبول کرنے پر پختہ وعدے اور

تاکیدی عہد لیے ہیں۔ اور انہوں نے ان سب کو توڑ دیا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کے دستور میں محال ہے کہ ان پختہ محکم وعدوں کو توڑنے پر چند دنوں سے زیادہ عذاب نہ کرے۔ خصوصاً جب انہوں نے اس عہد شکنی کو عادت بنا رکھا ہو۔ اور اس کے خوگر ہو چکے ہوں۔ کیونکہ العادۃ طبیعۃ ثانیہ اگر عمر ابدی پائیں اس سے ہرگز باز نہیں آئیں گے۔ پس ان عظیم کبیرہ گناہوں پر ہمیشگی کی نیت ان میں ثابت ہے۔ جو کہ ان پر ہمیشگی کرنے کے حکم میں ہے۔ اور دائمی گناہ کے لیے دائمی عذاب ان کے فہم کے مطابق بھی واجب ہے۔ اور ان کے الزام کے لیے کہیے۔

وَاِذْ اَخَذْنَا مِیْثَاقَ بَنِیْٓ اِسْرَآئِیْلَ اور یاد کرو اس وقت کو کہ ہم نے بنی اسرائیل سے پکا عہد لیا' عبادت میں توحید پر اور مزید تاکید اور اس عہد کی پختگی کی بناء پر حکم نہ فرمایا بلکہ خبر دینے کے طریقے پر کیونکہ مرد[illegible] اس کے خلاف کرنے میں اللہ تعالیٰ کی تکذیب سے ڈرتا ہے' ہم نے فرمایا:

لَا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰہُ تم عبادت نہیں کرو گے مگر خالص اللہ تعالیٰ کی۔ پس اس عہد کے ضمن میں دو ذمہ داریاں ہوئیں: ایک یہ کہ خدا تعالیٰ کی عبادت کرو گے' دوسری یہ کہ اللہ تعالیٰ کے غیر کی عبادت نہ کرو گے۔ پہلی ذمہ داری اس پر موقوف ہے کہ خدا تعالیٰ کو جانو اور چونکہ اس کی ذات کو جاننا محال ہے۔ اس لیے صفاتِ کمال کے ساتھ پہچانو۔ اور جو چیز اس کے حق میں ضروری ہے۔ جیسے عموم علم' عموم قدرت' ارادے کا نافذ کرنا' بندوں کے اعمال واقوال کا دیکھنا' سننا اور امر و نہی اور جو کچھ اس کے حق میں محال ہے جیسے عاجزی۔ جہالت۔ آغاز اور ندامت اس کا واقع کے مطابق اعتقاد رکھو۔ نیز وغ عبادت کی کیفیت اور اس کے اوقات جاننے پر موقوف ہے۔ اور یہ جاننا وحی و رسالت کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ پس انبیاء' کتب الٰہیہ اور فرشتوں کے ساتھ اعتقاد جو کہ وحی اور کتابیں وصول کرنے کا ذریعہ ہیں' بھی حقیقت کے مطابق بھی تمہیں ضروری ہوا۔ اور دوسری ذمہ داری ریاء' شرک اور محبت ماسوی اللہ کو دل میں غالب کرنے سے بچنے پر موقوف ہے۔ پس ان امور سے پرہیز لازم ہوئی۔

ونیز ہم نے فرمایا کہ وَبِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا والدین کے ساتھ احسان کرو عظیم

احسان کرنا جو کہ چند قسموں کا جامع ہو۔

حقوقِ والدین کا بیان

اور وہ تین قسمیں ہیں: پہلی قسم قول اور فعل سے تکلیف نہ دینا' دوسری قسم جسم اور مال سے ان کی خدمت کرنا اور تیسری قسم جب حاضر ہونے کی طلب کریں تو حاضر ہونا۔ پہلی قسم تو مطلق واجب ہے۔ اس لیے اسے چھوڑنے میں بہت بُری نافرمانی لازم آتی ہے۔ اور دوسری قسم مشروط ہے ان کے محتاج ہونے اور اس کے حدمت کرنے پر قادر ہونے پر۔ پس اگر وہ محتاج نہ ہوں یا اسے قدرت نہیں ہے۔ تو واجب نہیں ہے۔ اور تیسری قسم بھی مشروط ہے اس پر کہ حاضر ہونے سے شرعی خرابی ثابت نہ ہو۔ ورنہ واجب نہیں اور اگر والدین یا ان میں سے ایک اسے فرمائیں کہ نفلی عبادتوں کو چھوڑ دے اور ہمارے پاس حاضر رہ تو ان کے حکم کی تعمیل پہلے ہے۔ اور اگر فرمائیں کہ واجبات ترک کر دے یا حج فرض کے لیے نہ جا تو قبول نہ کرے۔ اور اگر سنن موکدہ کو جیسے جماعت اور عرفہ کا روزہ چھڑائیں تو زیادہ صحیح یہ ہے کہ اگر ایک یا دو بار ترک کرائیں تو ان کا کہا مان لے اور اگر اس ترک کی عادت بنالیں تو ان کے حکم کو قبول نہ کرے۔

حق اللہ کے بعد حقوق والدین رکھنے کی وجوہ

حاصلِ کلام یہ کہ ہم نے والدین کے ساتھ احسان کرنے کو اپنی عبادت کے بعد اور ان کے حق کو اپنے حق کے برابر کیا چند وجوہ کی بناء پر۔ پہلی وجہ یہ ہے کہ والدین جس طرح اپنی اولاد کی پرورش اور تربیت کا سبب ہیں اسی طرح اولاد کے وجود کا بھی سبب ہیں۔ اور ایجادِ الٰہی کے فیض کا واسطہ ہوتے ہیں۔ والدین کے سوا کوئی یہ مرتبہ نہیں رکھتا۔ اگر کوئی تربیت اور پرورش کا ذریعہ بنتا ہے۔ تو وجود کا سبب ہرگز نہیں ہوتا۔ پس اللہ تعالیٰ کے انعام کے بعد والدین کے انعام سے کسی کا انعام بڑا نہیں ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ والدین کا انعام حضرت حق جل وعلا کے انعام کے ساتھ پوری مشابہت رکھتا ہے۔ کیونکہ وہ اس انعام کے عوض کوئی تعریف شکر یا کوئی ثواب اور جزا نہیں چاہتے۔ بخلاف دوسرے لوگوں کے

انعام کے کہ لازمی طور پر کسی غرض سے مخلوط ہوتا ہے۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ اپنے بندے پر انعام کرنے سے رنجیدہ نہیں ہوتا اگرچہ بندہ گنہگار اور نافرمان ہو۔ اسی طرح وہ بھی اولاد سے شفقت اور خیر خواہی سے رنجیدہ نہیں ہوتے اگرچہ اولاد نالائق ہو۔

چوتھی وجہ یہ ہے کہ والدین کو واحد حقیقی کی بارگاہ سے کمال مناسبت ہے۔ جس طرح درجہ خدائی میں ایک ذات پاک کے سوا کسی کی گنجائش نہیں اسی طرح ماں باپ کے درجہ میں ایک ایک فرد کے سوا کوئی نہیں آ سکتا۔

پانچویں وجہ یہ ہے کہ کمال جو ممکن ہے' اولاد کے بارے میں والدین اس کی آرزو کرتے ہیں۔ بلکہ ہر کمال میں اپنی اولاد کی اپنے آپ سے زیادہ ترقی چاہتے ہیں۔ اور کسی اچھی چیز پر اس پر حسد نہیں کرتے اور یہ والدین کے سوا کسی کی خصوصیت نہیں ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ تمام شرائع اور دینوں میں والدین کی تعظیم واجب رہی۔ بلکہ اولاد کے ساتھ والدین کی مناسبت' محبت اور جھکاؤ ذاتی ہے' بے شعور حیوانات میں بھی موجود ہے۔ جس طرح اللہ تعالیٰ کی اپنے بندے کے ساتھ محبت بھی ذاتی ہے۔ اور اسی لیے کافروں کے حق میں بھی رُسل علیہ السلام کو بھیجنے' کتابیں اُتارنے' دلائل قائم کرنے اور عذر زائل کرنے کے ساتھ مصروف ہے۔

اور اس آیات میں جو والدین کو ایمان کی قید کے بغیر مطلق ذکر فرمایا ہے' ایک اشارہ ہے کہ ماں باپ اگرچہ کافر' منافق یا فاسق و فاجر ہوں' اولاد کو ان کے متعلق بھی نرمی اور اچھے سلوک کی راہ چلنا چاہیے۔ اور یہی وجہ ہے کہ حضرت ابراہیم خلیل الرحمٰن علیہ السلام نے اپنے چچا کو جو کہ بمنزلہ باپ تھا' پیغامِ ہدایت دیتے ہوئے نرمی کا راستہ اختیار فرمایا جیسا کہ سورۂ مریم میں اسے وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ اور جب حنظلہ بن ابو عامر راہب نے جو کہ جلیل القدر صحابی رضی اللہ عنہ تھے' اپنے باپ ابو عامر راہب کو جو کہ سخت عناد رکھتا تھا' قتل کرنے کی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اجازت چاہی تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اجازت نہ دی اور باپ کو قتل کرنے سے اگرچہ واجب القتل تھا' منع فرمایا۔

والدین کے ساتھ احسان کرنے کا طریقہ

اور احادیث صحیح میں جو کچھ مروی ہے اس کے مطابق والدین کے ساتھ احسان کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ تہ دلی سے ان کے ساتھ محبت کرے۔ اور گفتگو' چلنے' بیٹھنے اور اُٹھنے میں ادب کی باریکیوں کی رعایت کرے۔ مثلاً چلنے میں آگے نہ ہو۔ اور گفتگو میں انہیں ان کے نام کے ساتھ نہ پکارے مثلاً یا سیدی اور یا سیدتی' یا اے والد محترم اور والدہ محترمہ اور اسی طرح خدمت میں مقدور بھر خرچ کرے۔ اور قول اور فعل میں انہیں خوش رکھنے کا قصد کرے۔ اور اپنے قیمتی اوقات اور نفیس مال کا ان سے دریغ نہ کرے۔ اور وفات کے بعد ان کی وصیت جاری کرنے میں لگ جائے۔ اور انہیں دعائے خیر اور استغفار کے ساتھ یاد رکھے۔ اور ان کے لیے صدقات و خیرات بھیجے۔ اور ایک جمعہ کی مقدار میں ان کی قبر کی زیارت کرے۔ اور سورۂ یسین پڑھ کر اس کا ثواب ان کی روح کو گزارے اور جنہیں ان سے محبت اور قرابت ہے' ان کی خبر گیری کرے۔ اور جو سلوک وہ ان سے کرتے تھے بجالائے کیونکہ ان اعمال کے ساتھ والدین کے ساتھ نیکی کرنا پورا ہوتا ہے۔ اور ان تمام مراتب کو سورت اسراء میں چند کلمات کے ضمن میں ارشاد فرمایا: فَلَا تَقُلْ لَّهُمَآ اُفٍّ وَّلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَقُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِيْ صَغِيْرًا۔ (الاسراء بنی اسرائیل آیت ۲۳'۲۴) انہیں اف تک مت کہو اور انہیں مت جھڑکو اور ان سے بڑی تعظیم سے بات کرو۔ اور ان کے لئے تواضع وانکسار کے بازو جھکا دو رحمت سے اور عرض کرو اے میرے پروردگار! ان دونوں پر رحم فرما جس طرح انہوں نے مجھے (بڑی محبت و پیار سے) پالا تھا جب میں بچہ تھا۔

ذی القربٰی کے حقوق

و نیز ہم نے فرمایا کہ تم احسان کرو گے ذِی الْقُرْبٰی قریبوں کے ساتھ اور اس احسان کو ہم نے والدین کے ساتھ احسان کے تابع کر دیا کیونکہ دنیا میں جو رشتہ داری ہے یا والدین کے واسطہ سے ہے دونوں کے واسطہ سے جیسے حقیقی بھائی بہنیں یا ان میں سے ایک

سے واسطہ سے جیسے دادا' باپ کی طرف سے بھائی' چچے اور چچیاں یہ سب باپ کی وجہ سے رشتہ داری رکھتے ہیں۔ اور جیسے ماں کی طرف سے بھائی بہنیں' نانا' ماموں اور خالائیں۔ جو کہ ماں کی وجہ سے رشتہ دار ہیں۔ پس تمام ذوی القربیٰ والدین کے ساتھ قرابت میں شریک ہو گئے۔ اور فرق یہی ہے کہ سلسلہ وجود میں والدین اصل ہونے کے اعتبار سے قریب واقع ہوتے ہیں۔ اور یہ سب بالتبع۔ اور اسی لیے اصل احسان میں شریک ہیں۔ اور شریعت میں اس احسان کو صلہ رحمی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اور احادیث شریف میں وارد ہے کہ الرحم سحنة من الرحمن یعنی قرابت اسم رحمان کے ظہور کے شعبوں میں سے ایک شعبہ ہے۔ گویا اللہ تعالیٰ کی رحمت اس پردے میں ظہور کرتی ہے۔ اسی لیے حق تعالیٰ نے قرابت کو فرمایا ہے من وصلك وصلته ومن قطعك قطعة جو تجھ سے اچھا سلوک کرتا ہے' میں اس سے اچھا سلوک کرتا ہوں اور جو تجھ سے بُرا سلوک کرے میں اس سے اسی قسم کا سلوک کرتا ہوں۔

اور عقلی مصلحت بھی تقاضا کرتی ہے کہ اپنے اقارب کے ساتھ احسان کی راہ چلنا چاہیے۔ کیونکہ آدمی کا شادی میں بھی' غمی میں بھی اور دوسری مہمات میں بھی بغیر مالی امداد و اعانت اور خدمت بدنی کے کام درست نہیں ہوتا۔ اور ہر کسی کو ہر کسی کے ساتھ اس قسم کی امداد ممکن نہیں۔ پس ناچاران لوگوں کو جو کہ ایک دوسرے کے ساتھ زیادہ میلان اور اُلفت طبعی رکھتے ہیں۔ اور ایک قسم کا اتحاد' محرمیت اور ان کے احوال پر اطلاع ممکن ہے' یہ سلوک لازم کیا گیا ہے۔ تا کہ تمدن' اجتماعیت اور ایک دوسرے کے ساتھ امداد و تعاون کا کام نہ بگڑے۔

قرابت کی دو قسمیں

یہاں جاننا چاہیے کہ اہلِ قرابت کی دو قسمیں ہیں: ایک قسم ان لوگوں کی ہے۔ جو کہ قرابت کے ساتھ محرم بھی ہیں۔ جیسے چچا' ماموں' پھوپھی' خالہ' بھائی' بہن اور بھائیوں اور بہنوں کی اولاد۔ اس قسم کے ساتھ احسان فرض ہے۔ اور اس کا تارک گنہگار۔ دوسری قسم وہ لوگ ہیں جو محرم نہیں ہیں۔ جیسے چچاؤں اور ماموؤں کی اولاد' پھوپھیوں اور خالاؤں کی اولاد'

ان کے ساتھ احسان سنت موکدہ ہے۔ لیکن امداد و اعانت کے معنی میں۔ لیکن احسان بمعنی تکلیف نہ دینا تو یہ سب کی نسبت سے فرض ہے۔ بلکہ تمام مسلمانوں کی نسبت سے بھی۔

مشہور سوال

نیز جاننا چاہیے کہ یہاں مشہور سوال ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اس آیت میں یتامی اور مساکین کو جمع کے صیغے کے ساتھ لایا گیا ہے۔ اور اہلِ قرابت بھی متعدد ہیں۔ لیکن انہیں مفرد کے صیغے سے لائے۔ اور ذوی القربیٰ نہ فرمایا۔ اس میں کیا نکتہ ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اہلِ قرابت کے بارے میں صیغہ مفرد لانے میں جتلانا مراد ہے کہ چونکہ قرابت ایک مرتبہ میں ہوتی ہے انہیں ایک آدمی کے حکم میں اعتبار کرنا چاہیے۔ اور ترجیح، تفضیل اور سلوک میں اختلاف سے پرہیز کرنا چاہیے تاکہ وحشت کا موجب نہ ہو بخلاف یتامی اور مساکین کے کہ وہاں اختلاف سلوک اور بعض کو بعض پر ترجیح اور فضیلت دینا حرام نہیں ہے۔

دیگر سوال اور جواب

ایک اور سوال بھی ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اس سورت میں ذی القربیٰ حرفِ جار جو کہ با ہے کے تکرار کے بغیر ارشاد فرمایا گیا۔ جبکہ سورت نساء میں وبذی القربیٰ حرف با کے تکرار کے ساتھ، یہ فرق کس نکتہ پر مبنی ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس سورت میں عہد کا ذکر ہے۔ جو کہ بنی اسرائیل سے لیا گیا تھا۔ بنی اسرائیل اپنی استعداد کی تنگی اور کوتاہ نظری کی وجہ سے والدین کے ماسوا کا حق احسان نہ سمجھ سکے تو انہیں سمجھانے کے لیے ذی القربیٰ کو والدین کے حکم میں داخل کر دیا گیا۔ اس بناء پر کہ تمام ذی القربیٰ والدین میں سے ایک سے اتصال رکھتے ہیں۔ والمتصل بالمتصل متصل اور متصل سے ملا ہوا بھی متصل ہے۔ پس حرف با کا گرانا جو کہ استقلال پر دلالت کرتا ہے۔ اور کمال اتصالی کے منافی ہے، ضروری ہوا۔ جبکہ سورۂ نساء میں اُمتِ مصطفویہ علی صاحبہا السلام والتحیہ سے خطاب ہے۔ اور وہ اپنے کمال معرفت اور فراخی استعداد کی وجہ سے حق دار کے حق کو مستقل طور پر پہچان سکتے ہیں۔ پس

حرف با جو کہ اس پر دلالت کرتا ہے' کا لانا مناسب ہوا۔ نیز اس سورت میں کلام اختصار پر مبنی ہے۔ کیونکہ منظور اصلی تو عہد یاد کرانا ہے نہ کہ حاضر ذمہ داری۔ اسی لیے مقامِ توحید میں نفی و اثبات پر اکتفاء فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے: لَا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ پس با کے حذف کرنے کی جو کہ اختصار کا موجب ہے' رعایت کی گئی۔ تاکہ روشِ کلام کے مناسب ہو۔ اور سورۂ نساء (آیت ۲۶) میں تکلیفات کی تفصیل کا مقام ہے۔ اور اسی لیے توحید کو دو مستقل عبارتوں کے ساتھ ادا کیا۔ فرمایا کہ وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْئًا اور حقوق والوں کے بیان میں ایک طوالت منظور رکھی گئی ہے کہ وَالْجَارِ ذِي الْقُرْبٰى وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْبِ وَابْنِ السَّبِيْلِ وَمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ۔ پس حرف با کا یہاں لانا ضروری ہوا تاکہ روشِ کلام کے خلاف نہ ہو۔

بلکہ اگر گہری نظر سے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ سورۂ نساء میں ذی القربیٰ کو اصلی حق والا بناء کر جَارِ ذِي الْقُرْبٰى. جَارِ الْجُنُبِ اور صَاحِبِ بِالْجَنْبِ کو تابع اور حکمی قرابت قرار دیا گیا ہے۔ اور اس سورت میں والدین کو اصالۃً صاحبِ حق بناء کر ذوی القربیٰ کو ان کے تابع حکمی گردانا گیا۔ پس اس بناء پر یہاں حرف با کا لانا اور یہاں اس کا حذف لازم ہو گیا۔

و نیز ہم نے فرمایا کہ تم احسان کرو گے۔ اَلْيَتٰمٰى یتیموں کے ساتھ خواہ وہ مردوں کی جنس سے ہوں یا عورتیں۔

یتیم کے معنی اور حقوق کا بیان

عرف شرع میں وہ نابالغ بچہ ہے۔ جس کا باپ فوت ہو گیا ہو یا گم ہو چکا ہو اس کی ماں زندہ ہو یا نہ۔ اور اگر ماں بھی نہیں رکھتا تو وہ زیادہ مستحق ہو جاتا ہے۔ اور جانوروں میں یتیم وہ ہے۔ جس کی ماں نہ ہو گو باپ رکھتا ہو۔ اور جواہر اور نفیس چیزوں میں یتیم وہ جس کا ثانی اور مثل نہ ہو جسے در یتیم کہتے ہیں۔ اور یتیم کی جمع یتامیٰ لائی گئی ہے۔ حالانکہ فصیل کی جمع فعالی نہیں آتی لیکن یتیم آفت زدہ ہے' آفت زدوں کی جمع کی طرح اس کی جمع لائے جیسے وجاعی وحباطی اور صاحب کشاف نے کہا ہے کہ یتیم کو اگرچہ صفت ہے' اسمائے غالبہ کا حکم دیا گیا

ہے۔ جیسے صاحب' فارس اور انہیں کی شکل پر جمع لائی گئی پس اصل میں یتائم تھا' جگہ بدل کر یتامیٰ بنا دیا گیا۔ اور یتیم پر احسان دو قسم کا ہے: پہلی قسم وہ ہے جو اس کے وارثوں پر واجب ہے۔ جیسے اس کے مال کی اس طرح نگہبانی کرنا کہ روز بروز زیادہ ہو' تجارت یا زراعت کے ساتھ تا کہ خرچ کا اندازہ اور ملکیت کی ذمہ داریاں اس سے نکل آئیں۔ اور یتیم کی مصلحتوں کی دیکھ بھال خوراک' پوشاک' تعلیم علم و کتابت اور کمال نرمی اور خیر خواہی کے ساتھ آداب کی تلقین اور ایک قسم وہ ہے۔ جو کہ عام لوگوں پر واجب ہے اور وہ تکلیف نہ دینا ہے۔ نرمی اور دلجوئی' مجالس اور محافل میں اپنے پاس بٹھانا' یتیم کے سر پر ہاتھ پھیرنا اور اسے بیٹوں کی طرح بغل میں لینا اور اظہارِ محبت کرنا۔

اور یتیمی کا حق اس لیے اقارب اور والدین کے حق کے تابع ہوا کہ جب کوئی شخص یتیم اور بے بدر ہوا۔ حق تعالیٰ نے اپنے تمام بندوں کو حکم فرمایا کہ اس کے ساتھ باپ ہونے کا حکم ظاہر کریں۔ تا کہ حکمی عاجزی جو کہ اس کے باپ کی موت کی وجہ سے لاحق ہوئی اس حقیقی قوت کے ساتھ جو کہ اسے ہزاروں باتوں کی وجہ سے ملی' پوری ہو جائے۔ پس یتیم بھی شرعی قرابت رکھتا ہے۔ جس طرح ذوی القربیٰ قرابت عرفی رکھتے ہیں۔

و نیز ہم نے فرمایا کہ تم احسان کرو گے۔ اَلْمَسَاکِیْن گداؤں اور کنگالوں کے ساتھ جو کہ زمانہ حال کی عاجزی اور فقیری کی وجہ بالفعل یتیموں کا حکم رکھتے ہیں۔ اگر چہ یتیم کمائی کرنے کی طاقت نہیں رکھتے اور یہ طاقت رکھتے ہیں۔ اور اسی وجہ سے کلامِ الٰہی میں ہر جگہ مساکین سے مقدم ہوئے ہیں۔

کیونکہ یتیموں میں حال اور مستقبل دونوں کی عاجزی ثابت ہے بخلاف مساکین کے

مسکین کے معنی کا بیان

اور قرآن پاک کے عرف میں مسکین وہ شخص ہے۔ جس کی آمدنی اس کے خرچ سے کم ہو۔ اگر کچھ مال بھی رکھتا ہو۔ اور کسی پیشے میں بھی مصروف ہو۔ اس کی دلیل وہ ہے۔ جو کہ سورۂ کہف میں مذکور ہے کہ جس کشتی کو خضر علیہ السلام نے توڑا' مسکینوں کی ملکیت تھی۔ اور وہ مساکین اس کشتی کے ساتھ کمائی کرتے تھے اسی دلیل سے جو کہ سورۃ لا اقسم میں شدید

محتاجی کے مقام میں مِسۡکِیۡنًا ذَا مَتۡرَبَۃٍ فرمایا ہے۔ اگر لفظ مسکین خود بخود کسی بالکل کنگال پر دلالت کرتا تو اس قید کی حاجت نہ تھی۔ اور جب مساکین کو احسان کا مستحق ٹھہرایا تو فقیر کو بطریق اولیٰ محل رحم واحسان جاننا چاہیے۔ کیونکہ اس کی محتاجی مسکین کی محتاجی سے زیادہ ہے۔

وَ نیز ہم نے فرمایا قُوۡلُوۡا لِلنَّاسِ حُسۡنًا لوگوں کے ساتھ اچھی بات کرو جو کہ دل کی تنگی کا باعث نہ ہو۔ کیونکہ عوام الناس کے بارے میں احسان فعلی میسر نہیں ہوتا کیونکہ احسان فعلی اگر خدمت بدنی ہے۔ تو قوت کے ساتھ مشروط ہے۔ اور اس قدر قوت کہ بدن سے عام مخلوق کی خدمت کرے' آدمی میں نہیں پائی جاتی۔ اور اگر مالی امداد ہے۔ تو اپنی حاجت سے زائد مال پانے پر موقوف ہے۔ اور کسی کے لیے مال کی اس قدر کثرت جو کہ عام مخلوق کی حاجتوں کی گنجائش رکھے ہاتھ نہیں لگتی۔ تو مجبوراً عوام کے حق میں احسان قولی پر اکتفاء کرنا چاہیے۔

احسان قولی کے مرتبوں کا بیان

اور شرع شریف میں احسان قولی کے چند مرتبے ہیں۔ پہلا مرتبہ یہ کہ ملاقات کے وقت سلام سنون بجالائے۔ اور سلام کے جواب میں ایک لفظ زیادہ ملائے۔ دوسرا مرتبہ یہ ہے کہ مہربانی اور نرمی کے ساتھ نیکی پر دلالت کرے۔ اور بُرائی سے روکے اور سمجھانے کی راہ چلے نہ کہ مناظرہ اور مجادلہ کی جیسا کہ ایک بزرگ سے منقول ہے کہ انہوں نے کسی شخص کو جو وضو کے آداب اور سنتوں کی رعایت نہیں کرتا تھا۔ فرمایا کہ میں چاہتا ہوں کہ وضو کروں' تم توجہ سے دیکھو کہیں ایسا نہ ہو مجھ سے کوئی مستحب رہ جائے۔ اور چاہیے کہ یہ دلالت بھی خلوت میں ہو نہ کہ محضر عام میں تا کہ عار کا موجب نہ ہو۔ تیسرا مرتبہ یہ ہے کہ ملاقات کے وقت دوستی کا اظہار کرے۔ اور مزاج پُرسی کرے۔ اور شادی اور غم میں شریک ہونا بیان کرے۔ لیکن اس حد تک کہ سچ ہو' بے حد مبالغہ کیے بغیر' چوتھا مرتبہ یہ ہے کہ اسے بُلانے یا یاد کرنے کے وقت اس کے اچھے نام اور القاب زبان پر لائے۔ اور جو نام یا لقب اسے بُرے لگیں' ان سے پرہیز کرے۔ البتہ یہاں بھی سچائی کی رعایت کرے۔ اور جھوٹ نہ کہے۔

پانچواں مرتبہ یہ ہے کہ پس پشت اسے خوبی کے ساتھ یاد کرے۔ اور اس کی بچی تعریف کرے۔ اور بے حد جھوٹ اور بے حد مبالغہ سے پرہیز کرتے ہوئے اس کے فضائل کو ظاہر کرے۔ چھٹا مرتبہ یہ ہے کہ اچھے صلاح ومشورے کے وقت اس سے دریغ نہ کرے۔ ساتواں مرتبہ یہ ہے کہ اگر کسی کو دیکھے کہ نادانستہ کسی ہلاکت یا نقصان میں گرفتار ہوتا ہے۔ اور اس آفت سے اس کی خلاصی کو یہ شخص جانتا ہے' کمال حسن خلق اور ادب کی رعایت کرتے ہوئے اسے تعلیم دے۔ اور کسی اندھے کے حق میں جو کہ کسی کھڈے یا کنوئیں میں گرنے کے قریب ہو یا وہ شخص جو راستہ بھول گیا ہو یا اس کا سامان گم گیا ہو۔ اور اسے ڈھونڈتا ہو۔ اور اس کے نشان سے بے خبر ہو یا کوئی سامان خریدنا یا دوائی کی پہچان منظور ہو۔ اور اس کی خرید وفروخت کے امکان کے ساتھ اس کو حاصل کرنے کے طریقے سے آگاہی نہ ہو' یہ دلالت بہت تاکیدی ہو جاتی ہے۔ اور اسی طرح علمی استفتاء اور دینی شبہ کا حل طلب کرنے کے وقت وعلی ہذا القیاس۔ اور یہ اکثر معاملات کفار کے ساتھ بھی اجر وثواب کا باعث ہیں۔ اور اسی لیے وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا فرمایا۔ اور ایمان اور اسلام کی قید سے مقید نہ فرمایا مگر سلام کہنے میں پہل کرنا اہلِ اسلام کے ساتھ خاص ہے۔

مدارات' حسن خلق اور مداہنت کے معنوں میں فرق کا بیان

اور یہاں جاننا چاہیے کہ اس آیت میں حسن کا معنی یہ نہیں ہے کہ مخاطب کے نزدیک ہر لحاظ سے اچھا معلوم ہو۔ ورنہ مداہنت کا ارتکاب اور شرع کی مخالفت ہوگی کیونکہ اکثر مخاطبین اس چیز کو پسند کرتے ہیں جو کہ اپنی خواہش کے مطابق ہو اگرچہ شرع کے مخالف اور دین داری کے قانون کے منافی ہو۔ بلکہ اس کا معنی یہ ہے کہ حقیقت میں اس کے حق میں اچھی ہو۔ اور اس طرح ادا کی جائے کہ دل شکنی اور اسے عار لاحق ہونے کا سبب نہ ہو۔ پس اس آیت میں ہاں میں ہاں ملانے والوں اور خوشامدیوں کے لیے کوئی سند نہیں۔ اس لیے کہ ان کا کلام اور گفتگو اگرچہ بے سمجھ مصاحبوں اور مخاطبوں کے نزدیک اچھا معلوم ہوتا ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کے نزدیک قباحت اور برائی سے موصوف ہے۔ پس فِیْ نَفْسِہٖ حسن نہ رہا اور اس آیت میں حسن کا لفظ واقع ہے نہ کہ لفظ مستحسن۔ مرضی یعنی پسندیدہ ۔۔۔

خوش آنے والا تاکہ وہ باطل معنی اس سے سمجھا جا سکے۔

مدارات، حسن خلق اور مداہنت میں فرق

اور یہاں ایک عظیم مغالطہ پیش آیا۔ اکثر لوگوں کے لئے مدارات' حسن خلق کے اور مداہنت کے درمیان فرق واضح نہیں ہوا۔ مدارات اور حسن خلق شرع میں ہر مسلمان اور کافر کے ساتھ قابلِ تعریف ہے۔ جبکہ مدارات اور خوشامد معیوب اور مردود۔ ایک کا دوسرے سے امتیاز نہیں کرتے اور حسن خلق کے مقام پر مداہنت کا ارتکاب کرتے ہیں۔ اور ان دونوں کے درمیان صاف ستھرا فرق یہ ہے کہ مدارات اور حسن خلق اپنے بارے میں چشم پوشی کرنا اور نفسانیت کے ساتھ کام نہ کرنا ہے۔ اور اپنے آپ کو واجب التعظیم نہ سمجھنا اور اپنے بارے میں کسی کوتاہی سے درگزر کرنا ہے۔ جبکہ مداہنت دینی معاملہ میں چشم پوشی کرنا اور ناجائز امور اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک غیر پسندیدہ اقوال کو دیکھنے سننے کے باوجود حمایت و غیرت نہ کرنا اور اپنے دین کو ہلکا کرنا اور شریعت اور دین کے واجب حق سے درگزر کرنا۔ مثلاً اگر کسی شخص نے اسے سخت سست کہا یا اس کی تعظیم نہیں کی تو غصے میں نہ آنا اور اس سے بدلہ لینے کے درپے نہ ہونا بلکہ اچھا سلوک کرنا حسن خلق اور مدارات کے زمرے سے ہے۔ اور اگر شخص نے خلافِ شرع حرکت کی یا دین کی تعظیم نہ کی اس سے موافقت کرنا' اس سے ناپسندیدگی کا اظہار نہ کرنا اور اس کی بات کا رد نہ کرنا مداہنت اور خوشامد ہے۔ پس حسن خلق اور مدارات کسی کی خوشنودی اور دلجوئی کے لیے اپنے حق کو چھوڑنا ہے۔ جبکہ مداہنت اسی غرض فاسد کے لیے حق شرع کو ضائع کرنا ہے۔ اور ان دونوں کے درمیان واضح فرق ہے۔ ایک دوسرے سے بالکل جدا ہے۔ کسی طرح سے مشتبہ نہیں ہے۔ اور جب یہ فرق معلوم ہو گیا تو جاننا چاہیے کہ لوگوں کے ساتھ گفتگو یا تو دینی امور کے بارے میں ہے۔ اور اس کی بھی دو قسمیں ہیں: ایک قسم یہ کہ کافروں کے ساتھ ہو جیسے ایمان کی طرف بُلانا اور یہاں نرم گفتگو اور دلجوئی معتبر ہے۔ اس دلیل سے کہ حق تعالیٰ نے جب حضرت موسیٰ و حضرت ہارون علیٰ نبینا وعلیہما السلام کو عنوانِ رسالت کے ساتھ فرعون کے پاس بھیجا تو ارشاد فرمایا فقولا له قولاً لینا لعله یتذکر او یخشٰی (طٰہٰ آیت ۴۴) اس سے نرمی سے بات کرنا شاید کہ نصیحت قبول

کرے یا اللہ تعالیٰ سے ڈرے۔ اور اس دلیل سے کہ حضرت خاتم المرسلین علیہ الصلوٰۃ السلام کی تعریف میں حق تعالیٰ نے فرمایا ہے۔ فبما رحمة من الله لنت لهم ولو كنت فظا غليظ القلب لا نفضوا من حولك (آل عمران آیت ۱۵۹) اللہ تعالیٰ کی کمال مہربانی ہے کہ آپ کافروں اور منافقوں کے لیے خود بخود نرم طبع ہوئے۔ اور اگر درشت گفتگو والے اور سخت دل ہوتے تو آپ کی صحبت سے گریز کرتے اور آپ کی بات نہ سنتے۔

دوسری قسم یہ کہ فاسقوں کے ساتھ بات چیت ہو۔ اور ان لوگوں کے ساتھ جو کہ حقوقِ اسلام میں کوتاہی نہیں کرتے جیسے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کا حکم دینا اور نافرمانی سے روکنا یہاں بھی آداب، حسن خلق، گفتگو میں نرمی اور دلوں کو قائل کرنے کا لحاظ کرنا چاہیے۔ جیسا کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حکم دیا گیا۔ ادع الى سبيل ربك بالحكمة والموعظة الحسنة۔ (النحل آیت ۱۲۵) نیز فرمایا ہے: ادفع بالتي هي احسن (المومنون آیت ۹۶)

یا دنیوی امور کے بارے میں ہو جیسے غاصب اور امانت دار سے اپنا حق اور قرض کا تقاضا کرنا۔ اور ہر عقل مند کو معلوم ہے کہ نرمی کے ساتھ مقصد حاصل کرنا ممکن ہو تو اسے چھوڑ کر سختی اختیار کرنا معیوب اور مردود ہے۔ اسی لیے حدیث پاک میں وارد ہوا کہ مادخل الرفق في شيء الا زانه وما دخل الخرق في شيء الاشانه یعنی جہاں نرمی ہوگی، اسے زینت بخشے گی اور جہاں سختی ہوگی، اسے بے زیب کر دے گی تو ثابت ہوا کہ اچھی بات کہنا مسلمانوں اور نیک لوگوں کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ بنی آدم کے تمام گروہوں کے ساتھ دین و دنیا کے مقدمات میں حسن خلق کا طریقہ اپنانا اور ادب و تواضع کی راہ اختیار کرنا اچھا ہے مگر جہاں سختی اور سخت گوئی کے بغیر دین یا دنیا کا کام نہیں بنتا یا وہاں حسن خلق مداہنت کے ساتھ مشتبہ ہو جائے تو وہاں سختی اور شدت اختیار کرنا چاہیے۔ اور یہی مقام ہے اس آیت کا يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنَافِقِيْنَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ

اور حضرت امام محمد باقر رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ آپ نے وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا کی تفسیر میں فرمایا ہے کہ ماتحبون ان يقال لكم۔ لوگوں کو ایسی بات کہو جو تم پسند کرتے ہو کہ تمہیں کہی جائے۔ اور اس کی تفصیل یہ ہے کہ تمام امور میں خواہ وہ دینی ہوں

جیسے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر یا دنیوی جیسے قرض کا تقاضا اور اپنا حق مانگنا۔ چاہیے کہ انسان اپنے آپ کو اپنے حریف کے پلے میں رکھے۔ اور اپنے دل میں تولے کہ اگر میں اس فعل میں گرفتار ہوتا۔ اور کوئی شخص میرے ساتھ مقام نصیحت وارشاد میں یا نزاع اور جھگڑے کے وقت گفتگو کرتا تو مجھے کس طرح پسند ہوتا۔ اور کون سے طریقے سے برا لگتا۔ پہلے طریقے کو اختیار کرے۔ اور دوسرے سے پرہیز کرے۔ اور جب اس عہد میں بندوں کے ذمے جو بندوں کے جو حقوق ثابت ہیں کے بیان سے فراغت ہوئی تو اپنے حقوق طلب فرمائے۔

وَاَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ اور نماز برپا کرو۔ اور اسے اس طرح درست کرو کہ اس میں کوئی کمی نہ رہے۔ کیونکہ نماز ایک ایسی عبادت ہے۔ جو کہ دل و جان اور ہاتھ پاؤں کو شامل ہے۔ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ اور زکوٰۃ دو جو کہ مال سے معین مقدار ہے۔ چالیسواں حصہ سونے چاندی سے اور اموال تجارت کی قیمت سے بشرطیکہ ایک سال گزر جائے۔ اور مویشیوں اور کھیتی باڑی سے اجناس اور اصناف کے اختلاف کے مطابق مختلف ہے۔ جیسا کہ فقہی کتابوں میں مذکور ہے۔ کیونکہ یہ عبادت اگرچہ صورت میں خدا تعالیٰ کا حق ہے۔ لیکن معنوں کے اعتبار سے بندوں کا حق ہے۔ اور اخلاق کو اچھا کرنے اور بخل کی ردی عادت کو دفع کرنے میں اسے پورا دخل ہے۔

جواب طلب سوال

یہاں ایک جواب طلب سوال باقی رہ گیا اور وہ یہ ہے کہ اس پہلے عہد میں توحید کا ذکر فرمایا۔ اس کے بعد آدمیوں کے حقوق کو۔ اس کے بعد نماز اور زکوٰۃ کو۔ پس ترتیب میں دگرگونی لازم آئی کیونکہ اگر حقوق العباد کو پہلے لانا منظور تھا اس بناء پر کہ حقوق العباد زیادہ شدید ہیں۔ اور ان کی رعایت کرنا زیادہ ضروری اور ان میں عہد کو توڑنا زیادہ سخت ہے۔ تو چاہیے تھا کہ توحید کو بھی مؤخر کیا جاتا اور نماز زکوٰۃ کے ساتھ ذکر فرمایا جاتا اور اگر حقوق اللہ کو پہلے لانا پیش نظر تھا اس بناء پر کہ بنیاد یہی ہے۔ تو نماز اور زکوٰۃ کو توحید کے ہمراہ ذکر کرنا چاہیے تھا۔ اور حقوق اللہ کی تفریق کہ بعض کو پہلے اور بعض کو آخر میں بیان فرمایا' کی کیا وجہ ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ اصل میں حقوق العباد کو پہلے لانا منظور ہے۔ کیونکہ بندے اپنی

محتاجی کی وجہ سے اپنے حقوق میں کوتاہی کی وجہ سے تکلیف پاتے ہیں۔ جبکہ حضرت حق جل وعلا احتیاج سے پاک ہے۔ اگر اس کے حق میں کوئی کوتاہی ہو جائے' اسے کوئی نقصان نہیں پہنچتا۔ لیکن توحید کو حقوق اللہ میں ایک ایسا مقام حاصل ہے۔ جو کہ طاعات کی مقبولیت کی شرط ہے خواہ وہ طاعات حقوق العباد سے متعلق ہوں یا حقوق اللہ سے۔ اور طبعی طور پر شرط کو مشروط پر اوّلیت حاصل ہے اس بناء پر توحید کو باقی تمام چیزوں سے پہلے لانا لازم ہوا۔ اور اس کے بعد حقوق العباد کو حقوق اللہ پر مقدم فرمایا تا کہ ان کی ادائیگی پر زیادہ تاکید سمجھی جائے۔

ایک اور سوال اور اس کا جواب

اور ایک اور سوال بھی ہے کہ یتیموں' مسکینوں اور قرابت داروں کے ساتھ احسان کرنا زکوٰۃ دینے میں داخل ہے' اسے جدا ذکر کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یتیموں' مسکینوں اور قرابت داروں کے ساتھ احسان کرنا جیسا کہ تفسیر میں اس کا اشارہ پہلے گزر چکا' زیادہ عام ہے کہ مال کے ساتھ ہو یا کسی دوسری صورت کے ساتھ اور جس صورت میں مال کے ساتھ ہو' بھی عام ہے اس سے نصاب کی قدر میں ہو یا اس سے کم تر میں۔ اور جس صورت میں کہ قدر نصاب میں ہو بھی عام ہے اس سے کہ زکوٰۃ میں شمار کی جائے یا زکوٰۃ کے علاوہ۔ پس اس احسان کو جو کہ اس درجہ عموم رکھتا ہے' زکوٰۃ دینے میں شمار نہیں کرنا چاہیے۔ ہاں ان تین اصناف یعنی' یتیموں' مسکینوں اور قرابت داروں کے ساتھ احسان کرنے کے طریقے میں سے ایک یہ بھی ہے کہ مال زکوٰۃ کو ان کی طرف خرچ کیا جائے۔

نیز قرابت داروں' یتیموں اور مسکینوں کے ساتھ احسان کرنے کے ذکر سے اللہ تعالیٰ کو منظور یہ ہے کہ ان کے حال پر خصوصیت کے ساتھ توجہ اور لطف کی نظر رکھیں۔ جس طرح بھی ہو۔ اور زکوٰۃ دینے میں پیش نظر یہ ہے کہ مال کو اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرنے کا قصد کریں اور اسی لیے پہلا احسان عدالت کے خُلق کی تکمیل کے زمرے سے ہے۔ اور دوسرا احسان یعنی زکوٰۃ دینا سخاوت کے خلق کو حاصل کرنے کے لیے ہے۔ پہلا احسان حقوق العباد میں سے ہے۔ جبکہ دوسرا حقوق اللہ میں سے ہے۔

حاصلِ کلام یہ کہ یہ عہد یاد دِلانے کے بعد جو کہ آٹھ (۸) تکلیفات شامل ہے۔ اور تکلیفات کی تمام قسموں کو جامع ہے۔ کیونکہ تکلیف بدنی ہے یا مالی۔ اور ان میں سے ہر ایک عام ہے یا خاص۔ تکلیف بدنی عام مطلق عبادت ہے کہ ایک شخص اپنے تمام اعضاء اور قویٰ کو امرالٰہی کی تکمیل کے لیے مستعد کر کے اس غلام کی طرح گوش بر آواز ہو جو کہ اپنے مالک کی اطاعت کے قصد کے ساتھ کھڑا ہے۔ اور اس تکلیف کا اشارہ ان لفظوں کے ساتھ واقع ہے۔ لَاتَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰہَ اور خاص بدنی تکلیف نماز ہے۔ جو کہ مخصوص اوقات میں مقررہ شرائط اور ارکان کے ساتھ قرار پائی۔ اور خاص مالی تکلیف زکوٰۃ ہے۔ کیونکہ مالک نصاب' سال گزرنے مقرر مستحقوں اور گنتی کے ساتھ مخصوص ہے۔ اور عام مالی تکلیف جو کہ صرف امکان کی قدرت کے ساتھ مشروط ہے' سبب کے ساتھ ہے یا نسب کے ساتھ' یا غیر نسب۔ اور نسب کی تین حالتیں ہیں یا سابق ہے۔ جیسے والدین' یا مقارن ہے۔ جیسے دُور کے رشتے دار۔ یا لاحق جیسے یتیم جو کہ اپنے باپوں کی موت کی وجہ سے عام لوگوں کی اولاد کے حکم میں ہیں۔ اور نسب کے بغیر یا محتاجی اور فقیری ہے جیسے مساکین۔ یا نوع کا اشتراک ہے۔ جو کہ عام لوگوں کی نسبت سے ثابت ہے۔ لیکن عام لوگوں کی نسبت سے سوائے احسان قولی یا مکارم اخلاق میں سے جو اس کے حکم میں ہے کہ میسر نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ حدیث پاک میں وارد ہے انکم لن تسعوا الناس باموالکم ولکن سعوھم باخلاقکم تمہیں ممکن نہیں کہ اپنے مال کے ساتھ تمام لوگوں کی گنجائش نکال سکو لیکن تمہیں چاہیے کہ سب کے لیے اپنے اخلاق کے ساتھ گنجائش کرو اب جھڑکنے اور عتاب کرنے کے طریقے سے بنی اسرائیل سے فرمایا کہ

ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ پھر تم نے روگردانی کی۔ اس عہد سے باوجود تاکید و پختگی کے اور ان تمام آٹھوں تکالیف کو ضائع کر دیا۔

اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْكُمْ مگر تم میں سے قلیل جماعت نے۔ جیسے عبداللہ بن سلام اور کعب کے بیٹے اسد اور اسید اور ان کی مثل وہ لوگ جو کہ اپنے رسول علیہ السلام کی پیروی کے شرف سے مشرف ہوئے۔ اور توحید اور حقوق اللہ کی ادائیگی میں راسخ قدم ہوئے۔ پس اس محکم

عہد کو توڑنے اور ان عمدہ آٹھ تکالیف کو ضائع کرنے کے باوجود تم یہ توقع کیسے کرتے ہو کہ تمہارا عذاب چند روز سے زیادہ نہ ہوگا۔ حالانکہ ان میں سے بعض تکالیف کو چھوڑنا ہمیشہ کے عذاب کا سبب ہے۔ جیسے توحید اور بعض کو چھوڑنا دوزخ میں دیر تک ٹھہرنے کا موجب ہے۔ جیسے والدین کی نافرمانی' نماز ترک کرنا۔ اور کاش تم نے اس کے بعد اس روگردانی کا تدارک کرلیا ہوتا۔ اور اس عہد شکنی کی اصلاح کر لیتے لیکن تم روز بروز اس عہد شکنی میں ترقی کر رہے ہو۔

وَاَنۡتُمۡ مُّعۡرِضُوۡنَ اور تم نے احکامِ الٰہی سے روگردانی کو عادت بناء لیا ہے۔ اور العادۃ طبیعۃ ثانیہ یعنی عادت دوسری طبیعت ہے' کے مطابق اس روگردانی کا رنگ تمہارے نفسوں کے جواہر میں پختہ ہو کر مستحکم بدمزاجی کی طرح قابلِ علاج نہ رہا۔ اور اگر اس زمانے کے بنی اسرائیل کہیں کہ اس پختہ عہد سے روگردانی ہمارے تمام فرقوں سے رونما نہیں ہوئی بلکہ ہم میں سے بہت سے لوگ عبادت میں توحید اور حقوق کی ادائیگی پر ثابت قدم ہیں۔ خصوصاً ہم جو کہ اس وقت یہاں ہیں' ان تکلیفات کی ادائیگی میں کوئی کمی نہیں کرتے۔ پس ہمارے اسلاف میں سے بعض کے فعل کی وجہ سے ہم پر طعن نہیں ہو سکتا۔ پس ان کے جواب میں انہیں ایک اور عہد یاد دِلائیں اور کہیں

وَاِذۡ اَخَذۡنَا مِيۡثَاقَكُمۡ اور یاد کرو اس وقت کو جب کہ ہم نے تم سے پختہ عہد اس بات پر لیا کہ

لَا تَسۡفِكُوۡنَ دِمَآءَكُمۡ کہ تم ایک دوسرے کا خون نہیں گراؤ گے۔ اور اس عہد کو بھی ہم عہد توحید کی طرح خبر دینے کی شکل میں لائے تاکہ تم جانو کہ ایک دوسرے کا خون گرانا قباحت میں کفر و شرک کے قریب ہے۔ اور اسی لیے شرائع الٰہیہ میں مقرر ہے کہ شرک کے بعد بڑا کبیرہ گناہ ناحق خون کرنا ہے۔ اور اسی طرح اسی طریقے پر مزید تاکید کے لیے ہم نے فرمایا:

وَلَا تُخۡرِجُوۡنَ اَنۡفُسَكُمۡ مِّنۡ دِيَارِكُمۡ اور تم اپنے ہم مذہب گروہ کو اپنے گھروں سے نہیں نکالو گے۔ کیونکہ جلاوطنی ہلاکت کے قریب ایک آفت ہے۔ پس خون ریزی کے

حکم میں ہے۔ اور انہیں ترک کرنے پر پختہ عہد دینے کے باوجود اس قسم کے عظیم گناہوں کے ارتکاب پر شدید طویل عذاب کی امید کرنا چاہیے تھی اس کے قریب جو کہ کفر و شرک میں متوقع ہے۔

اور کسی شخص کو اس کے گھر سے نکالنا چند طریقوں سے ہوتا ہے۔ ان میں سے ادنیٰ یہ ہے کہ ہمسائیگی میں اس سے بُرا سلوک کیا جائے تاکہ اس مسکن کو چھوڑنے پر مجبور ہو جائے۔ اور جس طرح اس شخص کو ناحق اس کے گھر سے نکال باہر کیا' اللہ تعالیٰ اسے اس کے موروثی گھر سے جو کہ جنت ہے' نکال دے گا اور تم نے اس عہد کو قبول کیا۔

ثُمَّ اَقْرَرْتُمْ پھر تم نے اقرار کیا کہ ہم نے اس عہد کا التزام کیا ہے۔ اور ہم نے قبول کیا وَاَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ اور تم بھی جو کہ اس زمانے میں حاضر ہو' اپنے اسلاف کے اس اقرار کی گواہی دیتے ہو۔ اور اس کا انکار نہیں کرتے ہو۔

ثُمَّ پھر اس اقرار اور گواہی کے بعد اَنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ تم جو کہ اس وقت حاضر ہو' ان دونوں عہدوں کو توڑتے ہو جو کہ حق تعالیٰ نے تمہارے اسلاف سے بطریق خبر لیے تھے۔ اور تمہاری یہ عہد شکنی خبر الٰہی کی تکذیب کے مشابہ ہے۔ معاذ اللہ۔ کیونکہ تم تَقْتُلُوْنَ اَنْفُسَكُمْ اپنے ہم مذہب اور ہم قوم لوگوں کو قتل کرتے ہو جو کہ درحقیقت اپنے آپ کو قتل کرتے ہو۔ کیونکہ حکم شرع کے ساتھ تم پر قصاص واجب ہو جاتا ہے۔ اور تم واجب القتل ہو جاتے ہو۔ اور اس واقعہ کی صورت یوں تھی کہ مدینہ منورہ کے گرد و نواح میں یہود کے دو گروہ رہتے تھے: بنو قریظہ اور بنو نضیر۔ اور شہر مدینہ عالیہ میں بھی انصار کے دو گروہ رہتے تھے: اوس اور خزرج۔ بنو قریظہ اوس کے اور بنو نضیر خزرج کے حلیف تھے۔ اور اوس اور خزرج کے درمیان جب بھی لڑائی ہوتی' بنو قریظہ اوس کی امداد کے لیے۔ اور بنو نضیر خزرج کی امداد کے لیے آتے تھے۔ اور ایک دوسرے کو قتل کرتے تھے۔ بنو قریظہ کے ہاتھوں بہت سے بنو نضیر اور بنو نضیر کے ہاتھوں بہت سے بنو قریظہ مارے جاتے تھے۔ اور ان کا یہ معاملہ سالہا سال سے جاری تھا اس کا تدارک بالکل نہیں کرتے تھے۔ اور اس کام پر ندامت محسوس نہیں کرتے تھے۔ اور کاش تم اسی قدر پر اکتفاء کرتے لیکن تم اس پر ایک اور چیز کا اضافہ کرتے تھے۔

وَتُخْرِجُوْنَ فَرِيْقًا مِّنْكُمْ مِّنْ دِيَارِهِمْ اور اپنے ہم مذہبوں کے ایک گروہ کو ان کے گھروں سے نکال دیتے ہو۔ اور یہ گروہ وہ لوگ تھے۔ جو کہ جنگ میں مغلوب ہو جاتے اور ان کے سردار مارے جاتے' یہ اس فرقے کو کمزور سمجھ کر ان کے تعلقات پر تصرف کرتے تھے۔ اور اگر تم کہو کہ ہم اپنے ہم مذہب لوگوں کو قصداً قتل نہیں کرتے اور نہ ہی نکالتے ہیں بلکہ اس قسم اور عہد کی نگہبانی کے لیے جو کہ ہمارے ہم عہدیوں کے ساتھ ہے' ان کی امداد واعانت کرتے ہیں۔ اور اس ضمن میں ان کا قتل اور نکالنا لازم آتا ہے' ہم مجبور ہیں۔ ہم کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے اس عہد نے جو کہ ہم عہدیوں کے ساتھ تمہارے عہد سے پہلے تھا' تم پر ہم مذہبوں کو قتل کرنے اور نکالنے کو حرام کر دیا تھا۔ اور فعل حرام پر امداد و تعاون کرنا شریک ہونا ہے۔ اور شک نہیں کہ تم

تَظٰهَرُوْنَ عَلَيْهِمْ بِالْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ پشت پناہی کرتے ہو اپنے ہم مذہبوں کو قتل کرنے اور نکالنے پر اس فعل کے ساتھ جو کہ فی نفسہٖ گناہ ہے۔ اور اپنے دینی بھائی کے حق میں زیادتی ہے۔ اور ظاہر ہے کہ جس طرح ظلم حرام ہے۔ اسی طرح ظالم کی اس کے ظلم پر مدد کرنا بھی حرام ہے۔

معتزلہ کے ایک قوی شبہ کا جواب

اور یہاں ایک قوی شبہ ہے۔ جو کہ معتزلہ پر وارد ہوتا ہے۔ اور وہ حضرت حق تعالیٰ پر عدل واجب کرنے میں کہتے ہیں کہ اگر ظالم کی مدد کرنا حرام ہے۔ تو حق تعالیٰ ظالم کو ظلم کرنے کی قدرت کیوں دیتا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ جس طرح حق تعالیٰ نے ظالم کو ظلم کی قدرت بخشی ہے۔ اسی طرح اسے ظلم سے روکا بھی ہے۔ اور شدید وعید فرمائی ہے بخلاف آدمی کے کہ جو بھی ظالم کی مدد کرتا ہے' زیادہ تر ظلم پر اُبھارتا ہے۔ اور اس کی نظر میں ظلم کو اچھا گردانتا ہے۔ اور اگر حق تعالیٰ ظالم کو ظلم پر قدرت نہ دیتا تو تکلیف اور امتحان کا معاملہ جس پر اچھی بُری جزا کا دارومدار ہے' ثابت نہیں ہو سکتا تھا۔ کیونکہ کوئی کام اللہ تعالیٰ کے قدرت دیئے بغیر بندہ سے نہیں ہو سکتا۔ پس بندوں کا ظالم سے باز رہنا بے طاقتی کی وجہ سے ہوتا۔ نہ کہ ایمان اور اطاعت فرمانِ خداوندی کی وجہ سے۔ اور غرض تکلیف حاصل کرنے میں

جب ایک آدمی کو دوسرے پر اس قسم کی قدرت دیتا ہے۔ تو لازماً آدمیوں کے درمیان ظالم کے ظلم کی امداد مطلق حرام اور ممنوع ہوئی اور عجیب بات یہ ہے کہ اپنے ہم مذہبوں کو قتل کرنے اور وطن سے نکالنے میں اس قدر زیادتی کرتے ہو۔

وَاِنْ یَّاْتُوْکُمْ اُسٰرٰی تُفٰدُوْھُمْ اور اگر تمہارے پاس تمہارے ہم مذہب قیدی ہو کر آتے ہیں تو ان کا فدیہ دے کر انہیں چھڑا لیتے ہو۔ مثلاً اوس اور خزاج کی جنگ میں اگر بنوقریظہ میں سے کوئی خزرجیوں کے ہاتھوں قیدی ہو جاتا تو بنونضیر اسے خرید کر آزاد کر دیتے تھے۔ اور اگر بنونضیر میں سے کوئی اوسیوں کے ہاتھوں گرفتار ہو جاتا تو بنوقریظہ سونا دے کر اسے رہا کرا لیتے۔ اور اگر کوئی انہیں کہتا کہ تم ایک دوسرے کے ساتھ جنگ بھی کرتے ہو۔ اور ایک دوسرے کو جلاوطن کر دیتے ہو پھر سونا دے کر ان کے قیدیوں کو کیوں چھڑا لیتے ہو؟ جواب میں کہتے کہ ہمیں اللہ تعالیٰ نے بھی حکم فرمایا ہے کہ جب بھی ہم اپنے دینی بھائیوں کو کسی کے ہاتھوں میں اسیر دیکھیں تو اسے ہر حال میں رہا کرائیں اور ہمارا ایک دوسرے کے ساتھ جنگ کرنا صرف دنیاداری کی وجہ سے ہے۔ کیونکہ جنگ سے بیٹھ رہنے کی صورت میں ہم پر طعن کیا جاتا ہے۔ اور ہمیں شرمندگی لاحق ہوتی ہے کہ ہم نے اپنے ہم عہدیوں کی مدد نہ کی اور وہ بھی ضرورت کے وقت ہماری مدد نہیں کریں گے۔ اور ہمارا دنیوی نظام درہم برہم ہو جائے گا۔ حق تعالیٰ ان کے جواب کو باطل فرماتا ہے کہ جس طرح دینی بھائی کو دین کے مخالف کی قید سے چھڑانا تم پر فرض تھا۔ اور تم اسے بجالاتے ہو۔ اور اسی لیے عہد شکنیوں کے ذکر میں اس کا ذکر نہیں کیا۔ اسی طرح تمہارے درمیان جنگ بھی تم پر حرام تھی۔

وَھُوَ حال یہ ہے مُحَرَّمٌ عَلَیْکُمْ اِخْرَاجُھُمْ تم پر اپنے ہم مذہبوں کو نکالنا حرام ہے۔ اور جب نکالنا حرام ہے۔ تو قتل کرنا اور قتل کرنے پر مدد کرنا بطریق اولیٰ حرام ہوا۔ اور ان چیزوں کو بے دریغ عمل میں لاتے ہو۔ پس معلوم ہوا کہ تم اللہ تعالیٰ کے بعض بعض معاہدوں پر عمل کرتے ہو۔ اور اس کے بعض معاہدوں کو توڑ دیتے ہو۔

اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْکِتٰبِ تو کیا اپنی کتاب کے بعض احکام پر ایمان لاتے ہو۔ جو کہ ظالموں کی قید سے قیدی کو چھڑانا ہے۔ وَتَکْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ اور اسی کتاب کے بعض

احکام کے ساتھ کفر کرتے ہو جو کہ اپنے ہم مذہب کو قتل کرنے اور جلا وطن کرنا ہے۔ حالانکہ کتاب پر ایمان لانا اجزا میں تقسیم نہیں ہو سکتا۔ جب تک کہ اس کے تمام احکام کو قبول نہ کرو تمہارا ایمان صحیح نہیں ہوتا۔ اور اگر تم اپنی کتاب کے ایک حکم پر ایمان نہیں لائے تو کافر مطلق ہو گئے۔ اور جب احکام کتاب میں سے ایک حکم کا انکار کرتے ہو۔

فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ پس کیا جزا ہے اس کی جو یہ کام کرتا ہے۔ کسی مردود سے بھی ہو خصوصاً مِنْكُمْ تم میں سے۔ کیونکہ تم اپنے آپ کو اہل کتاب اور اس کتاب کے پیروکار کہتے ہو۔ خود انصاف کرو اور ظاہر ہے کہ کفر کی جزا نہیں ہے اِلَّا خِزْيٌ مگر شدید رسوائی جس سے شرم کی جاتی ہے۔ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا دنیا کی زندگی میں۔ جیسے چند دانت کے ساتھ جزیہ لینا ڈنڈے اور طمانچے مار کر خراج وصول کرنا اس کی گواہی کو قبول نہ کرنا اٹھتے بیٹھتے مجلس اور شارع عام میں اسے ذلیل اور حقیر ٹھہرانا قتل کرنا قید کرنا مال لوٹنا اور گھر جلانا جیسا کہ بنو قریظہ اور بنو نضیر کے ساتھ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اس وقت کے مسلمانوں کے ہاتھوں سلوک ہوا کہ تمام بنو قریظہ کو قتل فرمایا۔ اور ان کی عورتوں اور بچوں کو کنیز اور غلام بنایا گیا۔ اور بنو نضیر کو پوری ذلت کے ساتھ جلا وطن فرمایا گیا۔ یہاں تک کہ وہ بھاگ کر خیبر چلے گئے پھر خیبر میں ان کے سردار قتل ہوئے۔ اور ان کی عورتیں قیدی ہو گئیں۔ اور ان کے باقی ماندہ لوگ مسلمانوں کے حراج اور کارندے بنے۔ اور یہ سب کچھ اس وجہ سے ہوا کہ انہوں نے اپنے ہم مذہبوں کی دل جوئی کو اللہ تعالیٰ کے پختہ عہدوں کی پاسداری پر مقدم کیا۔ پس اللہ تعالیٰ کے عہد کو ذلیل اور حقیر جانا اور کاش ان کی یہی جزا پر اکتفا کی جاتی لیکن یہ دنیا اور دنیا کی ذلت سب زائل ہونے والا ہے۔

وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الْعَذَابِ اور قیامت کے دن سخت عذاب کی طرف پھیرے جائیں گے۔ جو کہ دنیا کی طرح ایک مقررہ مدت میں ختم ہونے والا نہیں ہو گا۔ کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کے عہدوں کو توڑنے میں مبالغہ کرتے تھے۔ حالانکہ وہ عہد بہت محکم اور پختہ تھے۔ اگر اللہ تعالیٰ ان کے عذاب میں مبالغہ نہ فرمائے تو جاہلوں کو وہم ہو جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ غافل ہے۔

وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ اور اللہ تعالیٰ اس سے غافل نہیں ہے جو کچھ تم کرتے ہو۔ کہ تم اس کے پختہ وعدوں کو بار بار توڑتے ہو۔ اور دوستی اور آشنائی کے لحاظ کو اللہ تعالیٰ کے حق پر مقدم کرتے ہو۔

اور ایسا کیوں نہ ہو کہ آخرت میں وہ سخت ترین عذاب میں گرفتار ہوں۔ کیونکہ انہوں نے آخرت کی منفعتوں میں سے اپنے لیے خود کچھ نہیں چھوڑا ہے۔ کیونکہ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا بِالْاٰخِرَةِ وہ ایسا بے عقل گروہ ہے جنہوں نے دنیا کی زندگی کو آخرت کے بدلے خریدا۔ جس وقت کہ انہوں نے اپنے ہم عہدیوں کا فرمان قبول کیا اور فرمانِ خداوندی کو خاطر میں نہ لائے۔ اور جب انہوں نے آخرت کو خود بیچ دیا تو منافع میں سے کسی منفعت کی امید کیا رکھتے ہیں۔

فَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ پس ان سے عذاب ہلکا نہ کیا جائے گا۔ کیونکہ عذاب کا ہلکا ہونا بھی اخروی منفعت کی ایک قسم ہے۔ جو کہ عنایتِ خداوندی سے ثابت ہوتی ہے۔ وَلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ اور نہ ہی کوئی ان کی مدد کرے گا کہ طاقت کے ساتھ ان سے اللہ تعالیٰ کے عذاب کو دُور کر دے۔ جیسا کہ دنیا میں اپنے ہم عہدیوں سے اس کی امید رکھتے تھے۔ پس معلوم ہوا کہ اقرار اور گواہی کے مطابق ہمیشہ کے عذاب شدید کے مستحق ہیں۔ اور وہ جو کہتے ہیں کہ لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّا اَيَّامًا مَّعْدُوْدَةً خود اس کی تکذیب کرتے ہیں۔

موافق طبع احکام قبول کرنے اور مخالف طبع ترک والے کا بیان

یہاں جاننا چاہیے کہ اس آیت سے معلوم ہوا کہ اگر کوئی شخص شریعت کے بعض احکام کو جو کہ اس کی طبیعت اور عادت کے موافق واقع ہوں' قبول کرے۔ اور بجالائے۔ اور جو اس کی طبیعت اور عادات کے خلاف ہوا سے قبول کرنے میں کوتاہی کرے تو یہ موافقت اور یہ عمل اس کے لیے کوئی کارآمد نہ ہوگا۔ مثلاً ایک شخص ہے۔ جو کہ شراب کو اپنے مزاج کو نقصان دینے والی سمجھ کر یا اپنے خاندان کے اطوار کے خلاف دیکھ کر چھوڑ دے اور پوشیدہ طور پر بدکاری کرے تو شراب کا چھوڑنا اس کے حق میں ثواب کا موجب نہ ہوگا۔ کیونکہ یہ عمل اتباعِ شریعت کے طور پر واقع نہیں ہوا۔ ہاں اگر طبعی تقاضے اور اتباعِ شریعت کے

قانون کی وجہ سے ایسا کرے۔ لیکن دوسری طرف ظاہر کے خلاف بھی عمل نہ کرے تو البتہ قانون کے مطابق یہ اسے فائدہ بخشتا ہے۔ اور اسی لیے اس قسم کی نیکیوں کے بجالانے میں اختلاف ہے۔ بعض نے کہا ہے۔

جرمے کہ رخت ما بحریم صفا کشد

بہتر ز طاعتے کہ بعجب وریا کشد

یعنی جس جرم سے صفائی ملے اس نیکی سے بھلا جو خود بینی اور ریاکاری تک پہنچا دے۔ اور بعض نے کہا ہے کہ ریا والی طاعت اس گناہ سے بہتر جو کہ توبہ کے بغیر ہو۔ اور دونوں فریقوں کے درمیان فیصلہ یہ ہے کہ نفس کی اصلاح اور اسے پاک کرنے کے باب میں ندامت اور شرمساری کے ساتھ گناہ خود بینی اور ریا والی نیکی سے بہتر ہے۔ اور رسم کی اصلاح اور شریعت کو رواج دینے کے لیے عجب وریا والی طاعت گناہ سے بہتر ہے۔ واللہ علم

اور اے یہودیو! تم کہو کہ قتل اور گھر سے نکالنے کے مقدمہ میں یہ ہمارے تمام توڑے گئے معاہدے ظالموں کی مدد ہے۔ اگرچہ کفر تک نہیں لے جاتے لیکن دراصل فسق کے زمرے سے ہیں۔ اور فاسق کا عذاب ختم ہونے والا ہے' دائمی نہیں۔ ہم کہتے ہیں کہ فاسق کے عذاب کا ختم ہونا اس صورت میں ہے کہ کفر تک نہ لے گیا ہو۔ بخلاف تمہارے اس فسق کے جو کہ کتاب کے بعض احکام کے ساتھ کفر کا موجب ہے۔ اور خطا کے گھیر لینے کی حد کو پہنچا۔ اور علی سبیل الفرض اگر تسلیم بھی کر لیا جائے تو بھی تم سے پیغمبروں علیہم السلام پر ایمان لانے کے عہد کو جو کہ بمنزلہ توحید کے ہے' توڑنا واقع ہوا حتیٰ کہ ان رسل علیہم السلام پر ایمان لانے کے بدلے تم نے انہیں قتل کرنے کے جرم کا ارتکاب کیا۔

وَلَقَدْ اٰتَیْنَا مُوْسَی الْکِتٰبَ اور بیشک ہم نے موسیٰ کو کتاب دی۔ جو کہ تورات تھی۔ اور اس کتاب میں اللہ تعالیٰ کے تمام پختہ وعدے اور معاہدے مذکور تھے۔ اور ان میں سے سب سے عمدہ یہ معاہدے تھے کہ تم ہر دور کے رسل علیہم السلام کی اطاعت کرو گے۔ اور ان پر تم ایمان لاؤ گے' ان کے ساتھ تعظیم اور توقیر کے ساتھ پیش آؤ گے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کو

تورات کی تختیاں عطا فرمائی گئیں' حضرت موسیٰ علیہ السلام نے انہیں اُٹھانے کی طاقت نہ پائی۔ اللہ تعالیٰ نے ہر آیت کے لیے ایک فرشتہ مقرر فرمایا۔ اور وہ بھی نہ اُٹھا سکے۔ اور اس کے بعد ہر حرف کے لیے فرشتہ بھیجا' وہ بھی نہ اُٹھا سکے جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اور فرشتوں کو اس کتاب کی معنوی عظمت اور بوجھ معلوم ہوا۔ اور اس کی قدر ان کے ذہن میں واضح ہو گئی تو حضرت موسیٰ علیٰ نبینا و علیہ السلام کو حکم ہوا کہ اب ہم نے اس کتاب کو اُٹھانا آپ پر آسان کر دیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اسے اُٹھا کر بنی اسرائیل کے پاس لائے۔

وَقَفَّيْنَا مِنْ بَعْدِهٖ بِالرُّسُلِ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد ہم ان کے پیچھے رسولوں کو لائے۔ جو کہ حضرت یوشع' حضرت الیاس' حضرت الیسع' حضرت شمویل' حضرت داؤد' حضرت سلیمان' حضرت شعیا' حضرت ارمیا' حضرت یونس' حضرت عزیر' حضرت حزقیل' حضرت زکریا اور حضرت یحییٰ علیہم السلام اور ان کے علاوہ چار ہزار افراد تھے۔ اور وہ سب حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت پر گزرے۔ اور انہیں بھیجنے کا مقصد اس شریعت کے احکام کو جاری کرنا تھا جو کہ بنی اسرائیل کی کاہلی اور سستی کی وجہ سے مٹ جاتی تھی۔ اور ان کے علمائے سوء کی وجہ سے بدل جاتی تھی۔ پس بنی اسرائیل میں یہ پیغمبر علیہم السلام اس اُمت کے علماء ربانیین اور مجدد دین اسلام کی طرح ہیں۔ جیسا کہ حدیث پاک میں وارد ہوا کہ ان اللہ تعالیٰ **یبعث لھذہ الامۃ علی رأس کل مائۃ من یجدد لھا دینھا**۔ بیشک اللہ تعالیٰ اس اُمت کے لیے ہر صدی کے آخر پر ایسے شخص کو بھیجے گا۔ جو کہ اس کے دین کو نئے سرے سے قائم کرے گا۔ پس تم نے ان رسل علیہم السلام کے بعض کا انکار کیا۔ اور ان سے بعض کو شہید کر دیا جیسے حضرت زکریا اور حضرت یحییٰ علیہما السلام اور اگر تم کہو کہ یہ رسل علیہم السلام اس قسم کے غالب معجزات نہیں رکھتے تھے۔ جیسے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معجزات تھے۔ اس بناء پر ہمارے اسلاف کو ان کے حال پر شبہ پڑ گیا اور غلط فہمی کی وجہ سے ان کی تکذیب کی اور انہیں قتل کر دیا۔ ہم کہتے ہیں کہ ان رسل علیہم السلام کے بعد ہم نے وہ غالب معجزات تمہیں دکھائے اور تم نے ہرگز یقین نہ کیا۔

وَاٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ اور ہم نے عیسیٰ بن مریم کو ظاہر معجزات عطا

فرمائے جیسے مردے زندہ کرنا' مادرزاد اندھے اور کوڑھی کو ٹھیک کرنا' پرندوں کو زندہ کرنا' غیب کی خبر دینا اور خود بخود تورات کو سیکھنا وغیر ذالك جو کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے غالب معجزات سے کم نہ تھے۔ بلکہ بعض وجوں سے ان سے بڑھے ہوئے تھے۔ خصوصاً اس جہت سے کہ ایک چیز ہم نے خاص حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو عطا فرمائی اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اس قسم کا معجزہ عطا نہیں فرمایا تھا۔ اور وہ یہ ہے:

وَاَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ اور ہم نے عیسیٰ علیہ السلام کو روح القدس کے ساتھ مدد دی اور روح القدس اس اسم الٰہی کا نام ہے۔ جس اسم کے ساتھ حضرت عیسیٰ علیہ السلام مردوں کو زندہ کرتے تھے۔ اور بیماروں کو ہاتھ پھیر کر اور دَم کر کے شفا دیتے تھے۔ اور بعض نے کہا کہ روح القدس حضرت جبریل علیہ السلام کا نام ہے۔ اور انہیں اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق ہمیشہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی رفاقت اور اعانت حاصل تھی۔ اور بعض نے کہا ہے کہ روح القدس اس روح پاک سے عبارت ہے۔ جو کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بدن میں پھونکی گئی اور دوسری روحوں سے کئی وجوہ سے ممتاز تھی۔ اور اس کی قدس کے ساتھ اضافت ایسی ہے جیسی حاتم الجود کی۔ اور وہ روح ملکی تھی جو کہ بشریت کے متعلقات بہت کم رکھتی تھی۔ حاصلِ کلام یہ کہ روح القدس کے ساتھ تائید جس معنی میں بھی ہو' آپ کی خصوصیتوں میں سے تھی۔ پس تم ان کی تکذیب اور انکار میں کسی طرح کا عذر نہیں رکھتے تھے۔

لفظ عیسیٰ اور مریم کے معنی کا بیان

اور عیسیٰ کا معنی عبرانی لغت میں الیشوع ہے۔ اور الیشوع کا معنی ہے مبارک اور مریم عبرانی لغت میں بمعنی خادم ہے چونکہ آپ کی والدہ کو بیت المقدس کی خدمت کے لیے نذر کر دیا گیا تھا اس لیے آپ کا نام مریم ہوا۔

ء کیا تم نے کسی شبہ' سند اور عذر کے بغیر ان پیغمبروں علیہ السلام کے بارے میں ہمارے پختہ عہد کو توڑ دیا سوائے اس کے کہ وہ تمہاری طبیعت کے خلاف حکم فرماتے تھے۔ فَكُلَّمَا جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ۔ پس جب بھی ان پیغمبروں علیہ السلام میں سے کوئی پیغمبر تمہارے پاس آیا۔ بِمَا لَا تَهْوٰۤى اَنْفُسُكُمُ ایسا حکم لے کر جسے تمہارے دل نہیں چاہتے تھے۔

اسْتَكْبَرْتُمْ تم اسے قبول کرنے سے تکبر کرتے تھے۔

فَفَرِيْقًا كَذَّبْتُمْ پس ان میں سے ایک گروہ کی تم نے تکذیب کی۔ وَفَرِيْقًا تَقْتُلُوْنَ اور ان میں سے ایک گروہ کو تم قتل کرتے تھے۔ جیسے حضرت شعیا' حضرت زکریا' حضرت یحییٰ اور اپنے گماں فاسد کے مطابق حضرت عیسیٰ علیہ السلام اگرچہ درحقیقت آپ کو پانے میں کامیاب نہ ہوسکے۔ لیکن شبہ کے ساتھ آپ کو سولی پر چڑھا دیا۔ اور جیسے رسول آخر الزماں صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کہ ایک بار آپ پر جادو کیا اور ایک بار زہر دیا۔ اور ایک بار آپ کو دیوار کے نیچے بٹھا کر بہانے کے ساتھ چاہا کہ ایک بہت بڑا پتھر آپ پر پھینک دیں۔ لیکن حق تعالیٰ نے آپ کو تمام حالات میں محفوظ رکھا اور یہی نکتہ جتلانے کے لیے قتلتم نہ فرمایا بلکہ مضارع کا صیغہ لایا گیا۔ کیونکہ ابھی تک وہ رسل علیہ السلام کو قتل کرنے کی فکر میں تھے۔

اور صحیح حدیث میں آیا کہ بکری کے گوشت کا زہر آلود لقمہ جو کہ میں نے خیبر میں کھایا تھا' ہر سال اس کا اثر لوٹتا ہے۔ اور گلے کے درد اور گلا گھٹنے کا موجب ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ اس وقت میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ اس کے اثر کی وجہ سے میری جان کی رگ پھٹ گئی ہے۔ پس حقیقت میں اس افضل المرسلین صلی اللہ علیہ وبارک وسلم کا وصال بھی ان کے قتل کی وجہ سے تھا۔ اور اس آیت میں جس نہج پر ارشاد ہوا ہے کہ ایک عظیم بلاغت رونما ہوئی ہے۔ گویا ارشاد فرمایا ہے کہ تمہارے نزدیک وصف رسالت ان دو چیزوں میں سے ایک کی مقتضی ہے' تکذیب یا قتل اور یہ انتہائی جہالت ہے کہ مخلوقات میں سے بہترین شخصیتوں کے ساتھ بدترین معاملہ کے ساتھ پیش آتے ہو۔

اور حدیث میں آیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ روح القدس جبریل علیہ السلام ہے۔ اور بخاری اور دوسری معتبر صحاح میں موجود ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم شاعر دربار رسالت حضرت حسان رضی اللہ عنہ کے لیے مسجد میں ایک منبر رکھنے کا حکم دیتے اور ان کے اشعار سنتے جو کہ وہ کفار کے شاعروں کے جواب میں کہتے۔ اور ان کے حق میں دعا فرماتے اَللّٰھُمَّ اَیِّدْہُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ پس معلوم ہوا کہ روح القدس کی تائید حضور صلی

اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیروی اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لانے کے فیض آپ کے بعض اُمتیوں کو نصیب ہوتی ہے۔ تو حضور کو بطریق اولیٰ حاصل ہوگی اور ابن حبان نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کی کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ روح القدس نے میرے سینے میں یوں بات ڈالی ہے کہ کوئی نفس نہیں مرتا۔ یہاں تک کہ اپنا رزق پورا نہ لے لے۔ پس اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور رزق طلب کرنے میں زیادہ تکلیف نہ اُٹھاؤ۔

اور روح القدس کی صحبت کے خصائص میں سے وہ ہے۔ جو کہ زبیر بن بکار نے کتاب اخبار مدینہ حسن بصری رضی اللہ عنہ سے بیان کیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ روح القدس جس سے ہم کلام ہوتی ہے' زمین کو اس کا گوشت کھانے کی اجازت نہیں ہے۔

ایک سوال اور اس کا جواب

یہاں ایک سوال ہے۔ جو کہ اہلِ تفسیر وارد کرتے ہیں۔ اور وہ یہ ہے کہ کذبتم ماضی کے صیغہ کے ساتھ اور تقتلون مضارع کے صیغہ کے ساتھ کیوں لائے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ان کا رسل کی تکذیب کرنا ایک ایسی چیز تھی کہ ہوئی اور گئی۔ اور ان کا رسل علیہم السلام کو قتل کرنا ابھی تک ختم نہ ہوا کیونکہ تمام پیغمبروں سے افضل پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قتل کے درپے ہیں۔ پس گویا ابھی قتل میں مشغول ہیں۔ اور اگرچہ کافروں کا رسل علیہم السلام کو قتل کرنا ان کی تکذیب کو بھی لازم کرتا ہے۔ اور جب تک قتل باقی ہے' تکذیب بھی باقی ہے۔ لیکن ہر رسول علیہ السلام کی تکذیب اس کی بعثت کے اوائل میں رونما ہوتی ہے۔ اور اس کا رونما ہونا ختم ہو جاتا ہے۔ بخلاف قتل کے کہ بار بار اس کے اسباب مہیا ہوتے ہیں۔ اور مہیا ہونے کا ظاہر ہونا دوسری تکذیب کے ظاہر ہونے کو لازم نہیں کرتا بلکہ پہلی تکذیب ہی کفایت کرتی ہے اس نکتہ کی بناء پر روش کو بدل دیا گیا۔ واللہ اعلم

وَقَالُوْا اور یہودیوں نے رسل علیہم السلام کو قتل کرنے کے عذر کے مقام میں کہا ہے۔ کہ ہم نے انہیں۔ اس لیے قتل کیا کہ ہمارے نزدیک ان کی سچائی ثابت نہ ہوئی۔ اگرچہ عوام

اور جاہلوں نے ان کے خلاف عادات کمالات دیکھ کر دھوکہ کھا کر انہیں سچا مانا۔ اور ان کے گرویدہ ہو گئے۔ مگر ہم لوگ اپنے مذہب میں اس قدر تعصب رکھتے ہیں کہ اس قسم کی باتوں سے ہم بالکل دھوکہ نہیں کھاتے۔ اور جو کوئی ہمارے مذہب اور آئین کے خلاف ہو۔ اگرچہ اس سے کتنی ہی خلاف عادت باتیں اور کرامتیں صادر ہوں' ہم ہرگز اس کے معتقد نہیں ہوتے۔ اور سر نہیں جھکاتے اور ہم اس سلسلہ میں اس درجہ پر پہنچے ہوتے ہیں کہ

قُلُوْبُنَا غُلْفٌ ہمارے دل غلافوں میں ہیں۔ ان میں خوشامد' چاپلوسی اور جادو بیانی بالکل اثر نہیں کرتی۔ اور دھوکہ دہی اور کرشمے دِکھانے سے ہم نہیں اُکھڑتے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ مقدمہ یوں نہیں ہے بَلْ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ بلکہ ان پر اللہ تعالیٰ نے لعنت فرمائی ہے۔ اور انہیں اپنی رحمت سے دُور پھینک دیا۔ اور حق کو سمجھنے اور اسے قبول کرنے کی ان کے دِلوں میں گنجائش نہ رکھی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ نصیحت کرنے والوں کے معتقد نہیں ہوتے۔ اور سچی بات کو نہیں سنتے۔ پس ان پر مقدمہ مشتبہ ہے۔ تعصب باطل کا تصلب حق سے امتیاز نہیں کرتے' انہیں جو حاصل ہے' تعصب باطل ہے۔ اور جس چیز کا دعویٰ کرتے ہیں تصلب حق ہے۔ جو کہ انہیں بالکل حاصل نہیں۔

تصلب حق اور تعصب باطل کے معنی کا بیان

اور تصلب حق کا معنی یہ ہے کہ دینِ حق کو قوت کے ساتھ پکڑے اور دوسرے دین اور آئین کی طرف ہرگز نہ دیکھے۔ اور شیاطین کی دھوکہ دہی' جوگیوں اور راہبوں کے کرتبوں پر توجہ نہ کرے۔ اور مصائب و تکالیف وارد ہونے کی وجہ سے اپنے دین کے حسن میں شک اور تردد نہ کرے۔ اور یہ تمام دینوں میں قابلِ تعریف اور ہر زمانے میں مطلوب ہے۔ اور تعصب باطل کا معنی یہ ہے کہ اپنی رسم یا اپنے خاندان کی سرداری کی غیرت کی وجہ سے دوسرے دین کا اس کی سچائی کی علامات ظاہر ہونے کے باوجود انکار کرے۔ اور اپنے بُرے کو نیک اور اپنے غیر کے نیک کو بُرا سمجھے اور یہ امر مردود اور معیوب ہے۔ اور انہیں ان دونوں معنوں کی تمیز نہیں۔ تعصب باطل کو تصلب حق خیال کرتے ہیں۔ اور اس کے حاصل ہونے پر تکبر اور فخر کرتے ہیں۔ اور اگر وہ کہیں کہ جب ہم ابدی لعنتی اور بارگاہِ خداوندی کے

دُھتکارے ہوئے ہیں' خطاب کو قبول کرنے اور حق کو سمجھنے کی صلاحیت ہمارے دِلوں سے سلب ہو چکی تو ہم پر کیا گناہ؟ ہم تو معذور ہو گئے۔ ہم کہتے ہیں کہ ان کا یہ عذر نہیں سنا جائے گا۔ کیونکہ اگر یہ حالت ابتدا سے ہی ان کے کام اور مداخلت کے بغیر ان کے دِلوں میں پیدا ہو جاتی تو لازماً معذور ہوتے لیکن یہ حالت بارگاہِ خداوندی سے ابتدا ہی سے ان پر ڈالی نہیں گئی بلکہ

بِكُفْرِهِمْ ان کے کفر کی وجہ سے کیونکہ جب بھی انہوں نے ایک معجزے' ایک رسول علیہ السلام اور ایک حکمِ الٰہی کا انکار کیا تو ان کے دِلوں میں ایک قساوت پیدا ہو گئی۔ اور جب دوسری بار معجزے اور دوسرے رسول علیہ السلام کا انکار کیا تو وہ قساوت بڑھ گئی۔ یہاں تک۔ کہ سختی اور کثافت کی سرحد پر پہنچ گئی جس طرح کہ موسمِ سرما میں ٹھنڈی ہوا کی وجہ سے پانی میں کچھ کثافت اور سختی پیدا ہو جاتی ہے۔ اور جب بار بار وہ سرد ہوا لگتی ہے' کثافت زیادہ بڑھتی ہے۔ یہاں تک کہ پتھر کی طرح سخت ہو جاتا ہے۔ اور کسی چیز سے بالکل متاثر نہیں ہوتا۔ اور بندے کے اختیار کی بدولت جو کچھ لعنت اور مقاماتِ رحمت سے دُوری ہوتی ہے' وہ عذر کی جگہ نہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ ان میں سے اکثر کتاب اور رسول پر ایمان نہیں رکھتے۔

فَقَلِيلًا مَّا يُؤْمِنُونَ پس بہت کم ایمان لاتے ہیں حضرت موسیٰ علیہ السلام اور تورات پر جو کہ ان دونوں پر ایمان لانے کے مدعی ہیں۔

دل کی چار قسمیں ہیں

امام احمد نے سندِ صحیح سے حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ دل کی چار قسمیں ہیں: ایک دل صاف ہے۔ اور اس میں چراغ روشن ہے۔ اور ایک دل وہ ہے۔ جس پر غلاف پڑا ہے۔ اور غلاف کے اوپر سے مضبوط رسی سے بند کیا ہوا ہے۔ اور ایک دل اُلٹا ہوا۔ اور ایک دل کے دو رنگ ہیں اس کی ایک سطح سفید اور ایک سطح سیاہ ہے۔ صاف دل ایمان والا دل ہے۔ اور روشن چراغ نورِ ایمان ہے۔ اور غلاف والا دل کافر کا دل ہے۔ اور اُلٹا دل منافق کا دل ہے۔ جس نے معرفت کے بعد انکار کیا ہے۔ اور دو رنگوں والا دل وہ ہے۔ جس میں ایمان اور نفاق دونوں

جمع ہوں اور اس دل میں ایمان کی مثال سبزے کی طرح ہے کہ اسے پاک پانی مدد دیتا ہے۔ اور اُگاتا ہے۔ اور اس دل میں نفاق کی مثال ایک ناسور کی طرح ہے کہ دَم بدم اس میں سے پیپ اور خون نکلتا ہے۔ ان دونوں طرفوں سے جو طرف غلبہ کر لے دوسری کے احکام کو مغلوب کر دیتی ہے۔ اور اس حدیث کے مضمون کو ابن ابی شیبہ ابن ابی الدنیا اور ابن جریر نے حذیفہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ فرمایا ہے کہ القلوب اربعة قلب اغلف فذالك قلب الكافر وقلب اجرد فيه مثل السراج فذالك قلب المؤمن۔ وقلب منكوس فذالك قلب المنافق۔ عرف ثم انكر۔ وقلب مصفح فيه ايمان ونفاق فمثل الايمان فيه كمثل شجرة يمدها ماء طيب۔ و مثل النفاق كمثل قرحة يمدها القيح والدم فاى المدتين غلبت على الاخرى غلبت عليه۔

اور حاکم نے سند صحیح کے ساتھ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے روایت کی کہ گناہ اور خواہشات دل پر وارد ہوتے ہیں۔ تو جس دل نے انکار کیا' ایک سفید نقطہ اس دل میں پیدا ہو جاتا ہے۔ اور جو دل انکار نہیں کرتا' ایک سیاہ نقطہ اس دل میں پیدا ہو جاتا ہے۔ پھر اگر دوسری بار وہی گناہ یا کوئی اور گناہ اس کے سامنے آیا اور اس نے اس گناہ کا بھی انکار کیا۔ اس کی سفیدی زیادہ ہوئی حتیٰ کہ خالص سفیدی رونما ہوئی پھر اسے کوئی گناہ نقصان نہیں دیتا۔ اور اگر دوسری بار بھی انکار نہیں کیا' اس کی سیاہی زیادہ ہوئی حتیٰ کہ رفتہ رفتہ سیاہ ہو جاتا ہے۔ اور اُلٹا ہو جاتا ہے۔ پس وہ حق کو حق نہیں سمجھتا اور باطل کو باطل نہیں جانتا اور اسی مضمون کو بیہقی نے شعب الایمان میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم سے روایت کیا۔ قال الايمان يبد ولمظة بيضاء فى القلب فكما ازداد الايمان عظما ازداد ذلك البياض فاذا استكمل الايمان ابيض القلب كله وان النفاق يبد ولمظة سوداء فى القلب كلما ازداد النفاق عظما ازداد ذالك السواد۔ فاذا استكمل النفاق اسود القلب كله وايم الله لو شققتم عن قلب مومن لوجدتموه ابيض ولو شققتم عن قلب منافق لوجدتموه اسود فرمایا کہ ایمان کی برکت سے دل میں سفید نقطہ ظاہر ہوتا ہے جب بھی ایمان میں عظمت آتی ہے وہ سفیدی زیادہ ہو جاتی

ہے۔ تو جب ایمان درجہ کمال کو پہنچتا ہے سارا دل سفید ہو جاتا ہے۔ اور بے شک نفاق سے دل میں سیاہ داغ پڑ جاتا ہے۔ جیسے جیسے نفاق بڑھتا ہے وہ سیاہی بھی زیادہ ہوتی جاتی ہے۔ تو جب نفاق کامل ہو جاتا ہے سارے کا سارا دل سیاہ ہو جاتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی قسم اگر مردِ مومن کے دل کو کھولو تو اسے سفید پاؤ گے۔ اور اگر تم منافق کا دل چیرو تو اس کا دل سیاہ پاؤ گے۔

اور اس بات پر دلیل کہ یہودیوں کی اپنے دین میں سخت تعصب باطل اور حق پوشی کے زمرے سے ہے یہ ہے کہ انہوں نے پیغمبر وقت علیہ السلام پر دیدہ دانستہ اور اس کی سچائی کو پہچانتے ہوئے سرکشی کی اور عناد کی راہ اختیار کی اور اس کی تفصیل یہ ہے کہ

وَلَمَّا جَآءَهُمْ كِتَابٌ اور جب ان کے پاس کوئی کتاب آئی انہوں نے جان لیا کہ وہ کتاب مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے۔ کیونکہ بلیغ انسان اس کے مقابلہ سے عاجز ہو گئے۔ نیز انہوں نے دیکھا کہ وہ کتاب مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ اس کے موافق ہے جو ان کے پاس ہے۔ گزشتہ انبیاء علیہم السلام کی کتابوں سے حالانکہ جس وہ شخص پر یہ کتاب اُتری وہ ان کتابوں سے متعارف نہیں۔ عربی رسم الخط جو کہ اس کے ملک میں رائج تھا نہیں لکھ سکتا تھا۔ چہ جائیکہ خط عبرانی۔ اور عبارت عربی کو لکھے ہوئے سے نہیں پڑھ سکتا چہ جائیکہ لغت عبری۔

نام پاک سے توسل اور فتح و نصرت

وَكَانُوْا مِنْ قَبْلُ اور اس کتاب کے نزول سے پہلے یہودی اس شخصیت کی نبوت اور ان کی تمام نبیوں علیہم السلام پر بزرگی کے معترف اور اقراری تھے۔ کیونکہ جنگ اور اپنی شکست کے خوف کے وقت يَسْتَفْتِحُوْنَ اس پیغمبر علیہ السلام کے نام کے ساتھ بارگاہِ الوہیت سے فتح و نصرت طلب کرتے تھے۔ اور جانتے تھے کہ ان کا نام پاک اس قدر بابرکت ہے کہ اس کے ذکر اور اس سے وسیلہ لینے کی وجہ سے فتح و نصرت حاصل ہوتی ہے۔

عَلَى الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ان لوگوں پر جنہوں نے کفر اختیار کیا۔ غیر اللہ کی پوجا کر کے شرک۔ اور رسل علیہم السلام کا انکار کیا۔ تو گویا رسول علیہ السلام کے نام کو تمام رسل علیہم

السلام کے لئے قوت دینے والا اور مدد کرنے والا جانتے تھے۔ اور یہ یقین رکھتے تھے کہ یہ رسول علیہ السلام کافروں کو قتل کرنے' باطل دینوں کو مٹانے میں اس مرتبہ پر فائز ہیں کہ آپ کا نام لشکر جرار رکھتا ہے۔

ابو نعیم' بیہقی اور حاکم نے صحیح سندوں اور متعدد طریقوں کے ساتھ روایت کی ہے کہ مدینہ کے یہودی اور خیبر کے یہودی جب بھی عرب کے بت پرستوں بنی اسد' بنی غطفان' جہینہ اور عذرہ کے ساتھ جنگ کرتے تھے' مغلوب ہو جاتے تھے۔ اور شکست کھا جاتے تھے۔ مجبور ہو کر انہوں نے اپنے عقلمندوں اور کتاب جاننے والوں کی طرف رجوع کیا اور انہوں نے کافی جستجو کے بعد اپنے سپاہیوں کو یہ دعا سکھائی کہ جنگ کے وقت پڑھا کریں اس کے بعد وہ مغلوب نہ ہوئے۔ اور فتحیاب اور کامیاب ہوئے۔ دعا یہ ہے کہ **اللهم ربنا انا نسئلك بحق احمد النبي الامي الذي وعدتنا ان تخرجه لنا في آخر الزمان و بكتابك الذي تنزل عليه آخر ما ينزل ان تنصرنا على اعدائنا** اے اللہ! ہم تجھ سے سوال کرتے ہیں حضرت احمد نبی اُمی کے وسیلہ سے جنہیں تو نے ہمارے لئے آخری زمانے میں بھیجنے کا وعدہ فرمایا۔ اور تیری اس کتاب کے وسیلہ سے جسے تو ان پر آخری کتاب کی شکل میں نازل فرمائے گا کہ ہمارے دشمنوں پر ہماری مدد فرما۔

(اقول وباللہ التوفیق ابن تیمیہ' ابن عبدالوہاب نجدی اور ان کے اذناب واتباع غور کریں کہ مسئلہ توسل نیا نہیں بلکہ اُمم گزشتہ میں بھی جاری تھا۔ اور جاری رہا ہے۔ بلکہ ان سے بہت پہلے ابتدائے آفرینش انسانیت کے وقت بھی توسل ہوتا تھا۔ چنانچہ اسی تفسیر میں فَتَلَقّٰٓى اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ کے تحت مفسر علام رحمۃ اللہ نے معجم للطبرانی۔ حاکم' ابو نعیم اور بیہقی کے حوالہ سے حضرت آدم علیہ السلام کی دعا نقل فرمائی کہ **اسئلك بحق محمد الاغفرت لي**۔ معلوم ہوا کہ مقربین بارگاہ خداوندی سے توسل کرنا حضرت آدم خلیفۃ اللہ مسجود ملائکہ سے شروع ہوا۔ ان کی اولاد کا فرض ہے کہ اپنے جد امجد کے طریق خیر کو اپنائیں تا کہ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ سے عملی وابستگی کا شرف حاصل ہو۔ محمد محفوظ الحق غفرلہ ولوالدیہ)

نیز ان تمام مذکور محدثوں نے اور امام احمد اور طبرانی نے سلمہ بن قیس سے روایت کی ہے کہ ہمارے محلہ میں جو کہ بنوعبدالاشہل کا محلہ تھا' ایک یہودی سکونت پذیر تھا۔ ایک دن اپنے گھر سے نکلا اور بنوعبدالاشہل کی محفل کی طرف گزرا اور کھڑا ہو کر بلند آواز سے کہنے لگا اور میں ان دنوں چھوٹی عمر کا تھا کہ اے اہلِ شرک اور اے بت پرستو! تمہیں معلوم نہیں کہ موت کے بعد کیا ہونے والا ہے؟ ہم سب نے کہا کہ ایک بار کہو کہ کیا ہوگا؟ اس نے کہا کہ موت کے بعد سب لوگ زندہ ہوں گے۔ اور جنت اور دوزخ نمودار ہوگی۔ اور حساب' اعمال اور میزان کا سلسلہ ہوگا۔ اور ہر کسی کو اپنے عمل کے مطابق بدلہ ملے گا۔ ہم نے کہا یہ کیا غیر ممکن باتیں کرتا ہے؟ اس نے کہا خدا کی قسم اگر اس روز کی آگ کے عوض مجھے دنیا میں آگ سے پُر ایک بہت بڑے تنور میں ڈال کر بند کر دیں اور اس آگ سے نجات دیں تو میری عین آرزو کے مطابق ہے۔ ہم نے کہا تیرے سچ کہنے کی کیا دلیل ہے؟ اس نے کہا میرے اس کلام کی دلیل ایک رسول علیہ السلام ہے۔ جو کہ عنقریب مکہ اور یمن کی طرف سے آئے گا۔ اور جو کچھ میں کہتا ہوں' تمہیں ثابت کر دے گا۔ ہم نے کہا کہ وہ پیغمبر (علیہ السلام) کب پہنچے گا؟ اس یہودی نے دائیں بائیں نگاہ ڈال کر میری طرف اشارہ کیا اور کہا کہ اگر اس نوجوان کی زندگی دراز ہوئی تو اس رسول علیہ السلام کا زمانہ ضرور آئے گا۔ سلمہ بن قیس کہتے ہیں کہ چند روز نہ گزرے کہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیغمبری کی خبر مشہور ہوگئی۔ اور جب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مدینہ عالیہ میں جلوہ افروز ہوئے' ہم سب ایمان سے مشرف ہوئے۔ اور اس نے کفر' سرکشی اور حسد کیا' ہم اسے ملامت کرتے تھے۔ اور کہتے تھے کہ اے فلاں! تجھے کیا بلا پڑی کہ کافر ہوگیا؟ تجھے یاد نہیں کہ تو ہمیں کیا کہتا تھا؟ وہ کہتا کہ کیوں نہیں' مجھے یاد ہے۔ لیکن یہ شخص وہ پیغمبر نہیں ہے۔ جس کا وعدہ کیا گیا ہے۔

حاصلِ کلام یہ کہ اس رسول علیہ السلام اور اس کتاب کے آنے سے پہلے یہودی ان دونوں کے احوال کو کلی طور پر جانتے تھے۔ اور ان دونوں کے آنے کے بعد جزوی طور پر بھی انہیں اس حد تک علم حاصل ہو کہ اسے معرفت اور پہچان کہا جا سکتا ہے۔

فَلَمَّا جَآءَهُمْ مَّا عَرَفُوْا پس جب ان کے پاس وہ چیز آ گئی جسے انہوں نے پہچان

لیا۔ اور اس کے تمام اوصاف کو جو کہ پہلے ہی جانتے تھے اس پر درست پایا۔ پیغمبر علیہ السلام کی ذات' جائے ولادت' مکان اور ان کے شمائل و اخلاق' وہ واقعات جو کہ تیرہ (۱۳) سال کی مدت میں ظاہر ہو چکے تھے۔ اور آپ پر نازل کی گئی کتاب لفظی اور معنوی اعجاز کے اعتبار سے اور آپ کی شریعت کے اطوار جو کہ باریک حکمتوں اور عام لوگوں کی مصلحتوں کو خوب شامل ہیں۔

كَفَرُوْا بِهٖ تو انہوں نے اس چیز کے ساتھ کفر کیا صرف عناد اور حسد کی وجہ سے اور یہی تعصب باطل کی علامت ہے۔ جو کہ خود گزشتہ لعنت کے آثار میں سے بھی ہے۔ اور دوسری لاحق ہونے والی لعنت بھی اس کے آثار سے ہے۔

فَلَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ پس خدا کی لعنت ہے ان کافروں پر۔ جو کہ دیدہ دانستہ حق پوشی کرتے ہیں۔ اور سرکشی' عناد اور حسد کی وجہ سے واضح حق کا انکار کرتے ہیں۔ حالانکہ ان کے ذمہ خصوصاً تورات کے پختہ وعدوں اور گزشتہ رسل علیہ السلام کے معاہدوں کی وجہ سے واجب اور لازم تھا کہ اس دین اور اس رسول علیہ السلام کی پوری کوشش اور ہمت کے ساتھ مدد کرتے۔ تاکہ ان کی جانیں ان معاہدوں اور پختہ وعدوں کو پورا کرنے کے مطالبہ سے نجات پائیں۔ پس وہ اس معاملہ میں اس غلام کی طرح ہو گئے جو کہ مال کے بدلے گروی تھا اگر کمائی کے اسباب سے وہ مال حاصل کر کے خلاصی پاتا تو ممکن تھا مگر اس کم عقل غلام نے خلاصی کا طریقہ یوں سوچا کہ اپنے ذمہ اس مال کے ثبوت کا انکار کرنے لگا اور کہنے لگا کہ اس شخص کا جس نے مجھے گروی کر رکھا ہے' مجھ پر کوئی حق نہیں ہے۔ بلکہ مال کے دعویٰ میں جھوٹا ہے۔ اور اس کی دستاویز جعلی ہے۔ اسی طرح انہوں نے اس رسول علیہ السلام کی نبوت اور اس دین کے انکار کو اور اس کی صداقت کو باطل کرنے کو ان معاہدوں سے نجات پانے کا وسیلہ بنا لیا جنہیں پورا کرنا واجب تھا۔ پس بِئْسَمَا اشْتَرَوْا بِهٖ اَنْفُسَهُمْ بہت بُری ہے وہ چیز جس کے بدلے انہوں نے اپنی جانوں کو خرید لیا کیونکہ ان کی جانیں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مدد اور پیروی کرنے کے عہد کو پورا کرنے کی خدا تعالیٰ کی دی ہوئی ذمہ داری کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے عذاب میں گروی تھیں۔ وہ چاہتے تھے کہ ان

جانوں کو اس بندھن سے آزاد کرائیں۔ خلاصی کی وجہ اس کے سوا نہ پائی کہ
اَنْ یَّکْفُرُوْا بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ اس چیز کے ساتھ کفر کریں جو اللہ تعالیٰ نے اُتاری۔ تورات میں اس پیغمبر علیہ السلام اور اس دین کی نعتوں اور صفات سے اور قرآن پاک میں آپ کی سچائی کے دلائل سے۔ یہاں تک کہ اس کفر کی وجہ سے نصرت و پیروی کے وجوب کو اپنے ذمہ سے گرادیں۔ کیونکہ نصرت واتباع کا وجوب اس پیغمبر علیہ السلام اور اس دین کی پہچان پر موقوف تھا۔ اور آپ کی صداقت اور سچائی کے اعتقاد کی فرع تھا۔ اور جب یہ پہچان اور یہ عقیدہ حاصل نہ ہوا' وہ وجوب بھی ثابت نہ ہوا۔ اور کاش کہ انہیں واقعی ناواقف ہونا اس کفر و انکار پر لاتا اور حقیقت میں اس رسول علیہ السلام کی صداقت اور اس دین کا حق ہونا انہیں حاصل نہ ہوتا کہ اس صورت میں وہ نصوص تورات اور دلائل قرآن پاک میں کوتاہ نظری اور غور نہ کرنے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے ایک غضب کے مستحق ہونے جیسے کہ اُمی کافر تھے۔ لیکن انہیں حقیقت میں یہ ناواقفیت اور نادانی نہ تھی بلکہ انہوں نے جو کچھ کیا
بَغْيًا اللہ تعالیٰ پر انکار کرتے اور اس بات کو بُرا جانتے ہوئے کہ اَنْ یُّنَزِّلَ اللّٰهُ اللہ تعالیٰ اپنی وحی نازل فرمائے جو کہ مِنْ فَضْلِهٖ اللہ تعالیٰ کے فضل اور عطا کی جنس سے ہے۔ نہ کہ عمل نیک کی اُجرت کے طور پر اور نہ ہی انسان کے کمائے ہوئے کمالات کی جنس سے۔ پس اسے حق پہنچتا ہے اسے نازل فرمائے عَلٰی مَنْ یَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ اپنے بندوں میں سے جس پر چاہے۔ بغیر کسی گزشتہ عمل اور استحقاق کے پس وہ اس انکار کی بناء پر چند وجہوں سے کفر میں گرے۔ اوّل وجہ یہ ہے کہ انہوں نے اپنی کتاب سے کفر کیا اور اس کی نصوص کو بدل دیا۔ دوسری وجہ یہ کہ حق ہونے کے دلائل واضح ہونے کے باوجود قرآن پاک کا انکار کیا' تیسری وجہ یہ کہ اللہ تعالیٰ کے افعال میں سے ایک عمدہ فعل کا اپنی ناقص عقل سے انکار کیا اور اسے بُرا جانا۔ پس گویا انہوں نے اللہ تعالیٰ پر اعتراض کیا کہ یہاں وحی بھیجنا نہیں چاہیے تھی۔ چوتھی وجہ یہ کہ پیغمبر وقت علیہ السلام کے ساتھ حسد کی بناء پر انہیں رسالت کے قابل نہ سمجھا۔ اور ان کے کمالات سے چشم پوشی کی۔ اور صرف اس لیے کہ فرقہ بنی اسرائیل سے نہ تھے گرچہ خلقی اور عملی کمالات کے جامع تھے' آپ کا اعتبار نہ کیا۔ اور اپنے آپ کو صرف اس

لیے کہ بنی اسرائیل کے فرقہ سے ہیں' مرتبہ رسالت کے لائق بنالیا۔ پس اہل کو نااہل اور نااہل کو اہل قرار دے دیا۔

فَبَآءُ وْ اپس وہ سوداگری اور تجارت کے مقام سے پھر گئے جس کا انہوں نے اپنی جانوں کو چھڑانے کے لیے قصد کیا تھا بِغَضَبٍ عَلٰی غَضَبٍ بارگاہِ خداوندی کے غضب کے ساتھ جو کہ اس بارگاہ کے ایک اور غضب کے اوپر ہے۔ گویا وہ غضب الٰہی کو تہ بہ تہ کما کر لائے۔ اور عرب لوگ اس ترکیب کو کسی چیز کی کثرت بیان کرنے کے مقام میں استعمال کرتے ہیں۔ جیسا کہ عرف میں رائج ہے کہ کہتے ہیں نور علی نور۔ اس کی حاجت نہیں ہے کہ صرف دو قسم کے غضب کو اس کے استعمال کرنے کی وقت ملحوظ رکھیں بلکہ وجوہ غضب کی کثرت جو کہ پہلے ذکر کی گئی اسے استعمال کرنے کے وقت منظور ہے۔ اور جب انہوں نے ان وجوہ کفر کی وجہ سے غضب الٰہی کے ڈھیروں کے ڈھیر اپنے اُوپر اُٹھالیے ہیں تو قیامت کے دن اپنے عذاب کے ہلکا ہونے یا اس عذاب کے چند دنوں میں منقطع ہو جانے کا اعتقاد بہت بعید از امکان ہے۔ اور ان کا عذاب ہلکا اور منقطع کس طرح ہو حالانکہ انہوں نے رسل علیہم السلام کے قتل اور تکذیب کی وجہ سے ایسی شخصیتوں کو ذلیل کرنے کا قصد کیا ہے جنہیں اللہ تعالیٰ نے دونوں جہانوں میں عزت عطا فرمائی ہے۔ اور معجزات کے ساتھ ان کی تصدیق فرمائی ہے۔ پس کثرت غضب کی وجوہ سے قطع نظر ان میں ایک وجہ غضب جو کہ کفر ہے بلاشبہ ثابت ہے۔

وَلِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ اور کافروں کے ایک عذاب ہے' ذلیل کرنے والا۔ جو کہ چند دن گزرنے پر اعزاز کے ساتھ ہرگز نہیں بدلتا۔ اور نہ ہی ہلکا اور خفیف ہوتا ہے۔ یہاں سے معلوم ہوا کہ ہر عذاب ذلیل کرنے والا نہیں ہوتا جیسے کہ نافرمان مسلمانوں کا عذاب جو کہ اہانت اور ذلیل کرنے کے لیے نہیں صرف گناہوں کی آلائش سے پاک کرنے کے لیے ہے۔ اللہ تعالیٰ کے اس قول کی دلیل کے ساتھ وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ پس ایمان والے گنہگاروں کا عذاب ڈانٹ ڈپٹ یا طمانچہ مارنے کے قبیل سے ہے۔ جیسا کہ مشفق باپ اپنے بیٹے کے ساتھ اس کے بھلے کے لیے کرتا ہے یا ختنے' یا

حجامت اور حمام میں مَل مَل کر دھونے کے قبیل سے ہے کہ اسے میل کچیل سے پاک کرنے کے لیے عمل میں لایا جاتا ہے۔

اہل کتاب کے کفر کے اسباب

یہاں جاننا چاہیے کہ اس رسول علیہ السلام کے حالات کو جاننے اور سابقہ انبیاء علیہم السلام کی کتابوں کی نصوص کی رو سے آپ کے برحق ہونے کے دلائل واضح ہونے کے باوجود اہلِ کتاب کے کفر کرنے اور حضور کی پیروی اور موافقت نہ کرنے کا باعث چند چیزیں تھیں۔ پہلی چیز یہ کہ ان میں سے بعض کا گمان یہ تھا کہ چاہیے کہ نبی آخرالزمان بنی اسرائیل سے ہو۔ کیونکہ خاندانِ رسالت یہی خاندان تھا۔ اور چونکہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بنی اسماعیل سے تھے اس لیے انہیں آپ کی متابعت گوارا نہ ہوئی۔ اور ان بیشتر عوام اور جہاں کے کفر کا یہی باعث تھا۔ کیونکہ خاندان پرستی ان کا شیوہ ہے۔ اور مرتبوں کے اہل ہونے کا موروثی خاندانوں میں منحصر ہونے کا اعتقاد رکھتے ہیں۔ دوسری چیز یہ ہے کہ ان میں سے بعض اپنے آپ کو اہلِ کتاب اور احکامِ الٰہیہ کے جاننے والے قرار دے کر رسل علیہم السلام کی بعثت سے بے پرواہ اور غیر محتاج سمجھتے تھے۔ اور کہتے تھے کہ اگر اس زمانے میں کوئی پیغمبر کا محتاج ہے۔ تو عرب لوگ ہیں۔ کیونکہ ان میں کبھی کتاب نازل نہیں ہوئی اور وہ محض اَن پڑھ ہیں۔ پس اس پیغمبر کی بعثت صرف عربوں کے لیے مخصوص ہے۔ اور جب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں اپنے دین کی دعوت دی اور ان کی کتابوں کے بعض احکام منسوخ فرمادیئے تو ان کے حسد اور تکبر کی رگ پھڑک اُٹھی اور نبوت کے انکار، مقابلہ اور جنگ کرنے کے ساتھ پیش آئے۔

تیسری چیز یہ ہے کہ ان کے علماء اور احبار نے یہ جاننے کے باوجود کہ آپ کی بعثت انسانوں اور جنوں کو عام ہے۔ اور یہ کہ یہ رسول علیہ السلام بنی اسماعیل سے ہوں گے نہ کہ بنی اسرائیل سے اور آپ کی جائے ولادت مکہ معظمہ اور آپ کا قبیلہ قریش ہے۔ سوچا کہ اگر ہم آپ کی پیروی میں قدم رکھتے ہیں تو ہماری سرداری اور کمائی کے ذرائع درہم برہم ہو جائیں گے۔ اور رشوتیں اور نذریں ہدیئے جو کہ ہم ممالک کی رعایا اور بادشاہوں سے لیتے ہیں،

ایک دم سب کے سب ختم ہو جائیں گے۔ ناچار انہوں نے عناد کی راہ اختیار کی اور دیدہ و دانستہ نبوت کے انکار پر ضد باندھی۔ اور قرآن پاک میں ان تینوں گروہوں کا اکٹھے اور جدا جدا ذکر فرمایا جاتا ہے۔ اور ان آیات میں زیادہ تر ان تینوں فرقوں کے حالات کو بیان میں شامل فرمایا گیا ہے۔ کیونکہ ان کے کفر کا اصل مادہ خود پسندی' بلند پروازی' رسالت کے لائق ہونے کو اپنے فرقہ میں منحصر جاننا اور اپنے آپ کو نبیوں رسولوں علیہم السلام سے بے نیاز قرار دینا ہے۔ جس پر لفظ بَغْيًا اَنْ يُّنَزِّلَ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ دلالت کرتا ہے۔

چند بحثیں

باقی رہ گئیں یہاں چند بحثیں جس کے مفسرین درپے ہوئے ہیں۔ پہلی بحث یہ ہے کہ لما کلمہ شرط ہے۔ اور شرط کی ایک جزا اور جواب ہوتا ہے۔ اور یہ کلمہ اس آیت میں دو جگہ استعمال ہوا ہے۔ اوّل وَلَمَّا جَآءَهُمْ كِتٰبٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ اور دوسری فَلَمَّا جَآءَهُمْ مَّا عَرَفُوْا كَفَرُوْا بِهٖ اور اس کی جزا یہاں دوسری جگہ مذکور ہے۔ جو کہ كَفَرُوْا بِهٖ ہے۔ پہلی جگہ میں کوئی ایسی چیز نظر آتی جو کہ جواب بننے کے قابل ہو۔ اس اشکال کی توجیہہ کیا ہو گی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ پہلے مقام میں لما کا جواب محذوف ہے' آنے والی شرط کے قرینہ کی وجہ یعنی وَلَمَّا وَجَآءَهُمْ كِتٰبٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ عَرَفُوْا اَنَّهٗ حَقٌّ فَلَمَّا جَآءَهُمْ مَّا عَرَفُوْا كَفَرُوْا بِهٖ اور بعض اہل عربیت نے کہا ہے کہ درحقیقت اس لفظ کا جواب کفروا بہ ہے۔ جو کہ ظاہر کے اعتبار سے فَلَمَّا جَآءَهُمْ مَّا عَرَفُوْا کا جواب واقع ہوا اور اس کی وجہ یہ ہے کہ دوسرے مقام میں لما صرف تاکید کے لیے لاتے ہیں۔ کلام کے طویل ہونے کی وجہ سے اور اس کے اعتبار سے کہ سامع کو آیت کی ابتدا میں واقع کلمہ لما سے غفلت ہو گئی جیسا کہ فَلَا تَحْسَبَنَّهُمْ بِمَفَازَةٍ مِّنَ الْعَذَابِ میں لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَفْرَحُوْنَ (آل عمران آیت ۱۸۸) کے بعد قرار دیا گیا ہے۔ اور اس توجیہ میں ایک باریک خدشہ ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ لما کو تکریر اور تاکید پر محمول کرنا اس وقت مناسب ہوتا ہے جبکہ اس کے بعد کا مدلول اور پہلے مقام میں لما کے

بعد کا مدلول کی بیشی کے بغیر ایک چیز ہو جبکہ یہاں دونوں مدلول کے درمیان باہمی غیریت اور فرق واضح ہے۔ کیونکہ گزشتہ خبروں کی تصدیق کرنے والی کتاب کا آنا بغیر غور وفکر کے ان کی معرفت کو لازم نہیں کرتا مگر یہ کہ معرفت کو قریب ہونے اور معرفت کے قریب استعداد پر محمول کیا جائے۔ اور اس میں بعد ہے' جیسا کہ مخفی نہیں۔

اور ان میں سے بعض نے کہا ہے مقام اول میں لما کا جواب جزائے آئندہ کے قرینے سے محذوف ہے۔ یعنی کذبوہ واستھانوا یعنی اسے جھٹلایا اور برا سمجھا۔ کَفَرُوْا بِہٖ کی دلیل سے۔ اور اس توجیہ میں بھی خلل ہے۔ کیونکہ اس صورت میں فلما حرف تفریع و تعقیب کے ساتھ مناسب نہیں ہوتا جیسا کہ ارباب سلیقہ پر پوشیدہ نہیں ہے۔ نیز تکذیب اور استھانت عین کفر ہے پس ایک جزا کو عموم اور خصوص کے ساتھ پر دو متغایر شرطوں پر مرتب کرنا لازم آتا ہے۔ حالانکہ عام کا لازم خاص کا لازم ہے۔

بیع اور شرا کے معنی کی تحقیق

دوسری بحث یہ ہے کہ اشتراء لغت عرب میں خریدنے کے معنی میں ہے۔ اور ظاہر ہے کہ یہودیوں نے کفر کی وجہ سے اپنی جانوں کو برباد کیا نہ کہ خریدا تو بِئْسَمَا اشْتَرَوْا بِہٖ اَنْفُسَھُمْ کا معنی کیا ہوگا۔؟ اس کا جواب یہ ہے کہ پہلے دوران تفسیر گزر چکا کہ یہودیوں نے اس کفر سے قصد کیا کہ اپنی جانوں کو اس عہد و پیاں میں گروی ہونے سے نجات دیں جو کہ انہوں نے رسول علیہ السلام کی مدد اور پیروی کرنے پر کیا تھا۔ اور جو کوئی کسی چیز کو گروی ہونے سے چھڑاتا ہے اس چیز کی خریداری کرتا ہے۔ پس اس معاملہ کی تعبیر اشتراء کے ساتھ مناسب ہوئی۔ اور بعض مفسرین نے کہا ہے کہ اِشْتَرَوْا بِہٖ بمعنی باعوا ہے اس طریقے سے کہ اشتری بمعنی شری ہے مزید فیہ کو مجرد کے معنوں میں استعمال کرنے کے طریقے پر اور شری بمعنی بیع ہے۔ جیسا کہ آیت وَشَرَوْهُ بِثَمَنٍ بَخْسٍ اور آیت وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْتَرِىْ نَفْسَهُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ میں ہے۔ اور چونکہ انہوں نے کفر کو طمع اور حسد کی وجہ سے اختیار کیا۔ گویا انہوں نے اپنے آپ کو ہلاکت کے میدان میں ڈالا اور دوزخ پر مقرر فرشتوں کے ہاتھوں فروخت کر دیا لیکن اس توجیہ میں عرف اور استعمال کی

مخالفت لازم آتی ہے۔ کیونکہ اہلِ عربیت نے یوں کہا ہے کہ اشترا اور ابتیاع عرب کے استعمال میں خرید کے ساتھ خاص ہے۔ اور بیع اور شری فروخت کرنے کے ساتھ اور مبایعت اور مشارات دونوں معاملوں میں مشترک ہے۔

حاصلِ کلام یہ کہ اس بات پر کہ یہودیوں نے یہ خسارے کا کام صرف حسد اور سرکشی کے طور پر کیا ہے نہ کہ غلط فہمی یا اس چیز میں کسی شک اور شبہ کی بناء پر جو اس رسول علیہ السلام کو وحی اور شریعت سے عطا فرمائی گئی۔ صریح دلیل یہ ہے کہ

وَاِذَا قِیْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ اور جب انہیں کہا جاتا ہے کہ ایمان لاؤ اس پر جو اللہ تعالیٰ نے اُتارا۔ خواہ توراتؔ ہو خواہ انجیل' خواہ فرقانِ حمید کیونکہ وجوب ایمان کا سبب عبوریت اور ربوبیت کا تعلق ہے۔ بندے کو واجب ہے کہ اپنے مالک کے فرمان کی اطاعت کرے خواہ وہ فرمان اپنے فرقہ کے ذریعے پہنچے یا غیر کے وسیلے سے۔ اور یہ علت ان تمام کتابوں میں مشترک ہے۔ جواب میں قَالُوْا نُؤْمِنُ بِمَآ اُنْزِلَ عَلَیْنَا کہتے ہیں کہ ہم ایمان لاتے ہیں اس پر جو ہمارے فرقہ پر نازل کیا گیا ہے۔ جس سے مراد بنی اسرائیل ہیں۔ اور اس قید سے اس سے پرہیز کرتے ہیں جو کہ بنی اسرائیل کے غیر پر نازل ہوا ہے۔ جیسے انجیل اور فرقانِ حمید۔ پس وہ غیر بنی اسرائیل پر کتاب نازل کرنے کو بُرا جانتے ہیں۔ اور ان انبیاء علیہم السلام کے ساتھ حسد کرتے ہیں جنہیں یہ کتابیں دی گئی ہیں۔

وَیَكْفُرُوْنَ بِمَا وَرَآءَهٗ اور وہ اس کے ساتھ کفر کرتے ہیں جو کہ ان کی کتاب کے سوا ہے۔ باوجودیکہ اس پر ایمان لانے کا موجب ان کے اعتقاد کے مطابق بھی ثابت ہے وھو اور وہ یہ ہے کہ وہ کتابیں فی نفسہا الْحَقُّ حق اور واقع کے مطابق ہیں' ان کے مضامین اور دلائل پر نظر کرتے ہوئے۔ اور اس کے باوجود مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَهُمْ اس کتاب کے موافق ہے جو ان کے پاس ہے۔ جس پر وہ ایمان رکھنے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ جب کوئی چیز فی نفسہ دلیل پر نظر کرتے ہوئے حق اور واقع کے مطابق ہو۔ اور اس کے باوجود اس کے موافق ہو جس پر وہ یقین رکھتے ہیں تو اس چیز پر یقین نہ کرنا تعصب باطن اور عناد کی دلیل ہے۔ کیونکہ مطابق کے مطابق' مطابق ہوتا ہے۔ پس اگر ان کے کلام پر تم غور کرو تو

صریح تناقض ظاہر ہوتا ہے۔ کیونکہ وہ تورات پر ایمان کا دعویٰ کرتے ہیں۔ اور جو چیز تورات کے موافق ہے اس کا انکار کرتے ہیں۔ پس حقیقت میں ان پر تورات کا انکار اور انجیل وفرقاں پر ایمان لازم آتا ہے اسی وجہ سے ان کے کلام جس میں صریح تناقض اور تصادم ہے کے جواب کی ضرورت نہیں۔ اور اگر تو چاہے کہ بطریق تنزل ان کے جواب میں مشغول ہو تو انہیں اس دعویٰ کی تعلیم دے کر جواب میں قُلْ کہہ۔ کہ اگر تمہارا تورات پر ایمان صحیح ہے۔ تو تورات کے ضمن میں ہر نبی علیہ السلام پر ایمان لانے کا عہد ہے۔ جو کہ اس کے بعد تشریف لائیں۔ پس تمہیں کیا ہوا کہ اپنے زمانے کے انبیاء علیہم السلام پر ایمان نہیں لاتے ہو۔ اور اگر تمہیں تورات سے دلیل لینا اس سے منع کرتا ہے کہ تورات کے بعض احکام کو منسوخ کرنے والے نبی علیہ السلام پر ایمان لاؤ۔

فَلِمَ تَقْتُلُوْنَ اَنْبِيَآءَ اللّٰهِ مِنْ قَبْلُ پس تم نے ان اللہ کے رسولوں علیہم السلام کو کیوں قتل کیا جو کہ اس سے پہلے گزر چکے ہیں۔ جبکہ انہوں نے تورات کے احکام میں سے کسی ایک حکم کو بھی ہے۔ بلکہ وہ احکام تورات کی ترویج اور حضرت موسیٰ علیٰ نبینا وعلیہ السلام کی شریعت کی تائید کے مبعوث ہوتے تھے۔ جیسے حضرت شعیا' حضرت زکریا اور حضرت یحییٰ علیٰ نبینا وعلیہم الصلوٰۃ والسلام

اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ اگر تمہارا تورات اور شریعت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان کا دعویٰ صحیح ہے۔ اور احتمال ہے کہ آیت کا معنی یوں ہو کہ جب انہیں کہا جاتا ہے کہ ایمان لاؤ اس پر جو کہ اللہ تعالیٰ نے اس زمانے میں اُتارا یعنی قرآن مجید تو کہتے ہیں کہ ہم اسی قدر پر ایمان لاتے ہیں جو کہ قرآن کے مضامین اور احکام سے ہم پر اُتری ہے۔ یعنی اس قدر پر جو کہ ہماری کتابوں اور اس کتاب میں مشترک ہے۔ اور اس قدر مشترک کے علاوہ جو کچھ ہے اس سے کفر کرتے ہیں۔ جیسے وہ احکام جو کہ تورات کو منسوخ کرتے ہیں۔ حالانکہ وہ بھی حق ہونے اور تورات کے اس کی تصدیق کرنے میں اس قدر کے برابر ہیں جن پر وہ یقین کرتے ہیں۔ پس ان کے نزدیک ایمان اور کفر کا مدار اس پر ہوا کہ جو تورات کے حکم کے تابع اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت کے مطابق ہو قبول کر لینا چاہیے ورنہ رد کر دینا

چاہیے۔ پس انہیں جواب میں کہیے کہ اگر وجوب ایمان کی علت تمہارے نزدیک یہی ہے۔ تو گزشتہ رسل علیہم السلام جنہوں نے تورات کی مخالفت نہیں کی ہے۔ اور اس کے احکام کو منسوخ کرنے والے انہیں تم نے کیوں قتل کیا اگر تم تورات پر ایمان رکھتے تھے۔

تفسیری نکتہ

باقی رہ گیا یہاں اس نکتہ کا بیان کہ تَقْتُلُوْنَ کو مضارع کے صیغہ کے ساتھ کیوں لایا گیا۔ حالانکہ مِنْ قَبْلُ کا لفظ صریح اس بُرے فعل کے زمانہ ماضی میں ہونے پر دلالت کرتا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ کسی شخص کے قتل پر راضی ہونا بھی اس شخص کو قتل کرنے کے حکم میں ہے۔ اور چونکہ حضور علیہ السلام کے ہم عصر یہودی اپنے اسلاف کے اس بُرے فعل پر راضی تھے اس لیے انہیں قاتل قرار دے کر فعل مضارع کی نسبت ان کی طرف کی گئی۔ گویا یوں ارشاد ہوا کہ تم اس زمانے میں گزشتہ انبیاء علیہم السلام کو اپنے اسلاف کے فعل پر راضی ہونے کے طریقے سے کیوں قتل کرتے ہو۔ کیونکہ اس انتہائی بُرے فعل کا وبال جو کہ تمہارے وجود سے بہت طویل زمانہ پہلے گزر چکا اب تمہارے نامۂ اعمال میں لکھا جا رہا ہے۔ بلکہ تمہارا کفر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد ان انبیاء علیہم السلام کے زمانے میں منحصر نہیں ہے جنہیں انہوں نے قتل کیا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں بھی اس سے بھی زیادہ قبیح و شنیع فعل تم سے رونما ہوا۔

وَلَقَدْ جَآءَكُمْ مُّوْسٰى اور تحقیق تمہارے پاس موسیٰ علیہ السلام آئے جن کی شریعت پر تم اپنے آپ کو قائم سمجھتے ہو۔ بلکہ ان کی شریعت پر ایمان کے بہانے سے دوسری برحق شریعتوں کا انکار کرتے ہو۔ بِالْبَیِّنٰتِ ظاہر معجزات کے ساتھ جیسے عصا' ید بیضا اور سمندر کو چیرنا جو کہ اس پر صریح دلالت کرتے تھے کہ الوہیت اور عبادت خاص اللہ تعالیٰ وجل شانہ کے لیے ہے' کسی دوسرے کے لیے اس میں شرکت نہیں۔ اگرچہ ممکنہ کمال کی بلندی کو پہنچ چکا ہو۔

ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ پھر تم نے لایعقل بچھڑے کو معبود بنا لیا۔ مِنْ بَعْدِهٖ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے طور کی طرف جانے کے بعد۔ جو کہ اتنا زیادہ سفر نہ تھا۔ اور وہ بھی تمیں

(۳۰) یا چالیس (۴۰) دن کہ اتنی سی مدت میں نہ تو تمہارے نزدیک ان کے معجزات کی دلالت مقام اعتبار سے گری تھی۔ نہ ان کے لائے ہوئے احکام منسوخ ہوئے تھے۔ نہ وہ منصب نبوت سے معزول ہوئے تھے۔ اور نہ ہی اس جہان سے منتقل ہوئے تھے۔ کہ تم معلم اور مرشد کو نہ پانے کی وجہ سے اِدھر اُدھر بھٹکتے اور غرق ہونے والے کی طرح خس و خاشاک کا وسیلہ ڈھونڈتے تھے۔ پس اس وقت حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کی شریعت پر تمہارا ایمان کہاں چلا گیا تھا؟ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے غائب ہونے کی اس قلیل مدت میں ایک دین کے عمدہ حکم کو جو کہ توحید اور عبادت کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص کرنا ہے' تم نے سامری کے کہنے پر جو کہ زرگری' مکاری اور شعبدہ بازی سے زیادہ نہ تھا اس حکم کی ضد کے ساتھ جو کہ عقل و انصاف کی راہ سے کمال جدائی رکھتی تھی کیونکہ الایعقل بیل کو اور اس کے بچے کی گھڑی گئی مورتی کو جناب ربوبیت کے ساتھ کس مشارکت یا مشابہت کا وہم ہو سکتا ہے کس طرح منسوخ قرار دیا؟ حالانکہ تم حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت کو قابلِ نسخ نہیں جانتے ہو لیکن تم سے یہ بے انصافی بعید نہیں۔ کیونکہ جو کسی چیز کا خوگر ہو جاتا ہے' وہ چیز اس پر بہت ہلکی معلوم ہوتی ہے۔ اگرچہ فی نفسہ وہ چیز انتہائی قبیح اور شنیع ہوتی ہے۔

وَاَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ اور تم ظلم کے خوگر ہو چکے ہو۔ گویا تمہارے تخم میں ظلم کا خمیر کیا گیا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ بے دریغ یہ حق تلفیاں کرتے ہو۔ یہ ہے حضرت موسیٰ علیٰ نبینا علیہ السلام پر تمہارے اسلاف کے ایمان کا حال۔ اور اگر تم چاہو کہ تورات پر ان کے ایمان کا حال معلوم کرو تو ایک اور واقعہ سنو۔

وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ اور یاد کرو اس وقت کو جب کہ ہم نے تم سے عہد لیا۔ احکام تورات کو قبول کرنے پر اور جب تورات تمہارے پاس آئی۔ اور اس کے احکام کو تم نے اپنی طبیعت پر گراں پایا تو اس عہد سے پھر گئے۔ اور اس کے احکام کو قبول کرنے میں پس و پیش کی۔ پس ہم تمہیں ڈانٹ ڈپٹ کے ساتھ اور تمہارے سروں پر پہاڑ گرنے سے ڈرانے کے ساتھ پھر اسی عہد پر لائے۔

وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ اور ہم نے تمہارے سروں پر پہاڑ کھڑا کر دیا تا کہ اس کے

گرنے کے ڈر سے تم اپنے عہد سے نہ پھرو۔ اور ہم نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زبان سے فرمایا خُذُوْا مَآ اٰتَیْنٰکُمْ اسے پکڑو جو ہم نے تمہیں احکام تورات اور مشقت طلب تکلیفات عطا کی ہیں۔ بِقُوَّۃٍ ایسی قوت کے ساتھ جو تم دنیوی مشقتوں کو برداشت کرنے میں صرف کرتے ہو۔ وَّاسْمَعُوْا اور سنو جو کچھ تمہیں کہا جاتا ہے تورات میں تاکہ اللہ تعالیٰ کے اوامر و نواہی میں سے کوئی چیز رہ نہ جائے۔ اور حافظہ سے نکل نہ جائے۔

قَالُوْا اس وقت تمہارے اسلاف میں سے موجود لوگوں نے کہا۔ جب پہاڑ کے گرنے سے ڈر گئے۔ سَمِعْنَا ہم نے احکام تورات سنے۔ وَعَصَیْنَا اور ہم نے نافرمانی کی ان احکام کی کیونکہ مشکل احکام کو اس طرح قبول کرنا آگے نہیں بڑھے گا کیونکہ جب تک کہ ہم اپنے اوپر پہاڑ گرنے کا خطرہ محسوس کرتے ہیں' مجبوراً زبان پر اطاعت اور قبولیت کے الفاظ لاتے ہیں۔ اور جب اس خطرے سے بے خوف ہو جائیں گے۔ اور شہوت' غضب' کاہلی اور سستی اپنی طبعی حالت پر لوٹے گی تو بے اختیار ہم نافرمانی میں مبتلا ہو جائیں گے۔ اور ایسی حالت میں جو کہ خوف اور غفلت کی حالت تھی' شہوت و غضب کے تقاضوں میں سے یہ بات کہنے کا باعث یہ تھا کہ صورت پرستی اور ہر چیز کو مباح جاننا ان کے جوہر نفس میں راسخ ہو چکا تھا۔

وَاُشْرِبُوْا اور وہ پلائے گئے تھے بچھڑے کی محبت جسے انہوں نے چند روز پوجا تھا جیسے شراب جو کہ جلدی جسم کے خالی حصوں اور گہرائیوں میں سرایت کر جاتی ہے۔ پس انہوں نے ٹھہرا لیا فِیْ قُلُوْبِھِمُ الْعِجْلَ ان کے دلوں میں بچھڑے کو۔ اور یہ سب کچھ شروع سے ہی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کے حق میں وقوع پذیر نہیں ہوا تا کہ مجبور و معذور ہوتے۔ اور حیوانات کی طرح ان کی حرکتوں پر مواخذہ اور عتاب نہ ہوتا۔ بلکہ یہ حالت انہوں نے جناب الٰہی سے کسب کی ہے۔ بِکُفْرِھِمْ اپنے کفر کی وجہ سے کہ جب انہوں نے ایک بار آیات الٰہی کے ساتھ کفر کیا۔ اور پیغمبر وقت کے ساتھ انکار سے پیش آئے۔ اور ان کے دلوں میں ایک زنگ چڑھ گیا۔ پھر جب دوسری مرتبہ اسی قسم کا کام کیا' وہ زنگ زیادہ ہو گیا۔ حتیٰ کہ رفتہ رفتہ دل کا پردہ غلیظ اور کثیف ہو گیا۔ یہاں تک کہ ہدایت کا اثر پہنچنے کو مانع ہوا۔

اس شخص کی طرح جس نے پہلی مرتبہ ایک غذا کھائی جو کہ اس کی بینائی کی قوت پر ایک باریک پردہ پیدا کرنے کا موجب ہوئی اس نے دوسری بار بد پرہیزی کی اور مسلسل یہی کرتا رہا۔ یہاں تک کہ کثیف اور سخت پردے نے اس کی بینائی کو ڈھانپ لیا۔ اور وہ بالکل اندھا ہو گیا۔ پس یہ لوگ جنہیں تورات پر ایمان کا دعویٰ تھا۔ اور اب یہی پورے کمال اور تاکید سے دعویٰ کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ اپنے ایمان کو اس کتابِ مقدس میں منحصر مانتے ہیں۔ اور کہتے ہیں نُؤْمِنُ بِمَا اُنْزِلَ عَلَيْنَا وَيَكْفُرُوْنَ بِمَا وَرَآءَهٗ یعنی ہم صرف اسی پر ایمان رکھتے ہیں جو ہم پہ اُتارا گیا اور اس کے علاوہ کفر کرتے ہیں۔ اور پھر اس کتابِ مقدس کے احکام کو قبول کرنے کے وقت اس طرح کے کلمات کفر بکتے ہیں۔ انہیں ملامت اور عار دلانے کے طور پر قُلْ فرمایئے کہ اگر کلمہ عصینا کہنا دل میں سامری کے بچھڑے کی محبت کی شراب پینا۔ تمہارے ایمان کے حکم سے صادر ہوا۔ بِئْسَمَا يَاْمُرُكُمْ بِهٖۤ اِيْمَانُكُمْ بہت بُری ہے وہ چیز جس کا تمہارا ایمان تمہیں حکم دیتا ہے اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ اگر تم ایمان لانے والے تھے۔ اس کتابِ مقدس پر۔ اس وقت جبکہ تم نے یہ کلمات کہے اور تم نے یہ شراب پی اور اگر تم تورات پر ایمان نہیں رکھتے تھے تو تمہارا یہ دعویٰ نُؤْمِنُ بِمَا اُنْزِلَ عَلَيْنَا باطل ہوا کیونکہ تم نے تورات کے عین نازل ہونے کے وقت اس کے ساتھ کفر کیا۔

چند بحثیں

یہاں چند بحثیں باقی رہ گئیں جن کے مفسرین درپے ہوتے ہیں۔ پہلی بحث یہ کہ آیت کے ظاہر سے یہ فائدہ نہیں نکلتا ہے کہ ان کے اسلاف نے طور اُٹھانے اور تورات کے احکام قبول کرانے کے وقت یہ دونوں کلمے کہے ہوں یعنی سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا اور یہ بہت غیر ممکن معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ وہ وقت کمال خوف اور ڈر کا وقت تھا اس وقت نافرمانی اور سرکشی کا اظہار عادتِ بشری کے مطابق ممکن نہیں ہے۔ اسی لیے بعض مفسرین اس طرف گئے ہیں۔ قالوا کی ضمیر فرقہ بنی اسرائیل کے تمام اصول وفروع کی طرف لوٹتی ہے۔ اور یہ دونوں کلمے تمام فرقہ بنی اسرائیل نے تقسیم اور بانٹنے کے طریقے سے کہے ہیں یعنی سَمِعْنَا ان کے آباء واسلاف نے اور عَصَيْنَا ان کی اولاد اور اخلاف نے کہا۔ اور اس نکتہ کے لیے قَالُوْا

فرمایا ہے ورنہ مناسب یوں معلوم ہوتا ہے کہ قُلْتُمْ کہا جاتا لیکن قُلْتُمْ کہنے میں گماں اس بات کا ہوتا کہ اس آیت کے نزول کے وقت حاضرین اور مخاطبین نے بھی سَمِعْنَا کہا ہوگا۔ حالانکہ سوائے نافرمانی کے ان کی کوئی صفت نہ تھی۔ اور بعض مفسرین نے کہا ہے اس وقت کے حاضر لوگ جدا جدا ہو گئے۔ بعض نے سَمِعْنَا کہا اور بعض نے عَصَيْنَا دوسری جماعت نے کہا ہے بنی اسرائیل کے تمام فرقے نے یہ دونوں باتیں کہی ہیں۔ لیکن سَمِعْنَا بزبان قالی اور عَصَيْنَا بزبان حال۔ اور بعض یوں کہتے ہیں کہ اس وقت سب نے سَمِعْنَا کہا اور اس کے بعد جب ان ذمہ داریوں کے بجالانے کا وقت آپہنچا اور ان پر ناگوار ہوئیں تو عَصَيْنَا کہہ دیا۔

حاصل کلام یہ کہ اس اشکال کا مدار اس پر ہے کہ سَمِعْنَا اطاعت پر دلالت کرتا ہے اور عَصَيْنَا اس کے خلاف پر۔ پس عقل مند سے دو باہم کلاموں کے درمیان جمع خصوصاً کمال خوف و ہراس کے وقت نافرمانی کا اظہار کس طرح جائز قرار دیا جا سکتا ہے۔ اسی لیے جواب میں کبھی اختلاف قائل؛ کبھی دونوں قولوں کے وقت کے مختلف ہونے کبھی آلہ قول کے مختلف ہونے کہ حال تھا یا قال کے ساتھ اس اشکال کو دور کرنے کا قصد کیا گیا ہے۔ اور تحقیق یہ ہے کہ سَمِعْنَا اطاعت پر دلالت نہیں کرتا۔ پس ان کے کلام کا مدلول صرف عصیان ہے گویا انہوں نے یوں کہا ہے کہ ہم نے ان تمام احکام کو کانوں سے سنا لیکن ہم ان احکام کی اطاعت نہیں کریں گے۔ پس جمع بین الکلامین المتنافیین لازم نہ آیا۔

ہم یہاں پہنچے کہ بنی اسرائیل کے فرقہ سے جو لوگ اس وقت حاضر تھے ان سے ان احکام کو قبول کرنا بھی متواتر اور ثابت ہے۔ اور یہ مندرجہ بالا کلام قبول نہ کرنے پر صریح دلالت کرتی ہے۔ پس اس کی کیا وجہ ہوگی؟ نیز پہاڑ کا اٹھانا صرف ان کے احکام کے قبول کرانے کے لیے تھا۔ اگر انہوں نے یہ کلمہ کہا تھا تو چاہیے تھا کہ پہاڑ ان پر پھینک دیا جاتا۔

ہم کہتے ہیں کہ حقیقت الامر یہ ہے کہ بنی اسرائیل نے اپنے سروں پر پہاڑ دیکھنے کے باوجود پہلے ان احکام کو قبول نہیں کیا۔ اور انہوں نے جانا کہ پہاڑ کو لانا صرف ڈرانے دھمکانے کے لیے ہے۔ دوسرے واقعات کی طرح حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیٰ نبینا

وعلیہما السلام کی سفارش سے یہ ہولناک واقعہ دُور ہو جائے گا۔ تورات کی مشقت طلب ذمہ داریاں کیوں قبول کریں۔ اسی وقت یہ کلمہ ان کی زبان پر آیا تھا جب انہوں نے دیکھا کہ یہ کلمہ کہنے کے بعد پہاڑ اور نیچے آ گیا اور سروں کے قریب پہنچ گیا تو سمجھے کہ ہمارا یہ ناز ونخرہ قبول نہیں ہوتا تو مجبوراً سجدے میں گر گئے۔ اور قبول کرنے کے الفاظ کہنے شروع کر دیئے اور سورۃ اعراف میں اس واقعہ کی طرف تفصیلی اشارہ فرمایا گیا ہے۔ اس آیت میں وَاِذْ نَتَقْنَا الْجَبَلَ فَوْقَهُمْ كَاَنَّهٗ ظُلَّةٌ وَّظَنُّوْا اَنَّهٗ وَاقِعٌ بِهِمْ الخ اور اس تقریر سے معلوم ہوا کہ اس واقعہ کا اس مقام میں وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ جو کہ بنی اسرائیل کے واقعات کے شروع میں اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا کے رکوع میں گزرا ہے' کے بعد ذکر کرنا تکرار نہیں ہے۔ بلکہ یہ واقعہ کا ابتدائی حصہ ہے۔ اور وہ واقعہ کا آخری حصہ ہے۔ جیسے وَاِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا فَادّٰرَءْتُمْ فِيْهَا کو وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖٓ اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تَذْبَحُوْا بَقَرَةً کے بعد ذکر کرنا۔

اور اس کی تفصیل یہ ہے کہ وہاں خُذُوْا مَآ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ وَّاذْكُرُوْا مَا فِيْهِ کے بعد واقع ہوا۔ اور وہ یاد رکھنے پر دلالت کرتا ہے۔ جو کہ سننے اور قبول کرنے کے بعد ہے۔ اور یہاں وَاسْمَعُوْا جو کہ سننا طلب کرنے کے لیے ہے۔ اور ظاہر ہے سننے کا حکم قبول نہ کرنے کے وقت ہوتا ہے۔ نیز وہاں ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ فَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ لَكُنْتُمْ مِّنَ الْخٰسِرِيْنَ صریح دلالت کرتا ہے کہ انہوں نے قبول کر لیا۔ اور ایک مدت کے بعد پھر گئے۔ اور ان تمام قرائن کے مجموعے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہاں ان کے قبول کرنے کی حالت کا بیان ہے کہ کس طرح بڑی ردوکد کے بعد قبول کیا۔ اور پھر وقت آنے پر پھر گئے۔ اور یہاں ان کے حال کی ابتدا کا بیان ہے کہ ابھی قبول نہیں کیا تھا۔ اور تمام وجوہ سے اشکال دُور ہو گیا۔ اور تکرار کا وہم بھی زائل ہو گیا۔

دوسری بحث یہ ہے کہ کلام کے ظاہر کا تقاضا یہ تھا کہ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا فرمایا جاتا الفاظ خطاب کی دلیل سے مِيْثَاقَكُمْ' فَوْقَكُمْ' خُذُوْا وَاسْمَعُوْا۔ اس ظاہر کو چھوڑ کر قالو صیغہ غائب کے ساتھ کیوں لایا گیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ کریموں اور بزرگوں کا شیوہ ہے

کہ کسی کے جرم کو اس کے روبرو ذکر نہیں کرتے اور اس کی بے ادبی کو بالمشافہ اس کی طرف منسوب نہیں کرتے۔ بلکہ مخاطب کے قبیح جرائم کا ذکر کرتے وقت اس کے غیر کی طرف توجہ کرتے ہوئے غائبانہ طور پر اس کے حال کی خبر دیتے ہیں۔ جیسا کہ کریم آقاؤں کا اپنے غلاموں اور نوکروں کے ساتھ معمول ہے یہاں بھی جب تک اپنی عنایات کا یعنی مِیثاق لینے، طور اُٹھانے اور قبولیت کے ساتھ پکڑنے اور سننے کے حکم کا ذکر فرمایا تو خطاب کی راہ اختیار فرمائی۔ اور جب ان کی اس ثقیل گفتگو کے ذکر کرنے کی باری آئی تو رسول کریم علیہ السلام اور ایمان والوں کی طرف توجہ فرما کر غائبانہ طور پر اسے نقل فرمادیا پھر جب ان کی اس قبیح گفتگو سے ان کے الزام اور ان کے دعوے کو باطل کرنے کا نتیجہ نکالنا منظور تھا تو دوسری بار بِئْسَمَا يَأْمُرُكُمْ میں انہیں خطاب فرمایا لیکن پیغمبر علیہ السلام کے وسیلہ سے۔ گویا انٰ سے مشافہۂ خطاب کا مرتبہ سلب ہو گیا۔

تیسری بحث یہ کہ عرب کے فصیح لوگوں کے استعمال میں اشراب کے دو معنی ہیں: پہلا معنی پلانا اور سیر کرنا اور جو تفسیر گزر چکی اسی معنی پر مبنی تھی۔ اور اس میں نہایت ہی اچھا لفظی استعارہ ہے۔ کیونکہ اگر زمین کو پلانا منظور ہے۔ تو جس طرح وہ پانی جو زمین کو پلاتے ہیں، زمین کے سبزے کا مادہ بن جاتا ہے۔ اسی طرح گوسالہ پرستی کی محبت ان سے صادر ہونے والی قباحتوں اور خباثتوں کا مادہ بن گئی۔ اور اگر شراب اور نشہ آور چیزیں پلانا مراد ہے۔ تو جس طرح نشہ آور شراب رگ رگ میں داخل ہوتی ہے۔ اور ہوش و حواس کو ضائع کر دیتی ہے۔ اور آدمی کو یہاں تک لایعقل بنا دیتی ہے کہ وہ بہن اور بیوی میں فرق نہیں کرتا۔ اور نیک اور بد میں تمیز نہیں کرتا۔ اسی طرح انہیں بچھڑے کی محبت نے لایعقل بنا دیا۔ دوسرا معنی رنگوں میں سے کسی رنگ کو دوسرے رنگ کی ملاوٹ دینا۔ جیسا کہ عرب لوگ کہتے ہیں ثوب مشرب بحمرة یعنی وہ کپڑا جس میں سرخ رنگ کی آمیزش ہو۔ اور اس استعارہ میں بھی ایک حسن اور لطافت ثابت ہے۔ کیونکہ جس طرح رنگ کسی کپڑے میں داخل ہو جاتا ہے۔ اور اس کے مسام میں اثر کرتا ہے۔ اسی طرح بچھڑے کی محبت اور اس کی پوجا پر حرص نے ان کے دِلوں کو رنگین کر دیا۔

چوتھی بحث یہ ہے کہ لفظ اشربوا جو کہ مجہول کا صیغہ ہے اس بات پر دلالت کرتا ہے۔ ان کے سوا کسی دوسرے نے ان کے ساتھ یہ کام کیا ہے۔ وہ دوسرا کون ہے؟ معتزلہ کہتے ہیں کہ سامری' ابلیس اور جن وانس کے شیاطین نے انہیں بچھڑے کی پوجا دل کی گہرائیوں میں ڈال کر اس رنگ میں رنگین کر دیا تھا۔ اور اس شراب سے انہیں مست کر دیا۔ اور اہلِ سنت کہتے ہیں کہ مسبب الاسباب ایک ذاتِ واحد ہے' تمام اسباب اسی جناب تک پہنچتے ہیں اگر ابلیس ہے۔ تو اسی کے اغوا سے کام کرتا ہے۔ اور اگر سامری ہے تو اس نے اسی کی تعلیم سے یہ کاری گری سیکھی ہے۔

پانچویں بحث یہ ہے کہ ایمان اعراض کی جنس سے ہے۔ اس سے امر اور نہی کا تصور کس طرح ہوسکتا ہے۔ لیکن جو کچھ فعل کا باعث اور اس کا سبب ہوتا ہے' آمر اور حکم کرنے والے کے ساتھ ایک قسم کی مشابہت بہم پہنچاتا ہے۔ پس اس کی سببیت کو امر کے ساتھ تعبیر کرتے ہیں۔ جیسا کہ آیت اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ میں اسی قسم کی تشبیہ کو پیشِ نظر رکھا گیا ہے۔

چھٹی بحث یہ ہے کہ سخت جھگڑالو دشمن کو الزام دینے کے مقام میں واجب التعظیم چیزوں کے متعلق مذاق کی راہ چلنا جائز ہے۔ جیسا کہ بِئْسَمَا يَاْمُرُكُمْ بِهٖٓ اِيْمَانُكُمْ میں واقع ہوا ورنہ ایمان نہایت قابلِ احترام شے ہے اس کی طرف قابلِ مذمت افعال کو منسوب نہیں کیا جاسکتا۔

ساتویں بحث یہ ہے کہ مناظرہ کے قواعد کے مطابق ابتدائے وَقَالُوْا قُلُوْبُنَا غُلْفٌ سے لے کر یہاں تک اس کلام کا خلاصہ مطلب یہ ہے کہ قلوبنا غلف کا مضمون جو کہ یہودیوں سے صادر ہوا تھا' اپنے دین میں کمال پختگی کی دلیل تھا جو کہ قابلِ تعریف کام تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اس دعوے کو ان پر رد فرمایا اس طرح کہ یہ سب کچھ اس لعنت اور سنگدلی کے آثار سے ہے۔ جو کہ تمہارے کفر کی وجہ سے تمہارے دل پر وارد ہوئی۔ پس تمہارا اپنے دین کے غیر کی طرف متوجہ نہ ہونا اور دلائل میں غور نہ کرنا تعصب باطل کے زمرے سے ہے نہ کہ تصلب حق سے۔ اور اس کی علامت تین چیزیں ہیں: پہلی چیز یہ ہے کہ قرآن پاک اور پیغمبر

Marfat.com

آخر الزمان صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ان کی تشریف آوری سے پہلے بہت متبرک اور معظم سمجھتے تھے۔ اور آپ کے نام کے ساتھ اپنی مہموں میں وسیلہ لیتے تھے۔ اور جب یہ دونوں بنی اسرائیل کی بجائے بنی اسماعیل میں ظاہر ہوئے تو تمہاری حسد کی رگ پھڑک اٹھی اور تمہارا قبول کرنا انکار میں بدل گیا اور یہ تمہارے تعصب کی صریح دلیل ہے۔

دوسری چیز یہ ہے کہ تم کہتے ہو کہ تورات کے سوا ہم کسی دوسری کتاب پر یقین نہیں رکھتے۔ اگرچہ وہ کتاب تورات کے مطابق ہو۔ اور یہ بھی تعصب کی علامت ہے کیونکہ اگر اپنے محبوبوں میں سے کوئی شخص کہے کہ السماء فوقنا آسمان ہمارے اوپر ہے اس کا ہم یقین کریں۔ اور اپنے دشمنوں میں سے کوئی یہی بات کہے اس کی تکذیب کریں۔ اور یہی وجہ ہے کہ تم نے انبیائے بنی اسرائیل کو تعصب و جہالت کی وجہ سے قتل کر دیا۔ حالانکہ وہ تورات کی مخالفت بالکل نہیں کرتے تھے۔ بلکہ تورات کے احکام کی تاکید کرتے تھے تو معلوم ہوا کہ تمہاری مخالفت تعصب پر مبنی ہے تصلب پر نہیں۔

تیسری چیز یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں بھی تمہارے اسلاف نے بے التفاتیاں' سرکشیاں' بچھڑے کی محبت پر اصرار۔ اور پختہ وعدہ کو توڑا ہے تو اگر وہ اس لڑائی جھگڑے اور ضد کو دین و ایمان پر پختگی قرار دیتے ہیں تو تمہارا ایمان ایک بری چیز ہے۔ اور ان تینوں علامات میں جو کہ تعصب باطل اور تصلب حق کے درمیان فرق کرنے والی ہیں' ادنیٰ سے اعلیٰ کی طرف، ترقی واقع ہوئی ہے۔ کیونکہ پہلے تو قرآن پاک کی صداقت پر دلالت کرنے والے قرائن کے واضح ہونے کے باوجود اس کے انکار کو ان کے حسد کی دلیل قرار دیا گیا ہے۔ اس کے بعد ان انبیاء علیہم السلام کو قتل کر کے جو کہ تورات کے مطابق حکم دیتے تھے۔ اور امر و نہی فرماتے تھے' عہد شکنی کی ہے۔ اس کے بعد خود حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ان کی ظاہری حیات مبارکہ میں مخالفت کر کے عہد شکنی کی اور یہ ان کے تعصب کا اعلیٰ مرتبہ ہے۔

اور اگر یہودی کہیں کہ ہم تورات کے سوا دوسری کتابوں اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت کے سوا دوسری شریعتوں کے ساتھ اس لیے کفر اختیار کرتے ہیں کہ ہمارے

نزدیک تورات کے بعد کوئی کتاب آسمان سے نازل ہوئی اور نہ ہی کوئی شریعت آسمان سے اُتری۔ پس ہمارا یہ کہنا کہ نُؤْمِنُ بِمَا اُنْزِلَ عَلَيْنَا اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل نہ ہونے والی کتابوں سے پرہیز کرنا ہے نہ کہ اس کی طرف سے ہمارے غیر پر نازل ہونے والی کتابوں سے۔ اور ایسی صورت میں ہمیں ملامت اور عتاب نہیں ہو سکتا تو ان کی اس گفتگو کے جواب میں۔

قُلْ آپ فرمائیں اگر معاملہ یہی ہے کہ تمہارے عقیدے میں سوائے تورات کے کوئی کتاب نازل نہیں ہوئی اور موسیٰ علیہ السلام کی شریعت کے سوا کوئی اور شریعت نہیں اُتری تو چاہیے کہ آخرت میں جو کہ بہشت اور جو کچھ اس میں ہے سے عبارت ہے اللہ تعالیٰ کے نزدیک صرف تمہارے لیے ہو۔ کیونکہ برحق ہونا تمہی میں منحصر ہے۔

اِنْ كَانَتْ لَكُمُ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ عِنْدَ اللّٰهِ اگر اللہ تعالیٰ کے نزدیک دار آخرت تمہارے لیے ہو خصوصاً جب کہ وہ دار آخرت خَالِصَةً تمہارے ساتھ خالص ہو۔ اور کسی دوسرے کو اس میں شرکت نہ ہو۔ اس معنی سے نہیں کہ وہاں کے بلند درجات تمہارے ساتھ مخصوص ہیں اگرچہ دوسرے لوگ بھی نچلے درجات میں داخل ہوں۔ بلکہ مِنْ دُوْنِ النَّاسِ دوسرے لوگوں کے سوا تو چاہیے کہ تمہیں موت دنیا کی زندگی سے زیادہ پسند ہو جو کہ اس پُر نعمت مقام تک پہنچنے کا وسیلہ ہے۔ کیونکہ اگرچہ دنیوی زندگی کی وجہ سے جنت کے درجات بلند کرنے والے اعمال میسر ہوتے ہیں۔ لیکن اس زندگی کی وجہ سے اس محبوب اور مرغوب تک پہنچنے میں دیر ہوتی ہے۔ جبکہ موت کی وجہ سے اس محبوب اور پسندیدہ مقام کا وصال جلدی حاصل ہوتا ہے۔ اور محبت کا قاعدہ ہے کہ محبّ کو محبوب سے دُور رہنا ایک ساعت اور ایک لمحہ کے لیے بھی دشوار ہوتا ہے۔ اگرچہ جانتا ہے کہ دیر آید درست آید تو اگر یہ معنی تمہارے ہاں موجود ہے۔

فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ پس موت کی آرزو کرو اگر تم اس دعوے میں سچے ہو۔ اور اگر تم کہو کہ ہم موت کی آرزو اس لیے نہیں کرتے کہ ہمیں یقین حاصل نہیں کہ جب بھی ہم موت کی آرزو کریں گے تو ہمیں موت ضرور آ جائے گی۔ ہم کہتے ہیں کہ اس

تردد کو دل میں جگہ مت دو۔ کیونکہ ہم جو کہ موت و حیات کے مالک ہیں، تمہارے ساتھ اقرار کرتے ہیں کہ جب بھی تم موت کی آرزو کرو گے ہم کسی توقف کے بغیر تمہیں موت پہنچا دیں گے۔ جیسا کہ حدیث پاک میں وارد ہے کہ اگر یہودی موت کی آرزو کریں تو ہر شخص اپنے منہ کے پانی سے دَم گھٹ کر اپنی جگہ پر مر جائے۔ اور روئے زمین پر ایک یہودی باقی نہ رہے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ تحدی اور معجزہ کے اظہار کے وقت پر ممکن کا واقع ہونا واجب ہو جاتا ہے مگر یہ وجوب ان کی آرزو پر معلق تھا جب انہوں نے آرزو نہیں کی، واقع نہیں ہوا۔

وَلَنْ يَّتَمَنَّوْهُ اَبَدًا اور موت کی آرزو ہرگز نہیں کریں گے۔ جب تک کہ دنیا کی زندگی میں ہوں اگرچہ موت چکھنے اور ان سختیوں کو جو کہ موت سے بھی بالاتر ہیں دیکھنے کے بعد چارو ناچار کہیں کہ يَا لَيْتَهَا كَانَتِ الْقَاضِيَةَ یَا لَیْتَنِیْ كُنْتُ تُرَابًا کیونکہ وعدہ اور وعید میں اس رسول علیہ السلام کی راست گفتاری کے تجربہ کی وجہ سے یقین کے ساتھ جانتے ہیں کہ ہم نے جب بھی اس کی آرزو کی، موت آئی۔ اور موت کے بعد اللہ تعالیٰ انہیں پوری جزا دے گا۔

بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ اس کے مطابق جو ان کے ہاتھوں نے آگے بھیجا ہے۔ اور یہ ان کے عمل کی قوت سے کنایہ ہے۔ کیونکہ اکثر اعمال کا آلہ ہاتھ ہے۔ اور اللہ تعالیٰ ان کے ظلم کی شدت کے باوجود انہیں ان کے بُرے اعمال کی پوری جزا کیوں نہ دے۔ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالظّٰلِمِيْنَ اور اللہ تعالیٰ ظالموں کو جانتا ہے۔ پس وہ اگرچہ موت کی آرزو نہ کریں۔ اور اس سے ہزار فرسنگ دُور بھاگیں، انہیں بُری موت ضرور پہنچے گی اور یہ مریں گے۔ اور مرنے کے بعد اپنے نامناسب کردار کی جزا پائیں گے۔

اور بیہقی کتاب الدلائل میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے لائے کے جب پہلی آیت اُتری تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہودیوں کو جمع کر کے ارشاد فرمایا کہ اگر تم اس دعویٰ میں سچ کہتے ہو تو ایک بار زبان سے کہہ دو اللھم امتنا یا اللہ! ہمیں موت دے۔ مجھے اس خدا کی قسم جس کے دستِ قدرت میں میری جان ہے، تم میں سے کوئی بھی یہ دعا زبان سے نہیں کہے گا مگر اس کے گلے کا پانی مہلک خناق کا مادہ ہو کہ اس کے گلے کو بند کر

دے گا اور وہ فی الفور ہلاک ہو جائے گا۔ یہودیوں نے یہ کلمہ کہنے سے انکار کر دیا۔ اور ڈر گئے اس کے بعد یہ آیت نازل ہوئی کہ وَلَنۡ یَّتَمَنَّوۡهُ اَبَدًا بِمَا قَدَّمَتۡ اَیۡدِیۡهِمۡ۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا وَاللّٰهُ وَلَنۡ یَّتَمَنَّوۡهُ اَبَدًا اللہ تعالیٰ کی قسم! وہ اس کی کبھی آرزو نہیں کریں گے۔

قصہ مختصر یہ کلام یعنی وَلَنۡ یَّتَمَنَّوۡهُ اَبَدًا جو کہ خبر دیتا ہے کہ یہودی ہرگز کبھی بھی یہ آرزو نہیں کریں گے، غیبی خبر اور واقع کے مطابق آیا۔ کیونکہ اگر وہ موت کی آرزو کرتے تو ضرور اسے نقل کیا جاتا بلکہ تواتر سے ثابت ہوا کہ لوگ ان آزمائشی واقعات میں ان کے واقع ہونے کے زیادہ منتظر ہوتے ہیں۔ اور صرف واقع ہونے پر ہی اس کی تشہیر کرتے ہیں۔

ایک شبہ کا جواب

یہاں اگر کسی کے دل میں شبہ گزرے کہ آرزو اور تمنا دل کا کام ہے۔ اس کا نہ ہونا کیسے معلوم ہو سکتا ہے؟ تو اس واقعہ کی واقع کے ساتھ مطابقت کس طرح واضح ہو؟ ہم کہتے ہیں کہ اوّل تو تمنا دل کا کام نہیں بلکہ لغت میں تمنا اسی کو کہتے ہیں کہ کوئی شخص اپنی زبان سے کسی چیز کی آرزو کا اظہار کرے۔ اور کہے کہ کاش مجھے یہ چیز حاصل ہو جائے۔ اور اس کی دلیل یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کا دعویٰ ایسی چیز کے ساتھ ہوتا ہے جو ظاہر اور کھلی ہو نہ کہ مخفی اور پوشیدہ اور ظاہر ہے کہ دِلوں کی چھپی باتیں ایسی چیز ہیں کہ علام الغیوب کے سوا خود بخود اس پر اطلاع نہیں ہو سکتی۔ تحدی اور مسائل میں سے کسی مسئلہ اور دعووں میں سے کسی دعویٰ کی سچائی کو ثابت کرنے کے مقام میں اس پوشیدہ امر پر کام کی بنیاد رکھنا مقصد کے خلاف ہے۔ اور اسی لیے ابن عباس (رضی اللہ عنہ) کی گزشتہ روایات میں گزرا کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہودیوں سے صرف اللھم امتنا کا کلمہ کہنے پر اکتفاء فرمایا۔ اور یہ نہیں فرمایا کہ دل سے موت کی آرزو کرو۔

دوسری بات یہ کہ ہم تسلیم کرتے ہیں کہ آرزو دل کا کام ہے۔ لیکن دل کے کاموں سے کوئی ایسا کام نہیں جس کے وجود اور عدم کی دلیل اعضاء کے کاموں سے نہ کہی جا سکے۔ اسی لیے کہتے ہیں کہ ما من عیان الادلہ بیان ہر ظاہر کا بیان ہے۔ اور دعویٰ کرنے

والوں کا موت اور اسباب موت سے فرار بلکہ زبانی طور پر موت طلب کرنے اور زبان سے اس کا ذکر کرنے سے گریز پائی اس بات کی صریح دلیل ہے کہ ان کے دل میں موت کی محبت بالکل نہ تھی۔ کیونکہ کسی چیز کی آرزو اس چیز کو بُرا سمجھنے کے ساتھ جمع نہیں ہو سکتی۔

تیسری بات یہ کہ اس وقت کے یہودیوں کا حال دو شقوں سے باہر نہیں تھا۔ موت کی دلی آرزو ان سے کبھی ثابت ہوئی نہ ہوئی اگر نہ ہوئی تو یہ خبر واقع کے مطابق ہوئی اور نبوت کے صحیح ہونے کی دلیل ہوئی اور اگر ہوئی تو چاہیے تھا کہ زبان سے اس آرزو کا اظہار کرتے۔ تا کہ الزام' شرمندگی اور اپنے دعویٰ کے باطل ہونے کی ذلت سے نجات پاتے۔ عقل مند ایک شرمندگی دُور کرنے کے لیے ہزاروں جھوٹ گھڑتے ہیں' انہیں یہ سیدھی سی بات کہتے ہوئے ہاتھ سے کیا جاتا تھا۔ اور بالکل ظاہر ہے کہ اگر انہیں دل میں موت کی آرزو حاصل ہوتی اور زبان سے اس کا اظہار نہ کرتے تو اپنے اُوپر جہالت' شرمندگی اور الزام بھی عائد کرتے اور جھوٹے بھی ہوتے اور کوئی عقل مند اس قسم کی بے ہودہ حرکت نہیں کرتا جس میں دنیوی نقصان بھی ہو۔ اور دینی ضرر بھی۔ بلکہ اگر انہیں موت کی دلی آرزو حاصل نہ ہوتی لیکن اس کا زبان سے اظہار کرتے تو عقل والوں کے نزدیک گنجائش ہوتی جو کہ عزت' آبرو اور اپنی بات پالنے کے لیے جھوٹ کو بہت شیریں جانتے ہیں۔ پس یہودیوں کا زبان سے اس آرزو کے اظہار سے باز رہنا اس آرزو کے ان کے دل میں نہ ہونے کی صریح دلیل ہے۔

چند جواب طلب سوالات اور جوابات

یہاں چند تحقیق طلب سوالات باقی رہ گئے۔ پہلا سوال یہ ہے کہ یہ کلام یہودیوں کی طرف سے مسلمانوں پر پھیری جاتی ہے۔ کیونکہ انہیں حق پہنچتا ہے کہ وہ کہیں کہ مسلمان بھی دعویٰ کرتے ہیں کہ جنت اور مافیہا خاص ان کے لیے ہے۔ ان کے سوا دوسرے فرقے یہود ونصاریٰ' مجوسی اور مشرک وہاں داخل نہیں ہوں گے۔ اور اس کے باوجود موت کی تمنا نہیں کرتے۔ بلکہ ہزار حیلوں سے اس سے بھاگتے ہیں۔ پس ہم بھی اگر یہ دعویٰ کریں۔ اور موت سے بھاگیں اور اسے بُرا جانیں' ہم پر کیا الزام عائد ہوتا ہے؟ اس کا حل یہ ہے کہ

یہاں دو اعتقاد ہیں: پہلا کہ بہشت خالص ہمارے لیے ہے۔ اور دوسرے فرقوں کا اس میں کوئی حصہ نہیں۔ دوسرا یہ کہ ہم سب کے سب جیسے بھی ہوں' بہشت میں جائیں گے۔ اور موت کی محبت بلاشبہ ان دونوں اعتقادات کے مجموعے کو لازم ہے۔ اگرچہ ان میں سے ہر ایک اعتقاد کو جدا جدا لازم نہ ہو۔ بلکہ تحقیق کے اعتبار سے اس محبت کے لازم ہونے کو صرف دوسرا اعتقاد بھی کافی ہے۔ اور یہودیوں کے یہ دونوں عقیدے تھے۔ جیسا کہ ان کے اس مجموعہ کلام سے ظاہر ہے۔ لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّا اَیَّامًا مَّعْدُوْدَةً وَلَنْ یَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰی۔ بخلاف مسلمانوں کے کہ وہ دوسرا عقیدہ نہیں رکھتے بلکہ اپنے بُرے اعمال اور غیر پسندیدہ باتوں سے ہمیشہ خائف اور ڈرتے ہیں۔ پس یہ کلام پھیری نہیں جا سکتی کیونکہ لَكُمُ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ عِنْدَ اللّٰهِ خَالِصَةً مِّنْ دُوْنِ النَّاسِ ان دونوں اعتقادوں کے مجموعے پر دلالت کرتی ہے۔ اسی وجہ سے لکم میں نفع کا لام اس جگہ کا ثواب تمام مخاطبین کے لیے حاصل ہونے کا اشارہ کرتا ہے۔ اور لفظ خالصہ عذاب کی انواع سے بچنے کو جتلاتا ہے۔ پس کلام کا معنی یہ ہوا کہ اگر تمہارے نزدیک جنت تمہارے فرقے کے نفع کے لیے ہے۔ جبکہ پہلے کوئی عذاب نہ ہوگا۔ اور اس منصب میں دوسروں کے لیے کوئی شرکت بھی ثابت نہیں تاکہ شرکاء کے گھٹیا پن کی جہت سے اس نعمت میں کوئی اندیشہ نہ ہو پس اس نعمت تک جلدی پہنچنے کی آرزو میں کیا توقف کرتے ہو۔

اس کے باوجود کہا جا سکتا ہے کہ وہ مسلمان جو کہ اس وقت کے یہودیوں کے مقابلہ میں واقع ہوئے تھے۔ جیسے کہ ہمارے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم' مہاجرین اور انصار انہیں ممکن تھا کہ اس پھیرنے کا دو طرح مقابلہ کریں۔ پہلا طریقہ یہ کہ کہیں کہ ہم اور ہمارے رسول علیہ السلام شرائع کی تبلیغ اور احکامِ الٰہیہ کو نافذ کرنے کے لیے بھیجے گئے ہیں۔ بلکہ اس وقت یہ بلند مرتبہ ہمیں میں منحصر ہے۔ اگر ہم فوت ہو جاتے تو قیامِ قیامت تک تصور نہیں ہو سکتا کہ کوئی دوسرا یہ منصب سنبھالے کیونکہ ہمارے رسول خاتم المرسلین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں۔ اور ہم پہلے مومن اگر ہم درمیان میں نہ ہوں' کون ہے جو رسول علیہ السلام کے اقوال و افعال اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے اُترنے والے احکام کو پچھلے لوگوں تک پہنچائے اور اس کا

پہنچانا حد تواتر تک پہنچے۔ تاکہ اس کے ساتھ محبت کا الزام ہو سکے۔ پس ہمارے وجود سے جو حکمتِ خداوندی مراد ہے پوری نہیں ہوتی سوائے ہماری زندگی کے۔ اسی وجہ سے ہم اپنی وفات سے راضی نہیں ہوتے تاکہ ہم اپنے خالق کی حکمت کو ضائع نہ کر بیٹھیں۔

ذوقِ شہادت فی سبیل اللہ اور غلامانِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

دوسرا طریقہ یہ کہ ان مذکور لوگوں میں سے ہر ہر فرد موت کی محبت اور اپنے پروردگار کی ملاقات کے شوق سے پُر تھا۔ جیسے مطیع غلام جو کہ بلند مرتبے حاصل کرنے کے لیے اپنے سردار کی ملازمت کا خواہاں ہوتا ہے بھاگے ہوئے غلام کی طرح نہیں جو کہ چوروں کی طرح اپنے مالک کے سامنے جانے سے پہلوتہی کرتا ہے۔ اور ان کی اس محبت اور شوق کی دلیل یہ ہے کہ انہوں نے اپنی جان اور مال کو جہاد میں خرچ کیا اور انہوں نے اپنی روحوں کو اس دین کی ڈھال بنا رکھا تھا۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی شان میں اُتارا مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ۔ (الاحزاب آیت ۲۳)

نیز یہ آیت نازل فرمائی: اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ۔ (التوبہ آیت ۱۱۱)

نیز فرمایا: وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِيْ نَفْسَهُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ

(البقرہ آیت ۲۰۷)

اور حضرت امیر المومنین عمر ابن الخطاب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ ہر نماز کے بعد یہ دعا کرتے تھے اللھم ارزقنی شھادۃ فی سبیلك ووفاۃ ببلد رسولك یا اللہ! مجھے اپنی راہ میں شہادت اور اپنے رسول علیہ السلام کے شہر میں وفات عطا فرما۔

اور حضرت امیر المومنین علی ابی طالب کرم اللہ وجہہ سے مروی ہے کہ کان یطوف بین الصفین فی غلالہ یعنی آپ جنگ کی دو صفوں کے درمیان گھوڑا دوڑاتے حالانکہ ایک پسینہ پونچھنے والے رومال کے کپڑے کا باریک کرتہ پہنے ہوتے۔ حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ نے آپ کی خدمت میں عرض کی کہ یہ جنگ کا لباس نہیں ہے جو آپ نے پہن رکھا

ہے یہاں زرہ اور فولاد کی کڑیوں والا لوہے کا بنا ہوا لباس پہننا چاہیے۔ آپ نے فرمایا:

یابنی لایبالی ابوك علی الموت سقط او سقط علیه الموت۔

اے بیٹے! تیرے باپ کو کوئی پرواہ نہیں کہ وہ موت پر گرے یا موت اس پر۔

اور حذیفہ بن الیمان رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حالتِ نزع میں آپ کو بہت تازگی اور مسرت لاحق ہوئی اور آپ بلند آواز سے فرما رہے تھے جاء حبیب علی فاقته لاافلح من ندم یعنی موت جو کہ میرا محبوب ہے عین انتظار اور کمال اشتیاق کے وقت آئی۔ اور جسے اس محبوب کی آمد سے ندامت ہوئی خلاصی پانے والا نہ ہو۔

اور عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ جنگِ صفین میں یہی نعرہ لگا رہے تھے الآن القی الاحبة محمد اوحزبه اب مجھے احباب کی ملاقات ہوگی۔ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی۔ اور جب ایک ہزار چار سو افراد نے حدیبیہ کے دن قربان ہونے پر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بیعت کی' اللہ تعالیٰ نے ان کی شان میں یہ آیت بھیجی لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ

(الفتح آیت ۱۸)

حاصلِ کلام یہ کہ جو صحابہ کبار خصوصاً غزوۂ بدر میں حاضر ہونے والوں' شہدائے احد اور اہلِ بیعت رضوان کی اچھی سیرت سے واقف ہوا' وہ یقین سے جانتا ہے کہ وہ فی سبیل اللہ قربان ہونے میں عظیم پختہ قدم رکھتے تھے۔ یہاں تک کہ سعد بن ابی وقاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے لشکر کفار کے سردار رستم بن فرخ زاد کے نام اپنے خط میں لکھافان معی قومًا یحبون الموت کما یحب الاعاجم الخمر کہ میرے ساتھ وہ لوگ ہیں جو کہ اس طرح چاہتے ہیں۔ جیسے عجمی لوگ شراب کو پسند کرتے ہیں۔ اور یہ لکھنے میں اس کے بعید از امکان ہونے کو دُور کرنے کی طرف ایک لطیف اشارہ ہے۔ کیونکہ نشہ کی حالت بھی موت کے ساتھ ایک قسم کی مشابہت رکھتی ہے کہ شراب سے مست آدمی لایعقل ہو کر اس جہان سے باہر چلا جاتا ہے۔ اور عالم خیال کی سیر اور گردش میں مستغرق رہتا ہے۔ پس موت کے مشابہ اس حالت کو شراب پینے والوں نے ایک گھڑی راحت اور عالم خیال کی سیر کے

لیے پسند کیا ہوگا تو ہم لوگ موت کو جو کہ محبوبِ حقیقی کے وصال اور عالمِ ملک و ودود کی سیر کا موجب ہے' کیوں پسند نہ کریں۔

اور بالکل ظاہر ہے کہ دنیا کا سامان آخرت کی نعمت کے مقابلہ میں بہت قلیل ہے۔ اور وہ قلیل بھی اس زمانے کے یہودیوں پر جو کہ اس کلام سے مخاطب ہیں۔ انوارِ محمدیہ علیٰ صاحبہا السلام والتحیہ کے جلوؤں کے ظہور کے بعد اور اس نزاع کے بعد جو کہ ان کے ساتھ مسلمانوں کو پیش آیا۔ یہاں تک کہ یہ جنگ و جدال لڑائی جھگڑے' بہادر مردوں کے قتل' اولادوں اور بچوں کی قید' نفیس جائیدادوں اور اموال کو لوٹنے' جزیہ اور خراج لگانے اور فقر و مسکنت اور احتیاج تک کھینچ لے گیا' بہت تلخ اور بدمزہ ہوگیا۔ پس ان کے گمان میں ان کے حق میں اس زندگی سے موت بلاشبہ اچھی اور بہتر تھی۔

اور اگر یہودی کہیں کہ آخرت کی نعمتوں کی آرزو میں ہم آگے ہیں۔ لیکن موت جو کہ اس نعمت کے ملنے کا وسیلہ ہے طبعی طور پر انسان کو پسند نہیں اس کی وجہ سے ہم موت کی آرزو نہیں رکھتے اور اس سے بھاگتے ہیں۔ ہم کہتے ہیں کہ اس محبوب چیز کا وسیلہ بذاتِ خود مکروہ ہے۔ لیکن عقل مند محبوب کو حاصل کرنے کے لیے اس وسیلہ کی ہزار دل سے آرزو کرتا ہے۔ جیسے شفا کے لیے فصد کھلوانا اور تنقیہ۔

یہاں جاننا چاہیے کہ بعض مفسرین نے اس آیت کی تفسیر میں ایک اور روش اختیار کی ہے۔ جو کہ اس مقام پر وارد ہونے والے اکثر اشکالات سے نجات بخشتی ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے اس دعویٰ کہ لَنَا الدَّارَ الْاٰخِرَةَ خَالِصَةً مِّنْ دُوْنِ النَّاسِ کے باطل کرنے میں تحدی اور اعجاز کی راہ اختیار فرمائی نہ کہ الزام اور مناظرہ کی۔ پس گویا یوں ارشاد ہوا کہ اگر تم اس دعویٰ میں سچے ہو تو ہم نے تمہاری صداقت کی علامت یہ قرار دی کہ تم موت کی آرزو کرو۔ بغیر اس کے کہ اس دعویٰ اور آرزوئے موت کے درمیان کوئی واقعی لزوم ثابت ہو۔ جیسا کہ کہتے ہیں کہ اگر تیرا دعویٰ درست ہے تو چاہیے کہ تو اپنے ہاتھ کو سر پر رکھے۔ کیونکہ جن حرکات کی عادت ہو' ان سے عاجز ہونا بغیر اس کے کہ کوئی ظاہری سبب ہو' اعجازِ الٰہی کی دلیل ہے۔ اور اعجاز کے وقت نبی علیہ السلام کا دعویٰ صحیح اور ان

کے مخالفین کا دعویٰ باطل ہو جاتا ہے۔

اور ظاہر ہے کہ موت کی آرزو اتنا عجیب اور مشکل کام نہیں خصوصاً جب آرزو کو زبانی اظہار پر محمول کیا جائے۔ پس سب کے سب یہودیوں کا اس بات سے عاجز آنا کہ موت کی آرزو اپنی زبان سے ظاہر کریں' ان کے اس دعویٰ میں جھوٹ کی صریح دلیل ہوئی۔

اور ان میں سے بعض دوسرں نے کہا ہے کہ اس دعویٰ میں انکار کا مقام لفظ خالصۃً ہے۔ اور مِنۡ دُوۡنِ النَّاسِ بھی خالصۃً سے متعلق ہے۔ پس کلام کا معنی یوں ہوا کہ اگر سرائے آخرت اللہ تعالیٰ کے نزدیک تمہارے لیے ہے اس حالت میں کہ وہ سرا ہر طرح عذاب سے پاک ہوگی بخلاف دوسرے لوگوں کے ان کے لیے وہ سرائے عذاب سے پاک میسر نہیں آئے گی یا تو اس سے بالکل محروم ہوں گے یا عذاب چکھنے کے بعد وہاں پہنچیں گے۔ اور اس توجیہ کی وجہ سے دوسرا عقیدہ جو کہ پہلے مذکور ہوا' بھی اس کلام سے ظاہر ہو گیا۔ اور یہودیوں کی طرف سے مسلمانوں پر اس کلام کا لوٹنا دُور ہوا۔

دوسرا سوال یہ ہے کہ اس آیت :ور لَقَدۡ كُنۡتُمۡ تَمَنَّوۡنَ الۡمَوۡتَ مِنۡ قَبۡلُ اَنۡ تَلۡقَوۡهُ فَقَدۡ رَاَيۡتُمُوۡهُ وَاَنۡتُمۡ تَنۡظُرُوۡنَ (آل عمران آیت ۱۴۳) اور اس جیسی دیگر آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ موت کی آرزو اور اسے دل سے چاہنا ایک قابلِ تعریف کام ہے۔ اور نجات کی نشانی اور شوقِ الٰہی کی دلیل ہے۔ اور بہت سی احادیث اس کی تائید میں وارد ہوئیں۔ ان میں سے یہ ہے کہ عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کی روایت سے آیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے: من احب لقاء اللہ احب اللہ لقاء ہ ومن کرہ لقاواللہ کرہ اللہ لقائہ۔

اور ان میں سے وہ ہے جو کہ آخری زمانے کے مسلمانوں کی مذمت اور کفار کے ساتھ جہاد کرنے سے ان کی بزدلی میں واقع ہوا۔ حب الدنیا وکراھیۃ الموت اور عقلی دلیل بھی اسی کی گواہ ہے۔ کیونکہ مردِ مومن کی سب کی سب ہمت آخرت میں راحت اور انس حاصل کرنا ہے۔ اور وہ یقین کامل رکھتا ہے کہ وہ حالت آنے والی ہے۔ اور ہمیشہ رہنے والی ہے۔ اور دنیا کی زندگی فانی اور ناپائیدار ہے۔ اور اس کے علاوہ وہ اوقات کو بدمزہ کرنے

والی اور اطاعت سے روکنے والی مصروفیات بہت رکھتا ہے۔ پس اسے آخرت میں رغبت، دنیوی لذتوں سے بے رُخی اور یہاں کی زندگی کو حقیر سمجھنا ضروری ہے۔ اور اگرچہ طبعی طور پر موت سے کراہت کرتا ہے مگر وہ کراہت نہیں جو کہ آخرت کی لذتوں سے بے رغبتی کی وجہ سے ہو۔ بلکہ دو اسباب میں سے ایک کی وجہ سے پہلا سبب نزع کی شدت اور روح کی کھینچا تانی کی سختی جو کہ بدذائقہ تنقیہ کرنے والی دوا پینے کی مانند طبعی طور پر ناپسند ہوتی ہے مگر عقلی طور پر محبوب ہوتی ہے۔

دوسرا سبب مواخذہ اور کوتاہیوں پر عتاب۔ پس وہ چاہتا ہے کہ لمبی زندگی پائے۔ اور زیادہ نیکیاں بجالائے۔ اور اسے توفیق نصیب ہو تاکہ اس جہان سے پاک اور صاف ہو کر جائے۔ اور اس سفر کی طرح نہ ہو جو کہ اسباب سفرخرچ اور سواری مہیا کیے بغیر ہو اسی لیے عبادہ بن صامت کی حدیث میں آیا کہ جب حضور علیہ السلام نے یہ کلمہ ارشاد فرمایا تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے عرض کی کہ یارسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہم سب موت کو مکروہ جانتے ہیں۔ پس ہمارا حال کیا ہوگا؟ تو حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ تمہاری اس کراہت کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔ کیونکہ تمہاری نظر میں مواخذہ اور عتاب کے خوف اور خطرے کی وجہ سے اس سرائے کی خاص لذت ابھی جلوہ گر نہیں ہوئی۔ معتبر وہ وقت ہے جو کہ نزع کا وقت ہے۔ اس وقت مردِ مومن کو ہر طرف سے بشارت پر بشارت پہنچتی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے آثار اور اس کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا کرم ظاہر اور بے پردہ نظر آتا ہے اس وقت اس کے نزدیک موت سے زیادہ محبوب کوئی چیز نہیں ہوتی۔ جبکہ کافر کو ہر طرف سے عذاب اور سزا کے اسباب نظر آتے ہیں۔ اور ڈرانا دھمکانا رونما ہوتا ہے۔ پس اس وقت اس کے نزدیک کوئی چیز موت سے زیادہ بُری نہیں ہوتی۔

اور بعض روایات میں آیا ہے کہ حضور علیہ السلام نے اس سوال کے جواب میں فرمایا والموت قبل لقاء اللہ، یعنی موت کو بُرا جاننا اللہ تعالیٰ کی ملاقات کو بُرا جاننے کو لازم نہیں کرتا کیونکہ موت اللہ تعالیٰ کی ملاقات سے پہلے ہے۔ اور اس مقصد کا وسیلہ ہے۔ اور کئی دفعہ وسیلہ ناپسند ہوتا ہے۔ اور مقصد محبوب ہوتا ہے۔ جیسے کڑوی دوائی پینا جو کہ حصولِ تنقید کا وسیلہ

ہے۔اور فصد اور بدذائقہ مسہل جو کہ حصولِ شفاء کا وسیلہ ہے۔اور ہر پرخطر سفر جو کہ مال کے حصول کا وسیلہ ہے۔

موت کی آرزو کرنا حرام ہے

اور بہت سی احادیث دلالت کرتی ہیں کہ موت کی آرزو کرنا حرام ہے' نہیں کرنی چاہیے۔ چنانچہ صحاح ستہ میں مروی اور ثابت حدیث مشہور ہے۔اور وہ حضور علیہ السلام کا قول ہے لایتمنین احدکم الموت لضر نزل به وان کان ولابدفلیقل احینی ما کانت الحیوة خیرالی و توفنی اذاکانت الوفاة خیرالی۔تم میں سے کوئی کسی نازل شدہ تکلیف کی وجہ سے موت کی تمنا نہ کرے۔اور اگر اس کے سوا چارہ نہیں تو یوں کہے اے میرے اللہ! مجھے زندہ رکھ جب تک زندگی میرے لیے بہتر ہے۔اور فوت کر دے جب وفات میرے لیے بہتر ہو۔پس اس ظاہری تعارض میں تطبیق کی وجہ کیا ہوگی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ موت کی آرزو کرنا کبھی اخروی راحت کے شوق کامل اور علائق دنیوی سے مجرد ہونے کی حالت سے مانوس ہونے کی وجہ سے ہوتی ہے۔اور وہ نجات اور شوقِ الٰہی کے غلبہ کی دلیل ہے۔لیکن شریعت میں اس آرزو کا اظہار جائز نہیں ہے۔کیونکہ اصل میں یہ آرزو مغلوبیت اور مجذوبیت کے آثار سے ہے۔جو کہ زندگی کے فوائد اور منافع سے غافل کرنے والی ہے۔اور وہ سمجھتا نہیں کہ اس دنیا میں جس قدر رہوں گا' اتنا ہی زیادہ قربِ الٰہی حاصل کروں گا۔اور مزید شوق اور رغبت حاصل کروں گا۔تو اگر کبھی غلبہ شوق کی وجہ سے یہ حالت رونما ہو تو چاہیے کہ اسے چھپانے کی کوشش کرے۔اور زبان سے اظہار نہ کرے۔جس طرح کہ شریعت میں مغلوبیت اور مجذوبیت کے تمام آثار کو اسی دستور کے مطابق چھپانا واجب قرار دیا گیا ہے۔

اور وہ جو اس باب میں اکابر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے منقول ہوا' سب کچھ اس وقت تھا۔جبکہ موت کے اسباب موجود ہو چکے تھے۔اور ظاہری زندگی کے باقی رہنے سے مایوسی ہو چکی تھی اس وقت انہوں نے موت کی آمد پر خوشی اور اپنے پوشیدہ مقصد کے حصول پر فرح و سرور کا اظہار کیا ہے۔اور وہ وقت بحث سے خارج ہے۔اور اس کے باوجود ان سے موت

کی طلب' آرزو اور خواہش منقول نہیں ہوئی۔ موت کی محبت اور اس کے پہنچنے پر خوش ہونا اور چیز ہے۔ اور موت کی طلب' دعا اور دلی طور پر چاہنا اور چیز اور کبھی مصائب پر بے صبری اور انہیں برداشت کرنے میں حوصلہ کی تنگی کی وجہ سے ہوتا ہے۔ جس طرح کسی کہنے والے نے کہا ہے شعر' الاموت یباع فاشتریه' فهذا العیش مالاخیر فیه' الا رحم المهیمن روح عبد' تصدق بالوفاة علی اخیه

اور یہ آرزو چند وجہ سے محل عتاب اور دلیل نقصان ہے۔ کیونکہ گھبراہٹ' بے صبری' اللہ تعالیٰ کے فیصلہ سے ناراضگی کی دلیل اور توکل و تسلیم کے تقاضا کے خلاف ہے۔ اور اس آرزو میں کفر کی ایک قسم کی بھی ملاوٹ ہے۔ کیونکہ یہ شخص سمجھتا ہے کہ موت کے بعد میں قضا کے پنجے سے نجات پالوں گا۔ اور رب تعالیٰ کی قدرت مجھ پر اس وقت تک ہے جب تک کہ میں بقید حیات ہوں جب مر جاوں گا تو اس کی قدرت سے باہر نکل جاوں گا اس عقیدے سے اللہ تعالیٰ کی پناہ اور یہی وہ آرزو ہے۔ جس سے احادیث شریفہ میں شدت سے روکا گیا ہے۔ اور اس کی مذمت کی گئی جیسا کہ اسی حدیث پاک میں لضر نزل کے لفظ کے ساتھ اسی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

تیسرا سوال یہ ہے کہ اس سورت میں ولن یتمنوہ فرمایا ہے۔ اور اس سورت الجمعۃ میں ولا یتمنونہ یہ فرق کس وجہ سے ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس صورت میں یہودیوں کا دعویٰ یہ ہے اِنَّ الدَّارَ الْآخِرَةَ خَالِصَةً مِّنْ دُوْنِ النَّاسِ یعنی عذاب سے پاک جنت اور جو کچھ اس میں ہے' ہمارے لیے ہے۔ اور اس میں دوسروں کا کوئی حصہ نہیں۔ اور سورۃ جمعہ میں یہ ہے نحن اولیاء اللہ من دون الناس یعنی ہم اللہ تعالیٰ کے دوست ہیں نہ کہ دوسرے لوگ اور ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کی دوستی جنت اور اخروی نعمتوں تک پہنچنے کا وسیلہ ہے۔ اور جنت اور اخروی نعمتوں تک پہنچنا مقصود بالذات ہے۔ پس مناسب ہوا کہ اس صورت میں ان کے دعوے کی جو کہ مطلوب بالذات کو اپنے فرقہ میں منحصر کرنا ہے' پوری تاکید سے نفی اور اس کا انکار کر دیا جائے جبکہ سورۃ الجمعہ میں ان کے دعویٰ کی جو کہ وسیلہ کو منحصر کرنا ہے۔ اور اتنا مقصود نہیں ہے بغیر تاکید و انکار کے اصل نفی کر دی جائے تاکہ مطلب

اور وسیلہ میں فرق ظاہر ہو جائے۔

نیز کہا جا سکتا ہے کہ سورۃ جمعہ میں ان کا دعویٰ اس صورت میں مذکور دعوے سے خاص ہے۔ کیونکہ جسے بہشت اور اخروی نعمت حاصل ہو جائے' لازم نہیں کہ اللہ تعالیٰ کا ولی بھی ہو۔ کیونکہ کمال میں ولی کا مرتبہ نبی علیہ السلام کے مرتبہ سے متصل ہے۔ اور معقولیوں کا قاعدہ ہے کہ عام کی نفی خاص کی نفی سے زیادہ بعید ہے۔ جس طرح کہ خاص کا اثبات عام کے اثبات سے زیادہ بعید ہے۔ اس کی مثال' تیرا یہ کہنا کہ الانسان موجود وفلاں بن فلاں ابن من فلاں موجود اور جب پہلا دعویٰ یعنی اپنے فرقہ میں نجات اور جنت کے درجات کو پہنچنے کا منحصر ہونا۔ دوسرے دعوے سے جو کہ ولایت کا اپنے میں منحصر ہونا ہے' زیادہ بعید تھا تو پہلے دعوے کے رد میں لفظ لن کی ضرورت ہوئی کیونکہ نفی کے باب میں اس سے زیادہ بلیغ اور کوئی حرف نہیں ہے۔ اور دوسرے دعوے کے رد میں اصل نفی پر جو کہ کلمہ لا کا مدلول ہے' اکتفاء مناسب ہوا۔

اور جب گزشتہ آیت میں اس بات کی خبر دی گئی کہ یہودی موت کی آرزو ہرگز نہیں کرتے اور نہ کریں گے۔ اور احتمال ہے کہ کسی کو دونوں ضدوں کی آرزو نہ ہو اور اسے دونوں طرفوں میں سے کسی کی رغبت نہ ہو۔ پس یہودیوں کے نزدیک موت وحیات برابر ہو نہ موت کے خواہش مند ہوں اور نہ زندگی کے طالب۔ اس احتمال کو دُور کرنے کے لیے فرمایا ہے کہ کاش اُنہوں نے موت کی آرزو کی ہوتی' دنیا کی زندگی پر حرص نہ کرتے۔ بلکہ اللہ تعالیٰ کا حکم تسلیم کرنے اور اپنے ارادہ کی نفی کرنے کے تقاضا کے مطابق موت وحیات کی دونوں طرفوں کو اپنے مالک کی رضا کے سپرد کرتے کیونکہ یہ حالت بھی طالبان آخرت بلکہ طالبانِ مولیٰ کے قابلِ تعریف حالات میں سے ایک قسم ہے۔ لیکن جب تو تجربہ اور امتحان کرے تو ان کی حالت اس کے خلاف پائے گا۔

وَلَتَجِدَنَّهُمْ اور تو ان یہودیوں کو ضرور پائے گا۔ جو کہ جنت کو خالص اپنا نصیب کہتے ہیں **اَحْرَصَ النَّاسِ عَلٰى حَيٰوةٍ** لوگوں میں سب سے زیادہ حریص ایک خالص قسم کی زندگی پر جو کہ انتہائی طویل اور بےفکری کے ساتھ ہو۔ اس سے بھی زیادہ جو کہ انسان میں

راسخ ہے۔ بلکہ تو انہیں اس قسم کی زندگی پر زیادہ حریص پائے گا۔ وَمِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا اوران سے جو شرک کرتے ہیں۔ جبکہ وہ مشرکین تمام لوگوں کے مقابلہ میں دنیا کی زندگی کی حرص زیادہ رکھتے ہیں۔ اس قدر کہ گویا اس باب میں حد انسانیت سے گزر چکے ہیں۔ اور لوگوں کے گروہ سے خارج ہو گئے۔ کیونکہ معاد اور عاقبت کے بالکل معتقد نہیں ہیں۔ اور موت کو محض فنا اور مطلق عدم سمجھتے ہیں۔ اور دنیا کی زندگی کے سوا کسی زندگی کو نہیں جانتے۔ تو ان کی بہشت یہی دارِ دنیا ہے۔ اگر وہ اس دنیا کی زندگی پر حرص کریں۔ اور جان دیں تو بجا ہے۔ اور جب یہ یہودی جو کہ اپنے آپ کو اہلِ کتاب کہتے ہیں۔ اور دار الجزاء کا اقرار کرتے ہیں۔ بلکہ اس سرائے کی نعمتوں کو اپنے لیے خاص جانتے ہیں' مشرکین کی نسبت زیادہ حرص کرتے ہیں تو جانا جا سکتا ہے کہ انہیں اپنا دوزخی ہونا پیش نظر ہے۔ اور ان کی یہ باتیں لاف زنی سے زیادہ نہیں ہیں۔ اور ان کے سب لوگوں سے زیادہ حرص ہونے کی دلیل یہ ہے کہ دوسرے لوگوں کی نسبت عمر کے زیادہ کرنے کی فکر کرتے ہیں۔ اور بیماریوں سے شفا کی طلب میں جائز حد سے زیادہ کوشش کرتے ہیں۔ ہر طبیب' ہر منتری اور ہر جادوگر کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ اور اس زندگی کی بقاء کے لیے اپنے ایمان اور دین کو برباد کرتے ہیں۔ اور اپنی زندگی کی فراخی اور اس کے تکلیف دہ نہ ہونے کے لیے ہر طرف سے حلال و حرام کی تمیز کیے بغیر مال کو جمع کر کے ذخیرہ کرتے ہیں۔ اور آخری دَم تک ان کا یہ شیوہ جاری رہتا ہے۔ بڑھاپے' دانت گرنے اور بالوں کی سفیدی جو کہ موت کا برآمدہ ہے' کے باوجود اپنی عمر بڑھانے کی تدبیروں سے باز نہیں آتے اور مشرکین سے بھی ان کے زیادہ حریص ہونے کی دلیل یہ ہے کہ

يَوَدُّ اَحَدُهُمْ ان میں سے ایک دوست رکھتا ہے' اپنے حق میں نہ کہ اپنے تمام فرقہ اور خاندان کے حق میں کیونکہ اپنے تمام فرقہ اور خاندان اور اپنے مذہب و مشرب کے بارے میں یہ آرزو جو کہ اکثر اشخاص کو ہوتی ہے۔ لیکن ان میں ہر ہر آدمی آرزو کرتا ہے۔

لَوْ يُعَمَّرُ اَلْفَ سَنَةٍ یہ کہ ایک ہزار سال عمر پائے۔ حالانکہ وہ جانتے ہیں کہ اتنی عمر میں زندگی کی حلاوت میں سے کچھ باقی نہیں رہتا۔ اور کسی عیش سے بہرہ ور نہیں ہوتے۔ اور

کسی طاقت سے اپنے کام میں مصروف نہیں ہو سکتے۔ اور مشرکین کے دل میں یہ آرزو پیدا نہیں ہوتی۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ مشرکین جب سرے سے معاد اور عاقبت کے منکر ہیں وہاں کی خیر میں رغبت رکھتے ہیں نہ اس جگہ کے شر سے ڈرتے اور بھاگتے ہیں۔ اور یہ لوگ دل سے جانتے ہیں کہ اس سرائے میں ہر نیک و بد کا بدلہ ہوگا۔ اور ہم ابدی عذاب کے مستحق ہو گئے ہیں جب تک دنیا میں ہم زندہ ہیں اس عذاب سے دُور رہیں گے۔ پس اس محبت اور اس آرزو کی وجہ سے اپنے آپ کو عذابِ الٰہی سے دُور رکھتے ہیں۔

وَمَاهُوَ اور نہیں ہے اس قدر عمر پانا بِمُزَحْزِحِهٖ مِنَ الْعَذَابِ اس شخص کو عذابِ الٰہی سے دُور رکھنے والا اگرچہ اس کی آرزو کے مطابق واقع ہو جائے اَنْ يُّعَمَّرَ یہ کہ اسے ہزار سال عمر دی جائے۔ کیونکہ اگرچہ عمر طویل معلوم ہوتی ہے۔ لیکن جب آخر کار ختم ہونے والی ہے تو مدت قریب اور قلیل کے حکم میں ہے۔ اور یہ شخص جو کہ کفر اور گناہ کے ارتکاب کا عادی ہے۔ جس قدر دنیا میں دیر تک رہتا ہے اسی قدر گناہ کا بوجھ اُٹھاتا ہے۔ پس اس قدر طویل عمر کفر اور گناہ میں گزارنا حقیقت میں اپنے آپ کو عذاب کے قریب کرنا ہے نہ کہ دُور کرنا۔ اور اپنے کو عذاب سے دُور رکھنا یہ ہے کہ اپنے اعمال کی اصلاح کریں۔ اور توبہ اور ندامت کی رغبت پیدا کریں۔ اور یہ کام انہیں میسر نہیں۔

وَاللّٰهُ بَصِيْرٌ بِمَا يَعْمَلُوْنَ اور اللہ تعالیٰ دیکھنے والا ہے جو وہ عمل کر رہے ہیں۔ کفر میں دَم بدم زیادتی اور ڈھیروں گناہوں اور ناجائز کاموں کے ارتکاب سے تو انہیں عمر کے چھوٹا ہونے کی صورت میں جو عذاب میں کچھ تخفیف متوقع تھی' وہ بھی حاصل نہ ہوگی۔ بلکہ اس طویل عمر میں قبیح اعمال کی زیادتی کی وجہ سے ان کا عذاب اور زیادہ ہوگا۔ اور اگر ان کی عمر فی الواقع چھوٹی ہوتی تو اس آرزو سے کہ ہزار سال کی عمر گناہ اور کفر میں گزاریں' ہزار سال کے کفر اور گناہ کے مرتکب ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ حق تعالیٰ جانتا ہے کہ اگر وہ اس قدر عمر پالیں گے تو انہیں اعمال میں گزاریں گے۔ پس وہ اپنے آپ کو عذاب کے قریب کر رہے ہیں نہ کہ دُور۔

اور اگر یہودی کہیں کہ ہم تورات کے غیر پر ایمان نہیں لاتے۔ اور اس پر یقین نہیں

کرتے۔ یہ ازرہ حسد نہیں کہ ہمارے فرقہ پر کیوں نہ اُترا بلکہ اس وجہ سے ہے کہ تورات حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کسی کے واسطہ کے بغیر بارگاہِ خداوندی سے عنایت فرمائی گئی تھی۔ جبکہ یہ قرآن تم پر جبریل کے واسطے اُترتا ہے۔ اور فرشتوں میں سے جبریل ہمارا دشمن ہے' ہمارا نفس یہ قبول نہیں کرتا کہ اپنے دشمن کے احسان کا بوجھ اُٹھائیں۔

پس ان کی اس بات کے جواب میں قُلْ آپ فرمادیں۔ کہ جبریل علیہ السلام تم سے دشمنی نہیں رکھتا بلکہ تم خیالات فاسدہ کی وجہ سے اسے دشمن سمجھتے ہو۔ مثلاً تم کہتے ہو کہ جبریل حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ہماری خفیہ باتوں کی اطلاع دیتا ہے۔ اور اس کے مقابلے میں ہم جو تدبیر اور مشورہ کرتے ہیں اس کی اسے خبر دے دیتا ہے اور اس کے کافروں پر عذاب لاتا ہے۔ اور انہیں زمین میں دھنساتا اور ان کی شکلوں کو مسخ کر دیتا ہے۔ اور اس نے بخت نصر کو ہمارے ہاتھ سے چھڑایا اور اسے قتل نہ کرنے دیا۔ یہاں تک کہ وہ جوان ہوا۔ اور اس نے بیت المقدس کو خراب کیا۔ اور بنی اسرائیلوں کو قتل اور قید کیا۔ اور جب اس نے یہ تمام چیزیں اللہ تعالیٰ کے حکم سے کی ہیں تو ان کاموں میں انہیں دشمن قرار دینے کا حق نہیں پہنچتا۔ پس

مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيْلَ جو جبریل (علیہ السلام) کا دشمن ہو اس کی دشمنی بلاوجہ ہے۔ فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ بِاِذْنِ اللّٰهِ کیونکہ جبریل (علیہ السلام) نے اس قرآن کو اُتارا ہے۔ اور اس سے ان کی دشمنی کا سب سے آخری سبب یہی ہے۔ آپ کے دل پر صرف اللہ تعالیٰ کے اذن اور اس کے حکم سے۔ نہ کہ خود بخود اپنی طرف سے۔ اس لیے کہ انبیاء علیہم السلام کے اجماع کے ساتھ جبریل (علیہ السلام) لئے سفارت اور رسالت کے منصب سے زیادہ ثابت نہیں۔ پس وہ جو کچھ کرتا ہے۔ اور پہنچاتا ہے' اللہ تعالیٰ کے حکم سے کرتا ہے اور پہنچاتا ہے۔ اور پیغمبر وقت کے پاس تمہارے بھید ظاہر کرنا بھی حکمِ خداوندی سے ہے نہ کہ تمہاری عداوت کی وجہ سے۔ اور اس کے باوجود تمہارے کفر اور نافرمانی کی وجہ سے جبریل (علیہ السلام) تمہارا دشمن بھی ہوگا۔ اس لیے کہ حق تعالیٰ بذات پاک خود کافروں کا دشمن ہے۔ اور جبریل (علیہ السلام) اللہ تعالیٰ کی مرضی کے تابع ہے پھر بھی

تمہارے ایمان چھوڑنے اور جبریل کے لائے ہوئے پیغامات سے کفر کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ کیونکہ وہ نازل کیا ہوا نہیں ہے مگر

مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ موافق اس کے جو اس سے پہلے ہے۔ جو کہ حضرت موسیٰ اور بنی اسرائیل کے دوسرے انبیاء علیہم السلام نازل ہوا۔ پس جبریل (علیہ السلام) کے لائے ہوئے کو رد کرنا گویا گزشتہ کتابوں کو رد کرنا ہے۔ اور ان کا اقرار کرنا عین جبریل علیہ السلام کے لائے ہوئے کا اقرار کرنا ہے۔ اور کمال بے وقوفی اور حماقت ہے کہ اگر تمہارا دوست کہے کہ السماء فوقنا یعنی آسمان ہمارے اُوپر ہے تو یقین کر لیتے ہو۔ اور اگر یہی الفاظ دشمن کہے تو نہیں مانتے ہو۔ اور اگر بادشاہ کی طرف سے کوئی حکم پہنچائے' اسے قبول کر لیتے ہو۔ اور اگر تمہارا دشمن وہی حکم پہنچائے تو رد کر دیتے ہو۔ بلکہ اگر جبریل (علیہ السلام) کے اُتارے ہوئے میں اس وقت غور کرو تو اس کی ایک دیگر صفت بھی پاؤ گے۔ کیونکہ وہ تمہاری کتابوں کے موافق ہے۔

وَهُدًى اور ایک کامل ہدایت بہ نسبت پہلے اُتاری گئی ہدایت کے وَبُشْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ اور ایمان والوں کے لیے بشارت۔ پس اسے اگر قبول کرو اور اس کا یقین کر لو تو اس بشارت میں داخل ہو جاؤ۔ اور اس ہدایت سے مشرف ہو جاؤ اور تمہیں جبریل (علیہ السلام) کے واسطہ سے عظیم نفع حاصل ہو۔ اور اس کی قوی محبت کا سبب ہو۔ کیونکہ اندھے کے نزدیک اس سے زیادہ دوستی کوئی نہیں کہ اسے سیدھی راہ کا نشان دے دیں اور پریشان' حیران' خائف اور ڈرنے والے کے نزدیک اس سے زیادہ کوئی دوستی نہیں کہ اسے خوش کر دیں تو جسے تم نے دشمنی کا سبب گمان کیا ہے عین سبب محبت ہے۔ اور تمہارا یہ عذر اس اندھے کے عذر جیسا ہے۔ جسے کوئی کنوئیں یا ہلاکت کی جگہ سے بچا لے اور سہی راہ کا نشان دے اور وہ کہے کہ یہ شخص میرا دشمن ہے' میں اس کی بات پر یقین نہیں کرتا اور کنوئیں میں گرتا ہوں یا اس حیران و پریشان شخص کے عذر کی طرح از حد خوف کی وجہ سے جان نکلتی ہے۔ اور اسے کوئی خوش خبری پہنچائے اور تسلی بخشے اور وہ کہے کہ میں اس کی باتوں کا یقین نہیں کرتا۔ اور میں خوف میں رہتا ہوں اور اپنی جان کو برباد کرتا ہوں۔

یہودیوں کے سوالات اور ان کے جوابات

اور اس آیت کے نازل ہونے کا سبب تفسیر ابن جریر اور ابن ابی حاتم میں اور حدیث کی دوسری کتابوں جیسے طبرانی' بیہقی' مسند امام احمد اور عبد بن حمید میں اس طرح مروی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہجرت فرما کر مدینہ عالیہ میں داخل ہوئے تو حالات کی تفتیش کے لیے یہودیوں کی کثیر جماعت آپ کی خدمت میں حاضر ہوئی۔ ان کا سردار عبداللہ بن صوریا جو کہ فدک کے احبار میں سے تھا امتحان کے درپے ہوا۔ اور اس نے پوچھا کہ پہلے تو آپ ہمیں اپنی نیند کی کیفیت سے خبر دیں۔ کیونکہ ہماری کتابوں میں آخرالزماں پیغمبر کی نیند کی کیفیت کا نشان دیا گیا ہے۔ میں دیکھوں کہ وہ علامت آپ میں موجود ہے یا نہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ میری آنکھیں سوتی ہیں' دل نہیں سوتا۔ اور غافل نہیں ہوتا۔ اگر یہی علامت ہے تو مجھ میں موجود ہے۔ عبداللہ بن صوریا نے کہا کہ آپ نے سچ کہا یہی علامت ہے۔

اب ہم آپ سے چند چیزوں کے بارے میں سوال کرتے ہیں جنہیں پیغمبروں کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ جو چاہو پوچھو لیکن میں تم سے خدائی عہد چاہتا ہوں اور وہ عہد طلب کرتا ہوں جو حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنے بیٹوں سے لیا تھا اگر میں تمہیں ان چیزوں کی خبر دے دوں' تم ایمان لاؤ گے۔ اور میری پیروی کرو گے۔ سب نے کہا کہ قبول ہے۔ اس کے بعد عبداللہ بن صوریا نے کہا کہ آپ بتائیں کہ بچہ کبھی ماں جیسا ہوتا ہے۔ اور کبھی باپ جیسا ایسا کس وجہ سے ہوتا ہے؟ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ مرد اور عورت دونوں میں مادہ منویہ موجود ہے' مرد کا مادہ سفید اور گاڑھا ہوتا ہے۔ جبکہ عورت کا مادہ زردی مائل اور پتلا جو مادہ منویہ اوپر آ جائے۔ اور دوسرے کے مادہ کو نیچے بٹھا دیتا ہے یا رحم میں قرار پکڑنے میں پہلے پہنچتا ہے۔ اور دوسرے کے مادہ سے پہلے جمع ہو جاتا ہے یا اجزا اور حجم کے اعتبار سے غلبہ اختیار کرتا ہے' بچے کو مشابہت میں اپنی طرف کھینچتا ہے۔ اگر ان تین چیزوں میں سے ایک چیز مرد کے مادہ سے متحقق ہو تو بچہ باپ کے خاندان کے ساتھ مشابہت حاصل کرتا ہے۔ اور اگر عورت کے مادہ

میں یہ چیزیں جمع ہوگئیں تو بچہ ماں کے خاندان سے ہم شکل ہوتا ہے۔اس کے بعد اس نے پوچھا بچے کا کون سا عضو ماں کے مادہ سے اور کون کون سے عضو باپ کے مادہ سے بنتا ہے؟ حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ ہڈیاں' چربی اور نرم ہڈیاں باپ سے ہوتی ہیں۔ جبکہ گوشت' خون' بال اور ناخن ماں سے۔انہوں نے کہا کہ آپ نے سچ فرمایا۔ ہمارے سابقہ انبیاء علیہم السلام کی کتابوں میں اسی طرح مذکور ہے۔اب آپ فرمائیں کہ جنت میں داخل ہوتے ہی جنتیوں کی مہمان نوازی میں کیا چیز پیش کی جائے گی؟ حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ مچھلی کا جگر ہوگا۔اور بعض روایات میں بیل کا گوشت اور مچھلی ہوگی۔انہوں نے کہا کہ یہ بھی درست ہے۔اس کے بعد انہوں نے پوچھا کہ ہمیں اس طعام کی خبر دیجئے جسے حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنے آپ پر حرام کر رکھا تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کو عرق النساء کی تکلیف ہوگئی تھی۔اور بہت طویل ہوگئی' آپ نے بارگاہِ خداوندی میں نذر مانی کہ مجھے اس سخت تکلیف سے شفا حاصل ہو جائے تو مجھے کھانے کی چیزوں میں سے جو زیادہ مرغوب ہوگی' اپنے اوپر حرام کرلوں گا۔حق تعالیٰ نے آپ کو شفا عطا فرمائی۔انہوں نے اونٹ کا گوشت اور اونٹ کا دودھ جو کہ انہیں بہت مرغوب تھا' اپنے اُوپر حرام کر دیا۔اور اس کے بعد آپ کی ساری اولاد پر یہ کھانا حرام ہوگیا۔انہوں نے کہا کہ یہ بھی درست ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ جب تم نے ان سوالات کے جوابات میں میرا امتحان لیا۔اور تم نے میری سچائی کو جان لیا۔پس تمہیں کیا توقف ہے کہ میرے دین میں داخل نہیں ہوتے ہو۔اور میری پیروی اختیار نہیں کرتے ہو؟ انہوں نے کہا کہ ایک چیز باقی رہ گئی ہے جب تک کہ اس چیز سے ہماری تسلی نہیں ہوتی' ہم آپ کی پیروی نہیں کریں گے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہو وہ کیا چیز ہے؟ انہوں نے کہا کہ بتائیے کہ آپ پر کون سا فرشتہ وحی لاتا ہے۔اور آپ کا رفیق اور غمگسار ہوتا ہے؟ حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ فرشتوں میں سے میرا ساتھی۔اور غمگسار حضرت جبریل علیہ السلام ہے۔اور وہی ہے جو فرشتوں میں سے ہر نبی علیہ السلام کے ہمراہ ہوتا ہے۔اور اس پر وحی لاتا ہے۔اور اس امر

میں میں تمام پیغمبروں علیہم السلام کے ساتھ شریک ہوں۔ وہ بولے ہم آپ کی پیروی نہیں کریں گے۔ کیونکہ تمام فرشتوں میں سے جبریل (علیہ السلام) ہمارا دشمن ہے۔ اگر آپ کا صاحب وحی میکائیل (علیہ السلام) ہوتا تو ہم ضرور آپ کی متابعت کرتے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ جبریل (علیہ السلام) کو کس وجہ سے دشمن قرار دیتے ہو؟ انہوں نے کہا چند وجوہ سے۔

یہودیوں کی حضرت جبریل علیہ السلام کے ساتھ عداوت کی وجہ

پہلی وجہ یہ ہے کہ قدیم زمانے سے نبوت اور رسالت ہمارے خاندان میں تھی اب جبریل نے یہ عمدہ منصب بنی اسماعیل میں مقرر کر دیا۔ اور ہمیں اس خدمت سے معزول کر دیا۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ پہلی اُمتوں پر خسف' مسخ' عذاب' قحط اور وباء اسی نے نازل کی جبکہ میکائیل (علیہ السلام) بارش' عطا اور فراخی والا ہے۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ پیغمبروں نے ہمیں خبر دی تھی کہ بیت المقدس ایک شخص کے ہاتھوں خراب ہوگا جس کا نام بخت نصر ہوگا' بابل اور عراق کی سرزمین میں پیدا ہوگا۔ اس کے پیدا ہونے کا وقت فلاں تاریخ ہوگی۔ اور اس کی سکونت فلاں جگہ ہوگی۔ اور اس کے ہاتھوں بنی اسرائیل کی ایسی تباہی اور خرابی ہوگی جو کہ بیان سے باہر ہے۔ جب اس کے پیدا ہونے کا وقت آیا تو ہمارے بزرگوں نے اپنے اعتباری آدمیوں میں سے چند لوگوں کو چوری چھپے بھیجا تا کہ اس بچے کو کسی حیلہ و تدبیر کے ساتھ قتل کر دیں۔ جب ہمارے بزرگوں کے بھیجے ہوئے آدمی بخت نصر کے شہر میں پہنچے اور اسے بچوں میں کھیلتا ہوا پایا اور چاہا کہ اسے قتل کر دیں۔ جبریل (علیہ السلام) ایک آدمی کی صورت میں ظاہر ہوا۔ اور اس بچے کو اپنے دامن میں چھپا لیا۔ اور کہا کہ اگر یہ بچہ وہی ہے۔ جس کے ہاتھوں تمہیں تکلیف پہنچنا مقدر ہے تو تمہیں اسے قتل کرنے پر قدرت حاصل نہیں ہوگی کیونکہ تقدیر بدل نہیں سکتی۔ اور اگر یہ بچہ وہ نہیں جس کا وعدہ دیا گیا ہے تو بے گناہ بچے کو کیوں قتل کرتے ہو؟ ہمارے بزرگوں کے بھیجے ہوئے آدمی واپس آ گئے اور بخت نصر جب جوان ہوا۔ اور اس نے شام اور بیت المقدس پر فوج کشی کی اور بنی اسرائیل کو زیر و زبر کر دیا۔

یہودیوں کے بیت المدارس میں فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کا کلمۂ حق

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان کا یہ عذر سُن کر خاموش رہے حتیٰ کہ ایک دن امیر المومنین حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ اس زمین کی جو کہ یہودیوں کے مدرسہ کے ساتھ متصل تھی، دیکھ بھال کے لیے جا رہے تھے۔ اور آپ کی عادت یوں تھی کہ جب بھی اس راہ سے گزرتے، یہودیوں کے مدرسہ میں داخل ہو جاتے اور ان سے تورات اور دوسری پہلی کتابوں کی نصیحتیں اور حکمتیں سنتے اور تعجب کرتے کہ کتب الٰہیہ آپس میں ایک دوسرے کی تصدیق کرنے والی ہیں اس دن بھی اسی عادت کے مطابق ان کے بیت المدارس میں داخل ہو گئے اس دن یہودیوں کے عقل مند جمع تھے۔ سب نے مرحبا کہا اور کہنے لگے کہ ہم تمہیں بہت پسند کرتے ہیں۔ اور غالب گمان یہ ہے کہ آپ بھی ہمیں دوست رکھتے ہیں۔ کیونکہ آپ کے سوا پیغمبر علیہ السلام کے اصحاب میں سے ہمارے پاس کوئی نہیں آتا، آپ اکثر تشریف لاتے ہیں۔ حضرت امیر المومنین نے فرمایا کہ تمہارے پاس میری آمد و رفت از رہ محبت نہیں ہے۔ اور میں جو تم سے سوال کرتا ہوں اور جواب سنتا ہوں یہ اس لیے نہیں ہے کہ مجھے میرے دین کے بارے میں کوئی شک وشبہ باقی رہ گیا ہے۔ بلکہ اپنے دین کے بارے میں مزید بصیرت حاصل کرنے کے لیے تمہارے پاس آتا ہوں۔ اور تمہاری کتابوں کی رو سے اپنے رسول علیہ السلام کے آثار اور علامات معلوم کرتا ہوں اور میرا ایمان دَم بدم قوت پکڑتا ہے۔ اور میں تم سے تعجب کرتا ہوں کہ اس قدر معرفت کے باوجود تمہیں کیا بیماری ہے کہ اس طرح کے عظیم الشان رسول علیہ السلام پر ایمان نہیں لاتے ہو۔ اور ان کی پیروی سے مشرف نہیں ہوتے ہو۔

یہودیوں نے کہا کہ اس رسول کی پیروی سے ہمارے انحراف کی بھی ایک وجہ ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ رسول علیہ السلام پر وحی لانے والا جبریل (علیہ السلام) ہے۔ جبکہ جبریل (علیہ السلام) کو ہم دشمن سمجھتے ہیں۔ کیونکہ جہان میں جہاں بھی خسف، مسخ اور عذاب واقع ہوا ہے اسی کے وسیلہ سے ہوا۔ نیز جبریل مشرب کا جاسوس ہے۔ اور چغلی کرتا ہے ہم خفیہ طور پر جتنی بھی تدبیریں کرتے ہیں، وہ سب کی سب محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر کھلے

عام پہنچا دیتا ہے۔ اور ہمیں بے وقعت کرتا ہے۔ اور میکائیل (علیہ السلام) بارش' فراخی اور نعمت والا ہے اور بردبار فرشتہ ہے کہ کسی کی بات کسی دوسرے تک بالکل نہیں پہنچاتا۔ اگر یہ وحی لانے والا میکائیل (علیہ السلام) ہوتا' ہم ضرور ایمان لانے والے ہوتے اور پیروی کرتے۔ حضرت امیر المومنین عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں تم سے پوچھتا ہوں کہ بارگاہِ خداوندی میں ان دونوں فرشتوں کا مرتبہ کیا ہے؟ انہوں نے کہا کہ دونوں اس دربار میں کمال مرتبہ رکھتے ہیں جہاں تجلی الٰہی ظہور فرماتی ہے' جبریل (علیہ السلام) دائیں جانب ہوتے ہیں۔ اور میکائیل (علیہ السلام) بائیں جانب۔ حضرت امیر المومنین رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ تم گدھوں سے زیادہ کند ذہن اور کافر ہو۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک ان کے قرب اور مرتبہ سے معلوم ہوا کہ جو کوئی ان میں سے ایک کا دشمن ہوگا اس دوسرے کا بھی دشمن ہو گا۔ اور جو ان دونوں کا بھی دشمن ہوگا' خدا تعالیٰ کا بھی دشمن ہوگا۔ حضرت امیر المومنین رضی اللہ عنہ کی یہ باتیں یہودیوں پر بہت ناگوار اور گراں گزریں۔ ان کی محفل بدمزا ہوگئی۔ وہاں سے اُٹھ کر اس کا ماجرا کے اظہار کے لیے آپ نے بارگاہِ سید عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا قصد کیا۔ اس سے پہلے کہ آپ محفل پاک میں پہنچیں' حضرت جبریل علیہ السلام یہ آیت لا چکے تھے۔ جیسے ہی آپ پہنچے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا لقد وفقك ربك یا عمر۔ تحقیق تیرے رب نے تیری موافقت فرمائی یعنی تیری تقریر کے مطابق حق تعالیٰ نے یہودیوں کو الزام دیا۔ اور یہ آیت تلاوت فرمائی۔ حضرت امیر المومنین فرماتے تھے کہ اس کے بعد میں دین اور ایمان کے بارے میں ایسی حالت پر پہنچا کہ میں اپنے آپ کو دینی مقدمات میں پتھر سے زیادہ سخت پاتا تھا۔

یہاں جاننا چاہیے کہ قرآن پاک کی ان تین صفات میں جو کہ مصدقا لما بین یدیه وهدی وبشرٰی للمؤمنین ہیں' کے ذکر میں یہاں ایک مضبوط نکتہ ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ دنیا میں کسی دوسرے سے سُنی ہوئی بات کی تصدیق کا باعث تین چیزوں میں ایک ہوتی ہے: پہلی چیز یہ کہ وہ کلام سننے والا ایک مشرب کا پابند ہے اس کے بزرگ جو کچھ کہہ کر چلے گئے ہیں اس کا شدت کے ساتھ معتقد ہوتا ہے۔ اگر کوئی اس کے بزرگوں کے

کہے ہوئے کے مطابق کہتا ہے اسے فوراً مان لیتا ہے۔ اور جو اس کے خلاف ہو اگرچہ اس پر عقلی دلیل قائم ہو وہ بات اس کے ذہن میں نہیں بیٹھی۔

دوسری چیز یہ ہے وہ کلام سننے والا محقق اور دلیل کا طالب ہے تو اگر اس پر کوئی قوی دلیل پالے گا' قبول کرے گا ورنہ انکار کردے گا۔ تیسری چیز یہ ہے کہ کلام کو سننے والا بچوں اور عورتوں کی طرح وہم اور خیال سے مغلوب ہے پس ہر خوش کن چیز جو کہ کسی مطلب کے حصول یا کسی مصیبت کو دُور کرنے پر دلالت کرے تو دلیل میں غور کیے بغیر اس کے نزدیک اس کی تصدیق واجب ہوتی ہے۔ اور ہر ناخوش چیز جو کسی خوف ناک امر سے ڈراتی ہے اس کا یقین نہیں کرتا۔ پس مصدقا لما بین یدیہ تصدیق کے پہلے باعث کا اشارہ ہے۔ اور ھدی دوسرے باعث کا جبکہ بشری للمؤمنین تیسرے باعث کا اشارہ ہے۔ اور جب تصدیق کے تینوں باعث اس کلام میں جمع ہو گئے ہوں پھر تصدیق نہ کرنا اور کفر اختیار کرنا کمال حماقت اور بے وقوفی ہے خصوصاً اس ناقابلِ قبول عذر کے ساتھ کہ ہمارے دشمن کی لائی ہوئی ہے۔

چند جواب طلب سوالات اور جوابات

یہاں چند جواب طلب سوالات باقی رہ گئے۔ پہلا سوال یہ ہے کہ شرط اور جزا کے درمیان کوئی رابطہ چاہیے۔ اور یہاں شرط جو کہ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيْلَ ھے۔ اور جزا جو کہ فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ بِاِذْنِ اللّٰهِ ہے کہ درمیان کوئی رابطہ معلوم نہیں ہوتا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس شرط و جزا کے درمیان ربط کے مفسرین کے نزدیک دو طریقے ہیں: پہلا طریقہ یہ ہے کہ اس شرط کی جزا کو محذوف رکھیں اور اس محذوف جزا کی دلیل کو جو کہ فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ بِاِذْنِ اللّٰهِ ہے اس جزا کے قائم مقام سمجھیں۔ پس کلام کا معنی یوں ہوگا کہ اگر کوئی جبریل (علیہ السلام) کو دشمن سمجھتا ہے تو اس کی دشمنی محض بلاوجہ ہے۔ کیونکہ جبریل (علیہ السلام) بارگاہِ الٰہی سے بندوں کے لیے اس عظیم نعمت کے حصول کا واسطہ ہے۔ اور جب نزولِ قرآن پاک جبریل (علیہ السلام) کے واسطہ سے صرف اللہ تعالیٰ کے حکم کے ساتھ ہے نہ کہ بالاستقلال اپنی خواہش سے۔ پس اگر اس پر نظر کریں کہ جبریل (علیہ

السلام) اس کام پر مامور ہے تو چاہیے کہ اسے معذور سمجھیں اور جانیں کہ اگر اللہ تعالیٰ میکائیل (علیہ السلام) کو اس کا حکم دیتا تو وہ بھی یہی کرتا اور اس پر بھی اشکال وارد ہوتا۔ اور اگر اس بات پر نظر کرے کہ جبریل (علیہ السلام) ہمارے لیے ہدایت اور بشارت سے ہر ایک دسترخوان لائے ہیں۔ اور انہوں نے ہمارے درد کی شفاخانہ غیب سے شافی دوا ہم تک پہنچائی ہے تو چاہیے کہ جبریل علیہ السلام کے شکرگزار ہوں اور ہزار زبان سے اس احسان کا شکر ادا کریں۔ اور ہزار دل سے اس سے محبت کریں۔

دوسرا طریقہ یہ ہے کہ اس شرط کی جزا محذوف نہیں ہے۔ بلکہ فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ الخ جزا واقع ہوئی لیکن بلغاء کے کلام میں شرط کی جزا دو وجہ سے آتی ہے: ایک وہ جو شرط پر منفرع اور مرتب ہوتی ہے۔ اور شرط اس کا سبب ہوا اسے بطور جزا ذکر کرتے ہیں۔ جیسا کہ یہاں کہتے ہیں کہ من کان عدوالجبریل استحق اشد العذاب یعنی جو جبریل (علیہ السلام) کا دشمن ہوا شدید عذاب کا مستحق ہوا۔ دوسری وجہ یہ کہ جس پر شرط متفرع اور مرتب ہو۔ اور وہ شرط کے حصول کی وجہ بنا ہوا سے ذکر کرتے ہیں۔ جیسا کہ کہتے ہیں ان عاداك زید فقد آذیته واسات الیه یعنی اگر زید نے تیرے ساتھ عداوت کی تو بے شک تو نے اُسے ستایا تھا۔ اور بُرا سلوک کیا تھا۔ یہاں بھی یہی راہ اختیار کی گئی ہے۔ کیونکہ یہودیوں پر اس عداوت میں جو کہ جبریل علیہ السلام کے ساتھ رکھتے' دو طریقوں سے عذاب پیش نظر ہے: پہلا طریقہ اس عداوت کے سبب کی خباثت کے بیان میں' دوسرا طریقہ اس عداوت کے ثمرہ اور نتیجہ کی بُرائی اور قباحت کے بیان میں جو کہ آئندہ آیت میں مذکور ہے۔ اور جب ہر چیز کا سبب اس کے سبب سے طبعی طور پر پہلے ہوتا ہے تو ذکر کرنے میں بھی سبب عداوت کو اس کے نتیجے سے پہلے لانا منظور ہوا۔ پس اس طریقے پر کلام کا معنی یوں ہے کہ جو جبریل (علیہ السلام) کا دشمن ہوا تو اس دشمنی کا سبب یہ ہے کہ وہ قرآن پاک کو آپ کے دل پر القاء کرتا ہے نہ کہ بنی اسرائیل میں سے کسی کے دل پر۔ اور چونکہ وہ قرآن پاک تمام کتابوں کے کمال کا جامع الصفات ہے کہ گزشتہ کتابوں کے مطابق بھی ہے' روشن دلیل بھی اور بشارت اور خوش خبری بھی۔ ان کے حسد کی رگ حرکت میں آئی' انہوں نے

اسے نازل کرنے والے کو دشمن قرار دے دیا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ جب کسی کی دشمنی کا سبب حسد ہو۔ اور وہ بھی دینی نعمت پر تو وہ اس عداوت سے زیادہ قبیح ہوتی ہے۔ جس کا سبب دشمنی کے اسباب میں سے کوئی اور ہو۔

دوسرا سوال یہ ہے کہ نزلہ کی ضمیر قرآن کی طرف لوٹتی ہے۔ حالانکہ لفظ قرآن مذکور نہیں ہے پس اضمار قبل الذکر لازم آیا۔

اس کا جواب یہ ہے کہ ضمیر کو کبھی اسم اشارہ کا حکم دیتے ہیں۔ اور اس کی جگہ استعمال کرتے ہیں۔ اور اس استعمال میں مشار الیہ کی ذات کا حاضر ہونا کفایت کرتا ہے' لفظوں میں اس کا ذکر درکار نہیں۔ اور تلاوتِ قرآن کے وقت ذاتِ قرآن کی حاضری بلاشبہ متحقق ہے۔ پس یہ استعمال صحیح ہوا جیسا کہ انا انزلناه في ليلة القدر میں معلوم ہے۔

چند چیزوں میں اضمار قبل الذکر جائز ہے

اور یہی وجہ ہے کہ عربی دانوں نے اصل عربوں کی استعمال شدہ ترکیبوں کے تجسس کے بعد کہا ہے کہ ان کے نزدیک چند چیزوں میں اضمار قبل الذکر جائز ہے۔ جیسے آسمان' زمین' روز و شب اور ہاتھ کی انگلیاں اور ان کی مثل جیسے ولو یواخذ اللہ الناس بما کسبوا ماترك على ظهرها من دابة (فاطر آیت ۴۵) اور جیسے انها لغداة باردة والذی شقهن خمسا اور اس کی تحقیق یہی ہے کہ ان استعمالات میں ضمائر کو اسمائے اشارہ کی جگہ لاتے ہیں۔ اور اسم اشارہ کے استعمال میں مشار الیہ کی ذات کا حاضر ہونا کافی ہے۔ اور یہ چیزیں غالباً اس انداز میں حاضر ہوتی ہیں کہ اشارہ کو صحیح قرار دیا جاسکتا ہے۔

تیسرا سوال یہ ہے کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یہ بات کرنے پر مامور ہوئے تو ان کی زبان سے یوں فرمانا چاہیے تھا کہ فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِیْ بِاِذْنِ اللّٰهِ۔ عَلٰى قَلْبِكَ کیوں فرمایا؟ اس کا جواب اکثر مفسرین نے یوں دیا ہے کہ عَلٰى قَلْبِكَ لفظ خطاب اللہ تعالیٰ کے کلام کی حکایت کی بناء پر وارد ہے گویا اس طرح ارشاد ہوتا ہے کہ یہ کلام جو کہ میں فرماتا ہوں' لوگوں کو خصوصاً یہودیوں کو پہنچا دیں۔ پس اس صورت میں عَلٰى قَلْبِیْ وارد کرنا مناسب نہیں بلکہ عَلٰى قَلْبِكَ مقرر ہے۔ اور ان میں سے بعض نے کہا ہے کہ حضور علیہ

السلام مامور نہ تھے مگر صرف جملہ شرطیہ کہنے کے جس کی شرط موجود ہے۔اور جزا محذوف اور وہ اللہ تعالیٰ کا قول

مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيْلَ فَاِنَّهٗ لعادی من لایعادی یعنی وہ اس سے عداوت کرتا ہے۔جس سے عداوت کی نہیں جاتی۔اور آنے والا کلام یعنی فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ بِاِذْنِ اللّٰهِ جو کہ اس جملہ شرطیہ کی دلیل ہے آمر کے کلام سے ہے۔جو کہ حق تعالیٰ ہے۔

چوتھا سوال یہ ہے کہ تنزیلِ قرآن تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سارے جسد مقدس پر تھا نہ صرف قلب مقدس پر۔پس عَلٰى قَلْبِكَ کا لفظ وارد کرنے کی کیا وجہ ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ تمام وجود پر قرآن پاک کا نزول حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ ساری اُمت کو عام ہے۔کیونکہ قرآن پاک جس طرح جبریل علیہ السلام کے واسطے سے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہوا اسی طرح حضور علیہ السلام کے وسیلہ سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہما پر نازل ہوا۔جو کہ حضور علیہ السلام سے قرآن پاک سننے کی دولت سے مستفید ہوئے اور ان سننے والوں کے واسطہ سے دوسرں پر اُترا۔اور اسی طرح ہمارے زمانے تک جو فرق کہ ہے صرف واسطوں کی قلت اور ان کی کثرت کی وجہ سے ہے۔اور جو کچھ حضور علیہ السلام کے ساتھ مخصوص ہے وہ قرآن پاک کا دل پر اُترنا ہے۔جو کہ اُمتیوں کو حاصل نہیں ہے۔

اور اس مبہم مسئلہ کی وضاحت یہ ہے کہ کسی کا کلام کسی تک دو طریقوں سے پہنچتا ہے:
پہلا طریقہ یہ کہ کان پر وارد ہو۔اور کان کے راستے دل پر وارد ہو۔اور یہ طریقہ عام جامع اور متعارف ہے۔اور اُمتیوں کو کلام اللہ اسی طریقے سے پہنچتا ہے دوسرا طریقہ یہ ہے کہ پہلے اور ابتدائی طور پر دل پر وارد ہو۔اور ترتیب یافتہ الفاظ خیال میں حاضر ہوں۔اور یہ طریقہ اہلِ کمال کے ساتھ خاص نادر اور غیر مشہور ہے۔حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو قرآن مجید جبریل علیہ السلام کے واسطہ سے اسی طریقے سے پہنچتا تھا۔اور اسی وجہ سے حضور علیہ السلام کو اس کلام کو یاد رکھنے میں تکرار کے ساتھ بار بار پڑھنے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔اور آپ اسے بھولتے نہیں تھے۔ورنہ ایک بار سُنا ہوا کلام خصوصاً طویل کلام یاد نہیں رہتا اگرچہ

کسی شخص کا حافظہ قوی ہو۔ پس اس نزول کی تخصیص کے لیے کہ باعثِ حسد یہی ہے لفظ عَلٰی قَلْبِکَ کا لانا ضروری ہوا۔

لفظ جبرَیل کی تحقیق

ہم لفظ جبریل کی تحقیق پر آتے ہیں۔ جاننا چاہیے کہ اہلِ عربیت کے اجماع کے مطابق جبرئیل علیت اور عجمہ کی وجہ سے اس کی شرط کے ساتھ غیر منصرف ہے۔ اور اکثر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی روایات کے مطابق اس کا معنی عبداللہ ہے۔ اس تفصیل کے ساتھ کہ جبر بمعنی اپنے مالک کے ہاتھوں میں بے اختیار اور مجبور بندہ اور ایل یعنی اللہ ہے۔ اور تفسیر ابن جریر اور ابن ابی حاتم میں حضرت ابن عباس' عکرمہ' علقمہ وغیرہم رضی اللہ عنہم سے اسی طرح روایت کی گئی ہے۔ ابن دیلمی میں ابوامامتہ سے مرفوعاً روایت کی گئی کہ رسول پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا اسم جبریل عبداللہ واسم میکائیل عبداللہ واسم اسرافیل عبدالرحمٰن ہے۔

اور ابوالشیخ کی کتاب العظمۃ میں اس روایت کی مانند حضرت امام زین العابدین رضی اللہ عنہ سے بھی منقول ہے۔ اور احتمال ہے کہ جبریل (علیہ السلام)' میکائیل (علیہ السلام) اور اسرافیل (علیہ السلام) کہ ان کے آخر میں کلمہ ایل ھے۔ اور ایل بمعنی اللہ ہے' ان تینوں فرشتوں کے القاب ہوں اور مذکورہ نام یعنی عبداللہ اور عبدالرحمٰن ان کے مخصوص اسمائے علم ہوں نہ کہ ان القاب کا ترجمہ۔ پس کوئی تعارض نہیں رہتا۔

اور بیہقی شعب الایمان اور خطیب مفترق و متفق میں ابن عباس رضی اللہ عنہما سے لائے کہ کل اسم فیہ ایل فھو عبداللہ یعنی جس اسم میں ایل ہوگا' وہ عبداللہ ہے۔

بہر حال ان فرشتوں کے نام آدمیوں کے ناموں کی طرح نہیں ہیں کہ زنگی کا فور اور فاسق کو صالح کہتے ہیں۔ بلکہ ان کے نام توقیفی یعنی اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ ہیں۔ پس ان کے مرتبہ کمال پر دلالت کرتے ہیں۔ بلاشبہ ان القاب کی طرح جو امراء کو بادشاہوں کی طرف بخشے جاتے ہیں۔ اور ان کے درجوں اور مرتبوں پر دلالت کرتے ہیں۔ جیسے وزیراعظم' امیر الامراء اور میر سامان وغیرہم تو جبریل (علیہ السلام) اپنے اس نام کے

مدلول کے تقاضا کی وجہ سے جو کہ یہودیوں کے نزدیک انہیں جنابِ حق تعالیٰ سے عنایت فرمایا گیا' قدرتِ الٰہی کے ہاتھ میں مجبور ہو۔ اور ایک آلہ ہونے سے زیادہ اس کا مرتبہ نہ ہو۔ اور ایک حالت جو کہ اس مصرع کے مضمون کا نمونہ ہے اوبجز نانی وماجز نیهم یعنی وہ بانسری بجانے والا اور میں بانسری ہوں۔ اسے بارگاہِ خداوندی میں حاصل ہے۔ پس اس کام کی وجہ سے اس سے عداوت درحقیقت خدا تعالیٰ سے عداوت ہے اس غصے کے ساتھ کہ اس نے اپنا فضل اپنے بندوں میں سے کسی پر کیوں اُتارا اور ظاہر ہے کہ

مَنْ کَانَ عَدُوًّا لِّلّٰہِ جو خدا تعالیٰ کا دشمن ہو۔ اس بات پر کہ اس نے اپنے بندوں میں سے ایک بندے پر ہمارے مشورہ اور جائز کرنے کے بغیر اپنا فضل کیوں نازل کیا۔ وَمَلٰٓئِکَتِہٖ اور دشمن اس کے فرشتوں کا بھی کہ وہ اللہ تعالیٰ کے کہنے اور حکم دینے پر اس بندے پر یہ فضل اور فیض پہنچانے میں کوئی مصروف ہوئے اگر چہ وہ فرشتے نہ ہوں۔ وَرُسُلِہٖ اور دشمن اس کے رسولوں کا بھی کہ انہوں نے یہ فیض کیوں قبول کیا اور ہمارا لحاظ نہ کیا اگر چہ وہ رسول فرشتے نہ ہوں۔

وَجِبْرِیْلَ اور خصوصاً جبریل (علیہ السلام) کا بھی دشمن جو کہ فرشتہ بھی ہے۔ اور رسول بھی اور معلمِ قرآن اور اس رسول علیہ السلام کے قلب مقدس میں اسے ثابت کرنے والا۔ وَمِیْکَالَ

اور خصوصاً میکائیل (علیہ السلام) کا بھی دشمن۔ جو کہ فرشتہ بھی ہے۔ اور جبریل (علیہ السلام) کا مدد معاون بھی۔ اور اس رسول علیہ السلام کے قلب مبارک پر قرآن نازل کرنے پر راضی بھی اور درحقیقت عام فرشتوں اور رسولوں اور خصوصاً ان دو فرشتوں اور دو رسولوں سے دشمنی خدا تعالیٰ سے دشمنی ہے۔ کیونکہ ہر شخص کے محبوب اور بھیجے ہوئے کی دشمنی اس شخص کی دشمنی ہوتی ہے۔ پس اس شخص نے چند طرفوں سے خدا کی دشمنی کے اسباب اپنے لیے جمع کر لیئے پہلے تو خدا تعالیٰ کو دشمن قرار دیا۔ اور اس کے فعل پر اعتراض کیا۔ دوسرے اس کے خاص بندوں کو جو کہ اس کے محبوب ہیں۔ اور اس کے حکم کے مطابق کام کرتے ہیں' دشمن قرار دیا۔ اور تیسرے خصوصاً جبریل اور میکائیل (علیہ السلام) کو دشمن قرار دیا جو کہ تمام

فرشتوں اور رسل ملائکہ سے ممتاز ہیں۔ پس خداتعالیٰ کی عداوت اس پر لوٹی اور جس طرح اس نے خداتعالیٰ کو دشمن قرار دیا' خداتعالیٰ اسے دشمن قرار دے گا۔

فَاِنَّ اللّٰهَ عَدُوٌّ لِّلْكٰفِرِيْنَ کیونکہ اللہ تعالیٰ کافروں کا دشمن ہے۔ اگرچہ وہ ایک وجہ سے کفر اختیار کریں۔ انہیں جنہوں نے کئی وجہ سے کفر کیا' خداتعالیٰ کو دشمن قرار دیا۔ اور فرشتوں' رسولوں اور جبریل و میکائیل (علیہ السلام) کو بھی دشمن قرار دیا کیوں دشمن قرار نہ دے کیونکہ ان کا کفر انواع کفر میں سب سے زیادہ شدید ہے۔

یہاں جاننا چاہیے کہ جبریل اور میکائیل (علیہ السلام) کا فرشتوں کے بعد ذکر حالانکہ یہ ان میں شامل ہیں اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ انہیں قرب و منزلت میں ایک بہت بلند مرتبہ حاصل ہے۔ خصوصاً یہ کہ ان کی دشمنی خدا کی دشمنی کا موجب ہو جاتی ہے۔ گویا یہ دونوں فرشتے ملکیت سے قطع نظر جو کہ موجب محبت ہے' ایسا مرتبہ رکھتے ہیں کہ ان کی محبت ایمان اور ان کی عداوت کفر ہے۔ اور اسی خصوصیت کا فائدہ دینے کے لیے مستقل طور پر ان دونوں فرشتوں کے نام ذکر فرمائے۔ ورنہ عام کے ذکر کے بعد خاص کا ذکر اتنا ضروری نہیں ہوتا۔ نیز یہاں ان دو فرشتوں کو خصوصیت سے ذکر کرنے کی ایک اور وجہ بھی ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ اس آیت کے نزول کا سبب وہ گفتگو تھی جو کہ جبریل اور میکائیل (علیہما السلام) کے بارے میں یہودیوں اور مسلمانوں کے درمیان واقع ہوئی تھی۔ اور اگرچہ عداوت کے مقام میں صرف جبریل علیہ السلام کا ذکر تھا نہ میکائیل (علیہ السلام) کا لیکن چونکہ اپنے پروردگار کی رضا اور اطاعت کے اتحاد میں ایک دوسرے کے ساتھ ایک جان دو قالب کا حکم رکھتے ہیں۔ اس لیے میکائیل (علیہ السلام) کے ذکر کا اشارہ فرمایا باوجود کہ جبریل (علیہ السلام) کی عداوت یقیناً میکائیل (علیہ السلام) کی عداوت ہے۔ اگرچہ زبان کے ساتھ نہ کہیں۔ اور اپنے آپ کو میکائیل (علیہ السلام) کا دوست کہیں۔ فرقہ روافض کی طرح جو کہ تینوں خلفائے راشدین رضوان اللہ علیہ اجمعین سے عداوت رکھتے ہیں۔ اور اپنی زبان سے خلیفہ چہارم کے دوست کہلاتے ہیں۔ حالانکہ ان تینوں میں سے ہر ایک کی عداوت یقیناً چوتھے خلیفہ سے بھی عداوت ہے۔ اور کیا ہی اچھا کہا گیا۔ رباعی

ربط خلفاء اربعہ ہست ازلی
گفتن ازخلاف شاں بودشرجلی
دانداین نکتہ طفل ابجدخواں ہم
کزوصل سہ مفردست ترکیب علی

یعنی چاروں خلفاء کا تعلق ازلی ہے' ان کے خلاف کہنا شرک جلی ہے' ابجد پڑھنے والا بچہ بھی یہ نکتہ جانتا ہے کہ تین مفردوں کا ملنا علی کی ترکیب ہے۔

نیز جاننا چاہیے کہ یہاں حرف واو بمعنے او ہے۔ کیونکہ ان پانچوں مذکورین میں سے ایک کی عداوت کفر کے حصول میں کافی ہے۔ لیکن یہاں ایک باریک نکتہ ہے۔ جس نکتہ دقیقہ کی رعایت کرتے ہوئے حرف اوکو چھوڑ کر حرف واؤ وارد فرمایا گیا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ اگرچہ بظاہر ممکن ہے کہ کسی شخص کو ان پانچ مذکورین میں سے ایک کے ساتھ عداوت ہو۔ اور دوسرے کے ساتھ عداوت نہ ہو لیکن گہری نظر سے پتہ چلتا ہے کہ ان میں سے ہر ایک کی عداوت سب کی عداوت کو لازم کرتی ہے تو حقیقت میں ان سب کی عداوت اکٹھی ہوگی نہ کہ جدا جدا۔

جواب طلب سوال

یہاں ایک جواب طلب سوال باقی رہ گیا اور وہ یہ ہے کہ اکثر روایات کے مطابق اسرافیل (علیہ السلام)' جبریل (علیہ السلام) سے افضل ہیں تو اس کی عداوت کو یہاں خصوصیت کے ساتھ کیوں ذکر نہیں کیا گیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اسرافیل علیہ السلام کا دنیوی جزوی امور جو کہ کثیر الوقوع ہیں کہ ساتھ تعلق نہیں ہے مگر ان تینوں جبریل' میکائیل اور عزرائیل علیہم السلام کے واسطے سے۔ پس حقیقت اسرافیلی حقیقت جنسی کی منزل میں ہے۔ جس کا کوئی اثر نہیں۔ مگر انواع کے ضمن میں۔ اور ان تینوں کے حقائق حاصل شدہ انواع کے مقام میں ہیں۔ اور خوب ظاہر ہے کہ جنسی معنی محبت اور عداوت سے متعلق نہیں ہوسکتا کیونکہ ایک قسم کے اطلاق کی وجہ سے جو وہ رکھتا ہے' ایک دوسرے کے مقابل آنے والی قیود کا جامع ہو جاتا ہے۔ اگر ایک جہت سے عداوت کے ساتھ متعلق ہو تو دوسری طرف سے

محبت کا متعلق ہو جاتا ہے۔ اور اس کے برعکس اور عزرائیل علیہ السلام چونکہ روحیں قبض کرنے پر مقرر ہیں۔ اور موت طبعی طور پر ہر حیوان کو مکروہ ہے عموماً اور انسان کو خصوصاً۔ پس ان کے فعل کی کراہت اگر عداوت کے ساتھ مشتبہ ہو جائے تو گنجائش نکل سکتی ہے۔ بخلاف ان دو فرشتوں کے کہ نہ تو حقیقت عداوت ان کی طرف متصور ہو سکتی ہے۔ اور نہ عداوت کا شبہ۔ پس ان کی عداوت صراحتاً خدا تعالیٰ کی عداوت ہے اللہ تعالیٰ ہمیں اس سے پناہ دے۔ (آمین)

حضرت جبریل-اسرافیل اور عزرائیل کے قرب کا بیان

اور ابوالشیخ نے کتاب العظمۃ میں بیہقی نے شعب الایمان میں معتبر سند کے ساتھ روایت کی ہے' ایک دن حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حضرت جبریل علیہ السلام کے ہمراہ تنہا بیٹھے تھے کہ اچانک آسمان کا کنارہ شق ہوا۔ اور اس شق ہونے کی وجہ سے حضرت جبریل علیہ السلام سمٹنا شروع ہوئے۔ اور سر زمین پر رکھنے لگے۔ اور ان پر تواضع اور عاجزی' خوف اور گھبراہٹ کے آثار ظاہر ہونا شروع ہوئے۔ اسی حالت میں ایک فرشتہ حضور علیہ السلام کے پاس انسانی شکل میں نمودار ہوا۔ اور اس نے کہا کہ اے محمد! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! آپ کا پروردگار آپ پر سلام فرماتا ہے۔ اور آپ کو اختیار دیتا ہے کہ آپ چاہیں تو بادشاہ منش پیغمبر ہوں اور اگر چاہیں تو بندہ منش پیغمبر کی طرح زندگی بسر کریں۔ حضور علیہ السلام سوچنے لگے۔ اور جبریل علیہ السلام کی طرف دیکھا۔ حضرت جبریل علیہ السلام نے سر جھکا کہ اشارہ کیا کہ بندگی اور عاجزی اختیار فرمائیں۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ میں بندوں کی طرح زندگی بسر کروں گا' مجھے بادشاہی نہیں چاہیے۔ وہ فرشتہ یہ جواب سن کر آسمان کی طرف عروج کر گیا۔ اس عجیب واقعہ کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت جبریل علیہ السلام سے فرمایا کہ اے جبریل! (علیہ السلام) میں تم سے پوچھنا چاہتا تھا کہ یہ فرشتہ کون ہے۔ اور تمہیں اس کے دیکھنے سے یہ حالت کس لیے لاحق ہوئی؟ جبریل علیہ السلام نے کہا کہ یہ فرشتہ اسرافیل (علیہ السلام) ہے۔ جس دن سے حق تعالیٰ نے اسے پیدا فرمایا ہے' تجلی الٰہی کے حضور کھڑا رہتا ہے۔ اور اپنے دونوں قدموں کی صف باندھ کر کمال خشوع سے کھڑا

رہتا ہے' اپنی آنکھ کبھی اوپر نہیں کرتا۔ اور اس کے اور اس کے پروردگار کے درمیان اس حالت میں بھی نور کے ساٹھ (۶۰) پردے حائل ہیں اگر ان پردوں میں سے ایک کے قریب ہو جائے' جل جائے۔ اور اس فرشتے کی ڈیوٹی یہ ہے کہ لوحِ محفوظ اس کے روبرو رکھی ہے۔ اور اسے اس لوح کی پوشیدہ چیزوں پر اطلاع دی گئی ہے جب بھی اللہ تعالیٰ کا ارادہ اس سے متعلق ہوتا ہے کہ آسمان یا زمین میں کوئی چیز واقع ہو' وہ لوح خود بخود بلند ہو جاتی ہے۔ اور اس فرشتے کے سامنے پہنچ جاتی ہے۔ اور یہ فرشتہ اسی وقت اس لوح میں دیکھتا ہے۔ اور اس مقدر یقینی کام کو دریافت کر لیتا ہے۔ اگر میرے متعلق کاموں میں سے ہو تو مجھے حکم دے دیتا ہے۔ اور میکائیل (علیہ السلام) کے کاروبار سے تعلق رکھتا ہو تو اس کا میکائیل (علیہ السلام) کو حکم دے دیتا ہے۔ اور اگر ملک الموت کے ساتھ متعلق ہو تو اسے نامزد کرتا ہے۔

حضرت جبریل' حضرت میکائیل اور حضرت ملک الموت علیہم السلام کی خدمات کا بیان

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ میں نے جبریل علیہ السلام سے پوچھا کہ آپ کس کس کام پر مقرر ہیں؟ جبریل علیہ السلام نے کہا کہ ہوائیں چلانے اور لشکروں کی فتح و شکست پر۔ میں نے کہا کہ میکائیل (علیہ السلام) کس ڈیوٹی پر مقرر ہیں؟ انہوں نے کہا کہ بارش اور نباتات پر۔ میں نے کہا کہ ملک الموت کس کام پر ہیں؟ تو انہوں نے کہا کہ روحیں قبض کرنے پر پھر جبریل (علیہ السلام) نے کہا کہ جب اسرافیل علیہ السلام نیچے آئے' میں سمجھا کہ یہ قیامت قائم ہونے کا وقت ہے۔ اور ڈر گیا اور میری حالت کی جو تبدیلی آپ نے دیکھی اسی ڈر کی وجہ سے تھی۔

اور طبرانی نے سند ضعیف کے ساتھ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے کہ ایک دن حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ آیا تمہیں خبر نہ دوں کہ فرشتوں میں سے افضل کون ہے؟ ان میں سے افضل جبریل علیہ السلام اور پیغمبروں میں افضل حضرت آدم علیٰ نبینا علیہ

علیہم الصلوٰۃ والسلام ہیں۔ اور دنوں میں افضل روز جمعہ۔ اور مہینوں میں افضل ماہِ رمضان المبارک اور راتوں میں افضل شب قدر۔ اور عورتوں میں افضل مریم بنت عمران ہیں۔

لیکن یہاں جاننا چاہیے کہ حضرت جبریل علیہ السلام کی فرشتوں پر اور حضرت آدم علیہ السلام کی پیغمبروں علیہم السلام پر افضلیت مطلقاً نہیں ہے۔ بلکہ خصوصاً نوعِ انسانی کے لیے نفع بخش کاموں کا لحاظ کرتے ہوئے ہے۔ کیونکہ حضرت جبریل علیہ السلام خصوصیت کے ساتھ وحی اور شرائع نازل کر کے نوعِ انسانی کی تکمیل اور اس نوع کے افراد کی آخرت کی اصلاح، انوار و برکات کے ساتھ عبادت گزاروں اور اطاعت شعاروں کی امداد اور ظالموں اور فرعونوں کو ہلاک کرتے ہیں۔ ان جہتوں سے آپ کا اس نوع کے حق میں خصوصاً ایک احسان ہے ورنہ پہلی روایت میں گزرا کہ حضرت اسرافیل (علیہ السلام) قرب و منزلت اور لوحِ محفوظ کی پوشیدہ چیزوں پر مطلع ہونے میں آگے ہیں۔ بلکہ حضرت جبریل، حضرت میکائیل اور حضرت عزرائیل علیہم السلام پر حکم چلاتے ہیں۔

اسی طرح حضرت آدم علیہ السلام کی فضیلت اور بزرگی اس وجہ سے ہے کہ تمام آدمیوں کے اچھے اعمال آپ کے اعمال نامے میں لکھے ہوئے ہیں۔ اور آپ اس نوع کے اصل الاصول ہیں۔ اور اس نوع کے سب سے پہلے فرد۔ اور پہلے فرد ہیں جنہیں رب تعالیٰ نے بلاواسطہ اپنا خلیفہ فرمایا۔ ورنہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کا قرب و منزلت معلوم ہے۔ اور حدیث شفاعت میں صریح وارد ہوا کہ **آدم ومن دونه تحت لوائی یوم القیامة**۔

اور اس مسئلہ میں تحقیق کی انتہا یہ ہے کہ اگر عموم اور کمالات کے احاطہ پر نظر کی جائے تو حضرت آدم علیہ السلام کے برابر کوئی نہیں۔ کیونکہ نوعِ انسانی میں جو کمال ظاہر ہوا، ان کی ذات میں لپٹنے اور پیوست ہونے کے طریقے سے موجود تھا۔ یہاں تک کہ کمال محمدی علی صاحبہ الصلوٰۃ التسلیمات بھی۔ اور اگرچہ درجہ کمال کی بلندی پر نظر کی جائے تو خاتم المرسلین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذاتِ مقدس کے برابر کوئی نہیں ہے۔ اس کی مثال یہ ہے کہ روئی داغ لگے کپڑے سے لے کر شبنم اور جاری پانی تک لباس کے تمام کمالات کی جامع ہے۔

حالانکہ شبنم اور جاری پانی کے مرتبے کو نہیں پہنچتی۔

بیہقی نے شعب الایمان میں اور ابن ابی شیبہ نے ثابت بنانی سے روایت کی ہے۔ اور صالونی کتاب المائین میں جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے مرفوعاً روایت لائے کہ جبریل علیہ السلام کی ڈیوٹیوں میں سے یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے انہیں آدمیوں کی حاجات پیش کرنے پر داروغہ مقرر فرمایا ہے۔ اگر خدا تعالیٰ کے محبوبوں میں سے کوئی محبوب کوئی مطلب حاصل کرنے کے لیے بارگاہِ خداوندی میں دعا کرتا ہے' جبریل (علیہ السلام) عرض کرتے ہیں کہ فلاں بندہ مطلب چاہتا ہے۔ حکم ہوتا ہے کہ ابھی اس کی ضرورت روک لو۔ اور اس کا مقصد پورا نہ کرو تا کہ دعا زیادہ کرے۔ کہ مجھے اس کی آواز' دعا اور زاری اچھی لگتی ہے۔ اور اگر کوئی کافر یا فاجر کسی کے مقصد کے لیے دعا کرتا ہے' حکم ہوتا ہے کہ اس کا مقصد جلد پورا کردو تا کہ اپنی بُری آواز سے مجھے ناراض نہ کرے۔

حضرت جبریل علیہ السلام کی اصلی صورت کا بیان

اور حضرت ابوالشیخ نے حضرت اُم المومنین عائشہ رضی اللہ عنہا سے اور امام احمد نے بھی روایت کی ہے کہ ایک دن حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت جبریل علیہ السلام سے فرمایا کہ میں تمہیں تمہاری اصلی صورت میں دیکھنا چاہتا ہوں۔ حضرت جبریل علیہ السلام نے کہا کہ رات کی فلاں ساعت میں بقیع الفرقد میں تشریف لائیں تا کہ میں اپنی صورت سے آپ کو ایک جھلک دِکھاؤں۔ حضور علیہ السلام اس میدان میں تشریف لے گئے۔ اور آپ نے دیکھا کہ حضرت جبریل علیہ السلام آسمان کی طرف سے آرہے ہیں' لباسِ شاہی کے ساتھ جس میں مروارید' یاقوت اور زبرجد نصب ہیں۔ اور آپ کے چھ سو (۶۰۰) پر ہیں۔ اور ان پروں میں زبرجد' یاقوت اور مروارید پردیے ہوئے ہیں۔ اور ان میں سے ایک ایک پر اتنا فراخ ہے کہ اس نے آسمان کا کنارہ ڈھانپ رکھا ہے۔

جبریل علیہ السلام کی مختلف صورتوں میں حاضری

اور ابوالشیخ نے شریح بن عبید سے مرفوعاً روایت کی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

فرماتے ہیں کہ میں نے جبریل علیہ السلام کو مختلف شکلوں میں دیکھا ہے۔ اور اب اکثر دحیہ کلبی رضی اللہ عنہ کی صورت میں دیکھتا ہوں۔ اور اس سے پہلے مختلف صورتوں میں مجھ پر ظاہر ہوتے تھے۔ اور اکثر اوقات میں انہیں یوں دیکھتا تھا جیسے کوئی کسی کو چھلنی کے پیچھے سے دیکھتا ہے۔ اور بیہقی نے دلائل النبوۃ میں روایت کی کہ ایک دن حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ' حضور علیہ السلام کے چچا نے عرض کی یارسول اللہ! (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) میں چاہتا ہوں کہ آپ مجھے حضرت جبریل علیہ السلام کو ان کی شکل میں دِکھائیں۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ آپ کو انہیں دیکھنے کی طاقت نہیں ہوگی۔ انہوں نے عرض کی میں بہت قوی دل والا ہوں' بے جا نہیں ہوؤں گا۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا تشریف رکھیں۔ اچانک جبریل علیہ السلام نازل ہوئے۔ اور اپنے دونوں قدم اس بڑے پتھر پر جو کہ کعبہ شریف کے متصل رکھا ہوا تھا۔ اور لوگ طواف کے وقت اپنے کپڑے اس پر ڈال دیتے تھے' رکھ چھوڑے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ اپنی نظر اُٹھائیں۔ انہوں نے نگاہ اُٹھائی اور جبریل علیہ السلام کے دونوں قدم دیکھے اور غش کھا کر گر پڑے جب ہوش میں آئے' لوگوں نے پوچھا کہ آپ نے کیا دیکھا؟ تو آپ نے فرمایا کہ میں نے ایک سبز زبرجد دیکھا لیکن اس زبرجد میں اتنی گرمی اور چمک تھی کہ میری آنکھیں چندھیا گئیں اور میں بے خود ہو کر گر پڑا۔

اور ابن المبارک کتاب الزہد میں ابن شہاب سے لائے ہیں کہ ایک دن حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم چاندنی رات میں عیدگاہ کی طرف جا رہے تھے کہ اچانک جبریل علیہ السلام نہایت چمک دمک کے ساتھ ظاہر ہوئے۔ حضور علیہ السلام بے ہوش ہو کر گر پڑے جب افاقہ ہوا تو دیکھا کہ حضرت جبریل علیہ السلام' حضور علیہ السلام کا سر انور اپنے سینے پر رکھ کر اور اپنا ایک ہاتھ حضور علیہ السلام کے سینے پر اور دوسرا ہاتھ آپ کے دونوں کندھوں کے درمیان رکھ کر بیٹھے ہیں۔ اور پوچھ رہے ہیں کہ آپ کو کیا ہوا کہ آپ بے ہوش ہو گئے؟ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا مجھے گمان نہ تھا کہ مخلوقات میں سے کسی کی اتنی چمک اور شعاع بھی ہوگی۔ حضرت جبریل علیہ السلام نے کہا کہ اگر آپ اسرافیل (علیہ السلام) کو

دیکھیں جس کا ایک پر مشرق میں اور دوسرا مغرب میں ہے۔ اور عرش ان کے کندھے پر ہے' بہت تعجب کریں۔ اور جثے کے اس قدر طول وعرض کے باوجود بعض اوقات تجلی عظمت کی وجہ سے سمٹ کر چھوٹی سی چڑیا کی طرح ہو جاتا ہے۔

اور ابن ابوداؤد نے کتاب المصاحف میں حضرت امام محمد باقر رضی اللہ عنہ سے روایت کی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے حضرت امیر المومنین ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا یہ مرتبہ تھا کہ آپ حضرت جبریل علیہ السلام کی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ سرگوشی سن لیتے تھے۔ لیکن ان کی صورت نہیں دیکھتے تھے۔

اور حاکم نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے کہ ایک دن میں حضور علیہ السلام کی خلوت میں حاضر آیا اور حضرت جبریل علیہ السلام کو حضور علیہ السلام کے ساتھ دیکھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ افسوس کہ جو بھی نبیوں کے سوا جبریل علیہ السلام کو سر کی آنکھوں سے دیکھتا ہے' نابینا ہو جاتا ہے۔ لیکن میں تیرے لیے دعا کروں گا کہ یہ نابینائی تجھے آخری عمر میں لاحق ہو۔ چنانچہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما آخری عمر میں نابینا ہو گئے تھے۔

اور ابوالشیخ ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت سے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے لائے کہ جنت میں ایک نہر ہے۔ جس میں جبریل علیہ السلام کے سوا کسی دوسرے کو اس میں داخل ہونے کا حکم نہیں ہے۔ اور حضرت جبریل علیہ السلام ہر روز اس نہر میں ایک غوطہ لگاتے ہیں۔ اور باہر آکر اپنے آپ کو جھاڑتے ہیں۔ اور ان کے ہر ہر قطرے سے ایک ایک فرشتہ پیدا ہوتا ہے۔ اور علاء ابن ہارون کی روایت میں وارد ہوا کہ کوثر کی نہر ہے۔ اور ابن مردویہ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں کہ اکثر اوقات جبریل علیہ السلام میرے پاس سفید کپڑوں میں آتے ہیں۔ لیکن سنجاف کی جگہ ان کے کپڑوں پر مروارید اور یاقوت سلے ہوتے ہیں۔ اور ان کا سر مروارید سے جالی کی طرح ہوتا ہے۔ اور ان کے سر کے بال مرجان کی طرح اور ان کے جسم کا رنگ برف کی طرح اور ان کی پیشانی چمکتی ہے۔ اور ان کے اگلے دانت چمکیلے ہوتے

ہیں۔ اور ان پر دو ہار مروارید سے پروئے ہوتے ہیں' ان کے دونوں پاؤں کسی سبز چیز میں لپٹے ہوتے ہیں گویا آپ نے سبز موزے پہن رکھے ہیں۔

اور ابوالشیخ اور ابن مردویہ حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت سے لائے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک دن جبریل علیہ السلام سے فرما رہے تھے کہ تمہیں رب العزت جل شانہ کا دیدار بھی میسر آیا ہے؟ عرض کی نہیں میرے اور اس دربارِ عالی کے درمیان نور کے ستر ہزار حجاب رہتے ہیں اگر ان میں سب سے نچلا حجاب دیکھوں' جل جاؤں۔

اور طبرانی' ابن مردویہ اور ابونعیم نے سند ضعیف کے ساتھ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ یہودیوں میں سے ایک شخص نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں آ کر پوچھا یا رسول اللہ! (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کیا حضرت حق تعالیٰ کو اپنی مخلوق سے کوئی پردہ اور حجاب بھی ہے؟ فرمایا ہاں! اس بارگاہ اور ان فرشتوں کے درمیان جو عرش کے اردگرد ہیں' نور کے ستر (۷۰) پردے ہیں۔ اور ستر (۷۰) پردے ظلمت کے' ستر (۷۰) پردے اطلس کی چادروں کے' ستر (۷۰) پردے شاہی وفارف کے' ستر (۷۰) پردے سفید مروارید کے' ستر (۷۰) پردے سرخ مروارید کے' ستر (۷۰) پردے سبز مروارید کے' ستر (۷۰) پردے تیز روشنی کے' ستر (۷۰) پردے برف کے' ستر (۷۰) پردے پانی کے' ستر (۷۰) پردے اولوں کے اور ستر (۷۰) پردے اور ہیں۔ حضرت حق کی ذاتی عظمت سے جن کی وصف بیان نہیں ہو سکتی۔ پھر اس یہودی نے کہا کہ مجھے اس فرشتے کی خبر دیں جو کہ اس بارگاہ کی تجلی کے متصل ہوتا ہے۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا وہ فرشتہ اسرافیل (علیہ السلام) ہے پھر جبریل (علیہ السلام) پھر میکائیل (علیہ السلام) پھر ملک الموت علیہ السلام۔

اور امام احمد کتاب الزہد میں ابوعمران جونی سے لائے ہیں کہ ایک دن جبریل علیہ السلام' حضور علیہ السلام کی خدمت میں آئے اور رو رہے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پوچھا کہ رونے کی کیا وجہ ہے۔ حالانکہ آپ معصوم ہیں۔ اور بازپرس کے خطرے سے

امن میں ہو؟ حضرت جبریل علیہ السلام نے کہا کہ اللہ تعالیٰ کی قسم میری آنکھ اس دن سے خشک نہیں ہوئی جس دن سے اللہ تعالیٰ نے دوزخ کو پیدا فرمایا ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ مجھ سے فروگذاشت ہو۔ اور میں دوزخ کا مستحق ہو جاؤں۔

(اقول وباللہ التوفیق قربِ خداوندی کے مراتب میں سے ایک مرتبہ خوف کا ہے قال اللہ تعالیٰ ذَالِكَ لِمَنْ خَافَ مَقَامِيْ وَخَافَ وَعِيْدِ' وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ جَنَّتَانِ اس جیسی اور بھی بے شمار آیات میں جن سے مستفاد ہے کہ خوف ایک قربِ خداوندی کا مرتبہ ہے۔ جس میں ضروری نہیں کہ کسی نافرمانی یا معصیت کا وجود ہو اس لیے جو جس قدر قربِ خداوندی سے بہرہ ور ہوتا ہے اسی قدر خوفِ خدا سے معمور ہوتا ہے محمد محفوظ الحق غفرلہٗ)

اور مسند امام احمد میں حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت وارد ہے کہ حضور علیہ السلام نے حضرت جبریل علیہ السلام سے پوچھا کہ میں نے میکائیل (علیہ السلام) کو کبھی مسکراتے نہیں دیکھا اس کی کیا وجہ ہے؟ حضرت جبریل علیہ السلام نے کہا کہ جس دن سے دوزخ کی تخلیق ہوئی ہے' میکائیل (علیہ السلام) مسکرائے نہیں ہیں۔ اور ابوالشیخ لیث بن سعد کی روایت کے ساتھ خالد بن سعید سے لائے کہ حضرت اسرافیل (علیہ السلام) رات کی بارہ (۱۲) ساعات میں بارہ (۱۲) اذانیں دیتے ہیں' ہر ساعت کی ایک اذان مقرر ہے۔ اور اس اذان کو ساتوں آسمانوں اور ساتوں زمینوں کے سب فرشتے سنتے ہیں۔ اور جن اور انسان نہیں سنتے اور سب آسمانی فرشتے بیت المعمور کے پاس جو کہ خانہ کعبہ کی محاذات میں ہے' ساتویں آسمان میں جمع ہو کر جماعت کا انتظار کرتے ہیں۔ اور حضرت میکائیل (علیہ السلام) امام بن کر نماز پڑھاتے ہیں۔

مسواک کی اہمیت

اور حکیم ترمذی نے زید بن رفیع سے روایت کی کہ ایک دن حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مسواک کر رہے تھے کہ اچانک حضرت جبریل اور میکائیل (علیہ السلام) دونوں آدمی کی شکل میں تشریف لائے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بطور تحفہ مسواک حضرت جبریل علیہ

السلام کو عطا کی۔ حضرت جبریل علیہ السلام نے کہا کہ کبر کبر۔ حکیم ترمذی کہتے ہیں کہ یعنی یہ مسواک حضرت میکائیل (علیہ السلام) کو عطا کریں جو کہ مجھ سے زیادہ بزرگ ہیں۔

اور ابوالشیخ عکرمہ بن خالد سے روایت کرتے ہیں کہ ایک شخص نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھا کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک کون زیادہ عزیز ہے؟ فرمایا مجھے علم نہیں جب حضرت جبریل علیہ السلام آئے' ان سے پوچھا۔ انہوں نے کہا کہ میں بھی نہیں جانتا پھر چلے گئے جب نیچے آئے تو کہا کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک مخلوقات میں سب سے زیادہ عزیز چار فرشتے ہیں: جبریل' میکائیل' اسرافیل اور ملک الموت علیٰ نبینا علیہم السلام۔ رہے جبریل علیہ السلام تو نبوت و وحی کا کام رسل علیہم السلام کے پاس آمد و رفت اور جنگوں میں فتح و شکست ان سے تعلق رکھتی ہے۔ اور رہے میکائیل علیہ السلام تو بارش کا ہر قطرہ اور ہر پتہ جو زمین سے اُگتا ہے' ان سے متعلق ہے۔ اور رہے ملک الموت علیہ السلام پس ہر روح خواہ خشکی میں ہو خواہ سمندر میں' کا قبض کرنا ان کا کام ہے۔ اور اسرافیل علیہ السلام' اللہ تعالیٰ اور ہر فرشتے کے درمیان امین ہیں یعنی اللہ تعالیٰ کے احکام ان تک پہنچاتے ہیں۔ اور لوحِ محفوظ کا نشان وہی دیتے ہیں۔

اور ابوالشیخ جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما کی روایت کے ساتھ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے لائے کہ جبریل (علیہ السلام) کا مقام تجلی الٰہی کی دائیں جانب ہے۔ اور میکائیل (علیہ السلام) کا مقام بائیں جانب اور مقام اسرافیل (علیہ السلام) ان دونوں کے درمیان۔ نیز ابوالشیخ نے خالد بن ابی عمران سے روایت کی کہ بندوں کے اعمال نامے بھی حضرت میکائیل (علیہ السلام) کے پاس پہنچتے ہیں۔ اور ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی روایت سے لائے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ صور پھونکنے والے اسرافیل علیہ السلام ہیں۔ اور ابوالشیخ نے وہب سے روایت کی کہ گناہ گاروں کی لعنت' اطاعت شعاروں کی رحمت اور بارگاہِ الٰہی کے محبوبوں کی محبوبیت ایک ایسی ڈیوٹی ہے۔ جو کہ حضرت جبریل علیہ السلام کے ساتھ متعلق ہے۔ پہلے آپ کو ان چیزوں کا حکم ہوتا ہے۔ اور آپ کے واسطے سے دوسرے فرشتوں کو حکم پہنچتا ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وزیروں کے تعین کا بیان

اور حاکم ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کی روایت کے ساتھ لائے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے تھے کہ ہر پیغمبر علیہ السلام کے لیے اللہ تعالیٰ کے خاص بندوں سے دو آدمی وزیر اور مشیر رہے ہیں۔ اور مجھے چار وزیر عطا ہوئے۔ دو وزیر آسمان والوں سے جو کہ جبریل اور میکائیل علیہم السلام ہیں۔ اور دو وزیر اہلِ زمین سے جو کہ ابو بکر اور عمر رضی اللہ عنہما ہیں۔

دو رسل۔ دو ملائکہ اور دو خلفاء کی عادات میں مناسبت

اور طبرانی نے معتبر سند کے ساتھ حضرت اُم المومنین اُم سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت کی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے تھے کہ آسمان میں دو فرشتے ہیں' ان میں سے ایک کی عادت نرم ہیں۔ اور دوسرے کی سخت یعنی حضرت جبریل اور میکائیل علیہم السلام اور زمینی پیغمبروں میں سے دو پیغمبر علیہم السلام ہیں جن میں ایک کی عادت نرم اور دوسرے کی سخت یعنی حضرت ابراہیم اور حضرت نوح علیہم السلام۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نرمی اس حد تک ہے کہ اپنے مخالفوں کے بارے میں بھی شفاعت فرماتے ہیں۔ اور کہتے ہیں مَن تَبِعَنِیْ فَاِنَّهٗ مِنِّیْ وَمَنْ عَصَانِیْ فَاِنَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ اور حضرت نوح علیہ السلام کی سختی یہاں تک ہے کہ کہتے ہیں رَبِّ لَاتَذَرْ عَلَی الْاَرْضِ مِنَ الْكَافِرِیْنَ دَیَّارًا اور میرے بھی دو دوست میں' ایک کی عادت نرم اور دوسرے کی سخت اور ہر ایک اپنے کام میں درست ہے۔ یعنی حضرت ابو بکر اور عمر رضی اللہ عنہما۔

حضرت ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما کا اور حضرت میکائیل و جبریل علیہما السلام کا مکالمہ

اور بیہقی کتاب الاسماء والصفات میں طبرانی معجم اوسط میں اور بزار اپنی مسند میں عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت سے لائے کہ ایک دن کافی لوگ جمع ہو کر بارگاہِ سید عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں آئے اور عرض کی یارسول اللہ! (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نیکیاں سب اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہیں۔ اور بُرائیاں سب بندوں کی جانب سے جبکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نیکی بدی سب کچھ

خدا تعالیٰ کی جانب سے ہے۔ ایک جماعت حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے قول کی قائل ہوگئی ہے۔ اور دوسرے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے فیصلے کے قائل ہیں۔ اور باہم بحث کر رہے ہیں' ہم سب آپ کی خدمت میں آئے ہیں تاکہ آپ اس مقدمے کا فیصلہ فرمائیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مسکرائے اور فرمایا کہ عجیب اتفاق ہے کہ آسمان میں بھی اسی قسم کا جھگڑا ہوا' حضرت میکائیل (علیہ السلام) نے ابوبکر (رضی اللہ عنہ) کے قول کے مطابق کہا جبکہ حضرت جبریل (علیہ السلام) نے قولِ عمر کے مطابق بات کی اس کے بعد حضرت جبریل (علیہ السلام) نے حضرت میکائیل علیہ السلام سے کہا کہ جب ہم لوگ جو کہ اہلِ آسمان ہیں' باہم مختلف ہوں گے تو زمین والے تو بطریقِ اولیٰ اختلاف کریں گے۔ آیئے تاکہ اس قضیئے کو اسرافیل علیہ السلام کے سامنے لے جائیں اور فیصلہ کرائیں۔ حضرت اسرافیل علیہ السلام کے پاس گئے۔ حضرت اسرافیل علیہ السلام نے ان پر قضاء قدر کا راز القاء فرمایا۔ اور فرمایا کہ القدر خیرہ وشرہ وحلوہ و مرہ کلہ من اللہ تعالیٰ اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ اے ابوبکر! اگر حق تعالیٰ چاہتا کہ کوئی اس کی نافرمانی نہ کرے تو ابلیس کو پیدا نہ فرماتا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے عرض کی صَدَقَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ۔

اور حاکم نے اسامہ بن عمیر ہذلی سے روایت کی ہے کہ ایک دن میں فجر کی دو سنتیں حضور علیہ السلام کے قریب پڑھ کر بیٹھ گیا' میں نے دیکھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی ہلکی سی دو رکعات پڑھ کر یہ دعا فرما رہے ہیں۔ اللھم رب جبریل و میکائیل و اسرافیل و محمد اعوذبک من النار اور یہ دعا تین بار فرمائی۔ (اقول وباللہ التوفیق۔ معلوم ہوا کہ فرضوں اور سنتوں نفلوں کے بعد دعا مانگنا حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت ہے۔ اسے ناجائز کہنے والے جہالت وحماقت کا ارتکاب کرتے ہیں۔ نیز معلوم ہوا کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کو مقربین کا رب کہہ کر پکارنا سنت ہے اور دعا کی قبولیت کا ذریعہ۔ محمد محفوظ الحق غفرلہ۔

اور امام احمد نے کتاب الزہد میں حضرت اُم المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے

روایت کی ہے کہ جب مرضِ الوصال میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات شریف کا وقت قریب ہوا' شدید غشی لاحق ہوئی اور آپ کا سرانور میری گود میں تھا۔ اور میں بار بار چہرۂ مبارک پر پانی چھڑک رہی تھی۔ اور شفا کی دعا کر رہی تھی۔ اور بے چین تھی کہ اچانک کچھ افاقہ رونما ہوا۔ اور فرمایا یہ دعا نہ کر بلکہ میں خدا تعالیٰ سے رفیقِ اعلیٰ کی صحبت چاہتا ہوں اور کہتا ہوں کہ جبریل' میکائیل اور اسرافیل علیہم السلام کی مصاحبت کروں اس وقت سے میں نے جان لیا کہ اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ظاہری دنیا میں نہیں رہیں گے۔

حاصلِ گفتگو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں احکامِ الٰہی کی خدمت کی بدولت بغیر کسی خواہشِ نفسانی کے امتزاج کے ان تینوں فرشتوں کا مرتبہ قرب و منزلت میں اس حد تک پہنچ چکا ہے کہ ان کے ساتھ عداوت کرنا حقیقت میں جنابِ کبریائی الٰہی کے افعال پر اعتراض کرنا ہے۔ پس جبریل علیہ السلام سے اس وجہ سے عداوت کرنا کہ اس نے قرآن مجید فرقہ بنی اسرائیل کے غیر پر نازل کر دیا' حقیقت میں عین ہماری عداوت ہے۔ کیونکہ کتابیں نازل کرنا ہمارا کام ہے۔ اور جبریل (علیہ السلام) کا سفارت سے زیادہ منصب نہیں۔

وَلَقَدْ اَنْزَلْنَا اِلَيْكَ اور تحقیق ہم نے آپ کی طرف اپنے مقام عظمت سے نازل کی ہے۔ آیاتِ قرآنی آیات اور اس اشتباہ کی کوئی گنجائش نہیں کہ وہ آیات ہماری اُتاری ہوئی ہیں یا کسی دوسرے کی نازل کی ہوئی ہیں۔ اس لیے کہ وہ آیات بینات روشن دلائل ہیں۔ اعجاز لفظی کے اعتبار سے بھی ان آیات کے معنوں کے عقلِ سلیم کے تقاضا کے مطابق ہونے کے اعتبار سے بھی۔ اور اس جہت سے بھی کہ یہ آیات گزشتہ انبیاء علیہم السلام کی کتابوں جو کہ یہودیوں کے نزدیک مانی جاتی ہیں' کے بھی موافق ہیں۔ پس ان آیات کا انکار ان یہودیوں سے نہیں ہوسکتا کیونکہ اس کے ضمن میں تمام پہلی کتابوں کا انکار ہوتا ہے۔

وَمَا يَكْفُرُ بِهَآ اِلَّا الْفٰسِقُوْنَ اور ان آیات کا انکار نہیں کرتے مگر وہ لوگ جو کفر میں حد سے گزر گئے ہیں۔ اور پہلی کتابوں میں سے کسی کتاب پر ہرگز ایمان نہیں رکھتے۔ اور انہوں نے عقل اور نقل کے تقاضوں سے باہر قدم رکھا ہے۔ اور حضرت حسن بصری رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ قرآن مجید میں ہر جگہ فسق کو کافر کی صفت قرار دیا ہے۔ جیسا کہ اس

آیت میں اس سے مراد وہ کفر ہے۔ جو کہ انتہا کو پہنچا ہوا ہے۔ اور اس سے اوپر کسی کفر کا تصور نہیں ہوسکتا اور جہاں فسق کو اہلِ ایمان کی صفت قرار دیا وہاں مراد کبیرہ گناہوں کا ارتکاب ہے۔

چند معجزات کا مختصر تذکرہ

اور احتمال ہے کہ آیت کا معنی یوں ہو کہ یہودی اگرچہ جبریل (علیہ السلام) سے عداوت رکھتے ہیں۔ اور اس وجہ سے کفر میں گرفتار ہیں۔ مگر یہ امر قرآن مجید کے ساتھ کفر کو واجب کرنے والا نہیں ہوسکتا کیونکہ ہم نے جبریل علیہ السلام کے واسطہ کے بغیر آپ پر بہت سے معجزات اُتارے ہیں۔ جیسے ستون کا رونا' آپ کے حکم کو درختوں کا قبول کرنا' اونٹوں اور ہرنوں کا شکایت کرنا' آپ پر پتھروں اور پہاڑوں کا سلام پڑھنا' احبار یہود کا جواب سوال وغیر ذالك جو کہ مجموعی طور پر آپ کی رسالت کے صحیح ہونے پر یقین کرنے کا موجب ہوتے ہیں۔ اور اُن دیکھے گئے۔ اور مشاہدہ کیے ہوئے معجزات کا انکار نہیں کرتا مگر وہ جو منتخب دین کے دائرے سے خارج ہو۔ اور کسی دین اور آئین سے وابستہ نہ ہو۔ ورنہ اسے دوسرے انبیاء علیہم السلام کے معجزات کا جو کہ ان معجزات سے زیادہ نہ تھے' انکار لازم آئے گا۔

ءَ کیا۔ یہ یہودی اپنے فسق کا انکار کرتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ ہم نے عقل اور نقل کے تقاضوں سے قدم باہر نہیں رکھا ہے۔ اور ہم نے عقل و شرع کے خلاف کوئی حرکت نہیں کی ہے۔ اور اگر تم اس انکار کو عقل اور نقل کے خلاف سمجھتے ہو تو حساب سے باہر ہے۔ کیونکہ تم مدعیانہ بات کرتے ہو۔

وَ كُلَّمَا عٰهَدُوْا عَهْدًا اور حال یہ ہے کہ جب بھی وہ خدا تعالیٰ یا وقت کے رسول علیہ السلام یا دوسری مخلوق سے کوئی عہد باندھتے ہیں اگرچہ آسان سے مقدمہ میں ہو۔ نَّبَذَهٗ فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ اسے پسِ پشت ڈال دیتا ہے ان میں سے ایک گروہ جس طرح کہ اس رسول علیہ السلام کے عہد مبارک میں بنو قریظہ اور بنو نضیر نے بارہا آپ کے ساتھ عہد باندھے۔ کہ جنگ میں ہم مشرکوں کی مدد نہ کریں گے۔ اور آپ کے بدخواہ نہ ہوں گے۔ اور ہر بار اس

عہد کو توڑا اور ان کے آباء واجداد سے یہ گناہ کثرت اور تکرار کے ساتھ واقع ہوا۔ جیسا کہ اسی سورۃ میں بارہا گزرا۔ وَاِذْ اَخَذْنَا مِیْثَاقَکُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَکُمُ الطُّوْرَ، وَاِذْ اَخَذْنَا مِیْثَاقَ بَنِیْ اِسْرَآئِیْلَ، وَاِذْ اَخَذْنَا مِیْثَاقَکُمْ لَاتَسْفِکُوْنَ دِمَآءَ کُمْ۔ اور ظاہر کے عہد کو توڑنا شرع میں بھی حرام اور گناہِ کبیرہ ہے۔ اور مقتضائے عقل کے خلاف بھی۔ اور اسی لیے اس برے کام کی قباحت پر بنی آدم کے تمام گروہ حتیٰ کہ بے دین بھی متفق ہیں۔ اور اس جرم کے مرتکب کو بدکار سمجھتے ہیں۔ پس عہد شکنی کی وجہ سے جو کہ ان سے بار بار واقع ہوئی اور ہو رہی ہے' ان کا فسق ثابت ہوا۔ اور اگر کسی واجب کے ساتھ ان کے حال کی تحقیق کی جائے تو اس فعل کی وجہ سے فاسق ہی نہیں ہوئے ہیں۔

بَلْ بلکہ کفر بھی رکھتے ہیں۔ کیونکہ اَکْثَرُھُمْ لَایُؤْمِنُوْنَ ان کے اکثر اپنی کتاب پر جو کہ تورات ہے۔ اور پختہ وعدوں پر جو کہ تورات میں موجود ہیں' ایمان نہیں رکھتے۔ نیز ان کی نگہبانی کو ضروری بھی نہیں سمجھتے۔ اور احتمال ہے کہ کلمہ بل میں فریق کے مضمون سے ترقی منظور ہو یعنی ایک فریق کیا' ان کے اکثر تصدیق نہیں کرتے کیونکہ عہد شکنی گناہ بھی ہے۔ اور اپنی کتاب کے ساتھ ان کے کفر اور دین سے ان کے خارج ہونے پر دلیل یہ ہے کہ اگر انہیں اپنی کتاب پر ایمان حاصل ہوتا تو اپنے دین پر قائم رہتے۔ اور جو اس کتاب کے مطابق بات کرے یا اس دین کے قواعد کے مطابق دعوت دے اس کا انکار نہ کرتے۔ اور اسے ستانے کے درپے نہ ہوتے۔

وَلَمَّا جَآءَ ھُمْ رَسُوْلٌ اور جب بھی ان کے پاس ایک رسول تشریف لایا جس کی آمد کو انہوں نے جانا مِنْ عِنْدِ اللّٰہِ' اللہ تعالیٰ کے ہاں سے۔ کیونکہ اس کے معجزات سابقہ انبیاء علیہم السلام کے معجزات کی طرح اس کی صداقت پر قوی دلیل ہیں۔ اور اس کے باوجود مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَھُمْ وہ رسول تصدیق کرنے والا ہے ان کتابوں کی جو کہ ان کے پاس تورات و زبور وغیرہ سے ہیں۔ کیونکہ ان کتابوں میں اس رسول علیہ السلام کی آمد کی خبر دی گئی ہے۔ اگر یہ رسول علیہ السلام تشریف نہ لاتے' وہ خبریں درست نہ ہوتیں۔ پس ان کے حال کا تقاضا یہ تھا کہ رسول علیہ السلام کے آنے سے ان کا ایمان اپنی کتابوں پر زیادہ ہو

جاتا اور یہ اُلٹا کفر میں گر گئے۔ اور انہوں نے اپنی کتابوں کے ساتھ بھی کفر اختیار کیا۔ اس لیے کہ

نَبَذَ فَرِيْقٌ مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ ڈال دیا ان میں ایک فرقے نے جنہیں ہم نے علمِ کتاب عطا فرمایا تھا۔ انہیں اس کتاب کے معنوں سے کچھ ربط تھا۔ اور اس کتاب کو انہوں نے اس رسول کے مطابق پہچانا۔ كِتٰبَ اللّٰهِ "اللہ تعالیٰ کی کتاب کو جسے پہلے سے ہی وہ خدا کی کتاب سمجھتے تھے۔ اور اس کتاب کے مضامین کے برحق ہونے کے معترف تھے کہ گویا اس فرقے نے اس کتاب کو ڈال دیا۔ وَرَآءَ ظُهُوْرِهِمْ پسِ پشت کہ اس کی طرف بالکل کوئی توجہ نہیں کرتے۔ اور اس کے لفظ اور معنی کو نہیں دیکھتے۔ اور جب کتاب پسِ پشت ہو تو مطالعۂ درس اور اس کے تکرار سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ پس وہ اس حرکت بے برکت کی وجہ سے كَاَنَّهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ گویا کچھ نہیں جانتے۔ پس مطلق جہالت کو انہوں نے کتابِ الٰہی کے مقابلہ میں اختیار کیا۔ یہاں سے معلوم ہوا کہ انہیں اپنی کتاب پر بھی ایمان حاصل نہیں۔

حضرت سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ یہودی تورات کو دیبا اور ریشم کے غلافوں میں رکھتے تھے۔ اور سونے اور لاجورد سے ملمع کرتے تھے۔ لیکن اس کے حلال کو حلال نہیں جانتے تھے۔ اور اس کے حرام کو حرام قرار نہیں دیتے تھے۔ اسی وجہ سے حق تعالیٰ نے انہیں کتابِ الٰہی سے منہ موڑنے کے ساتھ موصوف کیا۔ اور مسلمانوں کو بھی چاہیے کہ اس قسم کے عمل سے ڈریں اور اپنی کتاب کے علم اور اس کے مضمون پر عمل کرنے کے درپے ہوں۔ اے اللہ! ہمیں یہ سعادت عطا فرما۔ کاش یہ یہودی اسی قدر پر اکتفاء کرتے لیکن انہوں نے کتابِ الٰہی کو پسِ پشت ڈالا۔

وَاتَّبَعُوْا مَا تَتْلُوا الشَّيٰطِيْنُ اور انہوں نے پیروی کی ان منتروں اور ٹوٹکوں کی جو انسانوں اور جنوں کے شیطان پڑھتے تھے۔ عَلٰى مُلْكِ سُلَيْمٰنَ حضرت سلیمان علیہ السلام کی بادشاہی میں۔

شیاطین کے منتروں کا قصہ

اور اس کا قصہ یوں تھا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت سلیمان علیہ السلام کو جنوں، انسانوں،

جانوروں' ہوا۔ اور دوسری مخلوقات پر عام بادشاہی عطا فرمائی تھی۔ تو آپ کے وقت میں شیاطین جن بھی آدمیوں کی شکل میں منتقل ہو کر غوطہ خوری' سنگ تراشی' بلند عمارات کی تعمیر' حوض اور قلعے بنانا' عجیب تصویریں اور نادر قسم کے نقش ونگار بنانے کی قسم کے مشکل کاموں میں مصروف رہتے تھے۔ جیسا کہ قرآن مجید کے دوسرے مقامات میں مذکور ہے۔ اور اس وجہ سے آدمیوں کو جنوں کے ساتھ بے پردہ ملنے جلنے کا موقع ملتا تھا۔ اور ان کا ایک دوسرے کے ساتھ اُٹھنا بیٹھنا رہتا تھا۔ اور شیاطین جن آدمیوں کے سامنے اپنے عجیب وغریب اعمال ظاہر کرتے تھے۔ اور جو منتر شرک صریح پر مشتمل تھے۔ جیسے بتوں اور گزشتہ شیطانوں کے نام جو کہ گمراہ کرنے اور کفر میں مقتدا گزرے تھے' لوگوں کے سامنے پڑھتے اور ان کے پڑھنے سے دو وجہ سے بہت سے عجائبات ظاہر ہوتے تھے۔

پہلی وجہ یہ کہ جنوں کی خلقت کا آدمیوں کی خلقت سے بہت فرق ہے۔ پس وہ منتر سُن کر آدمیوں کو گمراہ کرنے کے لیے شیاطین الجن دُور دراز کی چیزیں لاتے تھے' کسی کی گردن توڑ دیتے تھے' کسی کے پاؤں باندھ دیتے تھے۔ اور کسی کے پیٹ میں داخل ہو کر درد پیدا کر دیتے تھے۔ اور بعض اوقات بنی آدم کے افراد میں سے بعض پر کوئی مکروہ اثر ڈال دیتے اور جب وہ منتر اس پر پڑھا جاتا تھا تو رہا کر دیتے تھے۔ یہاں تک کہ لوگ ان منتروں کے معتقد ہو کر ان بتوں اور ان شیاطین کے پیشواؤں کی تعظیم کرتے تھے۔ اور ظاہر ہے آدمیوں کے افعال کے مقابلے میں جنوں کے افعال خلاف عادت کا ہی حکم رکھتے ہیں۔

اور دوسری وجہ یہ کہ بعض امراض کی ارواح نے شرارت اور خباثت میں جنوں کا حکم حاصل کر لیا ہے کہ طبعی طور پر معبود بننے اور اپنی پوجا کرانے کو پسند کرتی ہیں۔ اور چاہتی ہیں کہ لوگ ہماری طرف رجوع لائیں۔ شیاطین الجن بعض منتروں میں ان خبیث روحوں کے التجا اور ان کے متعلق حد سے زیادہ تعظیم کے کلمات آدمیوں کو سکھاتے تھے۔ اور سجدہ بجالانا اور ان روحوں کے لیے قربانی دینا۔ اور دوسرے تعظیمی افعال کو اس منتر کے پڑھنے کے شرائط میں سے قرار دیتے تھے۔ تا کہ آدمی شرک اور گمراہی میں گرفتار ہوں اور اس عمل پر عجیب اثرات مرتب ہوتے تھے۔ رفتہ رفتہ ان کا یہ بے حد بُرا عمل رائج اور مشہور ہو گیا۔

یہاں تک کہ حضرت سلیمان علیٰ نبینا علیہ الصلوٰۃ والسلام بھی اس پر مطلع ہوئے۔ آپ نے اپنے وزیر آصف بن برخیا کو حکم دیا کہ شیاطین کو حاضر کر کے جو کچھ اس سلسلے میں ان کے پاس ہے، سب کچھ جمع کر کے چند دفتروں میں لکھوا کر میری کرسی کے نیچے دفن کر دو اور اس کے بعد پابندی لگا دو کہ شیاطین اور آدمی ایک دوسرے کے ساتھ نشست و برخاست نہ کریں۔ اور پڑھنے پڑھانے کا سلسلہ بند کر دیں جب تک کہ حضرت سلیمان علیہ السلام حیاتِ ظاہری میں تھے، وقت اسی طرح گزرتا رہا۔

حضرت سلیمان علیہ السلام اور آصف بن برخیا کی وفات کے بعد شیطانوں نے لوگوں کے سامنے یوں ظاہر کیا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام۔ نے جادو کے زور پر یہ سب بادشاہی حاصل کر رکھی تھی کہ ہوا، وحشی جانور، جنات اور انسان ان۔ کے زیر نگیں تھے۔ اور اپنے اس تمام جادو کو اپنی کرسی کے نیچے دفن کر کے چھوڑ کر چلے گئے ہیں۔ اب تدبیر یہ ہے کہ اس جگہ کو کھود کر ان کتابوں کو نکال لو اور اس کے مطابق عمل کرو تا کہ حضرت سلیمان (علیہ السلام) کی طرح تمہارے ہاتھوں بھی عجیب وغریب چیزوں کا ظہور ہو۔

لوگوں نے شیاطین کے گمراہ کرنے سے ان کتابوں کو نکال لیا۔ اور وہ منتر پڑھنا شروع کر دیئے۔ اور ان میں عجیب خاصیتیں پائیں۔ یہاں تک کہ تورات اور علومِ دین میں مصروفیت ختم ہوگئی۔ اور ان کی ساری ہمت جادو کا علم اور وہ منتروں کو حاصل کرنے میں مصروف ہوگئی۔ جس وقت تک شیطانوں کو ان کا گمراہ کرنا منظور تھا، ان منتروں کی اطاعت خوب کرتے تھے۔ اور ان کے اثرات بھی پوری خوبی سے مرتب ہوتے تھے۔ جب شیطانوں نے دیکھا کہ یہ گمراہی کے گڑھے میں گر گئے۔ اور اللہ تعالیٰ کی کتابوں سے انہوں نے پورے طور پر روگردانی کر لی تو ان منتروں کی اطاعت سے خاموشی اختیار کر لی۔ اور ہاتھ کھینچ لیے۔ اور وہ اثرات کم ہونا شروع ہو گئے۔ پس اس حادثہ کی وجہ سے یہودیوں کے دین میں چند وجہ سے سخت نقصان رونما ہوا۔ اوّل اللہ تعالیٰ کی کتابوں سے جو کہ روحانی امراض کے علاج کی پونجی تھی، روگردانی۔ دوسرے بتوں اور گزشتہ شیطانوں کے ناموں کی تاثیر کا اعتقاد اور ان کے لیے نذر اور قربانی بجالانا جو کہ صریح کفر اور شرک ہے۔ تیسرے

حضرت سلیمان علیٰ نبینا وعلیہ السلام کے بارے میں بدگمانی۔ یہاں تک کہ آپ کی نبوت کا انکار کر دیا۔ اور انہوں نے کہنا شروع کر دیا کہ (معاذ اللہ) سلیمان (علیہ السلام) ایک ماہر جادوگر تھے۔ جیسا کہ ابن جریر نے شہر بن حوشب سے روایت کی ہے کہ یہودی ایک دوسرے سے کہتے تھے کہ دیکھو محمد حق کو باطل سے ملاتے ہیں۔ اور سلیمان (علیہ السلام) کو انبیاء کے ساتھ ذکر کرتے ہیں۔ حالانکہ (معاذ اللہ) سلیمان (علیہ السلام) ایک ساحر تھے۔ جو کہ جادو کے زور سے ہوا کی پشت پر سوار ہوتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے یہودیوں سے صادر ہونے والے ان دو فعلوں کی مذمت فرمائی یعنی کتبِ الٰہیہ سے روگردانی اور بتوں اور شیاطین کے ناموں کی تاثیر کا اعتقاد اور تیسرے امر کو جو کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے متعلق کامل جادوگر ہونے کا قول تھا' اس عبارت سے رد فرمایا۔

وَمَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ اور سلیمان کافر ہرگز نہ تھے۔ بتوں اور شیطانوں کے ناموں کی تاثیر کے عقیدہ اور ان کے لیے نذر اور قربانی بجالانے کے ساتھ جو کہ جادو کی بنیاد ہے۔ کیونکہ آپ یہودیوں کی کثیر جماعت کے اقرار کے مطابق پیغمبروں میں سے ایک پیغمبر تھے۔ اور پیغمبروں کا کفر سے پاک ہونا قطعی ہے۔ بلکہ بدیہی یعنی کسی کی دلیل کا محتاج نہیں۔ کیونکہ منصب نبوت کفر کے ساتھ صریح منافات رکھتا ہے۔ اور انبیاء علیہم السلام کی بعثت کفر کو دفع کرنے کے لیے ہے۔ اگر معاذ اللہ نبی خود کفر اختیار کرے تو اس کی بعثت کا مقصد فوت ہونا لازم آتا ہے۔

وَلٰكِنَّ الشَّيٰطِيْنَ لیکن جن وانس کے شیاطین جو کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے دربار میں آپ کے معجزات دیکھ کر ایمان لائے تھے۔ اور مسلمانوں کے گروہ میں داخل ہو گئے تھے۔ لیکن ان کے نفسوں کے جوہر میں شرارت اور کفر کا خمیر تھا۔ اور آپ کے وصال کے بعد اپنی چھپی ہوئی خباثت کی وجہ سے

كَفَرُوْا کافر ہو گئے۔ اور سلیمان علیہ السلام پر جھوٹی تہمت لگادی کہ وہ بھی جادو کے کام کرتے تھے۔ اور انہیں ناپاک اعمال کی وجہ سے' انہوں نے جنوں' انسانوں' وحشی جانوروں' پرندوں اور دوسری مخلوقات کو تابع اور مطیع کر رکھا تھا۔ اور صرف یہ کہنے اور اعتقاد

رکھنے پر اکتفاء نہ کی بلکہ یہ کام شروع کر دیا کہ

یُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ لوگوں کو جادو کے کاموں کی تعلیم دیتے تھے۔ تاکہ دوسرے لوگوں کو بھی اپنی طرح کافر اور جادوگر بنا دیں۔ اور لوگ ان کے بہتان اور جھوٹ سے فریب کھا کر گمان کریں کہ جادو کا عمل بُرا نہیں ورنہ ایسا بلند مرتبہ رسول علیہ السلام اس میں کیوں مصروف ہوتا۔

جادو کی قسموں اور ان کے احکام کا بیان

یہاں جاننا چاہیے کہ جادو کا حکم مختلف ہے۔ اگر جادو میں کوئی قول یا فعل جو کہ کفر کا موجب ہو جیسے بتوں اور خبیث روحوں کا نام ایسی تعظیم کے ساتھ لینا جو کہ حضرت رب العزت کے لائق ہے۔ جیسے عموم علم و قدرت' غیب دانی' مشکل کشائی' ذبح لغیر اللّٰہ یا سجدہ لغیر اللّٰہ وغیرہ واقع ہو تو بلاشبہ وہ جادو کفر ہے۔ اور ایسا جادو کرنے والا کافر ہو جاتا ہے۔ اور اسی طرح وہ شخص جو اپنے مطلب کے لیے اس قسم کا جادو کرائے' دیدہ دانستہ کافر ہو جاتا ہے۔ اور اس پر مرتد ہونے کے احکام جاری ہوتے ہیں۔ اگر مرد ہے تو اسے تین دن کی مہلت دی جائے تاکہ توبہ کرے۔ اور اس قول اور فعل سے بیزاری ظاہر کرے۔ اور تین دن کے بعد اگر اس سے توبہ ثابت نہیں ہوئی' اسے قتل کر دینا چاہیے۔ اور اسے مسلمانوں کے قبرستان میں دفن نہیں کرنا چاہیے۔ اور مسلمانوں کے قانون کے مطابق اس کی تکفین و تجہیز نہ کی جائے۔ اور اس کے لیے فاتحہ' درود اور صدقات نہیں بھیجنے چاہئیں اور اگر عورت ہے تو امام شافعی کے نزدیک اسے بھی مردوں کے دستور کے مطابق تین دن کی مہلت کے بعد قتل کر دیا جائے۔ اور امام اعظم کے نزدیک اسے ہمیشہ کے لیے قید کر دینا چاہیے۔ یہاں تک کہ سچی توبہ کرے۔

اور اگر جادو میں کوئی فعل یا قول ایسا نہیں جو کہ مرتد ہونے یا کافر ہونے کا موجب ہو لیکن ایسے جادو والا دعویٰ کرتا ہے کہ میں اپنے جادو کے ذریعے خدائی کام کر سکتا ہوں۔ مثلاً انسانوں کی شکلیں جانوروں کی شکلوں میں بدلنا یا پتھر کو لکڑی اور لکڑی کو پتھر کر سکتا ہوں یا پیغمبروں کے کام اور ان کے معجزات ظاہر کر سکتا ہوں۔ جیسے ہوا میں اُڑنا یا ایک مہینے کی راہ

ایک لمحے میں طے کرنا۔ پس وہ بھی کافر اور مرتد ہو جاتا ہے۔ صرف جادو کی وجہ سے نہیں بلکہ اس دعویٰ کی وجہ سے۔

اور اگر کہتا ہے کہ میرے ان اعمال کی ایک خاصیت ہے۔ جس کی وجہ سے قتل کرنا یا صحیح کو بیمار کرنا' یا بیمار کو صحیح کرنا' پُر امن کو ڈرانا اور خیالات کو خراب کرنے کا عمل کر سکتا ہوں۔ پس یہ جادو مکر و فریب اور فسق ہے۔ اور ایسا جادوگر مکار اور فاسق ہے۔ اگر اپنے جادو کے ساتھ بے گناہ جان کو ہلاک کر دے تو ڈاکوؤں کی طرح اسے قتل کر دیا جائے۔ کیونکہ فساد برپا کرنے والا ہے۔ اور اس سلسلے میں جادوگر مرد اور عورت میں کوئی فرق نہیں۔ یہ ہے وہ جس کی امام فخر الدین رازی اور دوسرے علمائے حنفیہ نے تنقیح فرمائی ہے۔

اور امام اعظم رحمتہ اللہ علیہ سے ایک روایت میں یوں آیا جب کسی کے متعلق معلوم کریں کہ جادو کرتا ہے۔ اور اقرار یا گواہی سے یہ معنی ثابت ہو جائے' اسے قتل کر دینا چاہیے۔ اور اس سے توبہ طلب نہیں کرنی چاہیے۔ اور اگر وہ کہے کہ میں جادو ترک کرتا ہوں اور میں توبہ کرتا ہوں تو اس کی بات نہیں مانی جائے گی۔ ہاں اگر کہے کہ میں پہلے جادو کرتا تھا۔ اور اب مدت سے میں نے یہ دھندا چھوڑ دیا ہے تو اس کا قول قبول کر لینا چاہیے۔ اور اس کے خون سے درگزر کرنا چاہیے۔ اور امام شافعی کے نزدیک اگر کسی نے جادو کیا اور اس کے جادو کی وجہ سے مسحور مر گیا تو اس سے پوچھنا چاہیے اگر وہ اقرار کرے کہ میں نے اسے جادو کیا تھا۔ اور میرا جادو اکثر مار دیتا ہے تو اس پر قصاص واجب ہو جاتا ہے۔ اور اگر کہے کہ میں نے اسے جادو کیا تھا۔ لیکن میرا جادو کبھی مارتا ہے' کبھی نہیں مارتا تو قتل شبہ عمد ہوا۔ شبہ عمد کے احکام اس پر جاری کرنے چاہئیں اور اگر کہے کہ میں نے کسی اور کو جادو کیا تھا' اتفاقاً اس کا نام اس کے نام کے موافق پڑا یا اس کا گزر جادو کے مقام پر ہوا۔ اور اس پر اثر ہو گیا پس یہ قتل خطا ہے اس پر احکامِ خطا جاری ہوتے ہیں۔

ایک شبہ اور اس کا جواب

یہاں ایک شبہ ہے جو اکثر دل میں آتا ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ خلافِ عادت افعال جو کہ صرف قدرتِ الٰہی سے صادر ہوتے ہیں' اکثر اوقات اولیاء سے ظاہر ہوتے

ہیں۔ جیسے اعیان کو بدلنا' شکلیں تبدیل کرنا۔ اسی طرح وہ افعال جو کہ رسل علیہم السلام کے معجزات کے مشابہ ہوتے ہیں۔ جیسے مردے زندہ کرنا' طویل سفر کو ایک ساعت میں طے کرنا۔ اور اس قسم کے افعال بھی اولیاء سے اکثر واقع ہوتے ہیں۔ اور ان اولیاء کے احوال لکھنے والے ان افعال کو ان کی کرامات اور مناقب میں لکھتے ہیں تو اگر فعل الٰہی کی نسبت غیر کی طرف کرنا کفر ہے۔ تو یہاں بھی کفر لازم آتا ہے۔ اور اگر ظاہری سبب ہونے پر نظر کریں جو وہ غیر رکھتا ہے تو کفر نہ ہوگا۔ پس جادوگر کے بارے کفر کا حکم کیوں دیا گیا۔ بلکہ دعوتیوں' ورد پڑھنے والوں جو کہ دعائے سیفی اور دعوت کے ساتھ اس قسم کے عجائبات ظاہر کرتے ہیں' کے حال میں جادوگروں کے ساتھ پوری مشابہت رونما ہوتی ہے۔ فرق کی وجہ کیا ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ خلافِ عادات افعال خواہ رسل علیہم السلام کے معجزات کے مشابہ ہوں' خواہ کسی اور جنس سے سب کے سب تحت قدرتِ الٰہی ہیں۔ اور اس کے ارادہ اور ایجاد سے صادر ہوتے ہیں۔ اور اس باب میں اولیاء کے ہاتھوں ظاہر ہونے والے اور جادوگروں سے صادر ہونے والے کاموں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ فرق یہ ہے کہ اولیاء' دعوتی اور عزائم پڑھنے والے ان فعلوں کی نسبت غیر خدا کی طرف نہیں کرتے۔ بلکہ اللہ تعالیٰ کی قدرت یا اس کے اسماء حسنیٰ کے خواص سے منسوب کرتے ہیں۔ پس کوئی شرک لازم نہیں آتا جبکہ جادوگر ان فعلوں کو غیر خدا کی طرف یعنی ارواحِ خبیثہ' منتروں کے خواص اور بتوں کے ناموں کی طرف نسبت کرتے ہیں۔ اس لیے ان فعلوں کو اپنے قبضہ میں جانتے ہیں۔ اور اپنے حکم میں سمجھتے ہیں۔ اور ان فعلوں پر اُجرت لیتے ہیں۔ اور رشوت مانگتے ہیں۔ اور ان ارواحِ خبیثہ اور اصنامِ باطلہ کے لیے نذریں اور قربانیاں مانگتے ہیں۔ پس صریح شریک لازم آتا ہے۔ اور کفر کا مؤجب ہوتا ہے۔ جس طرح کہ اللہ تعالیٰ کے افعال عادی جیسے بیٹا دینا' رزق فراخ کرنا' شفائے مریض اور اس جیسے دوسرے کاموں کی نسبت مشرکین ارواحِ خبیثہ اور بتوں کی طرف کرتے ہیں۔ اور کافر ہو جاتے ہیں۔ جبکہ توحید کے ماننے والے اسمائے الٰہی کی تاثیر یا اس کی مخلوقات یعنی دواؤں اور جڑی بوٹیوں کے خواص سے جانتے ہیں یا اس کے نیک بندوں کی دعا سے جو کہ اس کی بارگاہ سے درخواست کر کے حاجت روائی کرتے

ہیں' سمجھتے ہیں۔ اوران کے ایمان میں خلل نہیں پڑتا اوراسی طرح یہ ہے۔

جادو کی حقیقت اور اس کی قسموں کا بیان

ہم یہاں آ پہنچے کہ جادو کی حقیقت کیا ہے؟ اوراس کی کتنی قسمیں ہیں۔ اوراس کی کونسی قسم موجب کفر ہے۔ کونس سی فسق۔ اور کونسی مباح جو کہ شریعت میں جائز ہے؟ اس بحث کی تفصیل طوالت چاہتی ہے اس کا اجمالی بیان یہ ہے کہ جادو کی حقیقت خلاف عادت عجیب افعال پر خفیہ اسباب کو اپنا کر اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں دعا اس کے اسماء کی تلاوت کا وسیلہ کیے بغیر اور ان افعال کو اس کی قدرت کی طرف منسوب کیے بغیر قدرت حاصل کرنا ہے۔ اور چونکہ جہان میں پوشیدہ اسباب چند قسموں کے ہیں' جادو کی بھی چند قسمیں ہیں۔ اور ان اقسام کا ضبط یہ ہے کہ سبب خفی یا روحانیات کی تاثیر ہے یا جسمانیات کی تاثیر ہے۔ اور روحانیات یا روحانیات کلیہ مطلقہ ہیں۔ جیسے روحانیات کواکب' افلاک اور عناصر کی روحانیات یا روحانیات جزئیہ خاصہ ہیں۔ جیسے امراض کی روحانیات اور شیطانوں اور بنی آدم سے جدا ہونے والے نفسوں کی روحانیات کہ ان نفوس کو مسخر کر کے اپنے کام میں لاتی ہیں۔ اور ہندی کی لغت میں بیر کہتے ہیں۔ یعنی با کی زیر اور یا کے سکون کے ساتھ۔

اور جسمانیات یا کیفیات کی ترکیب واجتماع سے عجیب تاثیر پیدا کرتی ہیں یا خواص کی وجہ سے یعنی کیفیات کے واسطہ کے بغیر صور نوعیہ کے تقاضا کی وجہ سے۔ جیسے مقناطیس کا لوہے کو کھینچنا۔ پھر روحانیات کے ساتھ مناسبت اور ان کی تاثیرات حاصل کرنے کا طریقہ معتبر شرائط کے ساتھ ان کے ناموں کے ذکر اور ان کی طرف التجا کے ساتھ ہے یا ڈھانچوں کی تصویر بنانا' مناسب تصویریں بنانا اور ان کے پسندیدہ کام کرنا یا ایسے کلام کی تلاوت جس کے مفردات ترکیب کا لحاظ کیے بغیر ارواح میں سے کسی روح کی عظمت کا اشارہ کریں۔ یا کوئی عجیب فعل جو اس سے کسی وقت سرزد ہوا۔ اور خاص و عام کی زبان پر اس کی تعریف جاری ہو گئی۔ پس ان شقوں پر نظر کرتے ہوئے جادو کی کئی قسمیں ہو گئیں لیکن جو رائج اور معمول ہے اس کی چند قسمیں ہیں۔ ان میں سے ایک قسم جو کہ سب قسموں سے عمدہ ہے کلدانیین کا جادو اور بابل کا جادو ہے جن کے مذاہب کے رد اور عقیدہ کو باطل کرنے کے لیے حضرت ابراہیم علیٰ

نبینا وعلیہ السلام مبعوث ہوتے تھے۔ اور اس علم کی اصل ہاروت ماروت سے لی گئی ہے۔ جسے بابل والے ان سے سیکھ کر کام میں لائے۔ اور اس میں بہت گہرائی حاصل کی۔ اور کلدانیین جو کہ بابل کے شہری تھے اس علم میں بہت مصروفیت رکھتے تھے۔

ساکنانِ بابل کے چھ (٦) حیران کن طلسموں کا بیان

معتبر تاریخوں میں لکھا ہے کہ نمرود کے عہد میں شہر بابل میں جو کہ اس کا دارالحکومت تھا' حکمائے بابل نے چھ (٦) طلسم ایسے بنائے تھے کہ ان کے ادراک میں عقلیں حیران تھیں: پہلا طلسم یہ کہ تانبے سے ایک بطخ بنائی تھی جب بھی کوئی جاسوس یا کوئی چور اس شہر میں آتا اس بطخ سے ایک ایسی آواز نکلتی کہ سب شہر والے اس کی آواز کو سنتے اور جان لیتے کہ اس کا مقصد کیا ہے۔ اور اس جاسوس اور چور کو پکڑ لیتے تھے۔

دوسرا طلسم ایک ڈھول تھا کہ جس کی کوئی چیز گم ہو جاتی' وہ اس ڈھول کے قریب آتا اور نقارے کی چوب اس پر مارتا۔ اس ڈھول سے آواز آتی تھی کہ تیری فلاں چیز فلاں جگہ پر ہے۔ اور ڈھونڈنے کے بعد اسی طرح نکلتی۔

تیسرا طلسم ایک شیشہ تھا جو کہ انہوں نے کسی غائب کا حال جاننے کے لیے بنایا تھا جب بھی کوئی غرض منداس شیشے میں دیکھتا اس کے غائب کا حال اس آئینے میں ظاہر ہو جاتا اور شہر میں یا جنگل میں یا کشتی میں یا پہاڑ میں وہ غائب جس حال میں ہوتا اس کی صورت کو اسی حال میں مشاہدہ کرتا تھا۔ اور اگر بیمار یا تندرست یا فقیر یا امیر یا زخمی یا قتل کر دیا گیا ہوتا اسی طرح نمودار ہوتا تھا۔

چوتھا طلسم ایک حوض تھا کہ ہر سال میں ایک دن اس حوض کے کنارے ایک جشن کا انتظام کرتے اور شہر کے امراء اور اشراف حاضر ہوتے تھے۔ اور جو شخص شربت اور جوس میں سے جو چاہتا' لا کر اس میں ڈال دیتا جب لوگوں کو پلانے کے لیے ساقی اس چوبچے پر کھڑے ہوتے اور اس میں سے نکالتے تو ہر شخص کے لیے وہی کچھ نکلتا جو وہ لایا ہوتا۔

پانچواں طلسم ایک تالاب تھا جو کہ جھگڑے چکانے اور مقدمات کے فیصلے کرنے کے لیے بنایا تھا۔ اگر دو آدمیوں کا آپس میں جھگڑا ہو جاتا اور سچ اور جھوٹ کا پتہ نہ چلتا تو اس

تالاب کے کنارے آ جاتے اور اس میں داخل ہو جاتے جو سچا ہوتا تالاب کا پانی اس کی ناف سے بھی نیچے رہتا۔ اور وہ غرق نہیں ہوتا تھا۔ اور جو جھوٹا ہوتا' پانی اس کے اوپر ہو جاتا اور اسے غرق کر دیتا مگر جو سچ کے آگے گردن جھکا دیتا اور اپنے جھوٹے دعویٰ سے باز آ جاتا اسی وقت نجات پا لیتا۔

چھٹا طلسم نمرود کے مکان کے دروازے ایک درخت لگا رکھا تھا جس کے سایہ کے نیچے درباری بیٹھتے تھے۔ اور لوگ جس قدر زیادہ ہوتے تھے' درخت بھی اسی قدر وسیع ہو جاتا۔ یہاں تک کہ ایک لاکھ تک پہنچ جاتے' سایہ اسی قدر زیادہ ہو جاتا اور جب اس عدد یعنی ایک لاکھ سے ایک آدمی بھی زیادہ ہو جاتا' سایہ بالکل نہیں رہتا تھا۔ اور سب دھوپ میں بیٹھتے تھے۔

اور نمرود جو کہ ان کا بادشاہ ہوتا' بھی اس بارے میں بہت مشق اور مبالغہ کرتا۔ کہتے ہیں کہ اس قسم کا جادو سب سے زیادہ مشکل ہوتا ہے۔ اور اسے حاصل کرنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ اور اس کے بعد کہ کسی کو اس قسم کے جادو کی حقیقت تک پہنچنا میسر ہو جائے جو چاہے خلاف عادت کو ظاہر کر سکتا ہے یا موافق عادت کو روک سکتا ہے۔ جیسے ان بیماریوں کا علاج کرنا جس سے طبیب عاجز ہوں جیسے برص' کوڑھ اور اذیت دینے والا عشق وغیرہ اس سے سب کچھ ہو سکتا ہے۔ کیونکہ وہ روحانیات کی استعانت سے تدبیر کرتا ہے۔ اور طبیب جسمانیات کی مدد سے کام کرتا ہے۔

اور اس ہنر کی حقیقت یہ ہے کہ فلک سے لے کر عناصر اور موالید تک ہر جسم ایک روح رکھتا ہے۔ جو کہ اس کی تدبیر کرنے والی ہے۔ اور جسموں کی تاثیرات سب کی سب ارواح کی طفیل ہیں۔ اور جب تمام عالم کی روحیں اس کے تابع ہیں گویا جہان کا مالک ہو گیا۔ پس اس سے جنگ اور لڑائی کیے بغیر دشمنوں پر قہر اور مفسدوں کی بیخ کنی ممکن ہے۔ جیسا کہ ارسطو نے حکیم برہماطوس اور بیداغوس سے نقل کیا کہ بابل کے شہر میں ان دونوں کے درمیان جھگڑا ہوا' بیداغوس نے کہا کہ تجھے میرے ساتھ مقابلہ کرنے کی کس طرح طاقت ہو گی جبکہ مریخ اور زحل میرے مقابلے سے عاجز ہیں۔ برہماطوس نے جب یہ بات سنی تو اس نے جلانے

والا جادو کر کے مریخ کی روح سے مدد لی اور بیدا غوس کو جلا دیا۔ اور کسی جنگ اور لڑائی کے بغیر اس کا شر دور کر دیا۔ اور دوسرے شہروں میں بھی اسی قسم کے واقعات نقل کرتے ہیں۔

جب حضرت ابراہیم علیہ السلام پیدا ہوئے' اللہ تعالیٰ نے آپ کو اجسام اور ارواح دکھائے اور آپ نے سب کو اللہ تعالیٰ کی قدرت کے ہاتھوں مجبور اور بے اختیار دیکھا اور آپ سب سے چہرۂ مبارک پھیر کر ذاتِ واحد حقیقی کی طرف متوجہ ہوئے جیسا کہ سورۃ انعام میں آئے گا۔ انشاء اللہ العزیز اللہ تعالیٰ کے ارشاد وَكَذَٰلِكَ نُرِيٓ إِبْرَاهِيمَ مَلَكُوتَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الخ سے لے کر اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِيْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِيْفًا وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ۔

اہل بابل کی دعوت ارواح کواکب کا نمونہ

اور اس قسم کا جادو نرا کفر اور محض شرک ہے۔ کیونکہ اس جادو کی شرائط میں جو کہ پندرہ (۱۵) ہیں' لکھا ہے کہ اس کی شرائط میں سے پہلی شرط یہ ہے کہ ارواح کو دلوں پر مطلع جانے اور ان کے بارے عاجزی اور جہالت کا گمان ہرگز نہ کرے۔ ورنہ وہ ارواح اس کی دعوت قبول نہیں کرتیں۔ اور اسے مطلب تک نہیں پہنچاتیں۔ نیز کواکب کی روحانیات کی دعوت کی کیفیت میں لکھتے ہیں کہ دعوت قمر سے شروع کرے۔ کیونکہ وہ عالم سفلی سے زیادہ قریب ہے۔ اور اس کے وسیلے سے عطارد کی دعوت۔ علیٰ ہذا القیاس۔ اور قمر کی دعوت کے الفاظ میں لکھتے ہیں کہ کہے۔ ایها الملك الكريم والسيد الرحيم ومرسل الرحمة و منزل النعمه اور عطارد کی دعوت میں یوں کہے۔ كل ماحصل لى من الخير فهو عنك و كل مايندفع من الشرمنى فهو منك تیز کہے ایها السيد الفاضل الناطق العالم، نجفيات الامور المطلع على السرائر اور اسی پر دوسرے ستاروں کی دعوت کا قیاس کیجیے اور ظاہر ہے کہ یہ اعتقاد اور یہ قول اسلام' توحید اور ملت حنفی کے منافی ہے۔

یہاں جاننا چاہیے کہ اہلِ بابل ہاروت اور ماروت کی تعلیم کی وجہ سے تسخیر کا طریقہ اور تمام روحانیات کلیہ و جزئیہ' علویہ و سفلیہ' فلکیہ وعنصریہ اور بسطیہ و مرکبہ سے استعانت کا طریقہ جانتے تھے۔ اور عمل میں لاتے تھے۔ حتیٰ کہ امراض اور دوسرے مذاہب کی

روحانیات کی بھی تسخیر کرتے تھے۔ اور ان کے ساتھ اتصال حاصل کر چکے تھے۔ اور عجیب اعمال ظاہر کرتے تھے۔ لیکن یونانیوں نے ان سے روحانیاتِ علویہ کی تسخیر کے طریقے پر اکتفاء کیا اور یوں سمجھتے تھے کہ جب روحانیاتِ علویہ مسخر ہوگئیں تو روحانیاتِ سفلیہ کی تسخیر کی' کوئی اور حاجت نہ رہی کیونکہ روحانیاتِ سفلیہ کو قبول کرنے اور متاثر ہونے کے سوا کوئی منصب نہیں ہے۔ فاعلیت اور اثر کرنا علویت سے مخصوص ہے۔ اور قدیم ہندی حکماء تمام روحانیات کی تسخیر کرتے ہیں۔ اور ہر ایک سے جو کام بھی اس کے متعلق ہے' لیتے ہیں۔

مصرعہ

وللناس فیما یعشقون مذاھب

پس بابلی جادو آج ہندیوں میں موجود ہے۔ اور یونانیوں نے اس میں سے بعض پر اکتفاء کی ہے۔

اور اس جادو کی دوسری قسم خاص کر جنوں اور شیطانوں کی تسخیر ہے۔ اور اس کا حصول آسان اور رواج زیادہ ہے۔ اور اس تسخیر میں بڑے جنات جیسے بھوانی اور ہنومان وغیرہ ہما سے التجا' عاجزی اور زاری کرنا اور ان کے لیے نذریں اور قربانیاں پیش کرنا اور مناسب عطریات کو ان کی حاضری کی جگہوں پر رکھنا ضروری ہوتا ہے۔ اور کفر صریح لازم آتا ہے۔

اور اس کی تیسری قسم بیر کا پیدا کرنا ہے۔ اور اس جادو میں ضرورت پڑتی ہے کہ کسی ایسے انسان کا دل تلاش کریں جو دل اور جسم کے قوی ہونے کی صورت میں مرا ہو اس کے بعد اس کی روح کو بعض ایسے الفاظ پڑھ کر جو کہ بڑے بڑے شیطانوں کے ذکر پر مشتمل ہوتے ہیں۔ اور ان کے متعلق ان الفاظ میں حد سے زیادہ تعظیم بیان کرتے ہیں' اپنی طرف کھینچتے ہیں۔ اور ان الفاظ کی طاقت کے ساتھ اور نذریں اور قربانیاں رکھ کر اس روح کو اپنے حکم اور قابو میں اس حد تک کر لیتے ہیں کہ غلام اور نوکر کی طرح جو حکم دیں' وہ روح سرانجام دیتی ہے۔ پس یہ عمل بھی یا کفر کو لازم کرنے والا ہے یا کفر کی حد تک پہنچا دیتا ہے۔ اور غالباً اس قسم کی ارواح جو شہوت اور غضب کے امور میں مدد کی طرف متوجہ ہوتی ہیں' صرف ناپاک جنس سے ہوتی ہیں۔ جیسے ہندوؤں اور فاسق لوگوں کی روحیں۔ پس اس عمل میں

خباثت سے خملط ہونا لازم آتا ہے۔
اس کی چوتھی قسم قوتِ خیال کو خراب کرنا ہے۔ کیونکہ جنوں کی بعض ارواح کے واسطے سے کسی شخص کے خیال میں تصرف کرتے ہیں تا کہ اسے جو کچھ موجود نہیں ہے نظر آئے۔ یا اپنی خوفناک خیالی صورتوں سے ڈرے یا غیر واقعہ حرکات کو واقع سمجھے اور اس قسم کو نظر بندی اور خیال بندی کہتے ہیں۔ اور فرعون کے جادوگروں کے واقعہ میں آیت یخیل الیه من سحرهم انها تسعی سے اسی قسم کا جادو سمجھ میں آتا ہے۔ اور اس قسم کا جادو اگر معجزہ کے مقابلے میں اس کی دلالت علی الحق کو دُور کرنے کے لیے کیا جائے یا اولیاء کے مقابلہ میں ان سے جھگڑنے کے لیے عمل میں لائیں تو حرام اور کبیرہ گناہ ہے۔ اور اسی طرح اگر اس خیال بندی کے ذریعے کسی کو دھوکہ دیں اور اس کی عزت اور مال میں خیانت کریں' یہ بھی گناہِ کبیرہ ہوتا ہے۔ اور یہ جادو بنفسہٖ کفر نہیں۔ لیکن جس وقت کسی شخص کے خیال میں تصرف کرتے ہیں تو جنوں کی روحوں سے یا بڑے جنوں کے ناموں کا ذکر ضروری ہوتا ہے۔ اگر وہ التجا اور ذکر حد سے زیادہ تعظیم کے ساتھ ملا ہو تو کفر لازم آتا ہے۔
پانچویں قسم وہمیوں کا جادو ہے۔ جو کہ پہلے ہندوؤں میں بہت رائج تھا۔ اور اب اس کا نام ونشان موجود نہیں ہے۔ اور اسے تعلیق الوہم بھی کہتے ہیں۔ اور اس کا طریقہ اس طرح ہے کہ کسی مطلوبہ واقعہ کی صورت کا تصور کر کے پیش نظر رکھ کر وہم کو اسے حاصل کرنے کے ساتھ متعلق کرتے ہیں۔ اور اس تعلیق کی شرائط یعنی غذا کو کم کرنا' لوگوں سے میل جول ترک کرنا وغیرہا عمل میں لاتے ہیں تا کہ وہ مطلوب حاصل ہو جائے۔ اور اس قسم کا حکم یہ ہے کہ اگر اس سے جائز غرض کا قصد کریں جیسے دو زانیوں میں جدائی ڈالنا یا کسی ظالم اور کافر کو ہلاک کرنا تو مباح ہے۔ اور کسی ممنوع غرض کا قصد کریں جیسے میاں بیوی کے درمیان جدائی ڈالنا یا کسی بے گناہ کو ہلاک کرنا تو حرام ہے۔ حاصلِ کلام یہ کہ اس فعل کو عمل میں لانے کا حکم رکھتا ہے۔ اور فی نفسہ قبیح نہیں ہے۔
چھٹی قسم عجائب کا جادو ہے۔ یعنی چیزوں کے خواص کی وجہ سے کوئی عجیب فعل صادر کرتے ہیں۔ اور وہ خواص ہر کسی کو معلوم نہیں ہوتے۔ مثلاً یہ کہ جب چاہیں کہ انگلیوں سے

آگ جلائیں تھوڑا سا کابلی چونا سرکے میں تر کر کے اس میں تھوڑی سی سمندری جھاگ ملا دیں اور انگلی پر مل لیں اور اس مقام پر نفط (ایک قسم کا تیل ہے جو آگ پکڑتا ہے) ڈال لیں۔ پس اگر کسی مجلس میں جہاں شمع یا چراغ جل رہا ہو ان انگلیوں کو چراغ کے سامنے لے جائیں' آگ لگ جائے گی۔ اور انگلی نہیں جلے گی۔

ساتویں قسم حیلوں کا جادو ہے۔ جو کہ عجیب بناوٹ کے آلات کی مدد سے عجیب و غریب کام ظاہر کرتے ہیں۔ اور ان آلات کو بنانا انتہائی سوچ بچار اور ریاضتوں پر مبنی ہے۔ جیسے بنی موسیٰ کے حیلے اور ساعت پہنچاننے کے آلات جو کہ فرنگی بناتے ہیں۔

آٹھویں قسم شعبدہ بازی اور ہاتھ کی چالاکی کا جادو ہے۔ جو کہ لوگوں کو حیران کرنے کے لیے بہت سی عورتیں اور مرد عمل میں لاتے ہیں۔ اور اس قسم کے جادو میں پوشیدہ سبب خفیہ حرکات اور مشابہ چیزوں کو جلدی سے بدل دینا ہے۔ اور تینوں جادو کفر ہیں نہ حرام مگر جب غرض فاسد کا قصد کریں تو اس قصد کی وجہ سے حرمت ثابت ہو جاتی ہے۔

جادوگروں کے افعال اور معمولات اولیاء اللہ میں فرق

یہاں جاننا چاہیے کہ جادو کی اکثر قسموں کی اُمتِ مصطفویہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والتحیۃ کے ذہین لوگوں نے اصلاح کر کے اور ان سے کفر و شرک دُور کر کے انہیں استعمال کیا ہے۔ پہلی قسم کی اصلاح دعوتِ علوی ہے کہ ملاءِ اعلیٰ کے فرشتوں کی اس کے ساتھ تسخیر کرتے ہیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ کے عظیم اسماء اور قرآن پاک کی آیات کی مدد سے۔

اور دوسری قسم کی اصلاح قرآن پاک کی سورتیں اور دعوتِ سفلی ہے۔ جس سے موکلات ارضی اور جنوں کو مسخر کرتے ہیں۔ لیکن اسماءِ حسنیٰ اور آیات کی مدد سے بغیر کسی آلائش کفر و شرک یا غیر اللہ کی تعظیم کے بلکہ حکومت اور غلبے کے ساتھ۔

اور تیسری قسم کی اصلاح صلحاء اور اولیاء کی پاک ارواح کے ساتھ رابطہ ہے۔ جسے اکثر اویسی مشرب رکھنے والے عمل میں لاتے ہیں۔ اور اپنی ضرورتوں میں اور دوسری مخلوق اس سے فائدہ حاصل کرتی ہے۔ اور اسے حاصل کرنے کے طریقے میں بھی پاکیزگی' تلاوتِ آیات اور ان ارواح کے لیے صدقات کا ثواب پہنچانے کو پیش نظر رکھتے ہیں۔

اور چوتھی قسم کی اصلاح عقد ہمت یعنی ارادے کو باندھنا ہے۔ جو کہ مشائخ کباء اور اولیاء اللہ سے مشکلات کے حل کے لیے واقع ہوا۔ اور یہ عمل بھی عظیم کیفیت سے موصوف ہے۔ جو کہ اللہ تعالیٰ کے اسماء میں سے کسی اسم کے جلوے میں مستغرق ہونے کی وجہ ہاتھ آتی ہے۔ جو کہ سراسر روح کی پاکیزگی اور گناہوں کی میل اور آلائشوں کے جہان سے اس کے اونچا ہونے پر مبنی ہے۔

اور پانچویں قسم کی اصلاح آیات' اسماء اور ان کے اعداد کے خواص کی گہرائی میں اُترنا ہے۔ اور بعض کو بعض کے ساتھ ترکیب دینا اور اوفاق مبارکہ کی تصویر بنانا کہ مختلف کاغذوں اور مختلف خاصیتوں کی ارواح پر اچھے مقاصد میں سے کسی مقصد کو اس سے حاصل کرتے ہیں۔ جیسا کہ تعویذات اور اسماء اور قرآن پاک کی سورتوں کے خواص کی کتابوں میں قیود اور شرائط کے ساتھ اور تکبیر کی کتابوں میں ان کی تشریح کی گئی ہے۔ اور اس علم کی پیروی میں دوسری چیزوں یعنی عنصریات کے خواص۔ اور برجوں کے خواص اور درجات ستاروں کے شرف اور وبال میں بھی گہرا غور وفکر کرتے ہیں۔ اور اس میں اللہ تعالیٰ کے ذکر کو ملاتے ہیں۔

حاصلِ کلام جادو کی قباحت کی وجہ بھی ہے کہ کفر وشرک' کواکب' ارواح' مدبرہ یا شیطانوں کی ارواحِ خبیثہ کی تاثیر کے اعتقاد تک کھینچ کر لے جاتا ہے۔ اور غیر اللہ کی طرف التجا پر موقوف ہوتا ہے۔ اور اسباب کو دیکھنے میں اس طرح مصروف ہے کہ سبب کی قدرت سے غافل کر دیتا ہے۔ اور جب یہ قبیح وجہ بالکل زائل ہو جائے تو حلال اور حرام ہونے کا مدار مقصود غرضوں پر ہے۔ اگر اچھی ہیں تو اچھا اور اگر بُری ہیں تو بُرا۔ اور یہودیوں کا جادو غالباً ارواح شیاطین سے مدد لینے اور ان کے ناموں کا ذکر تھا یا مہمل معنوں والے منتر پڑھنا اور پسندیدہ اور ڈراؤنی تصویریں بنانا اور اسی لیے اسے مذمت کے مقام پر یاد فرمایا۔ اور یہ لوگ اسی پر اکتفاء نہ کرتے تھے جو انہوں نے حضرت سلیمان علیہ السلام کے عہد میں شیطانوں سے حاصل کیا تھا۔ بلکہ تلاش اور جستجو کرتے تھے۔

وَمَآ اُنْزِلَ عَلَى الْمَلَكَيْنِ بِبَابِلَ هَارُوْتَ وَمَارُوْتَ اور اس جادو کی جو ان دو فرشتوں پر نازل ہوا جو کہ بابل میں تھے جن کے نام ہاروت اور ماروت تھے۔ اور وہ جادو کی

پہلی قسم تھی جو کہ ذکر کی گئی ہے۔ اور صریح کفر اور نرا شرک ہے۔ کیونکہ عالم کی تدبیر کرنے والی ارواح کو خدا تعالیٰ جیسا سمجھنا ہے۔ اور ان کے متعلق وہ افعال بجالانا ہے۔ جو کہ اللہ تعالیٰ کے لیے خاص ہیں۔ جیسے حمد و ثناء' عموم علم' قدرت کا عقیدہ اور غلبہ و عظمت۔ بخلاف جنوں اور شیطانوں کی تسخیر اور مہمل معنوں والے منتر پڑھنے کے کہ استیلائی اور قہری تسخیر کا احتمال بھی رکھتے ہیں۔ اور ان منتروں کے معنی درست اور غلط دونوں طرح کا احتمال رکھتے ہیں۔ شرک صریح اور کفر ظاہر کا ارتکاب اس قسم سے ثابت نہیں ہوتا۔

ہاروت' ماروت اور کلدانیین کے جادو میں فرق

اور ہاروت' ماروت کے جادو اور کلدانیین اور اہلِ بابل کے جادو میں جو کہ انہوں نے ان سے سیکھا تھا' فرق یہ تھا کہ ہاروت ماروت کو یہ قدرت بھی عطا ہوئی تھی کہ صرف ان کی تاثیر سے تسخیر ارواح میں مشکل اعمال کی کشاکشی کے بغیر کسی خبیث روح کے ساتھ ایک رابطہ حاصل ہو جاتا تھا۔ اور اس رابطے کا اثر طالب کی روح کے جوہر میں پکا اور راسخ ہو جاتا تھا۔ اور کسی تدبیر سے بھی زائل نہیں ہوتا تھا۔ جبکہ کلدانیین اور اہلِ بابل ارواح کے ساتھ مناسبت اور رابطہ حاصل کرنے میں بہت مشقتیں برداشت کرتے تھے۔ اور ریاضتیں کرتے تھے۔ اور خلوتیں اختیار کرتے اور پھر بھی انہیں وہ پختگی اور رسوخ حاصل نہیں ہوتا۔

ہاروت ماروت کی تاثیر قوی کی دلیل

اور ہاروت اور ماروت کی تاثیر قوی کی دلیل یہ ہے۔ جو کہ حاکم نے سند صحیح کے ساتھ اور بیہقی نے اپنی سنن میں حضرت اُم المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت کی کہ آپ نے فرمایا دومۃ الجندل والوں سے ایک عورت حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وصال کے بعد آئی۔ اور وہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ڈھونڈ رہی تھا۔ اور کہتی تھی کہ مجھے آپ سے ایک چیز پوچھنا تھی۔ افسوس کہ آپ رحلت فرما گئے۔ جب وہ میرے پاس آئی' میں نے اس سے پوچھا کہ اپنی حاجت اور سوال بیان کرو۔ اس نے کہا میرا ایک شوہر تھا جو کہ میرے ساتھ بدسلوکی کرتا تھا۔ اور صلح کی طرف ہرگز مائل نہیں ہوتا تھا۔ اور میں اس واقعہ سے بہت

تنگدل تھی۔ اچانک ایک بڑھیا میرے گھر میں داخل ہوئی۔ میں نے اس کے سامنے اس ماجرا کی شکایت شروع کردی۔ اس نے کہا کہ جو کچھ میں کہوں اگر تو اسے عمل میں لائے تو تیرا شوہر غلام کی طرح تیرا مطیع ہو جائے۔ میں نے کہا میں ضرور بجالاؤں گی۔ جب رات کا پچھلا وقت ہوا' وہ بڑھیا میرے پاس آئی۔ اور اپنے ساتھ دو سیاہ کتے لائی۔ ایک کتے پر خود سوار ہوگئی۔ اور دوسرے پر مجھے سوار کر دیا۔ اور ہم روانہ ہوئیں۔ ایک لحہ گزرا تھا کہ ہم سرزمین بابل میں پہنچ گئیں' ہم نے دیکھا کہ دو آدمیوں کو ان کے پاؤں کے ساتھ اُلٹا لٹکا رکھا ہے۔ ان دونوں مردوں نے مجھ سے پوچھا کہ کیوں آئی ہے؟ میں نے اس بڑھیا کے سکھانے پر کہا کہ جادو سیکھنے آئی ہوں۔ ان دونوں نے کہا کہ جادو کفر ہے۔ اسے سیکھنے سے آدمی کافر ہو جاتا ہے' اپنے گھر واپس چلی جا۔ میں نے کہا کہ میں ہرگز واپس نہیں جاؤں گی۔ جادو سیکھے بغیر نہیں جاؤں گی' وہ اگرچہ مجھے منع کرتے تھے۔ میں اصرار کر رہی تھی جب میرا اصرار زیادہ ہوا تو انہوں نے مجھے کہا کہ اس تنور کی طرف جا اور اس میں پیشاب کر۔ میں اس تنور کی طرف گئی لیکن اسے دیکھ کر مجھ پر خوف غالب ہوا۔ اور میرے جسم پر رونگٹے کھڑے ہو گئے' میں واپس ہوگئی۔ اور ان کے پاس پہنچی اور میں نے کہا کہ پیشاب کر آئی ہوں۔ انہوں نے کہا تو نے کیا دیکھا؟ میں نے کہا کچھ نہیں دیکھا۔ انہوں نے کہا جھوٹ کہتی ہے تو نے پیشاب نہیں کیا اب بھی تیرے لیے یہی بہتر ہے کہ اپنے گھر کو لوٹ جا اور کافر نہ ہو۔ میں نے کہا میں ہرگز نہیں جاؤں گی۔

انہوں نے کہا پس جا اور تنور میں پیشاب کر۔ میں پھر تنور کی طرف گئی پھر وہی حالت درپیش آئی۔ یہاں تک کہ تین بار اسی قسم کا واقعہ ہوا۔ چوتھی مرتبہ میں نے جرأت کر کے اس تنور میں بول کر دیا۔ میں نے دیکھا کہ ایک زرہ پوش مسلح گھوڑا سوار جو کہ سر سے پاؤں تک لوہے میں غرق ہے' اندر سے باہر آ رہا ہے۔ اور وہ اُڑ کر آسمان کی طرف چلا گیا اور میری آنکھوں سے غائب ہو گیا۔ میں ان کے پاس گئی اور واقعہ کا اظہار کیا' انہوں نے کہا تو سچ کہتی ہے۔ یہ زرہ پوش سوار تیرا ایمان تھا جو تجھ سے نکل کر چلا گیا اب جا تو جادو کے فن میں کامل ہوگئی۔ میں نے اپنی ساتھی بڑھیا سے کہا کہ میں جادو سیکھنے آئی تھی ابھی تک کچھ بھی نہیں

Marfat.com

سیکھا اور یہی انہوں نے مجھے تعلیم دی تو میرا مطلب تو حاصل نہیں ہوا۔ اس بڑھیا نے کہا کہ تو نہیں جانتی ان کی تعلیم اسی طرح ہوتی ہے اب جس چیز کو تو جو کہہ دے گی اسی طرح ہو جائے گی۔ میں نے کہا کیسے یقین آئے۔ اس بڑھیا نے کہا کہ گندم کا ایک دانہ لے اور زمین میں ڈال اور کہہ کہ زمین سے باہر آ۔ میں نے ایسا ہی کیا صرف میرے کہنے سے ہی باہر آ گیا۔ میں نے کہا لمبا ہو جا' لمبا ہو گیا پھر میں نے کہا سٹہ باہر لا' سٹہ باہر لایا اور پھر میں نے کہا کہ خشک ہو جا' وہ خشک ہو گیا پھر میں نے کہا آٹا بن جا' آٹا ہو گیا پھر میں نے کہا پکی ہوئی روٹی ہو جا' پکی ہوئی روٹی ہو گئی جب میں نے یہ حالت دیکھی کہ جس چیز کو جو کہتی ہوں' ہو جاتی ہے میرے دل میں میرا ایمان چلے جانے پر بہت ندامت اور افسوس ہے۔ اور اے اُم المومنین میں خدا تعالیٰ کی قسم کھاتی ہوں کہ ابھی تک میں نے کسی کے حق میں بُرائی نہیں کی اور نہ کروں گی اب رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اوصاف جلیلہ سُن کر آئی ہوں کہ آپ سے کوئی تدبیر پوچھوں تا کہ میرا گیا ہوا ایمان واپس آ جائے۔ اور جب میں نے آپ کو ظاہری حیات میں نہیں پایا' بہت حسرت میں ہوں۔

والدین کی خدمت کی برکت سے ایمان کی واپسی

حضرت اُم المومنین رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بہت سے صحابہ کرام (رضی اللہ عنہما) موجود ہیں' جا اور ان سے سوال کر۔ وہ عورت تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی خدمت میں حاضر ہوئی اور اپنا حال بیان کیا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے کسی نے جرت نہ کی کہ اس کے ایمان کی واپسی کی کوئی تدبیر بیان کرے۔ مگر ابن عباس اور بعض دوسرے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے کہا کہ اگر تیرے والدین یا ان میں سے ایک زندہ ہو تو تجھے کفایت کرتا ہے۔ اور ان کی خدمت بجالا تا کہ تیرا ایمان تیرے پاس واپس آ جائے۔

اور ابن المنذر نے اوزاعی سے روایت کی اور انہوں نے ہارون بن رباب سے نقل کی کہ میں ایک دن عبدالملک بن مروان جو کہ بادشاہِ وقت تھا' کے پاس ملاقات کے لیے گیا۔ میں نے دیکھا کہ اس کے پاس ایک شخص بیٹھا ہے۔ جس کے لیے مسند بنائی گئی ہے۔

اور تکیہ رکھا ہے۔ میں نے درباری لوگوں سے پوچھا کہ یہ کون ہے۔ جو کہ بادشاہ کے برابر مسند پر بیٹھا ہے؟ لوگوں نے کہا کہ اس شخص کی بزرگی اس لیے ہے کہ ہاروت' ماروت کو دیکھ کر آیا ہے۔ میں نے کہا یہ شخص؟ انہوں نے کہا ہاں! میں اس کے سامنے گیا اور سلام کیا اور اس سے کہا کہ ایک بار ہاروت' ماروت کی ملاقات کا قصہ بیان کریں۔ میرے صرف یہی کہنے سے اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ اور اس نے کہا کہ میرا قصہ یہ ہے کہ میں نوجوان لڑکا تھا' بچپنے میں میرا باپ گزر گیا تھا۔ اور اس نے بہت سا مال چھوڑا اور وہ سارا مال میری ماں کے ہاتھ میں تھا۔ اور میری ماں مجھے بہت اچھی طرح رکھتی تھی' میں اس سے جو مانگتا' دے دیتی اور موزوں' غیر موزوں لاپرواہی سے خرچ کرتا۔ میری ماں مجھ سے نہیں پوچھتی تھی کہ تو اس مال کو کیا کرتا ہے جب کافی مدت گزر گئی اور میں خوب جوان ہو گیا۔ میرے دل میں خیال آیا کہ میں اپنی ماں سے پوچھوں کہ اس قدر زیادہ مال میرے باپ نے کہاں سے لیا تھا؟ جب میں نے اپنی ماں سے پوچھا تو اس نے کہا کہ بیٹا تجھے یہ پوچھنے سے کیا غرض؟ کھا اور عیش کر اور جس قدر بے جا خرچ کرنا چاہے کر لیکن اس مال کے حال کے متعلق مت پوچھ کہ یہی بہتر ہے۔ میں نے یہ باتیں سن کر زیادہ اصرار کیا' میری ماں مجھے گھر میں لے گئی جہاں مال کے ڈھیر لگے ہوئے تھے' کہنے لگی یہ سب تیرا مال ہے' تیری چند پشتوں تک کے لیے کافی ہوگا' تجھے کیا پرواہ ہے کہ مال کمانے کی وجہ پوچھتا ہے؟ میں نے کہا مجھے بہرحال بتانا چاہیے کہ اس قدر زیادہ مال کس طرح جمع کیا جا سکتا ہے۔

اس نے کہا کہ تیرا باپ جادوگر تھا' یہ تمام مال اس نے اپنے جادو کے ساتھ جمع کیا تھا۔ میں نے جب یہ بات سنی تو دل میں سوچا کہ مال موروثی پر اکتفاء کرنا بے ہمتوں کا کام ہے' مجھے بھی جادو سیکھنا چاہیے۔ اور جس طرح میرے باپ نے اس قدر بافراغت مال جمع کیے تھے' میں بھی اپنے زورِ بازو اور ہمت کے ساتھ مال جمع کروں۔ میں نے اپنی ماں سے پوچھا کہ اس ملک میں میرے باپ کے خاص دوستوں اور ساتھیوں میں سے کوئی باقی ہے۔ جو کہ میرے باپ کے اسرار سے واقف ہو اور وہ اعمال جو کہ میرا باپ کرتا تھا اس کے پاس موجود ہوں؟ اس نے کہا ہاں! فلاں آدمی فلاں قصبہ میں رہتا ہے۔ میں نے سفر کا سامان درست

کیا اور اس شخص کے پاس پہنچ گیا' پورے ادب سے سلام کیا اور اس کے سامنے بیٹھ گیا اس نے مجھے نہ پہچانا اور پوچھا کہ تو کون ہے؟ اور کہاں سے آیا ہے؟ میں نے کہا کہ فلاں کا بیٹا ہوں جو کہ آپ کا دوست تھا جب اس نے میرے باپ کا نام سنا تو بہت تپاک سے ملا اور بڑی شفقت کی' مرحبا مرحبا کہا۔ اور اس کے بعد پوچھا تیری کیا حاجت ہے۔ اور کس غرض سے آیا ہے؟ تیرا باپ اس قدر مال چھوڑ کر گیا ہے کہ تو کئی پشتوں تک کھائے گا اور کسی کا محتاج نہیں ہوگا۔ میں نے کہا کہ میں مال کی ضرورت کی وجہ سے نہیں آیا ہوں۔ بلکہ جادو سیکھنے کے لیے آیا ہوں اس نے کہا بیٹے! یہ خیال ہرگز نہ کرنا کیونکہ اس میں قطعاً بہتری نہیں ہے۔ میں نے کہا کہ میں آپ کے دامن نہیں چھوڑوں گا۔ جب تک مجھے بھی میرے باپ کی طرح پورا جادوگر نہ بنا دیں اس نے جس قدر نصیحت کی' میں باز نہ آیا۔ آخر اس نے مجبور ہو کر کہا یہاں ٹھہر۔ یہاں تک کہ فلاں دن فلاں ساعت آئے۔ جب وہ دن اور وہ ساعت آ گئی' میں تیار ہو کر چلا گیا اور میں نے اس سے وعدہ پورا کرنے کی درخواست کی۔ وہ مجھے قسمیں دے رہا تھا۔ اور روکتا تھا۔ اور میں اس کے پیچھے لگا ہوا تھا حتیٰ کہ اس نے مجبور ہو کر کہا کہ آ تجھے ایک جگہ لے چلتا ہوں لیکن خبردار تو وہاں خدا کا نام نہیں لے گا۔

مجھے ساتھ لے کر ایک سرنگ میں جو کہ زمین کے نیچے تھی' نیچے لے گیا' میں نے اپنے خیال میں شمار کیا کہ تین سو اور کچھ سیڑھیاں طے کیں اور وہاں سورج کی روشنی ہرگز کم نہ تھی جب ہم ان سیڑھیوں سے نیچے پہنچے اچانک ہم نے دیکھا کہ ہاروت ماروت لوہے کی زنجیر کے ساتھ ہوا میں لٹک رہے ہیں۔ اور ان کی آنکھیں ڈھالوں کی طرح بڑی بڑی اور ان کے پر وسیع اور لمبے۔ جب ان کی خطرناک صورت پر میری نظر پڑی بے اختیار میری زبان سے نکلا لا الہ الا اللہ یہ کلمہ سنتے ہی وہ اپنے پروں کو ہلا رہے تھے۔ اور زور زور سے چیخ رہے تھے۔ حتیٰ کہ ایک ساعت کے بعد چپ ہو گئے' میں نے امتحان کے لیے دوسری بار پھر کہا لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ ان کی پھر وہی حالت ہو گئی۔ میں نے تیسری بار بھی کہا پھر وہی حالت رونما ہو گئی۔ اس کے بعد میں خاموش ہو کر کھڑا ہو گیا۔ انہوں نے مجھے دیکھا اور کہا تو آدمی کی جنس سے ہے؟ میں نے کہا ہاں! میں نے کہا تمہاری حالت کیا ہو گئی؟ وہ بولے جب سے ہم عرش

کے نیچے سے آ گئے اور اس عذاب میں گرفتار ہوئے' کبھی یہ کلمہ نہیں سنا۔ اب جب ہم نے تمہاری زبان سے سنا تو ہمیں ہمارا اصلی ٹھکانہ یاد آ گیا۔ ہم نے بے اختیار گریہ زاری کی اب بتا کہ تو کس اُمت میں سے ہے؟ میں نے کہا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اُمت سے۔ انہوں نے پوچھا کیا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مبعوث ہو گئے؟ میں نے کہا ہاں مبعوث ہو کر وصال بھی فرما گئے۔ اور ان کے وصال کے بعد ان کے خلفاء ان کے قائم مقام ہوئے۔ اور وہ بھی وفات پا گئے۔ انہوں نے پوچھا کہ ا۔ آپ کی اُمت ایک شخص کے تابع ہے یا گروہ گروہ؟ میں نے کہا ایک شخص کے تابع ہے۔ جسے بادشاہ کہتے ہیں۔ اس بات سے ناخوش ہوئے پھر انہوں نے پوچھا کہ آپس میں نفاق رکھتے ہیں یا اتفاق؟ میں نے کہا دِلوں میں باہمی نفاق رکھتے ہیں اس بات سے خوش ہوئے۔

پھر انہوں نے پوچھا کہ دنیا کی عمارتیں بحیرہ طبریہ تک پہنچ گئی ہیں؟ میں نے کہا کہ ابھی نہیں پہنچیں اس بات سے بھی رنجیدہ ہوئے۔ اور خاموش ہو گئے۔ میں نے کہا کہ اُمتِ محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والتحیہ کے ایک شخص پر متفق ہونے پر تم کس لیے رنجیدہ اور ناخوش ہوئے؟ انہوں نے کہا کہ اصل میں بات یہ ہے کہ ہم قربِ قیامت سے خوش ہوتے ہیں۔ کیونکہ ہمارا عذاب دنیا کی مدت تک ہے' قیامِ قیامت کے بعد ختم ہو جائے گا۔ جب تک کہ اُمتِ محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والتحیات ایک شخص پر جمع ہے قیامت دُور ہے جب جدا جدا ہو جائیں گے' قیامت نزدیک ہو جائے گی۔ اور اسی طرح اس اُمت کا آپس میں دِلی نفاق بھی قربِ قیامت کی دلیل ہے۔ اور عمارتوں اور آبادی کا بحیرہ طبریہ تک پہنچ جانا بھی قربِ قیامت کی علامت ہے۔ میں نے کہا مجھے نصیحت فرمائیں۔ انہوں نے کہا کہ اگر ہو سکے تو نیند نہ کرنا کیونکہ مشکل کام درپیش ہے پھر یہ شخص واپس آ گیا اور اس نے ان سے جادو نہ سیکھا۔

ہاروت اور ماروت کا واقعہ

اور ہاروت اور ماروت کا واقعہ اس کے مطابق جو ابن جریر' ابن ابی حاتم' حاکم اور دوسرے مفسرین نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما' حضرت امیر المومنین مرتضیٰ علی کرم اللہ وجہہ الکریم' عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما اور مجاہد وغیرہ سے نقل کیا ہے کہ جب حضرت ادریس

علیہ السلام کے زمانے میں بنی آدم کے بُرے اعمال زمین سے آسمان کی طرف چڑھنے لگے تو آسمانی فرشتوں میں اس بات کی بہت قیل و قال ہوئی۔ اور فرشتوں نے بنی آدم کے بارے میں حقارت' توہین' نفرت اور لعنت کا اظہار شروع کر دیا۔ حق تعالیٰ نے خطاب بھیجا کہ ہم نے بنی آدم میں شہوت اور غضب کی ترکیب کی ہے اس وجہ سے ان سے گناہ صادر ہوتے ہیں۔ اگر ہم تمہیں بھی زمین میں اُتاریں اور تمہیں شہوت اور غضب کا مرکب بنائیں' تم سے بھی گناہ صادر ہوں گے۔ فرشتوں نے کہا کہ اے ہمارے پروردگار! ہم کبھی بھی تیری نافرمانی کے نزدیک نہ جائیں۔ اگرچہ ہم میں شہوت اور غضب ہو۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اپنے میں سے دو کو چُن کر پسند کرو تاکہ میں اس امر کی حقیقت تم پر واضح کروں۔ انہوں نے ہاروت اور ماروت کو منتخب کیا جو کہ فرشتوں کے درمیان کمال عبادت و صلاح میں ممتاز تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان میں شہوت اور غضب کی ترکیب کر دی اور فرمایا کہ زمین پر چلے جاؤ اور لوگوں کے درمیان فیصلے کرنا اور حق کے مطابق فیصلہ کرنا اور انہیں شرک' قتل' زنا اور شراب پینے سے منع فرمایا۔ نیز فرمایا کہ سارا دن دنیا میں رہا کرو اور فیصلوں کے کام میں مشغول رہا کرو اور جب شام ہو تو یہ اسم اعظم پڑھ کر آسمان پر آ جانا پھر صبح کے وقت زمین میں اُتر جانا۔ انہوں نے ایک ماہ تک اسی قسم کی آمد و رفت رکھی۔ اور زمین میں ان کی بہت شہرت ہو گئی کہ دو نیک طینت آدمی فلاں جگہ پر ہیں' ہر واقعہ میں درست فیصلہ کرتے ہیں۔ اور حق کے طریقے سے رد رعایت کے بغیر جھگڑوں کا فیصلہ کرتے ہیں۔

اچانک زہرہ نامی ایک عورت جو کہ اس وقت کی تمام عورتوں سے حسن و جمال میں ممتاز تھی۔ اور حضرت امیر المومنین کی روایت میں اس طرح وارد ہوا کہ اہل فارس سے تھی۔ اور اس ملک میں اس کا لقب بیدخت تھا' لباسِ فاخرہ پہن کر پُر تکلف انداز میں اپنے شوہر کے خلاف دادخواہی کے لیے ان کے سامنے آئی۔ کہتے ہیں کہ اصل میں اسے اسم اعظم سیکھنے کا شوق لگا ہوا تھا۔ لیکن چونکہ وہ قدیم سے اس بے حیائی کی عادی تھی اسی طریقے کو اس مطلب کے حاصل کرنے کا وسیلہ بنا لیا۔ بہر حال یہ دونوں اسے دیکھتے ہی اس کے حسن و جمال پر فریفتہ ہو گئے۔ اور اس سے بُرے فعل کا تقاضا کیا۔ اس نے کہا تمہارا دین اور ہے۔

اور میرا دین اور ہے' دین میں اختلاف کے ہوتے ہوئے یہ کام نہیں ہوسکتا۔ نیز میرا شوہر غیور ہے۔ اگر وہ جان لے گا کہ میں تمہارے ساتھ نشست و برخاست کرتی ہوں تو مجھے قتل کردے گا۔ پہلے تو چاہیے کہ تم میرے بت کو سجدہ کرو اس کے بعد میرے شوہر کو قتل کرو اس کے بعد میں تمہارے پاس رہوں گی۔ انہوں نے کہا پناہ بخدا شرک اور قتل ناحق سخت قبیح ہے' ہم ہرگز نہیں کریں گے۔ وہ عورت پھر کر چلی گئی لیکن اُن کے دل میں اس کی محبت کے قلق اور بے چینی نے بہت غلبہ کیا۔ دوسرے دن انہوں نے اس عورت کے پاس پیغام بھیجا کہ ہم تیرے گھر میں مہمان ہوتے ہیں۔ اس نے کہا سر آنکھوں پر اس نے ایک مکان مہیا کیا اور اپنے آپ کو بھی مزین کیا اور اپنی عادت کے مطابق شراب کی بوتلیں بھی حاضر کیں۔

جب وہ اس مکان میں پہنچے تو اس نے کہا کہ اب میں تمہیں چار چیزوں میں اختیار دیتی ہوں۔ میرے بت کو سجدہ کردو یا میرے شوہر کو قتل کردو یا مجھے اسم اعظم کی تعلیم دو یا شراب کا ایک پیالہ پیو۔ ان دونوں نے باہمی مشورہ کیا کہ شرک اور قتل دونوں شدید گناہ ہیں۔ اور اسم اعظم سر الٰہی ہے' کسی سے کہا نہیں جاسکتا۔ البتہ شراب پینا نسبتاً آسان گناہ ہے اسی کو اختیار کرلینا چاہیے۔ جیسے ہی شراب پی' بے ہوش اور لایعقل ہوگئے۔ اور اس عورت کے حکم سے بت کو سجدہ بھی کردیا اس کے شوہر کو بھی قتل کردیا۔ اور اس عورت کو اسم اعظم بھی سکھا دیا۔ اور بعض روایات میں یوں وارد ہے کہ وہ عورت اسم اعظم پڑھ کر آسمان پر چلی گئی۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی روح کو ستارہ زہرہ کی روح کے ساتھ ملا دیا۔ اور زہرہ کی صورت میں مسخ ہوگئی اور یہ دونوں اس کے ساتھ نہ جاسکے۔ اور اسم اعظم ان کی یاد سے نکل گیا جب شراب کی مدہوشی سے اپنے آپ میں آئے' افسوس اور ندامت شروع کردی۔ اللہ تعالیٰ نے آسمانی فرشتوں کو ان کے حال سے مطلع فرمایا۔ اور فرمایا کہ دونوں فرشتے باوجود یہ کہ میری تجلیات سے غائب نہیں۔ اور انہیں پورا مشاہدہ نصیب تھا' شہوت کے غلبہ کی وجہ سے اس گناہ میں گرفتار ہوگئے۔ بنی آدم جو کہ حضوری سے غائب ہیں ان کی طینت میں شہوت کا خمیر ہے۔ اگر ان سے گناہ صادر ہوں تو کیا تعجب؟

سب ملائکہ نے اپنی خطا کا اقرار کیا اور اس کے بعد زمین والوں کے لیے بخشش کی دعا

میں مصروف ہوئے۔ چنانچہ حق تعالیٰ فرماتا ہے وَالْمَلٰٓئِكَةُ يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَيَسْتَغْفِرُوْنَ لِمَنْ فِي الْاَرْضِ الخ (الشوریٰ آیت ۵) حاصلِ کلام یہ ہے کہ دونوں فرشتے اپنی دگرگوں حالت دیکھ کر بے چین ہوئے۔ حضرت ادریس علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اور اپنی حالت بیان کی اور اپنے حق میں شفاعت کی درخواست کی۔ حضرت ادریس علیہ السلام نے وعدہ فرمایا کہ ٹھہرو تاکہ جمعۃ المبارک کے دن تمہارے لیے بارگاہِ خداوندی میں عرض کروں گا۔ جب جمعہ کا دن گزر گیا تو فرمایا اس جمعہ میں تمہارے حق میں میری دعا قبول نہیں ہوئی' دوسرے جمعہ کا انتظار کرو۔ جب دوسرا جمعہ آیا تو حضرت ادریس علیہ السلام نے فرمایا کہ حق تعالیٰ نے تمہیں اختیار دیا ہے۔ اگر تم چاہو تو اپنے لیے دنیا کا عذاب قبول کرو اور اگر چاہو تو آخرت کے عذاب کے لیے تیار رہو دنیا میں تم سے مواخذہ نہ ہوگا۔ انہوں نے باہمی مشورہ کیا کہ دنیا کا عذاب فانی ہے۔ جبکہ آخرت کا عذاب باقی' فانی کو اختیار کر لینا چاہیے کہ ختم ہو جائے گا۔ عذابِ دنیا کو اختیار کر لیا۔ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو حکم دیا کہ لوہے کی زنجیروں میں ان کے سر کے بال اور جسم کو چوٹی سے لے کر قدم تک باندھیں اور انہیں سرنگوں کر کے سر نیچے اور پاؤں اوپر کر کے اس کنوئیں میں لٹکائیں۔ جو کہ آگ کے شعلے مار رہا ہے۔ اور ایک ایک فرشتہ باری باری آگ کے کوڑے مارنے کی ڈیوٹی دے۔ یہاں تک کہ دنیا ختم ہو جائے۔

کہتے ہیں کہ ہر فرشتہ جو کوڑے مارنے سے فارغ ہوا دوسری بار اس کی باری نہیں آتی اور فرشتہ آتا ہے۔ اور اس کام میں مشغول ہو جاتا ہے۔ اور ان پر پیاس اس قدر مسلط کر دی گئی ہے کہ پیاس کی شدت سے ان کی زبانیں منہ سے باہر لٹکتی ہیں۔ اور ان کے منہ سے ایک بالشت کے فاصلے پر ٹھنڈا خوش گوار پانی رکھتے ہیں۔ اور ان کا منہ وہاں نہیں پہنچتا۔ والعیاذ باللہ من غضب اللہ اور یہ واقعہ محدثین کی تفاسیر' سنن بیہقی' مسند امام احمد اور کتب حدیث میں متعدد روایات اور مختلف طریقوں سے جن میں بعض صحیح ہیں' مروی اور ثابت ہے۔ البتہ مفسرین متکلمین نے جیسے امام رازی اور قاضی بیضاوی نے اس واقعہ کا انکار کیا ہے۔ اور کہا ہے کہ قرآن پاک کے الفاظ میں کوئی ایسی چیز موجود نہیں جو کہ اس واقعہ کا پتہ

دے اوران کتابوں کی روایات جو اصول بنیادی عقائد اور دین کے قواعد کے خلاف ہوں' معتبر نہیں سمجھی جاسکتی۔

ہاروت ماروت کے واقعہ میں اصول وقواعد دین کے خلاف ہونے کی چند وجوہ

اوراس واقعہ میں چند وجہ سے اصول اور قواعد دین کی مخالفت لازم آتی ہے: پہلی وجہ یہ فرشتے بالاجماع معصوم ہیں' ان سے کبیرہ گناہوں کا صادر ہونا ان کی عصمت کے خلاف ہے' دوسری وجہ یہ کہ ان دونوں فرشتوں کواس عذاب میں گرفتاری کے باوجود جادو کی تعلیم کی فرصت ہے۔اور لوگوں کوان سے ملنا کیسے ممکن ہوسکتا ہے۔تا کہ تعلیم وتعظیم کا سلسلہ درست ہو' تیسری وجہ یہ کہ ایک فاجرہ عورت کواس قسم کی خباثت کے باوجود کیسے ممکن ہوا کہ اسم اعظم کے زور سے آسمان پر چڑھ گئی۔اسمائے الٰہی کی دعوت کے لیے بہت شرائط درکار ہیں۔اور ان میں سے عمدہ شرط تقویٰ اور طہارت ہے۔چوتھی وجہ یہ کہ صورت کا مسخ اور تبدیلی عذاب کے زمرے سے ہے۔اور عذاب کے لیے چاہیے کہ اس کے ضمن میں ذلت ورسوائی ہواور جب اس فاجرہ عورت کو چمکدار روشن ستارہ بنادیا گیا اوراسے آسمان پر جگہ دی گئی کہ اس کے انوار ہمیشہ زمین والوں پر چمکیں اس کی کمال تعظیم کا موجب ہوا کہ انسانی شکل میں اتنی عظمت کا تصور بھی ہرگز نہیں ہوسکتا۔

پانچویں وجہ یہ کہ زہرہ سات (۷) ستاروں میں سے ایک مشہور ومعروف ستارہ ہے۔جو کہ حضرت آدم علیہ السلام کی پیدائش سے پہلے تھا۔جبکہ اس واقعہ سے لازم آتا ہے کہ یہ ستارہ اس واقعہ کے بعد موجود ہوا ہوگا۔چھٹی وجہ یہ ہے کہ اس قصے میں فرشتوں کی زبان سے نقل کیا گیا ہے کہ انہوں نے بارگاہِ خداوندی میں عرض کی کہ ہم شہوت وغضب کی ترکیب کے باوجود تیری نافرمانی نہیں کریں گے۔حالانکہ حق تعالیٰ نے فرمایا تھا کہ اگر تم میں بھی آدمیوں کی طرح شہوت وغضب کو مرکب کردوں تو تم بھی نافرمانی میں مبتلا ہوجاؤ گے تو اس میں صریح طور پر دربارِ خداوندی کی تکذیب اور ناواقف قرار دینا لازم آیا۔اور یہ فعل شنیع تو صرف ایمان کے بھی خلاف ہے چہ جائیکہ فرشتہ ہونا۔

پس ان دو فرشتوں کے نازل کرنے کا سبب یہ تھا کہ جادو کا علم بھی علوم الٰہیہ میں سے

ہے۔ نوع انسان میں اس علم کو باقی رکھنا نگاہِ خداوندی میں منظور تھا۔ اور انبیاء علیہم السلام کی شان نہیں ہے کہ اس قسم کے نقصان دہ علوم کی تبلیغ کریں۔ جن کی وجہ سے مخلوق کی تاثیر کا اعتقاد اور خالق کی تاثیر سے غفلت دلوں میں جاگزیں ہو۔ جیسے ریاضیات اور طبعیات کے علومِ فلسفیہ کہ ان کا نقصان ان کے نفع سے زیادہ ہے انہیں بھی انبیا علیہم السلام بیان نہیں کرتے۔ اور ان سے جان بوجھ کر خاموشی اختیار فرماتے ہیں۔ اس لیے کہ نبوت کی حقیقت خلق کو حق کی طرف بُلانا ہے۔ اور ان کے احساسات اور ذہنوں کو ملاءِ اعلیٰ کی طرف متوجہ کرنا ہے۔ اور یہ علوم اس غرض میں خلل ڈالتے ہیں۔ پس ناچار دو فرشتوں کو اس قسم کے علوم کی تعلیم دینے کے لیے نازل فرمایا۔

جادو کی تعلیم کا بیان

اور جادو کی تعلیم میں کوئی قباحت نہیں ہے۔ کیونکہ جادو کے کام کی انتہا یہ ہے کہ کفر ہے۔ اور جو چیز کفر تک پہنچائے اس کی تعلیم کا کوئی ڈر نہیں۔ مثلاً اگر کوئی شخص کہے کہ اگر تو فلاں ستارے کی پوجا کرے تو یوں اثر ہوگا اور اگر فلاں شیطان کی عبادت کرے تو یہ مطلب ہوگا۔ اور کوئی دوسرا آدمی اس کلام کو سُن کر اس ستارے کی تاثیر کا معتقد ہو جائے یا اس شیطان کی پوجا میں لگ جائے تو کفر یہ عبادت اور اعتقاد ہے۔

نیز جادو کا علم بہت سے فائدے رکھتا ہے۔ اور انبیا علیہم السلام کے معجزات اور اولیاء کی کرامات کے درمیان اور جادوگروں کے جادو، طلسم، منتروں اور شعبدہ کے درمیان فرق اسی علم سے حاصل ہوتا ہے۔ اور جو لوگ اس علم سے بے خبر ہیں ان چیزوں میں فرق نہیں کرتے۔ بلکہ جادوگروں اور مداریوں کو انبیا علیہم السلام اور اولیاء کی مانند سمجھتے ہیں۔

اور جادو کے بعض اعمال اللہ تعالیٰ کے دشمنوں کو ہلاک کرنے میاں بیوی کے درمیان اُلفت پیدا کرنے۔ اور ظالم کے شر کو دُور کرنے کے لیے شرعی طور پر مستحسن ہو جاتے ہیں۔ نیز جب کوئی شخص جادو کے قاعدے جان کر ناپسندیدہ جگہ پر استعمال کرنے سے پرہیز کرے مزید ثواب کا مستحق ہوگا۔ کہ گناہ پر قدرت ہونے کے باوجود گناہ سے باز رہا۔ نیز اس وقت بابل شہر کے لوگوں کو اس علم کا بہت شوق تھا۔ اور انہوں نے جادو سے عجیب و

غریب چیزیں نکالی تھیں۔ اور اس علم کی وجہ سے ان میں تکبر اور غرور بہت پیدا ہو گیا تھا۔ اور بارگاہ خداوندی سے بالکل غافل ہو چکے تھے۔ حکمتِ الٰہی نے تقاضا فرمایا ہوگا کہ اس وقت جہانِ غیب سے اس علم کی باریکیاں دو فرشتوں کے ذریعے ان پر کھول دے۔ تاکہ وہ جانیں کہ اللہ تعالیٰ کے علم سے کبھی بھی بے نیازی نہیں ہو سکتی اور غیبی مدد کے بغیر ہر فن کی آخری حد تک پہنچنے اور اس کی انتہا کو پانے سے بشر کا عاجز ہونا انہیں حائل ہو۔ حاصلِ کلام یہ کہ انہیں اسی پردہ میں سہی بارگاہ رب العزت کی طرف توجہ حاصل ہو۔

اور اس سبب کے ہونے پر دلیل یہ ہے کہ قرآن پاک کے الفاظ میں وَمَآ اُنْزِلَ عَلَى الْمَلَكَيْنِ واقع ہوا جو کہ اس علم کو جنابِ الٰہی سے نازل کرنے کی صریح دلیل ہے۔ نیز قرآن پاک میں ان فرشتوں کے حال سے متعلق مذکور ہے کہ وَمَا يُعَلِّمٰنِ مِنْ اَحَدٍ حَتّٰى يَقُوْلَآ اِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ فَلَا تَكْفُرْ اور یہ نصیحت اور وعظ اس امر کی دلیل ہے کہ یہ دونوں فرشتے خود بخود اس علم کی تعلیم نہیں دیتے تھے۔ نیز اس امر پر بھی دلیل ہے کہ ان کے پیش نظر صرف اس کی تعلیم نہ تھی بلکہ تعلیم اور جادو پر عمل سے روکنا۔ مختصر یہ کہ اس گروہ کی باتیں اسی طرز پر ہیں۔

اس واقعہ کی مخالفات قواعد دین کی توجیہ کا بیان

لیکن اگر اس باب میں وارد ہونے والی روایات کو تلاش کیا جائے تو یقین کے ساتھ معلوم ہوتا ہے کہ اس واقعہ کی بھی کوئی بنیاد ہے۔ اس لیے کہ اس باب میں مرفوعاً' موقوفاً' اخباراً اور آثاراً جو کچھ وارد ہوا اس نے اس واقعہ کی قدر مشترک کو تواتر کی حد تک پہنچا دیا ہے۔ اگرچہ واقعہ کی خصوصیات میں کوئی اختلاف وارد ہوا ہو۔ اور جس قدر متواتر ہے اس کا انکار اچھا نہیں۔ اور اگرچہ اس واقعہ کی چند اسناد غیر معتبر اور لغو ہیں۔ لیکن لغو اور ضعیف اسناد کا تواتر بھی سچا ہونے کی جہت کی ترجیح کا موجب ہو جاتا ہے۔

اور انہوں نے اس واقعہ کے دین کے قواعد کے خلاف ہونے کی وجوہ میں جو کچھ ذکر کیا ہے' ظاہراً وہ مسلم ہے۔ لیکن جب گہری نظر کی جائے تو ان مخالف چیزوں کو دین کے مقرر قواعد کی طرف لوٹانا ممکن ہے۔ اور اس کا احتمال ہے۔ اگر اس واقعہ کی صحت روایات کی

رو سے ثابت ہو جائے تو ان مخالف چیزوں کی توجیہ میں پڑنا چاہیے۔ اور کثیر روایات کے انکار کے لیے نہیں اُٹھنا چاہیے ورنہ حضرت یوسف اور حضرت داؤد علیٰ نبینا وعلیہما السلام کے واقعات اور اس قسم کے اور واقعات کی تکذیب لازم آئے گی۔ مثلاً کہا جاسکتا ہے کہ گناہوں سے فرشتوں کا معصوم ہونا اس وقت تک ہے جب تک کہ وہ صرف اپنی جبلت ملکی پر باقی رہیں۔ اور جب ان میں شہوت اور غضب پیدا کر دیا گیا تو صرف فرشتہ ہونے سے نکل گئے۔ پس اس وقت اس محض فرشتہ ہونے کے تقاضا کی جو کہ عصمت اور طہارت ہے' کی بھی ان سے امید نہیں رکھنا چاہیے۔ جیسا کہ انبیا علیہم السلام اور اولیاء کے نفوسِ قدسیہ جو کہ بشریت کے باوجود شہوت وغضب کی اصلاح کی وجہ سے معصوم اور پاک ہوتے ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ جب اثر کرنے والا بدل جائے تو اثر کے بدلنے میں کیا دُوری ہوگی۔

نیز کہا جاسکتا ہے کہ عذاب میں گرفتار ہونے کی حالت کے باوجود جادو کی تعلیم دینا اگر انسانی حوصلہ پر قیاس کریں تو بعید از امکان ہے۔ مگر یہاں فرشتوں کے بارے میں بات ہو رہی ہے جن کے حوصلہ کی فراخی معلوم ہے۔ ہوسکتا ہے کہ ان کے جسموں پر عذاب کی مختلف قسموں کے باوجود ان کی فکری اور نطقی قوتیں برقرار ہوں۔ اور بارہا تجربہ ہوا ہے کہ کسی بھی علم میں مہارت رکھنے والا تکلیف دہ دردوں اور شدید بیماریوں میں گرفتار ہونے کے باوجود اس علم کی تعلیم دے سکتا ہے۔ اور اس علم میں ہمیشہ مصروف رہنے اور مہارت رکھنے کی وجہ سے اس علم کا پڑھانا اس پر بہت سہل اور آسان ہوتا ہے۔ اور وہ تھوڑی سی توجہ سے ایسا کام کرسکتا ہے جو دوسرے گہری نظر کے ساتھ بھی نہیں کرسکتے اور ان دونوں فرشتوں کو جادو کا علم کسی کے دل میں ڈالنے کا اسی قسم کا ملکہ ہوگا۔ خصوصاً جب کہ ہم تسلیم کرتے ہیں کہ ان کا زمین میں اُترنا اسی علم کی تعلیم کے لیے تھا تو انہیں غیب کی طرف سے بھی اس بارے میں کوئی مدد پہنچتی تھی۔ اور عذاب برداشت کرنا اس سلسلے میں مانع نہیں ہوتا تھا۔

اور مسلم ہے کہ اس زمانے کے لوگوں کا ان دونوں فرشتوں سے ملنا واقع نہیں ہے۔ لیکن ہوسکتا ہے کہ شیاطین اور جنات فائدہ دینے اور لینے میں واسطہ ہو گئے ہوں جیسا کہ قتادہ سے مروی ہے کہ ہر سال شیطانوں میں سے ایک فرد ان تک پہنچتا ہے۔ اور نیا جادو سیکھ

کرآتا ہے۔ اور لوگوں میں پھیلاتا ہے۔ اور گزشتہ زمانے میں جبکہ کارخانۂ تعلیم وتعلم کی ابتدا تھی' لوگ ان سے ملتے تھے۔ اور سیکھتے تھے۔ اور انہوں نے اس کی تدوین ترک کردی۔

نیز کہا جاسکتا ہے کہ اگرچہ وہ عورت فاجرہ تھی۔ لیکن جب وہ اسمِ اعظم سیکھنے کا شوق رکھتی تھی۔ اور اسے اس نے بدکاری پر قادر کرنے کی شرط قرار دیا تھا پس اس فعل میں حسن اور قبیح کی دو وجہیں مل گئیں۔ اچھی نیت اور صورت عمل کی قباحت۔ اس شخص کی طرح جو کسی مجبور پیاسے کو غصب کیے ہوئے پانی سے سیراب کرے یا کسی مجبور بھوکے کو حرام کھانا کھلائے۔ اس کی جزا کی صورت میں تو ضرور مسخ ہوگئی لیکن اس کی اچھی نیت نے کام کیا کہ چمکتے ستاروں کے ساتھ مل گئی۔

اور اس کا راز یہ ہے کہ اس عورت نے اپنے حسن و جمال کو قربِ الٰہی حاصل کرنے کا وسیلہ بنایا تھا۔ لیکن بے جا اور بے محل۔ پس اسے حسن دائمی اس طرح عطا ہوا کہ زہرہ کی روح کے ساتھ اس کی روح کو متصل کردیا گیا اور نورانی جسم کے ساتھ اسے تعلق بخشا گیا اور آدمیوں کی روحوں کا آسمان پر چڑھنا کوئی تعجب کی بات نہیں۔ صالح ایمان والوں کے فوت ہونے والوں کی رُوحوں کا خصوصاً شہداء کا ساتویں آسمان پر چڑھنا تسلیم شدہ اور طے شدہ امر ہے۔ اور اگرچہ ستارے کی شکل دوسری مخلوقات کی نسبت شرافت اور عظمت رکھتی ہے۔ لیکن اِنسانی صورت کی نسبت سے مہین وحقیر ہے۔ پس ایک نسبت سے تعظیم اور ایک نسبت سے حقارت دونوں متحقق ہوگئیں۔

اور فرشتوں کے کلام میں اپنے ارادہ کی پختگی اور اطاعت نافرمانی نہ کرنے کا بیان ہے نہ کہ باری تعالیٰ کی تکذیب اور اسے معاذ اللہ ناواقف سمجھنا۔ پس ان کے کلام کا معنی یہ ہے کہ ہم اپنی طرف سے یہ پختہ ارادہ رکھتے ہیں گو اس کے خلاف واقع ہوجائے۔ اور ظاہری طور پر فرشتوں نے کلام الٰہی سے یوں سمجھا ہوگا کہ جس مخلوق میں شہوت اور غضب کی ترکیب ہوجائے اس سے نافرمانی کا صادر ہونا لازم ہے۔ اگرچہ مجبوری اور بے اختیاری سے ہو اور انہوں نے اپنی طرف سے یوں عرض کی' ہم سے اپنے اختیار کے ساتھ معصیت صادر نہیں ہوگی۔ پس دونوں کلاموں کے مدلولوں میں کوئی تناقض نہیں تاکہ تکذیب اور ناواقف ماننا

لازم آئے۔

اور اس عورت کو زہرہ کی شکل میں مسخ کرنے کا بھی یہی معنی ہے کہ اس عورت کی روح کو زہرہ کی روح کے ساتھ متصل کر دیا گیا نہ یہ کہ پہلے یہ ستارہ موجود نہ تھا۔ پس واقع کی کوئی مخالفت لازم نہیں آتی۔

مسخ شدہ شکلیں تیرہ (۱۳) ہیں۔ اور مسخ ہونے کی وجوہات

اور زبیر بن بکار ابن مردویہ اور دیلمی نے حضرت امیر المومنین مرتضیٰ علی کرم اللہ وجہہ سے روایت کی کہ میں نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھا کہ مسخ شدہ کتنی شکلیں ہیں؟ فرمایا تیرہ (۱۳) ہیں: ہاتھی' ریچھ' سور' بندر' سانپ کی شکل کی مچھلی' گوہ' ابابیل' بچھو' عموص جو کہ ایک چھوٹا سا جانور جو پانیوں اور دریاؤں میں ہوتا ہے۔ اور اسے ہندوستان کے عرف میں جولاہہ کہتے ہیں' مکڑی' خرگوش' سہل ستارہ اور زہرہ ستارہ۔ میں نے عرض کی یارسول اللہ! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان کے مسخ ہونے کی کیا وجہ تھی؟ فرمایا کہ ہاتھی ایک سرکش اور دولت مند آدمی تھا جسے لواطت اور اغلام بازی کی عادت تھی' بے ریش لڑکوں میں سے کوئی ایسا نہ تھا جس سے اس نے یہ بُرا فعل نہ کیا ہو۔ ریچھ ایک مخنث تھا جو کہ اپنے آپ کو عورتوں کی طرح سنوارتا تھا۔ اور مردوں کو اپنے اُوپر مسلط کرتا تھا۔ اور سور نصاریٰ کی ایک جماعت تھی جنہوں نے نزولِ مائدہ کی نعمت کی ناشکری کی تھی۔ اور بندر یہودی تھے۔ جو کہ ہفتہ کے دن مچھلی کا شکار کرتے تھے۔

اور سانپ کی شکل والی مچھلی ایک بے غیرت آدمی تھا جو کہ اپنی بیوی اور دوسرے مردوں کے درمیان دلالی کرتا تھا۔ اور گوہ ایک گنوار جنگلی تھا جو کہ حجاز کے قافلوں سے چوری کرتا تھا۔ ابابیل ایک ایسا شخص تھا جو درختوں سے پھل چراتا تھا۔ اور بچھو ایک زبان دراز آدمی تھا جس کی زبان سے کوئی بھی محفوظ نہ تھا۔ اور عموص ایک چغل خور آدمی تھا جو کہ اپنی چغل خوری کی وجہ سے دوستوں میں جدائی ڈال دیتا تھا۔ اور مکڑی ایک عورت تھی جس نے اپنے شوہر کو جادو کر کے مار دیا تھا۔ اور خرگوش بھی ایک عورت تھی جو کہ حیض سے پاک ہونے کا غسل نہیں کرتی تھی۔ اور سہیل یمن میں ایک چوکیدار تھا جو کہ ہر شخص سے کوئی نہ کوئی چیز

چھین لیتا تھا۔ اور زہرہ ایک بادشاہ کی بیٹی تھی جس نے ہاروت اور ماروت کو فتنے میں ڈالا۔

اور تفسیر زاہدی میں اس قصہ کے بقیہ میں مذکور ہے کہ اس عورت کو دونوں نے اپنی طرف راغب کیا اس نے انہیں اپنے آپ پر قادر کرنے سے انکار کر دیا جب تک کہ اسے اسمِ اعظم نہ سکھا دیں تو انہوں نے اس اسمِ اعظم سکھا دیا۔ پس وہ ایک مکان میں داخل ہوئی اور غسل کیا اور اللہ تعالیٰ سے اس کے اسمِ اعظم کے ساتھ دعا مانگی تو اسے اللہ تعالیٰ نے ستارہ کی شکل میں مسخ کر دیا جو آسمان کی طرف چڑھ گیا۔

وَمَا یُعَلِّمَانِ مِنْ اَحَدٍ اور وہ دونوں فرشتے لوگوں کو گمراہ کرنے کا ہرگز قصد نہیں رکھتے تھے۔ اور انہیں جادو کی تعلیم سے مخلوق کا کفر منظور نہ تھا جیسا کہ شیاطین کرتے تھے۔ بلکہ وہ کسی کو جادو کی تعلیم نہیں دیتے تھے۔ جب تک کہ اسے جادو کی قباحت سے خبردار نہ کر دیتے۔ اور وعظ و نصیحت نہ کر لیتے۔ حتیٰ کہ اپنے آپ کو صفتِ حقارت سے موصوف کرتے تھے۔ یَقُوْلَا اِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ کہتے تھے کہ ہم نہیں ہیں۔ مگر مخلوق کے فتنے کا سبب۔ کیونکہ لوگ ہم سے جادو سیکھ کر کافر اور نافرمان ہو جاتے ہیں۔ پس تیرے حق میں یہی بہتر ہے کہ تو اس کفر و نافرمانی کے سبب کو جو اکثر اپنے سبب کو کھینچ لیتا ہے' اپنے لیے اختیار نہ کرے۔ اور اگر تو اس سبب کا مرتکب ہوتا ہے۔

فَلَا تَكْفُرْ تو کافر مت ہو۔ ستاروں' شیطانوں اور ارواحِ خبیثہ کی تاثیر کا اعتقاد اور ان کی عبادت کر کے۔ اور جب طالب اصرار کرتا تھا۔ اور ان کی وعظ و نصیحت کے باوجود جادو سیکھنے سے باز نہ آتا تو اسے تعلیم دیتے تھے کہ اس مقدمہ میں جادو اس طرح ہوتا ہے۔ اور اس مقدمہ میں اس طرح اور اس ترتیب کے ساتھ فلاں مقصد میں اس کا اثر جاری ہوتا ہے۔ اور اس ترتیب کے ساتھ فلاں کام میں۔ پس تو اللہ تعالیٰ سے ڈر اور اس عمل میں مشغول مت ہو تاکہ تجھے رفتہ رفتہ باطل تاثیروں کے عقیدہ تک کھینچ کر نہ لے جائے۔

اس مقام پر تفسیر زاہدی میں کہتے ہیں کہ یہ فرشتوں کی طرف سے ڈرانے کے طریقہ سے واقع ہوتا ہے۔ اور سننے والے کی طرف سے بطور تعلیم یعنی سیکھنے کے جیسا کہ فقیہ کہتا ہے کہ جس نے ایک درہم کے عوض دو درہم لیے تو اس نے سود لیا۔ اور جس نے ایسا کیا اس نے

بدکاری کی۔ تو یہ کہنا فقیہ کی طرف سے بطور ڈرانے کے واقع ہوتا ہے۔ اور سننے والے کی طرف سے بطور سیکھنے کے۔ نیز اسی تفسیر میں کہتے ہیں کہ جادو کو بیان کرنا اس لیے جائز ہے کہ اسے جانے بغیر حرام سے پرہیز تک پہنچنا نہیں ہو سکتا جس طرح کہ تعمیل حکم تک حکم جانے بغیر پہنچنا نہیں ہو سکتا۔ اس پر اللہ تعالیٰ کا یہ قول دلالت کرتا ہے فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوٰهَا یعنی ہر نفس کے دل میں اس کی طاعت ڈالی تاکہ اسے عمل میں لائے۔ اور اس کی معصیت ڈالی تاکہ اس سے بچے۔ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے کہا گیا کہ فلاں آدمی شر کو پہچانتا نہیں تو آپ نے فرمایا کہ وہ اس شر میں پڑنے کے زیادہ لائق ہے۔ اور جادو کو جاننے میں کوئی گناہ نہیں۔ جیسا کہ شراب کا حال اور گانے بجانے کے آلات کو سمجھنے کے علم میں کوئی گناہ نہیں۔ گناہ تو اسے عمل میں لانے اور استعمال کرنے میں ہے۔ کیا تو دیکھتا نہیں جب فرعون کے جادوگروں نے کفر اور جادو پر عمل چھوڑ دیا تو اس نے ان کے دین میں کوئی نقص واجب نہیں کیا۔

جواب طلب سوال

یہاں ایک جواب طلب سوال باقی رہ گیا اور وہ یہ ہے کہ جب فرشتوں سے جادو کی تعلیم دینا اور ان سے لوگوں کا سیکھنا ثابت ہوا تو شیاطین کی تعلیم اور ان کی تعلیم میں کوئی فرق نہ رہا۔ شیاطین کی تعلیم کی مذمت کیوں فرمائی گئی اور اسے موجب کفر قرار دیا گیا ہے کہ وَلٰكِنَّ الشَّيٰطِيْنَ كَفَرُوْا يُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ جبکہ اس تعلیم کو موجب کفر قرار نہ دیا گیا اور موردِ عتاب نہ ٹھہرایا گیا۔

اس کا جواب دورانِ تفسیر واضح ہو چکا کہ شیاطین کی طرف سے جادو کی تعلیم باطل تاثیرات کے اعتقاد اور اس پر عمل کی ترغیب کے ساتھ ملی ہوتی تھی۔ اور فرشتوں کی تعلیم پرہیز اور احتیاط کے لیے نہی اور نصیحت کے ساتھ ملی ہوئی تھی۔ بس فرق واضح ہو گیا۔ اور مدحت اور مذمت کا مقام روشن ہو گیا۔ اور اس کے باوجود کہ یہودیوں کا جادو یا شیاطین سے لیا گیا ہے۔ جو کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے عہد میں رائج ہوا۔ یا فرشتوں سے لیا گیا ہے۔ جس کی تعلیم بابل میں دی جاتی تھی۔ اور یہ دونوں قسمیں بلا تامل مذموم اور متروک

ہیں۔ کیونکہ بنی آدم کی دشمنی اور انہیں گمراہ کرنے میں شیاطین کا حال ہر خاص و عام کو معلوم ہے کہ جو کچھ ان سے لیا گیا' ہو گیا اس پر کس طرح اعتماد کیا جا سکتا ہے۔ اور فرشتے خود وعظ و نصیحت کے ساتھ اپنے علم سے منع کرتے اور باز رکھتے ہیں۔ یہ یہودی اپنے جادو سے جس کی دونوں قسموں کی قباحت انہیں بھی معلوم ہے' ہرگز دست بردار نہیں ہوتے۔

فَيَتَعَلَّمُوْنَ مِنْهُمَا اور یہ جملہ اِتَّبَعُوْا پر عطف ہے۔ یعنی پس یہ یہودی جادو کی دونوں جنسیں سیکھتے ہیں۔ جو شیاطین سے لیا گیا ہے۔ اور جو فرشتوں سے لیا گیا ہے۔ حالانکہ انہیں ان دونوں قسموں کی قباحت معلوم ہے۔ اور صرف سیکھنے پر ہی اکتفاء نہیں کرتے۔ بلکہ لوگوں کو نقصان پہنچاتے ہیں۔ کیونکہ سیکھتے ہیں مَا يُفَرِّقُوْنَ بِهٖ بَيْنَ الْمَرْءِ وَزَوْجِهٖ وہ اعمال جن کی وجہ سے مرد اور اس کی عورت کے درمیان جدائی ڈالتے ہیں۔ اور یہ جدائی دو طریقوں سے واقع ہوتی ہے: پہلی حکم شرع کے ساتھ کیونکہ جب عورت اور اس کے شوہر میں سے ایک سحر باطل کی تاثیر کا معتقد ہوا تو کافر ہو گیا۔ اور عورت شوہر سے اور شوہر عورت سے جدا ہوا۔ اور نکاح ٹوٹ گیا اور دوسری جدائی عرف کے طریقے سے کیونکہ ان اعمال کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی عادت جاری ہونے کے حکم کے مطابق میاں بیوی کے درمیان باہمی بغض اور نفرت پیدا ہوتی ہے۔ اور جدائی تک کھینچ لے جاتی ہے۔ حالانکہ یہ جدائی کبائر میں سے ایک کبیرہ گناہ' نسب صحیح کو کاٹنے کا سبب ہے۔ اور شرع کے موضوع کے مخالف ہے۔ جس نے یہ عقد پیدا کرنے اور اسے باقی رکھنے کا حکم دیا ہے تو اللہ تعالیٰ جس چیز کا وصل چاہتا ہے' یہ قطع کرتے ہیں۔ اور جس چیز کو اللہ تعالیٰ بناتا ہے' یہ اسے بگاڑتے ہیں۔ پس اس برے فعل میں اللہ تعالیٰ کے پسندیدہ امر کی مخالفت بھی لازم آتی ہے۔ بدکاری واقع ہونے اور نسب کے منقطع ہونے سے جہان میں فساد بھی اور میاں بیوی کو نقصان پہنچانا بھی اور جب وہ جادو کے اعمال سے یہ برا عمل اپناتے ہیں تو جانا جا سکتا ہے کہ دوسرے اعمال بھی اپناتے ہوں گے۔

اور سنن ابن ماجہ میں حدیث صحیح میں وارد ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے تھے کہ بہترین سفارش اور صلح کرانا یہ ہے کہ مقدمۂ نکاح میں دو افراد کے درمیان صلح کرائے اور صحیح مسلم میں روایت کی کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ شیطان ہر روز صبح

کے وقت پانی پر اپنا تخت بچھاتا ہے۔ اور اپنے پیروکاروں کو روئے زمین میں لوگوں کو خراب کرنے کے لیے بھیجتا ہے۔ اور شام کے وقت ان کے اعمال کا جائزہ لیتا ہے جو لوگوں کے درمیان بڑا فتنہ پیدا کر کے آتا ہے۔ اور اپنے قریب جگہ دیتا ہے۔ پس اس کے پیروکاروں میں سے ایک آتا ہے۔ اور کہتا ہے کہ میں نے فلاں شخص کا اس قدر پیچھا کیا۔ یہاں تک کہ اس نے بدکاری کی یا چوری کی یا شراب پی۔ شیطان کہتا ہے کہ تو نے کچھ نہیں کیا پھر ایک اور آتا ہے۔ اور کہتا ہے کہ میں نے فلاں آدمی کو اس قدر گمراہ کیا کہ اس کے اور اس کی بیوی کے درمیان جدائی ڈال دی۔ شیطان بہت خوش ہوتا ہے اُسے اپنے نزدیک بلاتا ہے۔ اور اپنے سینے سے لگاتا ہے۔ اور کہتا ہے کہ تو اچھا بیٹا ہے۔

اور ابوالفرج اصفہانی کتاب آغانی میں عمرو بن دینار کی روایت سے لائے کہ حضرت امام حسن مجتبیٰ رضی اللہ عنہ نے قیس کے باپ ذریح سے فرمایا کہ کیا تیرے نزدیک حلال ہو گیا کہ تو نے قیس اور اس کی بیوی کے درمیان جدائی ڈال دی۔ کیا تو نے نہیں سنا کہ امیر المومنین حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے کہ میرے نزدیک برابر ہے کہ مرد اور اس کی عورت کے درمیان جدائی کر دوں یا دونوں کو تلوار کے ساتھ قتل کر دوں کیونکہ گناہ ہونے میں دونوں ایک دوسرے کے برابر ہیں۔

لیکن مسلمانوں کو نہیں چاہیے کہ یہودیوں وغیرہم کے جادو سے جو کہ اس قدر قوی تاثیر رکھتا ہے کہ میاں بیوی کے دیرینہ ساتھ کو ایک لمحے میں جدائی میں بدل دیتے ہیں۔ اور شرعاً اور عرفاً محبت کے وافر اسباب ہونے کے باوجود دلوں میں بغض اور نفرت پیدا کر کے تصرف کرتے ہیں۔ ڈریں اور کہیں کہ جادو کے دوسرے اقسام سے جیسے دشمنوں کی فتح و نصرت یا اعلان کے بدلنے یا خلاف عادت کام کرنے سے ہم ایمان کے زور سے بچ سکتے ہیں۔ اور ہو سکتا ہے کہ ہم باطل تاثیرات کے معتقد نہ ہوں۔ مگر اس قسم کے جادو سے جو کہ دل میں اثر کرتا ہے۔ اور دل کو محبت سے نفرت کی طرف پھیر دیتا ہے' ہم کیسے محفوظ رہ سکتے ہیں؟ کہیں ایسا نہ ہو کہ ہمارے دلوں کو رسول کریم علیہ السلام' خدا تعالیٰ عز شانہ اور ہماری کتاب اور دین کی محبت سے پھیر دیں اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبت کو جو کہ سالوں سے

ہمیں حاصل ہے' فراق اور جدائی میں بدل دیں۔ پس ہر اندرونی مرض کے علاج کا سرمایہ ہمارے ہاتھ سے جاتا رہے۔ اور ہم کسی حیلہ سے بھی انہیں دور نہ کرسکیں کیونکہ اگرچہ یہ اور ان جیسے دوسرے جادو کی یہ تاثیریں رکھتے ہیں۔ لیکن حقیقت میں کچھ نہیں کرسکتے اس لیے کہ جادو اور جہان کے تمام اسباب میں حکمِ الٰہی کے بغیر کوئی تاثیر نہیں ہے۔

وَمَاهُمْ بِضَآرِّيْنَ بِهٖ مِنْ اَحَدٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ اور وہ یہودی اپنے جادو کے ساتھ کسی کو نقصان نہیں پہنچا سکتے مگر اللہ تعالیٰ کے ارادہ اور مشیت کے ساتھ جب چاہتا ہے' ان کے جادو کے اعمال کو اثر بخشتا ہے۔ اور جب چاہتا ہے' تاثیر بیکار کردیتا ہے۔ اور اسی لیے اگر کوئی جادوگر چاہے کہ اللہ تعالیٰ کے دائمی جاری افعال کو باطل کردے مثلاً بارش کو برسنے نہ دے اور دانہ اُگنے نہ دے اور بغیر فوج اور سپاہیوں کی مدد کے کسی ملک پر قابض ہو جائے یا کسی لشکر کو بھگا دے' ایسا نہیں کرسکتا۔ جادو کے نام کی انتہا یہ ہے کہ کمزور نفسوں میں حادثات کے محرکات پیدا کرکے ایک تاثیر کرتا ہے۔ اور وہ تاثیر بھی دائمی اور ہمیشہ نہیں رہتی۔ پس مردِ مومن کو جو کہ ایک ذاتِ حقیقی کی تاثیر کا معتقد ہے' خدا تعالیٰ کے سوا کسی غیر سے ڈرنا نہیں چاہیے۔ کیونکہ عالمِ اسباب اور مسببات کی رسی کا سرا اسی کے دستِ قدرت میں ہے۔ بلکہ حقیقت میں اس کی تاثیر کے علاوہ کوئی تاثیر نہیں ہے اسی کے افعال ہیں کہ ایک دوسرے کے پیچھے چل رہے ہیں۔ وہم و خیال کی دنیا سمجھتی ہے کہ فلاں فعل' فلاں فعل کا سبب ہوا۔

اور یہ یہودی جادو کی ان دونوں قسموں کو جو کہ مذموم اور معیوب ہیں' سیکھنے میں مبالغہ کرنے پر ہی اکتفاء نہیں کرتے۔ بلکہ اپنے اوقات کو اس جنس کی دوسری چیزوں کو حاصل کرنے میں بھی خرچ کرتے ہیں جو کہ علمِ شریعت اور وحی الٰہی سے روگردانی کا سبب ہیں۔

وَيَتَعَلَّمُوْنَ مَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ اور ایسے علم سیکھتے ہیں جو کہ انہیں نقصان دیتے ہیں اگرچہ دوسروں کو نہ دیں اور انہیں نفع نہیں دیتے اگرچہ دوسروں کو دیں اور عقلمند کو چاہیے کہ جو چیز خود کو نقصان دے اور نفع نہ دے اس سے پرہیز کرے۔

علم کیسا بھی ہو مذموم نہیں ہے

یہاں جاننا چاہیے کہ علم فی نفسہٖ بُرا نہیں ہے جیسا بھی ہو۔ پس بندوں کے حق میں علم

مذموم نہیں ہو سکتا مگر تین وجہوں میں سے ایک کے ساتھ: پہلی وجہ یہ ہے کہ اس سے خود کو یا دوسرے کو کسی نقصان کی توقع ہو جیسے جادو اور طلسمات کا علم اور علمِ نجوم بھی اسی قبیلے سے ہے۔ کیونکہ اکثر مخلوق کے لیے مضر ہے اس طرح کہ جب ستاروں اور افلاک کے اطوار کے بعد جہان کے آثار کو جس نہج پر دیکھتے ہیں' ان کے دلوں میں جاگزیں ہو جاتا ہے کہ یہ فلاں ستارہ' فلاں برج اور فلاں درجہ کی تاثیر کی وجہ سے ہے۔ پس مقاصد کے حاصل ہونے کی امید اور ان کے فوت ہونے کا خوف ستاروں اور برجوں کی جہت سے دل میں جگہ پکڑتا ہے۔ اور نفع و نقصان کے مالک کی طرف توجہ نہیں رہتی اور دل پر ایک بہت بڑا پردہ حائل ہو جاتا ہے۔ جو کہ حق سبحانہ وتعالیٰ کی طرف دیکھنے سے مانع ہوتا ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ وہ علم اگرچہ فی نفسہ کوئی نقصان نہیں رکھتا لیکن یہ شخص اپنی استعداد کی کوتاہی کی وجہ سے اس علم کی باریکیوں کو دریافت نہیں کر سکتا اور جب اس کی باریکیوں تک نہ پہنچا تو جہل مرکب میں گرفتار ہوا اسی قبیلے سے اسرار الٰہیہ' شرعی حکمتوں' بہت سے علومِ فلسفیہ' مسئلہ قضا و قدر' جبر و اختیار' توحیدی شہودی' صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اختلافات' ان بزرگوں کے درمیان واقع جنگوں' اولیاء اللہ کی شطحیات کا علم جیسے کلمہ انا الحق و سبحانی ان کے سمجھ میں نہ آنے والے کلمات جیسے فصوص الحکم کے بعض مقامات اور قرآن مجید کی تصوف کے قواعد کے مطابق تاویلات میں بحث کرنا ہے۔ اور یہی حال ہے شعروں اور رخساروں اور خال کی تعریف کے علم کا جو کہ احمق عوام کے بارے میں جن کے دل شہوت سے پُر ہوتے ہیں' زہر کا حکم رکھتا ہے۔ اور تخیل اور ہر شے میں مبالغہ کرنے کی استعداد پیدا کرنے والا ہو جاتا ہے۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ قابلِ تعریف شرعی علوم میں بے جا سوچ بچار کرے۔ اور کمی بیشی کا مرتکب ہو۔ مثلاً علم عقائد اور توحید میں فلسفی بحثوں کو دخل دے۔ اور علم فقہ میں حیلوں اور بے اصل نادر روایات کو شروع کر دے اور علم سلوک میں جوگیوں کے معمولات کو داخل کر دے اور دعوت اسماء کے علم میں جادو اور طلسم کو ملا دے اور انبیاء علیہم السلام کے واقعات کے علم میں یہودیوں اور رافضیوں کی جھوٹی تواریخ کو سنے تاکہ عقیدوں میں خرابی کا سبب ہو۔ علیٰ

ہذاالقیاس اور یہ تمام علوم اکثر مخلوق کو نقصان پہنچاتے ہیں۔ اور جو نفع ان علوم سے متوقع ہے انہیں نہیں پہنچتا اور یہودی اسی قسم کے علوم کے دلدادہ ہو چکے تھے۔ اور قابل تعریف علوم سے روگردانی کرتے تھے۔ اور ان کا یہ مشغول ہونا اس وجہ سے نہ تھا کہ ان علوم کے نقصان کو وہ جانتے نہیں تھے۔ اور جہالت اور نادانی کی وجہ سے ان علوم کے متعلق نافع ہونے کا اعتقاد رکھتے تھے۔ بلکہ

وَلَقَدْ عَلِمُوْا لَمَنِ اشْتَرٰاهُ مَالَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ اور تحقیق یہ یہودی جانتے ہیں کہ جو اس قسم کے علوم خریدتا ہے۔ اور اپنے مال اور جان کو ان کے حاصل کرنے کے پیچھے صرف کرتا ہے اسے آخرت میں کوئی حصہ نہیں ہے۔ کیونکہ اس کا مال ضائع گیا اور اس کے اوقات جو کہ ثواب کمانے کا سرمایا تھے' بھی ضائع ہو گئے۔ اور جو چیز کہ آخرت میں کام آئے اس کے ہاتھ نہ آئی۔ اور ان کے بارے میں اسی قدر بے نصیبی پر قناعت نہیں بلکہ

وَلَبِئْسَ مَاشَرَوْا بِهٖ اَنْفُسَهُمْ اور بہت بری چیز ہے۔ جس میں انہوں نے اپنی جانوں کو فروخت کیا۔ اس لیے کہ ان علوم میں مشغول ہونے کی وجہ سے انہیں ابدی بدبختی حاصل ہوئی اور ابدی سعادت ہاتھ سے جاتی رہی۔ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ کاش کہ وہ جانتے کہ ہم ان علوم کو حاصل کر کے سعادتِ ابدی کو شقاوت ابدی کے ساتھ بدل رہے ہیں۔ لیکن انہیں اس کا پتہ نہیں بلکہ وہ گمان نہیں کرتے کہ اگر ہم ان علوم کو حاصل کرنے میں اپنا مال اور اوقات صرف کریں تو اس کا انجام یہی ہے کہ آخرت میں ہم اس پر ثواب نہ پائیں جیسا کہ دوسری مباح چیزوں میں۔ یا گمان کرتے ہیں کہ اگر ان نقصان دہ علوم کا حاصل کرنا آخرت میں کسی عذاب کا موجب ہوگا تو وہ عذاب جلد منقطع ہو جائے گا۔ اور اس بارے میں خود ساختہ باتوں سے دلیل پکڑتے ہیں کہ لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّا اَيَّامًا مَّعْدُوْدَةً تو ہم اس معاملہ میں کہ ہم نے اپنی جانوں کو تھوڑے سے عذاب میں گرفتار کر دیا اس شخص کی مانند ہو گئے جس نے بالفعل لذت حاصل کرنے کے لیے شب بیداری کی اور ناچ یا چہرے دیکھنے کے لیے نیند چھوڑ دی اور کچھ مال بھی خرچ کیا۔ اگرچہ اسے بدن میں روزانہ کچھ سستی اور تھکاوٹ یا مال میں کچھ نقصان لاحق ہو تو اتنی بڑی بات نہیں' ہم اس نوبت تک نہیں پہنچے کہ ہم

نے اپنی جانوں کو بیچ دیا ہو اور اسی تقریر سے معلوم ہوا کہ لَقَدْ عَلِمُوْا اور لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ کے مدلول میں کوئی تناقض اور اختلاف نہیں۔ کیونکہ اس کلمے کا مدلول آخرت میں ان علوم کے حاصل کرنے کے ضائع ہونے کا علم ہے۔ اور لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ کا مدلول ان علوم کو حاصل کرنے میں عذاب ابدی کے علم کی نفی ہے۔ اور علم ثابت اور منفی میں بہت فرق ہے۔

اور اس کے باوجود کہ یہ یہودی اللہ تعالیٰ کی کتابوں اور قابل تعریف علوم کے اس قسم کی غفلتوں اور روگردانیوں میں گرفتار ہیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ کی مہربانی اور اس کی عام رحمت نے ان پر توبہ اور اصلاح کا دروازہ بند نہیں فرمایا۔

وَلَوْ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا اور بالفرض یہ یہودی اگر اب بھی ایمان لے آئیں اپنی کتابوں اور اس کتاب پر جو کہ اس وقت نازل ہوئی ہے۔

وَاتَّقَوْا اور پرہیز کریں جادو کی کتابوں اور دوسرے نقصان دہ علوم میں مشغول ہونے سے۔

لَمَثُوْبَةٌ البتہ وہ ثواب اگرچہ تھوڑا ہو مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ خَيْرٌ اللہ تعالیٰ کے ہاں سے ان کے لیے بہتر اور زیادہ نفع بخش ہوگا دنیا و مافیہا سے چہ جائیکہ وہ چیز جو انہیں جادو سے اُجرت یا رشوت کے طریقے سے حاصل ہوتی ہے یا نام اور مرتبہ جو ان علوم کی وجہ سے پیدا کرتے ہیں۔

لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ کاش کہ وہ جانتے کہ اخروی ثواب دنیوی منافع سے کہیں بہتر ہے۔

چند جواب طلب سوالات

یہاں چند جواب طلب سوال باقی رہ گئے جو کہ مفسرین یہاں وارد کرتے ہیں۔ پہلا سوال یہ ہے کہ وَلَبِئْسَ مَا شَرَوْا بِهٖٓ اَنْفُسَهُمْ جملہ انشائیہ ہے۔ جو کہ فعل ذم سے صادر ہوا۔ اور لَمَنِ اشْتَرٰىهُ مَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ جملہ خبریہ ہے۔ انشاء کا اخبار پر عطف لازم آتا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ہم نے تفسیر کا جو رُخ اختیار کیا ہے یہ جملہ وَلَقَدْ عَلِمُوْا پر معطوف ہے نہ کہ لَمَنِ اشْتَرٰىهُ پر اور علم کے تحت داخل نہیں ہے ورنہ

لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ جو کہ نفی علم پر دلالت کرتا ہے اس کے خلاف واقع ہوتا۔ اور اگر کہیں کہ لَقَدْ عَلِمُوْا بھی جملہ خبریہ ہے تو ہم کہتے ہیں کہ لام قسم کی تمہید ہے۔ اور جملہ قسمیہ جملہ انشائیہ ہے نہ کہ جملہ خبریہ۔ ہاں جمہور کی تفسیر کے مطابق جو کہ اس جملے کو لَمَنِ اشْتَرَاهُ پر معطوف قرار دیتے ہیں' یہ سوال وارد ہوتا ہے۔ اور اس کے جواب میں کہتے ہیں کہ انشاء کو خبر کی تاویل میں کر کے مقول فی حقھم لَبِئْسَ مَاشَرَوْا بِهٖ اَنْفُسَهُمْ کو مقدر مان کر ہم عطف کرتے ہیں۔

دوسرا سوال یہ ہے کہ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ تمنا کے لیے ہے۔ جیسا کہ تفسیر میں گزرا اور کسی شے کی تمنا اس وقت ہوتی ہے جب اس شے کو حاصل کرنے پر قدرت نہ ہو۔ پس حضرت حق جل مجدہ سے جو کہ قادر مطلق ہے' تمنا کا تصور کیسے ہو سکتا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ کلامِ الٰہی میں تمنا اس کلام کے بشر سے خطاب کے موقع پر ہوتی ہے۔ جس طرح شک اور اضراب کے الفاظ میں اس کلام میں اسی خطاب پر مبنی ہے۔ اور جب اس کلام کا نزول بشر کو خطاب کرنے کے لیے ہے تو گفتگو میں ان کی روش اور طریقہ جاری رکھا گیا۔ گویا یوں ارشاد ہوتا ہے کہ عقل اور بصیرت کے حصول سے مایوسی میں ان کا حال اس حد تک پہنچ چکا ہے کہ کہنے والا ان کے حق میں یہ لفظ کہتا ہے۔ اور کہا جا سکتا ہے کہ کلامِ الٰہی میں تمنا اپنی حقیقت پر نہیں ہے۔ بلکہ طلب سے مجاز ہے۔ اور اس کلام میں تمنا کے لفظ سے متمنّیٰ کا مطلوب ہونا ثابت ہوتا ہے۔ اور غیر واقع امر کو طلب کرنا خدا تعالیٰ سے بعید نہیں۔ جیسے ابولہب کا ایمان اور صاحب کشاف نے کلامِ الٰہی میں تمنا کا معنی مجازاً ارادہ قرار دیا ہے۔ لیکن یہ اہل سنت و جماعت کے مذہب میں صحیح نہیں۔ کیونکہ ان کے نزدیک ارادۂ الٰہی حصول مراد کو لازم کرتا ہے۔

تیسرا سوال یہ ہے کہ وَلَقَدْ عَلِمُوْا میں تاکید قسمی کے طریقے سے علم کا اثبات فرمایا گیا اور لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ میں علم کی اس حد تک نفی کی گئی کہ اس سے مایوسی ہوگئی۔ اور اس نے محالات کا حکم لے لیا' ایک آرزو سے زیادہ نہ رہا۔ بظاہر یہ نفی اور اثبات ایک دوسرے کے منافی ہیں؟

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ سوال اس وقت وارد ہوتا ہے جب لَبِئْسَ مَا شَرَوْا بِهٖٓ اَنْفُسَهُمْ کا عطف لَمَنِ اشْتَرٰىهُ پر ہوتا کہ علم کے تحت داخل ہو اور تفسیر کی بنیاد پر جو کہ پہلے گزر چکی یہ جملہ جملہ قسمیہ پر معطوف ہے، علم کے تحت داخل نہیں۔ اور جائز ہے کہ پہلے جملے کا مضمون یہودیوں کو یاد ہو اور اس جملے کا مضمون معلوم نہ ہو۔ کیونکہ دونوں جملوں کے مضمون میں نہ اتحاد علمی ہے نہ متلازم علمی۔ کیونکہ پہلے جملے کا مضمون یہ ہے کہ نقصان دینے والے غیر نافع علوم کو حاصل کرنے کی کوشش کرنا آخرت میں انہیں کوئی نفع نہ دے گا۔ جبکہ اس جملے کا مضمون یہ ہے کہ اس قسم کے علوم حاصل کرنے کے پیچھے اپنی جان کی بازی لگانے کا نتیجہ بُرا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ کسی چیز میں نفع حاصل ہونا حصول نقصان کو لازم نہیں ہے۔ جیسے مباح چیزیں کہ نہ اخروی نفع رکھتی ہیں۔ اور نہ اخروی نقصان۔

لیکن جمہور مفسرین جنہوں نے اس جملے لَمَنِ اشْتَرٰىهُ پر معطوف قرار دیا ہے۔ اور تحت العلم شمار کیا اس سوال کے جواب میں یوں کہتے ہیں کہ پہلے جملہ کی ابتدا میں علم کا اثبات تحقیق کے طور پر ہے۔ اور بیان واقع ہے۔ اور کلام کے دوران علم کی نفی حقیقتاً نہیں تا کہ تناقض ہو۔ بلکہ عالم کو جاہل کے مرتبہ اُتارنے کے طور پر ہے۔ کیونکہ جو عالم اپنے علم کے تقاضا کے مطابق نہیں چلتا، جاہل کے برابر ہے۔

چوتھا سوال یہ ہے کہ لَمَثُوْبَةٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ خَيْرٌ جملہ شرطیہ لَوْ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا کی جزا واقع ہوا۔ اور جزا کے لیے چاہیے کہ شرط پر ایک طرح مرتب ہوتی ہو اور فرع بنتی ہو حالانکہ خدا تعالیٰ کے ثواب کا بہتر ہونا ان کے ایمان اور تقویٰ پر بالکل موقوف نہیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ثواب دنیا اور مافیہا سے بہتر ہے خواہ یہودی ایمان اور تقویٰ لائیں یا نہ لائیں۔ پس اس شرط اور جزا میں ربط کس طرح حاصل ہوگا؟

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ جزا کا شرط پر مرتب ہونا کبھی تو ثبوت واقعی کے پیش نظر ہوتا ہے۔ جیسے ان جاء ك زيد فاكرمه اور کبھی علمی طور پر ثابت ہونے اور اس پر حکم کے طور پر ہوتا ہے۔ جیسے وَمَا بِكُمْ مِّنْ نِّعْمَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ، وَاِنْ يُّكَذِّبُوْكَ فَقَدْ كُذِّبَتْ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِكَ اور یہاں اس آخری قبیلے سے ہے۔ یعنی ثواب کی خیریت کا حکم اور اس کا

ان کے پاس ذکر کرنا ان کے ایمان اور تقویٰ پر موقوف ہے۔ اور بعض مفسرین نے کہا ہے کہ قرینہ مقام کی وجہ سے لھم کا لفظ لَمَثُوبَةٌ لَهُمْ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ میں محذوف ہے۔ اور اس ثواب کی خیریت جو انہیں حاصل ہوگا' ان کے ایمان اور تقویٰ پر موقوف ہے۔ واللہ اعلم

اور جس طرح یہ یہود کتب الٰہیہ سے روگردانی کر کے جادو اور اس کی دوسری قسموں کو حاصل کرنے میں پڑ گئے ہیں۔ اور انہوں نے اس بُرے کام میں اپنی جانوں کی بازی لگا دی اسی طرح ان کی عادت بن چکی ہے کہ بزرگوں سے گفتگو اور خطاب کرنے میں دھوکہ کرتے ہیں۔ اور دوطرفہ بات کرتے ہیں کہ ایک وجہ سے تعظیم اور ایک وجہ سے توہین کا پہلو نکلتا ہے۔ اور گفتگو میں اس قسم کی دھوکہ بازی خاص کر جب واجب التعظیم بزرگوں سے خطاب ہو' بھی جادو کے ساتھ پوری مشابہت رکھتی ہے۔ کیونکہ قبیح فعل کو جو کہ بزرگوں کی توہین ہے' حقیقی تعظیم کے پردے میں چھپاتے اور پوشیدہ کر دیتے ہیں تاکہ کوئی اس کے توہین ہونے کے درپے نہ ہو جس طرح جادوگر اپنے فعل کو نیکوں کے خلاف عادت کاموں اور کرامات میں چھپا دیتا ہے۔ پس وہ حقیقی جادو کے بھی مرتکب ہوتے ہیں۔ اور لسانی جادو کے بھی۔ اور ان کی اس دھوکہ بازی کی ایک مثال یہ ہے کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دیکھتے اور آپ سے ہم کلام ہوتے تو کہتے راعنا جس کا ظاہری معنی طلب رعایت اور اپنے حال پر توجہ ہے۔ یعنی ہمارے حال پر توجہ فرمائیں۔ اور ہمیں تعلیم و ہدایت فرمائیں اور یہ تعظیم پر دلالت کرتا ہے۔ اور اس کا ایک معنی قبیح بھی ہے۔ اس لیے کہ راعن لغت میں احمق کو کہتے ہیں' رعونت سے مشتق ہے۔ جس کا معنی تکبر کے ساتھ ملی ہوئی حماقت ہے۔ اور اس کے آخر میں الف نصبی تنوین سے بدلا ہوا ہے۔ جو کہ وقف کی حالت میں ہوتا ہے۔ اور اس لفظ کو منادیٰ نکرہ کے حکم میں منصوب لاتے تھے۔ یعنی اے احمق متکبر۔ اور یہودیوں کے عرف میں زیادہ تر اسی بُرے معنی میں رائج ہو گیا تھا جیسے معطی ہمارے زمانے کے اوباش لوگوں کے عرف میں مابون یعنی اغلام بازی کرانے والے کے معنی ہیں۔ ثالث بالخیریۃ بمعنے ولد الزنا اور مرد مقدس بمعنی احمق

اور مسلمان اس بُرے معنی سے بے خبر تھے۔ جب انہوں نے یہودیوں سے سنا کہ اس

کلمے کو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے گفتگو کرنے کے مقام میں استعمال کرتے ہیں' سمجھے کہ شاید یہ گروہ جو کہ اہل کتاب ہیں' انبیاء علیہم السلام کی تعظیم میں اس کلمہ کو ماثور اور منقول سمجھ کر استعمال کرتے ہیں۔ ہمیں بھی چاہیے کہ اسے استعمال کریں۔ بے خبری اور بے سمجھی کی وجہ سے اس کلمے کے استعمال کے چکر میں پڑ گئے۔ پس اس کلمے کے استعمال میں جادو کے ساتھ ایک اور مشابہت بھی ہو گئی کہ مسلمانوں کو مخفی طریقے سے اس بات پر لے آئے کہ انہوں نے کلمہ کفر زبان سے ادا کیا اور یہ نہ جانا کہ یہ کلمہ' کلمہ کفر ہے۔ بلکہ پیغمبر علیہ السلام کی تعظیم کا کلمہ ہے۔

حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ نے جو کہ انصار کے بزرگوں میں سے تھے' ایک دن یہودیوں سے یہ کلمہ سنا۔ اور آپ پہلے سے یہودیوں کے نشست و برخاست رکھتے تھے۔ اور جانتے تھے کہ یہ لفظ ان کے عرف میں گالی گلوچ ہے۔ آپ سختی سے پیش آئے اور فرمایا کہ اگر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں یہ کلمہ تمہاری زبان سے میں نے پھر سنا تو تمہاری گردنیں اڑا دوں گا۔ یہودیوں نے کہا کہ آپ ہم پر کیوں غضب ناک ہوتے ہیں تمہارا گروہ جو کہ مسلمان ہیں' یہی کلمہ حضور علیہ السلام کے حق میں کہتے ہیں۔ حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ ناخوش ہو کر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی خدمتِ عالیہ میں حاضر آئے۔ دیکھا کہ یہ آیت نازل ہو چکی ہے۔

یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اے وہ لوگو! جو ایمان لائے ہو۔ تمہارے ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ اس دھوکے بازی کے لفظ کو بالکل ترک کر دو۔ اگرچہ تمہارا قصد اس دھوکے کا نہیں ہوتا۔ پس لَاتَقُوْلُوْا رَاعِنَا رسول کریم علیہ السلام کے دربار میں رَاعِنَا کا لفظ مت کہو اس لیے کہ یہ لفظ ایک بہت بڑا دھوکہ رکھتا ہے۔ اور یہودی تمہارے کہنے کو دلیل بنا کر کہتے ہیں۔ اور باطل معنی کا ارادہ کرتے ہیں۔ اگرچہ تم اس باطل معنی سے بے خبر اور غافل ہو۔

وَقُوْلُوا انْظُرْنَا اور اس لفظ کے بدلے اُنْظُرْنَا کہو یعنی ہم پر مہربانی فرمائیں اور ہمارے حال پر توجہ فرمائیں۔ جو کہ رَاعِنَا کا صحیح معنی ادا کرتا ہے۔ اور اس میں کوئی دھوکہ نہیں۔ اور کسی کے عرف میں اسی سے باطل معنی سمجھا نہیں جاتا ہے۔ وَاسْمَعُوْا اور رسول

کریم علیہ السلام کے کلام کو پوری توجہ سے گوش برآواز ہو کر ذہن کو حاضر کر کے سنو۔ تاکہ اس کی حاجت ہی نہ رہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اپنے حال پر توجہ کی درخواست کرو اور ان دونوں کلموں میں سے ایک کہو۔ اس لیے کہ توجہ سے اور گوش برآواز ہو کر سننا شاگرد کا کام ہے نہ کہ استاد کا۔ شاگرد کو چاہیے کہ استاد کو بار بار گفتگو لوٹا کر تنگ نہ کرے۔ اور شروع سے ہی اپنے آپ کو متوجہ کر لے تاکہ استادِ محترم کی تقریر سے فائدہ حاصل کرے۔ اور تم سے ایمان کے ہوتے ہوئے اس قسم کی دھوکہ بازی اور رسولِ کریم علیہ السلام کو ستانا کیسے مقصود ہو سکتا ہے۔ حالانکہ رسولِ کریم علیہ السلام کی توہین اور انہیں ستانا کفر ہے۔

وَلِلْكَافِرِيْنَ اور کافروں کے لیے تیار ہے اس کے عوض کہ اس قسم کے کلمات سے رسولِ کریم علیہ السلام کو ستانے کا قصد کرتے ہیں۔ اور آپ اور مسلمانوں کے دِلوں کو دُکھاتے ہیں۔ عَذَابٌ اَلِیْمٌ ایک دردناک عذاب کہ اس ایذاء اور درد کو اس سے کوئی نسبت ہی نہیں۔

یہاں جاننا چاہیے کہ اس کلام پاک میں جو کہ قرآن مجید اور فرقانِ حمید ہے، اٹھاسی (۸۸) مقامات پر اس اُمت کے ایمان والوں کو اس لفظ سے خطاب فرمایا کہ یَاۤاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اور ان مقامات میں سے یہ پہلا مقام ہے۔ (اقول وباللہ التوفیق۔ امام اہل سنت مجدد ہذہ الامۃ مولانا الامام احمد رضا بریلوی اپنی تصنیف منیف تجلی الیقین میں فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے تمام امتوں کے مابین حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی امت کو یاایھا الذین امنوا کے خطاب کے ساتھ امتیاز بخشا ہے جبکہ باقی اُمتوں کو یاایھا المساکین کے ساتھ خطاب فرمایا جب کہ توراۃ میں ہے۔ اسے ابن ابی حاتم نے روایت فرمایا۔ اسے امام سیوطی نے الخصائص الکبریٰ میں نقل فرمایا ہے۔ محمد محفوظ الحق غفرلہ)

اور کہتے ہیں کہ ایمان والوں سے خطاب اسی کتابِ حمید کا خاصہ ہے۔ پہلی کتابوں میں خطاب انبیاء علیہم السلام کی طرف پھیرا جاتا تھا کہ اپنی اُمتوں کو پہنچا دیں۔ اور یہاں بلاواسطہ مشافہۃً خطاب اس اُمت سے فرمایا جا رہا ہے۔ اور یہ ایک بہت بڑا اعزاز ہے کہ انہیں افضل المرسلین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے تابع ہونے کی وجہ سے پیغمبروں کا حکم دیا گیا۔

والحمد للہ علی ذلک یہاں سے اس بات کا سراغ لگایا جاتا ہے کہ جب اس جہان میں انہیں ایمان کے لقب کے ساتھ نوازا گیا ہے تو اس جہان میں بھی امن اور امان والوں سے قرار دیئے جائیں گے۔ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ بِاَنَّ لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ فَضْلًا كَبِيْرًا۔

زوائد مسند امام احمد میں اور شعب الایمان بیہقی میں اور حدیث کی دوسری معتبر کتابوں میں وارد ہے کہ ایک شخص حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے پاس آیا اور عرض کی مجھے کوئی نصیحت اور وصیت فرمائیں۔ آپ نے فرمایا کہ جب تو قرآن پاک پڑھے اور اس میں یہ لفظ سنے کہ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا تو فی الفور اپنے کانوں کو متوجہ کر اور اپنے ذہن کو حاضر کر کیونکہ اللہ تعالیٰ تجھ سے بلاواسطہ خطاب فرماتا ہے۔ اور کسی اچھی چیز کا حکم دیتا ہے یا کسی بُری چیز سے منع فرماتا ہے۔

اور حلیۃ اولیاء میں ابونعیم' حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت سے لائے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ کوئی آیت جو کہ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا سے صادر ہوتی ہے' نازل نہیں ہوئی مگر حضرت علی ابن ابی طالب کرم اللہ وجہہ اس آیت کے سر اور اس آیت کے سردار ہیں۔ لیکن ابونعیم نے اس حدیث کی روایت کے بعد کہا ہے کہ اس لفظ کو کسی نے ان کی طرف منسوب نہیں کیا مگر ابن ابی خیثمہ نے اور ہم نے بھی ان سے یہ حرف لکھے ہیں۔ دوسرے راوی اسے ابن عباس رضی اللہ عنہما کا کلام کر کے روایت کرتے ہیں۔ واللہ اعلم

نیز حلیۃ الاولیاء میں اور حدیث و تفسیر کی کتابوں میں خیثمہ سے روایت لائے ہیں کہ جہاں قرآن پاک میں یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وارد ہوا ہے اس جیسے مقام میں تورات و انجیل میں یٰۤاَیُّهَا الْمَسَاکِیْنَ ہوتا تھا۔

شافعیہ کے استدلال اور اس کا جواب

نیز جاننا چاہیے کہ رَاعِنَا اور اُنْظُرْنَا اگرچہ ایک دوسرے کے ہم معنی ہیں۔ اور ایک ہی معنی رکھتے ہیں۔ لیکن چونکہ لفظ رَاعِنَا خرابی پر مشتمل تھا جو کہ مذکور ہوئی اس سے منع کرنا اور دوسرے لفظ کو تجویز کرنا حکمت کے مطابق ہوا۔ پس وہ جو شافعیہ نے اس مقام پر استدلال

کے طریقے سے ذکر کیا ہے کہ شارع علیہ السلام کی طرف سے ایک مقام میں ایک کلمہ کو تجویز کرنا اس کے ہم معنی دوسرے کلمے کے جائز ہونے کو لازم نہیں کرتا۔ پس اگر کوئی شخص اللہ اکبر کی جگہ خدائے بزرگ کہے یا الرحمٰن اجل اس کی نماز درست نہ ہوگی۔ یہ بات حنفیہ کے خلاف درست نہیں بیٹھتی کیونکہ بحث اس جگہ ہے جہاں دونوں ہم معنی لفظوں میں سے کسی ایک میں خرابی نہ ہو۔ علاوہ ازیں بعض احناف نے ان کے ہم معنی ہونے کو بھی چند وجوہ کی بناء پر منع کیا ہے۔

پہلی وجہ یہ ہے کہ اگرچہ لغوی مدلول کے مطابق رَاعِنَا اور اُنْظُرْنَا کا معنی ایک ہے۔ لیکن مدلول عرفی میں رَاعِنَا گالی گلوچ ہے۔ اور اُنْظُرْنَا کے مدلول سے بہت دُوری رکھتا ہے' دوسری وجہ یہ کہ رَاعِنَا بابِ مفاعلہ سے ہے۔ جو کہ دو مخاطبوں میں برابری پر دلالت کرتا ہے۔ گویا یوں کہتے ہیں کہ آپ ہماری رعایت کریں۔ تاکہ ہم آپ کی بات کی رعایت کریں۔ اور بارگاہِ سید عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں اس قسم کا خطاب کمال بے ادبی ہے اس دلیل سے کہ لَاتَجْعَلُوْا دُعَآءَ الرَّسُوْلِ بَیْنَکُمْ کَدُعَآءِ بَعْضِکُمْ بَعْضًا تیسری وجہ یہ ہے کہ اس خطاب میں ایک قسم کی بلندی سمجھی جاتی ہے۔ یعنی میرا کلام سننے کی رعایت کیجئے اور اس سے غافل نہ ہوں اور کسی دوسری چیز میں مشغول نہ ہوں جبکہ انظرنا میں شفقت اور مہربانی کی طلب ہے۔ اور بس اور لفظ اسمعوا میں یہ اشارہ ہے کہ شاگرد کو چاہیے کہ پوری توجہ اور دھیان سے استادِ محترم کی بات سنے تاکہ دوبارہ کہلوانے کی ضرورت پیش نہ آئے۔

اور جب مسلمانوں کو یہ کلمہ کہنے سے منع فرمایا گیا اگرچہ یہودی جو کہ اپنے آپ کو اہلِ کتاب جانتے ہیں۔ اور انبیاء علیہم السلام کی تعظیم سے خوب واقف ہیں اس کلمے کو استعمال کرتے تھے اب بیان فرمایا جارہا ہے کہ یہودیوں کا تمہارے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے خطاب میں یہ کلمہ کہنا ایک غلط مقصد کے لیے ہے کہ تم بھی اسے سیکھ کر استعمال کرو۔ اور اس کلمہ کی قباحت اور بُرائی کا تجسس نہ کرو۔ اور لوگوں کے سامنے تمہاری ناواقفی ظاہر ہو اور ناواقف ہونا تم پر وحی اُتارنے کے منافی ہے۔ کیونکہ جس گروہ پر پہلے پہل وحی نازل ہو چاہیے کہ تیز فہم اور سمجھ دار ہو پس گویا وہ لوگوں کی نظر میں ثابت کرتے ہیں کہ یہ گروہ اس

قابل نہیں کہ ان پر وحی الٰہی کا نزول ہو کہ

مَا یَوَدُّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا مِنْ اَھْلِ الْکِتَابِ جو اہلِ کتاب میں سے کافر ہو گئے ہیں، پسند نہیں کرتے یعنی مدینہ شریف کے یہودی وَلَا الْمُشْرِکِیْنَ اور نہ ہی مشرکین مکہ اَنْ یُّنَزَّلَ عَلَیْکُمْ اس بات کو تم پر نازل ہو۔ مِنْ خَیْرٍ مِّنْ رَّبِّکُمْ تمہارے پروردگار کی طرف سے کوئی امر خیر۔ اور جب وہ اللہ تعالیٰ کو تم پر خیر نازل کرنے سے روکنے پر قدرت نہیں رکھتے تو ناچار قصد کرتے ہیں کہ لوگوں کی نظر میں تمہاری بے لیاقتی ثابت کریں۔ اور ایسا ثابت کرنے کا مصدر یہودی ہوئے ہیں۔ اور اس شبہ کو قبول کرنے والے مشرک۔ پس اسی طرح وہ تم سے یہ مذاق اور مبہم سی بات کرتے ہیں۔ حالانکہ ان کا یہ تمسخر اور ابہام کچھ نہیں کھول سکے گا۔ کیونکہ ان کا حسد اس وقت کامیاب اور کارگر ہوگا جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی کا نزول روک دیں اور یہ کام ان سے ممکن نہیں۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ ان کا محکوم نہیں۔

وَاللّٰہُ یَخْتَصُّ بِرَحْمَتِہٖ اور اللہ تعالیٰ خاص کرتا ہے اپنی رحمت کے ساتھ۔ کہ وحی کا نزول بھی اس کی رحمت کے آثار سے ہے۔ مَنْ یَّشَآءُ بندوں میں سے جسے چاہے۔ اگرچہ ظاہر بینوں کی نظر میں اس رحمت کی لیاقت نہ رکھتے ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ پرانے خاندانوں کے لوگ نئے دولت مندوں کو تمسخر اور مذاق کرتے ہیں۔ بلکہ ہر وہی کمال والے کو اس کمال کے موروثی خاندان والے حقیر جانتے ہیں۔ اور سمجھتے نہیں ہیں کہ پہلے ہمارے مرتبہ بزرگوں میں سے جو کسی کمال کا مبدا ہوئے ہیں، وہ ظاہر بین نظر کے اعتبار سے اس کی لیاقت نہیں رکھتے تھے۔ نیز نہیں سمجھتے کہ جب بھی حق تعالیٰ کسی کو بزرگی اور مرتبہ عطا فرماتا ہے پہلے اسے اس منصب کی لیاقت بخشتا ہے خاص کر شرعی مرتبوں اور دینی مناصب میں اور اسی لیے کہتے ہیں۔

(مصرع) بجائے خویش بود آنچہ کردگار دہد

یعنی اللہ تعالیٰ جو کچھ دیتا ہے درست ہوتا ہے۔

اور ان کی غلط فہمی کا سبب یہ ہے کہ وہ غائب کا قیاس حاضر پر کرتے ہیں۔ جس طرح بادشاہ آدمیوں کو نہ پہچاننے والے یعنی نالائق کو اٹکل اور مذاق کے طور پر اونچا مرتبہ بخش

دیتے ہیں۔ اور وہ اس مرتبہ کی ذمہ داری پوری نہیں کرتا۔ اور رُوئی کاشت کرنے کے بجائے اُون کاشت کرنے کا حکم دیتا ہے۔ اسی طرح شہنشاہِ مطلق بھی معاذ اللہ الکل اور مذاق کرتا ہے۔ حالانکہ بندوں کا دوسرے بندوں پر فضل واحسان سراسر ناقص اور ناتمام ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ منصب تو دیتے ہیں۔ اور اس منصب کی لیاقت نہیں دے سکتے۔

وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ اور اللہ تعالیٰ عظیم فضل والا ہے۔ جو کہ کمال کی حد سے بھی زیادہ ہے اس کے فضل کی نسبت سے منصب دینا اور اس کی لیاقت عطا کرنا دونوں برابر ہیں۔

اور اگر مسلمانوں کے دلوں میں تشویش ڈالنے کے لیے یہودی شبہ ڈالیں اور کہیں کہ اگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے تم پر خیر اور نیکی نازل ہوتی ہے۔ اور یہ قرآن پاک کا نزول اس کی رحمت کے آثار سے ہے۔ اور فضلِ عظیم جانتے ہو۔ پس احکام کا منسوخ ہونا جو کہ تمہارے دین میں کئی بار واقع ہوا۔ اور ہو رہا ہے اس کا کیا معنی؟ اگر تمہارے حق میں پہلا حکم بہتر تھا تو دوسرا حکم بُرا ہوا۔ اور اگر دوسرا حکم بہتر تھا تو پہلا حکم بُرا ہوا۔ نیز کئی دفعہ تمہارے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر بعض اوقات وحی آتی ہے۔ اور ان پر ایک کلام اُترتا ہے۔ اور اسے وہ خود بھی پڑھتے ہیں۔ اور دوسروں کو بھی پڑھنے کا حکم دیتے ہیں۔ اور ثواب کی امید رکھتے ہیں۔ اور دوسرے وقت میں وہ سب نازل شدہ ان کے ذہن سے نکل جاتا اور بالکل بھول جاتا ہے۔ پس وہ نیک امر جس کی تلاوت پر انہیں ثواب کی امید تھی' ان سے واپس کیوں لے لیا گیا؟ یہ کون سی رحمت اور کیا فضل واحسان ہے؟

اس شبہ کو دفع کرنے کے لیے اس مضمون کو سمجھئے اور دوسرے لوگوں کو سمجھایئے کہ منسوخ کرنے میں خیر کو شر کے ساتھ یا شر کو خیر کے ساتھ بدلنا نہیں ہے۔ تاکہ اس وحی کے اچھے ہونے کے منافی ہو۔ بلکہ ناسخ اور منسوخ دونوں خیر ہیں۔ اس لیے کہ

مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ قرآنِ کریم کی آیت کی جنس سے جسے ہم منسوخ کرتے ہیں۔ اور اس کے حکم کو روک دیتے ہیں اگرچہ وہ آیت تلاوت میں برقرار رہے' مصاحف میں لکھی ہوئی اور حفاظ کے سینوں میں محفوظ۔ جیسے آیت وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ

اَزْوَاجًا وَّصِيَّةً لِّاَزْوَاجِهِمْ مَّتَاعًا اِلَى الْحَوْلِ الخ (البقرہ آیت ۲۴۰) کہ اس کا حکم ایک سال کی عدت کا واجب ہونا ہے۔ جبکہ یہ دوسری آیت کے ساتھ جس کا حکم چار ماہ دس دن کی عدت کا وجوب ہے' منسوخ ہوئی۔ حالانکہ یہ آیت بھی قرآن پاک میں موجود ہے۔ اور بھولی نہیں بلکہ حافظ کی زبان پر جاری ہے۔ اور مثل آیت يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا نَاجَيْتُمُ الرَّسُوْلَ فَقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيْ نَجْوٰىكُمْ صَدَقَةً (المجادلہ آیت ۱۲) کہ اس کا حکم بھی منسوخ ہے۔ جبکہ اس کی تلاوت باقی ہے۔ اور اسی طرح کفار کے ساتھ جنگ میں صبر کرنے سے متعلق آیت کہ ایک مجاہد کو دس آدمیوں کے مقابلہ میں ثابت رہنے کا حکم تھا' منسوخ ہے۔ اور سورۃ انفال میں موجود ہے۔ اور پڑھی جاتی ہے۔ علیٰ ہذا القیاس

اَوْ نُنْسِهَا یا ہم اسے رسول علیہ السلام اور دوسرے قاریوں کے ذہن سے فراموش کرا دیں۔ تاکہ اس آیت کے الفاظ انہیں بخوبی یاد نہ رہیں۔ اور اس کے الفاظ کے بارے میں شبہ میں پڑ جائیں۔ اگرچہ اصل مضمون اور اس کے بعض الفاظ انہیں یاد ہوں۔ خواہ اس آیت کا حکم باقی ہو جیسے آیت الشیخ والشیخة اذا زنیا فارجموهما البتة نکالامن الله والله عزیز حکیم کہ اس کا حکم برقرار ہے۔ اور اس کے الفاظ بخوبی یاد نہ رہے۔ کوئی کہتا ہے کہ اس کے آخر میں وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ہے۔ اور کوئی کہتا ہے کہ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ہے۔ اور اسی طرح اس کا مقام بخوبی معلوم نہیں کہ یہ کس سورۃ میں تھی اسی لیے حضرت جبرئیل علیہ السلام کے امر سے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کی تلاوت چھوڑ دی اور جیسے لاترغبوا عن آباء کم فانه کفربکم ان ترغبوا عن آبائکم والولد للفراش وللعاهر الحجر جیسا کہ اسے ابن عبد البر نے تمہید میں حضرت عمرو (رضی اللہ عنہ) نے روایت کیا اور جیسے جاهدوا کما جاهدتم اول مرة اسے ابن عبید نے عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ سے روایت کیا۔ اور جیسے بلغوا قومنا انا لقد لقینا ربنا فرضی عنا وارضانا جو کہ بئر معونہ کے شہداء کی زبان سے حکایۃً نازل ہوا تھا۔ اسے بخاری اور مسلم نے روایت کیا۔ اور جیسے لو کان لابن آدم وادمن ذهب لابتغی الیه ثانیا ولو کان وادیان لابتغی الیهما ثالثا ولایملأجوف ابن آدم الاالتراب

ویتوب اللہ علی من تاب کہ اکثر محدثین نے اسے کثیر صحابہ کرام سے نقل کیا ہے۔ اور ابی بن کعب کے مصحف میں لکھا ہوا بھی تھا۔ لیکن اس کے بعض الفاظ مشتبہ ہو گئے جیسے بطن ابن آدم یا جوف ابن آدم اور اس کا مقام بھی مشتبہ ہو گیا کہ سورۂ احزاب تھی یا سورۂ برأت اور اس کی ابتدا بھی فراموش ہو گئی کہ انا انزلنا المال لاقام الصلوٰة وایتاء الزکوٰة تھا یا کچھ۔ اور اسی طرح آیت ان اللہ سیئوید ھذا الدین برحال مالھم فی الآخرۃ من خلاق ہے یا باقوام لاخلاق لہم فی الآخرۃ اسے ابو عبید وغیرہ نے حضرت ابو موسیٰ الاشعری رضی اللہ عنہ سے روایت کیا۔ علیٰ ہذا القیاس

اور خواہ اس کا حکم بھی چھوڑ دیا گیا ہو۔ جیسے عشر رضعات معلومات یحرمن کہ اس آیت کی ابتدا اور بعد کا حصہ سب بھول گیا۔ اور اس کا مقام بھی بالکل بھول گیا۔ اور اس کا حکم بھی منسوخ ہے۔ اسے بخاری اور مسلم نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا اور ابو داؤد کتاب ناسخ و منسوخ میں' بیہقی دلائل النبوت میں ابو امامۃ بن حنیف کی روایت سے لائے ہیں کہ انصار میں سے ایک صاحب تہجد کے لیے اُٹھے اور انہوں نے سورۂ فاتحہ کے بعد چاہا کہ ایک سورۃ پڑھیں جو کہ انہیں یاد تھی۔ اور ہمیشہ اس کی تلاوت کرتے تھے اس کی تلاوت پر بالکل قادر نہ ہو سکے۔ اور حافظہ سے ساری سورۃ اُتر گئی۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کے سوا ان کی زبان پر کچھ بھی جاری نہیں ہوتا تھا۔ بوقت صبح تعجب کے ساتھ دوسرے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے پوچھا تو سبھی نے یہی کہا کہ اسی طرح یہ سورۃ ہماری یاد سے بھی نکل گئی ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اور ماجرا عرض کیا۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا آج رات اس سورۃ کی تلاوت منسوخ ہو گئی۔ اور میرے سینے سے اور سب لوگوں کے سینے سے نکل گئی۔ بلکہ اس سے جس پر لکھا تھا اس خطبہ کے نقوش بھی زائل ہو گئے۔ بہرحال ان دونوں طریقوں میں سے جو بھی واقع ہو۔

نَاْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَآ ہم اس منسوخ شدہ یا فراموش شدہ آیت سے بہتر لاتے ہیں۔ اَوْ مِثْلِهَا یا خوبی میں اس منسوخ شدہ یا فراموش شدہ آیت کی مثل۔ پس منسوخہ اور ناسخہ دونوں آیات میں خیریت موجود ہوتی ہے۔ اگرچہ بعض اوقات منسوخہ آیت کے مقابلہ میں

ناسخہ میں زیادہ خیریت ہوتی ہے۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ اگر آیت کا حکم منسوخ ہے تو اس کی ناسخ دوسری آیت آتی ہے۔ جس سے دوسرا حکم نکلتا ہے۔ اور وہ حکم منسوخ حکم کے مقابلہ میں بہتر ہوتا ہے کہ عمل میں زیادہ آسان ہوتا ہے جیسے فاقرء وا ماتیسر من القرآن کیونکہ عمل میں تم ایلیل الا قلیلا نصفه اوانقص منه قلیلًا او زد علیه ورتل القرآن ترتیلا سے زیادہ آسان ہے۔ یا عمل میں بھی آسان ہوتا ہے۔ اور مصلحت وقت کے بھی زیادہ مطابق ہوتا ہے۔ جیسے اَلْـٰٔنَ خَفَّفَ اللّٰهُ عَنْكُمْ وَعَلِمَ اَنَّ فِيْكُمْ ضَعْفًا کہ عمل میں بھی آسان ہے۔ اور مصلحت وقت کے ساتھ زیادہ مطابق ہے۔ کیونکہ افواج کی کثرت کے وقت ان کے درمیان کمزور دل لوگ ہوتے ہیں اگر انہیں بھی قوی دل لوگوں کی طرح ایک آدمی کو دس کے مقابلہ میں صبر کرنے کی تکلیف دی جائے تو جہاد سے پہلوتہی کریں گے۔ اور جی چرائیں گے۔

یا عمل کرنے والے کی مصلحت سے زیادہ موافق ہو جائے۔ اگرچہ عمل میں سہولت نہ ہو۔ جیسے ماہ رمضان المبارک میں روزہ رکھنے کو متعین کرنا جو کہ فدیہ دینے اور روزہ رکھنے کے درمیان اختیار دینے کا ناسخ ہوا۔

یا اجر میں زیادہ ہو اگرچہ عمل کرنے والے کی مصلحت کے زیادہ مطابق نہ ہو اور عمل میں بھی آسان نہ ہو جیسے اسلام کے ابتدائی دور میں جہاد کا حکم کہ ابھی زیادہ جمعیت بھی نہیں ہوا تھا۔ اور جنگ کا تجربہ رکھنے والے اور اسلحہ کی مشق رکھنے والے لوگ اس دین میں داخل نہیں ہوئے تھے۔ اور صبر اور معاف کرنے کی آیات کا ناسخ ہونا۔

یا ناسخ آیت کا حکم ان امور مذکورہ میں منسوخ آیت کے حکم کی مانند ہوتا ہے۔ اور اگر آیت فراموش ہو گئی ہو تو اس کے عوض دوسری آیت آتی ہے۔ جو کہ اس کے بدلے اس کی تلاوت کی جاتی ہے۔ اور اس سے ثواب حاصل کیا جاتا ہے۔ اور وہ بھی کبھی پہلی آیت سے کثرت ثواب، فصاحت الفاظ اور بلاغت کلام میں بہتر ہوتی ہے۔ جیسا کہ اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ بجائے ان ذات الدین عند اللہ الحنیفۃ السمحۃ،

لاالیھودیۃ والنصرانیہ کے۔ اور کبھی ان امور میں فراموش شدہ آیت کے مطابق ہوتی ہے۔ جیسے بھلائی گئی آیات کے عوض باقی رہنے والی اکثر سورتیں۔

نسخ کی ایمان افروز حقیقت

یہاں جاننا چاہیے کہ احکامِ شرعیہ میں نسخ احکام تکوینیہ میں نسخ کی طرح ہے۔ اور نظامِ تشریعی میں نسخ کو بعید جاننا جو کہ کافروں کے شبہات ڈالنے کی وجہ سے رونما ہوتا ہے' اللہ تعالیٰ کے نظام تکوینی کے حال کو ملاحظہ کرنے سے دُور ہو جاتا ہے۔ اس کا بیان یہ ہے کہ احکامِ الٰہیہ جو کہ لوحِ محفوظ میں لکھے ہوئے ہیں خواہ تکوینی احکام کی جنس سے ہوں' خواہ شرعی احکام کی جنس سے ہوں' دو قسم پر ہیں۔ خاص ہیں یا عام اور خاص یا تو اشخاص کے ساتھ خاص ہیں یا زمانے کے ساتھ خاص ہیں۔ جو اشخاص کے ساتھ خاص ہیں' اشخاص کی باقی رہنے تک باقی رہتے ہیں۔ اور اس کے بعد منسوخ ہو جاتے ہیں۔ اور جو زمانے کے ساتھ خاص ہیں' وہ اس زمانے کے باقی رہنے تک باقی رہتے ہیں۔ اور وہ زمانہ گزرنے کے بعد ختم ہو جاتے ہیں خواہ وہ گزرنے والا زمانہ قلیل ہو جیسے قرآن پاک کے منسوخ احکام خواہ طویل ہو جیسے پہلی شرائع کے احکام اور یہ تبدیلی ان احکام کے لوحِ محفوظ میں لکھے ہونے کے منافی نہیں۔ کیونکہ وہاں انہیں اوقات اور انہیں مدتوں کے ساتھ مقرر کر کے لکھے گئے ہیں۔ جیسے تمام احکام تکوینی جیسے صحت' مرض اور امیری' فقیری۔

اور عام احکام بالکل قابلِ نسخ نہیں ہیں' ہمیشہ ہمیشہ کے لیے باقی اور برقرار ہیں۔ جیسے احکام تکوینی میں انسان کا بولنا اور اس کے قد کا سیدھا ہونا اور جیسے احکام شرعی میں شرک' زنا' لواطت اور چوری کی حرمت اور اس بیان سے واضح ہو گیا کہ احکام کے نسخ میں خواہ تکوینی ہوں یا شرعی علم الٰہی میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں آتی جو تغیر و تبدیلی ہے' وہ ہمارے نقصان زدہ ذہن میں ہے۔ کہ ہم ہر حکم کی مدت نہیں پہچانتے۔ اور غلط فہمی کی وجہ سے اسے ہمیشہ ور دائمی خیال کرتے ہیں۔ اور اگرچہ احکام تکوینی میں یہ معنی جائے انکار اور محل شبہ نہیں۔ کیونکہ بنی آدم میں سے ہر شخص ایک بدن میں صحت کا بیماری سے بدلنا' ایک شخص میں امیری کا فقیری سے بدلنا اور ایک قوم اور ایک گروہ میں غلبے کا مغلوبیت سے بدلنا۔ ایک قوم سے دوسری قوم

کے ساتھ حکومتوں کی تبدیلی اور ایک مکان اور ایک شہر کا آباد ہونا اور برباد ہونا۔ مختلف اوقات میں مشاہدہ کرتا ہے۔ اور ان تبدیلیوں کے خفیہ اسباب میں محمول کرتا ہے۔ لیکن شرعی احکام میں اس قسم کی تبدیلی دیکھ سُن کر کفار طعنہ اور طنز کے لیے اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی اس طعن و تشنیع کو دُور کرنے کے لیے ہر مسلمان کو خطاب کر کے جواب کی تلقین فرماتا ہے۔ اور خطاب کرتے ہوئے فرماتا ہے:

اَلَمْ تَعْلَمْ اے صاحب عقل کیا تو نہیں جانتا اَنَّ اللّٰهَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔ کیونکہ تو جہاں بھی دیکھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر لحہ اور ہر آن میں رنگا رنگ حوادث اور قسم قسم کے عجائب ظاہر فرماتا ہے۔ اور جو کسی کے فہم اور وہم میں نہیں سماتا' اپنی قدرتِ کاملہ سے اسے اچھی طرح سرانجام دیتا ہے۔ جیسے مہلک بیماری کو صحت' ذلت آمیز غربت کو دولت و ثروت حد درجہ کمزوری کو قوت سلطنت کو گدائی عزت کو ذلت اور بے کسی' روشنی کو تاریکی۔ اور تاریکی کو روشنی سے بدلنا۔ اور جب تو اسے ان تبدیلیوں پر قادر مانتا ہے تو تو اس سے کیا بعید جانتا ہے کہ ایک حکم کو دوسرے حکم اور ایک لفظ کو دوسرے لفظ کے ساتھ بدل دے۔ اور ایک حکم مشروع ہونے کے مرتبے سے معزول فرما کر اس کی جگہ دوسرا حکم مقرر فرما لے۔ اور ایک لفظ کو تلاوت و عبادت کے شرف سے پیچھے کر کے کسی دوسرے لفظ کو اس فضیلت سے نوازا ہے۔ اور دونوں احکام اور دونوں الفاظ اپنے مرتبہ میں قابلِ تعریف اور اچھے ہوں اور اگر یہ اجمالی بیان تیرے اعتراض کی گرہ نہیں کھولتا اور تیری عقل کے شیشے کو صاف نہ کرے تو میں تجھ سے پوچھتا ہوں:

اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ کیا تو نہیں جانتا کہ اللہ تعالیٰ کے لیے ہے ساتوں آسمانوں اور زمین کی بادشاہی۔ اور اس نے ہر آسمان میں ایک جدا حکم' ایک جدا ذکر۔ اور ایک جدا تدبیر کا فیصلہ فرمایا ہے۔ اور اسی طرح زمین کی مختلف ریاستوں میں ایک جدا لغت' ایک جدا طرز زندگی۔ اور ایک جدا قانون رکھا ہے۔ جبکہ تمام احکام' تدابیر' طرز ہائے زندگی اور لغتیں اپنے اپنے مقام پر قابلِ تعریف اور پسندیدہ ہیں۔ سندھیوں کے لئے اصطلاح سندھ اچھی اور ہندیوں کے اصطلاح ہند پسندیدہ۔ اور جب تو

نے جگہوں کے اختلاف کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے احکام اور تدبیرات کے اختلاف کو مان لیا۔ اور ان سب کو قابلِ تعریف اور بہتر سمجھا تو اشخاص کے اختلاف اور زمانوں کے فرق کی وجہ سے اس کے احکام اور تدبیرات کے اختلاف سے کیوں تعجب کرتا ہے۔ اور بعید سمجھتا ہے۔ اور ہر حکم کو اس کے زمانے میں اور ان اشخاص اور گروہ کے حق میں جن پر وہ حکم اُترا' کیوں اچھا نہیں سمجھتا۔

اور اس سے قطع نظر جب معجزات کی دلالت کی وجہ سے پیغمبر وقت علیہ السلام کی سچائی ثابت ہو گئی۔ اور یقین کے ساتھ معلوم ہو گیا کہ جو کچھ وہ رسول علیہ السلام پہنچاتے ہیں بلاشبہ حکم خداوندی ہے۔ پس اس حکم کی اطاعت میں اگر چہ وہ پہلے حکم کا ناسخ ہو' کوئی عذر نہ تھا۔ اور کفار کے بوگس شبہات کی وجہ سے حکم الٰہی کی اطاعت میں تم کس طرح تردد اور پس و پیش کرتے ہو۔

وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ حالانکہ تمہارے لیے خدا تعالیٰ کے سوا کوئی کارساز نہیں۔ جو تمہاری معاش اور معاد کے کام کی اصلاح کرے۔ اگر تمہارا کوئی اور کارساز ہوتا تو گنجائش تھی کہ اس کارساز کو مزاج کا غیر مستقل اور حکم بدلنے والا سمجھ کر چھوڑ دیتے۔ اور اس دوسرے کارساز کی طرف رجوع کرتے۔ اور اپنے معاش اور معاد کا علاج اس سے ڈھونڈتے۔ وَلَا نَصِيْرٍ اور اس کے سوا تمہارا کوئی مددگار نہیں۔ کہ اگر اپنے ناسخ احکام کی نافرمانی پر تم سے باز پرس کرے۔ اور سزا دے تو وہ مددگار تمہیں اس کے ہاتھ سے چھڑا لے۔ تو تم نسخ کی حکمت اور اس کے قبضہ میں اپنی بے چارگی جاننے کے باوجود جب بھی جیسے بھی فرماتے اس کے حکم کی اطاعت اور فرماں برداری کرتے ہو۔ اور اسے سر آنکھوں پر رکھتے ہو؟

ام یعنی نہیں بلکہ تُرِيْدُوْنَ اَنْ تَسْئَلُوْا رَسُوْلَكُمْ تم چاہتے ہو کہ سوال کرو اور اپنے رسول علیہ السلام سے درخواست کرو۔ احکامِ الٰہی کو بدلنے کی کہ پہلے جو کچھ فرمایا ہے اسی کو برقرار رکھے۔ اور اسے منسوخ نہ کرے۔ یا جو ہماری خواہش کے مطابق ہے' وہ حکم دے۔ اور جو ہم پر شاق اور گراں ہے' اسے ختم کر دے۔ اور رسول علیہ السلام سے اس مقصد

کو چاہنا اس لیے ہے کہ وہ تمہاری طرف سے اس آرزو کو بارگاہِ الٰہی میں پیش کر دیں اور بار بار زاری کریں۔ تا کہ اس کے مطابق قبولیت ہو جائے۔

كَمَا سُئِلَ مُوْسٰى مِنْ قَبْلُ جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے اس رسول علیہ السلام سے پہلے سوال کیا گیا تھا۔ کیونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام بھی بنی اسرائیل کو احکام میں سے کوئی حکم پہنچاتے تھے۔ اور وہ اسے نفس کے خلاف اور اپنی طبیعت پر ناگوار پاتے تھے۔ جیسے عمالقہ سے جہاد اور زکوٰۃ میں مال کا چوتھائی حصہ دینا۔ تو حضرت موسیٰ علیہ السلام سے نہایت منت سماجت کے ساتھ درخواست کرتے تھے کہ بارگاہِ خداوندی میں عرض کر کے اس حکم کو تبدیل کرا دیں اور اس کے بجائے کوئی اور ہلکا اور آسان حکم لائیں۔ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام ان کے سوالات کی کثرت کی وجہ سے بہت تنگ دل ہو چکے تھے۔ یہاں تک کہ اے محمد! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم شبِ معراج آپ کے سامنے ان کی شکایت بھی کی اور آپ کو تاکید بھی کی کہ اُمتیوں تک پہنچنے سے پہلے بارگاہِ خداوندی میں احکام کی تخفیف کا سوال کریں۔ اور پچاس (۵۰) نمازوں کو پانچ (۵) کرایا اور اسی طرح گائے کے واقعہ میں اپنے سوالات کی کثرت کی وجہ سے عام گائے کو بدل کر نادر پابندیوں کے ساتھ مقید کمیاب گائے بنا کر خود تنگی میں گرفتار ہوئے۔ اور ظاہر ہے کہ حکم الٰہی کی تبدیلی چاہنا خصوصاً ناسخ کے حکم کی اطاعت نہ کرنا اور منسوخ کے حکم کو لازم کرنا صریح کفر ہے۔ اور اللہ تعالیٰ پر حکم اور فرمان چلانے کو لازم کرتا ہے۔

وَمَنْ يَّتَبَدَّلِ الْكُفْرَ بِالْاِيْمَانِ اور جس نے ایمان کے بدلے کفر کو بدل لیا فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِيْلِ تحقیق اس نے سیدھی راہ گم کر دی کیونکہ منسوخ حکم اگرچہ حکم الٰہی ہے۔ لیکن جب منسوخ ہو گیا اس میں ہدایت باقی نہ رہی۔ اور یہ اس کی طرح ہے کہ چلنے والا طے کی ہوئی راہ پھر طے کرنا شروع کر دے اور آگے نہ جائے، وہ مقصد تک نہیں پہنچ سکے گا۔

چند جواب طلب سوالات

یہاں چند جواب طلب سوالات باقی ہیں۔ پہلا سوال یہ ہے کہ عام تکوینی احکام میں تبدیلی کے اسباب معلوم ہیں۔ اور اس کے اسباب پر اطلاع کی وجہ سے وہ بعید اور عجیب

سمجھنا دُور ہو جاتا ہے۔ مثلاً یہ معلوم ہے کہ موسمِ گرما میں برف نہیں جمتی اور سردیوں میں پانی چھڑکنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اور مفلس آدمی فلاں فلاں سبب سے امیر ہوتا ہے۔ اور امیر آدمی فلاں فلاں سبب سے فقیر ہوتا ہے۔ اور بیمار دواؤں سے صحت پاتا ہے۔ اور صحت مند بدپرہیزی سے بیمار ہوتا ہے۔ لیکن احکامِ شرعی میں تبدیلی کا کیا سبب اور کیا وجہ ہے؟ وہاں سوائے مکلفین کی آزمائش اور امتحان کے کہ اطاعت کرتے ہیں یا نافرمانی۔ دوسرا کوئی سبب ظاہر نہیں ہے۔ اور یہ سبب تبدیلی کا موجب نہیں ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ اگرچہ احکامِ شرعی میں اصلی سبب یہی ہے۔ مگر یہ آزمائش اور امتحان صرف اٹکل اور خودساختہ حکومت چلانا نہیں۔ بلکہ مکلفین کی مصلحتوں کی رعایت اور ان کے معاش اور معاد کی اصلاح پر مبنی ہے۔ جیسے طبیب کا مریض کو تکلیف دینا کہ جو چیز اسے نفع دینے والی ہے' اس کا حکم دیتا ہے۔ اور جو اسے نقصان دہ ہے' اس سے شدت کے ساتھ منع کرتا ہے نہ کہ جیسا اتفاق ہو۔ اور جب مکلفین کی معاشی اور اخروی مصلحتوں کی رعایت پیشِ نظر ہوئی اور ان کی روحانی بیماریوں کا علاج ارادۂ الٰہیہ کو منظور ہے' مختلف اُمتوں اور مختلف زمانوں کی مصلحتوں کے مطابق احکام کا اختلاف لازمی ہوا۔

احکامِ شرعیہ میں نسخ کی چار وجوہات

اور محقق علماء نے فرمایا ہے کہ احکامِ شرعیہ میں نسخ چار وجہوں میں سے ایک کے ساتھ ہوتا ہے: پہلی وجہ یہ ہے کہ احکامِ شرعیہ میں سے کسی حکم میں جو حکمت ہے' مختلف رنگ اختیار کرتی ہے۔ کبھی ایک رنگ میں ظاہر ہوتی ہے۔ کبھی دوسرے رنگ میں کہ حکمت کی وہ مختلف صورتیں مختلف احکام کا تقاضا کرتی ہیں۔ اور ہر صورت کے مطابق ایک حکم آتا ہے۔ ظاہر بین لوگ صورت کو دیکھتے ہوئے احکام کو مختلف خیال کرتے ہیں۔ اور باریک بین لوگ چھپی ہوئی حکمت پر نظر کرتے ہوئے تمام احکام کو ایک سمجھتے ہیں۔ مثلاً کفار کے ساتھ ان کی عیدوں اور عبادتوں میں مشابہت کو دور کرنا حکمتِ الٰہی میں واجب ہے۔ اور جس زمانے میں یہودی دارالاسلام کے پڑوس میں غلبہ رکھتے اور ہفتہ کے دن کی تعظیم میں زیادتی کرتے تھے' مسلمانوں کو حکم ہوا کہ تنہا ہفتہ کا روزہ نہ رکھیں مگر دوسرے روزوں کے دوران جیسے ماہِ

رمضان اور ایامِ بیض کے روزے اور جب وہ یہودی ان اچھے مقامات سے نیست ونابود ہو گئے۔ اور ان سے مشابہت کا اصلاً خوف نہ رہا تو اس تنہا دن کا روزہ رکھنے کی حرمت منسوخ ہوگئی۔ اور دوسرے روزوں کی طرح اس دن کا روزہ بھی مباح اور نفل ہو گیا۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ کائنات کے امور کی تدبیر میں ارادۂ الٰہی نیا تعلق پکڑتا ہے۔ اور اس کام میں ایک نیا نقش آجاتا ہے۔ جو کہ پہلے نہ تھا۔ پس اس نئی تدبیر اور نئے تقاضا کی وجہ سے کئی احکام صادر ہوتے ہیں۔ جو کہ پہلی شریعتوں اور گزشتہ اوقات میں بالکل صادر نہ ہوئے۔ جیسا کہ حضور خاتم المرسلین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت شریفہ کے وقت جہان کے لیے تدبیر الٰہی یوں منظور ہوئی کہ نبوت اور بادشاہت کو جمع فرمادیں۔ پس وہ احکام جو کہ دونوں طرف ملے ہوئے تھے' صادر ہوئے۔ اور جہاد' تقسیم اموالِ غنیمت' خراج اور جزیہ کے مسائل اور جو ان کے مناسب تھا' بروئے کار آئے اور پہلے زمانوں میں جبکہ نبوت' بادشاہت کے ساتھ ملی ہوئی نہ تھی' یہ احکام بھی نہ تھے۔ بلکہ اس کے خلاف حکم ہوتا تھا مثلاً اموالِ غنیمت حلال نہ تھے۔ اور مخالفین سے دین قبول کرنے کے عوض جزیہ اور خراج لینا جائز نہ تھا۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ اس رسول علیہ السلام کی بعثت کے زمانے کے رسم ورواج یا اس رسول علیہ السلام کی قوم کے رسم ورواج کسی حکم کا موجب ہوں کہ اس سے پہلے اس وقت یا اس قوم میں وہ رسم ورواج نہ ہونے کی وجہ سے حکم نہ تھا۔ اور اسی طرح نزولِ وحی کے اوقات کی ابتدا سے انتہا تک جو کہ تیئیس (۲۳) سال کی مدت تھی' کی رسموں کا اختلاف بھی بعض احکام کی تبدیلی کا موجب ہوا۔ اور اسی طرح اس ملت کے قواعد کی نگہداشت اور حفاظت بھی بعض احکام کی تبدیلی کا موجب ہوئی۔ جس کو قائم کرنے کے لیے اس رسول علیہ السلام کی بعثت ہوئی تھی جیسے حضور خاتم المرسلین علیہ السلام کے حق میں ملتِ ابراہیمی علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام اور یہی وجہ ہے کہ کعبہ کی طرف منہ کرنا بیت المقدس کی طرف منہ کرنے کا ناسخ ہوا۔

چوتھی وجہ یہ تھی کہ ایک حال سے دوسرے حال تک اور ایک ذمہ داری سے دوسری ذمہ داری تک منتقل کرنے میں درجہ بندی اور مشق کرانے کو کام میں لایا جاتا ہے۔ اس لیے

کہ صرف اباحت سے مشقت طلب ذمہ داری کی طرف منتقل ہونا اکثر نفسوں پر ناگوار ہوتا ہے۔ پس ضروری ہے کہ پہلے ہلکی اور آسان ذمہ داریوں کا عادی بنایا جائے تاکہ رفتہ رفتہ مشقت طلب اور بھاری کاموں کو برداشت کر سکیں۔ اور اس درجہ واریت اور مشق کرانے میں بار بار منسوخ کرنا اسی حکمت کی بناء پر واقع ہوا۔ جیسے متعہ میں اور یہ درجہ واریت اور مشق شراب کی حرمت میں خوب ظاہر ہے۔ اور ترکہ کی تقسیم اور والدین اور بیٹوں کے لیے حصے مقرر کرنے میں بھی واضح ہے۔

دوسرا سوال وہ ہے جو اسی جواب پر بطورِ فرع نکلتا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ احکام اور شرعی تکالیف کے نسخ کے لیے یہ وجوہات اور اسباب دل کو تسلی بخش ہوئے لیکن الفاظ قرآن کو فراموش کرنا جو کہ ثواب واجب کرنے اور قربِ خداوندی تک پہنچانے میں محض خیر اور نفع تھا' کون سا سبب سمجھا جا سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ اسباب تلاوت کے منسوخ کرنے میں جس کی تعبیر اس آیت میں اس کے ساتھ واقع ہوئی' کامیاب نہیں ہوتے۔ اور کوئی دخل نہیں رکھتے؟

اس کا جواب یہ ہے اس نوع کے نسخ کا سبب بہت دقیق ہے۔ پہلے ایک مقدمہ بیان کیے بغیر ذہن نشین نہیں ہوتا اس مقدمہ پر توجہ رکھنی چاہیے۔ کیونکہ عالمِ غیب سے علوم کے القاء کا طریقہ ترتیب یافتہ الفاظ اور استعمال شدہ کلمات کے طریقہ سے جدا ہے۔ اس لیے کہ علوم کا القاء پہلے عقل پر ہوتا ہے وہاں سے خیال کی طرف چلتے ہیں۔ اور الفاظ کا ایک لباس پہنتے ہیں۔ اور بولنے کے راستوں میں جاری ہوتے ہیں۔ جبکہ الفاظ اور کلمات مذکورہ کا طریقہ قوتِ خیالیہ کی کشادگی اور اسے وسعت دینا ہے۔ تاکہ ترتیب یافتہ الفاظ اور لمبے دامن والے مستعمل کلمات کی اس میں گنجائش ہو سکے۔ پس الفاظ کے القاء میں عالمِ غیب کی نزدیکی اور قرب میں القائے علوم کی نسبت ترقی ہے۔ جو کہ مقام تعقل سے ایک درجہ نیچے اُتر کر خیال کی سرحد میں داخل ہوتے ہیں۔ اور اسی لیے القاء الفاظ کی یہ قسم اولوالعزم پیغمبروں علیہم السلام کے ساتھ مخصوص ہے پھر خصوصاً خاتم المرسلین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ مخصوص ہے۔ اس لیے کہ گزشتہ انبیاء علیہم السلام پر زیادہ تر وحی متلو تختیوں پر نقش کی گئی اور

پتھروں میں کر دی گئی' کتاب کی شکل میں پہنچی تھی۔ اور اس افضل الرسل صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں زبرجدی تختیوں کے بجائے آپ کے مقدس خیال کو مقرر کر کے بلند پایہ حروف کا مصور جو کہ روح المقدس ہے' نقش وتصویر میں مصروف ہوا۔ اور جب یہ نوع قوای بشری کی نسبت سے بہت نادر اور کمیاب ہے تو لازماً بعض اوقات مشق کرانے اور عادت دِلانے کے لیے ایک مرتب کلام القاء ہوئی تھی۔ اور اس لوح میں اس کا باقی رہنا منظور نہ ہوتا تھا۔ جیسے بنائی گئی چیزوں کے ڈھانچے' گھڑی گئی عجیب چیزوں کے نمونے اور مختلف افکار کے مسودے۔ بلاتشبیہ بچوں کی تعلیم کی ابتدا میں حروفِ ہجا کی تعلیم کی طرح کہ حرفوں کی صورتوں کی تعریف اور ان کے ناموں کو بولنے کی مشق کرانے کے علاوہ اس میں اور کسی غرض کا لحاظ نہیں کیا جاتا اور اسی لیے فرمایا ہے سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسَىٰ إِلَّا مَا شَاءَ اللّٰهِ۔

ہم یہاں پہنچے کہ جو کچھ بھلایا گیا ہے' خصوصیت کے ساتھ اس بھلانے کی وجہ کیا ہے۔ حالانکہ یادداشت میں باقی رہنے والی آیات کے مضامین بھی ان مضامین کی مثل یا ان کے قریب ہیں۔ پس یہ سوال ایک جواب چاہتا ہے۔ جو کہ نہایت تفصیل اور طوالت میں ہے کہ اس تفسیر کا حوصلہ اس کی گنجائش نہیں رکھتا۔ اور یہاں اسی اجمال پر قناعت کرنا چاہیے جو کہ تفصیل سے بے نیاز کرنے والا ہے۔ اور اگر نفس بعض نکات کا شدید تقاضا کرے تو اس قدر سننا چاہیے کہ بعض اوقات اس وحی کے مضمون کا خوف اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ بار بار کان میں نہ پڑے جیسے الشیخ والشیخة اذا زینا فارجموحما کیونکہ سزا کی سب سے شدید قسم کا بیان ہے۔ اور کبھی سابق یا لاحق وحی میں واقع لفظ سے زیادہ مختصر ایک دوسرا لفظ اس سے بے نیاز کر دیتا ہے۔ اور سمجھانے اور وضاحت کرنے کے لیے فوری طور پر اس بھلائے گئے الفاظ کے اُتارنے کے محتاج ہو گئے تھے کہ سابق وحی کے لفظ میں غور یا لاحق وحی کے انتظار کی فرصت نہ تھی جیسے لاترغبوا عن آبائکم فانہ کفربکم وان ترغبوا عن آباء کم۔ کیونکہ وقضی ربك ان لاتعبدوا الاایاہ وبالوالدین احسانا انح اس سے بے نیاز کرنے والا ہے۔ اور اسی قبیل سے ہے۔ لو کان لابن آدم وادمن ذھب انح کا منسوخ ہونا کیونکہ دو کلمات الھاکم التکاثر حتّٰی زرتم المقابر لفظ اور

کلام کے اختصار کے ساتھ اس کلام سے بے نیاز کرنے والے ہیں۔ اور کبھی پریشان اور غمگین دِلوں کی تسلی اور تشفی منظور ہوتی ہے۔ اور یہ مہربانی ایک دوسرے کلام کو اُتارنے کا سبب ہو جاتی ہے کہ تشفی حاصل ہونے اور غم دُور ہونے کے بعد اس کی اس قدر ضرورت نہیں رہتی بلکہ بلاتشبیہ اس شخص کی مانند ہو جاتی ہے کہ ایک شخص کسی دوسرے کے لیے رقعہ لکھے اور حاضرین میں سے بعض اپنا سلام لکھنے پر بھی اصرار کرے اس حاضر کا سلام اپنی عبارت میں درج کر کے لکھ دے۔ اگر مکتوب الیہ چاہے کہ اس مکتوب کی نقل حاصل کرے تو اس سلام اور اس کی عبارت کو گرا دے گا اور یہی معنی بلغوا عنا قومنا الخ کے نسخ کا باعث ہوا کہ زندوں کی تسلی کے لیے شہیدوں کی طرف سے ایک پیغام پہنچانا منظور تھا۔ اور وہ ہو گیا اسی مثال پر باقی بھلائی گئی آیت کو قیاس کرنا چاہیے۔

تیسرا سوال یہ ہے کہ اربابِ اصول کے نزدیک نسخ کی تین قسمیں ہیں۔ صرف حکم کا نسخ جیسے نجویٰ میں وجوب صدقہ کی آیت صرف تلاوت کا نسخ جیسے آیۂ رجم۔ اور تلاوت و حکم دونوں کا نسخ جیسے عشر رضعات معلومات یحرمن اور اس آیت میں دو قسموں کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ اور نسخ حکم کو نسخ کا نام دیا۔ اور نسخ تلاوت کو بھلا دینے سے تعبیر فرمایا۔ اور تیسری قسم کے درپے نہیں ہوئے۔ اس کا کیا سبب ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ درحقیقت نسخ کی بھی دو قسمیں ہیں جو مذکور ہوئیں لیکن تیسری قسم ان دو قسموں کو مرکب کرنے سے حاصل ہوئی، قسم حقیقی نہیں ہے۔ اور اسی لیے دونوں قسموں میں داخل ہے۔ گویا یوں ارشاد ہوا کہ نَنسَخْ مِنْ آيَةٍ سواء انسیناها اولااوننسها سواء نسخناها اولانات بخیر منها اومثلها ؟ اہم جو آیت منسوخ کریں، برابر ہے کہ ہم اسے بھلا دیں یا نہ بھلائیں یا ہم اس آیت کو بھلا دیں برابر ہے کہ اسے منسوخ کریں یا نہ کریں۔ اس سے بہتر لاتے ہیں یا اس کی مثل اور اس اشارہ کی مؤید یہ بات ہے کہ اربابِ تحصیل کہتے ہیں کہ مقسم میں وحدت معتبر ہے۔ اور اسی لیے دو قسموں کو جمع کرنے سے تیسری قسم سرے سے پیدا ہی نہیں ہوتی۔ ورنہ کوئی تقسیم نہ رُکتی کیونکہ دو قسموں کا مجموعہ تیسری قسم ہو جاتا۔

چوتھا سوال یہ ہے کہ جب منسوخ التلاوۃ کو بھلانے کے قابل قرار دیا گیا تو چاہیے کہ وہ آیات بالکل بھول جاتیں اور کسی اور کو یاد نہ رہتیں حالانکہ مذکورہ آیات منسوخ التلاوۃ کی مثال میں ابھی یاد ہیں کہ اسے نقل کرتے ہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ان آیات کو فراموش کرانا اس معنی سے نہیں ہے کہ اس کے لفظ اور معنی سے کچھ بھی کسی کے ذہن میں نہ رہے۔ بلکہ اس کا معنی یہ ہے کہ ان آیات میں نازل شدہ پوری عبارت محفوظ نہ ہو اور بعض الفاظ یا الفاظ کی ترتیب میں شبہ پڑ جائے۔ اور جب شبہ پڑ گیا تو اس کا منزل ہونا یقین کے ساتھ ثابت نہ ہوا۔ اور قرآنِ کریم کی تعریف سے نکل گیا جو کہ منزل بالیقین ہے۔

اور بعض محققین نے کہا ہے کہ پیغمبر علیہ السلام کے حافظہ سے فراموش ہونا نسخ تلاوت کی دلیل ہے۔ لیکن چاہئے کہ یہ فراموش ہونا کہ تواتر کی تعداد تک تبلیغ سے پہلے ہو۔ یا عدد تواتر تک تبلیغ کے بعد ہو لیکن اس کا فراموش ہونا ان کی اکثریت کے حافظہ سے کہ ان کے گھٹنے سے تواتر باطل ہو جائے' بھی اسی کے ساتھ مل جاتا ہے۔ اور اگر عددِ تواتر تک تبلیغ کے بعد رسول علیہ السلام کے حافظہ سے فراموش ہو جائے۔ اور ابھی عددِ تواتر کو یاد ہے تو یہ نسخ تلاوت کی دلیل نہیں ہے۔ کیونکہ بارہا حضور علیہ السلام کو بعض آیات میں اشتباہ پڑ جاتا جیسا کہ صبح کی قرأت میں سورۂ روم سے اور دوسری سورتوں سے کئی آیات چھوڑ کر گزر گئے ہیں۔ اور تحقیق کے بعد فرمایا کہ کیا تم میں ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نہیں تھے کہ مجھے لقمہ دیتے اور ان آیات کی یاد دِلاتے۔ اور جب ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے عرض کی کہ یارسول اللہ! (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) میں حاضر تھا۔ لیکن یہ سمجھا کہ جب ان آیات کو حضور علیہ السلام نے چھوڑ دیا تو منسوخ ہو گئیں اس وجہ سے میں نے لقمہ نہ دیا۔ آپ نے ارشاد فرمایا کہ انما انا بشر انسی کما تنسون فاذا نسیت فذکرونی کہ میں لبادۂ بشریت میں ہوں' میں بھولتا ہوں جس طرح تم بھولتے ہو تو جب بھول جاؤں تو مجھے یاد کرا دیا کرو۔ نیز فرمایا کہ اگر یہ آیات منسوخ ہو جاتیں تو میں تمہیں اس کی خبر دیتا۔ بعض اصحاب السنۃ نے اسے اسی طرح روایت کیا۔

پس معلوم ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حافظہ سے عددِ تواتر کے حافظہ میں باقی

رہنے کے باوجود کسی آیات کا فراموش ہونا اس آیت کی تلاوت کے نسخ کی دلیل نہیں بنتا اور جو مطلقاً حضور علیہ السلام کی فراموشی کو نسخ تلاوت کی دلیل جانتے ہیں اس واقعہ اور اس کی مثل واقعہ کے جواب میں کہتے ہیں کہ نسیان اور چیز ہے۔ اور سہو و ذہول اور چیز۔ نسیان اس وقت ثابت ہوتا ہے۔ جبکہ حضور علیہ السلام کے حافظہ میں بالکل نہ رہے۔ اور یہ معنی منسوخ شدہ آیات کے سوا واقع نہیں ہوا۔ اور وہ جو سورۂ روم وغیرہ کی قرأت میں واقع ہوا' صرف ذہول اور سہو یا اشتباہ تھا۔ سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰى اِلَّا مَاشَاءَ اللّٰهِ کی دلیل کے ساتھ۔

سہو اور نسیان میں فرق

اور سہو اور نسیان میں فرق یہ ہے کہ سہو میں صرف خبردار کر دینا کفایت کرتا ہے کہ عقل متوجہ ہو کر اس آیت کو حافظہ میں پالیتی ہے۔ اور نسیان میں اس آیت کے الفاظ سنے بغیر اور ان الفاظ کو نئے سرے سے یاد کیے بغیر کام نہیں بنتا اور ظاہر ہے کہ مذکورہ واقعات میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ حالت لاحق نہیں ہوئی۔ ورنہ لقمہ دینا اور متنبہ کرنا کوئی فائدہ نہ دیتا ہاں عرف میں اس حالت کو بھی مشابہت کے طور پر نسیان کہہ دیتے ہیں۔ اور اسی عرفی اطلاق کے مطابق فرمایا کہ انما انا بشر انسی کما تنسون ورنہ نصِ قرآنی کے مطابق قرآن کا بھولنا حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے محال تھا۔ مگر جب ارادۂ الٰہی اس کے نسخ کے ساتھ متعلق ہوتا تھا۔ اور اس تقریر سے یہ حدیث اس حدیث سے مطابق ہوگئی۔ انی لاانسی ولکن انسی یعنی میں بھولتا نہیں۔ البتہ بھلایا جاتا ہوں کہ موطاء کے بعض نسخوں میں وارد ہے' اسے سمجھنا چاہیے۔

اس آیت سے مفہوم احکام کا بیان

علمائے اصول نے اس آیت سے جو احکام معلوم کیے ہیں' ان میں سے ایک یہ ہے کہ احکام کا نسخ جائز ہے' کوئی ڈر نہیں ہے۔ اور یہودی اس بارے میں مخالف ہیں وہ کہتے ہیں۔ کہ شارع کی طرف سے حکم شرعی کو منسوخ کرنا یا تو اس وجہ سے ہے کہ کوئی مخفی حکمت شارع پر ظاہر نہ تھی۔ اور اب ظاہر ہوئی۔ پس نئے سرے سے شروع کرنا لازم آیا۔ اور کوئی حکمت

ظاہر نہیں ہوئی تو پہلے حکم کو ختم کرنا اور دوسرا حکم لانا محض بے معنی ہوا۔ اور بے معنی کام شارع سے جو کہ حکیم ہے، بھی محال ہے۔

اور مسلمانوں نے اس بات کے جواب میں کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ علی الاطلاق مالک ہے۔ اور لَا یُسْئَلُ عَمَّا یَفْعَلُ اس کی شان ہے۔ اسے حق پہنچتا ہے کہ جو چاہے۔ جیسے چاہے حکم فرمائے۔ اور جب چاہے اس کے خلاف حکم دے۔ اس کے بارے میں حکمت و مصلحت پر نظر کا اعتقاد کرنا اسے اپنی طرح مخلوقات کا پابند سمجھنا ہے۔ وہ اس سے پاک ہے۔ اور اگر ہم حکمت اور مصلحت کا اعتبار کریں تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ مصلحتیں اور حکمتیں فی نفسھا زمان، مکان اور اشخاص کے اختلاف کی وجہ سے مختلف ہوتی ہے۔ جس طرح موسمِ سرما اور ٹھنڈے مزاج میں گرم دوا کھانا ضروری ہوتا ہے۔ اور موسم گرما اور گرم مزاج میں نقصان دیتا ہے۔ اور جب زمانہ سب کا سب ازل سے ابد تک اپنے اوقات میں واقع جزئیات پر منقسم اور پھیلا ہوا ہے۔ بغیر اس کے کہ بارگاہِ خالقِ کائنات کے ساتھ کوئی مصلحت عائد ہو۔ بلکہ اصلح اور اولیٰ کی بنیاد پر زمانہ کے مخفی واقعات کے بارے میں وہی ترتیب ہے۔ ظاہر ہونا، مخفی ہونا، پہلے ہونے والا، لاحق ہونے والا، معدوم کرنا اور واجب کرنا یہ سب زمانہ اور زمانہ والوں کی نسبت سے ہے۔ لیکن دربارِ خداوندی کی نسبت سے تو ازل میں ہر شے اپنے وقت میں کسی تغیر و تبدل کے بغیر واقع ہے۔

خلاصۃ الکلام یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے علم ازلی میں ہر حکم کی ایک انتہا ہے۔ لیکن مکلفین اس حد کو نہ سمجھنے کی وجہ سے احوال کے قرائن سے گمان کرتے ہیں کہ یہ حکم ہمیشہ رہے گا۔ جب حضرت شارع سے اس حکم کی انتہا کا بیان آتا ہے۔ اور اس حکم کو زائل کر دیتا ہے تو جانتے ہیں کہ پہلا حکم منسوخ ہو گیا۔ اور دوسرا حکم ناسخ ہوا۔ پس یہ جدت، تبدیلی، تقدم و تاخر صرف کم علم مکلفین کی نسبت سے ہے۔ جبکہ اللہ تعالیٰ کی نسبت سے ہر حکم اپنے وقت مقرر میں ہے، ظہور و خفا کے بغیر اور اس وقت مقرر سے تقدم و تاخر کے بغیر۔ اور یہ معاملہ صرف احکامِ شرعیہ ہی میں نہیں بلکہ حوادثِ عالم میں سے ہر حادثہ میں بھی قسم واقع ہے۔ اور جو شخص پورے نسخۂ وجود کو جو کہ یکے بعد دیگرے واقع ہونے والے بے انتہا حادثوں پر مشتمل ہے،

گہرائی سے مطالعہ کرے' اسے ایک کتاب کی طرح جانے کہ اس کتاب کو پڑھنے والا اس کی ایک سطر پڑھتا جاتا ہے۔ اور کلمہ کے بعد کلمہ اس کی زبان سے نکلتا ہے۔ اور جب کچھ کلمات یا سطریں گزر جاتی ہیں تو کچھ دوسرے کلمات اور سطریں ان کے پیچھے سے پہنچ جاتی ہیں۔ جو گزر گئے' لفظی وجود سے مٹ گئے۔ اور جو پیچھے سے آئے وجود لفظی کی تختی پر ثابت ہو گئے۔ اور یہ محو اثبات ہمیشہ ہوتا رہتا ہے۔ اور اس اعتبار سے اس نسخے کو کتاب المحو والاثبات کہتے ہیں۔ اور اگر اسی نسخہ کو اس کی مجموعی ہیئتوں کے ساتھ کہ حکمت والے علم والے نے اس کی ابتدائی چیزوں اور انتہائی مقامات سے ترتیب دیا' ملاحظہ کرے' تلاوت کا اعتبار کیے بغیر اور ایک کے گزرنے اور دوسرے کے آنے پر نظر کیے بغیر اسے اُم الکتاب کہتے ہیں۔ اور یہیں سے یمحو اللہ ما یشاء ویثبت وعندہ ام الکتاب کا معنی واضح ہوا۔

اور بعض محققین نے اس سب مجموعہ کا نام قضا رکھا ہے۔ اور ظہور تدریجی کو قدر کا نام دیا ہے۔ اور اصطلاح میں کوئی مضائقہ نہیں۔ نیز مسلمان کہتے ہیں کہ تورات مقدس میں مذکور ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کو حق تعالیٰ نے فرمایا تھا کہ اپنی بیٹیوں کا اپنے بیٹوں سے نکاح کردیں تا کہ نسل جاری ہو۔ یقین کے ساتھ معلوم ہے کہ بہن کا بھائی کے ساتھ نکاح دوسری شریعتوں میں شدید حرام ہے تو جب نسخ کا واقع ہونا ثابت ہوا تو اس کے جواز میں اور کیا شبہ باقی رہ گیا۔

یہاں جاننا چاہیے کہ اکثر عوام گمان کرتے ہیں کہ نسخ کی صورت میں بدا لیعنی شروع کرنا لازم آتا ہے۔ اور اس تقریر سے معلوم ہوا کہ بدا اور چیز ہے۔ اور نسخ اور چیز ہے۔ اس لیے کہ نسخ میں مختلف اوقات کے مطابق مکلفین کی مصلحتوں کی تبدیلی ہے نہ کہ حضرت سبحانہ وتعالیٰ پر غیر ظاہر مصلحت کا ظاہر ہونا۔ اور بدا میں غیر ظاہر کا ظاہر ہونا ہے تو ان کے درمیان واضح فرق واضح ہو گیا ہاں نسخ اس وقت بدا کو لازم آتا ہے جب اتحاد فعل' اتحاد وجہ' اتحاد وقت اور اتحاد مکلف سب ثابت ہو جائیں۔ اور اس قسم کا نسخ جو ان چار شرائط کے ساتھ واقع ہو محالات سے ہے۔ اس لیے کہ نسخ میں یا فعل مختلف ہوتا ہے۔ جیسے یوم عید کے روزہ کا

حرام ہونا اس کی نماز کے واجب کرنے کے ساتھ یا وجہ فعل مختلف ہوتی ہے۔ جیسے یومِ عاشورہ کا روزہ مستحب ہونے کی صورت میں یومِ عاشورہ کے روزہ کے ساتھ واجب ہونے کی صورت میں۔ یا یتیم کو تکلیف دینے کی نیت سے مارنے کی حرمت اسے ادب سکھانے کو مارنے کے جائز ہونے کے ساتھ یا وقت مختلف ہوتا ہے۔ جیسے کعبہ کی طرف منہ کرنا بیت المقدس کی طرف منہ کرنے کے ساتھ کہ یہ ایک زمانے میں تھا۔ اور وہ دوسرے زمانے میں یا مکلّف مختلف ہوتا ہے۔ جیسے زکوٰۃ میں یہودیوں پر چوتھائی مال واجب کرنا اور مسلمانوں پر چالیسواں حصہ واجب کرنا اور بنی ہاشم پر مالِ زکوٰۃ حرام کرنا اور ان کے غیر پر اس مال کو حلال کرنا۔ علیٰ ہذا القیاس

دوسرا حکم یہ ہے کہ بعض اصولیوں نے کہا ہے کہ حکم کا نسخ بدل کے بغیر جائز نہیں اس لفظ کی بناء پر کہ نَأْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَا أَوْ مِثْلِهَا۔ اور یہ حق ہے کہ اس لفظ سے یہ معنی سمجھ میں نہیں آتا کیونکہ یہ لفظ صرف دوسری آیت کے وارد ہونے پر دلالت کرتا ہے نہ کہ دوسرے حکم کے وارد ہونے پر۔ کیونکہ ظاہر ہے حضور علیہ السلام سے مناجات کے لیے صدقہ واجب ہونے کی آیت ایک اور آیت سے منسوخ ہوگئی۔ اور اس کے بدلے دوسرا حکم نہ آیا۔ اور اسی طرح روزہ کی رات میں سونے کے بعد کھانے پینے وغیرہ سے رُکنے کا وجوب منسوخ ہوا۔ اور دوسری آیت آئی کہ أُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ إِلَىٰ نِسَآئِكُمْ اور اس کے بدلے میں کوئی دوسری چیز مقرر نہیں ہوئی اور اگر حکم کو اباحت سے عام رکھیں جیسا کہ اصولیوں کی اصطلاح ہے تو ہر نسخ میں ایک بدل متحقق ہوتا ہے۔ اگر اباحتِ اصلیہ کی طرف لوٹتا ہو اور غالب یہ ہے کہ یہ لفظی جھگڑا ہے۔

تیسرا حکم یہ ہے کہ بعض اصولیوں نے حکم کے نسخ کے لیے شرط کی ہے دوسرے حکم سے زیادہ ہلکا ہو نہ کہ زیادہ ثقیل۔ اس لیے کہ اس صورت میں خیریت اور مثلیت متحقق نہیں ہوتی۔ اور اس آیت کا مفاد یہ ہے کہ حکم ناسخ چاہیے کہ خیر ہو یا مثل جبکہ محققین کے نزدیک یہ معنی ضروری نہیں۔ اس لیے کہ عمل کا بھاری ہونا کثرت ثواب کا سبب ہوتا ہے۔ پس خیریت کثرت ثواب کے اعتبار سے ثابت ہوئی اور یہ قطعاً معلوم ہے کہ رمضان کا روزہ رکھنے اور

فدیہ دینے کے درمیان اختیار دینا معین طور پر روزہ واجب کرنے کے ساتھ منسوخ ہوا حالانکہ ناسخ کا حکم منسوخ کے حکم سے زیادہ بھاری ہے۔

چوتھا حکم یہ ہے کہ امام شافعی کے نزدیک اسی لفظ کی وجہ سے کہ نَاْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَا اَوْ مِثْلِهَا کتاب اللہ کا ناسخ کتاب اللہ ہوگی۔اور رسول علیہ السلام کا کلام آیت کتاب سے نہ بہتر ہے۔اور نہ مثل۔اور انصاف یہ ہے کہ نَاْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَا اَوْ مِثْلِهَا دلالت نہیں کرتی مگر اس پر کہ ناسخ کا حکم منسوخ سے ثواب کی کثرت اور رعایت مصلحت کے اعتبار سے بہتر یا اس کی مانند ہوتا ہے نہ یہ کہ وحی متلو ہوتی ہے۔اور حقیقت رسول علیہ السلام پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے اُتارا گیا حکم جیسے بھی ہو متلو ہو یا غیر متلو خدا تعالیٰ کا لایا ہوا ہے۔اور یقین کے ساتھ معلوم ہے کہ الالاوصیۃ لوارث اقربین کی وصیت کا ناسخ ہوا۔اور اس معنی کو مواریث کی آیت سے سمجھنا اس کو واجب نہیں کرتا کہ ناسخ بھی وہی ہے۔کیونکہ ناسخ کی دلالت نئے حکم پر بالکل واضح ہونی چاہیے نہ کہ خفیہ۔

پانچواں حکم یہ ہے کہ دین کے مفسر اور مجتہد کو چاہیے کہ ناسخ اور منسوخ کا علم رکھتا ہو اور اس علم کے بغیر اسے علوم دینیہ میں دخل دینے کا حق نہیں پہنچتا۔کیونکہ اس علم کے بغیر اسے علمِ شرع اور غیر شرع میں امتیاز نہ ہوگا۔کئی دفعہ حکم منسوخ کو شارع کا حکم سمجھ کر فتویٰ دے دے گا اور غلطی میں پڑ جائے گا۔اور اسی لیے ابو جعفر نحاس نے حضرت امیر المومنین علی کرم اللہ وجہہ سے روایت کی کہ آپ ایک دن مسجد کوفہ میں داخل ہوئے' دیکھا کہ ایک شخص وعظ کر رہا ہے' پوچھا یہ کون ہے؟ لوگوں نے عرض کی یہ واعظ ہے کہ لوگوں کو خدا سے ڈراتا ہے۔اور گناہوں سے منع کرتا ہے۔آپ نے فرمایا اس شخص کا مقصد یہ ہے کہ لوگ اس کی طرف انگلیاں اُٹھائیں اس سے پوچھو کہ ناسخ اور منسوخ کو جدا جدا جانتا ہے یا نہیں؟ اس نے کہا مجھے یہ علم حاصل نہیں۔فرمایا اسے مسجد سے باہر نکال دو۔(اقول و باللہ التوفیق اس سے معلوم ہوا کہ آج کل بستر بردار جاہل تبلیغیوں کو مسجد سے نکالنا جائز ہے کہ بد عقیدہ ہیں اور احمقوں کا ریوڑ اور مسائل شرعیہ سے نابلد۔اللہ تعالیٰ ان کے شر سے بچائے۔محمد محفوظ الحق غفرلہ)

اور دارمی نے اپنی مسند میں حضرت حذیفہ بن الیمان رضی اللہ عنہ سے جو کہ رسولِ کریم

علیہ السلام کے راز دار تھے' روایت کی کہ ان سے کسی نے مسئلہ پوچھا اور عرض کی کہ اس کے بارے میں کوئی حکم فرمائیں۔ آپ نے فرمایا فتویٰ اور حکم دینے کے در پے تین میں سے ایک شخص ہوتا ہے: پہلا وہ شخص ہے۔ جو کہ قرآن کے ناسخ اور منسوخ احکام پہچانتا ہے۔ اور اس قسم کا آدمی اس زمانے میں حضرت امیر المومنین عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ ہیں۔ دوسرا وہ شخص ہے۔ جسے قاضی بنا دیا گیا ہو چار و نا چار یہ کام اس کے ذمہ پڑا ہو۔ تیسرا وہ احمق جو تکلف کے ساتھ اپنے آپ کو علماء اور فقیہوں میں داخل کرتا ہے۔ میں پہلی قسم میں سے تو ہوں نہیں۔ اور نہ ہی دوسری قسم سے۔ اور میری طبیعت پسند نہیں کرتی کہ میں تیسری قسم میں ہو جاؤں۔

چھٹا حکم یہ ہے کہ آیت اَمْ تُرِيْدُوْنَ اَنْ تَسْئَلُوْا رَسُوْلَكُمْ كَمَا سُئِلَ مُوْسٰى مِنْ قَبْلُ میں ارشاد ہوا کہ رسل علیہم السلام سے سوال ممنوع اور غیر پسندیدہ ہے۔ حالانکہ رسل علیہم السلام سے سوال اور تفتیش کیے بغیر دین اور ایمان کے مقدمات واضح نہیں ہوتے۔ اور حق کی راہ باطل کی راہ سے جدا نہیں ہوتی۔ اور اُمتیوں کو تسلی و تشفی حاصل نہیں ہوتی۔ پس پیغمبر علیہ السلام سے سوال کو بُرا کیوں قرار دیا گیا اور کنایہ کے طریق سے اس سے کیوں منع فرمایا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ رسل علیہم السلام سے سوال مطلقاً منع نہیں ہے۔ بلکہ احکامِ الٰہیہ کو تبدیل کرنے کا سوال منع ہے۔ جیسا کہ تفسیر میں گزرا۔ ہاں ہر وہ سوال جس کے ضمن یں مقدمات دین میں کوئی خرابی ہو اسی سوال کے ساتھ ملنے والا ہے۔ جیسے رسول علیہ السلام سے حاجت کے بغیر خود ساختہ معجزات کا سوال کرنا جس طرح کہ مشرکین مکہ کہتے تھے کہ لن نومن لك حتى تفجر لنا من الارض ينبوعا اوتكون لك جنة من نخيل و عنب فتفجر الانهار خلالها تفجيرا او تسقط السماء كما زعمت علينا كسفا اوتاتي بالله والملائكة قبيلا او يكون لك بيت من زخرف اوترقى في السماء ولن نؤمن لرقيك حتى تنزل علينا كتابا نقرء ہ (بنی اسرائیل آیت ۹۰ تا ۹۳) یا اس طرح نزولِ وحی کی فرمائش کرنا جس طرح ہم چاہتے ہیں۔ جیسا کہ اہل کتاب کہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا يسئلك اهل الكتاب ان تنزل عليهم كتابا من السماء فقد

سالوا موسیٰ اکبر من ذٰلک فقالوا ارنا اللہ جھرۃ یا مرضی الٰہی کے بغیر نئے گھڑے ہوئے احکام کو مقرر کر لینا جیسا کہ ناواقف مسلمانوں کے ایک گروہ نے کہا تھا کہ یارسول اللہ! (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہمارے لیے بھی ایک درخت مقرر فرمائیں جس میں ہم اپنے ہتھیار لٹکائیں جیسا کہ مشرکین کے لیے ایک درخت ہے۔ جس میں وہ اپنے ہتھیار لٹکاتے ہیں۔ اور انہوں نے اس درخت کو ذات انواط کا خطاب دے رکھا ہے۔

اور یہ قصہ جاہل بنی اسرائیلیوں کے سوال کے ساتھ پوری مشابہت رکھتا تھا کہ کہتے تھے اجعل لنا الٰھا کما لھم آلھۃ یا امورِ غیبیہ جزئیہ جن سے کوئی نفع نہیں کے متعلق سوال کرنا جس طرح کہ بعض ضعیف الایمان لوگ امتحان یا بدگمانی دور کرنے کے لیے پوچھتے تھے کہ میری بیوی سے کیا پیدا ہوگا لڑکا یا لڑکی اور میرا باپ کون آدمی تھا؟ اور فلاں گم شدہ چیز کہاں ہے؟ مختصر یہ کہ جو سوال کہ ممنوع ہے وہ ایسا سوال ہے جو بنی اسرائیل کے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کیے گئے سوالات کے ساتھ ان وجوہ میں سے کسی وجہ کے ساتھ مشابہت رکھے نہ کہ مطلق سوال۔ اور اس قسم کے بے ادبی کے سوالات بے ایمانی کا شائبہ بھی رکھتے ہیں۔

اور اہلِ کتاب جو کہ نسخ آیات اور الفاظ قرآن کے بارے میں بے سروپا شبہات ڈالتے ہیں حقیقت میں ان کا مقصد طلب ہدایت اور اپنے شبہات دور کرنا نہیں تا کہ ان کے ہر سوال کا جواب دیا جائے بلکہ

وَدَّ كَثِيرٌ مِّنْ أَهْلِ الْكِتَابِ اکثر اہلِ کتاب دوست رکھتے ہیں۔ باوجودیکہ کتاب کو جاننے والے ہیں۔ اور گزشتہ انبیاء علیہم السلام کے احوال سے خوب واقف ہیں۔ اور نسخ احکام ان کی کتاب میں بھی موجود ہے۔ جس طرح کہ حضرت آدم (علیہ السلام) کے عہد میں بیٹیوں کی بیٹوں کے ساتھ شادی کرنے کا واقعہ اور اس کا لاحق شریعتوں میں منسوخ ہونا۔ اور جیسا کہ کوئی سی گائے ذبح کرنے کا قصہ جو کہ ان کے بے ہودہ سوالات کی وجہ سے منسوخ ہو کر ایک خاص گائے ذبح کرنے تک پہنچا۔ لَوْ يَرُدُّونَكُم کاش کہ تمہیں شبہات ڈال کر لوٹا دیں۔ مِّن بَعْدِ إِيمَانِكُمْ تمہارے ایمان کے بعد۔ كُفَّارًا کافر کر کے۔ جیسا

کہ اپنی کتاب کے ساتھ خود کفر کرتے ہیں اور تمہاری طرف سے انہیں یہ بُرا مقصد کسی سبب اور محرک کی وجہ سے وقوع پذیر نہیں ہوا بلکہ

حَسَدًا مِّنْ عِنْدِ اَنْفُسِهِمْ حسد کی بناء پر جو کہ ان سے اُٹھتا ہے۔ بغیر کسی وجہ کے اور انہیں تمہارے دین کے بارے میں بھی کوئی شک اور شبہ باقی نہیں رہا تا کہ مشکوک اور شبہ والے دین سے لوٹانا ان کے گمان میں بہتر اور اچھا ہو۔ بلکہ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْحَقُّ اس کے بعد کہ تمہارے دین کی حقانیت ان پر واضح ہو چکی ہے۔ اور ان کی اس شرارت اور بدذاتی کا تقاضا یہ ہے کہ ان سے انتقام کے درپے رہو لیکن تمہیں چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کی خوشنودیوں میں سرگرم عمل رہو۔ اور نفسانیت کو اپنے تک راہ نہ دو۔ اور اللہ تعالیٰ کے حکم کے بغیر ان سے مت اُلجھو۔

فَاعْفُوْا پس ان کے یہ جرائم معاف کر دو۔ اور ان کے بیہودہ شبہات کی طرف کوئی توجہ نہ کرو۔ وَاصْفَحُوْا اور ان کی جنگ، لڑائی اور گالی گلوچ سے درگزر کرو۔ حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اپنا حکم لے آئے۔ جنگ اور لڑائی کے لیے۔ اور یہ گمان مت کرو کہ اللہ تعالیٰ نے اس حکم کی تاخیر عاجزی کی بناء پر کی ہے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ ان کے شر کو ابھی دُور کرنے پر بھی قادر ہے۔ بلکہ

اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ بیشک اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔ اور ان کے شر کو دُور کرنا اللہ تعالیٰ کی قدرت کی نسبت کون سا کام ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کی حکمت اس امر کی تاخیر کا تقاضا فرماتی ہے۔ کیونکہ اگر اس وقت تمہیں اُن کے ساتھ جنگ اور لڑائی کا حکم دے حالانکہ مشرکین عرب خصوصاً مکہ کے رئیس تمہارے ساتھ جھگڑا کرتے ہیں۔ اور عوام الناس کے ذہنوں میں یہ بُرا گمان جگہ پکڑتا ہے کہ یہ آدمی بہت سخت مزاج ہے کہ ہر کسی کے ساتھ جنگ کرتا ہے۔ اور نرمی اور تالیف قلوب نہیں کرتا۔ اور جب عرب کے مشرکین اور مکہ کے رئیس مغلوب ہونے اور لڑنے جھگڑنے کے بعد تمہارے دین میں داخل ہو جائیں یا صلح صفائی کے لیے سلسلہ جنبانی کریں۔ اور تمہارے رسول علیہ السلام کی طرف سے مائل کرنے اور تالیف قلوب کا طریقہ عام خاص لوگوں کے مشاہدے میں آجائے اس وقت تمہارے

ہاتھوں انہیں تنبیہ کرنا اوران سے بدلا لینا زیادہ درست اور مناسب ہے۔اور اگر تمہارا شوق جہاد شدید تقاضا کرتا ہے تو اس وقت تک جہاد نفس میں مشغول رہو۔

وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ اور نماز کو برپا رکھو جو کہ بدن پر بہت گراں عبادت ہے۔اور نفس کو زیر و زبر کرتی ہے۔ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ اور زکوٰۃ دو کیونکہ مال خرچ کرنا نفس پر مشقت بدن سے زیادہ تر بوجھل اور ناگوار ہوتا ہے۔اور اگر تمہیں اس قدر پر قناعت حاصل نہ ہو تو بدنی اور مالی نفلی عبادات بجالاؤ۔ وَمَا تُقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ مِّنْ خَيْرٍ اور جو کچھ تم نیکی اور خیرات کی قسم سے اپنی جانوں کے نفع کے لیے آگے بھیجتے ہو۔

تَجِدُوْهُ عِنْدَ اللّٰهِ ضرور پاؤ گے اللہ تعالیٰ کے ہاں۔اگرچہ بے دین اہل کتاب تمہارے اعمال کو رائیگاں اور ضائع سمجھتے ہیں۔اس لیے کہ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ تحقیق اللہ تعالیٰ اسے دیکھتا ہے جو تم عمل کرتے ہو۔اور تم سے حسن نیت اور شوق اطاعت کو جانتا ہے۔اور اسی کے مطابق تمہیں جزا دیتا ہے۔

حذیفہ بن الیمان اور عمار بن یاسر رضی اللہ عنہما کا یہود کو جواب لا جواب

یہاں جاننا چاہیے کہ اکثر مفسرین نے ان دونوں آیات کے نزول کے سبب کی یوں حکایت کی ہے کہ ایک دن فخاص بن یزید بن قیس اور یہودیوں کی ایک جماعت نے احد کے واقعہ اور اس میں مسلمانوں کو لاحق پریشانی کے بعد حذیفہ بن الیمان اور عمار بن یاسر رضی اللہ عنہما سے کہا کہ دیکھو کیسی آفت آ پہنچی اور ذلت و رسوائی ہوئی' تمہارے سردار قتل کر دیئے گئے۔اگر تم حق پر ہوتے تو تمہیں یہ ہزیمت اٹھانا نہ پڑتی۔پس بہتر ہے کہ تم پھر اسی پرانے دین کی طرف رجوع کرو اور اگر رسول (علیہ السلام) کی پیروی چاہتے ہو تو ہمارے دین میں داخل ہو جاؤ۔کیونکہ ہمارا دین سب سے افضل ہے۔اور مدت دراز ہوئی کہ ہمارے پاس ہدایت آئی۔حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ نے ان کے جواب میں فرمایا کہ میں تم سے پوچھتا ہوں کہ عہد شکنی تمہارے نزدیک کیسی ہے؟ اچھی ہے یا بری؟ انہوں نے کہا کہ عہد شکنی سخت گناہ ہے۔حضرت عمار رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ عہد باندھا ہے کہ جب تک میں زندہ ہوں' ان سے نہیں پھروں گا اور

آپ کا منکر نہیں ہوں گا۔ یہودیوں نے کہا کہ اس شخص نے جواب کی ذمہ داری خوب پوری کی۔ اور حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اگر میرا حال پوچھتے ہو تو میں اپنے خدا پر راضی ہوں کہ وہ میرا پروردگار ہے۔ اور حضرت محمد علیہ الصلوٰۃ والسلام سے راضی ہوں کہ وہ میرے رسول علیہ السلام ہیں۔ اور اسلام سے راضی ہوں کہ وہ میرا دین ہے۔ اور قرآن سے راضی ہوں کہ وہ میرا امام اور پیشوا ہے۔ اس کے بعد مجھے کسی مصیبت اور آفت کی کوئی پرواہ نہیں ہے جب یہ دونوں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں پہنچے اور ماجرا عرض کیا تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ تم نے خوب کہا اور چھٹکارا پایا' اللہ تعالیٰ نے یہ دونوں آیات بھیجیں۔

حسد کی مذمت کا بیان

اور اس آیت میں حسد کی مذمت واقع ہوئی۔ اس لیے کہ دوسرے کے کفر اور ہے گمراہ کرنے کا سبب ہوتا ہے۔ اور حدیث صحیح میں وارد ہے کہ الحسد یا کل الحسنات کما تاکل النار الحطب حسد نیکیوں کو اس طرح کھا جاتا ہے۔ جس طرف آگ ایندھن کو کھا جاتی ہے۔ نیز حدیث پاک میں وارد ہے کہ بنی آدم کی ایک جماعت اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی دشمن ہوتی ہے۔ لوگوں نے پوچھا کہ یارسول اللہ! (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کون بدبخت ہوگا جسے اللہ تعالیٰ کی نعمتوں سے دشمنی ہے؟ فرمایا وہ لوگ جو کہ لوگوں سے حسد کرتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر جو فضل و کرم کرتا ہے' اسے پسند نہیں کرتے۔ اور اس بُری خصلت کی سب سے شدید قباحت یہ ہے کہ علماء میں یہ خصلت زیادہ غلبہ کرتی ہے۔ اس کا راز یہ ہے کہ یہ لوگ اللہ تعالیٰ کی نعمت کی قدر کو زیادہ سمجھتے ہیں۔ اور اس نعمت کے اپنے پاس نہ ہونے اور اپنے غیر کے پاس ہونے سے بہت تکلیف محسوس کرتے ہیں۔ اور ان کی طبیعت حسد کی طرف رغبت کرتی ہے۔

چھ (۶) گروہ حساب کے بغیر دوزخ میں جائیں گے

اور اسی لیے اہل تجربہ نے کہا ہے کہ چھ (۶) گروہ حساب کے بغیر دوزخ میں جائیں

گے۔ حکام ظلم کی وجہ سے۔ تعصب اور ہٹ دھرمی کی وجہ سے' دیہاتی غرور اور تکبر کی وجہ سے تاجر خیانت کی وجہ سے جنگلی اور بادیہ نشین جہالت کی وجہ سے اور علماء حسد کی وجہ سے۔ اور اس کہنے والے کا مقصد یہ ہے کہ یہ بُری خصلتیں ان مذکورہ گروہوں میں زیادہ پائی جاتی ہیں۔ ان میں سے کوئی بھی ان خصلتوں سے خالی نہیں ہوتا الا ماشاء اللہ۔ پس حساب اور حالات پوچھنے کی ضرورت نہیں ہے۔

والدین کے ساتھ حُسنِ سلوک کی فضیلت

اور بنی اسرائیل کی بعض کتابوں میں منقول ہے کہ حضرت موسیٰ علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنے روحانی معراج میں ایک شخص کو سایۂ عرش میں دیکھا جو کہ تجلی الٰہی سے بہت قریب ہے۔ عرض کی بارِ خدایا! یہ شخص کون ہے۔ اور کس عمل کی وجہ سے اس مرتبے کو پہنچا؟ ارشاد ہوا کہ اس کا نام تمہارے سامنے نہیں لیتے لیکن اس کے اعمال سے تین (۳) چیزیں ہماری بارگاہ میں مقبول ہوئیں جس کی وجہ سے ہم نے اسے اس مرتبہ تک پہنچایا۔ پہلی چیز یہ ہے کہ جو نعمت کسی کے حق میں دیکھتا تھا' حسد نہیں کرتا تھا۔ دوسری چیز یہ ہے کہ اپنے والدین سے نافرمانی کا سلوک نہیں کرتا تھا۔ تیسری چیز یہ کہ چغل خوری اور عیب جوئی نہیں کرتا تھا۔

اور حضرت عبداللہ بن عون سے مروی ہے کہ ایک دن وہ فضل بن مہلب کی مجلس میں داخل ہوئے۔ اور فضل بن المہلب ان دنوں واسط کا صوبہ دار تھا۔ اس سے کہا کہ میں چاہتا ہوں کہ تجھے چند چیزوں کے ساتھ پند و نصیحت کروں۔ خبردار رہ تکبر مت کر کیونکہ یہ پہلا گناہ ہے جو جہان میں رونما ہوا۔ اور ابلیس اسی گناہ کی وجہ سے ابدی ملعون ہوا۔ چنانچہ حق تعالیٰ نے اس کے بارے میں فرمایا ہے فَسَجَدَ الْمَلٰٓئِكَةُ كُلُّهُمْ اَجْمَعُوْنَ اِلَّآ اِبْلِيْسَ اِسْتَكْبَرَ وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ۔ نیز اپنے آپ کی حرص اور طمع سے حفاظت کر کیونکہ یہ زمین پر اُترنے کا باعث ہے۔ نیز حسد سے دُور رہ کیونکہ قابیل کا ہابیل کو قتل کرنے کا باعث یہی مذموم خصلت ہوئی۔

حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے کہ کسی پر حسد نہیں کرنا چاہیے۔ کیونکہ وہ شخص اگر جنتی ہے تو مال و دولت' نام اور دنیا کا مرتبہ جنت کے مقابلے میں کیا شے

ہے کہ اس پر حسد کیا جائے۔ جب اسے جنت دیں گے تو یہ چیزیں بھی اگر اسے دے دیں تو
دی ہوں گی۔ اور اگر دوزخی ہے پس اس پر حسد کس طرح کیا جاسکتا ہے۔ کیونکہ ان سب
نعمتوں کا انجام دوزخ ہے۔

حسد کے چار (۴) مرتبے ہیں

علماء نے کہا ہے کہ حسد کے چار مرتبے ہیں' ایک سے ایک اونچا۔ پہلا مرتبہ یہ کہ کسی
سے نعمت کا زوال چاہنا اگر چہ وہ نعمت خود تک نہ پہنچے اور یہ حسد کا سب سے اونچا مرتبہ ہے۔
کیونکہ نیک مسلمان کے حق میں اسی قسم کا حسد کرنا بہت بُرا اور کبیرہ گناہ ہے۔ جبکہ کافر اور
فاسق کے حق میں جو کہ اس نعمت کی وجہ سے کفر اور معصیت پر قوت پکڑتا ہے' جائز اور مباح
ہے۔ دوسرا مرتبہ یہ کہ کسی سے اس نعمت کا اپنی طرف منتقل ہونا چاہے۔ مثلاً کسی کے باغ کے
متعلق چاہے کہ میں مالک ہو جاؤں اور کسی کی عورت کو چاہے کہ میرے نکاح میں ہو اور کسی
کی سرداری مجھے مل جائے یہاں اپنے لیے اس نعمت کا حصول پہلی غرض اور مطلوب بالذات
ہوتا ہے اس شخص سے اس نعمت کا زوال بالتبع مقصود ہوتا ہے۔ اور مسلمانوں کے بارے میں
اس قسم کا حسد بھی حرام ہے۔

تیسرا مرتبہ یہ کہ کسی سے نعمت کا زوال نہ چاہے مگر جب اس قسم کی نعمت کو اپنے لیے
حاصل کرنے سے عاجز ہو جائے تو آرزو کرے کہ کاش یہ نعمت کسی اور کے پاس بھی نہ ہو
تا کہ اسے مجھ پر کوئی فضیلت اور فوقیت نہ رہے۔ چوتھا مرتبہ یہ کہ اس نعمت کا حصول اپنے
لیے چاہے۔ اور اپنے غیر سے اس نعمت کا زوال یا اس نعمت کا اپنی طرف منتقل ہونا قطعاً اس
کے دل میں نہ کھٹکے۔ اور اسے غبطہ اور تنافس کا نام دیتے ہیں۔ اور حسد کا یہ مرتبہ اگر دینی
امور میں متحقق ہو جیسے ایمان' نماز' زکوٰۃ' فی سبیل اللہ خرچ کرنا' پڑھانا' پڑھنا' ارشاد اور
ولایت تو قابلِ تعریف ہے۔ بلکہ بعض اوقات واجب بھی ہو جاتا ہے۔ اور حرام نہیں ہے۔
چنانچہ قرآن مجید میں واقع ہے وفی ذالك فليتنافس المتنافسون اور حدیث صحیحین یعنی
بخاری و مسلم کی حدیث میں وارد ہے لاحسد الافی اثنین رجل اتاہ اللہ مالا فانفقه
فی سبیل اللہ ورجل آتاہ اللہ علما فھو یعمل بہ ویعلم الناس یعنی صرف دو

کے متعلق حسد (رشک) درست ہے۔ وہ شخص جسے اللہ تعالیٰ نے مال عطا فرمایا۔ اور اس نے اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کر دیا۔ اور وہ شخص جسے اللہ تعالیٰ نے علمِ دین عطا فرمایا تو وہ اس پر عمل کرے ہے۔ اور لوگوں کو پڑھائے۔

حسد کے اسباب سات (۷) چیزیں ہیں

نیز علماء نے فرمایا ہے کہ تحقیق کے مطابق حسد کے سات اسباب ہیں۔ پہلی چیز عداوت اور بغض اس لیے کہ آدمی کی جبلت ہے کہ جب اسے کسی کی طرف سے تکلیف پہنچتی ہے تو طبعی طور پر یہ اسے اپنے دل میں دشمن سمجھتا ہے۔ اور اس کے باطن میں کینہ پیدا ہو جاتا ہے۔ اور ہر وقت رشک اور انتقام کی تشفی کا قصد کرتا ہے۔ اور جب اسے اپنی ہمت سے یہ امر میسر نہیں آتا تو چاہتا ہے کہ زمانہ کی گردش اس سے انتقام لے اور اس کی جان اور مال ضائع ہو جائے۔ چنانچہ حق تعالیٰ نے ایسے حاسدوں کے بارے میں فرمایا کہ ان تمسسکم حسنة تسؤھم وان تصبکم سئیة یفرحوا بھا یعنی اگر تمہیں اچھائی پہنچے تو انہیں بری لگتی ہے۔ اور اگر تمہیں برائی پہنچے تو اس سے خوش ہوتے ہیں۔ اور یہی حسد ہے۔ جو کہ باہمی مقابلہ بازی اور جھگڑے کا باعث ہوتا ہے۔

دوسری چیز غرور اور تکبر ہے کہ اس کی وجہ سے اپنے دوست اور ہم نشیں کو اونچے منصب اور بلند مرتبہ پر نہیں دیکھ سکتا ہے۔ پس وہ چاہتا ہے کہ وہ مرتبہ اس سے زائل ہو جائے تا کہ ہم دونوں برابر ہو جائیں اور یہی وہ حسد ہے۔ جس کی وجہ سے کافر کہتے تھے لولا نزل ھذا القرآن علی رجل من القریتین عظیم (الزخرف آیت ۳۱) تیسری چیز یہ کہ ایک آدمی کو دوسروں سے خدمت لینے اور انہیں تابع رکھنے کی عادت ہے۔ اور یہ خدمت لینا اور تابع رکھنا دوسروں سے نعمت زائل ہوئے اور ان کے اس کا محتاج ہوئے بغیر صورت نہیں پکڑتا۔ ناچار ان سے نعمت کا زوال چاہتا ہے۔ جس طرح کے کفار مسلمانوں کی نسبت کہتے تھے اھٰؤلاء من اللہ علیھم من بیننا (الانعام آیت ۵۳) چوتھی چیز کسی کے نعمت حاصل کرنے پر تعجب کرنا کہ اپنی نظر میں اسے اس کے لائق نہیں سمجھتا۔ اس کا باعث ہوتا ہے کہ اس سے یہ نعمت زائل ہو جائے تا کہ تعجب زائل ہو جائے۔ جیسا کہ کفار حضور صلی اللہ علیہ وآلہ

وسلم کے بارے میں تعجب رکھتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا او عجبتم ان جاء کم ذکر من ربکم علی رجل منکم لینذرکم (الاعراف آیت ۶۳) پانچویں چیز اپنے بعض مقاصد کے فوت ہونے کا خوف دوسرے سے نعمت زائل ہونے کی تمنا کا باعث ہوتا ہے۔ جیسا کہ ہر صنعت والوں کو اس صنعت میں شریک لوگوں کے ساتھ ہوتا ہے۔ جیسے ایک شوہر کی عورتیں ایک شہر کے طبیب۔ یا ایک مسجد کے واعظ۔ چھٹی چیز سرداری کی محبت دوسروں کی سرداری کے زوال کی تمنا کرتی ہے۔ اس لیے کہ بے مثل ہونا اور کسی کمال میں منفرد ہونا آدمی کو طبعی طور پر پسند ہے۔ حالانکہ یہ معنی اسے کبھی میسر نہیں ہوتا۔ بلکہ کمالات میں منفرد ہونا حضرت حق سبحانہ وتعالیٰ کی ذات پاک کا خاصہ ہے۔ ساتویں چیز نفس کا کمینہ پن' حد سے زیادہ لالچ اور بے حد بخل کہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا فیض دیکھنے سے ہی طبعی طور پر رنجیدہ ہوتا ہے۔ اور بندوں کی مصیبت اور بدحالی دیکھ کر طبعی طور پر خوش دل ہوتا ہے۔ اور یہ حسد تمام حسدوں سے بدترین ہے۔ حسد کی تمام قسموں سے خدا کی پناہ

اور جب ان ساتوں اسباب میں سے چند چیزیں جمع ہو جائیں تو حسد زیادہ قوی اور وسیع ہو جاتا ہے۔ اور یہودیوں میں اپنے وقت کے رسول علیہ السلام اور ان کے پیروکاروں کے متعلق چند اسباب حسد جمع ہو گئے تھے۔ اور اسی لیے ان کا حسد ان کے جوہر نفس میں پختہ ہو گیا تھا جیسا کہ مِنْ عِنْدِ اَنْفُسِهِمْ کے لفظ سے اس کا اشارہ فرمایا گیا ہے۔

یہاں جاننا چاہیے کہ حسد ایک عالمگیر بیماری ہے کہ بہت کم لوگ اس سے خالی ہوں گے۔ جیسا کہ حدیث پاک میں اس آزمائش کے عام ہونے کا اشارہ آیا ہے جہاں کہ فرمایا مامنا الاویحسد ومامنا احد الاوینظر ولکن اذا حسدت فلا تحقق واذا نظرت فلا ترجع یعنی ہم میں سے کوئی نہیں۔ مگر وہ حسد کرتا ہے۔ اور ہم میں سے کوئی نہیں۔ مگر وہ بُری نگاہ سے دیکھتا ہے۔ لیکن جب تو حسد کرے تو کھوج نہ لگا اور جب ایسی نظر سے دیکھے تو دوبارہ مت دیکھ۔

روحانی مرض حسد کا علاج دو چیزیں ہیں

اور اس روحانی بیماری کا علاج دو چیزیں ہیں: علم اور عقل۔ علم کی دو قسمیں ہیں: اجمالی

اور تفصیلی۔ اجمالی یہ کہ ہر چیز کو اللہ تعالیٰ کے فیصلے اور حکم کے ساتھ جانے اور اس عقیدے کو ذہن میں حاضر رکھے کہ ماشاء اللہ کان وما لم یشأ لم یکن یعنی جو اللہ تعالیٰ نے چاہا' ہو گیا۔ اور جو نہیں چاہا' نہیں ہوا۔ اور سمجھے کہ کسی کو بُرا سمجھنا اور کسی کی خواہش تقدیر کو ٹالنے میں کارگر نہیں ہوتی اور تفصیلی علم یہ ہے کہ حسد کو اپنے ایمان کی آنکھ کا تنکا سمجھے اس لیے کہ حکم الٰہی کو بُرا جاننے اور اللہ تعالیٰ کی تقسیم سے ناراضگی کا سبب بنتا ہے۔ اور اپنی نوع کے بھائیوں کی بدخواہی اس کا لازمہ ہے۔ اور عذابِ دائمی' ہمیشہ کا غم' وسواس اور حواس کا بے سکون ہونا اس کی فوری دولت ہے بغیر اس کے کہ جس سے حسد کرتا ہے۔ اسے دنیا یا آخرت میں کوئی نقصان پہنچے اس لیے کہ دنیا میں حسد کی وجہ سے اس کی نعمت زائل نہیں ہوتی اور دین میں اسے نقصان تو کیا بلکہ عظیم فائدہ پہنچتا ہے۔ اس لیے کہ وہ مظلوم ہو جاتا ہے۔ اور یہ ظالم اور مظلوم کو آخرت میں ظالم کی نیکیوں میں تصرف کا حق دیں گے۔

اور حکماء نے حاسد کا نقصان سمجھانے کے لیے ایک مثال بیان کی ہے۔ اور حق یہ ہے کہ صحیح بات کہی کہ حاسد بالکل اس شخص کی طرح ہے جو اپنے دشمن پر ایک پتھر پھینکے مگر وہ پتھر دشمن تک نہ پہنچے اور واپس اسی کی آنکھ پھوڑ دے۔ اور یہ بے وقوف دوبارہ اس پتھر کو پھینکے اور دوسری آنکھ بھی پھوٹ جائے۔ اور تیسری دفعہ اس کا سر پھوڑ دے۔ اور اس کا دشمن ہر حالت میں محفوظ رہا۔ دوسرے لوگ اس کی بیہودہ حرکات کو دیکھ کر ہنس رہے ہیں۔ اور یہ حسد کا سارا وبال دنیا میں ہے۔ وَالْعَذَابُ الْآخِرَةُ اَشَدُّ وَاَبْقٰی۔

رہا عمل تو اس کا طریقہ یہ ہے کہ جس سے حسد کرتا ہے اس کے بارے میں ایسے کام عمل میں لائے جو سب کے سب حسد کے تقاضا کے خلاف ہوں۔ مثلاً اگر حسد بدگوئی کا باعث ہو تو بدگوئی کے بجائے اس کی تعریف کرے۔ اور اگر تکبر کا باعث ہو تو اس کے سامنے تواضع اور عاجزی کرے تاکہ رفتہ رفتہ محسود اس کا محبوب اور محب ہو جائے۔ اور حسد خود بخود زائل ہو جائے اس لیے کہ محبت حسد کے مادہ کو ختم کرنے والی ہے۔

نیز یہاں جاننا چاہیے کہ حاسد کے دل میں محسود کی طرف سے جو نفرت آتی ہے' وہ ایسی چیز ہے جو اس شخص کے بس میں نہیں ہوتی۔ پس اس نفرت پر عذاب اور سزا بھی واقع

نہیں ہو گی اس لیے کہ لَا یُکَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا۔ اور تکلیف شرعی اس نفرت کی طرف متوجہ نہیں ہے۔ بلکہ حاسد اس کا مکلف ہے کہ اس نفرت کو بُرا جانے اور اس نفرت کو زائل کرنے کے درپے ہو اور اپنے آپ کو اس نفرت کے اظہار سے تکلف کے ساتھ باز رکھے۔ یہاں تک کہ درجہ بدرجہ وہ تکلف طبیعت بن جائے۔

جواب طلب سوال

یہاں جواب طلب سوال باقی رہ گیا اور وہ یہ ہے کہ مسلمانوں کو اس آیت میں خطاب فرمایا گیا ہے کہ فَاعْفُوْا وَاصْفَحُوْا حالانکہ معاف کرنا انتقام پر قادر ہونے کے بعد ہوتا ہے۔ اور اس وقت کافر پورے غلبہ اور دبدبہ میں تھے اس مقام میں عفو ودرگزر کا استعمال کس طرح صحیح ہو سکتا ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ عفو ودرگزر کا حکم مسلمانوں میں سے ہر ایک کے لیے ہر ہر کافر کی نسبت واقع ہے۔ اور مسلمانوں میں سے ہر ہر شخص کے لیے ممکن تھا کہ دوسرے مسلمانوں سے مدد لے کر اس کافر کو سزا دے جو اسے ستانے کا قصد کرے اگرچہ اس کے کفر کے مادے کا خاتمہ نہ کر سکے۔ پس انتقام پر قدرت ثابت تھی۔ نیز مسلمانوں کے غلبہ اور امداد کا وعدہ ہو چکا تھا۔ اور کافروں کا غلبہ اور دبدبہ اللہ تعالیٰ کے سچے وعدوں کی وجہ سے زوال کے کنارے پر تھا۔ پس ان کے اعتقاد میں انتقام پر قدرت ثابت تھی۔ اور وہ یقین سے جانتے تھے کہ ہم جب بھی ان کا مقابلہ کریں گے غالب آئیں گے۔ اگرچہ بظاہر ان کا غلبہ اور دبدبہ ہو اور یہی وجہ ہے کہ دس آدمیوں کو ایک شخص جواب دیتا تھا۔ اور پہلو تہی نہیں کرتا تھا۔

اور بعض مفسرین نے عفو ودرگزر کو اچھے طریقے سے دعوت اور نصیحت بجا لانے' گفتگو میں شفقت اور نرمی کرنے اور سختی اور شدت ترک کرنے پر محمول کیا ہے۔ اور یہ معنی قادر ہونے اور انتقام سے عاجز ہونے کی دونوں صورتوں میں قابلِ تعریف اور اچھا ہے۔ اور اس مقام پر اس کا استعمال بلا تکلف صحیح ہوتا ہے۔ لیکن حَتّٰی یَاْتِیَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ کا لفظ اس سے کچھ انکار کرتا ہے مگر یہ کہ اس امر سے مراد ان کے جھگڑے اور اصرار اور ان کے عناد اور سرکشی کی وجہ سے سختی اور شدت کرنے کا امر ہو اور نرمی اور دل جوئی ترک کرنا ہو۔ واللہ اعلم

اور جب ان دو آیات میں ذکر ہوا کہ اکثر اہلِ کتاب چاہتے ہیں کہ تمہیں تمہارے دین سے برگشتہ کر دیں اور اسی مقصد کے لیے نسخ کا شبہ ڈالتے اور بیہودہ اعتراضات کرتے ہیں اب ان کی اس اندرونی خواہش پر دلیل ارشاد فرمائی ہے کہ

وَقَالُوْا اور تمہیں تمہارے دین سے برگشتہ کرنے کے لیے اہلِ کتاب کہتے ہیں جو کہ یہودی اور نصرانی ہیں لَنْ يَّدْخُلَ الْجَنَّةَ ہرگز جنت میں داخل نہیں ہوگا۔ اگرچہ احکامِ الٰہی کی اطاعت کرے۔ اور تمام رسل علیہم السلام پر فریفتہ ہو۔ اور اپنی عمر عبادت اور بندگی میں صرف کر دے۔ اِلَّا مَنْ كَانَ هُوْدًا مگر وہ جو یہودی ہو۔ اور اپنے اعتقاد اور عمل کو یہودیوں کے طریقے پر درست کرے۔ اور یہ یہودیوں کا مقولہ تھا جو کہ اہلِ کتاب کا پہلا فرقہ ہے۔

لفظ یہود اور نصاریٰ کے معنی کا بیان

اور یہود اصل میں ہائد کی جمع ہے۔ اور لغت میں ہائد توبہ کرنے والے کو کہتے ہیں۔ جیسا کہ سورۂ اعراف میں واقع ہوا کہ اِنَّا هُدْنَا اِلَيْكَ. اور اس وجہ سے کہ بابِ توبہ میں یہودیوں نے ایک سخت ناگوار فعل اپنایا تھا کہ بچھڑا پوجنے کے بدلے اپنے آپ کو قتل کرنے کے لیے پیش کر دیا' ان کا یہ لقب رکھا گیا۔

اد یا کہتے ہیں کہ جنت میں ہرگز نہیں جائے گا مگر وہی جو نَصَارٰی نصرانی ہو یا نصرانیوں کے طریقے کے مطابق اپنے اعتقاد اور عمل کو درست کرے۔ اور یہ نصاریٰ کا مقولہ تھا جو کہ اہلِ کتاب کا دوسرا فرقہ ہے۔ اور نصاریٰ نصران کی جمع ہے۔ جو کہ ناصر کے ہم معنی ہے۔ اور جب حواریوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ عہد باندھا کہ ہم آپ کے دین کے مددگار رہوں گے۔ جیسا کہ سورۂ صف اور دوسری سورتوں میں مذکور ہے اس لقب سے ملقب ہوئے پس اہلِ کتاب جو کہ دو فرقے ہیں' ان دو میں سے ایک بات کہتے ہیں۔ یہودی پہلی بات اور نصرانی دوسری بات۔ تاکہ تمہیں تمہارے دین سے برگشتہ کریں۔ اور تم ان کے کہنے سے دھوکہ کھا کر جنت میں داخل ہونے کے شوق کی وجہ سے ان دونوں طریقوں میں سے ایک کو اختیار کر لو اگر تمہیں یہودیوں کے متعلق اچھا گمان ہوگا تو ان کا

طریقہ اختیار کرلو گے۔ اور اگر نصرانیوں کے متعلق اچھا گمان ہوگا تو ان کا طریقہ اپنا لو گے۔ پس یہاں لفظ او دونوں اقوال کو اہلِ کتاب کے دونوں فرقوں پر تقسیم کرنے کے لیے ہے۔ اور کلام کا مفہوم یوں ہوا کہ اہلِ کتاب ان دو اقوال میں سے ایک کہتے ہیں جس طرح کہ اس صورت میں کہ ایک شہر یا ایک محلے والے کسی مقتول کے قاتل کے تعین میں اختلاف کریں۔ دونوں قول کہے جاسکتے ہیں۔ قال اهل البلدلم یقتله الافلان او فلان۔

اور جو اشکال یہاں وارد ہوتا ہے' زائل ہوگیا۔ اشکال کی صورت یہ ہے کہ اہلِ کتاب میں سے یہ کوئی بھی نہیں کہتا کہ جنت میں داخل نہیں ہوں گے مگر یہودی یا نصرانی کیونکہ یہودی دینِ نصاریٰ کو باطل جانتے ہیں۔ اور نصاریٰ دینِ یہود کو منسوخ شمار کرتے ہیں۔ آیت آئندہ کی دلیل سے کہ وَقَالَتِ الْيَهُودُ لَيْسَتِ النَّصَارٰى عَلٰى شَيْءٍ وَّقَالَتِ النَّصَارٰى لَيْسَتِ الْيَهُودُ عَلٰى شَيْءٍ۔ پس اس کلام کو اہلِ کتاب کی طرف سے نقل کرنا خلاف واقع ہوا۔ ہاں اگر یہود و نصاریٰ آپس میں فروعی اختلاف رکھتے اور ہر ایک دوسرے کو درست اور سچا شمار کرتا جیسا کہ مسلمان مذاہب اربعہ والوں کو جانتے ہیں تو اس مقولہ کی گنجائش تھی۔ لیکن فی الحقیقت ایسا نہیں ہے۔ بلکہ دونوں فریقوں کے درمیان ایک دوسرے کو کافر قرار دینا' گمراہ کہنا اور انکار کرنا اور جھوٹا کہنا ثابت ہے۔ اور اس تفسیر کے مطابق جو کہ گزری اس اُلجھن کا ازالہ یہ ہے کہ لفظ او نصاریٰ کا عطف ہودا پر نہیں ہے۔ تاکہ قول کے مقولہ میں داخل ہو اور خلاف واقع لازم آئے بلکہ قول کے مجموعی مقولہ پر ہے۔ اور جب دونوں اقوال کے درمیان جدائی کا مقام یہی لفظ ہوذ' نصاریٰ تھا۔ اور کلام کے باقی اجزا دونوں اقوال میں مشترک تو اس مشترک کے اعادہ کو تکرار محض جانتے ہوئے گرادیا ہے۔ اور حرف او کو نصاریٰ پر لگادیا جیسا کہ پہلے لکھی گئی مثال میں گزرا پس کلام کی تقدیر یوں ہے کہ وقال اهل الکتاب لن یدخل الجنة الامن کان هودا اوقالوا لن یدخل الجنة الامن کان نصاریٰ اور اس عطف کا نتیجہ ان دونوں کلاموں کو تمام اہلِ کتاب پر تقسیم کرنا ہوا۔ اور وہ واقعہ کے مطابق ہے۔ اس لیے کہ اہلِ کتاب کا ایک فرقہ ایک کلام کرتا ہے۔ اور دوسرا فرقہ دوسرا کلام

اور جمہور مفسرین جو کہ اَوْنَصَارٰی کا عطف ھودًا پر مانتے ہیں اس اشکال سے اس طریقے سے رہائی تلاش کرتے ہیں کہ کلام لف ونشر پر مبنی ہے۔ پہلے انہوں نے یہود و نصاریٰ دونوں فرقوں کو قالوا کی ضمیر میں جمع کر کے لپیٹ لیا اس کے بعد من کان ھودا اونصاریٰ میں انہیں جدا جدا کر دیا لیکن اس توجیہہ میں ایک قوی اُلجھن ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ لف میں جمع کرنا نشر میں بھی جمع کو لازم کرتا ہے پس کہنا چاہیے تھا کہ لَنْ یَّدْخُلَ الْجَنَّۃَ اِلَّامَنْ کَانَ ھُوْدًا وَنَصَارٰی۔ حرف واؤ کے ساتھ نہ کہ حرف او کے ساتھ جیسا کہ لف ونشر کی تمام مثالوں میں اسی طرح واقع ہے۔ مثلاً اس بیت میں کہ

سیب و بہ وانار بہ ترتیب لف و نشر
دل را معدہ وا وجگررا مقوی است

اور اس شعر میں کیف اسلو وانت حقف وعضل وغزال الخطا وقد ھادروفا اور اس آیتِ کریمہ میں ومن رحمتہ جعل لکم اللیل والنھار لتسکو فیہ ولتبتغوا من فضلہ وعلیٰ ہذا القیاس۔ اللھم مگر یہ کہ او کو یہاں واؤ کے معنی میں قرار دیا جائے۔ ہاں ان دونوں میں سے ہر قول کی اس کے معین قائل کی طرف نسبت معین اور اس جمع کی نسبت کی تخصیص سمجھ میں نہیں آتی لیکن ایسے مقام پر سامع تھوڑی سی توجہ سے ہر قول کے قائل کی تخصیص کر سکتا ہے۔ کیونکہ ان دونوں فرقوں میں سے ہر ایک کا دوسرے کو کافر اور گمراہ قرار دینا معلوم ہے۔ اور اس آیت کی مانند ایک اور آیت ہے۔ جو کہ سپارہ کے آخر میں آتی ہے۔ اور وہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے وَقَالُوْا کُوْنُوْا ھُوْدًا اَوْنَصَارٰی تَھْتَدُوْا

حاصلِ کلام یہ کہ مسلمان آدمی کو چاہیے کہ ان کے اس بے دلیل دعویٰ سے دھوکہ نہ کھائے اور جانے کہ

تِلْکَ اَمَانِیُّھُمْ یہ ان کی تمام بے اصل آرزوئیں ہیں۔ اس شخص کی آرزوؤں کی طرح جو کہ تنہائی میں بیٹھ کر اپنے دل کی تسلی کے لیے خیالات باندھتا ہے۔ اور خوش ہوتا ہے۔ اور اگر وہ لوگ اپنی بے وقوفی کی وجہ سے آپ کے سامنے اپنی ان دِلی آرزوؤں کا

اظہار کریں۔ اور اس خواہش کو بطورِ مذہب اور عقیدہ کے بیان کرنا شروع کردیں تو آپ ان کے جواب میں

قُلْ فرمائیں کہ نفی یا اثبات میں ہر مدعی کو اپنے دعویٰ پر دلیل لانا چاہیے۔ ورنہ اس کا دعویٰ باطل اور غیر مقبول ہے۔ پس هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اس دعویٰ پر اپنی واضح دلیل لاؤ' نص الٰہی یا قیاس عقلی سے جو کہ سچے مقدمات سے مرکب ہوا

اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ اگر تم اس دعویٰ میں سچے ہو۔

صیغۂ ھاتوا کی تحقیق

اور ہات اصل میں آت تھا' امر کے صیغہ کے ساتھ بابِ افعال سے جو کہ ایتاء ہے۔ جس کا معنی ہے لانا۔ ہمزہ کو قرب مخرج کی وجہ سے ہا کے ساتھ بدل دیا گیا' ہات ہو گیا۔ اور یہ بدلنا امر کے صیغوں میں مستعمل ہے ہات' ہاتیا' ہاتوا' ہاتی' ہاتیا' ہاتین

اور بعض عربی دانوں نے اس لفظ کو اسم فعل قرار دیا ہے۔ لیکن اس کی فعل کے طریقے پر تصریف اس بات کو ترجیح دیتی ہے کہ فعل ہے اسم فعل نہیں۔

بَلٰى ہاں اتنا تو عقلی اور نقلی دلائل سے ثابت ہے۔ اور تمام اہلِ حق کے نزدیک مسلم کہ مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ جس نے اپنی ذات کو اللہ تعالیٰ کے لیے مطیع کردیا۔ اور اس کی آیات اور احکام کو ہر دور میں اور جس رسول علیہ السلام کی زبان سے بھی اس تک پہنچے' سر آنکھوں پر رکھا اور قومیت کے تعصب اور اپنے قانون پر جھگڑا کرنے کو درمیان میں نہ لایا۔

وَهُوَ مُحْسِنٌ اور وہ شخص نیکوکار بھی ہو۔ نہ کہ افعالِ شنیعہ اور اعمالِ قبیحہ کا مرتکب۔

فَلَهٗ اَجْرُهٗ پس اس کے لیے اس کے نیک عمل کا اجر ہے۔ کہ جنت' اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اور قربِ خداوندی اس اجر کے نشانات سے ہے۔ عِنْدَ رَبِّهٖ اس کے پروردگار کے ہاں کہ اس کی اطاعت کی اور اس کے فرمان کے مطابق کام کیا۔ اگرچہ اس کے مخالفین کے نزدیک اسے کوئی اجر نہ ہو اور وہ اس کے عمل کو ضائع سمجھیں۔

وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ اور اس قسم کے لوگوں پر کوئی ڈر نہیں' ان کے مخالفین کے ڈرانے اور ان کے اعمال کو بے فائدہ سمجھنے کی وجہ سے۔

وَلَاهُمْ يَحْزَنُوْنَ اور نہ ہی وہ غمگین ہوتے ہیں۔ اپنے مخالفین کے طعن و تشنیع اور ان کی بے ہودہ گفتگو سے۔ اس لیے کہ ان کا تعلق اپنے پروردگار سے ہے۔ جو کہ ہر عمل کا قدر دان ہے۔ اور دل کی ہر نیت' ارادے اور عقیدے کو جاننے والا ہے نہ کہ مخلوق کے ساتھ۔ پس اس قسم کے اشخاص خواہ یہودی ہوں یا نصرانی یا ان کے علاوہ سب جنت میں داخلے کے مستحق ہیں۔ اور بہشت میں داخلے کو ایک فرقے یا دین یا آئین کے ساتھ منحصر کرنا بالکل باطل ہے۔ بلکہ کسی دین والوں کے حق میں بہشت کے داخلے کو منحصر کرنا اس وقت ثابت ہوتا ہے۔ جبکہ اس دین کے سوا سب دین منسوخ ہو جائیں۔ اور قیامت تک اس دین کے سوا کوئی اور دین نہ آتا ہو اور جب یہودیت اور نصرانیت میں یہ دونوں اوصاف ثابت نہیں ہیں تو ان کے ماننے والوں میں بہشت کے داخلے کو منحصر جاننا کسی طرح درست نہیں ہے۔

اجر واجب کرنے اور خوف وحزن زائل ہونے کا بیان

یہاں جاننا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے اجر واجب کرنے اور ڈر اور غم کے زائل ہونے کے متعلق دو شرطیں فرمائی ہیں: پہلی شرط اسلام لوجہ اللہ یعنی اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے جھکنا' دوسری شرط احسان یعنی نیک کام کرنا۔ اکثر مفسرین نے پہلی شرط کو عقائد درست کرنے پر محمول کیا ہے۔ اور دوسری کو درستیٔ اعمال پر۔ پس اس آیت کا مفہوم اَلَّذِيْنَ آمَنُوْا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ کا مضمون ہے کہ قرآن مجید میں جگہ جگہ اسی عنوان پر ثواب کا وعدہ مرتب کیا گیا اور دوسرے گروہ نے کہا ہے کہ یہ اسلام' اسلام سے علیحدہ ہے۔ اس لیے کہ اسلام عام کا معنی کلمہ طیبہ کے مضمون کی تصدیق اور اس کا اقرار ہے۔ اور نماز قائم کرنا' روزہ رکھنا' زکوٰۃ دینا اور خانہ کعبہ کا حج کرنا اس حدیث شریف صحیح کے مطابق کہ الاسلام ان تشهد ان لااله الا الله وان محمدا رسول الله وتقيم الصلوٰة وتؤتى الزكوٰة وتحج البيت ان استطعت اليه سيلا وتصوم رمضان جبکہ اس اسلام کا معنی خاص ہے۔

اسلام کا خاص معنی

اور اس کی حقیقت یہ ہے کہ مسلمان آدمی اپنے تمام اعضاء' جوارح اور قوتوں کے

ساتھ اپنے تمام احوال اور حالات میں اپنے پروردگار کے متعلق یقین کامل اور پوری فرماں برداری ظاہر کرے۔ اور یہی وہ اسلام ہے۔ جسے حق تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے چاہا اور وہ اللہ تعالیٰ کا قول ہے اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗۤ اَسْلِمْ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ اور حدیث نبوی علی صاحبہا الصلوٰۃ والتحیۃ المسلم من سلم المسلمون من لسانہ ویدہ میں اسی معنی کا اشارہ ہے۔ اس لیے کہ وجہ بمعنی ذات ہے۔ اور اگرچہ کسی شے کی ذات کے متعلق کبھی گردن، کبھی سر اور کبھی دوسرے اعضاء کے ساتھ بھی تعبیر کرتے ہیں۔ لیکن لفظ وجہ جس کا معنی چہرہ ہے ایک ایسی خصوصیت رکھتا ہے کہ دوسرے اعضاء میں وہ خصوصیت پائی نہیں جاتی۔ اور وہ یہ ہے کہ آدمی کا چہرہ اس کے اعضاء میں سب سے بزرگ ہے۔ اور ظاہری اور باطنی خواس کی کان۔ فکر و تخیل کا سرچشمہ۔ اور اس کی احساس اور تحریک پیدا کرنے والی قوتوں کا مبدا ہے۔ اور بہترین عبادت جو کہ سجدہ ہے اسی عضو سے حاصل ہوتی ہے۔ پس یہ عضو گویا ذات کا خلیفہ اور اس کے قائم مقام ہے۔ جب کوئی اسے کسی کے لئے جھکا دے تو جانا جاسکتا ہے کہ اس نے اپنے تمام اعضاء اور قوتوں کو مطیع کر دیا۔ اور اسلام کا یہ مرتبہ صحیح توکل اور پورے طور پر سب کچھ اسی کے سپرد کر دینے، امید اور خوف اور اپنی محبت اور نفرت کو اللہ تعالیٰ کے حکم کے تابع کیے بغیر صورت نہیں پکڑتا۔

اور اسی طرح یہ احسان بھی معروف احسان سے جدا ہے۔ اور اس کی حقیقت وہی ہے۔ جو کہ جبرئیل علیہ السلام کے سوال والی حدیث پاک میں واقع ہے۔ الاحسان ان تعبداللہ کانک تراہ فان لم تکن تراہ فانہ یراک یعنی عمل کو نیک کرنا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت اس طرح بجالائے کہ گویا تو اسے دیکھتا ہے۔ پس اگر تو اسے نہ دیکھے، وہ خود تجھے دیکھ رہا ہے۔ اور اس کا دیکھنا عبادت کے آداب کا لحاظ کرنے کے بارے میں کفایت کرتا ہے۔ اور اس دیکھنے کو لازم یہ ہے کہ اپنے عمل کو تین خرابیوں سے محفوظ رکھے۔ پہلی نیت کی خرابی کہ اس میں نفسانیت بالکل ملائی نہ جائے، دوسری عمل کی اس صورت کو اختیار کرے جو شرع شریف نے بیان فرمائی اور اپنی طرف سے اس میں کمی بیشی نہ کرے۔ اور اسے مسنون طریقے پر تمام شرائط اور آداب کا لحاظ کر کے ادا کرے۔ اور تیسری عمل سے فارغ

ہونے کے بعد ثواب کے منافی اور اسے ختم کرنے والی چیزوں جیسے گناہ اور خواہشات سے پرہیز کرے۔ اور جب اس نے ایسا کیا تو وعدہ کیے گئے اجر و ثواب کا مستحق ہو گیا۔ اور قبول نہ ہونے کا ڈر اور غم زائل ہو گیا۔

مختصر یہ ہے کہ اس آیت میں اس بات کا اشارہ ہے کہ اس زمانے کے یہودیوں اور نصرانیوں کا حال جنتیوں کے حال کے بالکل مشابہ نہیں ہے۔ اس لیے کہ نہ تو اسلام لوجہ اللہ رکھتے ہیں کہ اس کے ناسخ احکام کو قبول کریں۔ اور پیغمبر وقت علیہم السلام کے شیدائی ہوں اور نہ ہی انہیں احسان عمل کا مرتبہ نصیب ہے۔ کیونکہ انہوں نے اپنی طرف سے نئی شریعتوں کو گھڑ لیا ہے۔ اور شریعت کے مقرر کردہ اطوار کو بدل دیا ہے۔ اور تحریف کی ہے تو جب تک وہ اس حالت پر ہیں' انہیں جنت میں داخل ہونا خام خیالی ہے چہ جائیکہ وہ بالخصوص جنت کے مالک ہوں اور دوسروں کو جنت میں نہ آنے دیں۔ ہاں اگر وہ اپنا طریقہ بدل دیں اور پورے طور پر اللہ تعالیٰ کے احکام کی اطاعت کریں۔ اور اپنے اعمال کو موجودہ شریعت اور پیغمبر زماں علیہ السلام کے فرمان کے مطابق اچھا کریں تو اجر و ثواب پانے میں ضرور کامیاب ہو جائیں۔

اور اہلِ کتاب کے جھوٹے دعووں کو دلیل اور حجت طلب کیے بغیر کس طرح سنا اور قبول کیا جا سکتا ہے۔ جبکہ خود ان کے درمیان دین کے بارے میں ایک دوسرے کو جھوٹا سمجھنا اور انکار کرنا واقع ہے۔

وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ لَيْسَتِ النَّصَارٰى عَلٰى شَيْءٍ اور یہودی کہتے ہیں کہ نصاریٰ کے پاس دین و ہدایت کی کوئی چیز نہیں ہے۔ بلکہ اعتقاد اور عمل میں بالکل گمراہی اور بے راہ روی پر ہیں۔ اس لیے کہ یہودی حضرت عیسیٰ کو رسولِ خدا اور انجیل مقدس کو منزل من اللہ نہیں جانتے۔

وَقَالَتِ النَّصَارٰى لَيْسَتِ الْيَهُوْدُ عَلٰى شَيْءٍ نصاریٰ کہتے ہیں کہ یہود کے ہاں ہدایت اور دین کی کوئی چیز نہیں۔ اس لیے کہ تورات اور احکامِ تورات حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور انجیل کے آنے سے منسوخ ہو گئے اس میں کوئی ہدایت نہ رہی تو اگر ان دونوں اقوال میں

سے ہر قول کو معتبر سمجھا جائے تو تمام اہلِ کتاب درجۂ اعتبار سے گر جاتے ہیں۔ اور یہ کتاب اقتداء کے لائق نہیں رہتی اور ان میں سے ایک قول کو معتبر سمجھا جائے۔ اور دوسرے کو لغو اور ساقط قرار دیا جائے تو ترجیح بلا مرجح لازم آتی ہے۔ اس لیے دونوں فرقے اپنی کتاب کے علم میں برابر ہیں۔ اور ایک کو دوسرے پر ترجیح نہیں۔ وَهُمْ اور وہ سب خواہ یہودی ہوں، خواہ نصرانی يَتْلُوْنَ الْكِتَابَ ایک دوسرے کے مذہب کے باطل کرنے پر دلیل لینے اور اپنے قول پر گواہی لینے کے وقت کتابِ الٰہی کی تلاوت کرتے ہیں تو اگر ایک شخص چاہے کہ صرف اہلِ کتاب کے اقوال کے ساتھ حق کو باطل سے جدا کرے تو ممکن نہیں بلکہ اگر ان کا قول معتبر ہو تو دونوں مذہبوں کا باطل ہونا ثابت ہوتا ہے۔ یہودیوں کا مذہب نصاریٰ کے کہنے اور ان کے دلائل سے اور نصاریٰ کا مذہب یہودیوں کے کہنے اور ان کے دلائل سے۔

اور اسی لیے حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ جب اس آیت کی تلاوت کرتے تو فرماتے صَدَقُوْا وَاللّٰهِ اللہ کی قسم انہوں نے سچ کہا یعنی اس حد تک انہوں نے درست کہا کہ دونوں فرقے ہدایت اور دین پر قائم نہیں ہیں۔ بلکہ ہدایت اور دین کسی دوسرے طریقے میں ہے۔ جو کہ ان دونوں طریقوں سے جدا ہے۔

بہر حال اس باہمی جھوٹ اور انکار کی وجہ سے ان کے اقوال کا کوئی اعتبار نہ رہا بلکہ اگر غور کیا جائے تو انہیں عرب کے جاہلوں اور مشرکینِ مکہ پر بھی کوئی فضیلت اور برتری ثابت نہیں۔ اس لیے کہ

كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ مِثْلَ قَوْلِهِمْ اسی طرح کا بے ہودہ کلام کرتے ہیں، وہ لوگ کتاب کا علم بالکل نہیں رکھتے۔ جیسے بت پرست، آتش پرست اور ستارہ پرست بعینہٖ ان کے کلام کی طرح کسی فرق کے بغیر کرتے ہیں۔ اور جب عالم جاہلوں کی طرح بے دریغ چیخیں تو پھر ان کے اقوال کا کیا اعتبار رہ جاتا ہے۔ کہ کوئی ان کے کہنے سے حق دریافت کر سکے۔ نیز ہر فرقہ کی دوسرے کے حق میں گفتگو خود اس کے نزدیک بھی باطل ہے۔ کیونکہ یہودی جانتے ہیں کہ نصاریٰ پہلے انبیاء علیہم السلام کے بعض اعتقادات کے معتقد ہیں۔ اور تورات کے بعض احکام کو تسلیم کرتے ہیں۔ اور بجالاتے ہیں۔ اور اسی طرح نصاریٰ جانتے

ہیں کہ یہودی بھی اس قسم کے بعض سچے امور کے معتقد ہیں تو ان سے ہدایت اور دین کی مطلقاً نفی جس پر کہ علیٰ شی دلالت کرتا ہے' ہر ایک سے دوسرے کہ بارے میں واقع نہیں ہو سکتی مگر ازرہ تعصب اور تعصب کا یہ مرتبہ بے سمجھ جاہلوں کی خاصیتوں میں سے ہے۔ اور سی لیے بے حد تعصب کی وجہ سے علماء اعتبار کے مرتبہ سے گر جاتے ہیں۔ اور ان کے قول سند نہیں رہتے اور جب اہلِ کتاب کے دونوں فرقے کمال تعصب کی وجہ سے یا بے دریغ باتیں کرنے کی وجہ سے جاہلوں کی طرح ہو گئے۔ اور جاہل شروع سے ہی دلیل و برہان سے آشنا نہیں ہیں تو ان کی راہ سے حق کی معرفت سے مایوسی ہو گئی۔

فَاللّٰهُ یَحۡكُمُ بَیۡنَهُمۡ یَوۡمَ الۡقِیٰمَةِ پس اللہ تعالیٰ اہلِ کتاب کے دونوں فرقوں اور دوسرے جاہلوں کے درمیان قیامت کے دن قطعی فیصلہ فرمائے گا۔ ہر کسی کو اس کے گناہ کے مطابق جزا دے کر فِیۡمَا كَانُوۡا فِیۡهِ یَخۡتَلِفُوۡنَ ان چیزوں میں جن میں وہ دنیا میں اختلاف کرتے تھے۔ جاہل دونوں فرقوں کو باطل جانتے تھے۔ اور اہلِ کتاب جاہلوں کو اور اسی طرح اہلِ کتاب سے ہر ہر فرقہ دوسرے کو کافر اور گمراہ جانتا تھا۔ اور جب حال ایسا ہے تو اہلِ کتاب کا لَنۡ یَّدۡخُلَ الۡجَنَّةَ اِلَّا مَنۡ كَانَ هُوۡدًا اَوۡ نَصٰرٰی کہنا ان کے اسی قول کے ساتھ باطل ہو گیا اس لیے کہ یہودیوں کے قول کے مطابق نصاریٰ جنت میں نہیں جائیں گے۔ اور نصاریٰ کے مطابق یہودی اور جب دونوں اہلِ کتاب ہیں تو دونوں کے اقوال کا اعتبار کرنا چاہیے تو دو نقیضوں کے درمیان اجتماع لازم آیا اور یہ محال محض اہلِ کتاب کے اقوال پر اعتبار کرنے کی وجہ سے لازم آتا ہے تو ثابت ہوا کہ اہلِ کتاب کا قول حق کی تشخیص کے بارے میں معتبر نہیں۔

چند جواب طلب سوالات

یہاں چند جواب طلب سوالات باقی رہ گئے۔ پہلا سوال یہ کہ لفظ علیٰ شی نکرہ ہے' سیاق نفی میں واقع ہوا ہے۔ حالانکہ یہودیوں اور نصرانیوں میں سے ہر ایک کے نزدیک یہ عام نفی درست نہیں۔ اس لیے کہ اگرچہ مخالف کا مذہب باطل ہو لیکن وہ شے میں داخل ہے۔ اور اگر قرینۂ مقام کی وجہ سے شَیۡءٍ کو صحیح اور قابلِ اعتماد و اعتبار شے پر محمول کیا جائے تب بھی

یہ نفی عام درست نہیں ہوتی اس لیے کہ یہودیوں کے بعض عقائد اور اعمال نصاریٰ کے نزدیک اور اسی طرح نصاریٰ کے بعض اعتقادات اور اعمال یہودیوں کے نزدیک درست اور قابلِ اعتماد تھے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ ان سے یہ کلمہ جھگڑے لڑائی کے وقت از رہ تعصب سرزد ہوا تھا بغیر اس کے کہ ان کا مذہب ہو اور اہلِ تعصب اکثر اس قسم کے بے اصل کلمات جو کہ خود ان کے نزدیک باطل اور نادر ہوتے ہیں' کہہ دیا کرتے ہیں۔ ابن اسحاق اور ابن جریر وغیرہم نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے کہ جب نجران کے لوگ جو کہ نصاریٰ تھے' حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ملاقات کے لیے حاضر آئے' یہود کے دانش مند بھی جو کہ حضور علیہ السلام کے قرب و جوار میں رہتے تھے' انہیں دیکھنے کے لیے نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی مجلس میں حاضر ہوئے۔ اور حضور علیہ السلام کے سامنے دین و مذہب کے بارے میں باہمی جھگڑا اور مناظرہ شروع کر دیا۔ رافع بن حرملہ نے جو کہ یہودیوں کے دانش مندوں سے تھا' نصاریٰ سے کہا کہ تم کسی چیز پر نہیں ہو اس لیے عیسیٰ (علیہ السلام) کو رسول مانتے ہو اور انجیل کو کلامِ الٰہی خیال کرتے ہو جبکہ نہ عیسیٰ (علیہ السلام) (معاذ اللہ) رسول تھے۔ اور نہ ہی انجیل کتاب اللہ۔ پس تمہارے مذہب کی بنیاد بوگس ہے۔ نجران کے نصاریٰ میں سے ایک شخص نے کھڑے ہو کر کہا کہ ہمارے نزدیک تمہارے پلے بھی کچھ نہیں۔ کیونکہ موسیٰ (علیہ السلام) کو رسول جانتے ہو اور تورات کو کتابِ الٰہی قرار دیتے ہو نہ موسیٰ (علیہ السلام) (معاذ اللہ) رسول تھے نہ تورات کلامِ الٰہی۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان کی اس گفتگو سے بہت ناراض ہوئے۔ اور فرمایا کہ تم پر تعجب ہے کہ تم میں سے ہر ہر شخص اپنی کتاب کو پڑھتا ہے۔ اور ہر کتاب میں دوسری کتاب اور دوسرے رسول کی تصدیق موجود ہے' اللہ تعالیٰ نے حضور علیہ السلام کے جواب کے مطابق یہ آیت بھیجی۔

اور بعض مفسرین نے یہ مقولہ ہر ہر فرقہ کے مذہب پر محمول فرمایا ہے۔ اور کہا ہے کہ یہودیوں سے ہدایت کی نفی سے نصاریٰ کی مراد یہ تھی کہ اس زمانہ کے یہودی جو کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد دینِ یہودیت پر قائم ہیں' ہدایت کا کوئی حصہ نہیں رکھتے۔ اگرچہ

دینِ یہودیت کے منسوخ ہونے سے پہلے ہدایت یافتہ ہوں۔اور نصاریٰ سے ہدایت کی نفی سے یہودیوں کی مراد یہ ہے کہ یہودیوں سے نصاریٰ کے امتیاز کی وجہ باطل اور بے اصل ہے۔اگر چہ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) اور دیگر گزشتہ انبیاء پر ایمان اور احکام تورات کو قبول کرنا جو کہ یہود و نصاریٰ کے درمیان قدرِ مشترک ہے' صحیح اور درست ہو اور ظاہر ہے کہ ہر فرقہ کی تعریف اور مذمت میں اس فرقہ کے امتیاز کی وجہ کا لحاظ کیا جاتا ہے نہ کہ اس فرقہ اور دوسرے فرقوں کے درمیان قدرِ مشترک کا۔

دوسرا سوال یہ ہے کہ کَذَالِكَ کلمہ تشبیہ ہے۔جو کہ کاف تشبیہ اور ذالك سے جو کہ اسم اشارہ ہے' مرکب ہے۔اور ظاہر ہے کہ مشار الیہ یہاں وہی کلام سابق ہے پس لفظ مِثْلَ قَوْلِهِمْ محض تکرار ہوا۔اس لیے کہ کاف تشبیہ کا ہم معنی ہے۔اور قولهم ذالك کی جگہ ہوا؟

اس کا جواب یہ ہے کہ اس تکرار کو دُور کرنے کے بارے میں دو طریقے ہیں۔پہلا طریقہ یہ کہ مِثْلَ قَوْلِهِمْ کو ذَالِكَ کی تاکید بناتے ہیں۔اس لیے کہ ان کے درمیان موصول اور صلہ آنے کی وجہ سے کافی فاصلہ ہو گیا۔دوسرا طریقہ یہ کہ تشبیہ کے اختلاف پر محمول کرتے ہیں اس کی تفصیل یہ ہے کہ کَذَالِكَ کا مدلول قول کی قول کے ساتھ تشبیہ ہے۔اور مِثْلَ قَوْلِهِمْ کا مدلول مقولہ کے ساتھ تشبیہ ہے یا اس کے برعکس یا وجہ تشبیہ کے مختلف ہونے پر محمول کرتے ہیں اس کی تفصیل یہ ہے کہ کذالك سے مراد فی البطلان والفساد اور مِثْلَ قَوْلِهِمْ سے مراد کو نہ ناشیا عن العداوۃ ہے۔حاصلِ کلام یہ کہ ان دونوں لفظوں کے لانے کا مقصد اس چیز کا بیان ہے کہ انہوں نے اس قول میں چند وجہ کے ساتھ جاہل مشرکینِ مکہ' مجوس اور ہنود کے ساتھ مشابہت اختیار کی جو کہ برحق دینوں کے منکر ہوتے ہیں۔اور اگر اپنے حال پر غور کریں تو حق کے بیان اور انبیاء علیہم السلام کی پیروی سے اپنے کو بہت دُور سمجھیں۔اس لیے کہ بنی آدم کے داناؤں کے اجماع اور تمام ملتوں کے ماننے والوں کے اتفاق کے مطابق مساجد کی تعظیم واجب ہے۔اور اللہ تعالیٰ کے ذکر سے روکنا حرام اور وہ ان دونوں بُرے کاموں کو عمل میں لاتے ہیں۔

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسَاجِدَ اللّٰهِ اور اس شخص سے زیادہ ظالم کون ہے۔جو کہ

اللہ تعالیٰ کی مسجدوں میں جو کہ بلاشرکت غیر سے اس کے گھر ہیں، منع کرتا ہے اَنْ یُذْکَرَ فِیھَا اسْمُہٗ اس سے کہ ان میں اللہ تعالیٰ کے نام پاک کا ذکر کیا جائے۔ خواہ دل سے اور خواہ زبان سے اور خواہ تمام اعضاء کے ساتھ جو کہ نماز سے عبارت ہے۔ اور اس قدر پر اکتفاء نہ کیا بلکہ اس نے چاہا کہ اللہ تعالیٰ کے گھروں کو جڑ سے اُکھاڑ پھینکے وَسَعٰی فِیْ خَرَابِھَا اور ان مسجدوں کو خراب کرنے کی صرف اس تعصب کی بناء پر کوشش کی کہ ان مسجدوں میں ہمارے مخالفین عبادت میں مشغول رہتے ہیں۔ پس اس شخص کا ظلم چند جہتوں سے پُر ہجوم ہوا کہ دوسرے ظلموں میں یہ ہجوم پایا نہیں جاتا۔

ظلم اور اس کی اقسام کا بیان

اوّل یہ کہ ظلم کی بہت سی اقسام ہیں: ظلم مالی، ظلم عرضی، ظلم جانی اور ظلم کا سب سے اونچا مرتبہ یہ ہے کہ کسی کے گھر کو چھین لے۔ اور اسی لیے ظلم کی شدت بیان کرنے کے مقام میں اسی کا نام لیتے ہیں کہ فلاں آدمی فلاں کے گھر پر قابض ہو گیا۔ اور اسے گھر سے نکال دیا اس لیے کہ گھر چھیننے میں گویا شخص کے تمام متعلقات کا چھینا متحقق ہو جاتا ہے۔

دوسری جہت یہ کہ کسی کی چیز چھیننے کے بھی مختلف درجے ہیں۔ عین اس چیز کو غصب کرنا۔ منافع کو غصب کرنا۔ اور غصب کا اعلیٰ مرتبہ یہ ہے کہ اس کے نام کو مقام ذکر میں روانہ رکھیں۔ تیسری جہت یہ کہ غصب کے بعد غاصب کے تصرفات بھی چند قسموں پر ہیں۔ کبھی مالک ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں، کبھی عوض کا دعویٰ کرتے ہیں۔ اور جب غصب کی گئی چیز کو اس کی اصل سے اُکھاڑ پھینکا اور خراب کر دیا تو ظلم کامل ہو گیا۔ اور ظاہر ہے کہ ظلم کی قسموں سے وہی ظلم اُونچا اور بہت بُرا ہے۔ جو کہ اپنے خالق اور منعم کی نسبت سے ہو اور جب وہ اپنے خالق کی نسبت اس قسم کے ظلم کے مرتکب ہوئے ہوں کہ اس کے گھروں کو غصب کر لیں اس کے نام کا ذکر نہ کرنے دیں پھر ان گھروں کو خراب کر دیں اور گرا دیں تو ان سے زیادہ ظالم کوئی نہیں ہو سکتا اور اہلِ کتاب میں سے اس ظلم کے مرتکب نصاریٰ ہوئے کہ یہودیوں کے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو تکلیف دینے اور قتل کا ارادہ کرنے کی وجہ سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اُٹھائے جانے کے بعد یہ حادثہ رونما ہوا۔ نصاریٰ کی ایک جماعت

در پے ہو کر طیطوس رومی کے پاس پہنچی اور اسے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا معتقد بنا کر شام کی طرف لائے' یہودیوں کو قتل کرایا اور یہودیوں کے تعصب کی وجہ سے مسجد بیت المقدس کو جو کہ بلاشبہ حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیٰ نبینا علیہما السلام کی بنائی ہوئی تھی۔ اور اس وقت سے ہمیشہ بنی اسرائیل کے انبیاء کی عبادت گاہ اور ذکرِ خداوندی سے معمور رہی' خراب کر دیا۔ اور اسے گندگی اور کوڑے کرکٹ سے پُر کر دیا۔ اور اسے کوڑے کرکٹ اور گندگی کے ڈھیر میں بدل دیا۔ اور جہاں تورات ملی' جلادی اور اس متبرک مکان کے بدلے اس کے مشرقی مکان کو جو کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی خواب گاہ تھی' عبادت گاہ مقرر کر دیا۔ اور وہ متبرک مسجد اسلام کے پھیلنے کے وقت تک خراب رہی حتیٰ کہ حضرت امیر المومنین عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے اس شہر کو فتح فرمایا۔ اور خود بنفس نفیس اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اس مکان کو نجاستوں سے پاک کیا اور پانی کے ساتھ دھو کر پاک صاف کر کے عبادات اور نماز کا مقام قرار دیا۔

اور جاہلوں میں سے اہلِ مکہ ہوئے جنہوں نے حضور علیہ السلام اور مسلمانوں کو مسجد حرام میں داخل ہونے' وہاں نماز پڑھنے اور اس مقام میں خدا تعالیٰ کا ذکر کرنے سے روکا بلکہ مسلمانوں میں سے جسے دیکھتے تھے کہ وہاں نماز پڑھتا ہے یا ذکر کرتا ہے' اسے مار پیٹ اور گالی گلوچ کے ساتھ تکلیف دیتے اور اگرچہ انہوں نے اس مسجد کی عمارت خراب کرنے میں کوشش نہ کی لیکن اسے ذکر الٰہی سے فارغ کرنے اور معنوی نجاستوں سے جو کہ بت ہیں' ملوث کرنے میں کوشش کرنے والے ہوئے۔ اور در حقیقت مسجد کو خراب کرنا وہی ہے۔ اور اس کے بعد یہی طریقہ کفار کے دوسرے گروہوں ہندوؤں اور مجوسیوں میں رائج ہو گیا کہ اسلام کے شہروں میں سے کسی شہر کی مسجدوں پر غالب آتے ہیں' اذان اور جماعت سے روکتے ہیں۔ اور مسجدوں کو ذکرِ الٰہی کی برکت سے خالی کر دیتے ہیں۔ اور اپنے ذلیل کاروبار وہاں کرتے ہیں۔ اور اگرچہ یہودیوں نے یہ ظلم صریح نہیں کیا ہے۔ لیکن مشرکینِ مکہ کی امداد میں در پردہ وہ بھی اس گناہ کے مرتکب تھے۔ حالانکہ ان تینوں فرقوں کے نزدیک مسجدوں کی اس قسم کی بے حرمتی جائز نہیں ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کے ذکر سے روکنا ہر جگہ قبیح ہے خاص کر

مسجدوں میں جو کہ اسی کام کے لیے بنائی اور مقرر کی گئی ہیں۔ (اقول وباللہ التوفیق یہ بات حضرت مفسر علام قدس سرہ کے دور تک کی ہے جبکہ اس زمانے کے یہودیوں نے تو تخریب مساجد خصوصاً تخریب مسجد اقصیٰ اور بیت المقدس کے آثار مقدسہ کو پریشان کرنے کی حد کردی اور جب سے بیت المقدس ان بدبختیوں کے مکروہ قبضہ میں آیا ہے اس کی حرمت کو قطعاً پامال کیا جارہا ہے۔ اور براہِ راست یہودی یہ ناپاک کام سرانجام دے رہے ہیں) لعنهم الله تعالیٰ وخزلهم۔

بلکہ أُولَٰئِكَ مَا كَانَ لَهُمْ ان فرقوں کے لیے اپنے مذہب اور آئین میں بھی جائز نہ تھا۔ أَنْ يَدْخُلُوهَا کہ خداتعالیٰ کی مسجدوں میں داخل ہوں إِلَّا خَائِفِينَ مگر ڈرتے اور ہراساں ہوتے ہوتے اس سے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ہم سے اس مکان کا حق ادا کرنے اور اس کی تعظیم میں کوئی کوتاہی واقع ہو جائے۔ اور ہم صاحبِ خانہ کے حضور شرمندہ ہوں۔ جس طرح بادشاہوں کے دیوانِ عام اور دیوانِ خاص میں لوگوں کو اسی قسم کا خوف و ہراس ہوتا ہے۔ چہ جائیکہ یہ ظالم سب سے بڑے ظالم قرار پائے۔ اور اگر توحید اور اتباع ملت کے مدعی ہیں تو ان کا کام ان کی گفتار کے خلاف ہوا کیونکہ معبود کی تعظیم اس کی عبادت کی تعظیم کو لازم کرنے والی ہے۔ اور اس کی عبادت کی تعظیم اس کی عبادت گاہ کی تعظیم کو لازم کرتی ہے۔ پس عبادت گاہ کو خراب کرنا انکار عبادت کی دلیل ہے۔ اور عبادت کا انکار معبود کا انکار ہے۔ اور جب ان کا کام ان کی گفتار کے خلاف آیا تو منافقت کا داغ ان پر ثابت ہو گیا۔ اور اہلِ دین کے زمرے سے نکل گئے تو لازماً ان کے اس ظلم کے بدلے میں

لَهُمْ فِي الدُّنْيَا ان کے لیے دنیا میں ہے۔ جو کہ دارالجزاء نہیں۔ لیکن تاکہ دوسرے لوگ عبرت حاصل کریں خِزْيٌ شدید رسوائی۔ قتل کرنے، قید کرنے، جلاوطن کرنے، ان کے قبضہ سے شہروں اور ملکوں کو پکڑنے کے ساتھ اور انہیں ان مقامات متبرکہ میں داخل ہونے سے روکنے کے ساتھ مگر پورے خوف و ہراس کے ساتھ جیسے کہ مشرکینِ مکہ کے حق یہ معنی حضور علیہ السلام کے باسعادت عہد میں واقع ہوا کہ ہجرت کے نویں (۹) سال حضرت امیرالمومنین مرتضیٰ علی کرم اللہ وجہہ نے حضور علیہ السلام کے فرمان پر موسمِ حج میں منادی کی

کہ آج کے بعد کوئی مشرک یہاں نہ آئے اور اگر آئے تو اسے قتل کر دیا جائے گا۔ اور نصاریٰ کے حق میں امیر المومنین عمر فاروق اور امیر المومنین عثمان ذوالنورین رضی اللہ عنہما کی خلافت میں یہی معنی ظاہر ہوا کہ ملک شام ان کے ہاتھوں سے نکل گیا اور بیت المقدس سے پوری رسوائی اور ذلت نکالے گئے۔ اور رفتہ رفتہ بنی اُمیہ اور بنی عباس کے بادشاہوں کے دور میں قسطنطنیہ، عموریہ اور رومیہ بھی ان کے قبضہ سے نکل گئے۔ اور جزائر فرنگیں میں بھاگ کر آوارہ ہوئے۔ اور ان کے حق میں اس دنیا کی رسوائی پر ہی اکتفاء نہیں بلکہ

وَلَهُمْ فِي الْآخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيمٌ اور ان کے لیے آخرت میں جو کہ جزا و بدلہ دینے کا مقام ہے، بہت بڑا عذاب مہیا اور تیار ہے۔ جس کے پہلو میں اس قدر دنیوی رسوائی کسی حساب میں نہیں۔ اور اسی لیے اسے عذاب نہیں کہا جا سکتا لیکن یہ سب ظلم و ستم جو انہوں نے کیا ہے۔ اور کر رہے ہیں اس کا سب وبال ان کی جانوں پر ہے۔ اور باری تعالیٰ کی بارگاہ پاک اس سے بہت بلند ہے کہ کوئی ظلم و ستم کر کے اسے کوئی نقصان پہنچا سکے یا مساجد کو خراب کرنے اور ڈھا دینے سے اس کی عبادت رُک جائے۔ اور اس کے ذکر اور یاد کا گھر ویران ہو جائے اس لیے کہ اس کا کوئی ایک مکان نہیں ہے کہ ایک مکان میں قرار پکڑے اور ٹھہرے اور اس مکان کی خرابی کی وجہ سے دشت غربت میں آوارہ ہو یا ایک مکان میں عبادت اس تک پہنچتی ہے۔ اور دوسرے میں نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی نسبت سے تمام مکان برابر ہیں۔ اور اس کی عبادت ہر جگہ مقبول ہے۔ اور اسی طرح اس روکنے اور خدا کی مسجدوں کو خراب کرنے سے مسلمانوں اور اس کے عبادت گزاروں کو بھی کوئی نقصان نہیں پہنچتا اس لیے کہ اس نے مسلمانوں کے عبادت کرنے کے لیے سب روئے زمین کو مسجد کا حکم دیا ہے۔

فَأَيْنَمَا تو جہاں کھڑے ہو کر **تُوَلُّوا** اپنے چہرے کو اس کی طرف پھیرو اور توجہ کرو **فَثَمَّ وَجْهُ اللَّهِ** پس اسی مکان میں دربارِ خداوندی اور اس کا قرب ہے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ جسم اور جسمانی نہیں ہے کہ اس کا ایک مکان میں ہونا اس کے دوسرے مکان میں ہونے کو مانع ہو جائے۔ اور روحانی مقید بھی نہیں کہ اسے حوصلہ کی تنگی ایک طرف توجہ کرنے کی وجہ سے دوسری طرف توجہ کرنے سے باز رکھے بلکہ

اِنَّ اللّٰہَ وَاسِعٌ تحقیق اللہ تعالیٰ فراخ حوصلہ والا ہے کہ کسی چیز کی فراخی کو اس کی فراخی سے نسبت نہیں۔ اس لیے کہ جسمانیات اور روحانیات میں سے جو چیز بھی حسی یا معنوی فراخی رکھتی ہے اس کی فراخی لازماً کسی نہ کسی قسم کی قید سے مقید ہے۔ جیسے آفتاب کی شعاع تمام وسعت کے باوجود زمین کے مخروط ظلی میں کام نہیں کرتی اور جبریل علیہ السلام کے حوصلہ کی فراخی اس کام میں جو کہ ملک الموت علیہ السلام سے متعلق ہے، کامیاب نہیں ہوتی۔ جبکہ شیون باری تعالیٰ کی وسعت تمام واقعہ اور ممکنہ وسعتوں کو محیط ہے کہ کوئی حد نہیں اور اگر اس کی اس قسم کی فراخی کو تم سمجھ نہیں سکتے ہو تو اس قدر تو تم یقین سے جانتے ہو کہ اللہ تعالیٰ عَلِیْمٌ ہر چھپے اور ظاہر کو جاننے والا ہے۔ تو اگر اس کا ہر جگہ حاضر ہونا تمہاری سمجھ میں نہیں آتا اس کے علم کا ہر مکان میں ہر چیز کا احاطہ تمہیں معلوم ہے۔ اور عبادات قبول کرنے میں اللہ تعالیٰ کا احاطۂ علمی بھی کفایت کرتا ہے۔ کیونکہ دنیا کے بادشاہ ایک مکان میں ہوتے ہیں، اپنے تمام زیرنگیں ملک کے واقعات کو جانتے ہیں۔ اور اپنے اس جاننے کے مطابق ہر کسی کے ساتھ معاملہ کرتے ہیں۔ اور مطیع کی نافرمان سے تمیز کرتے ہیں تو خدا تعالیٰ جو کہ بادشاہوں کا بادشاہ ہے، اپنی تمام مملکت میں اپنی رعایا کے احوال سے کس طرح بے خبر ہوگا۔

چند بحثیں جن کا بیان ضروری ہے

یہاں چند بحثیں باقی رہ گئیں ہیں جن کے درپے ہونا ضروری ہے۔ پہلی بحث یہ ہے کہ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ جو شخص مسجد کو ذکر اور نماز سے معطل کرے۔ اور اس کی ظاہری یا معنوی خرابی کی کوشش کرے، سب سے بڑا ظالم ہے۔ حالانکہ اہلِ شرع کے اجماع کے مطابق کفر و شرک سب گناہوں سے بڑا ہے۔ اور ظلم کا سب سے اونچا مرتبہ ہے جیسا آیت اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِیْمٌ (لقمان آیت ۱۳) میں بھی اسی معنی کا اشارہ سمجھا جاتا ہے۔ پس دونوں میں مطابقت کی وجہ کیا ہوگی؟

اس کا جواب یہ ہے کہ زیادہ ظالم ہونے کے چند معنی ہیں: ایک معنی کے ساتھ شرک اور کافر زیادہ ظالم ہے۔ اس لیے کہ اس نے اپنے آپ کو بھی ابدی ہلاکت میں گرفتار کیا اور اپنے پروردگار کا حق بھی ضائع کیا۔ اور ایک معنی کے ساتھ مانع ذکر اور مخرب مساجد زیادہ

ظالم ہے۔ اس لیے کہ اس نے لوگوں کو سعادت سے محروم رکھا اور معبود کی معرفت کو جہان سے ختم کر دیا۔ مشرک و کافر اگر چہ توحید و نبوت کی معرفت نہیں رکھتے لیکن معرفت معبود کو مانع نہیں ہوتے۔ اور دوسروں کو اس سعادت سے محروم نہیں کرتے بخلاف اس شخص کے۔ پس شخص کے اپنے حال پر نظر کرتے ہوئے شرک و کفر بڑا ہے۔ اور دوسرے لوگوں کے حال کی نسبت سے یہ ظالم اس سے زیادہ اونچا ہے۔ جیسا کہ مخفی نہیں۔ اور اسم تفضیل جو کہ اظلم ہے کے مفہوم میں کسی ایک وجہ سے زیادتی کفایت کرتی ہے' تمام وجوہ اور اعتبارات سے زیادہ ہونا درکار نہیں۔ پس کوئی اختلاف اور تعارض نہیں ہے۔

دوسری بحث یہ ہے کہ جو شخص ذکرِ خدا سے منع کرنے والا ہو اور لوگوں کو دین اور نشانات شرع قائم کرنے سے کسی وجہ سے بھی روکے اس سخت وعید میں داخل ہے۔ ہر مسلمان کو اس امر سے مکمل پرہیز کرنا چاہیے۔ اور اس کام کے ابتدائی عوامل' قریب اور دُور کے اسباب سے پوری احتیاط کرنا چاہیے۔

تیسری بحث یہ ہے کہ لفظ من مفرد ہے۔ اور اشارہ کے مقام پر جمع کا صیغہ لائے جو کہ اُولٰئِكَ ہے' یہ استعمال کس طرح درست ہوگا۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اگر چہ لفظ من مفرد ہے۔ لیکن جمع کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ پس جمع کے صیغے کے ساتھ اس کی طرف اشارہ کرنا صحیح ہوگا۔ اور مقام اشارہ میں جمع کے صیغے کو پسند کرنے میں ایک نکتہ ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ ڈر کا مقام زیادہ تر تنہائی ہوتا ہے۔ اور اجتماع میں خوف کا اتفاق کمتر ہوتا ہے۔ اور جب حالتِ اجتماع میں بھی خوف ثابت ہو جائے تو جانا جا سکتا ہے کہ اس خوف کے اسباب کس قدر قوت اور غلبہ رکھتے ہیں۔

چوتھی بحث یہ ہے کہ لھم کے لفظ کو عذاب عظیم میں لوٹانا اگر چہ اس کی اتنی ضرورت نہ تھی کسی نکتہ کے لیے ہے۔ کیونکہ اگر لَهُمْ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ وَّفِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ فرمایا جاتا تب بھی یہی معنی ہوتا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ لفظ لھم کا مفاد دنیا کی رسوائی اور آخرت کے عذاب عظیم کا ان کے ساتھ خاص ہونا ہے۔ اگر اس لفظ کو دوبارہ لوٹایا نہ جاتا تو معلوم ہوتا کہ دنیا کی رسوائی اور آخرت کے عذاب عظیم کا مجموعہ ان کے ساتھ خاص ہے۔

اوران کا غیر اس رسوائی اور عذاب کا مستحق نہیں ہے۔ اور احتمال رہ جاتا کہ دنیا کی رسوائی اور آخرت کا عذاب عظیم علیحدہ علیحدہ ان کے غیر میں بھی متحقق ہو اور جب اس لفظ کا اعادہ فرمایا تو معلوم ہوا کہ دنیا کی رسوائی اور آخرت کے عذاب عظیم سے ہر ہر ایک مستقل طور پر اور انفرادی طور پر انہیں کے ساتھ خاص ہے۔ دوسروں میں نہ وہ رسوائی پائی جاتی ہے۔ اور نہ وہ عذاب۔ لیکن وہ رسوائی تو اس توہین اور ذلت کا عوض ہے جو خانۂ خدا اور نامِ خدا کے ساتھ وہ اپنے گمان میں عمل میں لائے۔ اگر چہ اس کا اثر اس ذات پاک تک نہ پہنچا اور دوسروں نے اس توہین اور ذلت کا قصد نہ کیا پس وہ اس رسوائی کے مستحق نہ ہوں گے۔ اور رہا وہ آخرت کا عذاب عظیم تو ظلم اور لوگوں کو اس سعادت عمدہ سے محروم رکھنے کا بدلہ ہے جو دوسروں میں ثابت نہ تھا۔

خدا تعالیٰ کی طرف مسجدوں کی اضافت کا بیان

پانچویں بحث یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کی طرف مسجدوں کی نسبت صرف عزت و عظمت دینے کے لیے ہے ورنہ مسجدیں آدمیوں کی بنائی ہوئی ہیں۔ اور مؤذنوں اور اماموں کے ۔نیکی جگہ اور اگر ملکِ الٰہی کی حقیقت پر نظر کی جائے تو تمام جہان اسی کی ملکیت اور مخلوق ہے۔ جیسا کہ آگے فرمایا وَ لِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَ الْمَغْرِبُ پس یہ نسبت صرف تشریف و تعظیم کے لیے ہے۔ جس طرح خانہ کعبہ کو بیت اللہ، حضرت صالح علیہ السلام کی اونٹنی کو ناقۃ اللہ فرمایا گیا اور اس کا راز یہ ہے کہ جہان کے تمام مکانات جہاں میں اللہ تعالیٰ کی ابتدائی ملک یکساں ہے۔ لیکن ان متبرک مقامات میں ابتدائی ملکیت ایک اور ملکیت کے ساتھ مل گئی کہ پہلے ان مکانات کو آدمیوں کی ملک میں داخل کر دیا گیا اور اللہ تعالیٰ کے حکم سے آدمیوں نے ان کے مالک ہو کر اللہ تعالیٰ کی بارگاہ کا قرب حاصل کرنے کے لیے انہیں اپنی ملک سے جدا کر کے اس کی عبادت اور اس کے نام کی یاد کے لیے وقف کر دیا۔ جیسے جانوروں کے درمیان قربانی کا جانور۔ پس یہ مقامات اس وجہ سے جہان کی تمام چیزوں سے ممتاز ہو گئے۔ اور ان میں دوسری جگہوں کے مقابلہ میں اللہ تعالیٰ کی طرف نسبت زیادہ مضبوط اور قوی ہو گئی اس لیے ان مکانات کو تشبیہ کی بناء پر بیوت اللہ اور اللہ کے گھروں کا نام دیا گیا۔

اور یہی وجہ ہے کہ صحیحین کی حدیث میں وارد ہے کہ احب البلاد الی اللہ مساجدھا والبغض البلاد الی اللہ اسواقھا یعنی شہروں کے مکانات میں سب سے پسندیدہ مکان اللہ تعالیٰ کے نزدیک ان کی مسجدیں ہیں۔ اس لیے کہ خدا تعالیٰ کی یاد دِلاتی ہیں۔ اور دل کو اس کی طرف متوجہ کرتی ہیں۔ اور شہروں میں سب سے غیر پسندیدہ جگہ ان شہروں کے بازار ہیں جو کہ اس کی یاد سے ہٹا کر دل کو امورِ دنیا کی طرف لگا دیتے ہیں۔ اور نفسانی خواہشات' کھانے پینے' نفع بخش تجارتوں' بے ریش لڑکوں' عورتوں اور سجی سجائی دُکانوں کی رغبت پیدا کرتے ہیں۔

چھٹی بحث یہ ہے کہ جب مسجدوں کو خراب کرنے والے کے متعلق یہ وعید شدید فرمائی تو مقابلہ کے طور پر یہ بات سمجھی گئی کہ مسجدوں کو آباد کرنے والے کے متعلق اس کے بدلے عدل اور ایمان کا حکم دیں گے۔ چنانچہ آیت اِنَّمَا یَعْمُرُ مَسَاجِدَ اللّٰهِ مَنْ آمَنَ بِاللّٰهِ (التوبہ آیت ۱۸) میں آتا ہے انشاء اللہ تعالیٰ۔ اور اسی لیے حدیث شریف میں وارد ہے کہ اذا رءیتم الرجل یتعاھد المسجد فاشھدو اله بالایمان جب تم کسی شخص کو دیکھو کہ مسجد کی خبر گیری کرتا ہے۔ اور اس مکان متبرک میں بار بار آمدورفت کرتا ہے تو اس کے لیے ایمان کی گواہی دو۔

مسجدوں کی تعظیم میں چند چیزوں کا بیان

ساتویں بحث یہ ہے کہ شرع شریف میں جو کچھ مساجد کی تعظیم میں وارد ہے' چند چیزیں ہیں۔ مسلمان آدمی کو چاہیے کہ ان چیزوں میں سے اپنے میں جس چیز کی طاقت پائے دریغ نہ کرے تاکہ مسجدوں کو خراب کرنے والوں میں داخل نہ ہو۔ بلکہ مسجدوں کو آباد کرنے والوں کی لڑی میں شمار کیا جائے۔ پہلی چیز مسجد میں فرض ادا کرنے کے لیے پیدل جانا خصوصاً تاریکی کے وقت کہ صحیح حدیث کے مطابق گناہوں کا کفارہ ہے۔ نیز حدیث شریف میں ہے کہ جو شخص اپنے گھر میں اچھے طریقے سے طہارت یعنی وضو کر کے مسجد کی طرف صرف فرض ادا کرنے کے لیے متوجہ ہوا۔ اس کا ہر قدم ایک کام کرتا ہے' ایک قدم سے اس کا ایک گناہ گر جاتا ہے۔ اور ایک قدم کی وجہ سے اس کا جنت میں ایک درجہ بلند ہوتا ہے۔

دوسری چیز یہ ہے کہ مسجد کو کوڑے کرکٹ' ناک کے پانی' تھوک اور دوسری طبعی مکروہ چیزوں اور شرعی پلیدیوں سے پاک رکھے۔ اور خوشبو لگا کر معطر کرے۔ اور اس میں تکلف کے بغیر نرم پاک فرش بچھوائے اور حدیث پاک میں ہے کہ مسجد سے خس و خاشاک کو دُور کرنا' اس متبرک مکان میں جھاڑو دینا حورانِ بہشتی کا مہر ہے۔ لیکن اس باب میں احتیاط کرے تا کہ مسجد کو سونے کے پانی سے مزین اور مطلا کرنے اور پھولوں' کلیوں کے ساتھ منقش کرنے اور لاجورد وغیرہ کے ساتھ رنگین کرنے تک نوبت نہ پہنچے اس لیے کہ یہ چیزیں مسجد کو مسجد کے حکم سے نکال کر تماشہ گاہ میں داخل کر دیتی ہیں۔ اور اسی لیے جب حضرت امیر المومنین عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے مسجد مقدس نبوی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والتسلیمات کی عمارت از سر نو تعمیر فرمائی تو آپ نے معمار کو ارشاد فرمایا اکن الناس من المطر وایاك ان تحمر او تصفر لتفتتن الناس یعنی مسجد کی تعمیر کو اس قدر کو مضبوط کرتا کہ بارش ٹپکنے کا خطرہ نہ رہے۔ اور خبردار رہ تا کہ مسجد کو سرخی اور زردی کے ساتھ رنگین نہ کرے کہ لوگ فتنے میں پڑ جائیں گے۔ اور عبادت کے وقت اس دلفریب رنگ اور زیب و زینت والے نقوش میں مصروف ہو جائیں گے۔ اور ان کی عبادت میں کمی ہو جائے گی۔

تیسری چیز یہ کہ جب مسجد میں داخل ہو اگر فرض و سنت کی ادائیگی کا وقت ہو تو بہتر ورنہ دو رکعت تحیۃ المسجد ادا کرے۔ ابو قتادہ رضی اللہ عنہ کی اس حدیث پاک کے مطابق جو کہ صحاح ستہ میں موجود ہے اذا دخل احدکم المسجد فلیر کع رکعتین قبل ان یجلس جب تم میں سے کوئی مسجد میں داخل ہو تو چاہیے کہ بیٹھنے سے قبل دو رکعت ادا کرے اور اگر فرض' سنت اور دوسرے نفل ادا کیے تو اس سے تحیۃ المسجد گر گئے۔ ہاں اگر نماز کے ممنوع اوقات ہوں جیسے عین سورج برابر ہونے کا وقت اور طلوع و غروب کا وقت اجماعی طور پر یا نمازِ فجر اور عصر کے بعد حنفیہ کے نزدیک تو چاہیے کہ قبلہ کی طرف منہ کر کے بیٹھے اور مختصر سی گھڑی میں ذکر اور تسبیح میں مشغول ہو پھر اپنی حاجت کی طرف متوجہ ہو اور اس وقت نماز نہ پڑھے۔

چوتھی چیز یہ ہے کہ جب مسجد میں داخل ہو تو دائیں پاؤں کو پہلے رکھے۔ اور جب باہر آئے تو پہلے بایاں پاؤں رکھے۔ اور حضرت خاتون قیامت فاطمہ زہراء رضی اللہ عنہا کی

روایت میں آیا کہ مسجد میں داخل ہونے کے وقت یہ کہے صلی اللّٰہُ علی محمد وسلم رب اغفرلی ذنوبی وافتح لی ابواب رحمتك اور باہر آنے کے وقت یہ کہے صلی اللّٰہُ علی محمد وسلم رب اغفرلی ذنوبی وافتح لی ابواب فضلك۔

پانچویں چیز یہ ہے کہ نماز کے انتظار کے لیے مسجد میں بیٹھنا عبادت ہے۔ اور اسی طرح نماز ادا کرنے کے بعد ذکر تہلیل اور تسبیح کے لیے

صحیح حدیث میں وارد ہے کہ نماز کے بعد جب تک نمازی اپنی جگہ پر بیٹھا رہتا ہے اس کے حق میں فرشتے یہ دعا کرتے ہیں اللھم اغفرله وارحمه لیکن فرشتوں کی یہ دعا اس وقت تک ہے جب تک کہ اس کا وضو نہیں ٹوٹتا۔

آداب ومکروہاتِ مسجد کا بیان

چھٹی چیز یہ کہ حتی المقدور مسجد میں خرید وفروخت اور دنیا کے دوسرے معاملات جیسے کوئی شے اُجرت پر دینا اور کسی کو کوئی چیز بنانے کا کہنا وغیرہ نہ کرے۔ اور لوگوں کو چاہیے کہ نمازِ جمعہ سے پہلے گروہ گروہ بیٹھ کر دنیا کی باتوں' فضول بیہودہ گفتگو اور حکام اور بادشاہوں کے واقعات بیان کرنے میں مشغول نہ ہوں۔ بلکہ قبلے کی طرف متوجہ ہو کر نماز کی شکل میں بیٹھ کر ذکر میں مشغول رہیں۔ اور گمشدہ چیز کو مسجد میں بلند آواز سے تلاش نہ کریں بلکہ اپنی آواز کو بلاوجہ مسجد میں اونچا نہ کریں۔ اور بے عقل بچوں اور پاگلوں کو مسجد میں نہ آنے دیں اور مسجد میں ہتھیار نہ لائیں اور ہجوم اور اجتماع میں ایک دوسرے کو تنگ نہ کریں۔ اور نہ ہی ضرر پہنچائیں اور خانہ جنگی نہ کریں۔ اور فقیروں کو مسجد میں سوال کرنا حرام ہے۔ اور اگر وہ مسجد میں سوال کریں تو انہیں دینا مکروہ ہے۔ تاکہ اس فعل کے عادی نہ ہو جائیں۔ اور مسجد میں شعر پڑھنا ممنوع ہے مگر وہ شعر جن کے ضمن میں توحید باری تعالیٰ اور نعتِ رسول علیہ السلام ہو یا وعظ ونصیحت پر مشتمل ہوں اور مسجد کے اندر مجرم کو سزا نہ دی جائے۔ اور بلاضرورت مسجد کے اندر سونا مکروہ ہے۔ اور ضرورت کے وقت کوئی مضائقہ نہیں۔ اور مسجد میں تھوکنا گناہ ہے۔ اور اس کا علاج یہ ہے کہ اگر کسی نے یہ غلطی کی تو تھوک کو فوراً مسجد سے باہر پھینکیں اور اس جگہ کو صاف کریں۔ اور زمین سخت نہ ہو تو زمین کھود کر اسے دبا دیں اور

کاریگر کو مسجد میں بیٹھ کر کام کرنا ممنوع ہے مگر وہ جو معتکف ہو اور اسے اپنے پیشے کے بغیر روزی میسر نہیں ہوتی اور مسجد میں غسل کرنا' وضو کرنا اور حجامت اس طرح بنوانا کہ زمین مستعمل پانی سے ملوث ہو یا بدن کے بال اور میل اس میں گریں' ممنوع ہے۔ کچا پیاز اور لہسن کھا کر مسجد میں آنا یا منہ میں حقہ کی بدبو لے کر مسواک کیے بغیر مسجد میں آنا مکروہ ہے۔

ساتویں چیز یہ کہ جہاں مسجد کی ضرورت ہو وہاں مسجد بنانے میں مالی اور جانی امداد کرنا ثوابِ عظیم رکھتا ہے۔ اور اسی طرح اسبابِ طہارت مہیا کرنے میں ثوابِ عظیم ہے۔ جیسے غسل خانہ بنوانا' مسجد کے کنوئیں کی مرمت کرانا' پرنالہ یا طہارت خانے کا چوبچہ جاری کرنا اور بوریا وغیرہ کا فرش مہیا کرنا اور جب تک لوگ وہاں موجود ہیں' چراغ روشن کرنا عبادت ہے۔ اور صحیح حدیث میں اُم المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی روایت سے وارد ہے کہ امر رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وآلہ وسلم ببناء المساجد فی الدور وان تطیب وتنظف یعنی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے محلوں میں مسجدیں بنانے کا حکم دیا۔ اور ان مسجدوں کو پاک صاف رکھنا چاہیے۔ اور انہیں خوشبودار اور معطر رکھنا چاہیے۔

مسلمانوں کے بغیر کسی اور کو مسجد میں مجبوری کے بغیر داخل نہ ہونے دیں

یہاں جاننا چاہیے کہ اکثر فقہاء نے اولئك ما كان لهم ان يد خلوها الا خائفين کے الفاظ سے یہ مسئلہ نکالا ہے کہ غیر اہلِ قبلہ کو خواہ یہودی ہوں' خواہ نصرانی یا مشرکین جیسے ہندو' مجوسی مسجد میں نہیں آنے دینا چاہیے۔ اور یہ مسئلہ نکالنے کی وجہ یہ ہے کہ ایسے مقامات پر خبر نہی کے ہم معنیٰ ہوتی ہے۔ جیسے مَا كَانَ لَكُمْ اَنْ تُؤْذُوْا رَسُوْلَ اللّٰهِ' (الاحزاب آیت ۵۳) وَمَا كَانَ لِلْمُشْرِكِيْنَ اَنْ يَّعْمُرُوْا مَسٰجِدَ اللّٰهِ (التوبۃ آیت ۱۷) اور جب نہی کافر کے متعلق ہو کہ کسی ذمہ داری کے حکم پر یقین نہیں رکھتا گویا وہ نہی ذمہ داری قبول کرنے والوں کے متعلق ہو جاتی ہے کہ وہ اس کافر کو یہ کام نہ کرنے دیں۔ پس کلام کا حاصل یوں ہوا کہ تمہیں جائز نہیں کہ اس قسم کے لوگوں کو مسجد میں داخل ہونے دو مگر اس وقت جبکہ مجبور' بے چارہ' ذلیل اور ڈرتے ہوں جیسے کہ مقدمے' جھگڑے اور قصاص اور حد ثابت کرنے کے وقت اس صورت میں جبکہ قاضی مسجد بیٹھا ہو اور اسی لیے امام مالک

رحمتہ اللہ علیہ اس مستنبط حکم کے مطابق عمل کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ کسی کافر کو مسجد میں داخل کرنا جائز نہیں۔ اور امام شافعی رحمتہ اللہ علیہ اس حکم کو مسجد حرام کے ساتھ خاص کرتے ہیں۔ اور اس مسجد مبارک میں کسی بھی کافر کو آنے نہیں دینا چاہیے۔ اور دوسری مسجدوں میں اگر مسلمان کسی مصلحت اور حکمت کے لیے اسے اندر آنے دیں تو کوئی مضائقہ نہیں۔

اور امام اعظم رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ کافروں کا سب مسجدوں میں آنا درست ہے۔ اس لیے کہ سید عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سعادت والے زمانے میں مہمانوں کو اگرچہ کافر ہوتے' مسجد میں ٹھہراتے تھے۔ جیسا کہ بنو ثقیف کے وفد کو اور دوسرے وفدوں کو۔ نیز تواتر سے معلوم ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ملاقات کے لیے یہود و نصاریٰ اور مشرکین اذن و اجازت طلب کیے بغیر مسجد میں آتے جاتے تھے۔ اور بیٹھتے تھے۔ اور ثمامہ بن اثال حنفی کو کفر کی حالت میں حضور علیہ السلام نے مسجد کے ستونوں میں سے ایک ستون کے ساتھ بندھا رہنے دیا تھا۔ اور حضور علیہ السلام کے اس ہمیشہ کے عمل کا ناسخ وارد نہیں ہوا۔ اور اس معنی پر اس آیت کی دلالت واضح نہیں ہے۔ کیونکہ تفسیر میں گزرا کہ آیت مذکورہ کا معنی اور ہے۔ جو کہ سیاق وسباق کے ساتھ زیادہ موزوں ہے۔ پس اس احتمالی معنی کی وجہ سے حضور علیہ السلام کا ہمیشہ کا عمل کس طرح منسوخ کیا جاسکتا ہے۔ نیز اس معنی پر الاخائفین کا استثناء ایک تکلف چاہتا ہے۔ جیسا کہ ظاہر ہے۔ (اقول وباللہ التوفیق۔ متاخرین کے مطابق کفار کو مسجدوں سے دور رکھنا چاہئے تاکہ عوام کے دلوں میں ان کے متعلق نفرت پیدا ہو۔ اور انما المشرکون نجس سے بھی اشارہ ملتا ہے۔ حضور سیّد عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے معمول شریف کا حوالہ ایک وقتی مصلحت کا آئینہ دار ہے۔ ابھی کچھ صفحات پہلے آداب عبد کے عنوان میں گزرا کہ بے عقل بچوں اور پاگلوں کو مسجد میں نہ آنے دیں۔ اور کفار بہرحال ان سے زیادہ لایعقل اور غیر ذمہ دار ہیں۔ اور ان کا ناپاک ہونا بھی یقینی نہیں۔ محمد محفوظ الحق غفرلہ)

آٹھویں بحث یہ ہے کہ آیت وَلِلّٰہِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ الخ اگرچہ مسلمانوں کی تسلی اور دلجمعی کے لیے اُتری ہے۔ تاکہ کافروں کے انہیں متبرک مساجد جیسے مسجد حرام اور

مسجد بیت المقدس سے روکنے اور ان نورانی مقامات کو خراب کرنے کی وجہ سے وہ رنجیدہ نہ ہوں اور عبادت میں بے ذوق نہ ہوں لیکن جب اس آیت سے یہ فائدہ نکلا کہ اللہ تعالیٰ کی نسبت سے سب مکانات برابر ہیں۔ اور اس سے لازم آیا کہ اس کی نسبت سے تمام طرفین بھی برابر ہوں گی اس لیے کہ طرفین حقیقت میں مکانوں کی اطراف ہیں۔ اور اس کی عبادت جس طرح ہر مکان میں مقبول ہے۔ اسی طرح جس طرف بھی توجہ ہو عبادت کے صحیح ہونے میں کفایت کرے۔ اور نماز میں قبلہ کی سمت معین ہونے کی وجہ سے یہ لازم بظاہر محال معلوم ہوتا ہے۔ اس لیے مفسر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اس لازم کو صحیح کرنے میں چند صورتیں بیان فرمائی ہیں۔ پہلی صورت یہ کہ استقبال قبلہ کا اصل اطاعت میں جو کہ اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہونا ہے کوئی دخل نہیں ہے۔ بلکہ اس استقبال کا حکم صرف عوام کے ذہنوں میں توجہ درست کرنے اور مقرر و محدود کرنے کے لیے ہے۔ پس ایک سمت سے دوسری سمت کے ساتھ استقبال کے منسوخ ہونے کی وجہ سے جیسا کہ بیت المقدس سے کعبہ کے ساتھ واقع ہوا۔ عبادت اور اطاعت کے حال کی تبدیلی کا موجب نہیں ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ جب ایک شخص تاریک رات میں گمان اور انداز کے ساتھ کسی سمت کو کعبہ معظمہ کی جہت جان کر اس کی طرف منہ کرے۔ اور اس کی طرف نماز ادا کرے۔ اور اس کے بعد ظاہر ہوا کہ وہ کعبہ کی سمت نہ تھی وہ ادا کی ہوئی نماز درست ہے۔ اور اس نماز کا اعادہ لازم نہیں آتا اور حضور علیہ لسلام نے اس حکم کو اسی آیت سے نکال کر لوگوں کو اس کا پتہ دیا حتیٰ کہ اس وقت کے اکثر حاضرین نے بھی گمان کیا کہ یہ آیت اسی مقدمہ میں نازل ہوئی ہے۔

جیسا کہ سنن ترمذی اور ابن ماجہ میں عبداللہ بن عامرۃ بن ربیعہ کی روایت سے وارد ہے کہ ہم ایک غزوہ کے سفر میں حضور علیہ السلام کے ہمراہ تھے۔ اور رات کا وقت تھا۔ اور وہ رات بہت تاریک تھی کہ ستارے تک نظر نہیں آتے تھے اس منزل میں قبلہ کی سمت معلوم نہیں ہوتی تھی لوگوں نے اندازے سے ایک طرف منہ کر کے نماز ادا کی اور اس سمت کے نشان کے لیے لکیریں کھینچ دیں اور ان لکیروں پر پتھر رکھ دیئے جب صبح روشن ہوئی ہم نے معلوم کیا کہ وہ تمام لکیریں سمت قبلہ سے پورے طور پر بدلی ہوئی تھیں۔ ہم نے ماجرا حضور صلی اللہ

علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا اور شکایت کی کہ یا رسول اللہ! (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہم سب نے غلطی سے غیر قبلہ کی سمت نماز پڑھی۔ اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل کی اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ تمہاری نماز درست اور مقبول ہوئی۔

اور دار قطنی نے اس قسم کا واقعہ جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے بھی روایت کیا ہے۔

تیسری صورت یہ ہے کہ قدیم مفسرین کی ایک جماعت نے کہا ہے کہ قبلہ کے تعین سے پہلے لوگوں کو اختیار تھا جس سمت چاہتے تھے' نماز ادا کر لیتے تھے۔ اور بعد میں یہ حکم منسوخ ہو گیا لیکن اس اختیار دینے کی سند صحیح روایات کی رو سے ثابت نہیں ہوتی اور محض احتمال ہے۔ ہاں قتادہ اور عبدالواحد بن زید نے کہا ہے کہ شب معراج کے بعد استقبال بیت المقدس اور کعبہ میں مسلمانوں کو اختیار دے دیا گیا تھا کہ ان دونوں مکانوں میں سے ہر ایک کی طرف توجہ جائز تھی۔ اور اس کے بعد یہ اختیار بھی منسوخ ہو گیا۔

چوتھی صورت یہ ہے کہ اس آیت کا مدلول نوافل پڑھنے والے مسافر کے ساتھ خاص ہے کہ اگر سواری پر نفل پڑھتا ہے اس کی سواری جس طرف بھی متوجہ ہو اس کی نماز درست ہے۔ اور حضور علیہ السلام نے بھی سفروں میں اس طرح نماز ادا فرمائی ہے۔ جیسا کہ صحیحین اور دوسری صحاح ستہ میں مروی ہے۔ (اقول وباللہ التوفیق۔ اس سے معلوم ہوا کہ دورانِ سفر نوافل ادا کرنا جائز بلکہ مسنون ہے۔ لیکن آج کے بعض ناعاقبت اندیش نوافل تو کیا سنن موکدہ ادا کرنے کو بھی درست قرار نہیں دیتے۔ یہی وہ لوگ ہیں جو خود تو گمراہ تھے ہی عوام کو بھی گمراہ کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کے شر سے بچائے۔ محمد محفوظ الحق غفرلہ)

پانچویں صورت یہ ہے کہ بیہقی اور ابن ابی شیبہ نے حضرت امیر المومنین عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ کسی نے آپ کے پاس یہ آیت تلاوت کی وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ آپ نے فرمایا اس کا معنی یوں ہے کہ ما بین المشرق والمغرب قبلہ اذا توجھت قبل البیت یعنی جب تو بیت اللہ کی طرف منہ کرے تو مشرق ومغرب کے درمیان قبلہ ہے۔ اور یہ تصویر مدینہ منورہ میں درست بیٹھتی ہے۔

اور ترمذی اور دوسری صحاح میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت سے مرفوعا

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے وارد ہے کہ فرماتے تھے ما بین المشرق والمغرب قبلة۔ پس اس آیت کا خلاصہ اس بات میں وسعت دینا ہے کہ علی التخصیص عین کعبہ کی طرف منہ کرنا ضروری نہیں ہے۔ بلکہ کعبہ کی سمت بھی کفایت کرتی ہے۔

چھٹی صورت یہ ہے کہ بعض باریک بینوں نے کہا ہے کہ جس مقام پر مقاطر مکہ ہیں وہاں جس طرف بھی اپنا منہ متوجہ کرے' استقبالِ قبلہ حاصل ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ فن ہیئت جاننے والوں پر پوشیدہ نہیں۔

ساتویں صورت یہ ہے کہ اس آیت کا مضمون اس شخص کے بارے میں ہے جو خانہ کعبہ کا مشاہدہ کر رہا ہے۔ جس سمت سے بھی چاہے' خانہ کعبہ کی طرف متوجہ ہو سکتا ہے۔

آٹھویں صورت یہ ہے کہ اس آیت کا نزول دعا کے حق میں ہے نہ کہ نماز کے بارے میں جیسا کہ حسن بصری اور ضحاک سے مروی ہے کہ جب آیت اُدْعُوْنِیْٓ اَسْتَجِبْ لَکُمْ اُتری' لوگوں نے پوچھا کہ ہم کس سمت منہ کر کے دعا مانگیں؟ ان کے جواب میں یہ آیت اُتری' اسے ابن جریر نے ابن المنذر نے انہوں نے مجاہد سے روایت کیا۔

نویں صورت یہ ہے کہ اس آیت کا نزول عبادت کے حق میں نہیں ہے۔ بلکہ گریز اور فرار کے حق میں ہے۔ اور لفظ تولوا کا خطاب ان لوگوں کے لیے ہے۔ جو کہ ذکرِ خدا سے منع کرتے ہیں۔ اور مسجدوں کو خراب کرنے میں کوشش کرتے ہیں۔ اور مراد یہ ہے کہ اگر تم چاہو کہ دنیا کی رسوائی اور آخرت کے عذاب سے بھاگ دوڑ کر بچ جاؤ تو تمہارے لیے یہ ممکن نہیں۔ اس لیے کہ زمین کا مشرق و مغرب اللہ تعالیٰ کے تصرف میں ہے۔ جس طرف بھی بھاگ کر جاؤ گے' دنیا کی رسوائی اور آخرت کا عذاب جو کہ تمہارے حق میں خدا تعالیٰ کا مقرر کیا ہوا ہے' تمہارے سامنے آ جائے گا۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ وسیع تصرف اور قدرت والا ہے۔ اور اس کا علم ہر مکان کو محیط ہے۔ اس لیے بھاگا نہیں جا سکتا۔

مختصر یہ کہ اہلِ کتاب کے دونوں فرقے جو کہ یہود و نصاریٰ ہیں۔ اور دوسرے باطل فرقے جیسے مکہ کے جاہل' ہندو اور مجوسی اس قسم کے ظلم کا ارتکاب کرنے کے باوجود جو کہ ظلم کی سب سے شدید قسم ہے' جنت میں داخل ہونے کا استحقاق نہیں رکھتے چہ جائیکہ ان کے سوا کوئی

جنت میں نہ جائے۔ اور جنت خاص انہیں کا حصہ ہو اس لیے کہ وہ اپنے پروردگار کے بارے میں سب وشتم کا دستور رکھتے ہیں۔ اور یہ ایک ایسا ظلم ہے۔ جو کہ شناعت میں پہلے ظلم سے بھی زیادہ اونچا ہے۔

وَقَالُوْا اوران سب نے کہا۔ خواہ یہود ہیں خواہ نصاریٰ خواہ مشرکین عرب جن کے متعلق اس سے پہلے اَلَّذِیْنَ لَا یَعْلَمُوْنَ کے ساتھ تعبیر کی گئی اِتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا اللہ تعالیٰ نے اپنے لیے اولاد بنائی ہے۔ یہودی کہتے ہیں کہ عزیر خدا کا بیٹا ہے (نعوذ باللہ) اور نصاریٰ کہتے ہیں کہ عیسیٰ (علیہ السلام) پسر خدا ہے (نعوذ باللہ) اور مشرکین عرب کہتے ہیں کہ فرشتے (نعوذ باللہ) اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں ہیں۔ کیونکہ خدائی کے کام کرتے ہیں۔ اور کسی کو نظر نہیں آتے اگر بیٹے ہوتے تو پردہ نشینی اختیار نہ کرتے۔ اور اولاد حاصل کرنے میں اگرچہ جانورں اور آدمیوں میں کوئی عیب نہیں ہے کہ آدمیوں میں سے کسی کے ساتھ اس کی نسبت کرنا سب وشتم ہو لیکن حضرت باری عز شانہ کے بارے میں بہت بڑا عیب ہے۔ اور بہت قبیح گالی ہے۔ جیسا کہ فراش ہونا عورتوں کے حق میں عیب نہیں ہے۔ اور مردوں کے حق میں گالی ہے۔

اسی لیے صحیح بخاری اور دوسری صحاح میں ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت سے حدیث قدسی میں آیا کہ حق تعالیٰ نے فرمایا ابن آدم مجھے جھوٹ کی تہمت لگاتا ہے۔ اور یہ اس کے لائق نہ تھا۔ ابن آدم مجھے گالی دیتا ہے۔ اور یہ ہرگز اس کے لائق نہ تھا۔ رہی جھوٹ کی تہمت تو اس طرح کہ کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ مجھے پھر آخرت میں زندہ نہیں کرے گا اگرچہ اس نے مجھے پہلے پیدا کیا حالانکہ پہلے پیدا کرنے کے مقابلہ میں دوبارہ پیدا کرنا مجھ پر زیادہ دشوار نہیں ہے۔ تاکہ اس کے دل میں یہ شبہ اور جھٹلانے کا خیال پیدا ہو۔ رہی گالی تو اس طرح کے وہ کہتا ہے کہ میرا پروردگار اولاد رکھتا ہے جانوروں اور آدمیوں کی طرح۔ حالانکہ میں بے مثل خدا اور بے نیاز ہوں' نہ میری اولاد ہے۔ اور نہ میں کسی کی اولاد ہوں' نہ کوئی میرا ہمسر ہوسکتا ہے۔

قول مذکور کے بطلان پر حدیث قدسی سے پانچ دلائل

اور اس حدیث قدسی میں پانچ دلیلوں کے ساتھ اس قول کے باطل ہونے کا اشارہ

ہے۔ پہلی دلیل احدیت اور یگانگی جو کہ بعضیت اور جزئیت کے منافی ہے۔ اور اولاد والد سے نطفہ جدا ہوئے بغیر نہیں ہوتی۔ دوسری دلیل صمدیت اور بے نیازی جو کہ احتیاج کے منافی ہے۔ اور صاحبِ اولاد ہونا احتیاج کا تقاضا ہے۔ اس لیے کہ ایک شخص کے لیے بڑھاپے کی حالت میں یا موت کے بعد یا سفر یا بیماری کی وجہ سے غیر حاضر ہونے کے وقت کوئی دوسرا چاہیے کہ اس کا قائم مقام ہو اور جسے احتیاج نہ ہو یا اسے موت فوت' غیر حاضری' سفر' کمزوری' عاجزی اور بڑھاپا لاحق نہیں ہوتا' اولاد سے بے نیاز ہے۔ جیسے آسمان' زمین اور ستارہ' تیسری دلیل لم یلد ہے۔ اس لیے کہ اولاد کے پیدا ہونے میں والد کا ایک حال سے دوسرے حال میں بدلنا ہے۔ اور جو قدیم ہے۔ اور تغیر سے بالکل بَری ہے اسے تولد کا کیا امکان؟ چوتھی دلیل لَمْ يُوْلَدْ ھے۔ اس لیے کہ جو جنتا ہے لازماً جنا گیا بھی ہوتا ہے۔ یا جنے گئے کے حکم میں۔ جیسے حضرت آدم وحوا کہ زمین سے پیدا ہوئے۔ اور جب کوئی کسی چیز سے پیدا نہ ہوا ہو اس سے دوسری چیز جدا ہو کر کیسے پیدا ہو۔

پانچویں دلیل وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ہے۔ اس لیے کہ اولاد کی حقیقت زوج یا زوجہ کے بغیر ممکن نہیں۔ اور زوج' زوجہ کا ہمسر ہوتا ہے۔ اور زوجہ' زوج کی ہمسر۔ نیز ہر بیٹا باپ کا ہمسر ہوتا ہے۔ تو جس کا ہمسر نہ ہو اولاد بھی نہیں رکھتا۔

اور تحقیق کے مطابق معنائے خدائی کی تصدیق جو کہ یکتائی کا تقاضا کرتا ہے اس خیال سے مانع کافی ہے۔ اسی لیے عقلمندوں کو یہ باطل عقیدہ سنتے ہی عظیم حیرت ہوتی ہے۔ اس لیے کہ ان کی عقل میں یہ بات نہیں آتی کہ آدمی اس عقل کے باوجود جو اسے حاصل ہے ایسی بیہودہ گفتگو کس طرح کر سکتا ہے اسی بناء پر قرآن مجید میں جگہ جگہ اس بیہودہ بات کو نقل کرنے کے بعد اس قول کے بہت بڑا اور بہت بُرا ہونے کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے۔ حتیٰ کہ سورۂ مریم میں فرمایا ہے تَكَادُ السَّمٰوٰتُ يَتَفَطَّرْنَ مِنْهُ وَتَنْشَقُّ الْاَرْضُ وَتَخِرُّ الْجِبَالُ هَدًّا اَنْ دَعَوْا لِلرَّحْمٰنِ وَلَدًا وَمَا يَنْبَغِيْ لِلرَّحْمٰنِ اَنْ يَّتَّخِذَ وَلَدًا (مریم آیت ۹۰ تا ۹۲) یعنی قریب ہے کہ اس سے آسمان پھٹ جائیں' زمین شق ہو جائے۔ اور پہاڑ ڈھ کر ریزہ ریزہ ہو جائیں کہ انہوں نے رحمٰن کے لیے بیٹے کا دعویٰ کیا حالانکہ رحمٰن کے

شایانِ شان نہیں کہ اس کا بیٹا ہو۔

اور صحیحین میں ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ خدا تعالیٰ سے زیادہ صبر کرنے والا کوئی نہیں کہ خود سنتا ہے کہ لوگ اس کے بارے میں اولاد بیٹے اور بیٹیاں ثابت کرتے ہیں۔ پھر انہیں رزق دیتا ہے۔ اور عافیت کے ساتھ رکھتا ہے۔ اور ابن ابی حاتم اور ابن المنذر اہلِ شام میں سے ایک شخص کی روایت سے لائے ہیں کہ اسے کسی سے یہ خبر پہنچی کہ زمین اور اس میں جو کچھ ہے' کی تخلیق کی ابتدا میں کوئی درخت کانٹوں والا نہ تھا۔ اور کوئی میوہ کڑوا' بدذائقہ اور بدبودار نہ تھا۔ اور کہیں سے کھاری پانی نہیں نکلتا تھا۔ اس کے بعد کہ جب بدبخت لوگوں نے ایسی بات کہی اور خدا عزوجل کے بارے میں یہ قبیح گالی بکی' درخت خاردار' میوے تلخ اور بدبودار ہو گئے۔ اور کھاری پانی نکلنا شروع ہو گیا۔ اور اس بات کے سخت بُرا ہونے کی وجہ سے ہر مسلمان کو چاہیے کہ کافروں سے ایسی بات سننے پر فوراً کہے:

سُبْحَانَہٗ میں اس ذات پاک کو اس سے پاک جانتا ہوں کہ اس کی اولاد ہو۔ جیسا کہ رائج ہے کہ دنیوی یا دینی مصیبت کے ذکر کے بعد (معاذ اللہ) نصیب دشمنان اور اسی قسم کے الفاظ کہتے ہیں۔ اور اس کلمے کو یہاں کلامِ الٰہی میں وارد کرنا اسی نہج پر ہے کہ یہ مسلمانوں کو تلقین کرنے کے لیے ارشاد فرمایا ہے۔ اور اِس کلمے کا معنی اس کے مطابق جو بیہقی اور حاکم نے روایت کیا ہے' ذاتِ خداوندی کو پاک جاننا ہے ہر اس چیز سے جو اس ذات پاک کے لائق نہیں۔ **اخرج الحاکم والبیهقی عن طلحة بن عبیداللّٰه قال سألت رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وآله وسلم عن تفسیر سبحان اللّٰه فقال هو تنزیه اللّٰه من کل سوء واخرج عبدبن حمید عن زید بن الاصم قال جاء رجل الی ابن عباس فقال لا اله الااللّٰه نعرفها انه لااله غیره والحمد للّٰه نعرفها ان النعمة کلها منه وهو المحمود علیها واللّٰه اکبر نعرفها انه لاشئ اکبر منه فما سبحان اللّٰه ؟ قال ابن عباس وماتنکر منها هی کلمه رضیها اللّٰه لنفسه وامر بها ملائکته وفزع الیها الاخیارمن خلقه** یعنی حاکم اور بیہقی نے طلحہ بن عبیداللہ سے روایت کی کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ

علیہ وآلہ وسلم سے سبحان اللہ کی تفسیر پوچھی تو فرمایا وہ اللہ تعالیٰ کو ہر عیب سے پاک جاننا ہے۔ اور عبد بن حمید نے زید بن الاصم سے بیان کیا کہ ایک شخص حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی خدمت میں آیا اور کہا لاالہ الا اللّٰہ کا معنی ہم پہچانتے ہیں کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ اور الحمدللّٰہ کو ہم پہچانتے ہیں کہ سب نعمتیں اسی کی طرف سے ہیں۔ اور اُن کی وجہ سے وہ تعریف کیا گیا ہے۔ اور اللہ اکبر کو پہچانتے ہیں کہ اس سے بڑا کوئی نہیں تو سبحان اللہ کیا ہے؟ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا اس میں بے پہچان کون سی چیز ہے' یہ ایک کلمہ ہے۔ جسے اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کے لیے پسند فرمایا۔ اور اس کا فرشتوں کو حکم دیا۔ اور اس کی مخلوق میں سے اچھے لوگ اس کی طرف پناہ لیتے ہیں۔

اور ابن ابی حاتم نے حسن بصری سے روایت کی کہ سبحان اللّٰہ اسم لایستطع الناس ان ینتحلوہ یعنی اس کلمے کو مخلوق اپنے حق میں استعمال نہیں کرسکتی کیونکہ ہر نالائق شے سے پاک ہونا شانِ خداوندی ہے۔ اور بس۔ بخلاف حمد و تکبیر کے کہ اسے آپس میں استعمال کرتے ہیں۔

اور اس خیال خیام سے اس ذات پاک کے پاک ہونے کی دلیل یہ ہے کہ اگر اس کا کوئی بیٹا ہو۔ پس اگر وہ بیٹا بھی منصب خدائی رکھتا ہے تو چاہیے کہ مستقل بنفسہٖ' قائم بذاتہٖ اور خودموجود ہو اور اسے اپنے وجود میں اس ذات سے کوئی تعلق نہ رہے۔ اور جب یوں ہوگا تو ولدیت کا معنی جو کہ فرع کے اپنی اصل کے ساتھ متعلق ہونے کا مقتضی ہے' بگڑ جائے گا۔ اور اگر اپنی ذات میں واجب الوجود نہ ہو تو لازماً باری تعالیٰ کے ایجاد کرنے سے موجود ہوا ہو گا اور اس صورت میں عبدیت لازم آئی۔ اور فرزندی اور ولدیت کا معنی باطل ہوا۔ تو معلوم ہوا کہ مرتبہٴ خدائی فرزند حاصل کرنے سے صریح منافات رکھتا ہے۔ کیونکہ فرزند کو چاہیے کہ اپنے والد کی جنس سے ہو۔ ورنہ فرزند نہ ہوگا۔ اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ کوئی شے ہم جنس نہیں ہو سکتی۔

بَلْ لَّهٗ مَافِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ بلکہ اسی کے لیے ہے سب کچھ جو آسمانوں اور زمین میں ہے مِلک کے طور پر اور پیدا کرنے کی جہت سے۔ اور ظاہر ہے کہ مملوک و مخلوق'

مالک وخالق کے ہم جنس نہیں ہو سکتی۔ اور اِسی لیے شرع شریف میں مقرر ہے کہ جب بھی کوئی شخص اپنے اقارب میں سے کسی کا مالک ہو جائے' وہ قریبی آزاد ہو جاتا ہے۔ پس عبدیت اور ولدیت میں پوری منافات ہے۔ نیز اولاد کے لیے واجب ہے کہ اپنے والد کی عبودیت سے باہر ہوں اور آسمان والوں اور زمین والوں میں سے کوئی بھی اس کی بندگی سے خارج نہیں ہے۔ بلکہ

كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوْنَ آسمانوں اور زمینوں میں سے ہر ایک اس کا مطیع اور تابع فرمان ہے۔ ان میں سے بعض خوشی کے ساتھ جیسے انبیاء علیہم السلام' ملائکہ' نیک ایمان والے اور بعض زور اور مجبوری کی وجہ سے جیسے کفار' شیاطین' فاسق وفاجر ایمان والے کہ جب چاہتا ہے' انہیں زندہ فرماتا ہے۔ اور جب چاہتا ہے' فوت کر دیتا ہے۔ جب چاہتا ہے' تندرست رکھتا ہے اور جب چاہتا ہے' بیمار کر دیتا ہے۔ جب چاہتا ہے غنی اور دولت مند کر دیتا ہے۔ اور جب چاہتا ہے مفلس اور فقیر کر دیتا ہے۔ وہ اس کے ان تصرفات کو روک نہیں سکتے۔ اگرچہ دل سے بُرا جانتے ہوں۔

اور اگر وہ کہیں کہ ہم بھی اس بات پر دلیل رکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی مخلوقات میں سے بعض فرزندی کا مرتبہ رکھتے ہیں۔ اور وہ یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام باپ کے بغیر پیدا ہوئے۔ اور آدمی کے لیے باپ چاہیے۔ پس ان کا باپ (معاذ اللہ) خدا ہے۔ اور اسی طرح حضرت عزیر علیٰ نبینا وعلیہ السلام معلم کی تعلیم کے بغیر تورات کو یاد سے پڑھتے تھے۔ اور آدمی کے لیے معلم کی تعلیم کے بغیر اس قسم کی طویل کتاب کو یاد سے پڑھنا ممکن نہیں۔ پس انہیں بلاواسطہ اللہ تعالیٰ نے فرزندوں کی طرح اپنی کتاب کی تعلیم دی ہے۔ اور یہ اِس بات کی دلیل ہے کہ آپ مرتبۂ فرزندی رکھتے تھے۔ اور اسی طرح فرشتوں نے اللہ تعالیٰ کی خوشنودی میں فنا ہو کر اپنے ارادے کو اس ذات کے ارادہ کے تابع کر رکھا ہے۔ اور ان سے وہ افعال صادر ہوتے ہیں جو کہ مخلوق کی طاقت نہیں ہیں۔ اور یہ مرضی اور عمل کا اتحاد ان کی ولدیت کی دلیل ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ تم اللہ تعالیٰ کی صفات اور افعال کی معرفت میں بہت قصور وار ہو اِسی وجہ سے ان شبہات میں گرفتار ہوتے ہو اگر اس کی صفات اور افعال کی

معرفت کا کوئی حصہ تمہارے پاس ہوتا تو اس طرح کی بیہودہ گفتگو نہ کرتے۔ اور اگر اس کی عمدہ صفات و افعال کو سمجھ نہیں سکتے ہو تو اس قدر تو سمجھو کہ اللہ تعالیٰ

بَدِيۡعُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ آسمانوں اور زمین کو نئے سرے سے پیدا کرنے والا ہے بغیر اس کے کہ ان کی پیدائش سے پہلے کوئی مادہ موجود ہو جو کہ اس پیدائش کے قابل ہو تو اس سے کیا بعید ہے کہ آدمی کو باپ کے بغیر پیدا کر دے یا کسی کو واسطۂ بشر کے بغیر اپنی کتاب کی تعلیم دے اور اگر غور سے دیکھو تو اس حقیقت کو پالو کہ اللہ تعالیٰ کسی چیز کو پیدا کرنے میں مادہ اور اسباب کا محتاج نہیں ہے۔ بلکہ

اِذَا قَضٰۤى اَمۡرًا جب کسی کام کو سرانجام دیتا ہے فَاِنَّمَا يَقُوۡلُ لَهٗ كُنۡ پس اس کا طریقہ یہی ہے کہ اس چیز کو فرماتا ہے کہ ہو وہ چیز ہونے اور سرانجام پانے میں اس کے حکم سے تاخیر اور توقف نہیں کرتی۔ فَيَكُوۡنُ پس وہ چیز بلاتوقف ہو جاتی ہے تو اگر مادہ اور اسباب کے بغیر پیدا کرنا اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ وہ چیز اپنے خالق کا فرزند ہو تو ہر چیز میں ولدیت اور فرزندی کا دعویٰ لازم آئے گا۔ حضرت عیسیٰ عزیر اور ملائکہ علیہم السلام کی کوئی خصوصیت نہیں رہے گی اس لیے کہ حقیقت میں پیدائش امر سے ہے نہ کہ اسباب سے۔ اگرچہ ظاہر بین نگاہ میں جو کہ ایک چیز کو دوسری چیز کے بعد دیکھتی ہے' اسباب کا وہم گزرے۔

چند بحثیں

یہاں چند بحثیں باقی رہ گئی ہیں جن کے مفسرین یہاں درپے ہوتے ہیں۔ پہلی بحث یہ کہ باری تعالیٰ کے لیے بیٹے کا ثبوت جیسا کہ ان آیات سے معلوم ہوا' صریح خلاف عقل ہے تو اس قدر کثیر تعداد جو کہ عقل مندوں سے خالی نہ تھی کس طرح اس بیہودہ بات پر اصرار کرتے تھے؟ اور اسی لیے علمائے محققین اس طرف گئے ہیں کہ پہلے گمراہ ٹولے کو حقیقی ولدیت کا اعتقاد نہ تھا۔ بلکہ ان کے کلام کا خلاصہ اسی قدر تھا کہ مخلوقات میں سے بعض کو عبدیت سے بالاتر مرتبہ دیتے تھے۔ اور اس مرتبے کا نام ولدیت رکھتے تھے اور ان بعض کو حمتی جانتے تھے۔ لیکن اس توجیہ میں دو وجہ سے خدشہ ہے۔ پہلی وجہ یہ کہ اس عقیدۂ باطلہ کے رد کے

مقام میں جگہ جگہ قرآن مجید میں ایسے الفاظ وارد ہوئے ہیں کہ حقیقی ولدیت پر صریح دلالت کرتے ہیں۔ جیسے انی یکون له ولدولم تکن له صاحبه (الانعام آیت ۱۰۱) یعنی اس کی اولاد کیسے ہوگی جبکہ اس کی بیوی ہی نہیں۔ اور بعض جگہوں پر حقیقی ولدیت کی صراحت بھی ارشاد ہوئی کہ وجعلوا بینه وبین الجنة نسبا (الصافات آیت ۱۵۸) اور متبنیٰ میں نسب نہیں ہوتا۔ دوسری وجہ یہ کہ جب ان کے عقیدہ کے مطابق متبنیٰ یعنی منہ بولا بیٹا ہونا ہوتو حقیقت میں انہوں نے تعبیر لفظی میں خطا کی ہوگی نہ کہ معنی میں اس لیے کہ چنا ہوا ہونا اور محبوب ہونا مسلمانوں کے نزدیک بعض مخلوق کے حق میں ثابت ہے اسی اصطفاء اور محبوبیت کو وہ تبنی سے تعبیر کرتے تھے تو ان پر اس قدر شدید عتاب اس لفظی خطا کی وجہ سے کیوں متوجہ کیا گیا اور کہا جاسکتا ہے کہ اصطفاء اور محبوبیت' عبدیت کے منافی نہیں ہیں۔ اور تبنی اور ولدیت جیسے بھی ہو' عبدیت کے منافی ہے۔ اور فرق کی حقیقت یہ ہے کہ اصطفاء اور محبوبیت' مصطفیٰ اور محبوب کو اس سے مرتبہ سے باہر نہیں کرتی بلکہ اس مرتبہ کے اعلیٰ درجات تک پہنچاتی ہے۔ مثلاً غلاموں یا کنیزوں میں سے جو کوئی اپنے مالک کا برگزیدہ اور محبوب ہو جاتا ہے تو اسی معنی سے ہوتا ہے کہ اپنے غلام یا کنیز ہونے کا حق خوب ادا کرتا ہے بخلاف تبنی اور بیٹا بنانے کے کہ تبنی کو اس کے مرتبہ سے باہر لانا اپنے مرتبہ میں اسے بٹھانا اور اپنے قائم مقام کرنا اسے لازم ہے۔ اور یہ معنی صریح شرک کو لازم کرنے والا ہے بخلاف اصطفاء اور محبوبیت کے پس جدا جدا ہو گئے۔

دوسری بحث یہ ہے کہ لفظ کُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوْنَ اس پر دلالت کرتا ہے کہ تمام آسمانوں اور زمینوں والے حضرت باری تعالیٰ کے مطیع اور تابع فرمان ہیں۔ جیسا کہ ابونعیم' طبرانی' ابویعلیٰ' ابن حبان اور دوسرے محدثین حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی روایت سے لائے ہیں کہ کل حرف فی القرآن یذکر فیه القنوت فهو الطاعة یعنی قرآن پاک میں جہاں بھی قنوت کا ذکر ہے تو اس سے اطاعت مراد ہے۔ حالانکہ بے شمار مخلوق احکام الٰہی کی بالکل مطیع و تابع نہیں۔ جیسے شیاطین اور کفار اور اسی لیے مجاہد نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اس آیت کے متعلق سوال کیا تھا۔ آپ نے جواب میں فرمایا کہ یہ لوگ قیامت

کے دن مطیع اور تابع فرمان ہوں گے۔ دوبارہ سوال کیا کہ یہ اطاعت اور انقیاد مکلفین کے ساتھ خاص ہے۔ جبکہ مَافِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ مکلفین اور غیر مکلفین کو شامل ہے تو آپ نے جواب میں دوسری تفسیر کی طرف رجوع فرمایا۔ اور کہا کہ قنوت کا معنی یہ ہے کہ ذراتِ عالم کا ہر ذرہ ذات پاک حضرت حق اور اس کی صفات کمال کا گواہ ہے۔ اس لیے کہ ذروں میں خود حادث اور محتاج ہونے کی علامات وارد ہیں۔ اور اس کی قدرت اور حکمت کے آثار ان میں جلوہ گر ہیں یا اس کا معنی یہ ہے کہ تمام موجودات اس کے تصرف کے مغلوب ہیں اس کے تصرف سے باہر نہیں جاتے جیسا کہ تفسیر میں گزرا اور تحقیق یہ ہے کہ اس آیت میں کل له قانتون واقع ہوا نہ کہ کل لاحکامه قانتون. کفار اور شیاطین جو کہ احکامِ شرعی کے نافرمان ہیں' اوّل تو ان احکام کو اللہ تعالیٰ کے احکام نہیں جانتے۔ پھر اگر دیدہ دانستہ اس کے احکام کا انکار کرتے ہیں تو اس کے وجود اور صفات کمال کا انکار بالکل نہیں کرتے' اہلِ حق اور باطل میں سے ہر شخص کی جبلت میں اس ذات پاک کی معرفت اور اس کی صفات کے کمال کا عقیدہ رکھا گیا ہے گو وہ غلط راہ پر چلا گیا ہو اور افراط و تفریط کا شکار ہوا۔ اور مافی السموت والارض میں سے ہر چیز کی ایک روح ہے جو شعور و عقل والی ہے کہ اس کی وجہ سے اس قدر معرفت سے وہ چیز محروم نہیں رہی۔ مکلف ہو یا غیر مکلف' حیوان ہو یا غیر حیوان۔ وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ' (بنی اسرائیل آیت ۴۴) كُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَهٗ وَتَسْبِيْحَهٗ (النور آیت ۴۱)

تیسری بحث یہ ہے کہ مَافِي السَّمٰوٰتِ میں لفظ ما جو کہ غیر ذوی العقول کے لیے ہے' استعمال فرمایا گیا ہے۔ اور كُلٌّ لَّهٗ قَانِتُوْنَ میں جمع سالم کا صیغہ لایا گیا ہے۔ جو کہ ذوی العقول کے لیے خاص ہے۔ اور کلام کا یہ تنوع کس نکتہ پر مبنی ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ مملوکیت کے بیان میں ذوی العقول کو ساز و سامان کی مانند قرار دے کر غیر ذوی العقول کو غلبہ دے کر ما کا کلمہ استعمال فرمایا گیا جو کہ اس مقام سے پوری مناسبت رکھتا ہے۔ اور اطاعت کے بیان کے مقام میں جو کہ عاقلانہ کام ہے' ذوی العقول کو غلبہ دینا زیادہ تر موزوں ہوا پس یہ تنوع کی انتہا کا تقاضا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے کلام کے اسرار کو بہتر جانتا ہے۔

بحث چہارم

چوتھی بحث یہ ہے کہ جملہ فَیَکُوْنُ رفع کی قرأت پر جسے جمہور قرأ نے اختیار فرمایا ہے' یقول پر معطوف ہے یافَهُوَ یَکُوْنُ کی تقدیر پر کلام کی ابتدا ہے۔لیکن ابن عامر کی قرأت پر جو کہ فَیَکُوْنُ کونصب کے ساتھ پڑھتے ہیں'ایک قوی اشکال ہے۔اس لیے کہ سببیت کے بغیر امر کا مابعد منصوب نہیں ہوتا۔اور یہاں سببیت درست نہیں۔اس لیے کہ شے کا ہونا اس شے کے ہونے کا سبب نہیں ہوسکتا۔لان سببیة الشئ لنفسه باطل اسی لیے علماء عربیت نے قاعدہ مقرر کیا ہے کہ جواب امر کو چاہیے کہ کسی طرح امر کے خلاف ہو یافعل میں جیسے اذہب تنتفع یا فاعل میں جیسے اذہب یذہب زید یا دونوں میں جیسے اذہب نیفعک زید اور اگر دونوں فعل متفق ہوں اور دونوں فاعلوں میں بھی متحد ہوں تو وہاں نصب کو جائز قرار نہیں دیا گیا اس لیے کہ شے اپنے نفس کے لیے شرط نہیں ہوتی۔پس ان فعلت فعلت کا معنی جو کہ فا کے ساتھ جواب کے صحیح ہونے کی شرط ہے' ثابت نہیں ہوگا؟

اس کا جواب یہ ہے کہ جو غرض امر پر مرتب ہوتی ہے' کبھی ایسی چیز ہوتی ہے۔جو کہ فعل امر کے مغائر ہوتی ہے۔جیسا کہ اکثر اوقات اسی طرح واقع ہوتا ہے۔اور اسی لیے علمائے عربیت نے فعل یا فاعل کی مخالفت کو شرط قرار دیا ہے۔اور کبھی امر پر مرتب ہونے والی غرض بعینہ وہی فعل ہوتا ہے۔پس اس فعل کو امر کے جواب میں واقع کرنا اس چیز سے خبردار کرتا ہے کہ اس امر سے ہماری غرض اس فعل کے سوا کوئی اور چیز نہیں۔چنانچہ اگر کہنے والا کہے کہ اذہب تذہب اس کا معنی یہ ہوگا کہ ہماری غرض اس امر سے صرف تیرا جانا ہے نہ کہ کوئی اور چیز اور اسی آیت میں جب وجود کے امر سے مقصود نفس وجود ہے اس غرض کے لیے کہ کان تامه کو کان تامه کا جواب بنایا ہے۔اور کہا جاسکتا ہے کہ علمائے نحو نے فا کے بعد جواب کی نصب کو جائز قرار دیا ہے کہ اس چیز کے بعد جو کہ امر کا معنی ہے یا اس کے لفظ کے بعد جو کہ لفظ امر کو ضمن میں لیے ہوئے ہے' بھی آتا ہے۔جیسے اتق الله امرا وافعل الخیر فیثاب علیه وقلت لزید زرنی فیزورنی اس لیے کہ اس جواب کی نصب کے صحیح ہونے میں مدار معنی پر ہے نہ کہ لفظ پر تو چیز کہ امر کے معنی میں ہے۔

حقیقت میں امر ہے۔ اور اسی طرح جو چیز کہ لفظ امر کو ضمن میں لیے ہوئے ہے اس باب میں امر کے ساتھ پوری مشابہت رکھتی ہے کہ سبب لفظ امر کے بعد واقع ہوگا۔ اگرچہ امر کا سبب نہ ہو تو اس قاعدے پر فیکون کی نصب جواب امر کی تشبیہ کی بناء پر ہوگی۔

لیکن اس صورت میں کہ فیکون مقولہ کے تتمہ سے ہوا۔ بہتر یوں معلوم ہوتا تھا کہ صیغہ خطاب کا ہوتا جیسے اذہب فتذہب لیکن غائب کا صیغہ لانے میں نکتہ یہ ہے کہ اس کلام میں اس امر حادث کو دوبار غائب کے لفظ سے ذکر فرمایا ہے۔ پہلے امر فرمایا۔ اور دوسری مرتبہ لہ اور ایک بار کن میں خطاب کے طریقے پر۔ پس یہاں بھی غیبت کی صورت کو تغلیب دی گئی ہے۔ تاکہ خطاب اور غیبت کا باہم برابر ہونا حاصل ہو۔ نیز جب یہ جواب امر کے جواب کے مشابہ ہے۔ اور حقیقت میں امر نہیں ہے تو خطاب وغیبت کی رعایت ان لوگوں کی نسبت سے کرنا چاہیے جن کی طرف اصل کلام کا رُخ ہے۔ اور اصل کلام جو کہ اس امر کو ضمن میں لیے ہوئے ہے کہ مخاطب مکلفین ہیں۔ جنہوں نے عرصہ ہائے دراز سے وجود کی خلعت پہن کر خطاب کی لیاقت حاصل کر رکھی ہے۔ اور نئے نئے حوادث اس مقام سے غیبت رکھتے ہیں۔ پس اس باریکی پر نظر کرتے ہوئے غائب کے صیغے کا استعمال متعین ہوا۔

پانچویں بحث یہ ہے کہ کلمہ کن کہنا پیدا کرنے سے کنایہ ہے۔ اور لفظ فیکون ایجاد کے تعلق کے بعد چیزوں کے جلد پائے جانے پر دلالت ہے۔ اس لیے کہ فاتعقیب مع الوصل کے لیے ہے۔ کلام کا خلاصہ یوں ہوا کہ **اذا قضی امر فلا یحتاج الی شئ الا الایجاد فیوجدہ بلا مهلة** یعنی جب کسی امر کا فیصلہ فرمائے تو کسی شے کی ضرورت نہیں ہوتی سوائے ایجاد کے پس اسے بغیر مہلت کے ایجاد فرماتا ہے۔ پس اشیاء کا وجود فعل ایجاد سے ہے نہ کہ کلمہ کن سے اور کلمہ کن کی طرف اس کی نسبت تمثیل کے طریقے سے ہے۔ گویا ہونے والے امر کو ذہن میں مطیع اور فرماں بردار غلام کی مانند قرار دیا گیا ہے۔ جسے حکم دیا گیا جو کہ اپنے مالک کے حکم سے ایک لمحے کے لیے ہرگز دیر نہیں کرتا۔ اور حکم ملتے ہی تعمیل کرتا ہے۔

اور اس بیان میں اس ذات پاک کے بیٹا حاصل کرنے سے پاک ہونے کی پوری

تاکید ہوئی۔ اس لیے کہ جسے اس قدر قدرت حاصل ہو‘ اسے کیا پڑی کہ بیٹا پیدا کرنے اور اس کی پرورش کرنے میں جانوروں اور آدمیوں کی طرح مقاربت‘ حمل‘ رضاعت اور دودھ چھڑانے کا محتاج ہو اس کی شان بلند اور برہانِ عظیم ہے۔ اور جو لوگوں نے اس تمثیلی معنی سے غافل ہو کر اس لفظ کے ظاہر پر نظر کی‘ وہ کئی اشکالات کی تنگ وادی میں گرفتار ہوئے ہیں۔

ان میں ایک اشکال یہ ہے کہ مخلوق کس وقت کن سے مخاطب ہوتی ہے۔ وجود سے پہلے اہلیت خطاب نہیں رکھتی اور وجود کے بعد اسے وجود کا حکم دینا تحصیل حاصل ہے۔ اور ان میں سے یہ اشکال ہے کہ اگر مخلوق بے حس و حرکت شے ہے۔ جیسے پتھر‘ مٹی وغیرہ اسے مکلف کرنا خلافِ عقل ہے۔

اور ان میں سے ایک یہ اشکال ہے کلمہ کن قدیم نہیں ہو سکتا اس لیے کہ ایسے اجزاء سے مرکب ہے جنہیں قرار نہیں۔ کیونکہ نون مسبوق ہے کاف سے جس وقت زبان پر کاف تھا‘ نون نہ تھا۔ اور جب حادث ہوا تو دوسرے کن کا محتاج ہوا۔ اور اسی طرح آگے تو دور اور تسلسل لازم ہوتا ہے۔ اور ان میں سے یہ اشکال ہے کہ قادر علی الاطلاق کو اگر اس کلمہ کے بولنے سے قطع نظر اعتبار کریں‘ اشیاء کی ایجاد کر سکتا ہے یہ نہیں؟ اگر کر سکتا ہے تو اس کلمہ کی ضرورت نہیں رہتی اور نرا لغو ہوا۔ اور اگر نہیں کر سکتا تو قادر مطلق نہ رہا۔ اور ان میں سے ایک اشکال یہ ہے کہ ہم اپنے متعلق قطعیت اور یقین کے ساتھ جانتے ہیں کہ اگر ہزار بار یہ کلمہ کہیں تو ہمارے افعال میں سے کسی چیز کے وجود میں کوئی اثر نہیں کرتا تو ہر قدرت اور ارادہ والے کا حال یہی ہے۔

اور ان اشکالات کے جواب میں انہیں عجیب حیرت ہوئی اور دائیں بائیں بھٹکے ہیں۔ مثلاً کہتے ہیں کہ یہ کہنا ہر مخلوق میں عام نہیں‘ ان کے ساتھ خاص ہے جو موجود ہیں۔ ایک حال سے دوسرے تک منتقل ہوتے ہیں‘ ان لوگوں کی طرح جنہیں حق تعالیٰ نے فرمایا كُوْنُوْا قِرَدَةً خَاسِئِيْنَ

نیز کہتے ہیں ھذااللفظ امر الاحیاء بالموت وللموتی بالحیوۃ یعنی یہ لفظ

زندوں کے لیے موت اور مردوں کے لیے زندگی کا حکم ہے۔ اور فخر الاسلام بزدوی نے کہا ہے کہ اس کلمہ کا تکلم ایجاد کے لیے نہیں ہے۔ بلکہ ملأ اعلیٰ کو جتلانے کے لیے دستورِ خداوندی کے جاری ہونے کے طریقے پر ہے۔ تاکہ جب وہ اس کلمہ کو سنیں، جان لیں کہ حق تعالیٰ نے کسی امر کو پیدا فرمایا ہے۔ اور اس قول کی اس سے تائید کی ہے۔ جو کہ حدیث صحیح میں ہے کہ ان ربنا اذا قضٰی امرا سمعت الملائکة صوتا کانه صلصلة علی صفوان الخ یعنی فرشتے کہتے ہیں کہ ہمارا ربِ کریم جب کسی امر کا فیصلہ فرماتا ہے تو فرشتے ایک آواز سنتے ہیں گویا وہ پتھر پر زنجیر ٹکرانے کی آواز ہے الخ۔ نیز کہتے ہیں کہ یہ امر تکلیفی حکم نہیں ہے کہ خطاب کو سمجھنے اور دوسری شرائط کا پایا جانا درکار ہو۔ بلکہ امر تسخیر ہے۔

اسمِ اعظم پر مشتمل دعا

مختصر یہ کہ اس کلام کے تمثیلی معنی کی تحقیق کے بعد ان تمام مشکلات سے جان بچ گئی۔ اور ابو بکر بن ابی شیبہ نے عبد الرحمٰن بن سابط سے روایت کی، حضور علیہ السلام کی مسجد مبارک میں ایک دعا کرنے والا اس طرح دعا کر رہا تھا اللھم انی اسئلك باسمك الذی لا اله الا انت الرحمٰن بدیع السمٰوٰت والارض واذا اردت امرا فانما تقول له کن فیکون۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ دعا سن کر فرمایا کہ اس دعا کرنے والے کو خبر پہنچاؤ کہ تیری دعا اسمِ اعظم کے ساتھ واقع ہوئی اور مقبول ہوئی۔

اور اب تک جو مذکور ہوئے اہلِ کتاب کے بیہودہ احوال تھے کہ ان کے دانا بھی نادانوں کی طرح ظاہر ہو کر عرب کے جاہلوں اور مشرکوں کے ساتھ اپنی مشابہت پسند کر کے بے دریغ چیخ رہے ہیں۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ اور اہلِ کتاب، مشرکینِ مکہ اور دوسرے بت پرست جو کہ کچھ نہیں جانتے کہتے ہیں۔ اور نہیں سمجھتے کہ خدا تعالیٰ کے ساتھ ہم کلامی کے قابل ہونے کی کیا شرط ہے۔ اور وہ شرائط کس شخص میں پائی جاتی ہیں کہ اگر حق تعالیٰ کو محمد (علیہ السلام) کی رسالت کو ثابت کرنا اور ان کے دعویٰ نبوت کی تصدیق منظور ہے تو لَوْلَا يُكَلِّمُنَا اللّٰهُ ہمارے ساتھ اللہ تعالیٰ بالمشافہ کلام کیوں نہیں کرتا کہ فلاں کو میں نے بھیجا ہے۔ اور وہ اپنے

دعویٰ میں سچا ہے' جھوٹ نہیں کہتا جیسا کہ اللہ تعالیٰ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ساتھ او فرشتوں کے ساتھ اور موسیٰ (علیہ السلام) کے ساتھ کلام کرتا ہے۔ اس لیے حصول مطلب کے لیے یہ راہ زیادہ آسان ہے۔ اور حکیم آدمی جب مقصد کو حاصل کرنے کا ارادہ کرتا ہے تو اس کے سب سے قریبی اور آسان راستے کو اختیار کرتا ہے۔

اَوْ تَاْتِیْنَا اٰیَةٌ یا ہمارے پاس کوئی علامت کیوں نہیں آتی۔ کہ اس علامت کی وجہ سے مجبور ہو کر ہم اس کی حقیقت کو پالیں۔ جیسا کہ سرزمینِ مکہ ہیں کہ جہاں پانی بالکل نہیں' چشمے جاری ہو جائیں یا اس زمین میں ایک دم باغ اور بوستان پیدا ہو جائیں۔ یا آسمان ٹکڑے ٹکڑے ہو کر ہم پر گر پڑے یا فرشتے گروہ در گروہ ہماری نگاہوں میں ظاہر ہوں یا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا سونے اور چاندی کا گھر بنے۔ یا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) آسمان کے اوپر چلے جائیں۔ اور ایک کتاب اپنے ہمراہ لے کر آئیں کہ ہم اس کتاب کو پڑھیں اور ان کی اس گفتگو کا منشا جہالت ہے۔ اس لیے کہ نہیں سمجھتے خدا عزوجل سے ہم کلامی کا مرتبہ بہت اونچا ہے۔ وہ ابھی پہلی سیڑھی جو کہ ایمان ہے' تک نہیں پہنچے ہیں۔ جبکہ وہ رُتبہ فرشتوں اور انبیاء علیہم السلام کے ساتھ خاص ہے۔ اور ان کے علاوہ کسی کو میسر نہیں تو اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہم کلامی کی فرمائش گویا اس بات کی فرمائش ہے کہ تا کہ سب کو پیغمبر یا فرشتے بنا دے اور یہ فرمائش ان بے وقوفوں سے محال نہیں۔ اس لیے کہ

کَذٰلِكَ قَالَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّثْلَ قَوْلِهِمْ اسی طرح کہہ کر چلے گئے وہ لوگ جو ان سے پہلے تھے۔ ان کی گفتگو کی طرح کسی فرق کے بغیر اس لیے کہ ان کے پہلوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی خدمت میں ارنا اللّٰه جهرة' اجعل لنا الٰہا کما لهم آلهة کہا ہے۔ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی خدمت میں هل یستطیع ربك ان ینزل علینا مائدة من السماء کہہ کر چلے گئے۔ اور دوسری اُمتوں کے جاہلوں نے بھی اپنے رُسل علیہم السلام سے اسی قسم کی فرمائشیں کی ہیں۔ پس اگر چہ اس زمانے کے کافر پہلے زمانے کے کفار کے ساتھ زمان' مکان' قوت' جسم اور عمر کے طول میں بہت اختلاف رکھتے ہیں۔ لیکن

تَشَابَهَتْ قُلُوْبُهُمْ ان کے دل ایک دوسرے جیسے ہیں۔ پہلے کفار کے دِلوں میں جو بیہودہ شبہات اور رسل علیہم السلام کے معجزات کا انکار واقع ہوتا تھا اس زمانے کے کافروں کے دِلوں میں بھی واقع ہوتا ہے۔ پس خداتعالیٰ سے ہم کلامی کی طلب جو وہ رکھتے ہیں' صراحتاً جہالت کے آثار میں سے ہے اس کے جواب کی ضرورت نہیں۔ ہم علامات اور معجزہ کی فرمائش پر آتے ہیں تو اس کا جواب یہ ہے:

قَدْ بَيَّنَّا الْاٰيٰتِ تحقیق ہم نے اس رسول علیہ السلام کی علامات اور معجزات کو واضح اور روشن کردیا۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعض معجزات کا بیان

جیسے چاند کا شق ہونا' پتھر کا سلام و کلام کرنا' آپ کے حکم پر درخت کا آنا' آپ کی جدائی میں ستون کی لکڑی کا رونا' آپ کے دستِ مقدس اور آپ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ہاتھوں میں سنگریزوں کا تسبیح پڑھنا' آپ کی انگلیوں سے پانی کے چشموں کا جاری ہونا۔ اونٹنی' ہرنی اور دوسرے بے زبان جانوروں کی آپ کی خدمت میں شکایت کرنا' آپ کے دعویٰ نبوت کی صداقت پر گوہ اور بھیڑیئے کا گواہی دینا۔ آپ کی برکت سے تھوڑے سے کھانے کے ساتھ لشکروں کا سیر ہونا۔ مشکل علاج والی بیماریوں کا آپ کا دستِ مقدس لگنے سے دُور ہونا اور اس سراپا اعجاز کلام کی ہر ہر آیت کا آپ کے قلب مقدس پر نازل ہونا۔ آپ کے اُمی ہونے اور حروف کو نہ پہچاننے کے باوجود۔ علیٰ ہذا القیاس لیکن یہ تمام روشن علامات اور واضح معجزات

لِقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ ان لوگوں کے لیے ہیں جو یقین حاصل کرنے کا قصد کرتے ہیں نہ ان لوگوں کے لیے جو کہ تعصب اور عناد اختیار کرتے ہیں۔ اور عاجز کرنے کا قصد کرتے ہیں۔ اور اگر وہ غور سے دیکھیں تو جان لیں کہ رسل علیہم السلام کی علامات اور معجزات میں یہ شرط نہیں کہ منکروں کی فرمائش کے مطابق آئیں یا حد اضطرار تک پہنچادیں۔ بلکہ اس معنی کا ہونا ایمان میں خلل پیدا کرتا ہے۔ اس لیے کہ ایمان وہی صحیح ہے۔ جو کہ اختیار کے ساتھ ہو نہ کہ مجبوری کے ساتھ۔ ہاں رسل علیہم السلام کی علامات اور معجزات میں اس قدر شرط ہے کہ

ڈرانے اور خوش خبری دینے کے قابل ہوں۔ اور یہ معنی ان علامات اور معجزات میں جو کہ آپ کے دستِ مقدس پر ظاہر ہوئے یا ہو رہے ہیں موجود ہے۔ اس لیے کہ

اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ بِالْحَقِّ تحقیق ہم نے آپ کو معجزات حقہ کے ساتھ درست طریقے پر اور حکمت کے تقاضوں کے مطابق بھیجا اور وہ یہ ہے کہ ہم آپ کو انہیں ایمان پر مجبور کرنے کی قدرت نہیں دیتے۔ کیونکہ جبر کی صورت میں ایمان کا فائدہ حاصل نہ ہوگا۔ اور ان کا ایمان فرعون اور ہامان کے ایمان کی طرح ناامیدی کا ایمان ہو جائے گا تو چاہیے کہ آپ کا حال اس سے متجاوز نہ ہو۔

بَشِيْرًا کہ آپ بشارت دینے والے ہوں۔ ہر اس شخص کو جو اپنے اختیار سے جبر واکراہ اور عذاب کا معائنہ کیے بغیر آپ کی پیروی کی راہ چلے وَّنَذِيْرًا اور آپ ڈرانے والے ہوں اسے جو اپنے اختیار سے آپ کی پیروی کی راہ سے کنارا کرے۔

وَلَا تُسْئَلُ عَنْ اور آپ سے پرسش نہ ہوگی کہ آپ کے منکر راہ پر کیوں نہ آئے۔ اور انہوں نے عناد کیوں اختیار کیا۔ اگرچہ وہ منکر اور معاند داخلی ہو گئے اَصْحٰبِ الْجَحِيْمِ جلانے والی آگ والوں میں۔ ہاں اگر ہم آپ کو انہیں ایمان لانے پر مجبور کرنے کی قدرت دیتے اور پھر یہ لوگ انکار اور عناد پر اصرار کرتے تو آپ سے ضرور پرسش ہوتی کہ آپ انہیں راہ پر کیوں نہ لائے۔

چند بحثیں

یہاں چند بحثیں باقی رہ گئیں۔ پہلی بحث یہ ہے کہ تشابہ اور تشبیہ میں کیا فرق ہے۔ اور اس آیت میں تشابہت کو کیوں بیان فرمایا گیا ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ حضور علیہ السلام کے زمانہ کے کفار کے دِلوں اور گزشتہ کافروں کے دِلوں کے درمیان کوئی فرق نہ تھا۔ دونوں فریقوں کے دِلوں کی برابری ثابت کرنے کے لیے لفظ تشابہ زیادہ موزوں ہوا بخلاف تشبیہ کے جو کہ مشبہ اور مشبہ بہ کے مرتبہ کی باہمی مخالفت پر دلالت کرتی ہے۔ اسی لیے جب شاعروں کو برابری اور مساوات منظور ہوتی ہے تو تشبیہ سے ہٹ کر لفظ تشابہ لاتے ہیں۔ جیسا کہ کہنے والے نے کہا ہے بیت

رق الزجاج ورقت الخمر
متشابھا وتشاکل الامر
فکانما خمر ولا قدح
وکانما قدح لاخمر

دوسری بحث یہ ہے کہ آیت قَدْ بَیَّنَّا الْاٰیٰتِ لِقَوْمٍ یُّوْقِنُوْنَ میں بظاہر ایک اشکال نمودار ہوتا ہے۔ اس لیے کہ اہلِ یقین کے لیے بیان کی کیا ضرورت ہے۔ بلکہ بیان تو اہلِ تردد اور شک والوں کے لیے چاہیے۔ اہلِ یقین کے لئے بیان کرنا تو تحصیل حاصل ہے؟ اس کا جواب دورانِ تفسیر گزرا کہ اہلِ یقین سے مراد وہ لوگ ہیں جو کہ حصولِ یقین کے لیے تیار اور اسے حاصل کرنے کا قصد رکھتے ہیں نہ کہ وہ لوگ جو بالفعل یقین رکھتے ہیں۔

تیسری بحث یہ ہے کہ نافع اور یعقوب کی قرأت میں لفظ وَلَا تُسْئَلُ عَنْ اَصْحٰبِ الْجَحِیْمِ صیغہ نہی کے ساتھ وارد ہوا ہے۔ اور اکثر مفسرین نے اس کا معنی یوں کیا ہے کہ دوزخیوں کا حال نہ پوچھئے کہ نہ تو زبان اس کے بیان کی متحمل ہے۔ اور نہ کانوں میں اس کے سننے کی طاقت اور اس نہی سے مراد دوزخیوں کے عذاب کی شدت کو بیان کرنا ہے۔ لیکن محدث عبدالرزاق اور ابن جریر نے محمد بن کعب قرظی اور داؤد بن ابی عاصم سے روایت کی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک دن فرما رہے تھے "اے کاش میں اپنے والدین کا انجام جانتا" اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ بِالْحَقِّ بَشِیْرًا وَّنَذِیْرًا وَّلَا تُسْئَلُ عَنْ اَصْحٰبِ الْجَحِیْمِ. اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے والدین کا ذکر نہ فرمایا حتیٰ کہ واصلِ بحق ہو گئے۔ اور شیخ جلال الدین سیوطی نے ان دو روایتوں کو ذکر کرنے کے بعد فرمایا ہے ارسال سند کے باوجود ان کی سند بھی ضعیف ہے۔ اور اس کے باوجود سیاق کلام سے اتنی مناسبت بھی نہیں ہے۔ واللہ اعلم

اور اگر کسی کے دل میں خیال آئے کہ اگر اس رسول علیہ السلام جو کہ خوش خبری سنانے اور ڈرانے کے لیے بھیجے گئے ہیں' کی علامات اور معجزات دوسرے رسل علیہم السلام کی علامات اور معجزات کی طرح بشارت اور ڈرانے کی صلاحیت رکھتے تو لازماً ان علامات اور

معجزات کو اہلِ علم اور کتاب کو سمجھنے والے پسند کرتے اور قبول کرتے گو جاہل اور نا سمجھ لوگ انکار اور عناد اختیار کرتے لیکن اس رسول (علیہ السلام) کی علامات اور معجزات کو اہلِ کتاب جو کہ یہود و نصاریٰ ہیں، بھی قبول نہیں کرتے اور پسند نہیں کرتے تو اس وسوسہ کو دُور کرنے کے لیے یہ جان لیں کہ آپ کے معجزات کو قبول نہ کرنا جو کہ یہود و نصاریٰ سے واقع ہوا' ان علامات اور معجزات میں کمی کی وجہ سے نہیں ہے۔ بلکہ اس وجہ سے ہے کہ یہ دونوں فرقے آپ سے راضی نہیں ہیں۔ اور ان کی بصیرت کی نگاہوں پر آپ کی طرف سے اور آپ کے معجزات کی طرف سے تعصب اور عناد کا پردہ سمجھنے دیکھنے کا حجاب بن گیا اور اگر آپ چاہیں کہ انہیں اپنی طرف سے راضی کریں، ہرگز صحیح نہیں ہے۔

(اقوال باللہ التوفیق یہ مسلک ہی حقیقت کی نظر سے ضعیف اور نا قابلِ اعتماد و التفات ہے۔ امام جلال الدین السیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے والدین کے ایمان' شرک سے پاک ہونے' اور جنتی ہونے کے متعلق کئی رسائل لکھے ہیں۔ مثلاً مسالك الحنفاء فی والدی المصطفٰی صلی اللّٰہُ علیہ وآلہ وسلم۔ الدرج النیفة فی الآباء الشریفة۔ المقامة السندسیه فی النسب المصطفویه۔ التعظیم والمنة فی ان ابوی رسول اللہ صلی اللّٰہُ علیہ وآلہ وسلم فی الجنة۔ نشر العلمین فی احیاء الابوین الشریفین۔ اور السبل الجلیة فی الاباء العلیه۔ چنانچہ مسالک الحنفاء ص ۱۸ پر فرماتے ہیں کہ انهما لم یثبت عنهما شرك بل كانا علیٰ الحنیفیة دین جدهما ابراهیم علیٰ نبیناء علیه الصلوٰة والسلام كما كان علیٰ ذالك طائفة من العرب كزید بن عمرو بن نفیل و ورقة بن نوفل وغیرهما۔ آپ کے والدین سے شرک قطعاً ثابت نہیں بلکہ وہ حنیفیت پر تھے یعنی اپنے اپنے جدامجد حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دین پر تھے جس طرح کہ عربیوں کا ایک گروہ تھا جیسے زید بن عمرو بن نفیل اور ورقہ بن نوفل وغیرہ۔ اور یہی مسلک امام فخر الدین رازی رحمۃ اللہ علیہ کا ہے' پھر امام فخر الدین رازی رحمۃ اللہ علیہ کی تفسیر اسرار التنزیل جسے تفسیر کبیر کہتے ہیں' کی یہ عبارت نقل فرمائی۔ ومما یدل علی ان آباء النبی محمد صلی

اللہ علیہ وآلہ وسلم ما کانوا مشرکین قولہ علیہ السلام لم ازل انقل من اصلاب الطاهرین الی ارحام الطاهرات وقال تعالیٰ انما المشرکون نجس فوجب ان لایکون احد من اجداده مشرکا۔ اور جو دلائل حضور علیہ السلام کے آباء واجداد کے مشرک نہ ہونے پر دلالت کرتے' ان میں سے حضور علیہ السلام کا یہ ارشاد ہے کہ ''میں ہمیشہ پاکوں کی پشتوں سے پاکوں کے ارحام میں منتقل کیا جاتا رہا اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ مشرک پلید ہیں تو واجب ہوا کہ آپ کے آباء واجداد میں سے کوئی بھی مشرک نہ ہو'' اور امام فخر الدین رازی رحمۃ اللہ علیہ کو امام جلال السیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے چھٹی صدی کا مجدد مانا ہے۔

اس سلسلہ میں علمائے اسلام کا ایک مسلک یہ ہے کہ اگرچہ والدین کریمین حقیقت ایمان پر فوت ہوئے لیکن انہیں مزید عزت وشرف عطا کرنے کے لیے زندہ فرمایا۔ اور انہوں نے زیارت بھی کی اور کلمہ شریف بھی پڑھا۔ چنانچہ شیخ عبداللہ البسوی الروحی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب مطالع النور السنی للنبیء عن طهارة النسب العربی میں فرمایا اعلم ان کثیرا من حفاظ المحدثین وغیرهم مثل ابن شاهین والحافظ ابوبکر الخطیب البغدادی' والسهیلی والقرطبی والمحب الطبری والعلامه ناصر الدین بن المنیر وغیرهم ذهبوا الی ان اللہ احیاله ابویه فامنا به (جواہر البحار ج ۴ ص ۲۰۳) یعنی حفاظ محدثین میں سے کثیر تعداد اس طرف گئے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے لیے آپ کے والدین کو زندہ فرمایا تو وہ دونوں آپ پر ایمان لائے جیسے ابن شاہین' حافظ ابوبکر بغدادی' سہیلی' قرطبی' محب طبری اور علامہ ناصر الدین المنیر رحمۃ اللہ علیہم۔ محمد محفوظ الحق غفرلہٗ ولوالدیہ)

وَلَنْ تَرْضٰى عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَلَا النَّصٰرٰى اور آپ سے ہرگز راضی نہ ہوں گے یہود اور نہ ہی نصاریٰ۔ تاکہ آپ کے معجزات کو قبول کرلیں اس لیے کہ دونوں فرقے اپنے آپ کو اہلِ علم ودانش خیال کرتے ہیں۔ اور لوگوں کی زبان پر اور جہان میں مشہور ہے کہ اللہ تعالیٰ کی کتابیں صرف ان کے پاس ہیں اور بس۔ تو وہ چاہتے ہیں کہ ان کے سوا دنیا میں کوئی

بھی ہے' ان کے تابع ہو اور وہ مطلقاً متبوع۔ پس آپ سے کس طرح راضی ہوں کہ آپ انہیں اپنا تابع بناتے ہیں۔ ہاں وہ آپ سے راضی نہ ہوں گے حَتّٰی تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ۔ یہاں تک کہ آپ (معاذ اللہ) ان کے منسوخ مذہب اور خود ساختہ دین اور آئین کی پیروی کریں۔ اور یہ کام آپ کی طرف سے کبھی واقع نہیں ہو سکتا بلکہ آپ انہیں اس خیال خام اور جھوٹی طمع سے ناامید کر دیں۔

قُلْ فرما دیجئے کہ پیغمبر کے شایانِ شان نہیں کہ کسی چیز کی پیروی کرے خدا تعالیٰ کی ہدایت کے سوا

اِنَّ هُدَى اللّٰهِ تحقیق اللہ تعالیٰ کی ہدایت ہر زمانے میں هُوَ الْهُدٰى وہی ہدایت ہے۔ جو اس زمانے کے پیغمبر علیہ السلام لائے ہیں۔ اور اس کے سوا دوسری ہدایتیں منسوخ ہونے سے پہلے اگرچہ ہدایت تھیں مگر نسخ کے بعد نہ رہیں۔ بلکہ ہوائے نفسانی اور دلوں کی خواہش ہو گئیں۔

وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اور اگر بالفرض آپ ان کی نفسانی خواہشات کی پیروی کریں بَعْدَ الَّذِيْ جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ اس کے بعد آپ کے پاس اس بات کا قطعی علم آیا۔ کہ اس زمانے کی ہدایت آپ کے لائے ہوئے دین میں منحصر ہے۔ اور اس کے سوا سب منسوخ ہیں۔

مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ نہیں ہوگا آپ کے لیے اللہ تعالیٰ کے عذاب سے کوئی دوست جس کی کوشش اور تلاش آپ کو اس سے رہائی دے۔ وَّلَا نَصِيْرٍ اور نہ کوئی مددگار کہ طاقت کے ساتھ اس عذاب کو دُور کر سکے۔ یہاں تک کہ موسیٰ' عیسیٰ (علیہما السلام) کہ اپنی ملت کی پیروی کی وجہ سے آپ کی حمایت کر سکیں۔ (اقول وباللہ التوفیق۔ اس آیت میں مذکور خطاب امت محمدیہ کو ہے۔ جیسا کہ تفسیر خزائن العرفان میں صدر الافاضل مولانا سیّد محمد نعیم الدین مراد آبادی رحمۃ اللہ علیہ اس آیت کے تحت رقم طراز ہیں' یہ خطاب امت محمدیہ کو ہے کہ جب تم نے جان لیا کہ سید انبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تمہارے پاس حق وہدایت لائے تو تم ہرگز کفار کی خواہشات کا اتباع نہ کرنا۔ اگر ایسا کیا تو تمہیں کوئی عذابِ الٰہی سے بچانے

والا نہیں''۔ چنانچہ شیخ العرب والعجم مولانا امام احمد رضا فاضل بریلوی قدس سرہ العزیز ولئن لتبعت اھواء ھم کا یوں ترجمہ کرتے ہیں۔ اور (اے سننے والے کسے باشد) اگر تو ان کی خواہشوں کا پیرو ہوا'' اور اسی آیت کا ترجمہ غزالی زماں امام اہل سنت مولانا سیّد احمد سعید کاظمی نور اللہ مرقدہ اپنے ترجمۃ القرآن البیان میں یوں کرتے ہیں ''اور (اے مخاطب) اس کے بعد کہ تیرے پاس علم آ چکا اگر تو نے اس کی پیروی کی الخ۔ بنابریں عظمت نبوت اور مقامِ رسالت کے پیش نظر راست اور بے ضرر ترجمہ یہی ہے۔ اور یہاں تفسیر میں مذکور وضاحت کے تکلف کی ضرورت ہی نہیں۔ فالحمد للہ رب العالمین۔ محمد محفوظ الحق غفرلہ ولوالدیہ)

اس کے باوجود تمام اہلِ کتاب آپ کے انکار پر متفق نہیں ہیں۔ اور آپ کے معجزات کو رد نہیں کرتے۔ بلکہ اہلِ کتاب یہودی ہوں خواہ نصاریٰ دو قسم کے ہیں۔ ایک قسم اَلَّذِیْنَ اٰتَیْنٰھُمُ الْکِتٰبَ وہ لوگ ہیں جنہیں ہم نے کتاب دی ہے۔ اور کتاب کی حقیقت اور قدر کو وہی جانتے ہیں۔ اور اس کے معنی کو وہی سمجھتے ہیں جو یَتْلُوْنَہٗ حَقَّ تِلَاوَتِہٖ اس کتاب کی تلاوت کرتے ہیں۔ جیسا کہ تلاوت کا حق ہے۔ تحریف لفظی یا معنوی کے بغیر اور حروف و کلمات کی حفاظت کے ساتھ۔ کلمات اور تشابہات کی تصدیق اور اس کے مدلولات کو بدلنے سے پرہیز کے ساتھ اور اس کی تقریر میں غور و فکر اور اس کی مرادات اور ارشادات کو سمجھنے کے ساتھ۔

اُولٰٓئِکَ یُؤْمِنُوْنَ بِہٖ اہلِ کتاب سے یہ گروہ اس حق پر ایمان لاتے ہیں جو ہم نے آپ کے ہمراہ بھیجا اور اس علم اور ہدایت پر جو کہ ہم نے آپ کے قلب مقدس میں اُتارا ہے۔ بلکہ ان کا اس نازل کیے گئے حق پر ایمان لانا عین اپنی کتاب پر ایمان لانا ہے تو ان کا آپ کے معجزات کے کمال اور آپ کے بشارت دینے اور ڈرانے کی صلاحیت کو جاننا کافی ہے۔

وَمَنْ یَّکْفُرْ بِہٖ اور جس نے اس نازل کیے گئے حق سے کفر کیا۔ اور وہ اہلِ کتاب کی دوسری قسم ہے۔ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْخٰسِرُوْنَ تو وہ لوگ وہی زیاں کار ہیں۔ کہ اس نازل

کردہ حق پر ایمان بھی ان کے ہاتھ نہ رہا اور نہ ہی اپنی کتاب کا ایمان رہا' قتل و غارت' اولاد کی قید اور جلاوطنی کی وجہ سے دنیا سے بھی بے بہرہ ہو گئے۔ اور آخرت سے بھی کہ کفر و عناد کی وجہ سے جہنم کی گہرائی میں پہنچ گئے۔ پس اگر وہ اپنے کامل خسارے کی وجہ سے آپ کی رسالت کی علامات اور معجزات میں شکوک و شبہات وارد کرتے ہیں۔ اور انہیں قبول نہیں کرتے تو کوئی ڈر نہیں کہ حقیقت میں وہ اہلِ کتاب سے نہیں ہیں۔ گو ظاہری طور پر گدھے کی طرح اس کتاب کے حامل ہوں۔ مصرع

که نکته داں نشود کرم گر کتاب خورد

یعنی اگر کیڑا کتاب کھا جائے تو نکتہ داں تو نہیں ہو جاتا۔

چند ضروری بحثیں

یہاں چند بحثیں باقی رہ گئیں جن کے در پے ہونا واجب ہے۔ پہلی بحث یہ ہے کہ اس آیت سے معلوم ہوا کہ دلائل کے واضح ہونے اور براہین کے روشن ہونے کے بعد تقلید باطل ہے۔ اس لیے کہ یہ علم آنے کے بعد خواہش کی پیروی ہے۔ اور یہی وجہ ہے مجتہد عالم کو غیر کی تقلید حرام ہے۔

دوسری بحث یہ ہے کہ اس آیت سے معلوم ہوا کہ یہ جاننے کے باوجود کہ اس شخص سے یہ کام صادر نہ ہو گا اس شخص کو اس کام سے منع کرنا اور اس کے بُرے انجام سے ڈرانا حکمت کے موافق ہے۔ جیسا کہ یہاں اہلِ کتاب کی خواہشات کی پیروی کے بارے میں معلوم تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ایسا کبھی نہیں ہو گا۔ اور اس کے باوجود اس پر شدید وعید فرمائی اور مؤثر طور پر روکا گیا اور اسی آیت کی مانند ایک اور آیت ہے کہ لَئِنْ اَشْرَكْتَ لَيَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ وَلَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْخَاسِرِيْنَ (الزمر آیت ۶۵) اور اس میں راز یہ ہے کہ شاید علمِ الٰہی میں اس شخص کو اس فعل سے بھی مؤثر تاکیدیں اور ہولناک خطرات باز رکھنے والے ہوں یا ان تاکیدوں کی وجہ سے اس کی عصمت زیادہ قوی اور بیشتر ہو جائے۔ نیز معصوموں کے بارے میں یہ سب مؤثر تاکیدیں اس لیے ہوتی ہیں کہ اُمتیوں کو شدید رکاوٹ حاصل ہو جائے۔ اور وہ جان لیں کہ اگر بالفرض اس قدر بلند درجات والے لوگوں

سے اگر یہ کام صادر ہوں تو انجام درست نہیں ہوتا۔ ہم جو کہ ابھی ایمان کی پہلی وادی سے نہیں گزرے ہیں' کس طرح بے خوف ہو سکتے ہیں؟

مختصر یہ کہ یہ معاملہ اس معاملہ کے برعکس ہے کہ ابولہب کو کافر سمجھتے ہوئے ایمان کی ترغیب فرماتے ہیں۔ اور اچھے وعدوں کے ساتھ اسے طمع دلاتے ہیں تا کہ پورے طور پر التزام حجت اور عذر کامل کر دیا جائے۔ یہاں سے معلوم ہوا کہ علم الٰہی اسباب کی سببیت کو باطل نہیں کرتا کیونکہ علمِ الٰہی میں اسباب اور مسببات کا سلسلہ کہ بعض بعض پر مرتب ہوتے ہیں۔ ثابت ہے تو اللہ تعالیٰ کا علم سببیت اسباب کی تاکید کرنے والا ہے نہ اسے باطل کرنے والا اور اسی راز کو دریافت کر کے انبیاء علیہم السلام اور وارثانِ انبیاء کا علم مغلوبوں اور مجذوبوں کے علم سے ممتاز ہوا ہے جنہوں نے یقینی تقدیر میں مسببات کو واجب الوقوع خیال کر کے طلب' تلاش اور مبادی و اسباب میں کوشش کرنے سے ہاتھ کھینچ لیے ہیں۔ اور اسباب حاصل کرنے کے دروازے اپنے اوپر بند کر لیے۔ بخلاف انبیاء علیہم السلام کے جنہوں نے ہمیشہ اسباب حاصل کیے ہیں۔ اور اسباب ترک کرنے سے روکا ہے۔ انہوں نے اللہ تعالیٰ کی قدرت کو دیکھا اور اس کی حکمت سے جو کہ ہر مسبب کو اس کے سبب کے ساتھ مربوط کرنے والی ہے' چشم پوشی کی اور یہ دونوں کارخانوں کا لحاظ کرتے ہیں۔ اور دونوں طرفوں کی رعایت ان کی نظر میں منظور ہے۔

تیسری بحث یہ ہے اس سورۃ میں یہاں بَعْدَ الَّذِیْ جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ۔ آل عمران میں فَمَنْ حَآجَّكَ فِیْهِ مِنْ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ۔ اس سورۃ میں نسخِ قبلہ کے مقدمہ میں مِنْ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ اور سورۃ رعد میں بعد مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ واقع ہوا۔ پس یہ مراد ادا کرنے کے لیے کبھی لفظ من لایا جاتا ہے کبھی اسے ترک کر دیا جاتا ہے۔ اور کبھی الذی فرمایا ہے۔ اور کبھی ما اس تبدیلی انداز میں کیا نکتہ ہے؟ اور اس مقام کا ان عبارتوں میں سے ہر ایک کا تقاضا کس اعتبار پر مبنی ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ کلمہ الذی معرفہ کرنے میں ما کی نسبت زیادہ قوی ہے۔ اس لیے کہ کلمہ کبھی نکرہ نہیں ہوتا۔ اور اس کا صلہ واجب ہے۔ بخلاف ما کے کہ کبھی نکرہ بھی ہوتا ہے۔

نیز کلمۂ من جو کہ تبعیض پر دلالت کرتا ہے جب لفظ بعد پر داخل ہو تو وقت کو اور اس کی حد کو مقرر کرتا ہے۔ اور من کے بغیر لفظ بعد تمام اوقات کو عام کرتا اور گھیرتا ہے جب دونوں قاعدے معلوم ہو گئے تو ہر مقام کی اس عبادت کے ساتھ مناسبت جو وہاں اختیار کی گئی ہے' سہولت کے ساتھ نکالی جاسکتی ہے۔ مثلاً یہاں جو علم مراد ہے' ہدایتِ الٰہی کا علم ہے۔ جو کہ تمام امورِ دینیہ کو شامل ہے۔ جیسے ذات' صفات' نبوات' آخرت کے متعلق عقائد اور شرائع اور احکام اور یہ علم دو کمال رکھتا ہے' ایک عام ہونے کا کمال دوسرا ہمیشہ رہنے کا کمال کہ زمانۂ بعثت سے لے کر آخر تک باقی ہے بغیر کسی جدت اور تبدیلی کے۔ تو لفظ الذی جو کہ تعریف میں زیادہ مؤثر ہے اس علم کی تعریف کے کمال کا فائدہ دینے کے لیے مناسب ہوا۔ اور لفظ من جو کہ ابتدائے غایت کے لیے ہے' مناسب نہ ہوا۔ اس لیے کہ یہ علم کسی وقت کے ساتھ مقرر نہیں ہے۔ تاکہ اس کی حد کی ابتدا بیان کی جائے تو بَعْدَ الَّذِیْ جَآءَ كَ مِنَ الْعِلْمِ کی عبارت اس مقام کے لائق ہوئی۔

اور قبلہ کے مقدمہ میں علم سے مراد خاص علم ہے۔ جو کہ امر قبلہ سے متعلق ہے۔ اور وہ علم پہلے نہ تھا۔ بلکہ اس سے پہلے ایک اور علم تھا جو کہ بیت المقدس کی سمت منہ کرنے کا متقاضی تھا۔ پس اس جگہ لفظ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَ كَ مِنَ الْعِلْمِ مناسب ہوا۔ اور اسی طرح سورۂ آلِ عمران میں مراد وہ خاص علم ہے۔ جو کہ عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت سے متعلق ہے۔ اور وہ علم بھی موقت تھا وفد نجران کی گفتگو کے بعد نازل ہوا۔ پس وہاں بھی اسی عبارت کے ساتھ بیان کرنا مناسب ٹھہرا۔

اور اس سورۂ رعد میں اگرچہ علم خاص مراد ہے' حکمِ عربی کے نزول کے متعلق کہ قرآن سے عبارت ہے۔ لیکن وہ علم بھی علم ہدایت و دین کی طرح وقت کے ساتھ مقرر نہیں بلکہ بعثت شریفہ کے زمانے کی ابتدا سے لے کر اس کے آخر تک قائم اور باقی ہے۔ پس علم کی خصوصیت پر نظر کرتے ہوئے لفظ ما لایا گیا جو کہ تعریف میں کچھ کمی رکھتا ہے۔ اور اس سے ایک ابہام کی بو محسوس کی جاتی ہے۔ اور اس کے استمرار اور دوام پر نظر کرتے ہوئے من کے لفظ کو حذف کر دیا گیا تاکہ اشارہ ہو کہ یہ خاص' عام کی طرح ہمیشہ اور دائمی ہے اس کی ابتدا

نہیں ہے۔ اور اللہ تعالیٰ اپنے کلام کے اسرار کو بہتر جانتا ہے۔

چوتھی بحث یہ ہے کہ رسول علیہ السلام یقیناً معصوم ہیں۔ پس ان سے کافروں کی خواہشات کی پیروی کی نفی یقینی ہے۔ اور وہ شرط جس کا عدم یقینی ہے' لفظ لو کے استعمال کا مقام ہے نہ کہ حرف ان کے استعمال کا۔ تو یہاں حرف ان کو کیوں استعمال فرمایا گیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ رسول علیہ السلام سے یہ خطاب حقیقت کے اعتبار سے نہیں کہ جس میں شرط کے وقوع اور نفی کی قطعیت کی رعایت کر کے شرط کے الفاظ میں سے ان دونوں شقوں میں سے ایک کے ساتھ جو مناسب تھا' اختیار کیا گیا۔ بلکہ یہ تو فرض محال کی بنیاد پر ہے۔ اور فرض محال کا مقام مطلقاً وقوع شرط میں شک کا مقام ہے کہ ان کے استعمال کا محل ہے۔ اور اسی لیے ان کان زید حمارا فهو ناحق جیسے کلام میں ان استعمال ہوتا ہے نہ کہ لفظ لو۔ ہاں اگر حقیقت اور بیان واقع کے طور پر خطاب واقع ہوتا ہے تو شرط کے منفی ہونے کے متعلق یقین کی صورت میں لو کا استعمال متعین ہو جاتا جیسے لَوْ كَانَ فِيهِمَا آلِهَةٌ إِلَّا اللَّهُ لَفَسَدَتَا اور چونکہ ایسا نہیں۔ اس لیے استعمال بھی ایسا نہیں۔

کتاب اللہ کی تلاوت کے حق کا بیان

پانچویں بحث یہ ہے کہ کتاب اللہ کی تلاوت کا حق کیا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ حقِ تلاوت ادا کرنے میں چند چیزیں معتبر ہیں۔ جیسا کہ دورانِ تفسیر ان چیزوں کی طرف اشارہ کیا گیا لیکن ان چیزوں کی تفصیل جو کہ صحیح روایات میں وارد ہے۔ ان میں سے حاکم کی روایت ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے کہ آپ نے حق تلاوت کی تفسیر میں فرمایا يحلون حلاله ويحرمون حرامه ولايحرفونه عن مواضعه یعنی اس کے حلال کو حلال اور اس کے حرام کو حرام قرار دیتے ہیں۔ اور اسے اس کی جگہوں سے نہیں بدلتے۔ اور ان میں سے ابن جریر اور ابن ابی حاتم کی ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا يَتْلُوْنَهٗ حَقَّ تِلَاوَتِهٖ اے يتبعونه حق اتباعه ثم قرء ابن عباس والقمر اذاتلاها يقول تبعها یعنی اس کی پیروی کرتے ہیں۔ جیسا کہ پیروی کا حق ہے پھر ابن عباس نے یہ آیت پڑھی والقمر اذا تلاها یعنی اس کے پیچھے آئے۔

اور ان میں سے ابن ابی حاتم کی حضرت امیر المومنین عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا اذامر بذکر الجنة سئل اللّٰه الجنة واذامر مذکر النار تعوذباللّٰه من النار جب جنت کے ذکر سے گزرے تو اللہ تعالیٰ سے جنت مانگے۔ اور جب آگ کے ذکر سے گزرے تو آگ سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگے۔ اور خطیب کتاب الرواۃ میں مالک سے ابن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت کے ساتھ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے لائے کہ آپ نے فرمایا کہ کلام اللہ کا حقِ تلاوت یہ ہے کہ اس کے حلال کو حلال سمجھے اور اس کے حرام کو حرام جانے اور اسے اس طرح پڑھے جیسے نازل ہوئی اس کے کلمات کی تحریف نہ کرے اس کے معنوں کی فاسد تاویل نہ کرے۔ اور اس کے احکام کو دنیاداروں اور دولت مندوں کی دِلجوئی کے لئے نہ چھپائے۔

اور ان میں سے ابن جریر اور وکیع کی حضرت حسن بصری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا کلام اللہ کا حقِ تلاوت یہ ہے کہ اس کے محکمات پر ایمان لائے۔ اور ان کے مطابق عمل کرے۔ اور اس کی متشابہات پر ایمان لائے۔ اور جس کا سمجھنا اس پر مشکل ہو علمائے کرام کے سپرد کردے اور رد کرنے اور قبول کرنے اور تاویل وتمثیل میں اپنی ناقص عقل کو دخل نہ دے۔

اور یہاں سے پتہ چلا کہ حقیقت میں اہلِ کتاب وہی لوگ ہیں جنہوں نے اس طریقے سے کتاب کی تلاوت کو لازم کیا ہے۔ اور نفسانیت اور اپنے خاندانی اور قومی تعصب کو یا اپنے طور طریقے اور آئین کی حفاظت کو کتاب کی معرفت کے لیے پردہ نہیں بنایا ہے۔ نہ وہ لوگ جو کہ کتاب کو غرور وتکبر کا وسیلہ جانتے ہیں باولے کتے یا باردار گدھے کی طرح ہر کسی پر جھپٹتے ہیں۔ اور تکبر وخود بینی کے حجاب میں گرفتار ہیں۔ اور مطلقاً متبوع ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ پس اے بنی اسرائیل! ہم تمہیں پھر خطاب کرتے ہیں۔ جیسا کہ ابتدائے کلام میں تم سے خطاب کیا تھا۔ اور ہم فرماتے ہیں یَابَنِیْٓ اِسْرَآئِیْلَ! اے بنی اسرائیل! تم اپنے گمان میں مطلقاً متبوع ومقتداء ہونے کا مرتبہ رکھتے ہو یہاں تک سب پیغمبروں علیہم السلام سے کامل اور افضل المرسلین علیہ السلام کو اپنی پیروی کی تکلیف دیتے ہو تم سمجھتے نہیں

ہو کہ یہ شان اور مرتبہ تمہیں کس طرح حاصل ہوا۔

اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ اس نعمت کو یاد کرو جو میں نے تم پر انعام فرمائی اور اس نعمت کی وجہ سے تمہیں یہ لمبے چوڑے دعوے یاد آ گئے۔

وَاَنِّيْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ اور تحقیق میں نے تمہیں تمہارے جہان والوں پر بزرگی دی تھی۔ اور اگر چاہوں تو وہ بزرگیاں تم سے چھین لوں اور کسی اور کو دے دوں' وہ تمہاری ذاتی فضیلت نہیں تھی کہ جدا نہیں ہو سکتی۔ پس اس نعمت کا حق اور اس فضیلت دینے کے لائق یہ نہ تھا کہ تم میری آیات اور رسولوں علیہم السلام پر بڑائی مارو اور ان سے کفر کر کے میری نعمت کی ناشکری کرو۔

وَاتَّقُوْا اور اس باب میں ڈرو يَوْمًا لَّا تَجْزِيْ نَفْسٌ اس دن سے کہ کوئی نفس کار آمد نہ ہوگا۔ اگرچہ تم نے اس کی طرف منسوب ہو کر بزرگی حاصل کی ہوگی۔ جیسے حضرت یعقوب علیہ السلام ظاہری نسبت میں اور حضرت موسیٰ علیہ السلام معنوی نسبت میں۔

عَنْ نَّفْسٍ کسی نفس کے لیے۔ اگرچہ وہ اپنے آپ کو اس نفس کا تابع اور اس کی طرف منسوب خیال کرے۔ جب کہ وہ اللہ تعالیٰ' اس کی آیات اور اس کے رسل علیہم السلام پر تکبر کرے۔ اور کفر اختیار کرے۔ شَيْئًا کچھ بھی اگرچہ عذاب کا کچھ حصہ کم کر کے اور حساب میں قدرے تخفیف کے ساتھ ہو۔

وَلَا يُقْبَلُ مِنْهَا عَدْلٌ اور اس نفس سے کوئی عوض ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا۔ جو وہ اپنے پیروکار کی خلاصی کے لیے دے۔ اگرچہ اپنے تمام اچھے اعمال کو اس کے فدیہ کے طور پر دے دے۔ وَلَا تَنْفَعُهَا شَفَاعَةٌ اور کسی نفس کو کوئی شفاعت اور سفارش نفع نہ دے گی جو وہ اپنی طرف منسوب لوگوں کے حق میں ان کے کفر اور اللہ کی آیات اور اللہ تعالیٰ کے رسل علیہم السلام پر تکبر کے باوجود کرے گا اگرچہ قبول کرنے کے حق میں نفع دے گی۔

وَلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ اور نہ ہی وہ اس معاملہ میں بارگاہِ خداوندی سے مدد کیے جائیں گے۔ اگرچہ حقوق ضائع کرنے والوں سے ان کے حقوق لینے کے بارے میں ان کی مدد کی جائے گی۔ بمطابق اِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ

يَقُوْمُ الاشهاد (المؤمن آیت ۵۱)

اور احتمال ہے کہ منہا اور تنفعہا اور ہم کی ضمیر دوسرے نفس کی طرف راجع ہو جو کہ عذاب میں گرفتار ہے۔ اور اس کے مطابق معنی زیادہ ظاہر اور روشن ہے۔ جیسا کہ پوشیدہ نہیں ہے۔

چند جواب طلب سوال

یہاں چند جواب طلب سوال باقی رہ گئے۔ پہلا سوال یہ ہے کہ یہ آیت بالکل اسی طرح بنی اسرائیل کے واقعہ کی ابتدا میں گزری ہے یہاں اس کا لوٹانا کس مقصد کے لیے ہوا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ واقعہ کی ابتدا میں اس مضمون کا ذکر نعمتیں یاد دِلانے کے لیے تھا' نعمتوں کی ناشکری سے پرہیز کر کے' راہِ شکر اور منعم کا حق پہچاننے کا راستہ اختیار کریں۔ اور قصہ کے آخر میں اس مضمون کا ذکر اپنی متبوعیت کے دعویٰ اور افضل المرسلین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اپنی پیروی چاہنے کے رد اور باطل کرنے کے لیے ہے۔ اس لیے کہ جب اپنے حق میں اللہ تعالیٰ کی نعمت کو یاد کریں۔ اور جہانوں پر اپنی فضیلت ملاحظہ کریں تو سراغ لگائیں کہ اس دعویٰ کا منشا اور ابتدا ایک ایسی چیز ہے جو ہماری ذاتی نہیں۔ اور نہ ہی ہم نے بزرگوں سے اپنی نسبت کے زور سے پائی ہے۔ اور ہمارے آگے ایک ایسا دن ہے۔ جس دن کوئی نسبت اور نسب کام نہیں آئے گا۔ اور طریقہ حق کی پیروی کے بغیر کام نہیں بنتا اور کوئی راستہ نظر نہیں آتا۔

اور بعض مفسرین نے کہا ہے کہ قصہ کی ابتدا میں اس آیت کے لانے کی غرض یہ تھی کہ بنی اسرائیل کے حق میں اللہ تعالیٰ کی تمام نعمتوں کی اجمالاً یاد دِلا کر اس کا شکر طلب کیا جائے۔ اور اس دن سے کہ اسلاف کرام کی نسبت اور نسب کسی کے کام نہ آئے گا ڈرائیں اس دن کے بعد اس فرقہ کے اوقات اور اشخاص کے مطابق ان نعمتوں اور تفصیل کو سیر حاصل طریقے سے بیان فرمایا اس واقعہ کے آخر میں خلاصہ حساب اور صرف جمع وخرچ کے طور پر اس مضمون کو دوبارہ بیان کرنا مناسب ہوا۔ پس اس آیت کو اس طویل واقعہ کے آغاز اور انجام میں وارد کرنا اس طرح ہے۔ جیسا کہ حساب والے لوگ پہلے تو صرف جمع اور خرچ

لکھ لیتے ہیں کہ اس قدر جمع تھا۔ اور اتنا خرچ ہوا اس کے بعد تاریخوں اور مدوں پر تقسیم کرتے ہیں۔ اور جب حساب سے فارغ ہوتے ہیں تو پھر اسی جمع خرچ کو مختصر کر کے دوبارہ لکھ دیتے ہیں۔

دوسرا سوال یہ ہے کہ اس آیت میں گزشتہ آیت کے مطابق تین (۳) فرق ہیں۔ پہلا یہ کہ سابقہ آیت میں لَا یُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ فرمایا ہے۔ جبکہ اس آیت میں لَا تَنْفَعُهَا شَفَاعَةٌ ہے۔ دوسرا یہ کہ سابقہ آیت میں لَا یُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ فرمایا ہے۔ جبکہ یہاں لَا یُقْبَلُ مِنْهَا عَدْلٌ فرمایا۔ تیسرا یہ کہ سابقہ آیت میں شفاعت کی نفی کا ذکر پہلے فرمایا ہے۔ جبکہ یہاں فدیہ کی نفی کو پہلے بیان فرمایا اس فرق میں نکتہ کیا ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ اندازِ بیان کی تبدیلی کے بعض نکتے سابقہ آیت کی تفسیر میں گزر چکے ہیں' یاد کر لینے چاہئیں اور وہ جو اس وقت حاضر ہیں' یہ ہیں کہ شفاعت کا فائدہ مند ہونا دو چیزوں پر موقوف ہے' پہلی چیز یہ کہ شفاعت بذاتِ خود نفع دینے والی ہو نہ کہ مضر دوسری چیز یہ ہے کہ جس کے حضور شفاعت کی جائے وہاں مقبول بھی ہو۔ کیونکہ ظاہر ہے کہ اگر شفاعت بذاتِ خود نفع دینے والی ہو۔ جیسا کہ مال دینا' قید سے رہائی دینا اور وہ شخص اس شفاعت کو قبول نہ کرے تو اس شفاعت میں کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ اور وہ محض بے سود ہوگی۔ اور اسی طرح اگر شفاعت مقبول ہو جائے۔ لیکن بذاتِ خود مضر ہو جیسے حاکم کے سامنے چور کی سفارش تاکہ اسے سزا نہ ملے' وہ شفاعت بھی محض بے سود ہے تو ایک جگہ قبولیت کی نفی فرمائی اور دوسری جگہ نفع ختم کر دیا گیا تاکہ نفع کی دونوں طرفوں کی نفی کا بیان ہو جائے۔

مسئلہ شفاعت کی تحقیق

اور اس کی تحقیق یہ ہے کہ اس دن انبیاء علیہم السلام اور اولیائے اللہ شفاعت فرمائیں گے۔ لیکن ان کی عام شفاعت جو کہ بمنزلہ قاعدہ کلیہ کے بیان ملے ہے کہ انہیں بخش دے جو ایمان لائے۔ اور انہوں نے اچھے عمل کیے۔ یا اسے میرے رب! میرے پیروکاروں اور میرے فرمانوں کو بخش دے اور اس کی مثل شفاعت کافروں کے ہرگز کام نہ آئے گی۔ اگرچہ مقبول ہوگی اور ان کی خاص شفاعت ہر ہر کافر کے حق میں جیسے حضرت ابراہیم علیہ

السلام کی شفاعت آزر کے حق میں مقبول نہیں ہوگی۔

(اقول و باللہ التوفیق۔ یہ علیٰ سبیل الفرض ہے کہ مثلاً اگر وہ قیامت کے دن آزر کی شفاعت کریں تو قبول نہیں ہوگی گویا قانون شفاعت کی وضاحت کے لیے یہ جملہ کہا گیا ورنہ قیامت کے دن حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے چچا آزر کے لیے شفاعت نہیں کریں گے۔ کیونکہ سورۃ الشعراء میں آپ کی ایک دعا مذکور ہے واغفر لابی انہ کان من الضالین لیکن یہ دعا آپ نے اس لیے فرمائی تھی کہ آزر نے آپ سے ایمان کا وعدہ کیا تھا۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے کہ وما کان استغفار ابراھیم لابیہ الاعن موعدۃ وعدھا ایاہ' فلما تبین انہ عدواللہ تبرء منہ ان ابراھیم لاواہ حلیم۔ تبرء منہ سے آزر سے آپ کی بیزاری قطعاً ثابت ہوئی تو قیامت کے دن اس کی شفاعت کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ محمد محفوظ الحق غفر لہ)

پس انہیں دونوں وجہوں سے اپنے اسلاف کی شفاعت سے ناامید کیا گیا لیکن پہلی آیت کو مقبولیت کی نفی اور اس آیت کو نفع کی نفی کے ساتھ اس لیے خاص کیا گیا کہ پہلی آیت کے ماسبق میں کفر کا ذکر صراحت کے ساتھ ہوا ہے۔ فرمایا ولاتکونوا اول کافر بہ۔ پس وہاں مقبولیت کی نفی زیادہ مناسب ہوئی۔ جبکہ اس آیت سے پہلے منسوب ہونے اور تبع ہونے کا ذکر ہے۔ جسے وہ اپنے متبوعوں اور منسوب الیہم کی شفاعت کا وسیلہ گمان کرتے تھے تو یہاں نفع کی نفی زیادہ موزوں ہوئی۔ گویا یوں فرمایا گیا کہ اگرچہ انبیاء علیہم السلام اور تمہارے اسلاف کی شفاعت ان کے پیروکاروں اور ان کی طرف نسبت رکھنے والوں کے بارے میں مقبول ہے۔ لیکن تمہارے کفر کے ہوتے ہوئے نفع نہ دے گی کیونکہ تم پیروی اور ان کی نسبت سے خارج ہو گئے۔

نیز عدل کے ذکر میں اخذ اور قبول جدا جدا ہیں' ان دونوں میں کوئی تعلق نہیں ہے۔ کیونکہ جائز ہے کہ اخذ یعنی فدیہ لینا تو ہو لیکن رد یا قبول میں تردد کے طور پر ہو۔ یا قبول نہ ہو۔ اور اسی طرح جائز ہے کہ قبول ہو مگر فدیہ لیا نہ جائے۔ بلکہ قبول کے بعد سپرد نہ کریں۔ اور پہلی آیت میں جب قبول شفاعت کی نفی پہلے گزر چکی ہے۔ اور غالب طور پر دنیا میں

جب شفاعت قبول نہیں کرتے تو مقصد عوض لینا ہوتا ہے اس کی لفظ اخذ کے ساتھ نفی فرمادی تا کہ یہ وہم بھی زائل ہو جائے۔ اور اس آیت میں جب نفع شفاعت کی نفی پہلے نہیں گزری ہے تو عوض کی لفظ قبول کے ساتھ نفی فرمادی گئی کہ وہاں عوض دینا بھی قبول نہیں ہوگا چہ جائیکہ لیا جائے۔ کیونکہ لینا' دینے کے بعد ہوتا ہے۔

رہی عوض میں شفاعت کی پہلے یا بعد میں ذکر کرنے کی وجہ تو وہ یہ ہے کہ حادثہ کی ابتدا میں شفاعت عوض دینے سے پہلے کرتے ہیں۔ اور جب حادثہ لمبا ہو جاتا ہے۔ اور طول پکڑتا ہے تو عوض کو شفاعت سے پہلے لاتے ہیں۔ اور پہلی آیت میں حادثہ کی ابتدا ہے۔ اور اس آیت میں اس کی انتہا' اللہ تعالیٰ اپنے کلام کے اسرار کو بہتر جانتا ہے۔ اور دو آیتوں کے انداز میں فرق کا زیادہ تر دارومدار وہ غرض ہوتی ہے۔ جس کے لیے کلام لایا جائے۔ کیونکہ گزشتہ آیت میں وہ غرض بنی اسرائیل کو اس پیغمبر علیہ السلام کی پیروی پر اور ان بُرے کاموں کو ترک کرنے پر اُبھارنا ہے۔ جیسے کتاب میں ردوبدل کرنا' حق کو باطل کے ساتھ ملانا۔ رسول کریم علیہ السلام کی نعت کو چھپانا۔ نماز اور زکوٰۃ کو ترک کرنا۔ لوگوں کو نیکی کا حکم دینا۔ اور خود اس کے مطابق عمل نہ کرنا' طمع اور حرص کے جال میں گرفتار ہونا صبر نہ کرنا۔ اور اللہ تعالیٰ کے حضور حاضری کی پرواہ نہ کرنا جبکہ اس آیت کا مقصد ان شبہات کو دُور کرنا ہے۔ جو کہ وہ پیغمبر وقت علیہ السلام کی رسالت کے بارے میں لائے تھے۔ اور اپنے آپ کو ان کی پیروی سے بالاتر خیال کرتے تھے۔ بلکہ وہ خود کو ہر طرح رہبر اور بالکل نجات پانے والا گمان کرتے تھے۔ اور فضیلت اور بزرگی کو اپنی ذاتی شے سمجھتے تھے۔ اور جنت اور اخروی نعمتوں کو ذاتی طور پر اپنے لیے تصور کرتے تھے۔ اور اسی لیے اس آیت کے بعد نعمتیں یاد نہیں دِلائیں بلکہ ان کے مطلق رہبری اور امامت کے خیال کو دُور کرنے کے لیے ارشاد فرمایا ہے۔ کیونکہ ان کے عناد اور کفر کی جڑ یہی خیال تھا۔

وَاِذِ ابْتَلٰٓی اِبْرٰھٖمَ اور اس وقت کو یاد کرو جبکہ ابراہیم کو آزمائش کے طور پر فرمایا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے واقعہ کی ابتدا کا بیان

جو کہ تارخ بن ناخور کے بیٹے تھے۔ اور تارخ کا لقب آزر بھی بیان کرتے تھے (اقول

و باللہ التوفیق محققین کے نزدیک آزر حضرت ابراہیم علیہ السلام کا دُور کے رشتے کا چچا ہے باپ نہیں۔ آپ کے والد کا نام تارخ ہے۔ چنانچہ مسالک الحنفاء میں امام جلال الدین السیوطی رحمۃ اللہ علیہ ۲۸ پر نقل فرماتے ہیں کہ ابن ابی شیبہ ابن المنذر اور ابن ابی حاتم نے بعض صحیح طرق سے امام مجاہد سے روایت کی ہے لیس آذر ابا ابراھیم یعنی آزر حضرت ابراہیم علیہ السلام کا باپ نہیں۔ نیز ابن المنذر نے سند صحیح کے ساتھ ابن جریج سے اللہ تعالیٰ کے قول واذقال ابراھیم لابیہ آزر (الانعام آیت ۷۴) کی تفسیر میں یہ قول نقل فرمایا قال لیس آزر بابیہ انما ھو ابراھیم بن تیرخ او نارخ اور قرآن پاک میں جہاں بھی آزر پر اب کا اطلاق ہوا ہے وہاں چچا مراد ہے۔ چنانچہ فرمایا بان العرب کانوا یطلقون لفظ الاب علی العم اطلاعا شائعاً وان مجازا یعنی چچا پر لفظ اب کا اطلاق عرب کی لغت میں عام ہے۔ اگرچہ مجازاً ہے۔ بلکہ قرآن پاک میں بھی چچا کو اب کہا گیا ہے ام کنتم شھداء اذ حضر یعقوب الموت اذ قال لبنیہ ما تعبدون من بعدی قالوا نعبد الھك والہ آبائك ابراھیم و اسماعیل واسحاق۔ یہاں حضرت اسماعیل علیہ السلام پر اب کا لفظ بولا گیا حالانکہ آپ حضرت یعقوب علیہ السلام کے چچا ہیں۔

نیز ۱۸ پر امام فخر الدین رازی رحمۃ اللہ علیہ کی تفسیر اسرار التنزیل کے حوالہ سے نقل فرمایا ان آباء الانبیاء ما کانوا کفاراً کہ انبیاء علیہم السلام کے باپ کافر نہ تھے۔ ان میں سے ایک دلیل یہ ہے الذی یراك حین تقوم وتقلبك فی الساجدین' قیل معناہ انہ کان ینقل نورہ من ساجد الی ساجد یعنی حضور علیہ السلام کا نور اللہ تعالیٰ کے حضور سجدہ گزاروں میں منتقل ہوتا رہا۔ وبھذا التقدیر الآیۃ والۃ علی ان جمیع آباء محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کانوا مسلمین وحینئذ یجب القطع بان والد ابراھیم ما کان من الکافرین' انما ذاك عمہٗ یعنی مندرجہ بالا معنی کے مطابق یہ آیت دلالت کرتی ہے کہ حضرت سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے تمام آباء و اجداد مسلمان تھے۔ اور اس لیے یہ یقین کرنا بھی واجب ہوا کہ حضرت ابراہیم علیہ

السلام کے والد کافر نہ تھے۔ بلکہ وہ تو آپ کے چچا ہیں اس مسئلہ کی تفصیلات کے لیے مسائل تسعہ امام سیوطی رحمتہ اللہ علیہ اور تفسیر نعیمی از حکیم الامت مولانا مفتی احمد یار خان صاحب نعیمی گجراتی کا مطالعہ بہت مفید ہے۔ نیز اس تفسیر میں جہاں کہیں بھی آزر کے متعلق حضرت مفسر علام ذکر کریں وہاں مندرجہ بالا وضاحت پڑھ لی جائے تا کہ حقیقت مسئلہ سامنے رہے۔ محمد محفوظ الحق غفرلہ)

اور حضرت ابراہیم علیہ السلام نمرود بن کنعان کے دور حکومت میں مضافات شہر بابل کے قصبہ کوثی میں حضرت نوح علیہ السلام کے طوفان کی تاریخ سے ۳۷۰۹ میں پیدا ہوئے۔ اور آپ میں بچپنے سے ہی ہدایت کے نشانات ظاہر ہو گئے۔ اور آپ نے اپنے چچا اور قوم کے ساتھ بت پرستی کے ردو ابطال کے لئے بحثیں اور مناظرے کئے یہاں تک آپ نے بتوں کو توڑ دیا۔ اور آپ کی قوم نے کینہ اور بغض کی وجہ سے آپ کو آگ میں جلانا چاہا۔ آگ کو خوب جلایا اور آپ کو اس میں ڈال دیا۔ آپ کے پروردگار نے آپ کو اس آگ سے صحیح وسالم باہر نکال لیا پھر آپ کا چچا اور آپ کی قوم والے آپ کے دشمن ہو گئے حتیٰ کہ آپ اپنا گھر بار چھوڑ کر حران کی طرف اور وہاں سے شام اور فلسطین کی طرف ہجرت فرما گئے۔ اور اسی سرزمین کو آپ نے وطن بنالیا۔ حق تعالیٰ نے چاہا کہ آپ کو اس کے بدلے کہ آپ نے اس کی رضا کے لیے اپنے آپ کو آگ میں جلنے کے لیے پیش کر دیا۔ اور آپ نے اپنا گھر بار خویش واقارب کو اس کی راہ میں ترک کر کے پردیس اختیار کیا۔ بہت اونچا مرتبہ عطا فرمائے جو کہ اس وقت تک آدمیوں میں سے کسی کو وہ مرتبہ حاصل نہ ہو۔ پس بعض باتیں فرما کر ان کی چھپی ہوئی استعداد کو ظاہر فرمایا۔

رَبُّهٗ ابراہیم علیہ السلام کے پروردگار نے۔ کہ بچپنے سے آپکی رنگارنگ تربیت فرمائی اور آپ کو اعلانِ نبوت وخلت کے مرتبہ تک پہنچایا۔ اور اس کی تربیت ہر وقت ابراہیم علیہ السلام میں ایک نیا رنگ پیدا کرتی تھی۔ اور ہر تربیت کے بعد آپ میں ایک بلند استعداد اور عظیم مرتبے کا استحقاق ظاہر ہوتا تھا حتیٰ کہ رب تعالیٰ نے آپ کو مامور فرمایا۔

بِكَلِمٰتٍ چند باتوں کے ساتھ کہ ان کے بجالانے کی وجہ سے عالم بالا اور زیریں

کے فرشتوں پر ظاہر ہو جائے کہ یہ شخص اسی مرتبہ کے لائق تھا۔ اور اس شخصیت کو یہ منصب عطا فرمانا حکمت کی شان میں ضروری اور لازم معلوم ہوتا تھا۔ اور یہی اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا دائمی دستور ہے کہ مرتبے' عہدے' جزائیں اور اجر دینے میں اپنے علم پر اکتفاء نہیں فرماتا جب تک کہ اس کے مستحق اور مستعد ہونے کی زبان کو اس طرح گویا نہ کرے کہ زمین و آسمان کے سب رہنے والے اس حتمی فیصلے کا قالی اور حالی زبانوں کے ساتھ اس کے لیے تقاضا نہ کریں۔ اور یہ معاملہ امتحان اور آزمائش کے ساتھ بہت ہی مشابہت رکھتا ہے اس لئے اس کا اس لفظ کے ساتھ موسوم کرنا بہت موزوں اور مناسب ہوا۔ ورنہ اللہ تعالیٰ کو جو کہ علام الغیوب ہے اور مستقبل کے واقعات اس کے علم میں ماضی کا حکم رکھتے ہیں' امتحان و آزمائش کی کیا ضرورت ہے۔

وہ کلمات جن کے ساتھ ابراہیم علیہ السلام کا امتحان لیا گیا

اور وہ چند باتیں جن کے ساتھ بطور امتحان ابراہیم علیہ السلام کو مامور فرمایا گیا اور ان باتوں کو بجالانے کے ساتھ آپ کی خفیہ استعداد کو ظاہر کیا گیا' آپ کی چند چیزوں سے تعلق رکھتی تھیں۔ پہلے آپ کی قوتِ علمیہ اور فکریہ کے ساتھ۔ کہ آپ کو بت پرستوں کے ساتھ مناظرہ اور جھگڑا کرنے پر مامور فرمایا۔ اور آپ نے اس ضروری کام کو نہایت اچھے طریقے سے سرانجام دیا۔ پہلے آپ نے سورج' چاند اور ستارے کو حادث ہونے اور ایک حال سے دوسرے حال میں بدلنے کی وجہ سے معبود ہونے کی اہلیت سے نکال باہر کیا۔ دوسرے آپ نے بتوں کو توڑا اور رب الارباب کی کمزور مخلوق آدمی کی قوت کے مقابلہ میں ان کے عاجز ہونے کی دلیل سے واضح کیا۔ تیسرے آگ پوجنے والوں کو الزام دینے کے لیے اپنے آپ کو آگ کے سپرد کر دیا۔ اور آگ کی تاثیر کو اللہ تعالیٰ کی طاقت کے ساتھ باطل کر دیا۔ اور آگ کی روح کو اس کے فعل اور طبعی اثر ڈالنے سے ہٹا کر ٹھنڈک میں بدل دیا اس بے مثل ترتیب کے ساتھ آسمان و زمین کی روحانیات کو معبود ہونے کی اہلیت سے معزول کر دیا۔ اور جسمانی اور روحانی اسباب کو ایک قہار مسبب کے ارادہ کے آگے بے کار ظاہر فرمایا۔ حتیٰ کہ زبان سے یہ دعویٰ لائے اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ

حَنِيْفًا وَّمَا اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ۔ (الانعام آیت ۷۹)

اور اس دعوے کی سچائی کے امتحان کے لیے آپ کو چند چیزوں میں آزمایا تا کہ آپ کی روح کو امتحان کی کسوٹی اور معرفت کے معیار پر رکھیں۔

پہلی چیز اپنی قوم اور خاندان سے بلکہ اللہ تعالیٰ کے سوا ہر چیز بے زاری جیسا کہ خالص دوست اور سچے خلیل کی نشانی ہے کہ محبوب کے سوا ہر شے سے بے زار ہوتا ہے۔ اور اسی لیے فرمایا اِنِّیْ بَرِیْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ (الانعام آیت ۷۸) نیز فرمایا اِنَّنِیْ بَرَآءٌ مِّمَّا تَعْبُدُوْنَ (الزخرف آیت ۲۶) اور اِنَّا بُرَءٰٓؤُا مِنْكُمْ (الممتحنۃ آیت ۴) بلکہ یہ بے زاری دشمنی تک جا پہنچی کہ فرمایا فَاِنَّهُمْ عَدُوٌّ لِّیْٓ اِلَّا رَبَّ الْعٰلَمِیْنَ (الشعراء آیت ۷۷)

دوسری چیز واسطوں کو اٹھانا اور محبوب میں حجاب کے بغیر نگاہیں جمانا۔ یہاں تک کہ سخت شدید حاجت کے وقت حضرت جبریل علیہ السلام سے فرمایا اما الیك فلاحاجة یعنی مجھے تیری کوئی حاجت نہیں۔

تیسری چیز اللہ تعالیٰ کے امر کے سامنے جھک جانا۔ اور اس کی رضا میں اپنی جان اور مال کے نقصان کے ساتھ انتہائی خوشی حاصل ہونا۔ جیسا کہ پیارے وطن سے ہجرت اور بیٹے کو ذبح کرنے کے حکم کے وقت آپ سے ظاہر ہوئی اور مہمانوں کی مہمان نوازی اور گداؤں پر ایثار کرنے میں ہمیشہ ظاہر ہوتی تھی۔ اور ظاہر ہے کہ آدمی کو دنیوی امور میں سب سے زیادہ عزیز یہی چار چیزیں ہوتی ہیں: جان، مال، اولاد اور وطن جو کہ قریبیوں اور قبیلوں کو جامع ہوتا ہے۔ اور ان چیزوں کی حفاظت کے لیے آدمی کس قسم کی بے صبریاں نہیں کرتا۔ جب آپ نے ان چاروں چیزوں کو اپنے مولا کی رضا پر قربان کر دیا تو آپ کی محبت اور خلت پورے طور پر ثابت ہوگئی۔ اور اسی لیے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے ان مبہم کلمات کی تفسیر میں فرمایا ہے کہ الکلمات التی ابتلی بها ابراهیم فراق قومه فی الله حین امره الله بمفارقتهم ومحاجة نمرود فی الله حین قال انا احیی وامیت وصبره علی قذفهم ایاه فی النار لیحرقوه فی الله والهجرت بعد ذالك من وطنه وبلاده حین امره بالخروج عنهم وما امره به من الضیافة والصبر علیها وما ابتلی

به من ذبح ولده یعنی وہ کلمات جن کے ساتھ حضرت ابراہیم علیہ السلام آزمائے گئے' اللہ تعالیٰ کی رضا میں اپنی قوم سے جدائی جب اللہ تعالیٰ نے آپ کو ان سے جدا ہونے کا حکم دیا۔ اللہ تعالیٰ کی رضا میں نمرود سے مناظرہ جب اس نے کہا کہ میں زندہ کرتا اور مارتا ہوں اور جب انہوں نے جلانے کے لیے آپ کو آگ میں پھینکا تو اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے آپ کا صبر کرنا اور اس کے بعد اپنے وطن اور علاقے سے ہجرت کرنا جب کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو وہاں سے نکل جانے کا حکم دیا۔ اور آپ کو جو مہمان نوازی کا حکم دیا۔ اور اس پر آپ کا کاربند رہنا اور اپنے بیٹے کو ذبح کرنے کے لیے جو آپ کو آزمایا گیا۔

اور اگر اس معاملہ میں غور کیا جائے جو آپ نے حضرت اسماعیل علیہ اسلام کے ساتھ ان کے عین بچپنے میں اور ان کی والدہ حضرت ہاجرہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ صرف اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق کیا تو بشری طاقت سے باہر معلوم ہوتا ہے۔ مختصر یہ کہ ان تمام مشقت طلب ذمہ داریوں کا مقصد آپ کے حال کی اچھائی' آپ کی عملی قوت اور آپ کے تمام لطائف اور روحی قوتوں کے حکمِ خداوندی کے حضور مطیع ہونے کا اظہار تھا جنہیں آپ نے اَسْلِمْ کے خطاب کے جواب میں اجمالی طور پر یوں عرض کیا تھا کہ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعَالَمِیْنَ

پھر آپ کے بدن اور جسم کو بھی محبت سے داغ دار فرمایا جیسا کہ عاشق اپنے معشوقوں کے لیے اپنے بدن پر داغ لیتے ہیں۔ اور اس کی وجہ سے ان کے دعویٰ عشق کی سچائی ثابت ہوتی ہے۔ اور ان داغوں میں سب سے عمدہ ختنہ تھا جو کہ جماع اور مقاربت کی ذلیل بہیمانہ خواہش کی جگہ کو کاٹنا ہے۔ تاکہ یاد رہے کہ رب العزت جل مجدہ کے داغ والے اس عضو کو اس کے غیر پسندیدہ مقام پر صرف نہیں کرنا چاہیے۔ اور اسی لیے تورات میں وارد ہوا ہے کہ ختنہ ابراہیم علیہ السلام اور ان کی اولاد پر خدا تعالیٰ کا داغ ہے۔ جیسے شاہی گھوڑوں اور جانوروں کے داغ لگائے جاتے ہیں۔ اور ان داغوں میں مونچھیں پست کرنا ہے۔ اور زیر ناف کے بال صاف کرنا' ناخن اُتارنا' بغل کے بال اُکھاڑنا۔ استنجا کے وقت بول و براز کے مقامات کو دھونا۔ وضو میں کلی کرنا اور ناک میں پانی ڈالنا' نماز اور ذکر کے وقت ہمیشہ

مسواک کرنا' کنگھی کے ساتھ سر کے بالوں کی مانگ نکالنا' عطر و خوشبو استعمال کرنا' پہننے کے کپڑے صاف رکھنا' ہر جمعہ میں بدن کے جوڑوں کو دھونا۔ اور آپ کو ایک روز کچھ عبادات اذکار اور اخلاق کو لازم کرنے کی تاکید فرمائی۔

سہام الاسلام کا بیان

اور وہ سب تیں (۳۰) خصلتیں ہیں جن کا نام سہام الاسلام ہے' ان میں سے دس (۱۰) سورۂ برأت میں مذکور ہیں: توبہ' عبادت' حمد' سیاحت' رکوع' سجود' امر بالمعروف' نہی عن المنکر ۔ ہر چیز میں اللہ تعالیٰ کی مقرر کی ہوئی حدوں کی حفاظت اور ایمان۔ اور ان میں سے دس (۱۰) سورۂ احزاب میں ہیں: اسلام' ایمان' قنوت' صدق' صبر' خشوع' صدقہ دینا' روزہ رکھنا۔ شرم گاہ کو بدکاری' لواطت' سحاق اور اجنبی کی نظر سے بچانا۔ اور زبان اور دل سے ہمیشہ ذکر کثیر کرنا اور ان میں سے دس (۱۰) سورۂ مومنون اور سائل میں ہیں: ایمان' یومِ جزا کی تصدیق' اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ہمیشہ ڈرنا۔ نماز میں خشوع۔ اس کے آداب' عادات' سنن اور مستحبات کی حفاظت کرنا۔ بے ہودہ گفتگو' بے فائدہ باتوں' کھیل کود اور مسخرگی سے پرہیز اور روگردانی کرنا۔ خوش دِلی سے زکوٰۃ دینا۔ اس عورت سے اپنی شرم گاہ کی حفاظت کرنا جو کہ اپنے نکاح یا ملک میں نہیں۔ عہد کو پورا کرنا۔ امانت ادا کرنا۔ گواہی پر قائم رہنا۔

اور اگرچہ ان مذکورہ سورتوں میں سے بعض خصلتیں ایک دوسرے میں داخل ہیں۔ لیکن احتمال ہے کہ قیود' خصائص اور اپنے ساتھ مذکورہ اعمال کے ساتھ مل کر علیحدہ اور جدا خصلتوں کا حکم پیدا کریں۔ اور ہر جگہ جدا شمار کی جائیں۔

پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حکم ہوا کہ ہر سال میں ایک مرتبہ اپنے آپ کو فریفتہ اور شیدائی بنا کر دیوانوں اور عاشقوں کی طرح اپنے محبوب کے گھر کے اردگرد گھومنے کے لیے ننگے سر' ننگے بدن' ننگے پاؤں' بکھرے بالوں' پریشان حال اور گرد آلود ہو کر شام سے سرزمینِ حجاز میں پہنچ کر کبھی پہاڑ پر کبھی زمین پر اس کے گھر کی طرف منہ کر کے کھڑے ہوں۔ اور کبھی اس کے دشمن کو اپنے خیال میں تصور کر کے اس پر لعنت اور پھٹکار کے پتھر پھینکیں۔ اور اس

کی خاطر اپنی جان کے بدلے اپنی مملوکہ چیزوں میں سے سب سے پیاری شے کی جان کی قربانی کریں اس کے بعد اس کے تجلیات سے معمور گھر کے گرد طواف کریں۔ اور بار بار اس کے گوشوں کو چومیں اور چاٹیں تا کہ عشق و محبت کا جو معنی ان کے باطن میں چھپا ہوا ہے' صورت کے لباس میں جلوہ گر ہو اور خاص و عام اس کا مشاہدہ کریں۔ اور اس دوران بلند آواز کے ساتھ لبیک کہتے ہوئے نعرے لگائیں اور اندرونی محبت کی آگ کو بھڑکائیں اور اس کیفیت کی نمائش کے لیے ان کے لیے مناسک مقرر ہوئے۔ اور شریعت نے طواف۔ صفا و مروہ کے درمیان سعی کرنا۔ مزدلفہ و عرفات کا آنا جانا۔ منیٰ میں ٹھہرنا۔ قربانی ذبح کرنا۔ تلبیہ کہنا اور احرام باندھنا مقرر فرمایا۔

اور حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان تمام ذمہ داریوں کو جو کہ بعض تو بشر کی عقلِ ناقص میں اچھی معلوم ہوتی تھیں اور اکثر بشر کے فہم سے بالاتر تھیں' دل و جان کے ساتھ پوری مسرت و خوشی سے قبول کیا۔

فَاَتَمَّهُنَّ پس حضرت ابراہیم علیہ السلام ان تمام باتوں کو کمی بیشی' سستی اور غفلت کے بغیر پورے طور پر بجالائے۔ یہاں تک کہ دوسرے مقام پر آپ کے حق میں فرمایا وَاِبْرٰهِیْمَ الَّذِیْ وَفّٰۤی (النجم آیت ۳۷) اور وہ ابراہیم جس نے اپنی ذمہ داری کو پورا کیا۔ اور مصنف ابن ابی شیبہ اور حدیث کی دوسری کتابوں میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت ہے کہ ما ابتلی بهذ الدین احد فقام به کله الا ابراهیم یعنی اس دین کے ساتھ کوئی شخص آزمایا نہیں گیا جس نے پورے طور پر اسے قائم کیا ہو سوائے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے۔

ختنہ کا بیان

اور ابوالشیخ نے کتاب العقیقہ میں موسیٰ بن علی بن رباح' انہوں نے اپنے باپ سے روایت کی جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ختنہ کا حکم فرمایا گیا اس وقت آپ کی عمر مبارک ۸۰ برس تھی۔ آپ نے گھر میں موجود تیشے کے ساتھ فوراً حکم کی تعمیل کی۔ بہت درد ہوئی' بارگاہِ خداوندی میں دعا کی' اللہ تعالیٰ نے وحی بھیجی کہ تو نے جلدی کی اور اس سے پہلے

کہ ہم اس کام کے طریقہ اور آلے کے متعلق بتائیں تو نے اپنے آپ کو پریشانی میں ڈال لیا۔ آپ نے عرض کی کہ اے میرے پروردگار! میں نے تیرے حکم کی تعمیل میں ایک لحہ کے لیے دیر کرنا پسند نہ کیا۔ اور بیہقی نے روایت کی ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حضرت اسحاق علیہ السلام کی ولادت کے ساتویں دن آپ کا ختنہ فرمایا۔ اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کا بالغ ہونے کے بعد تیرہ (۱۳) سال کی عمر میں۔ اور حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی حضرت حسنین کریمین رضی اللہ عنہما کا ولادت کے ساتویں دن ختنہ فرمایا۔

اولیات ابراہیم علیہ السلام

اور بیہقی نے زہری سے روایت کی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ جو اسلام لائے چاہئے کہ ختنہ کرے۔ اور حاکم اور بیہقی نے طریق صحیحہ کے ساتھ روایت کی ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام پہلی شخصیت ہیں جنہوں نے رسم ختنہ جاری فرمائی اور آپ سے پہلے انبیاء علیہم السلام ختنہ شدہ پیدا ہوتے تھے۔ اور جس کے سب سے پہلے بال سفید ہوئے' حضرت ابراہیم علیہ السلام ہیں جب آپ نے اپنے بالوں میں سفیدی دیکھی تو عرض کی بارِ خدایا یہ کیا ہے؟ حکم ہوا کہ وقار ہے۔ عرض کی رب زدنی وقارا۔ اے میرے رب! میرا وقار زیادہ فرما۔ اور سب سے پہلے جس نے لبوں کے بال لئے' ناخن تراشے اور زیر ناف بال دُور کرنے کو جاری کیا اور پابندی کی وہ بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام ہیں۔ اور سب سے پہلے جس نے سلی ہوئی چادر پہنی جسے شلوار کہتے ہیں' بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام ہیں۔ آپ سے پہلے دھوتی پہننے کی عادت تھی۔ اور وکیع کی مسند میں مروی ہے کہ اوحی اللّٰہ تعالٰی الی ابراھیم انك اکرم اھل الارض علی فاذاسجدت فلاتری الارض عورتك فاتخذ سروالا یعنی اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف وحی فرمائی کہ آپ میرے نزدیک سب زمین والوں سے زیادہ معزز ہیں۔ تو جب آپ سجدہ کریں تو زمین آپ کے ستر کو نہ دیکھے تو آپ نے شلوار اختیار فرمائی۔ اور دیلمی حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت سے لائے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ جس نے سب سے پہلے (سیاہی کے بغیر) خضاب' مہندی اور وسمہ لگایا' حضرت ابراہیم علیہ

السلام ہیں۔

اور ابن ابی شیبہ اپنی مصنف میں لائے کہ اول من خطب علی المنبر ابراھیم خلیل الرحمن یعنی جس نے سب سے پہلے منبر پر خطبہ دیا' اللہ تعالیٰ کے خلیل حضرت ابراہیم علیہ السلام ہیں۔ اور بزار اور طبرانی نے معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کی روایت بیان کی کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے تھے کہ اگر میں اپنے لیے منبر بنواؤں تو کوئی حرج نہیں ہے۔ کیونکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بھی منبر استعمال فرمایا ہے۔ اور ابنِ عساکر حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی روایت سے لائے کہ سب سے پہلے جس نے راہِ خدا میں جہاد کیا' حضرت ابراہیم علیہ السلام ہیں۔ اور سب سے پہلے جس نے جنگ میں لشکر کو آراستہ کیا اور میمنہ' میسرہ اور قلب مقرر کیا' حضرت ابراہیم علیہ السلام ہیں۔ اور یہ واقعہ اس وقت ہوا جب رومی حضرت لوط علیہ السلام کو گرفتار کر کے لے گئے تھے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان کے خلاف جہاد فرمایا۔ اور حضرت لوط علیہ السلام کو چھڑا لیا۔

اور مصنف ابن ابی شیبہ میں ان لفظوں کے ساتھ روایت آئی ہے کہ اول من عقد الالوایه ابراھیم کہ سب سے پہلے جس نے جہاد میں جھنڈے باندھے' حضرت ابراہیم علیہ السلام ہیں۔ اور بیہقی نے شعب الایمان میں روایت کی ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا مہمان نوازی کی کثرت کی وجہ سے ابوالضیفان لقب تھا۔ اور آپ کے مکان مبارک کے چار دروازے تھے۔ تاکہ جس طرف سے چاہے' مہمان داخل ہو جائے۔ اور جب حضرت ابراہیم علیہ السلام چاشت کا کھانا کھانا چاہتے تو اپنی اقامت گاہ کے چاروں طرف سے ایک ایک کوس تک مہمان کی تلاش کرتے اور جب تک مہمان نہیں پہنچتا تھا' چاشت کا کھانا نہیں کھاتے تھے۔ کیونکہ چاشت کا وقت مہمان کے آنے کا وقت نہیں ہوتا۔ اور مسند امام احمد میں وارد ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بارگاہِ خداوندی میں عرض کی کہ بارِ خدایا زمین میں میرے سوائے کوئی نہیں ہے جو تیری عبادت کرے۔ حق تعالیٰ نے تین ہزار ملائکہ اُتارے تاکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ عبادت میں شریک ہوں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام تین دن تک فرشتوں کی امامت میں مصروف رہے۔ اور ابن سعید

نے روایت کی ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو مال اور خدام کی بہت وسعت دی گئی تھی۔ سب سے پہلے جس نے ثرید (شوربے میں روٹی کے ٹکڑے بھگو کر کھانا) بنایا' حضرت ابراہیم علیہ السلام ہیں۔

شیر مال کے ایجاد کرنے والے کا اور حکم معانقہ کا بیان

اور دیلمی نے حضور علیہ السلام سے روایت کی ہے کہ جس نے سب سے پہلے شیر مال تیار کیا' حضرت ابراہیم علیہ السلام ہیں۔ جو کہ اپنے مہمانوں کے لیے تیار کرتے تھے۔ اور کھلاتے تھے۔ اور خطیب اپنی تواریخ میں تمیم داری رضی اللہ عنہ کی روایت سے حضور علیہ السلام سے لائے کہ لوگوں نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھا کہ مرد کا مرد کے ساتھ معانقہ کرنے سے متعلق آپ کیا فرماتے ہیں؟ آپؐ نے فرمایا کہ معانقہ درست ہے۔ پہلوں میں بھی تھا۔ اور ان کی دوستی کے خلوص اور ملاقات کے آداب کی تکمیل کی علامت تھا۔ اور دوستی کے اظہار کے وقت سب سے پہلے جس نے معانقہ کیا' وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام ہیں۔ اور اس کا واقعہ یوں تھا کہ آپ ایک دن اپنے مویشیوں کی چراگاہ کی طلب میں بیت المقدس کے پہاڑ میں سیر فرما رہے تھے۔ تاکہ اپنے مویشیوں کو رکھنے کے لیے کوئی جگہ تلاش کریں اسی دوران آپ نے ایک غمگین اور نرم آواز سنی کہ کوئی ذکر کرنے والا اللہ تعالیٰ کا ذکر کر رہا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی تقدیس اور پاکی کی صفات بیان کر رہا ہے اس آواز کو سنتے ہی اپنے مقصد کو بھلا کر اس آواز کی طرف متوجہ ہوئے۔ دیکھا کہ ایک دراز قد والا بوڑھا جس کا جسم بالوں سے پُر ہے' کھڑا اللہ تعالیٰ کی توحید کا ذکر کر رہا ہے۔ آپ اس کے پاس گئے۔ اور پوچھا کہ اے بوڑھے! تیرا خدا کون ہے۔ جسے تو یاد کر رہا ہے؟ اس نے کہا کہ میرا خدا آسمان میں ہے۔ پوچھا زمین میں بھی وہی خدا ہے یا کوئی اور؟ اس نے کہا زمین میں بھی وہی خدا ہے اس کے سوا کوئی اور خدائی کا اہل نہیں۔ پھر پوچھا کہ تیرا قبلہ کہاں ہے۔ اس نے کہا کعبہ کی طرف۔ پھر آپ نے پوچھا کہ تو کہاں سے کھاتا ہے؟ اس نے کہا کہ جنگل میں خود بخود اُگنے والے غلے کے پکنے کے وقت جو کہ موسم گرما کے آخر میں ہوتا ہے' میں باہر آتا ہوں اور وہ دانہ غلہ جمع کر کے رکھ لیتا ہوں تاکہ سردیوں میں کام آئے' وہی کھانا کھاتا ہوں۔

آپ نے پھر پوچھا کہ تیرے اہل وعیال میں سے کوئی باقی ہے جو تیری خدمت کرے؟ اس نے کہا نہیں۔ آپ نے پھر پوچھا کہ تیرا گھر کہاں ہے؟ اس نے کہا کہ اس پہاڑ کے غاروں میں سے ایک غار میں وقت گزارتا ہوں۔ آپ نے فرمایا کہ آؤ اس غار کا نشان دو تا کہ تمہارے ہمراہ میں تمہارے گھر جاؤں اور تیرے قبلہ کی سمت دیکھوں۔

اس نے کہا کہ اس مکان اور اس غار کے درمیان ایک نہر ہے۔ جس کا پانی بہت گہرا ہے۔ اور اسے عبور کرنا آدمی کے لیے ممکن نہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے پوچھا کہ تو اس گہری ندی سے کیسے گزرتا ہے؟ اس نے کہا کہ میں خلافِ عادت پانی کے اوپر چلتا ہوں۔ اور وہ پانی میرے لیے مسخر ہو جاتا ہے کہ میرے پاؤں کے تلوے کے سوا کچھ بھی تر نہیں ہوتا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا آؤ تمہارے گھر چلیں' ہو سکتا ہے کہ جو تمہارے لیے پانی کو مسخر کرتا ہے' میرے لیے بھی مسخر کر دے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور وہ بوڑھا دونوں روانہ ہوئے جب پانی کے کنارے پہنچے تو دونوں پانی کے اوپر چلتے ہوئے گزر گئے۔ اس بوڑھے کو تعجب ہوا جب غار میں پہنچے تو اس کی مسجد کے قبلہ کی سمت کو سمتِ کعبہ کے مطابق پایا اور بہت خوش ہوئے اس کے بعد پوچھا کہ اے بوڑھے! یہ بتا کہ کون سا دن سب سے زیادہ سخت ہے؟ اس بوڑھے نہ کہا کہ وہ دن کہ جس دن حضرت رب العرش مخلوق کے حساب کے لیے اپنی کرسی ظاہر فرمائے گا اور دوزخ کو بھڑکائے گا۔ یہاں تک کہ کوئی فرشتہ مقرب اور نبی مرسل نہیں رہے گا۔ جو کہ زاری کرتے ہوئے نہ گرے اور وہ اپنے حال سے پریشان ہوں گے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا کہ اے نیک بخت بوڑھے! میرے لیے اور اپنے لیے دعا کر کہ اللہ تعالیٰ اس دن کی پریشانی سے ہمیں امن اور اطمینان نصیب فرمائے۔ بوڑھے نے کہا کہ میری دعا کس کام آتی ہے' مجھ سے دعا نہ چاہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا کیوں؟ اس نے کہا میں تین (۳) سال سے ہر وقت اور ہر لمحہ دعا کر رہا ہوں لیکن بالکل قبول نہیں ہوتی۔ آپ نے فرمایا وہ دعا کیا ہے؟ اس نے کہا کہ ایک دن میں اسی صحرا میں جس میں آپ سے ملاقات ہوئی' کھڑا تھا کہ ایک نوجوان مویشی لیے ہوئے پہنچتا ہے۔ اور اس نوجوان کی زلفیں پریشان اور بکھری ہوئی

تھیں۔ میں نے کہا تو کہاں سے آیا ہے۔ اور یہ مویشی کس کے ہیں؟ اس نے کہا کہ اللہ کے دوست ابراہیم علیہ السلام کے گھر سے آ رہا ہوں اور مویشی اسی کے ہیں۔ میں اس وقت سے یہ دعا میں مشغول ہوں کہ بارِ خدایا اگر دنیا میں کوئی ہے۔ جو کہ تیرا دوست ہو تو مجھے اس کی زیارت میسر فرما اور اس سے پہلے کہ میں اس جہان سے جاؤں اس کے دیدار سے مشرف ہو جاؤں ابھی تک اس کے دیدار سے مشرف نہیں ہوا ہوں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا کہ تیری دعا قبول ہوگئی' آؤ میں تم سے معانقہ کروں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس بوڑھے کو کھینچ کر معانقہ فرمایا۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ اسی دن سے معانقہ رائج ہو گیا۔ اور اس سے پہلے سجدے کی رسم تھی کہ تعظیم کے مقام میں ایک دوسرے کو سجدہ کرتا تھا۔ پھر اسلام میں مصافحہ رائج ہوا۔

قصہ مختصر جب حضرت ابراہیم علیہ السلام بشر کے لیے ممکن تمام وجوہ کمال کے ساتھ قوتِ علمیہ' نظریہ اور فکریہ کی جہت سے بھی' قوتِ علمیہ' خلقیہ اور حالیہ کے اعتبار سے بھی' جسم کی طہارت اور نفاست کی صورت میں بھی اور فطرتِ روح' سرّ اور دوسرے لطائف کی صفائی کی جہت سے بھی مکمل ہو گئے۔ اور آپ کی کامل استعداد اچھے طریقے سے ظاہر ہو گئی۔

قَالَ ان کے پروردگار نے ان سے فرمایا کہ اِنِّیْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا میں تجھے سب لوگوں کے لیے جو کہ تیرے بعد آئیں' امام اور پیشوائے مطلق بنانے والا ہوں۔ کہ ہر چیز میں تیری اقتداء کریں۔ اور تیری پیروی سب مخلوق پر واجب ہوئی۔ گویا تیری اقتداء اور پیروی ان کی حقانیت کی دلیل ہوگی۔ اور تیری مخالفت باطل ہونے اور گمراہ ہونے کی علامت ہوگی۔ اور یہ امامت مطلقہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی خاصیتوں میں سے ہے۔ جیسا کہ خاتمیت حضرت افضل المرسلین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خصوصیتوں میں سے ہے۔ اور اسی لیے جب بھی اور جہاں بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بعد کوئی حق ظاہر ہوا۔ اور کوئی پیغمبر علیہ السلام بھیجا گیا اور کوئی کتاب اُتری۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی پیروی اور آپ کی اقتداء کے ساتھ وابستہ ہے۔ یہودی' نصرانی اور صابی سب کے سب آپ کی تعظیم اور آپ کی پیروی اور اقتداء کے قصد کی کوشش کرتے ہیں۔ اور آپ کے افعال اور اقوال کو کلی طور پر شریعت

بنانے کا قانون اور دین سے وابستگی کا معیار سمجھتے ہیں۔ اگر بدلے ہوئے حکم کی جزئیات میں وقتی مصلحتوں کی وجہ سے بظاہر مخالفت کرتے ہیں تو وہ مخالفت بھی اس قانون کلی اور معیار میں داخل ہے۔ اور موافقت کے حکم میں شمار ہے۔ جس طرح کہ سب کے سب یونانی طب میں ابن سینا کو اپنا امام جانتے ہیں۔ اور قواعد کلیہ اسی سے لیتے ہیں۔ اور اگر وقتی تقاضا میں اس کے خلاف چلتے ہیں تو اسی کے مقرر کردہ قاعدوں کے مطابق چلتے ہیں۔ اور اسی قیاس کے مطابق حنفی امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کو اپنا امام جانتے ہیں۔ اور اگر کسی وقت صاحبین یا زفر بن ہذیل کے قول پر فتویٰ دیتے ہیں تو اسے قانون، حنفی اور امام کے مذہب کے قاعدے سے باہر نہیں جانتے اور اس امام کے مقرر کردہ عام قواعد میں مثل قول بالاستحسان اور عموم بلوی کے اعتبار میں درج کرتے ہیں۔

اور اس تقریر سے ملتِ ابراہیمی اور دینِ مصطفوی صلی اللہ تعالیٰ علیہما وبارک وسلم کے درمیان فرق واضح ہو گیا کہ ملتِ ابراہیمی کی ہر حال میں کلی طور پر پیروی واجب ہے۔ اور حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دین کی قبولیت یہودیت ونصرانیت کے منسوخ ہونے کے بعد جزوی طور پر لازم ہے۔ اور جو اشکال اس مقام پر وارد ہوتا تھا' زائل ہو گیا۔

ملتِ ابراہیم علیہ السلام اور دینِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں فرق

اشکال یہ ہے کہ اگر عام لوگوں کے حق میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اقتداء اور اتباع واجب ہے۔ تو آپ میں اور افضل المرسلین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں دعوت کے عام ہونے میں فرق نہ رہا۔ نیز یہودیت اور نصرانیت اپنے اپنے وقتوں میں سچے دین تھے۔ حالانکہ ان میں بہت سے کاموں میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ملت کی مخالفت جلوہ گر تھی اگر حضرت ابراہیم علیہ السلام کی امامت مطلقہ مراد تھی تو یہ مخالفت کس طرح جائز ہوتی؟

اس اشکال کے زائل ہونے کی وجہ اس عبارت سے روشن ہے۔ جو کہ پہلے ذکر کی جاچکی ہے۔ اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ مخصوص اس امامتِ مطلقہ کی علامتوں میں سے یہ ہے کہ آپ کو قیامت کے دن تمام مخلوق سے پہلے پوشاک اور خلعت سے نوازا جائے گا۔ جیسا کہ بادشاہوں کی عادت ہے کہ ہر قوم کے سردار اور پیشوا کو اس قوم کے تمام

افراد سے پہلے خلعت پہناتے ہیں۔ اور بخاری اور مسلم اور دوسری صحاح میں مروی ہوا کہ قیامت کے دن سب مخلوق ننگے سر، ننگے بدن اور ننگے پاؤں اٹھیں گے۔ اور سب سے پہلے جسے پوشاک پہنائی جائے گی' حضرت ابراہیم علیہ السلام ہوں گے۔ اور مصنف ابن ابی شیبہ اور کتاب الزہد امام احمد میں آیا کہ ان کے بعد بلا فصل جناب خاتم المرسلین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دھاری دار پوشاک جسے حبرہ کہتے ہیں' کا جبہ پہنایا جائے گا۔ اور صحیح مسلم اور دوسری صحاح میں وارد ہے کہ ایک شخص نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس لفظ کے ساتھ خطاب کیا کہ یاخیر البریہ اے مخلوق! میں سب سے بہتر تو حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ اس خطاب کے لائق حضرت ابراہیم علیہ السلام ہیں۔

(اقول وباللہ التوفیق امامتِ مطلقہ سے مراد یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے علاوہ باقی انبیاء ورسل علیہم السلام کے آپ امام اور مقتداء ہیں' قیامت کے دن سب سے پہلے پوشاک کا پہنایا جانا لازم نہیں کرتا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام خود حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بھی امام ہیں۔ کیونکہ اوّل تو متکلم عموم کلام میں داخل نہیں ہوتا۔ چنانچہ شیخ محقق حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمتہ اللہ علیہ اشعۃ اللمعات میں مامن بنی آدم مولود الایمسہ الشیطان حین یولد الخ کی شرح میں ۸۲ پر فرماتے ہیں کہ

بعضے از شارحاں گفتہ اند کہ متکلم از عموم کلامی کہ می گوید در محاورات خارج یباشد

اور مفسر علام کی نقل کردہ مصنف ابنِ شیبہ اور کتاب الزہد والی حدیث سے زیادہ سے زیادہ یہ ثابت ہوتا ہے کہ سب سے پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو پوشاک پہنائی جائے گی تو یہ ایک جزری فضیلت ہے۔ چنانچہ اسی مقام پر اشعۃ اللمعات میں حضرت شیخ محقق نے فرمایا چونکہ مشہور است کہ فضل کلی منافی جزئی نہ بود۔ مفہوم یہ ہے کہ جزوی فضیلت من کل الوجوہ فضیلت سے متصادم اور منافی نہیں۔ ہوسکتا ہے۔ کہ مفضول میں کوئی ایسی صفت ہو جو کہ اس سے فاضل میں نہ ہو رہی حدیث مسلم کو خیر البریۃ کا لقب حضور علیہ السلام نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لائق گردانا تو امام نووی نے اس حدیث کی شرح میں فرمایا

قال العلماء انما قال صلی اللّٰہ علیہ وآلہ وسلم ھذا تواضعا واحتراما

لابراهم صلی اللّٰهُ علیه وآله وسلم لخلته وابوته والانبینا صلی اللّٰهُ علیه وآله وسلم افضل کما قال صلی اللّٰهُ علیه وآله وسلم انا سید ولد آدم یعنی حضور علیہ السلام نے یہ الفاظ تواضع کے لیے اور حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کے احترام کے لیے فرمائے کیونکہ آپ خلیل بھی ہیں۔ اور آپ کے نسبی جدامجد بھی۔ ورنہ حضور علیہ السلام افضل ہیں۔ جیسا کہ خود آپ نے فرمایا انا سید ولد آدم میں آدم علیہ السلام کی ساری اولاد کا سردار ہوں۔ اور یہ آپ کی مطلقاً سیادت اور امامت پر واضح دلالت ہے۔ نیز بحوالہ مسلم، حضور علیہ السلام نے فرمایا واخرت الثالثة لیوم یرغب الی الخلق کلهم حتی ابراهیم علیه السلام کہ میں نے تیسری دعا اس دن کے لیے بچا رکھی ہے جس دن ساری مخلوق میری طرف رغبت کرے گی حتیٰ کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام بھی۔ پتہ چلا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام سمیت تمام مخلوق بارگاہِ حضور علیہ السلام میں حاجت براری کے لیے حاضر ہوگی۔ اسی لیے امام اہلِ سنت مجدد مأتہ حاضرہ اعلیٰ حضرت مولانا الامام احمد رضا بریلوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا

لَاوَرَبِّ الْعَرْشِ جس کو جو ملا ان سے ملا
بٹتی ہے کونین میں نعمت رسول اللہ کی
وہ جہنم میں گیا جو ان سے مستغنی ہوا
ہے خلیل اللہ کو حاجت رسول اللہ کی

(محمد محفوظ الحق غفرلہ)

گفتۂ او گفتۂ اللہ بود

اور مصنف ابنِ ابی شیبہ میں صحیح سند سے مروی ہے کہ ایک سال حضرت ابراہیم علیہ السلام کے علاقے میں غلے کا قحط پڑ گیا، آپ غلہ لینے کے لیے دوسرے شہر میں تشریف لے گئے۔ تلاش کے باوجود غلہ نہ ملا، مایوس ہو کر واپس ہوئے۔ سرِ راہ ایک میدان میں پہنچے جس میں سرخ ریت بہت تھی۔ آپ نے اپنے غلاموں سے فرمایا کہ بوریوں میں یہ سرخ ریت بھر لو تاکہ لوگ ہمیں ہلکا اور حقیر نہ سمجھیں کہ بوریاں خالی لے کر آگئے۔ چنانچہ وہ ریت

بوریوں میں بھر کر لے آئے۔ لوگ جب بھی پوچھتے تھے کہ آپ ان بوریوں میں کون سا غلہ بھر کر لائے ہیں تو حضرت ابراہیم علیہ السلام فرماتے کہ سرخ گندم۔ جب گھر لا کر غلاموں نے بوریاں کھولیں تو سرخ ریت سرخ گندم بن چکی تھی۔ حق تعالیٰ نے نہ چاہا کہ اپنے خلیل علیہ السلام کے کلام کو خلافِ واقعہ ہونے دے اور اس سرخ گندم کی خاصیت یہ تھی کہ جب بھی اسے کاشت کرتے تھے' اوپر سے نیچے تک اس کے سارے کے سارے پودے میں گندم کے دانے اُگتے تھے۔

اور امام احمد کتاب الزہد میں' ابونعیم حلیۃ الاولیاء میں' اور ابن ابی شیبہ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ سے روایت لائے ہیں کہ ایک دفعہ کفار نے حضرت ابراہیم علیہ السلام پر دو بھوکے شیر چھوڑ دیئے' ان دونوں شیروں نے جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کو دیکھا تو سر بسجود ہو گئے۔ اور آپ کے قدمین شریفین کو چاٹنا شروع کر دیا۔

اور اس امامتِ مطلقہ کی علامات میں سے یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ملت کے اعتبار سے تمام مسلمانوں کا باپ قرار دیا گیا ہے۔ چنانچہ فرمایا ہے **ملة ابیکم ابراهیم** (الحج آیت ۷۸) پس تو آپ ابوالملۃ ہیں۔ جیسا کہ حضرت سید عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ابوالشفقت والرحمۃ ہیں۔ آپ نے فرمایا **انما انا لکم مثل الوالد** میں تمہارے لیے والد کی طرح ہوں اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا **وازواجه امهاتهم** (الاحزاب آیت ۶) آپ کی ازواج مومنوں کی مائیں ہیں۔ اور اسی سلسلہ کی وہ روایت ہے۔ جو کہ مسند احمد' حاکم' بیہقی اور دوسرے معتبر محدثین سے وارد ہوئی کہ **اولاد المومنین فی الجبل فی الجنة' یکفلهم ابراهیم وساره علیهما السلام حتّٰی یردهم الی آباء هم یوم القیامة** ایمان والوں کی اولادیں ایک جنتی پہاڑ میں ہیں جن کی حضرت ابراہیم اور سارہ علیہما السلام کفالت فرماتے ہیں۔ یہاں تک کہ انہیں قیامت کے دن ان کے آباء واجداد کی طرف لوٹائیں گے۔ اور سعید بن منصور کی مسند میں حضرت مکحول شامی سے مروی ہے **ان رسول الله صلی الله علیه وآله وسلم قال ان ذراری المسلمین فی عصا فیر خضر فی شحر الجنه یکفلهم ابوهم ابراهیم علیه السلام** حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام

نے فرمایا کہ مسلمانوں کی اولادیں جنتی درخت میں سبز چڑیوں میں ہیں۔ جن کی کفالت ان کے جدامجد حضرت ابراہیم علیہ السلام فرماتے ہیں۔

قصہ مختصر اس واقعہ سے واضح ہوا کہ امامت اور متبوعیت مطلقہ کے قابل وہی شخص ہوتا ہے۔ جو کہ امتحانِ الٰہی میں ٹھیک ٹھیک کامیاب ہو۔ اور اللہ تعالیٰ کے حکم کو قبول کرنے کے اس قدر لائق ہو۔ کیونکہ امتحان کے وقت آدمی عزت پاتا ہے یا ذلیل ہوتا ہے۔

بیت

تکلیف اُٹھائے بغیر خزانہ حاصل نہیں ہوتا

اے جان برادر مزدوری اسی کو ملتی ہے۔ جس نے کام کیا۔ اور یہود و نصاریٰ کو امامت و متبوعیت مطلقہ کا دعویٰ کس طرح لائق ہو جو کہ ابھی تک خود بینی اور خود رائی میں گرفتار ہیں۔ اور ایمان کا پہلا زینہ جو کہ پیغمبر وقت علیہ السلام کے حکم کی اطاعت ہے' بجا نہیں لاتے۔ اور اس عظیم مرتبہ کے لیے ان کی نالائقی کی صریح دلیل یہ ہے کہ جب حق تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اس عظیم منصب سے نوازا تو آپ نے چاہا کہ یہ منصب میرے خاندان میں بطور وِراثت جاری ہو۔

قَالَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِيْ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے پروردگار کی بارگاہ میں عرض کی کہ ہر زمانے میں میری اولاد میں سے ایک امام مقرر فرما۔ تاکہ زمین کبھی بھی میری امامت سے خالی نہ ہو۔ اور آپ کی یہ آرزو اس بناء پر تھی کہ جب مجھے تمام لوگوں کا امام بنایا گیا ہے۔ اور قیامِ قیامت تک میرا ظاہری طور پر باقی رہنا ممکن اور عادت کے مطابق نہیں۔ پس آپ نے اس امامت کے باقی رہنے کی صورت اس رنگ میں نکالی کہ میری نسل میں سے ایک امام زمین میں ہمیشہ موجود رہے۔ جو کہ امامت کے کام اور اس منصبِ عظیم کو جاری رکھے۔ حق تعالیٰ نے ان کے جواب میں۔

قَالَ فرمایا کہ اگر بعض زمانوں میں آپ کی نسل ظالم ہوگی اور ان میں سے ظالم کے سوا کوئی نہیں رہے گا تو اس وقت امامت عطا کرنے کے کوئی قابل نہ ہوگا۔ اس لیے کہ لَايَنَالُ عَهْدِي الظّٰلِمِيْنَ میرا خدمت اور منصب کا وعدہ ظالموں کو نہیں پہنچتا۔ خواہ نبوت

ہو یا امامت' خواہ خلافت ہو یا ولایت۔ بلکہ شرع شریف کے حکم کے مطابق قضا' افتاء' محتسب' بادشاہی' امارت اور حکومت کا منصب بھی ظالموں اور فاسقوں کو نہیں دینا چاہیے۔ کیونکہ ان منصبوں میں عدالت اور تقویٰ شرط ہے۔ اور ظاہر ہے کہ اس وقت کے یہود و نصاریٰ ظلم کی سب سے شدید قسم کے مرتکب تھے۔ وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسَاجِدَ اللّٰهِ' (البقرہ آیت ۱۱۴) وَقَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا سُبْحَانَهٗ (البقرہ: آیت ۱۱۶) وغیرہما آیات اس پر دلالت کرتی ہیں۔ پس ان میں اس منصب کی قابلیت کیسے ہوگی؟ تو انہیں ظالم ہونے کے باوجود جو اپنا امام بنائے گا' وہ بھی ظالم ہوگا۔ اور وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَ هُمْ مِنْ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ اِنَّكَ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِيْنَ (البقرہ آیت ۱۴۵) کا مضمون اس واقعہ سے بہت اچھے طریقے سے ثابت ہوتا ہے۔

اور اس آیت میں اس امر پر صریح دلیل ہے کہ جو تین حجابات میں جو کہ حجابِ رسم' حجابِ طبع اور غلط فہمی اور بُری معرفت کا حجاب ہے' گرفتار ہو۔ اور جاہ و مال کی محبت جیسی نفسانی لذتوں میں مصروف ہو۔ یا اس کی ہمت جزوی مصلحتوں تک محدود ہو اور کلی مصلحتوں پر دھیان نہیں دیتا' جن کی شرع شریف میں حق تعالیٰ نے رعایت فرمائی یا اس کی اصل فطرت میں پختگی نہ ہو۔ بلکہ ٹیڑھا سوچے تو وہ نبوت کا وصی جو کہ امامت اور پیشوائی سے عبارت ہے' کی لیاقت نہیں رکھتا اور جو کوئی امورِ دین میں سے کسی امر میں پیشوائی کا مدعی ہو اور ان روحانی امراض میں مبتلا ہو تو یقین کر لینا چاہیے کہ اس کا دعویٰ باطل ہے۔ اور وہ نالائق ہے۔ اور یہ معنی ہمارے رسولِ کریم علیہ السلام کے زمانہ کے یہود و نصاریٰ میں آفتاب کی طرح روشن تھا۔ پس درحقیقت وہ مرتبہ' امامت کی ضدوں سے موصوف تھے۔ اور اس منصب عالی سے روکنے والے تمام امراض اپنے میں جمع کر چکے تھے پھر ان کا اس منصب کی آرزو کرنا بڑی حماقت اور بالکل جہالت تھی۔ جیسا کہ ان کے جاہلوں کی خداتعالیٰ سے ہم کلامی کی درخواست جو کہ آیت لَوْلَا يُكَلِّمُنَا اللّٰهُ میں گزری۔

چند جستجوئیں

یہاں چند جستجوئیں باقی رہ گئیں جن کا اکثر اوقات سامع منتظر رہتا ہے۔ پہلی جستجو یہ کہ

سورۃ کی ابتدا سے لے کر یہاں تک بنی اسرائیل کے ساتھ خطاب چلتا ہے۔ پارہ کے آخر تک بھی انہیں سے خطاب ہے کہ اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَآءَ اِذْحَضَرَ يَعْقُوْبَ الْمَوْتُ (البقرہ آیت ۱۳۳) بنی اسرائیل کے خطاب کے درمیان حضرت ابراہیم علیہ السلام کی امامت اور کعبۃ اللہ کی تعمیر کا واقعہ جو کہ ان سے اور حضرت اسماعیل علیہ السلام سے رونما ہوا' کیوں لایا گیا؟ یہ خطاب قریش کے لائق تھا جو کہ خانہ کعبہ کے مجاور اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد سے تھے۔ اور جو نعمتیں تعمیر کعبہ اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کو فضیلت دینے کے بارے میں ہیں' ان کے حق میں قدر اور عزت رکھتی ہیں نہ کہ بنی اسرائیل کے حق میں؟

اس کا جواب یہ ہے کہ اس واقعہ کو بیان کرنے کا مقصد نعمتوں کا شمار نہیں ہے۔ جیسا کہ اکثر گزشتہ واقعات میں ہے۔ بلکہ خاتم المرسلین علیہ الصلوٰۃ والسلام کی نبوت اور بنی اسرائیل پر اس دین متین کی اطاعت واجب ہونے کو ثابت کرنا ہے۔ اس لیے کہ وہ اگرچہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد میں سے نہیں تھے۔ لیکن حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد ہونے کو اپنا فخر جانتے تھے۔ اور اس بات کے معتقد تھے کہ کعبہ معظمہ حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیٰ نبینا وعلیہما السلام نے بنایا ہے اس وقت اپنی اولادوں کے لیے انہوں نے دعائیں مانگیں اور وہ دعائیں قبولیت سے مشرف ہوئیں۔ پس یہ واقعہ بنی اسرائیل کے سامنے بیان کرنے میں چار عمدہ مقاصد پیش نظر ہیں جو کہ سب کے سب بنی اسرائیل کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں۔

پہلا مقصد یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو پہلے مشقت طلب ذمہ داریوں سے آزمایا جب آپ ان ذمہ داریوں سے اچھی طرح پورے طور پر عہدہ برآ ہو گئے تو انہیں مقتدا ہونے اور امام ہونے کا منصب عطا فرمایا تو معلوم ہوا کہ دینی مرتبے سرکشی اور عناد ترک کرنے اور ہر وقت احکامِ الٰہیہ جو کہ ہر آنے والے رسول علیہ السلام کی زبان سے ظاہر ہوں' کو قبول کیے بغیر حاصل نہیں ہوتے اگرچہ غرور' تکبر اور اپنی ریاست کی وجہ سے وہ قبول کرنا نفس پر ناگوار ہو۔

دوسرا مقصد یہ ہے کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے امامت کے منصب کی

درخواست کی تو فرمان پہنچا کہ آپ کی اولاد میں سے ظالموں کو یہ منصب نہیں ملے گا تو جو بھی منصب امامت یا دینی مناصب میں سے کسی منصب کا طالب ہو گا جیسے ولایت' ارشاد' افتاء' محتسب ہونا اس کے لیے ضروری ہے کہ بے موقع تعصب' جھگڑا' فضول گفتگو اور کج بحثی کو چھوڑ دے۔ اور خدا تعالیٰ کی بلند کی ہوئی قدروں کو توڑنے کے درپے نہ ہو۔ تاکہ اپنے مطلوب منصب کی لیاقت سے دور نہ جا پڑے اور تمہیں یہ معنی میسر نہیں ہوتا مگر اس وقت جبکہ دل و جان کے ساتھ اس رسول علیہ السلام کے مددگار' محب اور خیر خواہ ہو جاؤ۔

تیسرا مقصد یہ کہ اگر میں قبلہ کو بیت المقدس سے بدل کر سمت کعبہ کو مقرر کر دوں تو تمہیں حق نہیں پہنچتا کہ طعن کی زبان کھولو اور اس رسول علیہ السلام کی نبوت کے بارے میں بیہودہ شبہات ڈالو۔ اس لیے کہ کعبہ بھی پرانے زمانے سے مقام تعظیم اور حضرت ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام کی جائے عبادت رہا ہے۔ اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کا بنایا ہوا ہے۔ جو کہ آپ نے ہمارے حکم اور فرمان سے بنایا۔ اور اس مسجد متبرک میں مقامِ ابراہیم علیہ السلام ہے۔ جو کہ تمام ملتوں کے امام اور تمہارا فخر ہیں۔ اور آپ نے اس شہر اور مقامِ ابراہیم کے لیے دعائیں کی ہیں۔

چوتھا مقصد یہ ہے کہ اس کعبہ معظمہ کی تعمیر کے وقت تمہاری دانست کے مطابق حضرت ابراہیم اور اسماعیل علیٰ نبینا و علیہما الصلوٰۃ والسلام نے یہ دعا بھی مانگی ہے کہ ہماری اولاد میں سے ایک اُمت پیدا ہو جو کہ حکمِ الٰہی کی مطیع ہو۔ ان میں ایک پیغمبر علیہ السلام تشریف لائیں۔ جو کہ صاحب کتاب' دین کے معلم اور راہِ یقین کے راہبر ہوں۔ اور یہ دعا جو کہ دو عالی مرتبت پیغمبروں علیہما السلام نے ایسے مبارک وقت میں کی جو کہ تعمیر کعبہ کا وقت تھا' یقین ہے کہ وہ قبولیت سے ہمکنار ہوئی ہے۔

تو تمہارے گمان کے مطابق بھی حضرت اسماعیل علیہ السلام کی نسل میں ایک اُمت اور ایک رسول علیہ السلام کا وجود ضروری ہوا۔ پس اگر تم اس رسول علیہ السلام اور اس اُمت کا انکار کرتے ہو تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی عظمت اور ان کی دعا کی قبولیت کے عقیدہ سے دست بردار ہوتے ہو۔ اور اپنے فخر کو ضائع کرتے ہو۔ اور اسی تقریر سے واضح ہوا کہ حضرت

ابراہیم علیہ السلام کی امامت کا ذکر پہلے کیوں لائے اور اس کے بعد خانہ کعبہ کو جہان والوں کی عبادت گاہ ہو مقرر کرنے کی طرف کیوں انتقال فرمایا گیا اس کے بعد اس شہر کی آبادی کے حق میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا کا ذکر اور اس چیز کا بیان کہ کسی وقت اس شہر میں کفر بھی پھیلے گا' کیوں لائے؟ اور بات کو اُمت کے وجود اور رسول علیہ السلام کی بعثت کی دعا پر کیوں ختم کیا؟ واللہ اعلم بمقاصد کلامہ القدیم

دوسری تفتیش یہ ہے کہ من تبعیضیہ کی دلیل سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا کا خلاصہ یہ تھا کہ میری اولاد میں سے بعض کو بھی امامت حاصل ہو۔ پس اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد لَا یَنَالُ عَهْدِی الظّٰلِمِیْنَ کس قبیلے سے ہے' رد ہے یا قبول اگر رد ہے تو خلافِ واقع ہے۔ کیونکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد اور نسل میں بہت سے انبیاء علیہم السلام اور ان کے وصی گزرے ہیں۔ جیسے حضرت اسماعیل' حضرت اسحاق' حضرت یعقوب' حضرت یوسف' حضرت موسیٰ' حضرت ہارون' حضرت داؤد' حضرت سلیمان' حضرت ایوب' حضرت یونس' حضرت زکریا' حضرت یحیٰ' حضرت عیسیٰ اور حضرت الیاس علیٰ نبینا علیہم الصلوٰۃ والسلام پھر ان میں سب سے افضل واشرف حضرت محمد صلی اللہ علیہ وعلیہم وبارک وسلم اور اگر قبول ہے تو اس کا طریقہ یہ تھا کہ فرمایا جاتا نعم یا نعم ینال عهدی المومنین الصالحین

اس کا جواب یہ ہے۔ جو کہ دورانِ تفسیر گزرا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا مدعا یہ تھا کہ ہر وقت میری اولاد میں روئے زمین پر ایک امام موجود ہو اور یہ معنی مقبول نہ ہوا لیکن اسے ایک دلیل کے طور پر بیان فرمایا اس طرح کہ امامت میرا عہد ہے۔ اور میرا عہد ظالموں کو نہیں پہنچتا۔ پس اگر آپ کی ساری اولاد کسی وقت ظلم اختیار کرے۔ اور ان میں سے کوئی بھی عدالت وتقویٰ کی راہ پر قائم نہ رہے تو اس منصب کے لائق ہونے سے دُور جا پڑے گا۔

(اقول وباللہ التوفیق۔ اس سے مراد یہ نہیں کہ کسی زمانے میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ساری اولاد ہی کافر مشرک ہوگی۔ بلکہ ایسا تو صرف قانون امامت بیان کرنے کے

لیے فرمایا کہ اگر کسی وقت ایسا ہوا تو وہ عہد امامت سے محروم رہیں گے۔ چنانچہ امام جلال الدین السیوطی رحمتہ اللہ علیہ نے امام فخر الدین رازی رحمتہ اللہ علیہ کے مسلک کی تائید فرماتے ہوئے مسالک الحنفاء ۱۹ پر فرمایا ان الاحادیث الصحیحة ولت علی ان کل اصل من اصول النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم من آدم الی ابیہ عبد اللہ فھو خیر اھل قرنہ وافضلھم ولا احدنی قرنہ ذالك خیر منہ ولا افضل یعنی احادیثِ صحیحہ اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ حضور علیہ السلام کے اصول میں سے ہر اصل حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ تک اپنے زمانے کے لوگوں سے بہتر اور افضل ہیں۔ اور اس زمانے میں ان سے کوئی بہتر تھا نہ افضل۔ چنانچہ بخاری شریف میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بعثت من خیر قرون بنی آدم قرنا فقرنا حتی بعثت من القرن الذی کنت فیہ حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ مجھے بنی آدم کے بہتر قبیلوں میں نسل بعد نسل رکھا گیا حتیٰ کہ میں اس خاندان میں رکھا گیا جس میں کہ میں تھا۔ محدث ابونعیم نے دلائل النبوۃ میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم' لم یزل اللہ ینقلنی من الاصلاب الطیبہ الی الارحام الطاھرہ مصفی مھذبا لا تنشعب شعبتان الا کنت فی خیر ھما اللہ تعالیٰ مجھے پاک پشتوں سے' پاک ارحام میں منتقل فرماتا رہا' ہر آلائش سے صاف پاک' دو شاخیں نہیں پھوٹتی تھیں مگر میں ان میں سے اچھی میں ہوتا تھا۔

نیز امام سیوطی رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا ان الاحادیث والا ثار ولت علی انہ لم تخل الارض من عھد نوح او آدم الی بعثة النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم الی ان تقوم الساعة من ناس علی الفطرة یعبدون اللہ ویو حدونہ ویصلون لہ وبھم یحفظ الارض ولولاھم لھلکت الارض ومن علیھا احادیث اور اقوال اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ نوح علیہ السلام بلکہ آدم علیہ السلام کے عہد سے لے کر حضور صلی اللہ علیہ ولہ وسلم کی بعثتِ شریفہ تک یہاں تک قیامت قائم ہو' زمین

ان لوگوں سے خالی نہ ہوئی جو کہ فطرت اسلام پر اللہ تعالیٰ کی عبادت کریں' اسے وحدہ لاشریک مانیں اور اس کے لیے نماز پڑھیں' انہیں کی برکت سے زمین کی نگہبانی ہوتی ہے۔ اور اگر وہ نہ ہوتے تو زمین اور جو کچھ اس پر ہے سب ہلاک ہو جائے۔ انتہی محمد محفوظ الحق غفرلہ ولوالدیہ)

اور جمہور مفسرین نے کہا ہے کہ یہ جواب قبولیت دعا پر دلالت کرتا ہے۔ اس لیے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام جانتے تھے کہ میری ساری اولاد اس منصب کی اہل نہ ہوگی اور اتنی مدت میں ظالموں کی کثیر جماعت پیدا ہوگی۔ پس ان کی طلب صرف اس قدر تھی کہ میری اولاد میں سے بعض کو منصبِ امامت نصیب ہو اور واقع میں یہی قسم واقع ہوئی تو آپ کا سوال پورا ہوا۔

اب ہم یہاں پہنچے کہ اس سوال کے جواب میں نعم۔ یا ینال عھدی المومنین الصالحین کیوں نہ فرمایا گیا؟ تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر نعم فرمایا جاتا تو صریح طور پر معلوم نہ ہوتا کہ وہ بعض جو کہ امامت کی اہلیت رکھتا ہے' صالح ہوگا یا فاسق' عادل ہوگا یا ظالم اس بات کو صراحت کے ساتھ بیان کرنے کے لیے کہ ظالم امامت کے لائق نہیں ہے' یہ عبارت ارشاد فرمائی گئی اور اسی طرح اگر ینال عھدی المؤمنین الصالحین فرمایا جاتا تو جب بھی یہ مسئلہ صراحت کے ساتھ واضح نہ ہوتا اس لیے کہ اس عبارت کی انتہائی دلالت اس بات پر ہوتی کہ ظالم سے اہلیت سلب ہے۔ لیکن مفہوم مخالف کے طریقے سے نہ کہ کلام کے صریح معنی کے طور پر۔

اور بعض مفسرین اس طرف گئے ہیں کہ یہ مبنی بر ہدایت کلام حضرت ابراہیم علیہ السلام کے مقصد کی تاکید ہے۔ کیونکہ آپ کی غرض صرف اپنی اولاد کے صلحاء کے لیے امامت کی طلب تھی اس کے لیے کہ آپ اس بلند مرتبہ پر جو کہ امامتِ مطلقہ ہے' فائز ہونے کے بعد اس مسئلہ کو کیونکر نہیں جانتے تھے کہ کافر و ظالم امامت کے لائق نہیں ہیں۔ پس یہ جواب کچھ اس طرح ہے کہ قریب المرگ آدمی سے کہیں کہ اپنے بیٹے کے لیے کوئی وصیت کرو۔ وہ جواب میں کہے کہ لایرث منی اجنبی یعنی کوئی اجنبی میرا وارث نہیں ہوتا یعنی جو کچھ مجھ

سے باقی رہے گا' میرے بیٹے کے لیے ہے پس وصیت کی کوئی ضرورت نہیں۔

تیسری جستجو یہ ہے کہ ومن ذریتی کا لفظ ظاہر ہے کہ محذوف پر عطف ہے۔ یعنی قال ابراھیم اجعلنی اماما وبعضا من ذریتی ائمۃ۔ اور جب انی جاعلک للناس اماما کی نص صریح کے ساتھ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو امام بنانے کا وعدہ ہو چکا تھا تو پھر اپنی امامت کی دعا کی ضرورت کیوں پیش آئی؟

اس کا جواب یہ ہے کہ واؤ عطف جمع کے لیے ہے۔ تو یہ دعا حقیقت میں اپنی اور اپنی اولاد کی امامت کو جمع کرنے کے لیے ہے نہ صرف اپنی امامت کے لئے۔ اور وعدہ صرف اکیلے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی امامت کا تھا نہ کہ دونوں اماموں کو جمع کرنے کا اور کشاف میں مذکور ہے۔ وَمِنْ ذُرِّيَّتِيْ کا عطف جاعلک کے ک پر ہے۔ جیسا کہ کوئی کہے سا کرمک یعنی میں تیری عزت کروں گا۔ اور سننے والا اس کے جواب میں کہے وزیدا یعنی تکرمنی وزیدا تو میری اور زید کی عزت کرے گا۔ لیکن اس توجیہ میں ایک قوی اشکال ہے کہ اگر اس صورت میں لفظ ومن ذریتی جاعلک کا مفعول بھی ہوگا تو کلام کی تقدیر اس طرف لوٹے گی کہ انی جاعلک وجاعل بعض ذریتی اور اس کلام کا فساد بالکل ظاہر ہے۔ اور اگر کہیں کہ تقریر کا حاصل یہ ہے کہ انک جاعل بعض ذریتی ائمہ اور اس کا عطف اِنِّيْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا کے جملہ پر قرار دیں حالانکہ وہ جملہ قال اللہ کا مقول ہے تو یہ جملہ بھی اسی قال کا مقول ہو جائے گا نہ کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا مقول' جبکہ یہ جملہ بلاشبہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا مقولہ ہے۔ اور صحیح وجہ وہی ہے کہ محذوف پر عطف قرار دیا جائے۔ اور صاحب کشاف کے کلام کی توجیہ کی انتہا یہ ہے کہ یہاں عطف کی حکایت ہے نہ کہ عطف فی الحقیقت واقع کرنا اور حکایت میں وَمِنْ ذُرِّيَّتِيْ واؤ عطف کے ساتھ واقع ہوا ہے۔ لیکن حقیقت میں عطف کلام کے صادر ہونے کے وقت تلقین کے طور پر ہے۔ جیسا کہ کوئی کہے سا کرمک اور مخاطب تلقین کے طور پر کہے وزیدا کہ اس کا معنی یہ ہے کہ یوں کہے سا کرمک وزیدا۔ پس زیداً میں عامل وہی سا کرمک ہوگا۔ جو کہ قائل کے کلام میں تھا۔ البتہ کلام کی کیفیت کو بدل کر اس لیے کہ قائل کا کلام خبر دینے کے طریقے پر

ہے۔ اور مخاطب کی کلام طلب کے طور پر۔ اور معطوف علیہ اور معطوف میں عامل کے عمل کے قائم کرنے میں اصل عامل کا تعلق شرط ہے نہ کہ کیفیت کا باقی رہنا جیسا کہ قامت ھند وزید۔ قام زید لاعمرو اور ماقام زید لکن عمرو میں ہے کہ پہلے کلام میں عامل کی تانیث کی کیفیت اور دوسرے کلام میں کیفیت کا اثبات اور تیسرے کلام میں کیفیت نفی باقی نہ رہی اور اس قسم کے استعمال کا گواہ آیت اسکن انت وزوجك الجنة ھے۔ جیسا کہ پہلے گزر چکا کیونکہ اس کا معنی اسکن انت ولتکن زدجتك الجنة مقرر ہے۔

چوتھی جستجو یہ ہے کہ نص قرآنی کے مطابق حضرت یونس اور حضرت آدم علیٰ نبینا وعلیہما الصلوٰۃ والسلام نے اپنے متعلق ظلم کا لفظ بولا۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت یونس علیہ السلام کی حکایت کرتے ہوئے فرمایا لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحَانَكَ اِنِّیْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ (الانبیاء آیت ۸۷) اور حضرت آدم علیہ السلام سے حکایت کرتے ہوئے فرمایا رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا الخ (الاعراف آیت ۲۳) حالانکہ انہیں امامت کا اعلیٰ مرتبہ جو کہ نبوت ہے' حاصل تھا تو لَا یَنَالُ عَهْدِی الظّٰلِمِیْنَ کا کلمہ اُلٹ پلٹ ہو گیا۔

تو جمہور اہلِ تفسیر کے ذوق کے مطابق اس کا جواب یہ ہے کہ جس ظلم کو ان دونوں بزرگوں نے اپنی طرف منسوب کیا ہے' حقیقی ظلم نہ تھا۔ بلکہ ترکِ اولیٰ ہے۔ اور آیت لَا یَنَالُ عَهْدِی الظّٰلِمِیْنَ میں حقیقی ظلم مراد ہے۔ جو کہ فسق ہے۔ اور وہ گناہ کرنے سے عبارت ہے۔ اور اہلِ تحقیق کے ذوق کے مطابق جواب یہ ہے کہ ظالم اور اختیاری افعال سے مشتق تمام اسماء جیسے ضارب' قاتل وغیرہ حقیقت میں اس شخص کے بارے میں استعمال کیے جاتے ہیں جس نے ان افعال کا قصد کیا ہو اور انبیاء علیہم السلام کی فروگزاشتوں میں معصیت کا قصد بالکل نہیں ہوتا۔ بلکہ وہ کسی مباح شے یا کسی اطاعت کا قصد فرماتے ہیں۔ اور اس اطاعت کی مجاورت اور قرب کی وجہ سے فروگزاشت رونما ہوتی ہے تو اس کام کا ارتکاب قصد نہ ہونے کی وجہ سے ان کے حق میں معصیت نہیں ہوتا لیکن نفس کی پامالی' تواضع اور انکساری کی وجہ سے ظاہری صورت کی بناء پر اس فروگزاشت کو ظلم اور معصیت کہہ دیتے ہیں۔ اور

ذلت کا لفظ جو کہ پاؤں پھسلنے کے معنوں میں ہے' اسی تحقیق کا پتہ دیتا ہے۔

پانچویں جستجو یہ ہے کہ اس نص صریح کے مطابق مناصب شرعیہ میں سے ہر منصب کے لیے عدالت اور تقویٰ شرط ہے۔ اور اسی لیے فقہاء نے اس بات پر اجماع فرمایا ہے کہ اپنے اختیار سے کسی فاسق کو بادشاہی اور حکومت سونپنا نہیں چاہیے۔ البتہ اگر کوئی فاسق غلبہ حاصل کر کے سلطنت اور حکومت پر مسلط ہو جائے تو اس کے خلاف خروج جائز نہیں ہے۔ کیونکہ یقینی طور پر فتنہ کھڑا کرنے کا سبب ہے۔ جبکہ اسے معزول کرنا موہوم ہے تو موہوم مصلحت کے لیے یقینی فساد کو اختیار نہیں کرنا چاہیے۔ اور اسی طرح قاضی' مفتی' محتسب اور نماز کے پیش امام کو چاہیے کہ فاسق و فاجر نہ ہو۔ اور اس کے باوجود اگر کسی شخص نے نماز میں کسی فاسق کی اقتداء کی تو اس کی نماز فاسد نہیں ہوتی اور اکثر علمائے اسلام کا یہی مسلک ہے۔

(اقول و باللہ التوفیق مقصد یہ ہے کہ اعمال نماز ثابت ہو گئے لیکن مکروہ تحریمی ہے۔ چنانچہ بہار شریعت حصہ سوئم از صدر الشریعہ مولانا امجد علی صاحب اعظمی رحمتہ اللہ علیہ میں' درمختار اور شامی کے حوالہ سے ہے کہ بد مذہب کہ جس کی بد مذہبی حد کفر کو نہ پہنچی ہو اور فاسق معلن جیسے شرابی' جواری' زنا کار' سود خوار وغیرہم جو کبیرہ گناہ بالاعلان کرتے ہیں' ان کو امام بنانا گناہ اور ان کے پیچھے نماز مکروہ تحریمی واجب الاعادہ ہے۔ محمد محفوظ الحق غفرلہٗ)

اور ابن مردویہ حضرت امیر المومنین مرتضیٰ علی کرم اللہ وجہ الکریم کی روایت بیان کرتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے لَایَنَالُ عَهۡدِی الظّٰلِمِیۡنَ کی تفسیر میں فرمایا ہے کہ لاطاعة للمخلوق فی معصیة الله لاطاعة الافی المعروف یعنی مخلوق کی اطاعت اللہ تعالیٰ کی نافرمانی میں جائز نہیں۔ اطاعت تو صرف نیکی میں ہے۔ اور ابن ابی حاتم نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی آپ نے فرمایا قال الله لابراهیم انی جاعلك للناس اماما قال ومن ذریتی فابی ان یفعل ثم قال لاینال عهدی الظالمین یعنی اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے فرمایا کہ میں تجھے لوگوں کا امام بنانے والا ہوں۔ عرض کی: کہ میری اولاد سے؟ تو قبولیت نہ ہوئی پھر فرمایا کہ میرا وعدہ ظالمین کو شامل نہیں ہے۔ اور ابن اسحاق اور ابن جریر کی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے

روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ یخبر انہ کائن فی ذریتہ ظالم لاینال عھدہ ولا ینبغی لہ ان یولیہ من امرہ یعنی یہاں خبر دی ہے کہ آپ کی اولاد میں سے ظالم ہوں گے جنہیں یہ وعدہ شامل نہیں۔ اور اسے لائق نہیں کہ اسے اپنے امر کا والی بنائے۔

شیعہ فرقۂ امامیہ کا عصمت امامت میں حد سے تجاوز کرنا

لیکن یہاں امامیہ فرقہ نے حد سے تجاوز کرنے کی راہ اختیار کی ہے۔ اور انہوں نے کہا ہے کہ امامت کے صحیح ہونے میں عصمت شرط ہے۔ جس کا معنی ہے فہم میں خطا اور عمل میں گناہ کے مرتکب ہونے سے رُکنا۔ اور جب مخلوق کو اس ظاہری اور باطنی عصمت کا علم نہیں ہو سکتا پس مجبوراً امام مقرر کرنا چاہیے جو کہ خدا تعالیٰ کی طرف سے ہو نہ کہ مخلوق کی طرف سے لیکن یہ بات بالکل ظاہر ہے کہ ظلم کے مقابلہ میں عدالت اور تقویٰ ہے نہ کہ عصمت۔ ہاں اگر آیتِ شریفہ میں لاینال عھدی من کان ممکن الظلم ومحتمل المعصیۃ کے الفاظ واقع ہوتے (یعنی میرا وعدہ اسے شامل نہ ہوگا جس سے ظلم کا امکان اور معصیت کا احتمال ہو) تو اس سمجھ کی گنجائش تھی۔ اب جبکہ لفظ ظالمین واقع ہے تو غیر ظالم کی امامت خواہ معصوم ہو خواہ متقی' درست رہی۔ نیز اگر عہد کو عام رکھیں تو چاہیے کہ قاضی' مفتی' محتسب' امیر اور حاکم میں بھی عصمت کو شرط جانیں اور اگر عہد کو کئی قسموں میں سے ایک قسم کے ساتھ خاص کرتے ہیں تو دوسرے بھی عہد کی بعض قسموں میں عصمت کے شرط ہونے میں شریک ہیں۔ اس لیے کہ نبوت میں اجماعی طور پر عصمت شرط ہے۔

اور ان کے دل میں جو یہ بات آتی ہے کہ اگر امامت میں عصمت شرط نہ ہو اور متقی آدمی کو امامت کے ساتھ منسوب کریں۔ اور اس کی اطاعت ساری مخلوق پر فرض ہو جائے تو احتمال ہے کہ وہ متقی چونکہ معصوم نہیں ہے' تقویٰ کے راستہ سے پھر جائے۔ اور ظلم کی راہ اختیار کرے۔ تو لوگ بھی اس کی فرض شدہ اطاعت کی وجہ سے ظلم میں گرفتار ہو جائیں۔ اور امامت کا مقصد حاصل نہ ہو۔ تو یہ نہایت گھٹیا بات ہے۔ اس لیے کہ امام کی معصیت کا احتمال اُمت کو اس وقت نقصان پہنچاتا ہے جب ان پر اس کی اطاعت قید اور شرط کے بغیر فرض ہو حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ بلکہ امام کی اطاعت ان چیزوں کے ساتھ مقید و مشروط ہے جن کا

معصیت ہونا شرع شریف کی رو سے معلوم نہ ہو ورنہ امام کی اطاعت فرض نہیں رہتی اور احکامِ قرآن اور رسول علیہ السلام کے اوامر و نواہی کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔ اس دلیل سے یٰایھا الذین اٰمنوا اطیعوا اللّٰہ واطیعوا الرسول واولی الامر منکم فان تنازعتم فی شیٔ فردوہ الی اللّٰہ والرسول ان کنتم تؤمنون باللّٰہ والیوم الاٰخر ایمان والو! حکم مانو اللہ کا اور حکم مانو رسول (علیہ السلام) کا اور ان کا جو تم میں حکومت والے ہیں پھر اگر تم میں کسی بات کا جھگڑا اُٹھے تو اسے اللہ اور رسول (علیہ السلام) کے حضور لوٹاؤ۔ اگر اللہ اور قیامت پر ایمان رکھتے ہو اور حدیث شریف کی دلیل سے لاطاعۃ للمخلوق فی معصیۃ الخالق کہ اللہ تعالیٰ کی معصیت میں مخلوق کی اطاعت جائز نہیں۔ پس رعایا کے حق میں امام کی اطاعت' غلام کے حق میں مالک کی اطاعت' بیوی کے حق میں شوہر کی اطاعت' اولاد کے حق میں والدین کی اطاعت اور زیرِ دستوں کے حق میں امیر' حاکم' قاضی' مفتی اور محتسب کی اطاعت کی طرح مقید اور مشروط ہے نہ کہ غیر مشروط۔ ہاں انبیاء علیہم السلام کے لیے مطلق یعنی غیر مشروط اطاعت ثابت ہے۔ اور وہاں اس وجہ سے عصمت شرط ہے کہ سلسلہ تبلیغ کی ابتدا انہیں سے ہے۔ اگر ان میں عصمت شرط نہ ہو تو احکامِ شرعیہ کی طرف رجوع کی وجہ سے ان کی خطا کا تدارک نہیں کیا جاسکتا اس لیے کہ احکامِ شرعیہ کی معرفت کا راستہ نبی علیہ السلام کے واسطہ کے بغیر ممکن نہیں۔ بخلاف امام اور دوسرے واجب الاطاعت اشخاص کے کہ جن کا پہلے ذکر ہو چکا اس لیے یہ حضرات تبلیغ کے مبداء میں واقع نہیں ہیں کہ ان کی وساطت کے بغیر احکام کی معرفت حاصل نہ ہو سکے۔ پس دونوں صورتیں جدا ہو گئیں۔

اور کتاب نہج البلاغۃ میں جو کہ فرقہ امامیہ کی معتبر کتابوں میں سے ہے' حضرت امیر المومنین رضی اللہ عنہ کی صریح نص موجود ہے کہ لابد للناس من امیر بر او فاجر یعمل فی امرتہ المومن ویستمتع الکافر و یا من فیہ السبیل الخ یعنی لوگوں کے لیے نیک یا بُرے امیر کے سوا چارہ نہیں جس کی امارت میں ایمان والا مصروف عمل ہو' کافر فائدہ حاصل کرے۔ اور راستہ پُر امن ہو۔

عجیب ترین تجاوز

اور اس حد سے تجاوز کی عجیب ترین صورت یہ ہے کہ خلفائے ثلاثہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کی خلافت کے رد کے لیے ان لوگوں نے اس آیت سے یہ مسئلہ نکالا ہے کہ امام کو چاہیے کہ اس نے کبھی کفر نہ کیا ہو اور سنِ بلوغ کی ابتدا ہی سے اسلام کی روش پر ہو۔ حالانکہ جب کافر مسلمان ہو گیا۔ اور اس۔ نے کفر سے توبہ کر لی۔ تو اسے کافر و ظالم ہرگز نہیں کہا جا سکتا۔ ظالم وہی ہے۔ جو کہ ظلم سے آلودہ ہو حالانکہ التائب من الذنب کمن لاذنب لہ یعنی گناہ سے توبہ کرنے والا اس شخص کی طرح ہے۔ جس پر کوئی گناہ نہیں۔ شرع شریف کا مقرر کردہ قاعدہ ہے۔ اور اگر ایک کافر سالہا سال سے مسلمان ہوا۔ اور اس نے توحید میں پختہ قدمی حاصل کر لی ہو، اسے ہرگز کافر نہیں کہا جا سکتا اور وہ جو بعض ناسمجھ لوگ فرقہ امامیہ کی تائید کے لیے کہتے ہیں کہ ایک باایمان شخص کو جو کہ خواب کی حالت میں ہے' ہم مومن کہتے ہیں۔ حالانکہ اس حالت میں اسے ایمان جو کہ تصدیق کے معنوں میں ہے' یقیناً حاصل نہیں ہے۔ اس کی اسی پہلی تصدیق کی بناء پر اس پر مومن کا لفظ استعمال کرنا صحیح ہے تو ظالم کا لفظ بھی اسی سابق ظلم کی وجہ سے صحیح الاستعمال ہو گا۔ نیز متکلم اور ماشی کہ ان کے مبادی کا حصول یک بارگی ممکن نہیں۔ اس لیے کہ یہ قرار نہ پانے والے امور ہیں' ان کا استعمال مصادر کے حصول کے بغیر صحیح ہے۔

تو اس کا جواب یہ ہے کہ باایمان آدمی کے لیے حالتِ خواب میں اس کی تصدیق کو زائل کرنے والی شے حاصل نہیں ہے۔ اسی لیے شرعاً وہی پہلی تصدیق معتبر ہے۔ اور اسی اعتبار سے اس کے حق میں اصطلاح شرعی کے مطابق مومن کا لفظ استعمال کرنا صحیح ہے۔ اس لیے کہ الفاظِ شرعیہ کے استعمال میں معانی شرعیہ ثابت ہونا چاہئیں نہ کہ معانی لغویہ۔ بخلاف اس ظالم اور کافر کے جس نے اپنے ظلم اور کفر سے توبہ کر لی ہو اور اس کے کفر اور ظلم کو زائل کرنے والا شرعاً ثابت ہو چکا اس کے حق میں ظالم و کافر کے لفظ کا استعمال کیونکر ہو سکتا ہے۔ اس کی اجازت لغت دیتی ہے نہ شرع۔ اور اس کے باوجود حالتِ خواب میں تصدیق سے غفلت اور بے توجہی ہے نہ کہ خزانہ اور حافظہ سے تصدیق کا زائل ہونا اور جو حصول کہ لفظ

مومن کے استعمال کے صحیح ہونے میں شرط ہے' خزانہ اور حافظہ میں حصول ہے نہ کہ اس کا بالفعل ادراک ورنہ عالم کو نماز میں مشغولیت کے وقت جاہل کہنا صحیح اور ایک مال دار کو جس کے ہاتھ میں کافی مال نہیں۔ جبکہ اس کے خزانے میں بے پناہ مال ہے' مفلس کہنا درست ہو اور یہ اجماعی طور پر باطل ہے۔

اور اسی طرح قرار نہ پانے والے امور کے مشتقات اس وجہ سے کہ ان کے مبادی کا حصول یک بارگی محال ہے' ان مبادی کو حاصل کرنے کا قصد وارادہ ان مشتقات کے استعمال میں عرفاً لغتہً اور شرعاً ان کے مبادی کے حصول کے قائم مقام قرار دیا جاتا ہے۔ بخلاف ممکنہ الحصول مشتقات کے کہ یہ بدل قائم کرنا ان کے استعمال میں جائز نہیں' اصل کے ممکن ہونے کی وجہ سے۔ جیسا کہ مریض کے حق میں تیمم جائز ہے۔ اور صحیح مقیم کے حق میں ناجائز۔ نیز وہ حصول جو کہ مشتقات کے استعمال میں شرط ہے' عام ہے اس سے کہ درجہ بدرجہ حصول ہو یا یک بارگی اور قرار نہ پانے والے امور میں ان کے تمام زمانوں میں درجہ بدرجہ حصول ثابت ہے۔ اگرچہ یک بارگی نہیں۔

چھٹی جستجو یہ ہے کہ اس آیت میں ظلم کے بُرے انجام سے شدت کے ساتھ ڈرانا اور خوف دلانا ہے۔ اس لیے کہ پہلے تو یہ بُری خصلت ایک شخص کو مرتبۂ نبوت' امامت اور ریاستِ شرعیہ سے دُور پھینک دیتی ہے کہ لَایَنَالُ عَهۡدِی الظّٰلِمِیۡنَ دوسرے مرتبہ ولایت سے بھی گرا دیا آلَا لَعۡنَةُ اللّٰهِ عَلَی الظّٰلِمِیۡنَ۔ تیسرے مخلوق کی نظر اور دِلوں سے بھی گرا دیتی ہے۔ کیونکہ احسان کرنے والے سے محبت اور بُرا سلوک کرنے والے سے بغض دِلوں کی جبلت میں ہے۔ چوتھے اپنے نفس کی سعادت سے بھی گرا دیتی ہے کہ فرمایا وَمَا ظَلَمُوۡنَا وَلٰكِنۡ كَانُوۡۤا اَنۡفُسَهُمۡ یَظۡلِمُوۡنَ انہوں نے ہم پر ظلم نہیں کیا بلکہ حقیقت میں وہ اپنی جانوں پر ظلم کرتے ہیں۔ پانچویں پیچھے رہ جانے والی چیزوں میں خیر و برکت کا ذکر بھی ختم ہو جاتا ہے کہ دار الظالم خراب ولو بعد حین کہ ظالم کا گھر برباد ہے۔ اگرچہ کچھ وقت کے بعد ہی سہی۔ چھٹے شفاعت' اسلاف کی حمایت اور اچھے نسب سے بھی گرا دیتی ہے۔ فرمایا اِنَّهٗ لَیۡسَ مِنۡ اَهۡلِكَ اِنَّهٗ عَمَلٌ غَیۡرُ صَالِحٍ ہم اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں

تمام ناپسندیدہ چیزوں سے اللہ تعالیٰ کی پناہ لیتے ہیں۔

اور اگر اہلِ کتاب کہیں کہ ہم اپنے لیے مقبوعیتِ مطلقہ اور امامتِ عامہ کا دعویٰ نہیں کرتے کہ لوگ ہم سے لیاقت امامت کے سلب ہونے کی وجہ سے الزام دھریں بلکہ ہمارا مقصد یہ ہے کہ حکمِ الٰہی نہیں بدلتا۔ پس ہر رسول (علیہ السلام) اور ہر اُمت کو چاہیے کہ سابقہ کتابوں کی طرف رجوع کریں۔ اور ان میں سے عمدہ کتابیں تورات اور انجیل ہیں۔ جو کہ ہمارے پاس موجود ہیں۔ پس اس رسول علیہ السلام اور اس کی اُمت کو چاہیے کہ ان دونوں کتابوں کے احکام کی ہم سے تحقیق کریں کیونکہ یہ تو نرے اُمی ہیں' کتاب کو نہیں جانتے۔ نیز چاہیے کہ احکام کے منسوخ ہونے کا دعویٰ بھی نہ کریں۔ چنانچہ پہلے انبیاء علیہم السلام' بنی اسرائیل میں گزرے ہیں' اُنہوں نے اسی طریقے سے تورات کے احکام کی پیروی کی ہے۔

ان کے جواب میں آپ فرمائیں کہ تمہارا یہ دعویٰ بھی غلط ہے۔ اس لیے کہ حکمِ الٰہی ہر زمانے کے مطابق دوسرے رنگ میں آتا ہے۔ اور تمہیں خود بھی اس امر کا اقرار ہے کہ تورات نے ملتِ ابراہیمی کے بعض احکام کو منسوخ کیا تھا۔ تو اگر کوئی دوسرا رسول علیہ السلام اور کوئی دوسری کتاب تورات کے احکام کو منسوخ کرے تو ناممکن خیال کرنے اور تعجب کرنے کی کون سی جگہ ہے۔ اور اس اقرار کے لیے ایک اور واقعہ یاد کرو۔

وَاِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ اور اس وقت کو یاد کرو جبکہ ہم نے خانہ کعبہ جو کہ آج تک شہر مکہ میں موجود ہے۔ اور بے شمار مخلوق اس کی تعظیم' احترام' طواف اور اسلام میں مشغول ہے مَثَابَةً لِّلنَّاسِ لوگوں کے جمع ہونے کا مقام بنایا۔ تاکہ ہر سال حج اور طواف کرنے کے لیے اس عظیم گھر کے پاس جمع ہوں۔ اور اس اجتماع میں انہیں دینی' دنیوی' روحانی اور جسمانی فائدے حاصل ہوں۔ کیونکہ حق تعالیٰ نے نوعِ انسانی کو اس طرح پیدا فرمایا ہے کہ ان کے علوم اور انسانی کمالات ایک دوسرے سے ملنے اور مصاحبت کرنے سے بڑھتے ہیں۔ اور اسی لیے جنگلوں میں رہنے والے اور صحرانورد اکثر انسانی کمالات سے خالی ہوتے ہیں۔ پس یہ عین حکمت کے مطابق ہے کہ تمام جہان والوں کو ایک مکان اور ایک وقت میں جمع ہونے کا حکم فرمایا جائے تاکہ ہر ایک شخص دوسرے کے کمال سے فائدہ حاصل کرے۔

اور ایک ریاست کے رہنے والوں نے اپنی سوچ یا الہامِ خداوندی سے جو صنعتیں، پیشے، علوم اور عبادات ظاہر کی ہوں، دوسری ریاست کے رہنے والے اس مکان میں جمع ہونے کی وجہ سے ان پر مطلع ہوں اور اس تازہ سوچ کی اچھائی یا بُرائی آراء اور عقلوں کے اجتماع کی وجہ سے مقرر ہو اور اگر حاصل کرنے کے قابل ہے تو سب کے سب اسے سیکھیں۔

نیز انسانی ارواح اُن شیشوں کی طرح ہیں جو کہ ایک دوسرے کے مقابل پڑے ہیں کہ ایک کا عکس دوسرے میں پڑتا ہے۔ اور ایک کی استعداد دوسرے میں اثر کرتی ہے۔ پس اجتماع کے حکم کی وجہ سے ہر شخص کی کسب کی ہوئی عبادات اور کیفیات کے دوسرے بھی حامل ہو کر ایک عظیم نورانیت پیدا کرتے ہیں بہت سے چراغوں کی طرح کہ اجتماعی صورت کی وجہ سے ہر ایک کے نور کو کئی گنا بڑھا دیتے ہیں۔ اور اسی نکتہ کے لیے جمعہ اور باجماعت نماز مشروع ہوئی۔ البتہ پنجگانہ جماعتیں تو صرف ایک محلّہ کو جمع کرتی ہیں۔ اور جمعہ ایک شہر والوں کو جمع کرنے والا ہے۔ اور یہ جماعت ہفت اقلیم کے لوگوں کو جمع کرنے والی ہے۔ اور احتمال ہے کہ لفظ مثابہ ثواب سے مشتق ہو یعنی لوگوں کے لیے ثواب حاصل کرنے کی جگہ

حج اور عمرہ کی فضیلت

اور ظاہر ہے کہ یہ گھر ثواب حاصل کرنے کے لیے ایک عجیب نسخہ ہے۔ اس لیے کہ اس گھر کا حج حدیث صحیح کے مطابق تمام گناہوں کے کفارہ کا سبب ہے کہ فرمایا **من حج للّٰہ فلم یرفث ولم یفسق رجع کیوم ولدتہ امہ** جس نے اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے حج کیا اور رفث و فسوق سے پرہیز کی، وہ اس دن کی طرح ہو گیا جس دن وہ پیدا ہوا۔ اور اس گھر کا عمرہ بھی کفارہ سیأت ہے اس حدیث کے مطابق **العمرۃ الی العمرۃ کفارۃ بینھما** عمرہ سے لے کر عمرۃ تک دونوں کے درمیان کے گناہوں کا کفارہ ہے۔ اور نماز جو کہ ثوابِ کثیر حاصل کرنے کے اسباب میں سے بہترین ہے، کا صحیح ہونا اس گھر کی طرف منہ کرنے کے ساتھ مشروط ہے۔ اور طواف اور قربانی بھی جو کہ ثواب حاصل کرنے کے عمدہ اسباب سے ہیں، اسی گھر کی خصوصیات سے ہیں۔ اور تمام نیکیوں کے لیے خواہ روزہ یا صدقہ یا دوسری خیر کی قسموں میں سے ہوں اس گھر کے اردگرد یہاں تک زیادہ ثواب ہے کہ یہاں

کی ایک ایک نیکی دوسری جگہ کی ایک لاکھ نیکیوں کے برابر ہے۔ جیسا کہ تاریخ ارزقی اور حدیث کی دوسری کتابوں میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت کے ساتھ مروی ہے۔ اور وہاں مشغولیت عبادت سے قطع نظر صرف اس متبرک مقام کی مجاورت اور اس تجلیات سے معمور گھر کو دیکھنے سے ہی بے حد ثواب حاصل ہوتا ہے۔ جیسا کہ انہیں کتابوں میں مروی ہے کہ حضرت حق تعالیٰ ہر روز اس گھر پر ایک سو بیس (۱۲۰) رحمتیں نازل فرماتا ہے۔ ان میں سے ساٹھ (۶۰) طواف کرنے والوں' چالیس (۴۰) نماز ادا کرنے والوں اور بیس (۲۰) صرف دیکھنے والوں کے لیے ہیں۔ نیز حدیث پاک میں وارد ہے النظر الی الکعبة عبادۃ کعبہ شریف کی طرف نظر کرنا عبادت ہے۔ اور جب یہ گھر حصولِ ثواب کا مکان ہوا تو اجتماع وہجوم کی جگہ بھی ضرور ہوگا۔ اس لیے کہ بنی آدم کے عقل مند ثواب حاصل کرنے میں رغبت کرتے ہیں۔ اور جہاں اپنی مرغوب شے پائیں وہاں ہجوم کرتے ہیں اسی لیے کہا گیا ہے کہ جہاں میٹھا چشمہ جاری ہو وہاں آدمی' پرندے اور چیونٹیاں جمع ہوتی ہیں۔

واور اسی لیے ہم نے اس گھر کو کیا امناً امن کی جگہ تا کہ جو لوگ دینی اور دنیوی فوائد اور ثواب کمانے کے لیے اس کے اردگرد جمع ہوں' وہ خوف سے محفوظ ہوں ورنہ اجتماع اور مل بیٹھنا ممکن نہ ہوگا۔ اس لیے کہ خوف کی صورت میں بھاگنا آدمی کی جبلت میں ہے۔ اور لوگ نفع حاصل کرنے پر نقصان دُور کرنے کو پہلے رکھتے ہیں۔ اور اگرچہ روئے زمین پر ہر جگہ از روئے شریعت امن قائم کرنا واجب ہے۔ اور بغیر وجہ سے کسی کے درپے ہونا خواہ جان کو یا مال کو یا عزت کو حرام ہے۔ لیکن اس خطے کو ایک ایسی خصوصیت ہے جو دوسرے مقامات کو حاصل نہیں۔ جیسا کہ شاہی قلعے ان ممالک کی نسبت سے جن کی حفاظت کی جاتی ہے۔ اسی لیے حدِ حرم میں شکار کرنا گناہ اور کفارے کا موجب ہے۔ اور حدیث صحیح میں ہے کہ ان اللہ حرم مکة وانها لم تحل لاحد بعدی وانما احلت لی ساعة من نهار وقد عادت حرمتها الیوم کحرمتها بالامس فهی حرام بحرمة اللہ الی یوم القیامة یعنی بے شک اللہ تعالیٰ نے مکہ شریف کو محترم کیا اور اس میں لڑنا میرے بعد کسی کے لیے حلال نہیں۔ اور میرے لیے دن کی ایک گھڑی کے لیے اسے حلال

کیا گیا اور اس کی حرمت آج اسی طرح لوٹ آئی ہے۔ جیسا کہ کل تھی تو یہ اللہ تعالیٰ کی حرمت سے قیامت کے دن تک محترم ہے۔

اسی لیے امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اگر حد کا مرتکب یا کسی جان کا قاتل حرم مکہ میں داخل ہو جائے وہاں اُس کے درپے نہیں ہونا چاہیے۔ بلکہ اس کا حلقہ تنگ کر دینا چاہیے۔ اور لوگوں کو اس سے معاملہ روک دینا چاہیے۔ یہاں تک کہ اس سے بات نہ کریں۔ اور اس کے ہاتھ کوئی شے فروخت نہ کریں۔ اور وہ تنگ ہو کر حرم سے باہر آئے اس وقت اس سے قصاص لیں اور حد جاری کریں۔

اور ظاہر ہے کہ یہ مذکورہ احکام یہود کی شریعت میں بالکل موجود نہ تھے۔ اور تورات ان احکام کی ناسخ تھی۔ ہاں یہ احکام حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد اور ان پیروکاروں میں باقی تھے۔ یہاں تک کہ ہم نے ان پر فرض کر دیا تھا کہ اس گھر کے لیے ہر سال آؤ اور اس کے اردگرد ایک دوسرے کے قتل اور لُوٹ کھسوٹ کے درپے نہ ہونا۔

وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ اور بناؤ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے کھڑے ہونے کی جگہ کو جو کہ ایک معین پتھر ہے۔ اور اس پتھر پر کھڑے ہو کر حضرت ابراہیم علیہ السلام کعبہ بناتے تھے اس کے بعد اسی پتھر پر کھڑے ہو کر آپ نے لوگوں کے درمیان حج کا اعلان فرمایا۔ اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دونوں قدم مبارک اس پتھر میں نقش ہو گئے۔ اور احادیث صحیحہ میں وارد ہے کہ حجر اسود اور یہ پتھر دونوں حضرت آدم علیہ السلام کے ہمراہ بہشت سے آئے ہیں۔ قیامت کے دن دونوں کو آنکھیں، زبان اور لب عطا ہوں گے تا کہ جس نے اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے ان کی زیارت کی، گواہی دیں۔

مقام ابراہیم کو مصلی بنانے کی حکمت

مُصَلّٰی جائے نماز۔ کیونکہ خانہ کعبہ کے طواف کے بعد اس پتھر کے پیچھے کھڑے ہو کر دو رکعت تحیۃ الطواف گزارنا مقرر ہے۔ تا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی امامت تا قیامت جاری رہے۔ نیز جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اسی پتھر پر کھڑے ہو کر حج کا اعلان فرمایا تھا تو آپ کی رحلت کے بعد اس پتھر کے قریب کھڑا ہونا اور اللہ تعالیٰ کی عبادت بجالانا

گویا آپ کی خدمت میں حاضر ہونا ہے۔ اور آپ کی خدمت میں عبادتِ خداوندی بجالانا ہے۔ اور یہ حکم بھی بنی اسرائیل میں نہیں تھا تو کیا تعجب ہے کہ بنی اسرائیل کے انبیاء علیٰ نبینا وعلیہم الصلوٰۃ والسلام کے بعد بنی اسماعیل میں سے ایک رسول (علیہ السلام) پیدا ہو اور بنی اسرائیل کے مخصوص احکام کو منسوخ فرمادے۔ جیسا کہ تورات اور انبیاء بنی اسرائیل علیہم السلام نے بنی اسماعیل کے مخصوص احکام کو منسوخ کیا تھا۔

اور اگر وہ کہیں کہ خانہ کعبہ کو حج کے لیے مقرر کرنا' اس متبرک مقام میں ہر سال اجتماع کا واجب ہونا' ہر نماز کی ادائیگی میں اس گھر کی طرف منہ کرنا اور مقام ابراہیم کے پیچھے نماز طواف ادا کرنا احکامِ الٰہی سے نہ تھا۔ بلکہ لوگوں نے اپنی آراء کے اجتماع سے ان احکام کو مقرر کر رکھا تھا۔ ہاں حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیٰ نبینا وعلیہما السلام نے اس مکان کو عبادت کے لیے دوسری سب مسجدوں اور معبدوں کی طرح بنایا ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ تمہارا یہ خیال غلط ہے۔ اس لیے کہ جس طرح ہم نے لوگوں کے دِلوں میں اس مکان کی زیارت اور یہاں اجتماع کا شوق ڈالا ہے۔ اسی طرح ہم نے حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل (علیہما السلام) کو حج اور نماز کے لیے حکم دیا۔

وَعَهِدْنَآ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ یعنی ہم نے حضرت ابرہیم اور اسماعیل (علیہما السلام) کی طرف ایسی وحی بھیجی جو کہ تاکید اور مبالغہ میں عہد لینے کے مشابہ تھی۔ اَنْ طَهِّرَا بَيْتِىَ کہ میرے گھر کو پاک رکھو نجاستوں اور ان تمام چیزوں سے جنہیں دیکھنے سے طبع سلیم نفرت کرتی ہے۔ جیسے تھوک' ناک سے بہنے والا پانی اور کوڑا کرکٹ۔

لِلطَّآئِفِيْنَ طواف کرنے والوں کے لیے جو کہ اس کے اردگرد گھومتے ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ یہ تمہارے دین میں نہیں ہے۔ اس لیے کہ واجب طواف یا حج کے ضمن میں ہوتا ہے یا عمرہ کے ضمن میں اور تم ان دونوں کو جائز نہیں سمجھتے۔

وَالْعٰكِفِيْنَ اور یہاں اعتکاف کرنے والوں کے لئے جبکہ تم اس مکان میں اعتکاف کرنے کو دوسری مسجدوں میں اعتکاف کرنے سے بہتر نہیں سمجھتے ہو۔

وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ اور نمازیوں کے لیے جو کہ رکوع و سجود کرتے ہیں۔ اور تمہارے

دین میں رکوع بالکل نہیں ہے۔ اور تمہارا سجدہ بھی حقیقی سجدہ نہیں کہ پوری پیشانی کو زمین پر رکھو بلکہ اپنا ایک گال زمین پر رکھتے ہو۔ پس تم قائل ہو کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور آپ کی اولاد کے دین سے تورات کے آنے کی وجہ سے یہ احکام منسوخ ہو گئے ہیں تو اگر ایک دوسری کتاب کے آنے سے تورات کے بعض دوسرے احکام منسوخ ہو جائیں تو کیوں تعجب کرتے ہو؟

چند ابحاث

یہاں چند بحثیں باقی رہ گئیں۔ پہلی بحث یہ کہ وَاِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ کی دلالت اس پر ہے کہ اس مبارک گھر کو اجتماع کی جگہ قرار دینا خداتعالیٰ کی طرف سے ہے۔ لیکن اس وقت حکم کون سا تھا؟ اس آیت کے سیاق وسباق سے ظاہر یہ ہے کہ اس حکم کی ابتدا حضرت ابراہیم علیہ السلام کے وقت سے تھی۔ لیکن تواریخ کی رو سے ثابت ہے کہ اس عظیم گھر کو بنانا حضرت آدم علیہ السلام کے زمانہ میں وقوع پذیر ہوا۔ اور اس کے بعد یہ مقام ہمیشہ انبیاء علیہم السلام اور صلحاء کا معبد اور دعا کی قبولیت کی جگہ رہا۔

کعبہ معظمہ کی تعمیر کا بیان

تاریخ ارزقی' ابوالشیخ کی کتاب العظمۃ' تاریخ ابن عساکر' اور اس فن کی دوسری کتابوں میں مذکور ہے کہ جب حضرت آدم علیہ السلام جنت سے زمین پر آئے تو بارگاہِ خداوندی میں عرض کی کہ اے میرے خدا! میں ملائکہ کی تسبیح' تکبیر اور تہلیل زمین پر نہیں سنتا جیسا کہ آسمان پر سنتا تھا۔ اور نہ ہی کوئی طواف کی جگہ رکھتا ہوں جیسا کہ میں آسمان میں فرشتوں کی طواف گاہ دیکھتا تھا جو کہ بیت المعمور ہے۔ حکم ہوا کہ چلئے۔ اور جہاں ہم نشان دیں' مکان تعمیر کرو اور اس کے گرد طواف کرو اور اس کی طرف منہ کر کے نماز ادا کرو اور حضرت جبریل علیہ السلام کو حکم ہوا کہ حضرت آدم علیہ السلام کے ہمراہ جائیں۔ اور انہیں نشان دیں۔ حضرت جبریل علیہ السلام' حضرت آدم علیہ السلام کو کعبہ معظمہ کی جگہ لائے۔ اور وہاں اپنا پر مارا کہ زمین کی تہہ سے اس کے ساتویں طبقے سے متصل ایک بنیاد ظاہر ہوئی۔ اور

اس بنیاد کے اوپر فرشتوں نے بڑے بڑے پتھر جن میں سے ایک پتھر کو تیس (۳۰) آدمی بھی نہیں اُٹھا سکتے' ڈال کر اسے پُر کر دیا۔ اور یہ سب پتھر پانچ پہاڑوں سے تھے: کوہِ لبنان' کوہِ زیتا' طور سینا' جودی اور حرا۔ یہاں تک کہ وہ بنیاد سطح زمین کے برابر پہنچ گئی۔ اس وقت حق تعالیٰ نے بیت المعمور کو آسمان سے اُتار کر اس بنیاد پر رکھ دیا۔ اور حکم ہوا کہ حضرت آدم علیہ السلام اور ان کی اولاد اس کے گرد طواف کریں۔ اور اس کی طرف نماز پڑھیں۔ اور یہ گھر طوفانِ نوح علیہ السلام کے زمانے تک موجود تھا۔ اور طوفان کے وقت اس گھر کو پھر آسمان پر لے گئے۔ اس کے بعد کعبہ معظمہ کی جگہ ایک بلند ٹیلے کی طرح تمام زمین سے جدا معلوم ہوتی تھی۔ لیکن اس پر کوئی عمارت نہ تھی۔ اور دنیا والے اسی جگہ کا قصد کرتے تھے۔ اور اسے دعا کی قبولیت کا مقام سمجھتے تھے۔ یہاں تک کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بنائے کعبہ کا حکم ہوا۔

خانہ کعبہ کا رقبہ

اور ان کے ہمراہ سکینہ نے ایک بادل کی صورت میں سایہ ڈالا اور اس سایہ کی وجہ سے کعبہ معظمہ کی حد معین ہو گئی۔ اور حضرت جبریل علیہ السلام نے سایہ کے اندازے کے گرد ایک خط کھینچ دیا۔ اور اسی خط کے مطابق حضرت ابراہیم علیہ السلام زمین کھودنے میں مصروف ہو گئے۔ یہاں تک کہ حضرت آدم علیہ السلام کی بنیاد ظاہر ہوئی۔ اس بنیاد کے اوپر خانہ کعبہ کی تعمیر عمل میں آئی۔ اور جس وقت کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس گھر کی تعمیر فرمائی اس کی بلندی نو (۹) گز کی اور حجر اسود سے رکن شامی تک اس کا دور تینتیس (۳۳) گز اور رکن شامی سے رکن غربی تک بائیس (۲۲) گز اور رکن غربی سے رکن یمانی تک اکتیس (۳۱) گز اور رکن یمانی سے حجر اسود تک بیس (۲۰) گز۔ پس اس وقت کعبہ معظمہ کی شکل مستطیل تھی جس کا طول اس کے عرض سے واضح طور پر زیادہ تھا۔ اور دونوں طرفوں کا طول جو کہ شرقی اور غربی ہے' بھی مختلف تھا۔ لیکن غیر محسوس سا اور اسی طرح عرض کی دونوں طرفیں جو کہ شمالی اور جنوبی تھیں' بھی غیر محسوس سی مختلف تھیں اور اس وقت اس گھر کا دروازہ زمین کے ساتھ چسپاں تھا نہ کہ بلند اور بالکل کشادہ تھا کواڑ نہ تھے۔ حتیٰ کہ تبع حمیری نے اس

کے لیے دروازہ' کواڑ' زنجیر اور قفل بنائے۔

مقام ابراہیم اور حجر اسود کی حقیقت

نیز حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس مکان کے اندر داخل ہونے والے کے دائیں ہاتھ پر ایک گڑھا کھود کر چھوڑ دیا تھا تا کہ اس مکان کے خزانہ کے طور پر ہو۔ اور اس گھر کے لیے جو نذریں اور ہدیے آئیں اس خزانہ میں رکھے جائیں۔ اور اس گھر کے بنانے والے حضرت ابراہیم علیہ السلام تھے۔ اور مزدور حضرت اسماعیل (علیہ السلام) تھے۔ جو کہ گارا بناتے تھے۔ اور کوہِ ابوقبیس' حرا اور ورقان سے پتھر لاتے تھے۔ یہاں تک اس گھر کی عمارت آدمی کے قد سے اونچی ہوگئی۔ اور آپ کو ایسی چیز کی ضرورت پیش آئی جس پر کھڑے ہو کر تعمیر کریں۔ آپ نے حضرت اسماعیل علیہ السلام کو حکم دیا کہ میرے لیے ایک ایسا پتھر لاؤ جس پر کھڑے ہو کر تعمیر کا کام کرسکوں۔ آپ کسی پتھر کی تلاش میں کوہِ ابوقبیس پر گئے' راستے میں حضرت جبرئیل علیہ السلام ملے اور انہوں نے کہا کہ آیئے تا کہ میں آپ کو ایسے دو بڑے پتھروں کا پتہ دوں جو کہ آدم علیہ السلام کے ہمراہ جنت سے دنیا میں آئے ہیں۔ اور بڑی برکت رکھتے ہیں۔ اور حضرت ادریس علیہ السلام نے دونوں پتھروں کو طوفان آنے کے خوف سے اس پہاڑ میں چھپا کر دفن کر دیا۔ ایک حضرت ابراہیم علیہ السلام کے کھڑے ہونے کے لیے لے جائیں۔ اور دوسرے کو خانہ کعبہ کے گوشے میں دروازے سے دائیں طرف لگائیں تا کہ جو بھی اس گھر کا طواف کرے پہلے اس پتھر کو چومے اور طواف شروع کرے۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام' حضرت جبریل علیہ السلام کے حکم کے مطابق ان دونوں پتھروں کو یکے بعد دیگرے لائے۔ اور حضرت جبریل علیہ السلام نے بھی حضرت اسماعیل علیہ السلام کے ہمراہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس آ کر کعبہ کے گوشے میں حجر اسود رکھنے کا حکم دیا جب حضرت ابراہیم علیہ السلام ایک پتھر پر کھڑے ہو کر عمارت کی تعمیر فرما رہے تھے تو وہ پتھر عمارت کی بلندی کے اندازے کے مطابق بلند ہوتا تھا۔ یہاں تک کہ عمارت مکمل ہونے تک دوسرے پتھر کی ضرورت نہ پڑی اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دونوں قدموں کی انگلیوں کے نشان اس پتھر میں منقش ہوگئے۔ اور دوسرا پتھر جو کہ کعبہ شریف

کے گوشے میں رکھا گیا اس میں سے ایک عظیم نور پھیلا اور کعبہ معظمہ کے چاروں طرف اس کے نور نے سرایت کی۔حتیٰ کہ جس حد تک وہ روشنی پہنچتی تھی' چاروں طرف سے حرم شریف کی حد مقرر ہوئی کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے تعمیر کعبہ سے فارغ ہونے کے بعد اس حد کو حرم کے نصاب کے ساتھ نشان لگائے۔

اور حدیث صحیح میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت کے ساتھ آیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے تھے کہ الرکن والمقام یاقوتتان من یاقوت الجنة طمس اللہ نورهما ولولا ذالك لاضاء مابين المشرق والمغرب یعنی حجر اسود اور مقامِ ابراہیم جنت کے یاقوت میں سے دو یاقوت ہیں جن کا نور اللہ تعالیٰ نے مٹا دیا اگر ایسا نہ ہوتا تو مشرق ومغرب کے درمیان سب کچھ روشن ہو جاتا۔نیز حدیث صحیح میں وارد ہے کہ سیاہ پتھر کا رنگ جو کہ حجر اسود کے نام سے مشہور ہے' ابتدا میں بہت سفید اور نورانی تھا۔بنی آدم کے گنہگاروں کے ہاتھ لگنے سے اس قدر سیاہ ہو گیا۔اور قتادہ سے مروی ہے کہ اسلام سے پہلے عادت نہ تھی کہ کوئی مقامِ ابراہیم تک ہاتھ پہنچائے اور مسح کرے اس اُمت میں یہ کام رائج ہو گیا۔اور جنہوں نے اسلام سے پہلے اس پتھر کو دیکھا' نقل کرتے ہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دونوں ایڑیوں اور آپ کی انگلیوں کے نشان اس پتھر میں ظاہر اور واضح تھے۔اور اب لوگوں کے ہاتھ لگنے کی وجہ سے نشان بخوبی ظاہر نہیں ہیں۔اور ابن ابی شیبہ نے حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما سے نقل کی کہ انہوں نے ایک جماعت کو دیکھا جو کہ مقامِ ابراہیم پر ہاتھ پھیرتے ہیں۔آپ نے فرمایا خدا تعالیٰ نے تمہیں اس پتھر پر ہاتھ پھیرنے کا حکم نہیں دیا بلکہ اس کا یہی حکم ہے کہ اس کے متصل نماز پڑھو۔(اقول وباللہ التوفیق گزشتہ وضاحت سے پتہ چلتا ہے کہ تبرکاً مقامِ ابراہیم علیہ السلام کو ہاتھ لگانا اسلام میں رائج ہوا' پہلے نہ تھا۔گویا متبرک شے کو ہاتھ لگا کر برکت لینا اسلام کے خصائص میں سے ہے۔نیز سیاق کلام سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کے لوگوں کو مسح کرنے سے روکنے کی وجہ یہ تھی۔حضرت ابراہیم علیہ السلام قدمین شریفین کے نشانات مٹ رہے تھے انہیں باقی رکھنے کے لیے آپ نے صرف یہ فرمایا کہ ہاتھ پھیرنے کا حکم نہیں۔یہ

روایت نجدی شرک فروشوں کی دلیل نہیں ہو سکتی ورنہ حضرت انہیں ڈانٹتے' کوستے اور اس سے توبہ کرنے کا حکم دیتے جیسا کہ آج مقامِ ابراہیم کو ہاتھ لگانے والوں کو نجدی حرام' حرام اور شرک' شرک کی گردان کرتے ہیں۔ سلف صالحین سے اس کا اشارہ تک بھی نہیں ملتا بلکہ مذکورہ روایت سے تبرکات کے تحفظ کا مسئلہ واضح ہوتا ہے۔ محمد محفوظ الحق غفرلہٗ) اور بیہقی نے اپنی سنن میں روایت کی ہے کہ یہ پتھر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانۂ مبارک میں اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے عہد میں خانۂ کعبہ سے متصل تھا۔ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں قدرے فاصلہ پر رکھا گیا۔ اور اس کا سبب بہت بڑے سیلاب کا آنا تھا۔ جسے سیل ام نہشل کہتے ہیں۔ اور یہ پتھر سیلاب کے پانی کے زور سے اپنی جگہ سے ہٹ گیا اور دور جا پڑا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے خود تشریف لا کر اس پتھر کے لئے ایک جگہ تجویز کی۔ اور اس پتھر کے ارد گرد پتھر بھر کر درمیان میں اسے رکھا۔ اور جب سے اب تک اسی جگہ پر ہے۔ یہ ہے وہ حقیقت جو اکثر مورخین بیان کرتے ہیں۔

تعمیر کعبہ کے مختلف دور

پس خانۂ کعبہ کی پہلی تعمیر حضرت آدم علیہ السلام سے واقع ہوئی اور وہ جو مشہور ہے کہ اس گھر کی پہلی تعمیر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمائی ہے اس بناء پر ہے کہ اس جگہ کو کعبہ کی صورت میں کہ چار دیواریں اور چھت ہو' آپ نے بنائی ہے۔ جبکہ حضرت آدم علیہ السلام کے عہد میں اس کی بنیاد کے سوا کچھ نہ تھا۔ اور اس بنیاد کے اوپر بیت المعمور کو رکھا گیا تھا جو کہ اندر سے خالی یاقوت سے خیمہ کی شکل میں تھا۔ اور مٹی اور پتھر کی عمارت نہ تھی۔ لیکن حضرت آدم علیہ السلام سے پہلے بھی یہ مقام محل تعظیم واحترام تھا۔ بلکہ زمین اور اس میں جو کچھ ہے' کی تخلیق سے بھی پہلے جیسا کہ فاکہی تاریخ مکہ کی ابتدا میں کہتے ہیں کہ حدثنی عبداللہ بن ابی سلمہ قال حدثنا الواقدی قال حدثنا ابن جریج عن بشیر بن عاصم الثقفی عن سعید بن المسیب انہوں نے کہا کہ علی ابن ابی طالب کرم اللہ وجہہ الکریم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے بیت اللہ کو زمین وآسمان سے چالیس (۴۰) سال پہلے پیدا فرمایا پس وہ پانی پر جھاگ کی صورت میں تھا۔ نیز فاکہی نے اپنی سند کے ساتھ حضرت

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کی کہ کعبہ زمین سے دو ہزار (۲۰۰۰) سال پہلے پیدا کیا گیا۔ کہا گیا کہ اسے زمین سے پہلے کیسے پیدا کیا گیا۔ جبکہ یہ زمین سے ہے تو فرمایا کہ اس پر دو فرشتے مقرر تھے۔ جو کہ دو ہزار (۲۰۰۰) سال تک رات دن تسبیح پڑھتے رہے تو جب اللہ تعالیٰ نے زمین کو پیدا کرنے کا ارادہ فرمایا تو اسے کعبہ شریف کے نیچے سے بچھایا اور کعبہ کو زمین کے وسط میں کیا۔

اور وہ جو بعض مؤرخین نے کہا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کی وفات کے بعد آپ کے بیٹوں نے کعبہ کو مٹی اور پتھر سے بنایا ہے۔ اور اس مقام پر بیت المعمور کا ہونا حضرت آدم علیہ السلام کی حیات ظاہری تک تھا تو یہ اتنا قابلِ اعتماد نہیں۔ کیونکہ اس روایت کی سند کی انتہا وہب بن منبہ تک ہے۔ جو کہ زیادہ تر اسرائیلیات نقل کرتے ہیں۔ اور تحقیق یہی ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے پہلے اسے کسی نے مکان کی شکل میں نہیں بنایا ہے۔ اور قرآن پاک اور سنت صحیحہ شہورہ سے بھی ثابت ہے۔ اسی لیے شیخ عماد الدین بن کثیر اپنی تفسیر میں کہتے ہیں کہ کسی معصوم سے یہ روایت نہیں ہوا کہ خلیل علیہ السلام سے پہلے بیت اللہ تعمیر کیا گیا تھا۔ رہا حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بعد کا معاملہ تو مؤرخین کے نزدیک اسی طرح مقرر ہے کہ عمالقہ اور جرہم نے بھی اسے تعمیر کیا ہے۔ اور پھر قصی بن کلاب نے بھی اسے بنایا اور اس کی چھت کی گوگل کے درخت کی لکڑی کے ساتھ پوشش بنائی۔ اور کھجور کی لکڑی کو تختوں کی جگہ کام میں لایا گیا۔ پھر جب حضور علیہ السلام پچیس (۲۵) برس کے تھے تو قریش نے اس گھر کو پھر بنایا اور اس کی وجہ یہ تھی کہ ایک عورت کعبہ شریف کی پوشاک کو خوشبو والا دھواں دے رہی تھی، ایک چنگاری اُڑی جس سے چھت کی اکثر لکڑیاں جل گئیں اور اس سے پہلے ایک بہت بڑا سیلاب آیا تھا جس کے صدمے سے کعبہ شریف کی دیواریں پھٹ گئی تھیں۔ قریشی سرداروں نے جمع ہو کر ولید بن مغیرہ کو تعمیر کا انچارج مقرر کیا اور کعبہ کو شہید کر کے نئے سرے سے بنایا اور آپس میں یوں طے کیا گیا کہ مالِ حلال کے سوا اس مصرف میں کچھ بھی خرچ نہ کیا جائے۔ اور چونکہ اس وقت اکثر مال دار سود خور تھے اس لیے حلال مال بہت کم میسر آیا اور اس تعمیر میں بہت سی تبدیلیاں واقع ہوئیں۔ ایک یہ کہ کعبہ شریف کے عرض سے

چند گز زمین چھوڑ دی گئی اور اسے حطیم میں داخل کر دیا گیا۔ دوسری یہ کہ اس کے دروازے کو زمین سے بہت اونچا بنا دیا گیا تا کہ جسے چاہیں اندر آنے دیں اور جسے چاہیں اندر نہ آنے دیں۔ تیسری تبدیلی یہ کہ خانہ کعبہ کے اندر لکڑی کے ستونوں کی دو قطاریں کھڑی کر دی گئیں اور ہر قطار میں تین ستون تھے۔ چوتھی تبدیلی یہ کہ باہر سے خانہ کعبہ کی اونچائی دُگنی کر دی یعنی اٹھارہ (۱۸) گز۔ گویا حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بنائی ہوئی اونچائی سے نو (۹) گز زیادہ کر دیے۔

پانچویں تبدیلی یہ کہ خانہ کعبہ کے اندر رُکن شامی سے متصل ایک سیڑھی بنائی تا کہ اس کے ذریعے کعبہ کی چھت پر پہنچا جا سکے۔ اور یہ بھی پہلے نہ تھی۔

پھر اسلام میں عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما نے اس گھر کو بنایا اور اس حدیث پاک کے مطابق جو آپ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے سُنی تھی، دورِ جاہلیت کی نئی چیزیں ختم کر دیں اور گارے کے بجائے ورس کو جو کہ یمن میں خوشبودار مٹی ہے، پائیدار چونے میں ملا کر استعمال کیا گیا اور حطیم کو خانہ کعبہ میں داخل کر کے اس کے دو دروازے بنا دیے۔ ایک مغرب کی طرف دوسرا مشرق کی طرف اور جب آپ تعمیر سے فارغ ہوئے تو اوپر سے لے کر نیچے تک، باہر اور اندر مشک وغیرہ کی لپائی کی۔ اور دیباج کی پوشاک ڈالی گئی اور اس تعمیر سے ۲۷ رجب المرجب ۶۴ھ کو فراغت حاصل ہوئی۔

پھر حجاج کے دور میں اس عظیم گھر کی ایک اور تعمیر ہوئی لیکن صرف اسی قدر کہ کعبہ کی شامی طرف کو شہید کر کے قریش کی بنیاد پر اسے اونچا کیا اور کعبہ کی زمین کو بڑے بڑے پتھروں سے پُر کر کے اس کے مشرقی دروازے کو بلند کر دیا۔ اور مغربی دروازہ بند کر دیا۔ اور کعبہ کی دوسری طرفوں کو نہ چھیڑا اور یہ تعمیر ۷۴ھ میں واقع ہوئی۔ اس کے بعد سلطان مراد بن احمد خان کے دور تک عمارت کی تجدید نہ ہوئی سوائے اس کے کہ بادشاہ حجاج کی اسی تعمیر کی ترمیم و اصلاح کرتے رہے۔ یہاں تک کہ سلطان مراد نے پھر تعمیر کی تجدید کی اور سوائے حجر اور اس گوشے کے تمام کعبہ کو شہید کر کے تعمیر کیا۔ اور یہ تعمیر ۱۰۴۰ھ میں واقع ہوئی اور ابھی تک وہی عمارت باقی ہے۔ لیکن حجاج کی تعمیر کی طرز پر ہے۔

دوسری بحث یہ ہے کہ لفظ مثابہ سے لغتِ عرب کے مطابق دو چیزیں سمجھ میں آتی ہیں۔ایک یہ کہ مجمع ہو۔اور دوسری یہ کہ لوگ بار بار وہاں آئیں۔اور ایک بار آنے سے سیر نہ ہوں۔یہی وجہ ہے کہ حضرت ابن عباس' مجاہد اور دوسرے مفسرین نے کہا ہے کہ اس گھر کی زیارت کا شوق ہم نے لوگوں کے دِلوں میں ڈال دیا تا کہ اسے دیکھنے اور اس کا طواف کرنے سے سیر نہ ہوں اور جب بھی اس گھر سے جائیں' ان کے دل اس گھر کی طرف واپس آنے کے مشتاق ہوں۔چنانچہ یہ بات تجربہ میں آئی ہے کہ جو شخص اس گھر کا حج ایک بار کرتا ہے۔اور اس گھر کو دیکھ کر آتا ہے پھر وہ ساری عمر اس گھر کی طرف لوٹنے کا مشتاق رہتا ہے۔اگر چہ اس نے راستے میں بے شمار سختیاں برداشت کی ہوں اور بے پناہ تکلیفیں اُٹھائی ہوں اور اس گھر کو دیکھنے کے بعد اس کی تعظیم گویا اضطراری طور پر دل کی گہرائی سے جوش مارتی ہے۔اور اس کی تعظیم جبلی طبعی امور کی طرح محسوس ہوتی ہے۔

حیوانات کا کعبۃ اللہ کی تعظیم و طواف کرنا

ارزقی نے مطلق بن حبیب سے روایت کی ہے کہ ایک دن ہم حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے ہمراہ کعبۃ اللہ کے سایہ میں بیٹھے تھے۔یہاں تک کہ سورج بلند ہونے کی وجہ سے سایہ ختم ہو گیا۔اور لوگ اپنی جگہوں سے اُٹھ کھڑے ہوئے۔اچانک مسجد حرام کے دروازوں میں سے ایک دروازے کی طرف سے شدید چمک ظاہر ہوئی۔ہم نے دیکھا کہ ایک سانپ باہر آرہا ہے۔تمام حاضرین نے اپنی نگاہیں اس سانپ کی طرف متوجہ کر لیں۔وہ سانپ سیدھا خانہ کعبہ کی طرف آیا اور اس نے طواف کے سات چکر ادا کئے اور اس کے بعد مقامِ ابراہیم علیہ السلام کے پیچھے چلا گیا۔اور دو رکعت نماز ادا کی۔حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما اور دوسرے اکابرینِ محفل اس سانپ کے قریب گئے۔اور انہوں نے کہا: کہ اے عزیز! تیرا طواف ادا ہو گیا لیکن اس شہر میں ناواقف لوگ' غلام اور خدمت گار بہت ہیں' بہتر یہی ہے کہ تو اپنے آپ کو لوگوں کی نظر سے پوشیدہ رکھے' کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ تجھے ایذاء پہنچائیں اس نے یہ بات سنتے ہی اپنے سر کو اپنی دُم کے ساتھ لگایا اور آسمان کی طرف اُڑتا چلا گیا۔یہاں تک کہ ہماری نظر سے اوجھل ہو گیا۔

نیز ابوالطفیل سے لائے کہ نیک جنوں میں سے ایک نوجوان جو کہ وادی ذی طویٰ میں رہتا تھا اکثر سانپ کی شکل میں خانہ کعبہ کے طواف کے لیے آیا کرتا تھا۔ اور مقامِ ابراہیم علیہ السلام کے پیچھے نماز ادا کرتا تھا۔ جنیات میں سے اس کی ماں تھی جو کہ اس کام سے روکا کرتی تھی۔ اور ڈراتی تھی کہ ایسا نہ ہو کہ لوگ تجھے سانپ سمجھ کر مار دیں۔ وہ باز نہیں آتا تھا۔ یہاں تک کہ بنو سہم کے ایک گروہ نے اسے مار دیا اس کو مارتے ہی مکہ شریف میں زبردست غبار اُٹھا اور شدید آندھی آئی۔ اور بنو سہم کی اس جماعت کو ان کے گھروں میں مردہ پایا گیا۔

نیز تواریخ مکہ میں ایک طواف کرنے والے اونٹ کی حکایت مشہور ہے۔ اور اس حکایت کا خلاصہ یہ ہے کہ ۸۱۵ھ ماہ جمادی الاخری میں جمال فاروقی کے اونٹوں میں سے ایک اونٹ اپنے مالک سے بھاگ کر مکہ معظمہ کا قصد کیے ہوئے مسجد حرام میں داخل ہوا' بہت سے لوگ اس کے اردگرد بھاگ رہے تھے۔ اور اسے پکڑنا چاہتے تھے اس نے کسی کی طرف توجہ نہ کی۔ یہاں تک کہ خانہ کعبہ کے گرد طواف کے سات چکر بجالایا اور اس نے تین طواف پورے کئے۔ ازاں بعد حجر اسود کی طرف آیا اور اسے بوسہ دیا پھر مقامِ حنفیہ کی طرف متوجہ ہوا۔ اور میزاب رحمت کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ اور رونے لگا۔ یہاں تک کہ اس کی آنکھوں سے بے تحاشہ آنسو جاری ہو گئے۔ اور اسی حالت میں زمین پر گر پڑا اور جان کو جانِ آفریں کے سپرد کر دیا۔ اور لوگ اسے اس حالت میں دیکھ رہے تھے۔ اس کے مرنے کے بعد انہوں نے اسے اُٹھا کر صفا و مروہ کے درمیان لے جا کر دفن کر دیا۔

مکہ معظمہ میں پندرہ (۱۵) مقاماتِ قبولیت دعا

اور اس گھر کی طرف مخلوقات کے رجوع کے اسباب میں سے ایک سبب یہ ہے کہ یہاں چند مقامات پر دعا قبول ہوتی ہے۔ اور لوگوں نے تجربہ کیا ہے۔ اور اپنے دینی اور دنیوی مقاصد کے حصول کے لیے ان مقامات میں دعا کو نہایت قوی ترین وسیلہ سمجھتے ہیں۔ چنانچہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ سے صحیح روایت کے ساتھ ثابت ہے کہ مکہ معظمہ میں پندرہ (۱۵) مقام ایسے ہیں جہاں دعا قبول ہوتی ہے۔ ملتزم کے پاس' میزاب رحمت کے نیچے'

رُکن یمانی کے پاس' صفا پر' مروہ پر' صفا اور مروہ کے درمیان' رُکن اور مقام کے درمیان' کعبہ شریف کے اندر' منیٰ میں' مزدلفہ میں' عرفات میں' تینوں جمرات کے پاس اور زمزم شریف کا پانی پیتے وقت۔

انبیاء علیہم السلام- بنی اسرائیل اور تعظیم کعبہ

اور ابن ابی شیبہ کی مصنف میں مذکور ہے کہ بنی اسرائیل میں سے ایک اُمت مکہ شریف کو آتی تھی۔ اور جب وہ وادی ذی طویٰ پہنچتی تو حرم شریف کی تعظیم کے لیے اپنے جوتے اُتار لیتی۔ اور یہ بھی مذکور ہے کہ حضرت انبیاء علیہم السلام جب حرم کے نشان کے پاس آتے تو اپنی نعلین اُتار لیتے۔ اور ابونعیم نے حلیۃ الاولیاء میں امام مجاہد سے روایت کی کہ بعض اوقات بنی اسرائیل میں سے ایک ایک لاکھ آدمی حج کے لیے آتے اور جب حد حرم تک پہنچتے تو ننگے پاؤں ہو جاتے تھے۔ اور ارزقی اور ابن عساکر نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے کہ حواریوں نے بھی اس گھر کا حج کیا ہے۔ اور جب وہ حد حرم میں داخل ہوئے تو سواریوں سے اُتر گئے۔ اور پیدل چلنا اختیار کیا۔

اور ارزقی نے حویطب بن عبدالعزیٰ سے روایت کی ہے کہ زمانہ جاہلیت میں ہم ایک دن کعبہ شریف کے سائے میں بیٹھے تھے۔ اچانک ایک عورت آئی۔ اور اس نے کعبہ کے پردے کو پکڑ کر فریاد شروع کر دی کہ اے میرے خدا! میں اپنے شوہر کے ہاتھوں تنگ ہوں' مجھے بے وجہ مارتا ہے اس دعا کے ساتھ ہی اس کے شوہر کا ہاتھ خشک ہو گیا۔ میں اسے اسلام میں اشل یعنی ٹنڈا دیکھتا تھا۔

اور تواریخ میں ثابت ہے کہ اساف اور نائلہ دونوں مرد عورت تھے' کعبہ میں داخل ہوتے وقت مرد نے عورت کا بوسہ لیا۔ دونوں پتھر کی شکل میں مسخ ہو گئے۔ لوگوں نے دونوں کو کعبہ سے باہر لا کر مخلوق کی عبرت کے لیے کھڑا کر دیا۔ اور ابن ابی شیبہ نے عبدالرحمٰن بن سابط سے روایت کی ہے کہ مکہ شریف کے لوگ موسم حج میں باہر آئے ہوئے تھے۔ ایک چور نے مکان خالی دیکھ کر کسی کے گھر سے سونے کا ٹکڑا اُٹھا کر کعبہ شریف کے اندر رکھ دیا جب واپسی کے وقت وہ سونے کا ٹکڑا اُٹھانے کے لیے کعبہ میں آیا۔ ابھی اس کا سر کعبہ کے اندر

تھا۔ اور اس کے باقی اعضاء باہر کہ خانہ کعبہ نے اسے جھٹکا دیا اس کا سر تن سے جدا ہو گیا۔ لوگوں نے یہ عجیب واقعہ دیکھ کر اس کے مردہ جسم کو باہر لا کر کتوں کے آگے ڈال دیا۔

نیز ارزقی نے اپنی تاریخ میں سند صحیح سے ذکر کیا کہ جاہلیت کے دور میں ایک عورت تھی جس نے اپنے قریبی رشتہ داروں سے ایک بچہ لے کر پالا تھا۔ اور وہ عورت کسبِ معاش کے لیے گھر سے باہر جاتی تھا۔ اور وہ بچہ اکیلا رہ جاتا۔ ایک دن اس بچے نے اپنی تنہائی کا شکوہ کیا اس عورت نے کہا کہ اے بیٹے! اگر اکیلے ہونے کی حالت میں کوئی ظالم تجھ پر زیادتی کرے تو جان لے کہ مکہ میں ایک گھر ہے' اپنے آپ کو اس میں پہنچا دینا اور فریاد کرنا۔ اس گھر کا ایک مالک ہے۔ جو کہ فریاد کو پہنچتا ہے۔ اتفاقاً اس بچے کو اکیلا پا کر ایک ظالم قیدی بنا کر لے گیا اور ایک مدت تک اسے اپنے پاس رکھا۔ ایک دفعہ وہ تجارت کی غرض سے مکہ معظمہ میں پہنچا اور وہ بچہ اس کے ہمراہ تھا جب اس نے اس گھر کو دیکھا' لوگوں سے پوچھا کہ یہ کس کا گھر ہے؟ انہوں نے کہا خانہ خدا ہے۔ اسے ماں کی بات یاد آ گئی اس ظالم کے قبضے سے بھاگ کر خانہ کعبہ کے قریب آیا اور اس کے پردوں کو مضبوطی سے پکڑ لیا اس کے پیچھے اس کا مالک پہنچ گیا اور اس نے چاہا کہ اسے کھینچ کر لے جائے۔ پہلے اس نے اپنا دایاں ہاتھ بڑھایا تا کہ اس بچے کو پکڑ لے اس کا ہاتھ خشک ہو گیا پھر بایاں ہاتھ بڑھایا' وہ بھی خشک ہو گیا جب اس نے صورتِ حال اس طرح دیکھی تو سردارانِ قریش کے پاس گیا اور کہا کہ میں اس مصیبت میں گرفتار ہو گیا ہوں' تم گواہ ہو کہ میں نے اس بچے کو چھوڑ دیا۔ اور میں اس کے درپے نہ ہوں گا جہاں چاہے چلا جائے۔ لیکن میرے دونوں ہاتھوں کا علاج کیجئے۔ اکابرِ قریش نے کہا کہ اپنے ہر ہاتھ کے لیے ایک اونٹ قربانی کر و اس نے اسی طرح کیا اس کے دونوں ہاتھ کھل گئے۔

نیز ارزقی نے عبدالمطلب بن ربیعہ بن حارث سے روایت کی کہ بنی کنانہ کا ایک شخص اپنے چچازاد پر بہت ظلم کرتا تھا۔ اور وہ خدا تعالیٰ اور قرابت کی جتنی پناہ ڈھونڈتا' وہ ظالم اسے تکلیف دینے سے باز نہیں آتا تھا' مجبور ہو کر اس نے خانہ کعبہ کی پناہ لی۔ اور دعا کی کہ اے میرے خدا! فلاں مجھ پر ظلم کرتا ہے۔ اور میں نے تیرے گھر میں پناہ لی ہے۔ اسے کسی ایسی

درد میں مبتلا کر جولا دوا ہو۔ یہ دعا کی اور گھر چلا گیا۔ اس نے دیکھا کہ اس کے ظالم کا پیٹ سوج کر مشک کی طرح ہو گیا ہے، جتنی دوائیں کرتا تھا، کوئی فائدہ نہیں ہوتا تھا۔ یہاں تک کہ اس کا پیٹ پھٹ گیا اور مر گیا۔ عبدالمطلب کہتے ہیں کہ میں نے یہ واقعہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے سامنے پیش کیا تو آپ نے فرمایا کہ میں نے بھی ایک ایسے شخص کو دیکھا جس نے خانہ کعبہ کے سامنے کھڑے اپنے ظالم کے لیے بددعا کی کہ اندھا ہو جائے۔ وہ فی الفور اندھا ہو گیا۔ اور لوگ اسے کھینچ کر لے گئے۔ اور یہی کرشمے تھے کہ یہ مکان ہمیشہ جائے امن رہا ہے۔ کیونکہ لوگ دنیوی عذاب کے خوف سے اس شہر کے لوگوں کے درپے ہونے اور اس شہر کی بے ادبی کرنے پرہیز کرتے تھے۔ اور یہاں ایک دوسرے کے ساتھ جھگڑا نہیں کرتے تھے۔ اور اس شہر کے امن کے اسباب میں سے ایک اور سبب یہ ہے کہ بادشاہوں کے تسلط سے ہمیشہ آزاد رہا۔ یہاں تک کہ اسلام تک نوبت پہنچی اور جو لوگ اس مکان کی تعظیم زیادہ کرتے تھے، سلطنت کے مرتبہ کو پہنچے۔ اس کے بعد زیادہ امن متحقق ہوا۔

تیسری بحث

یہ ہے کہ اس گھر کی نسبت خدا تعالیٰ کی طرف کرنے کا کیا معنی؟ جیسا کہ اس آیت میں واقع ہے اَنْ طَهِّرَا بَيْتِيَ (البقرہ آیت ۱۲۵) اگر اس گھر کی خالقیت اس اضافت کو درست قرار دیتی ہے تو ہر خطۂ زمین یہی حکم رکھتا ہے۔ اور سکونت اور بود و باش کی نسبت سے ہے تو باری تعالیٰ کی ذات پاک مکان سے منزہ ہے۔ اسے کسی مکان کے ساتھ یہ نسبت حاصل نہیں۔ اور اگر اس سبب سے ہے کہ یہاں اس کی عبادت کی جاتی ہے۔ اور اس کی شان معبودیت نے وہاں ظہور فرمایا ہے تو خانہ کعبہ اور کفار کے عبادت گھر جیسے ہردوار وغیرہ یکساں ہوئے کیونکہ سب میں شانِ معبودیت ظاہر ہے۔ اس لیے کہ ہر جگہ طالبان حق اپنے شوق کو صورت کے لباس میں ظاہر کرتے ہیں؟

اس کا جواب یہ ہے کہ جنابِ الٰہی کے ساتھ اس گھر کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ گھر اللہ تعالیٰ کے حکم کے ساتھ اس کی عبادت اور اس کی طلب کے شوق کو پورا کرنے کے لیے بنایا گیا ہے۔ اور اس کا مخلوقات کے ساتھ کسی قسم کا تعلق نہیں ہے۔ جبکہ کفار کے عبادت گھر جیسے

ہردوار وغیرہ نہ تو اللہ تعالیٰ کے حکم کے ساتھ اس کام کے لیے بنائے گئے ہیں۔ اور نہ ہی مخلوقات کے تعلق سے خالی ہیں۔ کیونکہ ان تمام عبادت گھروں میں رام یا کشن یا دوسری روحوں کی کوئی نسبت ان جگہوں کا قصد کرنے والوں کی نظر میں ملحوظ ہے۔ پس ان دونوں جہتوں سے فرق واضح ہو گیا۔

اور اس کی تحقیق یہ ہے کہ کسی مکان کو قبلہ بنانے کے لیے یہ دو چیزیں لازم ہیں۔ ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے ساتھ ہو۔ اس لیے ظہورِ الٰہی کی نسبت تو ہر جگہ ہے۔ لیکن یہ ظہور عام عقل مندوں کے اجماع کے مطابق عبادت میں اس طرف توجہ کرنے کو صحیح قرار نہیں دیتا تو اس کام میں ایک خاص قسم کا ظہور ضرور ہونا چاہیے۔ اور اس ظہور کو پہچاننے کی ترازو عقلِ بشری کی حد سے باہر ہے۔ توقیف شرعی کے بغیر سمجھی نہیں جا سکتی۔ تو اس بارے میں شارع کی نص ضروری ہے۔ دوسری چیز یہ کہ اس مکان کو کسی طور سے بھی کسی مخلوق سے تعلق نہ ہو۔ ورنہ اس مکان کی طرف منہ کرنے کے وقت شرک کا شائبہ لازم آئے گا۔ اور اس عبادت میں خالص توحید نہیں رہے گی۔ اور اسی لیے قبورِ انبیاء علیہم السلام، ستارہ، آگ، پانی اور درخت کو قبلہ قرار دینے کے متعلق سختی سے منع کیا گیا۔ اور تفتیش کے مطابق کفار کے معبدوں میں یہ دونوں صفتیں نہیں ہیں۔ مثلاً ہردوار اس وجہ سے ان کے نزدیک واجب التعظیم ہے کہ کشن اسی راہ سے اوپر گیا اور اجودھیا اس وجہ سے کہ رام چندر کا مسکن اور سیتا کا مقامِ رسوائی ہے۔ علیٰ ہذا القیاس

البتہ یہ فرقہ جو کہ حلولی المذہب ہیں، ان اشخاص کو ذاتِ مقدس کے مظاہر سمجھتے ہیں۔ اور ان اشخاص کی طرف منسوب چیزوں کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب چیزوں کے حکم میں جانتے ہیں۔ لیکن جب اس ذات پاک کے لیے حلول باطل ہے۔ یہ خیال فاسد کی بنیاد فاسد پر کے قبیلے سے ہے۔ اور اگر بالفرض کفار کے معبدوں کو ہم اصل میں شعائر الٰہی مانیں۔ اور کہیں کہ ان مقامات کی نسبت مخلوقات کی طرف ان فرقوں کی تحریفات میں سے ہے۔ اور ابتدا میں ذاتِ حق کے سوا کسی کے ساتھ ان کی نسبت نہ تھی۔ اور کوئی صریح نص ان مقامات کے تعین کے بارے میں قدیم شریعتوں میں آئی تھی تو پھر بھی خانہ کعبہ اور ان

مقامات کے درمیان فرق ظاہر ہے۔ اس لیے کہ ان مقامات میں عبادت کرنا بھی منسوخ ہے۔ اور منسوخ حکم کی پیروی کرنا خدا تعالیٰ کی صریح مخالفت ہے۔ اور اس کا راز یہ ہے کہ قبلہ مقرر کرنے کا مدار عبادت کی قبولیت پر ہے۔ اور جب قبولیت عبادت کو ایک مکان یا ایک جہت پر منحصر کر دیا گیا تو پھر اس مکان کے علاوہ عبادت بجالانا اپنی کوشش کو ضائع کرنا ہے۔

بلاتشبیہہ جس طرح ایک بادشاہ اپنی سلطنت میں سے کسی مکان کو دارالخلافہ مقرر کرے۔ اور رعایا پر فرض کر دے کہ اپنی حاجتیں اسی مکان کی طرف لے جائیں۔ اور نذریں، ہدیے اسی مقام پر پہنچائیں پھر کچھ عرصہ کے بعد دوسرے مقام کو دارالخلافہ بنائے اور اس مکان کے متعلق اسی قسم کا حکم صادر کرے تو پہلے مکان کو کوئی حکومتی اعزاز نہیں رہتا۔ اور وہاں آمد و رفت بے فائدہ ہو جاتی ہے۔ اور جو نذریں اور ہدیئے وہاں پہنچائیں۔ قبولیت نہیں پاتے۔ بلکہ اگر رعایا میں سے کوئی اصرار کرے۔ اور کہے کہ دارالخلافہ وہی مکان ہے نہ کہ یہ دوسرا۔ تو وہ لازمی طور پر تنبیہہ اور سزا کا مستحق ہو جاتا ہے کہ اس نے بادشاہ کے حکم کی خلاف ورزی کی۔ اور اگر کفار کے عبادت گھروں کا قصد کرنے والوں سے کوئی شخص تفتیش کرے کہ تم کس لیے اور کس کے لیے جاتے ہو؟ تو ضرور واضح ہو جائے گا کہ یہ لوگ ان مکانات کی طرف جانے میں مخلوقات میں سے کسی مخلوق خواہ روحانی ہو یا جسمانی کے قرب کا قصد کرتے ہیں۔ اور ذاتِ خالق کی طرف متوجہ ہونے سے بالکل غافل ہیں۔ اس قسم کا مکان جو کہ صرف توجہ الی اللہ کے لیے معین اور مقرر ہو، زمین کی طرفوں میں خانہ کعبہ اور صخرۂ بیت المقدس کے سوا کہیں نہیں پایا جاتا اسی لیے ان دونوں مکانوں کو قبلہ ہونے کی لیاقت حاصل ہوئی اور بس۔

البتہ کفار کے معبدوں کو اگر قدرے مشابہت ہے تو اولیاء و صلحاء کی قبور یا ان کی چلہ گاہوں سے ہے نہ کہ کعبہ اور صخرہ بیت المقدس سے۔ اور دونوں میں بہت فرق ہے۔ اور یہیں سے ان تاکیداتِ بلیغہ کا راز واضح ہو گیا جو کہ حدیث پاک میں زیارتِ قبور اور تین سجدوں کے سوا کسی اور مقام کی طرف شدِ رحال کرنے سے روکنے میں وارد ہوئیں اور اس سے کہ انبیاء علیہم السلام کی قبور کو سجدہ گاہیں بنائیں۔ مدعا یہی ہے کہ اس عمل میں اکثر جاہل

لوگ وہی عقیدہ اپنا لیتے ہیں جو کہ مشرکوں کو اپنے بزرگوں کے بارے میں ہے۔ اور خالص توجہ الی اللہ نہیں رہتی مگر ان ارواح کے پردے میں اور اس قدر توجہ آخرت میں جو کہ نفسِ انسانی کی دوستی اور فساد کے ظاہر ہونے کا وقت ہے' کام نہیں دیتی۔

(اقول وباللہ التوفیق۔ ظاہر ہے کہ اہلِ ایمان اولیاء اللہ کے مزارات پر انہیں اللہ تعالیٰ کے ولی سمجھ کر جاتے ہیں اس سے واضح ہے کہ وہ یہاں حاضری میں ذاتِ حق کو اولیاء اللہ سے ثانوی حیثیت نہیں دیتے بلکہ وہ تو اس حوالے سے جاتے ہیں کہ یہ مقبولانِ بارگاہِ خداوندی ہیں۔ اور انہیں مستقل نہیں مانتے' شریک نہیں ٹھہراتے۔ بلکہ بندگانِ خدا سمجھتے ہیں انہیں مظاہرِ عونِ خداوندی جانتے ہیں۔ جبکہ مشرکین تو غیر خدا کو معبود مانتے ہیں۔ اور انہیں شریک ٹھہراتے ہیں' دونوں عقیدوں میں واضح فرق ہے۔ حضرت مفسر علام رحمتہ اللہ علیہ نے ان لوگوں کی بات کی ہے جو مشرکین کا سا عقیدہ رکھیں۔ چنانچہ نفس مسئلہ زیارتِ قبور کے لیے آپ نے ایاك نعبد کے تحت خود اسی تفسیر میں ارشاد فرمایا آنچہ تعلق بچشم وارد...... وزیارت قبور شہداء وصالحاں کہ جان خود در راہ او باختہ اند۔ یعنی وہ عبادت جو آنکھ سے تعلق رکھتی ہے' شہداء اور اولیاء کی قبور کی زیارت ہے جنہوں نے راہِ خداوندی میں اپنی جانوں کی بازی لگا دی۔ اور آگے چل کر وایاك نستعین کے تحت فرمایا دریں جا باید فہمید اگر التفا محض بجانب حق ست و اورا ایکے از مظاہر عون دانستہ و نظر بکارخانہ اسباب و حکمت او تعالیٰ دراں نمودہ بغیر استعانت ظاہر نماید دور از عرفان نخواہد بود۔ و در شرع نیز جائز و رواست۔ بلکہ آگے فرماتے ہیں کہ انبیاء و اولیاء ایں نوع استعانت بغیر کردہ اند۔ ایسی استعانت انبیاء و اولیاء نے غیر اللہ سے کی ہے۔ اس لیے حضرت مفسر علام کی اس عبارت کو آپ ہی کی وضاحت کے تناظر میں دیکھا جائے۔ محمد محفوظ الحق غفرلہٗ)

اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب خانہ کعبہ کی تخصیص کی وجہ

اب ہم یہاں پہنچے کہ اس مکان کو ایسا گھر بنانے میں جو کہ جنابِ خداوندی کی طرف منسوب ہو' عبادت کا قبلہ اور مرجع خلائق ہو' خاص کرنے میں کیا حکمت ہے؟ اس لیے کہ شارع حکیم مطلق ہے۔ بغیر کسی حکمت کے اٹکل کے ساتھ تخصیص نہیں فرماتا۔ ہم کہتے ہیں

کہ اس تخصیص کی حکمت میں تین مؤثر وجوہ ہیں جو کہ افراد بشر کے ناقص فرد کے ذہن میں آئی ہیں۔ پہلی وجہ یہ ہے نوع انسانی کی اصل خاک ہے۔ اور کرۂ خاک کی اصل یہی نقطہ ہے۔ جیسا کہ گزشتہ روایات میں گزرا کہ زمین کی تخلیق سے پہلے یہ مکان پانی کی سطح پر جھاگ کی طرح کا ایک جسم تھا۔ اور اس کے بعد ساری زمین اسی جھاگ کے نیچے سے بچھائی اور وسیع کی گئی۔ پس جسم آدمی کی اصل اسی نقطہ کی طرف لوٹتی ہے۔ اسے چاہیے کہ جب اپنے جسم کو اپنے پروردگار کی عبادت میں مشغول کرے تو اس کے مٹی والے اصل کی طرف رجوع کرے۔ چنانچہ جہاں بھی اسے میسر ہو اپنے اصل قریب پر سجدہ کرتا ہے تو عبادت کے وقت اپنے اصل بعید کی طرف متوجہ ہو اور عمر میں اک مرتبہ اس مقام کی زیارت کے ساتھ توجہ الی اللہ اور اشتیاق الی لقاء اللہ کے معنی کو جلوہ گر کرے۔ اور حقِ شوق کو پورا کرے۔ اور اس کے اردگرد گھومے اور اپنے مالک کی رضامندی کے لیے حکم بجالائے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ عبادت کے وقت آدمی فرشتوں کا خلیفہ ہے۔ دراصل یہ عظیم شغل ان کا کام ہے۔ جیسا کہ وہ غصے کے وقت درندوں کا خلیفہ ہے۔ اور شہوت کے وقت چارپایوں اور مکروفریب کے وقت شیطان کا خلیفہ ہے۔ اور فرشتوں کی عبادت گاہ آسمان میں بیت المعمور ہے۔ اور یہ مقام زمین پر بیت المعمور کے بالکل سیدھ میں ہے۔ جیسا کہ ارزقی نے حسن بصری رضی اللہ عنہ سے اور دوسرے بہت سے تابعین سے روایت کی کہ بیت اللہ، بیت المعمور کی سیدھ میں ہے۔ اور ان دونوں کے درمیان ان کی سیدھ میں ساتویں آسمان تک۔ اور جو اس کی سیدھ میں اس سے ساتویں زمین تک اس کے نیچے ہے، سب کا سب حرم ہے۔ اور دوسری سند سے اسی مضمون کو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت کے ساتھ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کی۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ اس عظیم الشان مکان میں حضرت اسماعیل علیہ السلام کے بارے میں جو کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں سب سے بڑے ہیں۔ اور حضور خاتم المرسلین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نسب مقدس کا مبداء ہیں، ربوبیت الٰہی عجیب رنگ میں ظاہر ہوئی اور اس مکان کے بالکل قریب غیبی پانی جس کا نام زمزم ہے۔ حضرت جبریل علیہ

السلام کے پر مارنے سے اُبلنے لگا۔ اور اب تک جاری ہے۔ تو جب بھی حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیٰ نبینا وعلیہما السلام والتحیہ کی اولاد اور ان کے تابعین چاہیں کہ دربار رب العزت میں متوجہ ہوں اس مکان کو توجہ کے لیے اختیار کریں کیونکہ اللہ تعالیٰ کی شان ربوبیت نے ان کے بزرگ اسلاف کے حق میں جن کی طرف منسوب ہو کر یہ لوگ فخر محسوس کرتے ہیں اسباب کے پردہ کے بغیر جلوہ گری فرمائی اور اس شان ربوبیت کے آثار ونشان اب تک ظاہر ہیں۔

اور حضرت ابراہیم واسماعیل علیٰ نبینا وعلیہما السلام والتحیہ کے حق میں بھی اس نعمت کا شکر یہ ادا کرنے کا تقاضا ہوا کہ یہاں عبادتِ خداوندی کے لیے ایک مکان مقرر کریں۔ تاکہ جب بھی وہاں عبادت میں مشغول ہوں تو اللہ تعالیٰ کی شانِ ربوبیت عیاں طور پر انہیں ملحوظ ہو۔ کیونکہ مکان کو دیکھنا گزشتہ واقعات کو یاد دلانے میں بہت بڑا دخل رکھتا ہے۔ یہ تین چیزیں ہیں جو کہ اس جگہ کو خدا کا گھر بنانے کے لیے تخصیص کی ابتدا میں وجوہ حکمت کے طور پر بشر کو معلوم ہیں۔ لیکن اس کے بعد جبکہ یہ مکان معبد خلائق' قبلۂ عبادات' عاشقانِ صادق کا مرجع اور خاص محبوں کا مطاف بن گیا تو اس مکان کی تخصیص کی وجوہ کی عمدہ وجہ اس مقام میں تجلی الٰہی کا ظہور ہے۔ کہ یہ تمام تعظیمیں اور محبتیں اسی تجلی پر واقع ہوتی ہیں۔ اور قسم قسم کی دعائیں اور رنگارنگ اذکار اسی پر پڑتے ہیں۔ اور یہ کامل وسیع تجلی ہے۔ جس نے اس خطہ کے اردگرد کو نورِ عظیم کے ساتھ پکڑا ہوا ہے۔ اور ملائکہ کی افواج کو خدمت اور اتباع میں لگایا ہوا ہے۔ اور بعض سابقہ انبیاء علیہم السلام کے کلام میں جسے بنی اسرائیل کی کتابوں میں روایت کرتے ہیں اسی تجلی کی طرف اشارہ ہے۔ اور وہ اللہ تعالیٰ کا قول ہے **سبحان الذی تجلی علی طور سیناء واشرق نورہ من الساعیر واستعلن من جبال فاران۔** فاران مکہ معظمہ کا نام ہے۔ جیسا کہ ساعیر کوہ بیت المقدس کا نام ہے۔ اور اس کلام کا معنی یہ ہے کہ وہ خداوند پاک ہے۔ جس نے کوہِ طور پر تجلی فرمائی۔ جس کا نور ساعیر سے چمکا اور جو فاران کے پہاڑوں پر بے پردہ ظاہر ہوا۔ اور اسی تجلی الٰہی کے سبب اس عظیم گھر کے زائروں میں سے جو شخص اس میں گہری نظر سے دیکھے' ایک سکون' ایک وقار اور جلال سے ہر ایک

عظمت پاتا ہے۔ خواہ ذہین ہو خواہ کند ذہن اور وہ سمجھتا ہے کہ یہاں ایک عظیم شان ہے۔ جو کہ کسی مکان میں نمودار نہیں ہے۔ اور دلوں میں اس گھر کا محبوب ہونا اور اس کی طرف دلوں کو کھینچنا اسی تجلی کے اثرات ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس کے ظاہر و باطن کے مشاہدہ کا شرف نصیب فرمائے اور جہاں اللہ تعالیٰ کی خاص تجلیات کے بارے میں جو کہ قلوب اولیاء پر واقع ہوتی ہیں۔ اور ابھی وہ شان معبودیت و مسجودیت کے مرتبہ کو نہیں پہنچاتیں' کئی چیزیں کہی ہوں جیسا کہ حذیفہ بن الیمان کا قول لمجلس من عمر خیر من عبادۃ ستین سنه کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی ایک مجلس ساٹھ (۶۰) برس کی عبادت سے بہتر ہے۔ اور مولانا روم کے اس قول کی طرح کہ جن نے تبریز میں شمس الدین کی ایک نظر پائی' وہ بستی پر طعن اور چلہ سے مذاق کرتا ہے تو اس عام وسیع تجلی کے بارے میں جو کہ معبودیت کے مرتبہ کو پہنچی ہے' کیا سمجھا جا سکتا ہے؟ البتہ ابن ابی شیبہ' ارزقی' جندی اور بیہقی شعب الایمان میں عطاء بن یسار سے لائے ہیں کہ بیت اللہ کی طرف دیکھنا عبادت ہے۔ اور بیت اللہ کی طرف دیکھنے والا قائم' صائم' مخبت اور مجاہد فی سبیل اللہ کے مرتبہ پر ہے۔

اور جندی نے عطا سے روایت کی کہ طواف اور نماز کے بغیر بیت اللہ شریف کی طرف دیکھنا ایک سال کی عبادت کے قیام' رکوع اور سجود کے برابر ہے۔ اور ابن ابی شیبہ اور جندی نے طاؤس سے نقل کیا کہ بیت اللہ شریف کی طرف نظر صائم قائم دائم مجاہد فی سبیل اللہ کی عبادت سے افضل ہے۔ اور ابن عدی اور بیہقی نے شعب الایمان میں تضعیف کے ساتھ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت کے ساتھ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بیان کیا کہ اللہ تعالیٰ کی ایک سو بیس (۱۲۰) رحمتیں ہیں جنہیں ہر روز و شب میں اس گھر کے لیے نازل فرماتا ہے۔ ساٹھ (۶۰) طواف کرنے والوں کے لئے چالیس (۴۰) نماز پڑھنے والوں کے لیے۔ اور بیس (۲۰) دیکھنے والوں کے لیے ہیں۔ اور ارزقی نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کی کہ جب بھی سابقہ پیغمبروں میں سے کسی پیغمبر علیٰ نبینا علیہم السلام کی اُمت عذاب الٰہی کے ساتھ ہلاک ہوتی تو وہ پیغمبر علیہ السلام مکہ شریف کی طرف رجوع فرماتے۔ اور عبادت میں مشغول ہوتے جس طرح کہ عہدے دار اور بادشاہی خدمت گزار

جب اپنی ذمہ داریوں سے فارغ ہو جاتے ہیں تو وہ بادشاہ کے حضور رجوع کرتے ہیں۔ اور اس کے مجرا اور سلام میں حاضر رہتے ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ جس کا دل دنیا سے بھر جاتا ہے' وہ چاہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرے۔ کہتا ہے کہ میں بیت اللہ کا ارادہ رکھتا ہوں۔ گویا وہ خدا تعالیٰ کی طرف رجوع اسی طریقے سے سمجھتا ہے۔ اور یہاں سے مثابہ للناس کا ایک اور معنی ظاہر ہو گیا۔

اور ارزقی نے امام مجاہد سے روایت کی کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سرخ اونٹ پر سوار ہو کر خانہ کعبہ کے حج کے لیے تشریف لائے ہیں۔ اور آپ نے روحا سے احرام باندھا اور آپ نے دو قسطوانی گودڑیاں زیب تن فرمائیں' ایک دھوتی بنائی اور دوسری چادر اور خانہ کعبہ کا طواف فرمایا۔ اور صفا و مروہ کے درمیان بھی گھومے۔ اور آپ صفا و مروہ کے درمیان لبیک لبیک کہتے ہوئے دوڑ رہے تھے کہ غیب سے ایک آواز آپ کے کانوں میں پہنچی لبیک عبدی انا معك یعنی میں حاضر ہوں اے میرے بندے' میں تیرے ساتھ ہوں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اس آواز کی لذت سے بے ساختہ سجدہ کرتے ہوئے زمین پر گر پڑے۔

اور ابن مردویہ اور اصفہانی نے ترغیب و ترہیب میں اور دیلمی نے جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے روایت کی کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ جب قیامت کا دن ہوگا کعبۃ اللہ کو فرشتے دُلہن کی طرح زیب و زینت سے سجا کر میدانِ حشر میں لائیں گے۔ راستے میں میرے مزار سے گزر ہوگا تو کعبہ فصیح زبان سے کہے گا ''السلام علیک یا محمد'' میں جواب میں کہوں گا ''وعلیک السلام یا بیت اللہ'' تیرے ساتھ میری اُمت نے کیا سلوک کیا؟ گویا وہ تو ظاہر ہے۔ تو ان کے ساتھ کیا سلوک کرے گا؟ کعبہ کہے گا یا رسول اللہ! آپ کی اُمت میں سے جو شخص میری زیارت کے لیے آیا تو اس کے لیے میں کافی ہوں اور اس کی میں شفاعت کروں گا اس کی طرف سے آپ مطمئن رہیں۔ اور جو میری زیارت کو نہ پہنچ سکا تو اس کے لیے آپ کفایت اور شفاعت فرمائیں۔

چوتھی بحث

وَاتَّخِذُوْا کے لفظ میں ہے۔ اور یہ قرأت متواترہ ہے۔ نافع اور ابن عامر خا کی فتح

پڑھتے ہیں۔ اور اس کے معنی ظاہر ہیں کہ جَعَلْنَا پر عطف ہے۔ یعنی ہم نے خانہ کعبہ کو مرجع خلائق اور ان کے لیے جائے امن گردانا اور انہوں نے مقامِ ابراہیم (علیہ السلام) سے نماز کی جگہ حاصل کی تاکہ فرمان کے مطابق بجالائیں۔ اور دوسرے قرأ جو کہ خا کی کسر سے پڑھتے ہیں۔ اور اسے امر کا صیغہ سمجھتے ہیں اس کا عطف جَعَلْنَا کے جملہ پر جو کہ خبریہ ہے انشأ کے خبر پر عطف کے قبیل سے ہوگا۔ اسی لیے جمہور مفسرین کہتے ہیں کہ قلنا کا لفظ واوعطف کے بعد مقدر ہے۔ یعنی وَقُلْنَا اتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰھٖیْمَ (علیہ السلام) تاکہ خبر کا عطف خبر پر ہو۔ ہر تقدیر پر اس آیت کے ظاہری معنی پر عمل نہیں ہے۔ کیونکہ نہ لوگوں نے اس پتھر پر نماز گزاری اور نہ حکم شرع اس بات پر آیا کہ اس خاص پتھر کو نماز کی جگہ بنانا چاہیے۔ اسی اشکال کی وجہ سے امام مجاہد نے کہا ہے کہ مقامِ ابراہیم (علیہ السلام) عرفات' مزدلفہ اور منیٰ ہے۔ اس لیے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان مقامات پر کھڑے ہو کر دعا فرمائی ہے۔ لیکن ان دونوں اقوال میں لفظ مقامِ ابراہیم (علیہ السلام) کو غیر متعارف معنوں پر محمول کرنا ہے۔ کیونکہ اہلِ مکہ اور ان کے علاوہ لوگوں کے عرف میں مقامِ ابراہیم (علیہ السلام) وہی پتھر ہے۔ جس میں قدم مبارک کا نشان ہے۔ اور اس پتھر کو مقامِ ابراہیم (علیہ السلام) ہونے میں ایک ظاہری خصوصیت ہے۔ اس لیے کہ یہ روشن معجزہ اسی پتھر میں ظاہر ہوا ہے۔ نیز لفظ مصلیٰ کو معنی شرعی کے غیر پر محمول کرنا ہے۔ اس لیے کہ صلوٰۃ کو دعا میں استعمال کرنا اہلِ شرع کے نزدیک رائج نہیں ہے۔ اگرچہ لغت میں ہوگا۔ اور الفاظ قرآنیہ کو معانی شرعیہ پر محمول کرنا چاہیے نہ کہ لغوی معنوں پر۔ پس سب سے بہتر وہی توجیہ ہے جو تفسیر میں گزری اور مراد یہ ہے کہ طواف کی نماز تاکیدی مستحب کے طور پر اس پتھر کے قریب اس طرح ادا کرے کہ وہ پتھر امام کی جگہ ہو اور نماز گزارنے والا بمنزلہ مقتدی نماز پڑھے اور مکان کی قریبی جگہ کو وہ مکان کہنا مجاز متعارف ہے۔ جو کہ حقیقت کے قریب ہے۔ پس اس آیت کے ظاہر پر عمل ہوتا ہے۔ اگرچہ امام اعظم کے مذہب پر اس نماز کی اصل واجب ہے۔ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک دو قول ہیں۔ ایک یہ کہ سنت ہے۔ دوسری یہ کہ فرض ہے۔ لیکن اس نماز کو اس طرح ادا کرنا کہ اس پتھر کے پیچھے ہو بالاجماع

مستحب تاکیدی ہے۔ جہاں تک ہو سکے اسے چھوڑنا نہیں چاہیے اگر مخلوق کا ہجوم رکاوٹ پیدا کرے تو مسجد حرام کی کسی دوسری جگہ پر ادا کرنا چاہیے۔

سنن ابن ماجہ اور دیگر محدثین کی کتابوں میں جابر رضی اللہ عنہ کی روایت آئی کہ جب فتح مکہ کے دن حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مقامِ ابراہیم (علیہ السلام) کے پاس رُکے تو آپ کی خدمت میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کی یا رسول اللہ! (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کیا یہ وہی مقامِ ابراہیم (علیہ السلام) ہے۔ جس کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى فرمایا ہاں۔ اور صحیح مسلم اور دوسری صحاح میں موجود ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے تین چکروں میں رمل فرمائی۔ اور چار میں معمول کے مطابق چلے۔ جب فارغ ہوئے تو مقامِ ابراہیم (علیہ السلام) کا قصد فرمایا۔ اور اس کے پیچھے دو رکعات ادا فرمائیں۔ پھر پڑھا وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى نیز تمام صحاح میں موجود ہے کہ اس آیت کا نزول حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی موافقات میں سے ہے۔ اور آپ نے اسی پتھر کے بارے میں عرض کی تھی کہ طواف کی نماز کو اس کے پیچھے مقرر فرمایا جائے نہ کہ پورے حرم یا عرفات وغیرہ کے متعلق۔

اور شوافع کے بعض خوش طبع لوگوں سے سنا گیا ہے کہ کہتے تھے کہ اس آیت پر عمل تمام مخلوق میں سے ہمارے نصیب ہے کہ ہمارا مصلیٰ مقامِ ابراہیم (علیہ السلام) کی طرف ہے۔ اور دوسرے مذاہب کے لوگوں کے مصلے دوسری طرفوں میں ہیں۔ ایک حنفی نے اس خوش طبعی کے جواب میں فرمایا کہ ہمارے قبلہ کی سمت حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قبلہ کی سمت کے موافق ہے۔ کیونکہ یہ بات قطعی طور پر ثابت ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور شام کے تمام شہروں کا قبلہ میزاب رحمت کی سمت ہے۔ اور اسی جگہ مصلائے حنفی ہے لیکن وہ مقام جہاں بالفعل مصلائے حنفی ہے اصل میں مسجد حرام کی حد سے باہر تھا۔ اور قریش کا دارالمشورہ تھا۔ لیکن مسجد حرام کے وسیع ہونے کے بعد اس نے مسجد کا حکم پالیا ہے۔ اس حدیث پاک کی دلیل کے ساتھ جو کہ مسجد نبوی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے متعلق فرمائی ہے۔ اور مسجد حرام کا حکم بھی وہی ہے۔ اور وہ آپ کا ارشادِ گرامی ہے کہ اگر میری یہ مسجد وادی صنعاء تک بنائی گئی

تو میری ہی مسجد ہوگی۔

پانچویں بحث (فضیلت طواف)

یہ ہے کہ طائفین کو عاکفین اور مصلین سے پہلے لانے سے بعض علماء نے استنباط کیا ہے کہ مکہ شریف کے مجاور کو نماز سے طواف بہتر ہے۔ جندی اور ابن النجاری نے جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے روایت کی کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ جس نے بیت اللہ کے سات (۷) چکر لگائے اور مقامِ ابراہیم (علیہ السلام) کے پیچھے دو رکعت ادا کیں اور زمزم کا پانی پیا' اللہ تعالیٰ اس کے سب کے سب گناہ بخش دیتا ہے چاہے کتنے بھی ہوں۔ اور ارزقی نے عمرو بن شعیب سے' انہوں نے اپنے باپ' اپنے دادا سے روایت کی انہوں نے کہا کہ رسولِ کریم علیہ السلام نے فرمایا کہ جب بھی کوئی شخص طواف کے ارادے سے اپنے گھر سے باہر آئے وہ ایسا کہ جیسا کہ دریائے رحمت میں جا رہا ہے۔ اور جب مطاف میں داخل ہوا تو ایسا ہے۔ جیسا کہ اس نے دریائے رحمت میں غوطہ لگایا اور جب طواف شروع کیا تو ہر قدم میں اسے دو چیزیں حاصل ہوتی ہیں جو قدم اُٹھاتا ہے اس کے لیے پانچ صد نیکیاں لکھتے ہیں۔ اور جب قدم رکھتا ہے تو اس سے پانچ سو گناہ دُور کر دیئے جاتے ہیں۔ اور جب طواف سے فارغ ہو کر مقامِ ابراہیم (علیہ السلام) پر پہنچتا ہے۔ اور وہاں دُو رکعت نماز ادا کرتا ہے' وہ یوں ہو جاتا ہے کہ گویا ماں کے شکم سے ابھی ہی پیدا ہوا ہے کہ اس پر کوئی گناہ نہیں رہتا۔ اور ایک فرشتہ اس کے سامنے آ کر کہتا ہے کہ اپنی باقی عمر میں از سرِ نو عمل شروع کر کہ تجھے اپنی گزشتہ عمر سے کوئی کھٹکا نہیں رہا اور اسے اپنے قریبیوں میں سے ستر (۷۰) آدمیوں کی شفاعت کرنے کا منصب عطا فرمایا جاتا ہے۔

چھٹی بحث یہ کہ رکع اور سجود کے درمیان حرفِ عطف کو جو کہ واؤ ہے' کیوں حذف کر دیا گیا حالانکہ اس سے پہلے کلام کی روش بطریق عطف ہے کہ فرمایا لِلطَّآئِفِیْنَ وَالْعَاکِفِیْنَ اس کا جواب ظاہر ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ طواف اور اعتکاف دونوں جدا جدا عمل ہیں۔ ایک دوسرے پر موقوف نہیں ہیں۔ بخلاف رکوع و سجود کے کہ ان دونوں کو ایک ساتھ ملائے بغیر عبارت نہیں بنتی اور ان کا اعتبار نہیں ہوتا اس بنیاد پر کہ ان دونوں فعلوں کا مجموعہ ایک عمل

ہے۔ جو کہ نماز ہے۔ عطف کے حرف کو درمیان میں لانا مناسب نہ تھا۔

ساتویں بحث یہ ہے کہ یہاں ارکانِ نماز میں سے صرف رکوع وسجود پر اکتفاء فرمایا جبکہ سورۃ الحج میں قیام کو بھی ذکر کیا گیا ہے۔ اس اسلوب بیان کے اختلاف کی وجہ کیا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ حقیقت میں جو چیز نماز اور غیر نماز میں تمیز پیدا کرتی ہے' یہی دو فعل ہیں' رکوع وسجود جبکہ قیام نماز کے ساتھ بلکہ عبادت کے ساتھ یہی خاص نہیں ہے۔ اس لئے کہ اکثر اوقات قیام عادت کی بنا پر بھی ہوتا ہے۔ جیسے قعود اور اضطباع۔ بخلاف رکوع وسجود کے کہ بے حد تعظیم کے قصد بلکہ عبادت کے قصد کے بغیر متحقق نہیں ہوتے۔ پس رکوع وسجود کا ذکر گویا نماز کی امتیازی اداؤں کا ذکر ہے۔ ان دونوں کے ذکر کرنے سے نماز کی حقیقت کی طرف اشارہ متحقق ہو گیا۔ اور قیام کے ذکر کی اتنی ضرورت نہ رہی۔ ہاں چونکہ سورۃ الحج میں مناسکِ حج کا بیان کرنا منظور ہے' کلام کو جامع کرنا اور ارکان کو پورا بیان کرنا بھی اس جگہ روش خطاب کے مناسب ہے۔ نیز کہا جاسکتا ہے کہ سورۃ حج میں خطاب مشرکین مکہ سے ہے۔ جو کہ نماز سے بالکل آشنا نہ تھے۔ اِنَّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا وَیَصُدُّوۡنَ عَنۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ وَالۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ کی دلیل سے تو وہاں قیام' رکوع اور سجود سب کا ذکر موزوں ہوا۔ اس لیے کہ وہ نہ تو خدا تعالیٰ کی رضا کے لیے قیام کرتے تھے۔ اور نہ رکوع وسجود اور یہاں خطاب اہلِ کتاب یعنی یہود ونصاریٰ سے ہے۔ اور وہ نماز کو جانتے تھے۔ اور قیام کو کسی کمی بیشی کے بغیر ارکان نماز میں سے ادا کرتے تھے جن میں خلل کرتے تھے یہی دو رکن تھے۔ کیونکہ رکوع بالکل نہیں کرتے تھے۔ اور سجدہ شرعی طریقے پر نہیں کرتے تھے تو ان کے لیے قیام کا ذکر بالکل درکار نہ تھا۔

آٹھویں بحث یہ ہے کہ یہاں عاکفین کو بھی طائفین کے ساتھ ذکر فرمایا جبکہ سورۃ حج میں عاکفین کو چھوڑ کر طائفین اور نمازیوں پر اکتفاء فرمایا اس میں اختلاف کی وجہ کیا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ سورۃ حج میں اس سے پہلے یہ لفظ بالکل قریب ہی مسجد حرام کے بارے میں گزرا ہے کہ فرمایا جَعَلۡنٰہُ لِلنَّاسِ سَوَآءَ نِ الۡعَاکِفُ فِیۡہِ وَالۡبَادِ یہاں عاکف کا ذکر تکرار تھا۔ بخلاف طائفین اور نمازیوں کے کہ یہ دونوں بادی ہیں' نیز سورۃ حج میں شروع

سے پوری مسجد حرام کا ذکر ہے۔ اور اعتکاف کا تعلق پوری مسجد کے ساتھ ہے۔ عاکفین کو مسجد کے ذکر کے متصل لانا مناسب تھا۔ اور طواف اور نماز کو جو کہ گھومنے اور اس طرف منہ کرنے کی وجہ سے خانہ کعبہ سے متعلق ہیں' خانہ کعبہ کے متصل لانا زیادہ موزوں ہوا۔ اور اس سورۃ میں پہلے مسجد حرام کا ذکر نہیں گزرا ہے۔ بلکہ خانہ کعبہ کا ذکر ہے کہ فرمایا وَاِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ تو عاکفین کا ذکر جو کہ اس گھر کے ساتھ ایک قسم کا تعلق رکھتے ہیں اگر چہ وہ تعلق بعید ہے' ضروری ہوا۔

نویں بحث یہ ہے کہ محققین نے کہا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کا مقام' مقامِ قلب تھا۔ اور لطیفہ قلب کے احکام ان پر غالب اور بیت المعمور شخص اکبر میں قلب کی طرح ہے۔ اسی لیے روایات کے مطابق چوتھے آسمان میں جگہ رکھتا ہے۔ جو کہ عالم کبیر کا وسط ہے تو حضرت آدم علیہ السلام کو اس گھر کے طواف کا حکم دینا اور ان کے لیے بنیاد تعمیر کرنا لطیفۂ قلب کی تکمیل پر ان کے گھومنے کی صورت تھی جس نے اس رنگ میں ظہور کیا اور حضرت ادریس علیہ السلام کے عہد میں لطیفۂ عقل ظاہر ہوا۔ اور اس کے احکام غالب ہو گئے۔ اور حضرت نوح علیہ السلام کے عہد میں لطیفۂ روح کا غلبہ ہوا لہٰذا بیت المعمور کا طواف اور اس گھر کے مناسک مخفی ہو گئے جب حضرت ابراہیم علیہ السلام پھر اس لطیفہ کی اصلاح پر متوجہ ہوئے۔ اور آپ نے اس کے احکام کو غالب کر دیا۔ اور آپ کے عہد میں احکامِ حج اور مناسک کی ادائیگی جو کہ سب کے سب جوش محبت' شوق اور دوسری صفاتِ قلبیہ کا نشان دیتے ہیں' پورے اثر کے ساتھ جلوہ گر ہوئے۔

اور رکن اسود مصافحہ بیعت کے وقت دست شیخ کے مشابہ ہے۔ اور مقامِ ابراہیم (علیہ السلام) مرید کے حق میں اتباع شیخ کی صورت ہے۔ جبکہ وہ منصبِ ابراہیمی کا وارث ہو اور رکن اسود کی سیاہی اس بات کی دلیل ہے کہ شیخ میں احکام بشریت دیکھ کر نفرت نہ کرے۔ اور بے اعتقاد نہ ہو۔ بلکہ اس کے ہاتھ کو خدا کا ہاتھ جانے اور طریقت کا دستگیر سمجھے۔

اور جب بنی اسرائیل محبت و شوق کی راہ سے بے خبر تھے۔ سوائے طمع اور خوف کے کوئی دوسری راہ نہیں جانتے تھے۔ افعالِ حج کے حسن کو نہیں سمجھتے تھے۔ اور وہ ان افعال کی حقیقت

دریافت نہ کر سکے۔ جس طرح علمائے ظاہر بیں وجد و شوق کی کیفیت سے بے خبر ہوتے ہیں۔ اور اس سے انکار کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں ان امور سے آگاہ فرمایا۔ اور ارشاد فرمایا کہ یہ امور ملتِ ابراہیمی کی پشت میں داخل تھے نہ کہ مشرکین کی بدعات کے قبیل سے اگر یہ رسول علیہ السلام اور ان کی اُمت حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اس عظیم سنت کو زندہ کریں تو اعتراض کی کون سی جگہ ہے۔ اور انکار کا کیا مقام؟ اور اگر اس گھر کی تعظیم' اس گھر کا طواف' اس کے نزدیک اعتکاف کرنا اور اس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنا ملتِ ابراہیمی کی اصل میں داخل نہ تھا تو حضرت ابراہیم علیہ السلام اس گھر کو بنانے کے بعد اس گھر کی بقاء اور اس کی حرمت کی دعائیں بار بار کیوں مانگتے تھے۔

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ یعنی اور اس وقت کو یاد کرو جبکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا جب آپ کو خانہ کعبہ بنانے کا حکم ہوا۔ اور آپ نے اس پر پختہ ارادہ کیا۔ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا اے میرے پروردگار! بنا اس لق و دق صحرا کو جہاں چند گھروں کے سوا کوئی سکونت اختیار نہیں کرتا بَلَدًا آباد شہر تاکہ اس گھر کو بنانے کا فائدہ حاصل ہو۔ کیونکہ اگر اس گھر کے مضافات میں ایک شہر آباد نہیں ہوگا تو اس گھر کا طواف کون کرے گا' اعتکاف کون کرے گا۔ اور نماز کون ادا کرے گا؟

مگر ایسا شہر جو کہ اٰمِنًا امن والا ہو۔ کیونکہ تکالیف و آفات شہر کی ویرانی کا موجب ہوتی ہے۔ نیز بدامنی کی صورت میں حجاج کے قافلے دُور دراز سے نہیں پہنچ سکتے تو مثابہ للناس کا معنی کیسے متحقق ہوگا۔ نیز یہ جنگل نہ تو گھاس اُگنے کے قابل ہے۔ تاکہ مویشی وہاں زندگی گزار سکیں۔ اور نہ ہی خشکی اور پتھریلے پن کی وجہ سے قابلِ زراعت ہے۔ تاکہ لوگ وہاں معاش کا سلسلہ جاری رکھ سکیں۔ تو یہاں وافر امن چاہیے تاکہ تاجر ہر طرف سے زرعی اجناس' غلے اور سامان وغیرہ لے کر آئیں۔ اور یہاں رہنے والوں کے لیے معیشت کا کام فراخ ہو۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا کو اس طرح قبول فرمایا کہ غریبوں کو ستانے والا کوئی ظالم اس جگہ دستیاب نہ ہوا اور اگر ظالموں میں سے کسی نے اس مکان کا قصد کیا تو فی الفور ہلاک ہو گیا جیسا کہ اصحابِ فیل کے واقعہ میں رونما ہوا۔

اور اگر کوئی کہے کہ حجاج ثقفی جو کہ ظلم و ستم اور ناحق خون کرنے میں ضرب المثل ہے اس شہر پر اس وقت کس طرح قابض ہو گیا جب اس نے حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کا محاصرہ کیا اور انہیں قتل کیا؟ ہم کہتے ہیں کہ حجاج کا مقصد اس شہر کو خراب کرنا اور اس میں رہنے والوں کو ایذاء دینا نہ تھا۔ اسی لیے اس نے اس شہر کے لوگوں سے تعرض نہ کیا۔ اور اس کی طرف سے جو ظلم و ستم واقع ہوا' حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما اور ان کے رفقاء پر واقع ہوا۔ اور اس سانحہ میں کعبہ شریف کی عمارت کو جو نقصان پہنچا اس نے اس کی مرمت اور درستی میں کوشش کی۔ اور کعبۃ اللہ کے غلاف اور زیب و زینت کو پہلے کی نسبت اور زیادہ کیا۔ حاصلِ کلام یہ کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے رسم حج کی بقاء کے لیے اس شہر کی آبادی چاہی اور آبادی کے لیے امن۔ کیونکہ بے امنی کی صورت میں شہر ویرانی لازم ہے۔ نیز آبادی کی بقاء کے لیے ایک اور دعا فرمائی۔

وَارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرَاتِ۔ اور اس شہر والوں کو مختلف ریاستوں کے رنگا رنگ پھلوں کی روزی عطا فرما تا کہ وہ پھل کھانے کے شوق میں اس خشک وادی سے پریشان ہو کر پھل دار ریاستوں کا رُخ نہ کریں۔ اور آپ کی اس دعا کو اللہ تعالیٰ نے اس طرح قبول فرمایا کہ حضرت جبریل علیہ السلام فلسطین اور شام کی سرزمین سے شہر طائف کو اپنے پروں پر رکھ کر لائے۔ اور پہلے اسے خانہ کعبہ کے اردگرد سات مرتبہ طواف کرایا۔ اور اسی لیے اس کا نام طائف ہوا اس کے بعد مکہ شریف سے تین دن کی راہ کے فاصلہ پر پہاڑ کے اوپر رکھ دیا۔ اور اس کی آب و ہوا کو اس کی اصل صورت پر باقی رکھا گیا۔ اور یہ واقعہ قدرتِ الٰہی کے عجائب میں سے ہے۔ اس لیے کہ موسم گرما میں گرم لُو چلنے اور پتھروں کے گرم ہونے کی وجہ سے مکہ معظمہ میں ایک شدید حالت محسوس ہوتی ہے۔ اور جب وہاں سے کوہِ طائف پر آتے ہیں تو وہاں کی ہوا بالکل سرد ملک کی ہوا ہوتی ہے۔ اور طائف کا بغیر دانے کے منقی اور سرد ملکوں کے پھل وافر مقدار میں ہوتے ہیں۔ نیز اس دعا کی قبولیت کے لیے ایک اور طریقہ یہ ہوا کہ اس شہر اور اس کے رہنے والوں کے ساتھ لوگوں کے دلوں میں بہت محبت پیدا کر دی گئی حتیٰ کہ ہر طرف سے زرعی اجناس اور غلہ' پھل اور میوے اُٹھا کر لاتے ہیں۔ اور پہنچاتے ہیں۔ مصر

ہند، سندھ، فارس اور بصرہ سے بھرے ہوئے جہاز جاتے ہیں۔ اور خالی واپس آتے ہیں اسی لیے اس شہر میں ہر ملک کی نفیس چیزیں پائی جاتی ہیں۔

اور یہ دعا مانگتے ہوئے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو یاد آیا کہ میں نے اپنی اولاد کے لیے امامت طلب کی تھی۔ اور حق تعالیٰ نے فرمایا تھا کہ آپ کی اولاد میں سے ظالموں کو امامت نہیں ملے گی تو رزق طلب کرنے میں بھی لازماً مجھے اسی کی موافقت کرتے ہوئے تخصیص اور تقلید کرنا چاہیے۔ اسی بنیاد پر آپ نے کہا کہ میں رزق کی طلب میں خاص کرتا ہوں۔

مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ اسے جو کہ اس شہر میں سے ایمان لایا ہے خدا تعالیٰ اور آخرت کے دن پر۔ تاکہ ان کا غیر معاش نہ ہونے کی وجہ سے اس شہر میں سکونت اختیار نہ کرے۔ اور کوئی کافر یہاں اقامت پذیر نہ ہو سکے۔ تاکہ یہ شہر کفر اور بت پرستی کی آلائش سے خالی ہو۔

قال حق تعالیٰ نے فرمایا کہ روزی کو امامت پر قیاس نہ کیجئے کیونکہ امامت، نبوت کی نیابت ہے۔ پس چاہیے کہ صاحب امامت ظالم اور ستم گر نہ ہو۔ اور روزی پرورشِ الٰہی سے ہے۔ اور وہ رب العالمین ہے۔ مومن و کافر، ظالم و عادل اور صالح و فاسق کو پرورش کرتا ہے۔ ہاں باایمان لوگوں کا رزق دنیا میں آخرت کے ساتھ ملا ہوا ہے تو گویا اپنی ولادت کی ابتدا سے ابدالآباد تک انہیں رزق ملتا رہے گا۔

وَمَنْ كَفَرَ اور جو کافر ہوا تو اسے ہم رزق دنیوی کے حصول میں مومن سے امتیاز نہیں دیتے بلکہ اس کے امتیاز کی وجہ یہ ہے کہ اس کا رزق صرف اس کی عمر تک ہے۔ فَاُمَتِّعُهٗ قَلِيْلًا تو ہم اسے تھوڑے سے مال کے ساتھ نفع دیتے ہیں۔ اگرچہ اسے بہت سا رزق اور بے شمار نعمت دے دی جائے۔ لیکن وہ سب کچھ زندگی کی مدت تک ہے۔ ثُمَّ اَضْطَرُّهٗ پھر میں اسے بے چارہ کر کے لے جاؤں گا۔ اِلٰى عَذَابِ النَّارِ آگ کے عذاب کی طرف۔ جس کی ابتدا بدن سے روح کے جدا ہونے سے شروع ہوتی ہے۔ اور اس کی انتہاء ابد ہے۔ جس کی کوئی حد نہیں ہے۔ اور اس وجہ سے کہ وہ خانہ کعبہ کا مجاور تھا۔ اور اس

شہر میں رہتا تھا اس کے لئے عذاب میں کوئی تخصیص حاصل نہ ہوگی۔ بلکہ دوسروں کی نسبت اس کا عذاب کئی گنا ہوگا۔ اس لیے کہ اس نے میرے گھر کے نزدیک لادینیت کو اختیار کیا۔

وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ اور دوزخ بُری جائے بازگشت ہے۔ اس لیے کہ دنیا میں اگر ایک مکان دوسرے مکان کی نسبت ایک جہت سے بُرا ہوتا ہے تو دوسری جہت سے اچھا بھی ہوتا ہے۔ اور وہ مکان ہر جہت سے بُرا ہے' کسی وجہ سے بھی اس میں خوبی نہیں۔

چند فوائد

یہاں چند فائدے باقی رہ گئے جن پر اطلاع دینا ضروری ہے۔ پہلا فائدہ یہ ہے کہ ان واقعات کے بیان میں زمانے کی ترتیب کی رعایت نہیں کی گئی ہے۔ اس لیے کہ زمانے کے اعتبار سے پہلے کعبۃ اللہ کی تعمیر ہے۔ اس کے بعد یہ دعا اس کے بعد خانہ کعبہ کو مرجع خلائق بنانا تو اس میں کیا نکتہ ہے کہ اس ترتیب کے برعکس بیان کیا گیا؟ اس کا جواب یہ ہے، کہ پہلے اجمالی طور پر وَاِذِ ابْتَلٰی اِبْرٰهٖمَ میں ان واقعات کا اشارہ فرمایا گیا۔ اس کے بعد اس کی تفصیل فرمائی گئی۔ پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی امامت کا ذکر لایا گیا اس لیے کہ یہ منصب عطا کرنا از روئے شرافت تمام نعمتوں پر مقدم ہے۔ اس کے بعد خانہ کعبہ کی مرجعیت اور اس شہر کے پُر امن ہونے کا ذکر لایا گیا اس لئے کہ کعبۃ اللہ کی تعمیر کا یہی مقصد تھا۔ اور مقاصد کو وسائل پر تقدم حاصل ہے۔ اس کے بعد بیان فرمایا کہ اس شہر کا پُر امن ہونا صرف حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا سے ہوا۔ اور وہ دعا یقیناً قبول ہوئی۔ پس دوسری دعا جو یہ گھر بناتے وقت کی تھی' بھی مقبول ہوگی۔ اور دوسری دعا کے ضمن میں حضرت خاتم المرسلین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت شریفہ کی دعا بھی تھی۔ پس اس ترتیب کا مقصد اچھی طرح واضح ہوا۔

دوسرا فائدہ یہ ہے کہ اس سورۃ میں بَلَدًا اٰمِنًا واقع ہوا جبکہ سورۂ ابراہیم علٰی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام میں ھٰذا البلدا آمِنًا فرمایا۔ ان دونوں عبارتوں کا فرق کس لیے ہے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ دعا جو کہ اس سورۃ میں ہے اس سے پہلے تھی کہ وہ مکان آباد ہو کر شہر کی صورت حاصل کرے تو گویا یوں عرض کیا کہ بار خدایا! اس گھاس سے خالی صحرا کو پہلے شہر بنا

اور پھر با امن شہر اور وہ دعا جو کہ سورۂ ابراہیم میں ہے' شہر کی آبادی کے بعد تھی تو گویا یوں عرض کیا کہ بارِ خدایا! اس آباد شہر کو حوادث سے محفوظ رکھ۔

دین کی خاطر دنیا طلب کرنا کمال کے منافی نہیں

تیسرا فائدہ یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اس دعا سے معلوم ہوا کہ بعض اوقات کاملین بھی دنیوی امور کو جیسے امن' روزی' پھل کھلانے اور اس قسم کے امور خداتعالیٰ سے چاہتے ہیں۔ اس لیے کہ یہ چیزیں فروغ دین اور رونق شریعت میں فراوانی کا باعث ہوتی ہیں۔ کیونکہ ظاہر ہے کہ امن اور دل کا روزی کے بارے میں فراغت پانا اطاعات میں دلجمعی کے باعث ہوتا ہے۔ نیز وہ شہر جو کہ خوف سے پاک ہو اور وہاں لوگوں کی روزی وسیع ہو تو وہاں مخلوق کا اجتماع اور لوگوں کی آمد و رفت زیادہ ہوتی ہے۔ تو یہ طلب حقیقت میں دنیا کی طلب نہیں ہے۔ بلکہ دین کی طلب ہے۔ اور دین کی خاطر دنیا طلب کرنا کمال کے منافی نہیں ہے۔ جیسا کہ حدیث شریف میں وارد ہے کہ نعم المال الصالح للرجل آدمی کے لیے حلال مال بہت اچھا ہے۔

چوتھا فائدہ یہ ہے کہ پہلے تو جعلنا اور عهدنا میں متکلم مع الغیر کی ضمیریں استعمال ہو کر آئیں۔ یہاں امتعہ واضطرہ میں صیغۂ واحد متکلم کیوں استعمال فرمایا گیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اسلوب کی اس تبدیلی میں ایک دقیق نکتہ اور ایک باریک اشارہ ہے۔ گویا یوں فرمایا گیا ہے کہ کافر اور فاجر کو روزی دینے اور اس کی موت کے بعد اسے عذاب دینے میں اگرچہ میرے نیک بندے فرشتے اور انبیاء علیہم السلام میرے رفیق نہ ہوں اور اس کے روادار نہ ہوں۔ میں تنہا یہ دونوں کام کرتا ہوں اور اس کا راز یہ ہے مخلوق اگرچہ کمال کے اعلیٰ مرتبہ کو پہنچی ہوئی ہو' حکمت کی تمام وجوہ کے ملاحظہ سے قاصر ہے۔ اور جاذب قوتوں کے حکم میں مجبور ہے۔ اگر کسی کو سرکشی اور عناد کے مقام پر دیکھتا ہے تو چاہتا ہے کہ وہ فی الفور ہلاک ہو جائے۔ اور سانس لینے کی مہلت نہ پائے۔ اور اگر کسی کو سخت تکلیف اور عذاب میں گرفتار دیکھتا ہے تو رقت کا مظاہر کرتا ہے۔ اور اس کے سابقہ جرائم سے غافل ہو جاتا ہے۔ اور اس کی سفارش کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ یہ صرف حکیم مطلق کی شان ہے۔ اور بس کہ وجوہ

حکمت میں سے ہر وجہ کی وقت پر رعایت فرماتا ہے۔

وَاِذْ يَرْفَعُ اِبْرٰهٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ اور اس وقت کو یاد کرو جبکہ ابراہیم (علیہ السلام) اس گھر کی دیواریں اونچی کر رہے تھے۔ اپنے ہاتھ سے اور اس کام کو کسی نقاش اور معمار کے حوالے نہیں فرماتے تھے۔ تاکہ اس اجر و ثواب میں کوئی دوسرا آپ کا شریک نہ ہو۔

وَاِسْمٰعِيْلُ اور اسماعیل (علیہ السلام) بھی اسی طرح حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کے ساتھ ان دیواروں کو بلند کرنے میں مشغول تھے۔ حدیث شریف میں آیا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام راج گیری کی جگہ خود کعبہ معظمہ کی تعمیر میں مشغول تھے۔ اور اسماعیل علیہ السلام مزدور کی جگہ کام کرتے تھے کہ گارا بناتے تھے۔ اور پتھر اُٹھا کر لاتے تھے۔ اور یہ دونوں بزرگ اس وقت یہ دعا کر رہے تھے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اے ہمارے پروردگار! اپنے فضل سے اس محنت اور اس خدمت کو ہماری طرف سے قبول فرما۔

اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ تحقیق تو ہی ہماری دعا کو سننے والا ہے اَلْعَلِيْمُ ہماری نیت کو جاننے والا۔

قبول اور تقبل میں فرق اور افطاری کی دعا

قبول اور تقبل میں فرق یہ ہے کہ اگر کوئی چیز قبول کرنے کے لائق ہو تو وہاں کہتے ہیں کہ اس چیز کو قبول کیجئے۔ اور اگر وہ چیز ناقص ہو اور اس لائق نہ ہو کہ اسے کوئی قبول کرے تو کہتے ہیں کہ اس کا تقبل کیجئے۔ اس بنیاد پر کہ تقبل کا معنی تکلفاً قبول کرنا ہے۔ اور تکلفاً سے قبول کیا جاتا ہے جو قبولیت کے لائق نہ ہو۔ پس اس لفظ میں انتہائی کسر نفسی' عاجزی اور اپنے عمل کو حقیر جاننا ہے۔ گویا وہ اس لائق نہیں ہے کہ مقبول ہو مگر جبکہ تو از رہ عنایت اپنے فضل سے اسے قبول فرمائے۔ اور اس قسم کی کسر نفسی اور تواضع حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بھی منقول ہے۔

اور دار قطنی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت سے لائے کہ حضور صلی اللہ علیہ

وآلہ وسلم جب روزہ افطار فرماتے تھے تو یوں کہتے اللهم لك صمنا وعلى رزقك افطرنا فتقبل منا انك انت السميع العليم

چند فوائد

یہاں چند فوائد باقی رہ گئے۔

حضرت آدم علیہ السلام کی تعمیر کعبہ

پہلا فائدہ یہ ہے کہ يَرْفَعُ اِبْرَاهِيْمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ کے لفظ سے اکثر مؤرخین نے یوں مسئلہ نکالا ہے کہ خانہ کعبہ کی بنیاد حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانے سے پہلے موجود تھی۔ اور حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اسی بنیاد پر دیواریں بلند کیں۔ جیسا کہ بیہقی نے شعب الایمان میں اور ارزقی نے وہب بن منبہ سے روایت کی ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام زمین پر آئے تو تنہائی کی وجہ سے آپ کو بہت وحشت سی محسوس ہوئی۔ نیز زمین میں کوئی مکان اور چھت نظر نہیں آتی تھی۔ عرض کی بار خدایا! میں زمین میں اکیلا اترا ہوں۔ کوئی ایسا نہیں جو میرے ساتھ تیری عبادت میں شریک ہو۔ نیز میں زمین میں کوئی چھت والا مکان نہیں دیکھتا۔ حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ عنقریب تیری اولاد سے بے شمار لوگ پیدا ہوں گے۔ اور میری تسبیح و تقدیس میں مشغول ہوں گے۔ اور مکانات بنائیں گے۔ لیکن چاہیے کہ پہلے میرے نام سے مکان بنائیں۔ اور اسے عرش اور بیت المعمور کی طرح قبلہ اور طواف گاہ بنائیں۔ اور اس کے بعد اپنے لیے اور اپنی اولاد کے لیے مکانات بنائیں۔ حضرت آدم علیہ السلام نے عرض کی کہ بار خدایا! وہ گھر کہاں بناؤں؟ فرمایا وہاں جہاں ہم نے آپ کے بدن کی خاک کا گارا بنایا تھا۔ اور چالیس (۴۰) سال تک وہ خاک وہیں پڑی رہی اور تمام زمین کو ہم نے وہیں سے پھیلایا اور فراخ کیا۔ حضرت آدم علیہ السلام نے عرض کی کہ مجھے اس جگہ کا نشان دیا جائے۔ حضرت جبریل علیہ السلام کو حکم ہوا کہ حضرت آدم علیہ السلام کے ہمراہ جائیں۔ اور کعبہ معظمہ کے مکان کا نشان دیں اور وہ گھر بنانے میں آپ کی مدد کریں۔ حضرت جبریل علیہ السلام' حضرت آدم علیہ السلام کے ہمراہ

آئے اور اس جگہ کا نشان دیا۔ اور فرشتوں کو حکم دیا کہ زمین کے نیچے سے اس گھر کی بنیاد کو پُر کر کے لائیں جب وہ بنیاد سطح زمین تک پہنچی تو بیت المعمور کو جو کہ آسمان میں ملائکہ کی طواف گاہ تھی' اُتار کر اس بنیاد پر رکھ دیا گیا اور حضرت آدم علیہ السلام کو حکم ہوا کہ اس کے ارد گرد طواف کریں۔ اور اس کی طرف منہ کر کے نماز ادا کریں۔ اور خانہ کعبہ کی عمارت طوفان کے دنوں تک اسی طرح تھی۔ طوفان کے وقت بیت المعمور اُٹھالیا گیا اور کعبۃ اللہ کی سیدھ میں ساتویں آسمان پر رکھا گیا۔ اور اب فرشتے اس کے طواف اور زیارت میں مشغول ہیں۔ جیسا کہ حدیث معراج میں اس کا ذکر آیا ہے' اور طوفان کے بعد مقامِ کعبہ میں ایک سرخ رنگ کا بہت بڑا ٹیلا زمین سے اونچا نمودار ہوا۔ اور حضرت آدم علیہ السلام کی وہ بنیاد زیر زمین برقرار رہی لیکن لوگ اپنی حاجات طلب کرنے اور اپنی مہموں میں دعا مانگنے کے لیے اسی جگہ کا قصد کرتے تھے۔ اور نذریں' ہدیئے لاتے تھے۔ یہاں تک کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو خانہ کعبہ بنانے کا حکم دیا گیا۔ آپ نے انہیں بنیادوں پر دیواریں کھڑی کیں اور اس جگہ کے تعین کے لیے حضرت جبریل علیہ السلام نے ایک بادل کو لا کر اس کے سایہ کو اس جگہ کو معین فرمایا۔

تعمیر کعبہ اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کی ولادت

احادیث میں جو کچھ آیا ہے اس کے مطابق ابراہیم علیہ السلام کے کعبہ معظمہ بنانے کا واقعہ یہ ہے کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے آتشِ نمرود سے نجات پائی اور قوم اور اپنے چچا کے ایمان سے مایوس ہو گئے تو ترکِ وطن کر کے حران کی طرف تشریف لے گئے جہاں اپنے ایک چچا ہاران نامی کے پاس سکونت پذیر ہوئے اس نے اپنی دختر سارہ کا آپ کے ساتھ عقد نکاح کر دیا۔ اور آپ کو نرمی اور دلجوئی کے ساتھ اپنے پاس بحفاظت رکھا اور اس کا مقصد یہ تھا کہ آپ کو دنیوی مال واسباب اور عورت اور اولاد کی طمع کے ساتھ آپ کے دین سے پھیر لے جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے عقیدۂ توحید پر استقامت فرمائی اور حضرت سارہ رضی اللہ عنہا بھی آپ کے ساتھ متفق ہو گئیں اور آپ نے بت پرستوں کے دین کو بُرا کہنا شروع کر دیا تو ہاران سخت خفا ہوا۔ اور اس نے دونوں کو مالی اسباب اور زیب و

زینت کے لباس سے خالی کر کے نکال دیا۔ آپ نے حضرت سارہ رضی اللہ عنہا کو ساتھ لے لیا۔ اور حضرت سارہ رضی اللہ عنہا نے آپ کے ساتھ عہد کیا کہ میں آپ کی نافرمانی ہرگز نہیں کروں گی بشرطیکہ آپ بھی میری بات مانیں گے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس بارے میں ان کے ساتھ عہد فرمایا۔ اور وہاں سے نکل آئے اور حضرت لوط علیہ السلام کے سوا جو کہ رشتے میں دونوں کے قریبی تھے۔ اور کوئی ہمراہ نہ ہوا۔ پہلے مصر کا قصد فرمایا اتفاقاً وہاں ایک جابر سرکش اور کافر بادشاہ مسلط تھا۔ اور اس کی ناپاک عادت یہ تھی کہ ہر خوبصورت عورت کو اس کے مالک سے چھین لیتا تھا۔ اور اگر وہ اس کا شوہر ہوتا تو اسے قتل کر دیتا تھا۔ اور اگر بھائی یا اس کا کوئی اور وارث ہوتا تو قتل نہ کرتا جب حضرت ابراہیم علیہ السلام اس شہر میں داخل ہوئے۔ اور آپ نے یہ ماجرا سنا تو خوف زدہ ہوئے کیونکہ حضرت سارہ رضی اللہ عنہا حسن و جمال میں اس وقت کی خواتین میں سے ممتاز تھیں۔ چنانچہ حدیث پاک میں آیا ہے کہ وہ حسن جو کہ حضرت آدم علیہ السلام کو دیا گیا تھا اس کا ایک نصف حضرت یوسف علیہ السلام کو عطا فرمایا گیا تھا۔ اور چھٹا حصہ حضرت سارہ رضی اللہ عنہا کو اور باقی تمام لوگوں میں تقسیم ہوا۔

قصہ مختصر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حضرت سارہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا کہ یہاں سے بادشاہ کی عادت ایسی ہے اگر اس کے پیادے تمہیں لینے کے لیے آئیں تو یہ ظاہر نہ کرنا کہ میں تمہارا شوہر ہوں۔ بلکہ یوں کہنا کہ میں تمہارا بھائی ہوں۔ اس لیے کہ میں دین و اسلام کے اعتبار سے تمہارا بھائی ہوتا ہوں اور حق تعالیٰ تمہیں اس ظالم کے ہاتھوں سے محفوظ رکھے گا اور میری عزت کو ضائع نہیں ہونے دے گا۔ اچانک اس بادشاہ کے کارندوں نے حضرت سارہ رضی اللہ عنہا کی حسن و جمال کا سُن کر اس کے سامنے بیان کیا کہ اس شہر میں ایک خاتون آئی ہے۔ جو کہ حُسن میں بے مثل ہے اس ظالم نے کہا کہ اسے لاؤ اور اگر اس کا شوہر ہے تو اسے قتل کر دو اس کے پیادے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس گئے۔ اور انہوں نے پوچھا کہ جو عورت آپ کے ساتھ ہے اس کا آپ سے کیا تعلق ہے؟ آپ نے فرمایا میری دینی بہن ہے۔ انہوں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو چھوڑ دیا۔ اور حضرت

سارہ رضی اللہ عنہا کو زبردستی لے گئے جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہ صورتِ حال دیکھی تو نماز کے لیے کھڑے ہو گئے۔ اور دعا میں مشغول ہو گئے۔ ادھر جب حضرت سارہ رضی اللہ عنہا اس ظالم کے پاس پہنچیں' دیکھتے ہی حسن و جمال کا فریفتہ ہو گیا۔ اور اس نے بے ادبی کرنے کا ارادہ کیا۔ حضرت سارہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ پہلے مجھے مہلت دے کیونکہ ابھی مجھ پر راستہ کی دُھول پڑی ہوئی ہے' میں ہاتھ منہ دھولوں اور عبادت کرلوں از اں بعد جو چاہو کرنا اس ظالم نے حکم دیا کہ لوٹا اور طشتری لاؤ اور اسی جگہ ہاتھ منہ دُھلاؤ۔ حضرت سارہ رضی اللہ عنہا نے وضو فرمایا۔ اور نماز کے لیے کھڑی ہو گئیں اور نماز کو لمبا کر دیا۔ اور دعا میں مشغول ہو گئیں۔ اس ظالم نے جب دیکھا کہ آپ نماز سے فارغ نہیں ہوتیں تو چاہا کہ عین حالتِ نماز میں آپ پر دست درازی کرے۔ اور مکان کو خالی کر لیا جیسے ہی اس نے آپ تک ہاتھ لے جانے کا ارادہ کیا اس کے ہاتھ بند ہو گئے۔ اور مرگی کا دورہ پڑنے سے زمین پر گر پڑا اس کا سانس رُک گیا اور منہ سے جھاگ بہنے لگا جب حضرت سارہ رضی اللہ عنہا نے دیکھا کہ اس ظالم کی یہ حالت ہو گئی ہے' ڈریں کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ اس کی سانس کی آواز سے اس کے چوکیدار مطلع ہو کر آ ئیں۔ اور مجھے اس کے قتل کی تہمت لگا ئیں اور قتل کر دیں۔ بارگاہِ خداوندی میں عرض کی کہ بار خدایا! اس ظالم کو چھوڑ دے کہ اسے عبرت حاصل ہوگئی ہے جب اسے افاقہ ہوا تو پھر وہی ارادہ کیا پھر اسی قسم کا واقعہ ہوا پھر ارادہ کیا پھر وہی حشر ہوا۔ تیسری دفعہ اس نے کہا کہ اس عورت کو لے جاؤ کہ یہ آدمی نہیں جنیہ ہے یا جادوگر ہے۔ اور میرے شہر سے باہر نکال دو اور اسی قسم کی ایک اور عورت میرے پاس ہے۔ جسے میں نے قبطیوں سے چھینا تھا۔ اور اس پر بھی مجھے تصرف حاصل نہ ہوا' وہ عورت بھی اس عورت کے حوالے کر دو۔ حضرت سارہ' حضرت ہاجرہ (رضی اللہ عنہ) کو لے کر آ ئیں۔ اور حضرت ابراہیم علیہ السلام اس وقت نماز میں معروف تھے۔ جب حضرت سارہ (رضی اللہ عنہا) کو دیکھا' سلام پھیر کر پوچھا کہ کیا حال ہے؟ حضرت سارہ رضی اللہ عنہا نے کہا کہ خیر ہے' اللہ تعالیٰ نے ظالم کے ہاتھ کو چھوٹا کر دیا۔ اور ہمیں ایک خادمہ دی ہے۔ جس کا نام ہاجرہ ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام خوش ہوئے۔ اور وہاں سے بھی کوچ کر کے فلسطین کی

سرزمین میں جو کہ شام کے وسط میں ہے۔ اقامت اختیار فرمائی۔ وہاں کے لوگوں نے آپ کی تشریف آوری کو غنیمت جان کر بہت سی زمینیں بطورِ نذر پیش کیں جن کی پیداوار انہیں ملتی تھی۔ اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اس زمین میں بہت فراخی ملی۔ آپ نے بہت سے غلام خریدے اور بہت سی زمینیں آباد فرمائیں اور بے شمار مویشی پالے اور مہمان نوازی اور لنگر خانہ جاری فرمایا۔ اور حضرت لوط علیہ السلام کو رسالت کے طور پر سدوم اور اس ضلع کے دوسرے شہروں کی طرف بھیجا۔

اور اسی اثنا میں حضرت سارہ کو اولاد کے اشتیاق نے غلبہ کیا۔ اور آپ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے کہا کہ میں ہاجرہ کو آپ کی خدمت میں بطور ہبہ پیش کرتی ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ اس کے بطن سے کوئی بیٹا پیدا ہو تاکہ ہم اس سے دل بہلائیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا کہ تمہارے مزاج میں غیرت اور رشک غالب ہے ایسا نہ کہ جب اس خادمہ سے کوئی بیٹا پیدا ہو تو تمہیں گراں گزرے اور تم اس پر زیادتی کرو۔ حضرت سارہ (رضی اللہ عنہا) نے اس مدعا پر اصرار کیا حتیٰ کہ حضرت ہاجرہ رضی اللہ عنہا کے بطن مبارک سے حضرت اسماعیل علیہ السلام پیدا ہوئے۔ اور حضرت سارہ کی گود میں پرورش پاتے تھے۔ اور حضرت ہاجرہ (رضی اللہ عنہا) آپ کو دودھ دیتی تھیں لیکن حضرت ابراہیم علیہ السلام حضرت سارہ (رضی اللہ عنہا) کے خوف کی وجہ سے حضرت اسماعیل علیہ السلام کی طرف نظر نہیں فرماتے تھے۔ اور اجنبیوں کی طرح رہتے تھے۔ ایک دن جبلتِ بشری کے تقاضا سے حضرت ہاجرہ رضی اللہ عنہا کی گود میں حضرت اسماعیل علیہ السلام کو تنہائی میں دیکھا' محبت پدری نے غلبہ کیا' اپنی گود میں لے کر چند باراں کے چہرہ کو چوما۔ اچانک حضرت سارہ (رضی اللہ عنہا) کو اس امر پر آگاہی ہوگئی۔ اور ان پر رشک نے غلبہ کیا۔ اور کہا کہ اس بچے کی ماں کو اسی وقت میرے گھر سے لے جایئے۔ اور ایسے صحرا میں جہاں پانی' سایہ اور گھاس نہ ہو' چھوڑ آئیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جتنا سمجھایا کوئی پیش نہ گئی۔ بارگاہِ خداوندی میں التجا کی۔ حکم ہوا کہ سارہ (رضی اللہ عنہا) کے کہنے کے مطابق عمل کریں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام دونوں کو سوار کر کے روانہ ہوئے۔ اور منزل بمنزل طے

کرتے آرہے تھے۔ یہاں تک کہ اس میدان میں پہنچے جس میں خانہ کعبہ واقع ہے۔ حکمِ الٰہی پہنچا کہ ان دونوں کو اسی مکان میں چھوڑ کر چلے جائیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حضرت اسماعیل علیہ السلام اور ان کی والدہ کو خانہ کعبہ کے نزدیک ایک درخت کے تنے کے نیچے جو کہ زمزم کے مقام کے قریب تھا' چھوڑ دیا۔ اور اس وقت سرزمینِ مکہ میں کوئی سانس لینے والا موجود نہ تھا۔ اور نہ ہی پانی تھا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کھجور سے پُر ایک تھیلا' چند روٹیاں اور پانی سے بھرا ایک مشکیزہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی والدہ کے پاس چھوڑ کر تشریف لے گئے۔ اور فرمایا کہ اس بچے کو دودھ پلاؤ اور یہیں رہو۔ اس کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام واپس ہوئے۔ حضرت اسماعیل کی والدہ آپ کے پیچھے چل رہی تھیں اور عرض کر رہی تھیں کہ آپ کہاں چھوڑ چلے اس صحرا میں جہاں پانی ہے نہ مونس اور نہ ہی سایہ دار مکان؟ حضرت ابراہیم علیہ السلام پیٹھ پھیر کر جا رہے تھے۔ اور ان کی بات پر متوجہ نہیں ہوتے تھے۔ آخر حضرت اسماعیل علیہ السلام کی والدہ نے عرض کی کہ آیا اس کام کا آپ کو اللہ تعالیٰ نے حکم فرمایا ہے؟ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے صرف اتنا کہا کہ ہاں! حضرت اسماعیل علیہ السلام کی والدہ نے کہا کہ پھر ہمیں کسی چیز کی پرواہ نہیں ہے' اللہ تعالیٰ ہمیں ضائع نہیں فرمائے گا۔ اور دلجمعی سے واپس اپنے بیٹے کے پاس آگئیں اور دودھ دینا شروع کیا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام جب پہاڑ کے ٹیلے سے گزر کر آگے چلے گئے۔ اور معلوم کیا کہ اب مجھے حضرت ہاجرہ (رضی اللہ عنہا) نہیں دیکھ رہیں تو کعبۃ اللہ کی جگہ کی طرف متوجہ ہو کر اپنے ہاتھوں کو بلند کیا اور یہ چند دعائیں بارگاہِ خداوندی میں عرض کیں۔ ربنا انی اسکنت من ذریتی بواد غیر ذی ذرع عند بیتك المحرم ربنا لیقیمو الصلٰوۃ فاجعل افئدۃ من الناس تھوی الیھم وارزقھم من الثمرات لعلھم لشکرون

(ابراہیم آیت ۳۷)

حضرت ہاجرہ رضی اللہ عنہا جب تک کہ مشک کا پانی موجود تھا۔ اور کھجوریں اور روٹیاں باقی' بچی کھاتی رہیں۔ اور اپنے بچے کو دودھ پلاتی رہیں۔ جب پانی ختم ہو گیا' پیاس نے آپ پر غلبہ کیا اور آپ کے بیٹے پر بھی۔ یہاں تک کہ بچہ اپنے آپ کو زمین پر مارتا اور لیٹتا

تھا۔ بچے کی یہ حالت ان سے دیکھی نہ گئی۔ اُٹھیں اور کوہِ صفا کی طرف متوجہ ہوئیں۔ جو کہ اس مقام سے نسبتاً قریب تھا۔ اور اس پہاڑی پر چڑھ گئیں تا کہ دیکھیں کہ اگر انہیں کہیں کوئی آدمی یا جانور نظر آئے تو اس سے پانی کا سراغ لگائیں۔ لیکن اس پہاڑی پر صرف وہیں تک اوپر گئیں جہاں تک بچہ نظر سے اوجھل نہ ہو۔ دائیں بائیں جتنا بھی دیکھا اور نظر دوڑائی' کچھ بھی نظر نہ آیا۔ مایوس ہو کر اس پہاڑی سے اُتر آئیں۔ اور مروہ کی طرف متوجہ ہوئیں اور میدان میں چلنے کے دوران آپ کے دل میں خیال گزرا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ اس وقت جبکہ میں اپنے بچے سے غائب ہوں' کوئی درندہ آئے اور میرے بچے کو لے جائے اس خیال کی وجہ سے اس میدان کے نشیبی حصہ میں جسے بطن الوادی کہتے ہیں' دوڑنا شروع کر دیا۔ اور اپنا دامن اُٹھا کر شدید دوڑ لگائی۔ یہاں تک کہ میدان کی ڈھلوان سے ہموار زمین پر آ گئیں اور دوڑنا چھوڑ دیا اس لیے کہ وہاں سے ان کے بچے کی جگہ اتنی پوشیدہ نہ تھی۔ اور جب مروہ کے پاس پہنچیں تو اس پہاڑی پر بھی اسی قدر اوپر چڑھ کر دائیں بائیں نظر دوڑائی' کوئی شے نظر نہ آئی پھر صفا کی طرف متوجہ ہوئیں اور میدان کے نشیبی حصہ سے دوڑ کر اور ہموار زمین سے آہستہ چل کر اوپر گئیں اور اسی طرح آپ کو سات (۷) مرتبہ صفا سے مروہ اور مروہ سے صفا آنے جانے کا اتفاق ہوا۔

صفا مروہ کی سعی اور چشمۂ زمزم کا جاری ہونا

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اس واقعہ کی روایت کے دوران حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نقل فرماتے تھے کہ صفا اور مروہ کے درمیان سعی اسی لیے مقرر ہوئی ہے۔ تا کہ لوگ ان کی بے کسی اور بے چارگی کی حالت کو اور حضرت حق عزوجل کی فریادرسی کو یاد کریں۔ اور اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کے دربار میں بے چارگی اور بے کسی کی حالت میں پیش کریں۔ تا کہ ان پر اللہ تعالیٰ کی رحمت کا ورود ہو۔

قصہ مختصر جب آخری بار مروہ پر پہنچیں تو ان کے کانوں میں ایک آواز پہنچی۔ آپ نے اپنے آپ کو خطاب کرتے ہوئے کہا کہ اندیشہ چھوڑ اور آواز پر کان لگا۔ اس کے بعد پھر وہی آواز سُنی تو کہا کہ تو نے آواز تو سنا دی' اے کاش تیرے پاس ہمارے کام کا کوئی چارہ ہوتا۔

یہ کہا اور بھاگتے ہوئے اپنے بچے کے پاس آئیں۔ دیکھا کہ ایک فرشتہ زمزم کی جگہ پر اپنا پر یا ایڑھی مار رہا ہے۔ اور زمین سے پانی جاری ہے۔ آپ نے چاہا کہ اس جاری پانی کو ایک حوض میں جمع کریں اسی لیے مٹی کے تودے اُٹھا اُٹھا کر لاتی تھیں اور پانی کے گرد حوض کی طرح بنا رہی تھیں اور اس پانی سے مشکیزہ کو بھر لیا۔ اور ڈرتی تھیں کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ پانی ختم ہو جائے۔ اور ہم پیاسے رہ جائیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس واقعہ کے ذکر کے بعد فرماتے تھے کہ خدا تعالیٰ، حضرت اسماعیل علیہ السلام کی والدہ کو معاف فرمائے اگر جلدی نہ کرتیں اور پانی کو اس کی طبیعت پر کھلا چھوڑ دیتیں تو زمزم ایک جاری چشمہ ہوتا۔

قصہ مختصر وہ پانی خود بھی پیا اور اپنے بچے کو بھی پلایا۔ اور اس فرشتے نے انہیں تسلی و تشفی دی اور کہا کہ ڈریں نہیں۔ کیونکہ حق تعالیٰ آپ کو یہاں ضائع نہیں فرمائے گا۔ اس لیے کہ اس جگہ خدا کا گھر ہے۔ جسے یہ بچہ جوان ہو کر اپنے والد بزرگوار کے ساتھ مل کر تعمیر کرے گا۔ اور حق تعالیٰ یہاں کے رہنے والوں کو بھی ضائع نہیں فرمائے گا اور اس وقت کعبۃ اللہ کی جگہ زمین سے اونچی اور ممتاز تھی ایک ٹیلے کی طرح نمودار تھی، سیلاب آتے تھے۔ اور اس سے دائیں بائیں گزر جاتے تھے۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی والدہ اور حضرت اسماعیل وہاں تنہائی میں وقت گزارتے تھے۔ کہ اتفاقاً قوم جرہم کی ایک جماعت یمن کے گردونواح سے دشت غربت میں آوارہ پھرتے ہوئے وہاں آنکلتی ہے۔ اور وہ لوگ مقامِ کدا کی طرف سے گزر کر مکہ شریف کی نچلی طرف فروکش ہوتے ہیں۔ دیکھتے ہیں کہ بہت سے پرندے خانہ کعبہ کے بالمقابل پرواز کر رہے ہیں۔ انہوں نے آپس میں کہا کہ پرندے وہاں ہوتے ہیں جہاں آبادی اور پانی ہو اور ہم ہمیشہ سفروں میں یہاں سے گزرتے ہیں، ہم نے کبھی یہاں پانی کا نام ونشان نہیں دیکھا۔ انہوں نے اس کام کی تحقیق کے لیے ایک ایلچی بھیجا۔ وہ ایلچی دیکھ کر گیا کہ یہاں غیب سے پانی نکلا ہے۔ اور ایک خاتون اور ایک بچہ اس پانی کے پاس سکونت پذیر ہیں۔ مذکورہ جماعت کے لوگ اس واقعہ کو سن کر یہاں سکونت کی رغبت کر کے حضرت اسماعیل علیہ السلام کی والدہ کے پاس آئے اور آپ (رضی اللہ عنہا) سے یہاں رہنے کی اجازت کی درخواست کی۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی والدہ بھی ان کا پڑوس

اختیار کرنے میں راغب ہوئیں اور چاہا کہ اس تنہائی میں کوئی مونس مہیا ہو۔ انہیں سکونت کی اجازت دے دی لیکن اس شرط پر کہ پانی میں ان کا کوئی حق ملکیت نہیں ہوگا۔ انہوں نے یہ شرط قبول کر کے اس جگہ سکونت اختیار کی اور اپنے اہل و عیال اور دوستوں کو بھی بُلا کر چند گھر آباد کر لیے۔ اور حضرت اسمٰعیل علیہ السلام ان سے عربی زبان سیکھ کر نہایت ذہین' قابل' تیز فہم اور جوان ہوئے۔ یہاں تک کہ اس جماعت جرہم کے سرداروں نے کمال آرزو کے ساتھ اپنی بچی کا نکاح آپ سے کر دیا اس دوران حضرت اسماعیل علیہ السلام کی والدہ وفات پا گئیں۔ اتفاقاً جب حضرت اسماعیل علیہ السلام چودہ (۱۴) سال کے ہوئے تو حضرت سارہ رضی اللہ عنہا کے شکم سے بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ایک صاحبزادہ پیدا ہوا جو کہ حضرت اسحاق علیہ السلام ہیں۔ اور حضرت سارہ رضی اللہ عنہا اس بیٹے کی پرورش میں مصروف ہو گئیں اور ان کا رشک کم ہوا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان سے اجازت چاہی تاکہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کو دیکھ آئیں۔ انہوں نے اس شرط پر اجازت دی کہ گھوڑے سے نیچے نہ اُتریں اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کے گھر میں رات نہ گزاریں اور زیادہ دیر نہ ٹھہریں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام اسی شرط پر روانہ ہوئے جب یہاں پہنچے تو پتہ کرنے پر معلوم ہوا کہ وہ بیٹا جوان ہو کر خانہ دار ہو گیا ہے۔ اور اس کی والدہ وفات پا چکی ہیں۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام کے گھر کا پوچھ کر آپ ان کے دروازہ پر تشریف لائے۔ اتفاقاً حضرت اسماعیل علیہ السلام اس وقت شکار کے لیے جنگل کی طرف گئے ہوئے تھے۔ اور ان کی گزر بسر یہی تھی کہ تیر اور کمان کے ساتھ حلال جانوروں کا شکار کر کے لاتے تھے۔ اور آبِ زمزم میں پکا کر کھاتے تھے۔ اور اللہ تعالیٰ انہیں صرف اسی پر قناعت دے دیتا تھا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جب حضرت اسماعیل علیہ السلام کو نہ دیکھا تو ان کی اہلیہ کو دروازہ پر بُلا کر پوچھا کہ تیرا شوہر کہاں گیا ہے۔ اور کب واپس آئے گا؟ اس نے عرض کی کہ روزی کی تلاش کے لیے جنگل کی طرف گئے ہیں۔ اور شام تک آجائیں گے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے سوچا کہ اگر میں شام تک یہاں ٹھہروں تو حضرت اسماعیل علیہ السلام آجائیں گے' وہ مجھے بالکل نہیں چھوڑیں گے۔ اور ان کے گھر میں مجھے رات بسر کرنا ہوگی تو

شرط اور وعدہ کی خلاف ورزی لازم آئے گی اور مقصد احوال پُرسی ہے۔ بہتر یہی ہے کہ ان کی اہلیہ سے احوال پوچھ کو لوٹ جاؤں۔ گھوڑے پر سوار ہو کر دروازے پر کھڑے کھڑے ان کی اہلیہ سے احوال پُرسی شروع کر دی۔ یہاں تک کہ ان کی گزر بسر کے متعلق پوچھا۔ اس عورت نے کہا کہ ہماری روزی کا حال تباہ اور خراب ہے۔ اور بہت تنگی اور تکلیف سے گزارہ ہوتا ہے۔ اور بہت شکایتیں کیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہ سُن کر فرمایا کہ جب تیرا شوہر آئے تو میری طرف سے اسے سلام کہنا اور کہنا کہ اپنے دروازے کی دہلیز کی لکڑی کو تبدیل کریں کہ یہ دہلیز ان کے لائق نہیں ہے' یہ فرما کر واپس ہوئے۔

شام کے وقت حضرت اسماعیل علیہ السلام آتے ہیں' انہیں نبوت کے کچھ انوار اور برکات محسوس ہوتی ہیں۔ اپنی بیوی سے پوچھا یہاں کوئی آیا تھا؟ اس نے کہا ہاں ایک بزرگ آدمی گھوڑ سوار جن کی صورت اس طرح کی تھی۔ اور ان کا رنگ اس طرح کا تھا۔ اس دروازے پر کھڑے ہو کر انہوں نے مجھے بُلا کر آپ کے حالات پوچھے۔ آپ نے اپنے دل میں جان لیا کہ یہ بزرگ حضرت ابراہیم علیہ السلام تھے اس لیے کہ آپ نے اپنی والدہ سے آنجناب کا حلیہ اور شمائل سُن رکھے تھے۔

قصہ مختصر حضرت اسماعیل علیہ السلام کی بیوی نے تمام ماجرا بیان کیا اور کہا کہ آپ نے مجھ سے روزی کے متعلق پوچھا تھا' میں نے کہا کہ ہم بہت غربت اور تنگی میں گرفتار ہیں۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام نے فرمایا کہ پھر بزرگ کیا فرما گئے ہیں۔ بیوی نے کہا کہ یہی فرما گئے ہیں کہ اپنے شوہر کو میری طرف سے سلام کہنا اور کہنا کہ اپنے گھر کی دہلیز کو تبدیل کر دے۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام نے فرمایا کہ وہ بزرگ میرے والد بزرگوار تھے' مجھے فرما گئے ہیں کہ تجھے اپنے سے جدا کر دوں' جا اپنے باپ کے گھر میں رہ اور میرے ساتھ تیرا کوئی تعلق نہیں۔ جب حضرت اسماعیل علیہ السلام نے اس عورت کو جدا کر دیا تو جرہم کے قبیلے سے ایک اور شخص نے اپنی بیٹی کا آپ (علیہ السلام) سے نکاح کر دیا۔ اور وہ آپ (علیہ السلام) کے گھر میں آباد رہی۔ یہاں تک کہ مدت دراز کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حضرت سارہ رضی اللہ عنہا سے حضرت اسماعیل علیہ السلام کو دیکھنے کے لیے پھر اجازت

چاہی۔ اور فرمایا کہ پہلی دفعہ میری اسماعیل علیہ السلام سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ اور میرے دل نے تسلی نہیں پائی تھی۔ حضرت سارہ رضی اللہ عنہا نے پھر اسی شرط کے ساتھ اجازت دی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام' حضرت اسماعیل علیہ السلام کو دیکھنے کے لیے پھر روانہ ہوئے۔ اور جب ان کے گھر پہنچے تو انہیں نہ پایا۔ پوچھا کہ اسماعیل کہاں ہیں؟ ان کی نئی بیوی نے دروازے پر آ کر عرض کی کہ مرحبا! یا حضرت تشریف لائیں اور آرام فرمائیں اور مجھے حکم دیں کہ میں سر مبارک کو دھو ڈالوں کیونکہ راہ کی دُھول سے بہت آلودہ ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا مجھے اُترنے کا حکم نہیں ہے۔ وہ خاتون ایک بڑا پتھر لا کر اور آپ (علیہ السلام) کی رکاب کے قریب رکھ کر اس پتھر پر کھڑی ہو گئی۔ اور حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بھی اپنے پاؤں مبارک کو اس پتھر پر زور دے کر رکھ کر اپنا سر جھکا دیا اس عورت نے آپ (علیہ السلام) کے سر مبارک کو خوب دھویا' صاف کیا اور کنگھی کی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس دوران اس خاتون سے حضرت اسماعیل علیہ السلام کے احوال پوچھے۔ اس نے آپ (علیہ السلام) کے اخلاق و عادات کا شکریہ ادا کیا۔ یہاں تک کہ بات گزر بسر پر پہنچ گئی۔ اس خاتون نے حق تعالیٰ کا بہت شکر ادا کیا اور کہا کہ الحمد للہ! ہم بہت وسیع اور فراخ روزی کے ساتھ وقت گزارتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں کسی مخلوق کا محتاج نہیں فرمایا ہے۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام جنگل کے شکار سے گوشت لاتے ہیں۔ اور زمزم کا پانی ہمارے پاس موجود ہے۔ اس گوشت اور اس پانی سے گزر بسر اچھی ہو رہی ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس کے حق میں دعائے خیر فرمائی اور فرمایا کہ حق تعالیٰ تمہیں گوشت اور پانی میں برکت عطا فرمائے۔ حدیث شریف میں ہے کہ آپ کی دعا کی خصوصیت یہ ہوئی کہ جو کوئی مکہ معظمہ میں گوشت اور پانی پر اکتفاء کرے' اسے زرعی اجناس اور غلوں کی ضرورت نہیں رہتی اور اس کی قوت برقرار رہتی ہے۔ جبکہ دوسرے شہروں میں یہ خاصیت نہیں ہے۔

قصہ مختصر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے پھر رات ٹھہرنے کے خوف سے زیادہ توقف نہ فرمایا۔ اور لوٹنے کا ارادہ فرمایا۔ اس خاتون سے فرمایا کہ جب تمہارا شوہر آئے تو انہیں

میری طرف سے سلام پہنچانا اور کہنا کہ دروازہ کی یہ دہلیز بہت اچھی ہے' اسے غنیمت جانیں اور اس کی پوری نگہبانی کریں۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام جو کہ شام کے وقت آتے ہیں۔ پھر انہیں انوار و برکات محسوس ہوتے ہیں' اپنی اہلیہ سے پوچھا کہ کیا آج یہاں کوئی صاحب آئے تھے؟ آپ کی اہلیہ نے کہا ہاں اس طرح کے ایک بزرگ تشریف لائے تھے' میں نے ان کا سر مبارک دھویا اور تواضع کی لیکن آپ گھوڑے کی پشت سے نیچے نہیں آئے اور فرمایا کہ مجھے اُترنے کا حکم نہیں ہے۔ اور آپ نے ہمارے احوال اور ہماری گزر بسر کے متعلق بہت کچھ پوچھا اور ہمارے لیے دعائے خیر کر کے تشریف لے گئے۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام نے فرمایا آپ نے اور کیا فرمایا؟ اہلیہ نے عرض کی کہ یہ فرمایا کہ اپنے شوہر کو میرا سلام دینا اور کہنا کہ اپنے دروازہ کی دہلیز کو غنیمت جان کر پوری نگہبانی کریں۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام نے فرمایا کہ وہ بزرگ میرے والد بزرگوار حضرت ابراہیم علیہ السلام تھے۔ اور تیرے حق میں سفارش فرما گئے ہیں' میرے گھر کے دروازہ کی دہلیز تو ہے۔ چاہیے کہ میں تجھے حسن سلوک سے رکھوں جب اس واقعہ پر بھی ایک مدت گزر گئی تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حضرت اسماعیل علیہ السلام کو دیکھنے کا شوق پھر غالب ہوا۔ حضرت سارہ (رضی اللہ عنہا) نے فرمایا کہ میں اسماعیل کو دیکھنے کے لیے دوبار گیا ہوں لیکن ملاقات نہ ہوئی۔ اگر اجازت ہو تو اسے دیکھ آؤں اور چند دن اس کے پاس ٹھہروں تا کہ میرے دل کو تسلی ہو۔ حضرت سارہ (رضی اللہ عنہا) نے بخوشی اجازت دے دی اور حضرت ابراہیم علیہ السلام روانہ ہو کر وہاں پہنچے۔

دیکھا کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام زمزم کے قریب ایک درخت کے نیچے بیٹھے تیروں کو درست کر رہے ہیں۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام نے دیکھتے ہی حضرت ابراہیم علیہ السلام کو پہچان لیا' بے اختیار اُٹھے اور ایک دوسرے سے معانقہ فرمایا۔ اور جو کچھ سعادت مند بیٹے کو اپنے عالی مرتبت باپ کے ساتھ سلوک کرنا چاہیے تھا کیا اور معمر بن راشد یمنی اس واقعہ کے ذکر میں فرماتے تھے کہ میں نے ایک شخص کو یہ ذکر کرتے سنا انهما بكيا حين التقيا حتى اجابهما الطير یعنی یہ دونوں بزرگ جب ملے تو اس قدر روئے اور ان کی

آوازیں اس قدر بلند ہوئیں کہ ہوا میں اُڑنے والے جانوروں نے بھی گریہ اور آہ وزاری شروع کردی۔

ملاقات کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حضرت اسماعیل علیہ السلام سے فرمایا کہ مجھے حق تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ یہاں خدا تعالیٰ کے لیے ایک گھر بناؤں۔ اور یہ کام میں اپنے ہاتھوں سے کروں گا اگر تو میری امداد کرے تو بہتر ہوگا۔ کیونکہ تیرا کام کرنا گویا میرا کام کرنا ہے۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام نے عرض کی کہ کہاں؟ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا کہ اس بہت بڑے اونچے ٹیلے پر۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام نے عرض کی کہ آپ کا حکم اور خدا تعالیٰ کا حکم دونوں سر آنکھوں پر۔ میں اس کام میں آپ کی مدد ضرور کروں گا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ذوالقعدہ کی پہلی تاریخ کو خانہ کعبہ کی تعمیر شروع فرمائی اور اس مہینے کی پچیس (۲۵) تاریخ کو یہ تعمیر مکمل ہوئی۔ اور اس دوران حضرت اسماعیل علیہ السلام پہاڑوں سے پتھر اُٹھا کر لاتے تھے۔ اور حضرت ابراہیم علیہ السلام تعمیر فرمارہے تھے۔

حاکم نے طریق صحیح کے ساتھ اور بیہقی نے دلائل النبوہ میں حضرت امیر المومنین مرتضیٰ علی کرم اللہ وجہہ الکریم سے روایت بیان کی کہ ایک شخص نے آپ سے پوچھا کہ مجھے خانہ کعبہ کے متعلق بتائیے کہ کیا یہ پہلا گھر ہے۔ جو کہ زمین میں بنایا گیا؟ آپ نے فرمایا مسئلہ یوں نہیں ہے اس گھر کی تعمیر سے پہلے بہت سے گھر تھے۔ اور لوگ اپنی رہائش کے لیے بناتے تھے۔ یہ گھر وہ پہلا گھر ہے۔ جو کہ خدا تعالیٰ کی عبادت کے لیے زمین میں مقرر ہوا۔ اور اس پر برکت اور نور ڈالا گیا۔ پھر آپ نے خانہ کعبہ کی تعمیر کا واقعہ شروع فرمایا۔ اور ارشاد فرمایا کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کو دربارِ خداوندی سے حکم ہوا کہ اس گھر کی تعمیر کریں' آپ اس جگہ کی تعیین نہیں جانتے تھے۔ اور متردد تھے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ مجھ سے اس کی تعمیر میں کمی بیشی ہو جائے۔ حق تعالیٰ نے سکینہ کو ایک پیچیدہ اور گرہ لگی ہوا کی صورت میں بھیجا۔ ہوا کے اس قطعہ کے دو سر تھے۔ اس ہوا نے بادل کی طرح خانہ کعبہ کی زمین پر سایہ ڈالا اور ڈھال کی طرح ہوا میں لٹکتی کھڑی رہی اس کے بعد ازاں حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حکم ہوا کہ سکینہ کے سایہ کے اندازے کے مطابق زمین کعبہ کو معین کریں۔ حضرت ابراہیم علیہ

السلام نے اس کے مطابق تعمیر فرمائی۔

نصب حجر اسود کا واقعہ

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بعد مدت دراز تک وہ عمارت قائم رہی۔ یہاں تک کہ سیلابوں کی وجہ سے منہدم ہوگئی۔ اور عمالقہ نے اسے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے انداز میں تعمیر کیا پھر وہ عمارت منہدم ہوگئی۔ اور فرقۂ جرہم نے اسے بنایا یہ پھر منہدم ہوگئی۔ اور قریش نے اسے تعمیر کیا۔ اور جس وقت قریش اسے بنا رہے تھے۔ جب حجر اسود نصب کرنے کی باری آئی تو آپس میں اختلاف اور جھگڑا شروع کر دیا۔ قریش کے فرقوں میں سے ہر فرقہ چاہتا تھا کہ اس پتھر کو ہم اپنے ہاتھ سے رکھیں اس جھگڑے کو ختم کرنے کے لیے یہ طے پایا کہ مسجد میں جو سب سے پہلے آئے اسے منصف قرار دیں اور اس کے حکم کے مطابق عمل کریں۔ اچانک سب سے پہلے جس نے مسجد میں قدم رکھا' وہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تھے۔ جو کہ باب بنی شیبہ میں سے داخل ہوئے۔ انہوں نے اپنی قرارداد کے مطابق آپ کو منصف بنا لیا۔ آپ نے فرمایا کہ چادر لاؤ اس چادر کو پھیلایا گیا اور آپ نے اپنے دستِ مقدس کے ساتھ حجر اسود کو چادر کے درمیان رکھ دیا اس کے بعد قریش کے فرقوں میں سے ہر فرقہ کے سرداروں سے فرمایا کہ چادر کے ایک ایک گوشہ کو پکڑ کر اُٹھائیں جب وہ چادر حجر اسود کی جگہ کے مقابل پہنچ گئی تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس پتھر کو اپنے دست مبارک کے ساتھ اُٹھا کر اس کی جگہ رکھ کر دوسرے پتھروں کے ساتھ ملا دیا۔

بیت اللہ شریف کا رقبہ

اور ارزقی نے ابن اسحاق سے روایت کی کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بیت اللہ شریف بنایا اور اس کی بلندی آسمان کی طرف نو (۹) گز اور اس کا زمین میں رُکن اسود سے رُکن شامی تک جو کہ حطیم کے پاس اس کے سامنے ہے' عرض بتیس (۳۲) گز کیا اور رُکن شامی سے رُکن غربی تک جس میں حطیم ہے' (۲۲) گز عرض کیا' رُکن غربی سے رُکن یمانی تک اکتیس (۳۱) گز اور رُکن یمانی سے رُکن اسود تک کا عرض بیس (۲۰) گز کیا۔ فرمایا کہ اسی

لیے اس کا نام کعبہ رکھا گیا۔ کیونکہ یہ مربع کی شکل میں ہے۔ فرمایا۔ اور اسی طرح حضرت آدم علیہ السلام کی بنیاد تھی۔ اور اس دروازہ کو زمین کے ساتھ بنایا گیا جسے کواڑ نہیں لگائے تھے۔ یہاں تک کہ تبع بن سعد الحمیری آیا اور اس نے اسے کواڑ لگائے۔ اور فارسی دروازہ لگایا اور اسے پورا غلاف چڑھایا اور اس کے نزدیک قربانی کی اور حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بیت اللہ کے پہلو میں حجر کو ایک چھپر بنایا جو کہ پیلو کے درخت سے بنایا گیا جس میں بکریاں داخل ہوتی تھیں تو یہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی بکریوں کا گیٹ تھا۔ اور حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بیت اللہ کے اندر داخل ہونے والے کے دائیں ہاتھ ایک گڑھا بنایا جو کہ اس گھر کا خزانہ ہو اور اس میں کعبہ شریف کے ہدیے ڈالے جائیں۔ اور جب حضرت نوح علیہ السلام کے زمانہ میں اللہ تعالیٰ نے زمین کو غرق فرمادیا تو حجر اسود کو جبل ابوقبیس میں بطور امانت رکھ دیا گیا اور فرمایا کہ میں نے اپنے خلیل کو میرا گھر بناتے ہوئے دیکھا تو اسے نکالا۔ حضرت جبریل علیہ السلام اسے لائے۔ اور اس مقام پر رکھ دیا۔ اور اس پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تعمیر فرمائی اور وہ اس وقت اس کی سفیدی کے نور سے جگمگاتا تھا۔ اور اس کا نور ہر طرف سے حرم کے نشانات تک چمکتا تھا۔

اور صحیح بخاری اور دوسری معتبر صحاح میں مروی ہے کہ ایک دن حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کو خانہ کعبہ کے پاس لے گئے۔ اور فرمایا کہ دیکھو تمہاری قوم قریش نے، بنائے کعبہ کے وقت حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بنیادوں سے کعبہ کو مختصر کر دیا۔ انہوں نے عرض کی یارسول اللہ! (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اب آپ اسے پورا فرمادیں۔ آپ نے فرمایا کہ ابھی تمہاری قوم تازہ تازہ اسلام میں داخل ہوئی ہے۔ اگر میں خانہ کعبہ کو شہید کروں۔ اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بنیادوں پر پورا کروں تو طعن وتشنیع کریں گے۔ اور کہیں گے کہ اس شخص نے اپنی طرف سے دوسری زمین کا کعبہ میں اضافہ کر دیا اگر یہ خوف نہ ہوتا تو میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بنیادوں پر ضرور پورا کرتا۔ اور میں اس کے دروازے کو زمین کے ساتھ ملا دیتا۔ اور اس گھر کو دو دروازوں والا بنا دیتا ایک مشرق کی طرف اور دوسرا مغرب کی طرف۔

یہاں جاننا چاہیے کہ خانہ کعبہ کے چار گوشے ہیں۔ دو گوشوں کو یمانی کہتے ہیں کہ ان میں سے ایک حجر اسود کا گوشہ ہے۔ جو کہ مشرق کی طرف واقع ہے۔ اور ان میں سے ایک کنج یمانی یعنی رُکن یمانی کہتے ہیں جو کہ مغرب کی طرف واقع ہے۔ اور دو گوشوں کو رُکن شامی کہتے ہیں۔ ان میں سے ایک کا لقب جو کہ مشرق کی طرف ہے' رُکن عراقی ہے۔ اور دوسرا جو کہ مغرب کی طرف ہے' رُکن غربی کے نام سے مشہور ہے۔ پس قریشیوں نے بنائے کعبہ کے وقت دونوں شامی رُکنوں کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بنیادوں سے چھوٹا کر دیا۔ اور کعبہ شریف کی کچھ زمین کو باہر چھوڑ دیا۔ اور اس زمین کو حجر اسود میں داخل کر دیا۔ اور وہ دیوار جو کہ حجر اسود کے گوشے سے رُکن عراقی تک ہے اس کے نشانات کو بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام کے نشانات کے اندازے سے کم کر دیا اسی وجہ سے اس طرف بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بنیاد سے کچھ حصہ چبوترے کی طرح زمین سے اونچا رہا اور اسے کعبہ کا سائبان کہتے ہیں۔

اور جب حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما نے اپنی حکومت کے دور میں خانہ کعبہ کو شہید کر کے بنایا تو اس کے مطابق جو کہ حضور علیہ السلام نے اپنے ذہن شریف میں قرار دیا تھا۔ اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس اس کا اظہار بھی فرمایا تھا' عمل کیا۔ لیکن حجاج نے غلبہ پانے کے بعد پھر دورِ جاہلیت کی صورت پر لوٹا دیا۔ اور تواریخ میں مذکور ہے کہ ہارون رشید نے اپنے دور سلطنت میں حضرت امام مالک رحمتہ اللہ علیہ سے فتویٰ پوچھا تھا کہ اگر آپ حکم دیں تو میں خانہ کعبہ کو عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کے طریقے پر بنا دوں جو کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی خواہش کے مطابق تھا۔ آپ نے فرمایا کہ اگرچہ یہ حدیث صحیح ہے۔ اور اس کے مطابق عمل کرنا حضور علیہ السلام کی مرضی کی پیروی ہے۔ لیکن کعبہ کو بار بار منہدم کرنا اور اس کی تعمیر میں تبدیلیاں لانا مصلحت نہیں۔ اس لیے کہ اس صورت میں کعبہ کی تعمیر بادشاہوں کا کھیل بن جائے گا۔ ہر بادشاہ اسے اپنے مخصوص طریقے پر بنانے کو رسوم شاہی جان کر اس پر اقدام نمائی کرے گا۔ اور بہت بڑی خرابی رونما ہوگی۔ اور جہاں مصلحت اور خرابی ایک دوسرے کے مقابل ہوں وہاں خرابی دُور کرنے کی رعایت کو پہلے رکھا جانا

چاہیے۔اور مصلحت سے دست بردار ہو جانا چاہیے۔

دوسرا فائدہ یہ ہے کہ قواعد کے لفظ کی تفسیر میں لوگوں کو ایک حیرت لاحق ہے۔ اکثر مفسرین نے قاعدہ کی تفسیر اساس اور بنیاد کے ساتھ کی ہے۔ اور اس صورت میں قواعد کو اونچا کرنا سمجھ نہیں آتا۔ اس لیے کہ بنانے والا اساس اور بنیاد کو اس کی جگہ سے بلند نہیں کرتا بلکہ اس پر دیوار کی چنائی کرتا ہے مگر یہ کہ روایات کی خلاف ورزی کا ارتکاب کیا جائے۔ اور کہا جائے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے زمین کی تہ سے بھی اس گھر کی بنیاد اُٹھا کر سطح زمین تک بلند کی ہے یا کہا جائے کہ بنیادوں کو بلند کرنے کے مجازی معنی یہی ہیں کہ ان پر دیوار بنائی جائے۔ اور بعض مفسرین نے کہا ہے کہ قواعد سے مراد پتھر اور اینٹ کی قطاریں ہیں۔ اس لیے کہ ہر نچلی قطار اوپر کی قطار کے لیے بنیاد کی طرح ہے۔ اور اسی لیے لغتِ عرب میں ان قطاروں کو ساقات البنا کہتے ہیں۔ اور لغتِ ہندی میں ردہ کہتے ہیں۔ اور اگرچہ ان قطاروں کو ان کی جگہوں سے حقیقتاً اُٹھانا متصور نہیں ہے۔ لیکن بنیاد کی نسبت سے سب کے لیے حقیقی اٹھانا واقع ہے۔ اور سب سے زیادہ صحیح یہ ہے کہ قواعد سے مراد دیواریں ہیں۔ اس لیے کہ قاعدہ کا لفظ لغتِ عرب میں زیادہ تر ستون کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ اور دیواریں چھت کے لیے بمنزلہ ستون ہوتی ہیں۔ خصوصاً جب ان دیواروں کے درمیان کوئی دروازہ بھی کھول دیں کہ اس صورت میں ستونوں کے ساتھ پوری مشابہت پیدا ہو جاتی ہے۔

تیسرا فائدہ یہ ہے کہ عبارت کی ظاہری صورت اس طرح تھی کہ فرمایا جاتا واذیرفع ابراھیم قواعد البیت اس عبارت میں کہ القواعد من البیت ہے' بلاغت کی کیا باریکی ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اگر لفظ من بیان کے لیے ہے تو اس عبارت کا مدلول ابہام کے بعد بیان کرنا ہوا۔ اس لیے کہ اس کلام کے معنی کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام دیواروں کو اونچا کر رہے تھے۔ اور وہ دیواریں خانہ کعبہ کی دیواریں تھیں۔ تو اس ادا سے خانہ کعبہ کی شان کی تعظیم نکلتی ہے۔ جو کہ قَوَاعِدَ الْبَیْتِ کی عبارت سے نہیں نکلتی تھی۔ اور اگر لفظ من تبعیض کے لیے ہے تو اس عبارت کو لانا یہ جتلانے کے لیے ہے کہ

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے پورے گھر کو اس کی بنیاد سے نہیں بنایا بلکہ اس کے اجزا اور بعض حصوں کو بنایا صرف دیواریں بلند کیں' جبکہ اس کی بنیاد تو پہلے ہی سے موجود تھی۔ اور اسی اعتبار سے اس سے پہلے اس گھر کی تعمیر بھی مقرر ہو چکی تھی۔ جیسا کہ روایات کے مطابق گزرا اور قواعد البیت کی عبارت سے یہ فائدہ ظاہر نہیں ہوتا ہے۔

چوتھا فائدہ یہ کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کا ذکر کلام پورا کرنے کے بعد کیوں لایا گیا اور کلام کے درمیان میں درج کیوں نہ فرمایا تا کہ عبارت یوں ہوتی کہ وَاِذْ یَرْفَعُ اِبْرَاھِیْمُ وَاِسْمَاعِیْلُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَیْتِ ؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس گھر کی تعمیر میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی شراکت برابر کی نہ تھی بلکہ دو وجہ سے تابع کی اپنے متبوع کے ساتھ اور خادم کی مخدوم کے ساتھ شراکت تھی۔ پہلی وجہ یہ ہے کہ کعبۃ اللہ کو بنانے کے لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام اصالتاً مامور تھے بخلاف حضرت اسماعیل علیہ السلام کے۔ ہاں حضرت اسماعیل علیہ السلام کو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے مامور فرمایا تھا۔ اور خود امر فرمانے والے تھے۔ دوسری وجہ یہ کہ بلند کرنے کا عمل حضرت ابراہیم علیہ السلام سے وقوع پذیر ہوا نہ کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام سے۔ اس لیے کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام مزدور کی طرح پتھر لاتے تھے۔ اور عرف میں تعمیر یا حکم دینے والے کی طرف منسوب کرتے ہیں یا اس کی طرف جو خود تعمیر کر رہا ہے۔ مثلاً لوگ کہتے کہ یہ قلعہ فلاں بادشاہ نے بنایا ہے یا یہ دیوار فلاں معمار اور مستری نے بنائی ہے۔ اور تعمیر کی نسبت مزدور کی طرف کرنا رائج نہیں۔ اس فرق کے اظہار کے لیے حضرت اسماعیل علیہ السلام کے ذکر کو دورانِ کلام حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ذکر کے ساتھ درج نہ فرمایا تا کہ برابری کی شرکت نہ سمجھی جائے۔ ہاں دعا میں دونوں کی شرکت برابری کی تھی کیونکہ دونوں اپنی کوشش اور محنت کی قبولیت کے یکساں آرزومند تھے۔ اور اپنی اولاد کے لیے عنایاتِ ربانی کے طالب اور اسی لیے دعا کی حکایات میں متکلم مع الغیر کا صیغہ تابعیت و متبوعیت کا فرق ظاہر کیے بغیر ارشاد فرمایا گیا۔

پانچواں فائدہ یہ ہے کہ قبولیت عمل کی دعا سے جو ان دونوں بزرگوں سے صادر ہوئی'

معلوم ہوتا ہے کہ کسی ایسے فعل پر جو کہ اخلاص اور قبولیت کی دوسری شرائط کے ساتھ مزین ہو' ثواب کا مرتب ہونا اور اس کے ساتھ رضائے خداوندی کا متعلق ہونا واجب اور لازم نہیں ہے ورنہ اپنی نیت کے اخلاص کو جاننے کے باوجود قبولیت کی طلب کا کوئی فائدہ نہ تھا اور اہل سنت کا یہی مذہب ہے۔ اور معتزلہ کی جماعت جنہوں نے اس صورت میں قبولیت کو باری تعالیٰ کے ذمہ واجب جانا ہے' وہ اس دعا اور طلب کی توجیہ اس طرح کرتے ہیں کہ اس عمل کو قبول کرنے کی طلب میں ان دونوں بزرگوں کا مقصد یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ اسے اخلاص سے معمور اور شرائط قبولیت کے جامع افعال کے زمرے میں سے کر دے بلکہ قبول کرنے کی طلب' عمل کو اس طرح صحیح کرنے کی طلب سے کنایہ ہے کہ جس سے عمل مقبول ہو اور نتیجتاً ثواب حاصل ہو۔ لیکن عقل مند پر پوشیدہ نہیں ہے کہ معتزلہ کے قانون کے مطابق جو کہ بندوں کے اعمال کو بندوں کی مخلوق اور ان کے اختیار کے ساتھ وابستہ مانتے ہیں' عمل کو صحیح کرنا اور اسے قبولیت کے لائق بنانا ان کا اپنا کام تھا۔ اور ان کے اپنے ہاتھ میں تھا اسے بارگاہِ خداوندی سے مانگنے کا کوئی فائدہ نہ تھا۔

اور ہر صورت میں ان دونوں بزرگوں نے جب نبوت کی سچی فراست کے ساتھ جان لیا کہ جس وقت حق تعالیٰ نے اپنے لیے گھر بنانے کا حکم فرمایا ہے تو اس مناسبت سے اس جہان میں کوئی اور رنگ ظہور پذیر ہوگا۔ اور عبادت کے لیے کوئی نیا انداز جو کہ صورت پرستی اور عشق مجازی کے مشابہ ہوگا' مقرر ہوگا۔ اور اس وسیلہ سے باطنی معنی کو صورت ظاہری کا لباس پہنائیں گے۔ اور لوگ ملائکہ کی طرح معائنہ اور مشاہدہ کا حکم حاصل کریں گے۔ اور اس نئے انداز کے اکثر احکام جن کے معنی عقل سے وراء ہوں گے' دربارِ خداوندی سے پہنچیں گے۔ اور ان احکام کے اسرار اور حکمتیں بشری عقل کی ظاہری نظر میں جلوہ گر نہیں ہوں گے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ان اسرار اور حکمتوں پر آگاہی نہ ہونے کی وجہ سے یا صورت پرستوں کے افعال کی مشابہت کے پیش نظر ان احکام کی تعمیل میں ہم سے اور ہماری اولاد سے کوئی کوتاہی یا توقف رونما ہو اور دعا بارگاہِ خداوندی میں پیش کی اور یوں عرض کی۔

رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ اے ہمارے پروردگار! اور ہم دونوں کو اپنے احکام مطیع

فرماتا کہ وہ جن رنگ اور جس انداز میں آئیں ہم انہیں قبول کریں۔ اور ان کے اسرار طلب نہ کریں۔ نیز اس گھر کے حج میں ہم تیری عبادت اور بندگی کا قصد کریں نہ کہ اس گھر کی عبادت کا۔ نیز کر دے وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَآ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ ہم دونوں کی اولاد سے ایک جماعت جو تیرے احکام کی مطیع ہو تا کہ مناسک حج کی ادائیگی میں کوئی سُستی اور کاہلی نہ کریں جن میں زیادہ تر اپنی آبروریزی اور مجنونامہ اور بے تابانہ انداز اختیار کرنے کو ضمن میں لیے ہوئے ہیں۔ اور وقار و عزت کے منافی اور اپنی وضع اور خودداری کی حفاظت سے دُور ہیں۔ جیسا کہ ننگے سر اور ننگے بند ہونا' خوشبو ترک کرنا' اونچی جگہ پر تند و تیز انداز میں تلبیہ کے نعرے لگانا' اپنے آپ کو شیفتہ و شیدا ظاہر کرنا' چند پتھروں اور لکڑیوں کے گرد گھومنا' کسی پتھر کو بوسہ دینا' سبب ظاہری کے بغیر کبھی بھاگنا کبھی چلنا کبھی کھڑے ہونا' کسی دشمن کا مشاہدہ کیے بغیر صرف آنکھوں سے اوجھل دشمن کے تصور پر کنکریاں پھینکنا اور بغیر کسی قصور کے ایک جان دار کو بے جان کرنا ہے۔ اور وقار اور عزت کے پابند نہ ہوں اور ان کی زبانِ حال پر یہ ترانہ جاری ہو

گر طمع خواہد زمن سلطان دیں
خاک برفرق قناعت بعد ازیں

یعنی اگر سلطان دین مجھ سے طمع چاہیں تو اس کے بعد قناعت کے سر پر خاک ہو اور جب احکام کی اطاعت اور وہ عبادتیں جو کہ اس گھر سے وابستہ ہیں اُن احکام کو پہچانے بغیر ممکن نہیں۔ پس پہلے ہمیں اور ہمارے واسطے سے ہماری اولاد کو ان احکام کی معرفت نصیب فرما۔

وَاَرِنَا مَنَاسِكَنَا اور ہمیں ہماری عبادتوں کے مقامات دِکھا جو کہ اس گھر سے متعلق ہیں۔ اور ان عبادتوں کا وقت اور ان کی کیفیات اور وہ اسرار جو کہ اس کے ضمن میں پوشیدہ ہیں۔ گویا ہمیں وہ ساری چیزیں آنکھوں سے نظر آ جائیں تا کہ ہم اس کے مطابق عمل کریں۔ اور اپنی اولاد کو بھی اس کا حکم دیں۔

صورت حج اور اس کے ارکان کا بیان

اور تفسیر ابن جریر اور محدثین کی دوسری کتابوں میں متعدد طریقوں سے حضرت

امیر المومنین علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بارگاہِ خداوندی میں یہ دعا پیش کی تو حضرت جبریل علیہ السلام کو حکم ہوا کہ حج کی صورت حضرت ابراہیم علیہ السلام کے سامنے ظاہر کریں۔ حضرت جبریل علیہ السلام نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حج کرایا اور احرام سے لے کر سر منڈانے تک حج کے جو ارکان، سنتیں اور اس کے مستحبات بجالانا چاہئیں، آپ کو سب کا پتہ دیا۔ پہلے احرام، اس کے بعد طواف قدوم، اس کے بعد صفا اور مروہ کے درمیان دوڑنا، اس کے بعد ذوالحجہ کی آٹھویں تاریخ کو منیٰ میں مقام کرنا، اس کے بعد اس ماہ کی نویں تاریخ کو میدانِ عرفات میں کھڑے ہونا اور تلبیہ کہنا، اس کے بعد مزدلفہ میں لوٹنا اور رات گزارنا اور دسویں دن کی صبح کے وقت وقوف کرنا، اس کے بعد منیٰ میں لوٹنا اور قربانی کے لئے ذبح اور نحر اور سر کے بال کاٹ کر احرام سے باہر آنا اور اس کے بعد لباس پہن کر طواف زیارت کے لیے جانا اور اسی اثنا میں جمرہ عقبیٰ کے نزدیک جو کہ منیٰ کی حد میں ہے، حضرت ابراہیم علیہ السلام کے سامنے شیطان رونما ہوا۔ اور اس نے راستہ روکا۔ حضرت جبریل علیہ السلام نے فرمایا کہ اس کی طرف سات (۷) سنگ ریزے تکبیر کہتے ہوئے پھینکیں تاکہ دُور ہو۔ اور دوسرے، تیسرے اور چوتھے دن تینوں جمرات میں شیطان ظاہر ہوا۔ حضرت جبریل علیہ السلام نے آپ کو تینوں مقامات پر پھر شیطان پر پتھر پھینکنے کا حکم دیا۔ اور حضرت اسماعیل علیہ السلام بھی اس حج میں شریک تھے۔ اور اس واقعہ کو بیہقی شعب الایمان میں بھی لائے ہیں۔

اور سعید بن منصور نے امام مجاہد سے نقل کیا کہ حج ابراہیم واسماعیل وہما ماشیان۔ کہ حضرت ابراہیم اور اسماعیل علی نبینا وعلیہما السلام نے پیدل چل کر حج کیا۔ اور جب حضرت ابراہیم علیہ السلام حج سے فارغ ہوئے تو انہیں بارگاہِ خداوندی سے حکم ہوا کہ روئے زمین کے لوگوں میں حج کا اعلان کریں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے عرض کی کہ بارخدایا! میری آواز کس کے کان میں پہنچے گی لوگ تو جہان کی اطراف میں پھیلے ہوئے ہیں۔ حکم ہوا کہ آواز دینا آپ کے ذمہ ہے۔ اور اس آواز کو پہنچانا ہمارا کام ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام اس پتھر پر کھڑے ہو گئے جو کہ مقامِ ابراہیم کے نام سے مشہور ہے۔ اور آپ نے کعبۃ اللہ کی

تعمیر بھی اسی پتھر پر کھڑے ہو کر کی تھی۔ اور وہ پتھر اتنا بلند ہوا کہ جبل ابوقبیس اور دوسرے اونچے پہاڑوں سے بھی اونچا ہو گیا۔ اور حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بلند آواز سے تین مرتبہ فرمایا کہ اے لوگو! تمہارے خدا نے اپنے لیے زمین میں ایک گھر بنایا ہے۔ اور وہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ اس کے گھر کے حج کے لیے آؤ خواہ سوار' خواہ پیدل۔ اللہ تعالیٰ نے اس آواز کو تمام جہان والوں کے کانوں میں پہنچا دیا جو کہ موجود تھے۔ اور ان ارواح کے کانوں میں جو کہ ماؤں کے شکموں میں یا باپوں کی پشتوں میں تھیں' بھی پہنچا دی۔ کسی نے ایک بار لبیک کہا' کسی نے دو بار اور کسی نے اس سے زیادہ بار کہا اور کسی نے جواب نہ دیا۔ اور جس نے جواب نہ دیا اسے حج خانہ کعبہ میسر نہیں ہوتا۔ اور جس نے ایک بار کہا' ایک بار حج کرتا ہے۔ علیٰ ہذا القیاس سعید بن منصور نے اپنی سنن میں ابن ابی خاتم نے اپنی تفسیر میں اور ارزقی نے اپنی تاریخ میں اسے امام مجاہد سے اسی طرح روایت فرمایا۔ اور جب حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیٰ نبینا وعلیہما السلام نے سوچا کہ اس گھر کے مناسک احرام سے لے کر سر منڈانے تک بے شمار مشکل اور طویل المدت افعال پر مشتمل ہوں گے۔ اور ان افعال میں مصروفیت کے دوران لازماً کوئی سہو یا کوتاہی رونما ہو گی تو ایک اور دعا پیش کی اور عرض کی۔

وَتُبْ عَلَيْنَا اور ہم پر رحمت سے توجہ فرما۔ اگر اس گھر کے مناسک میں ہم سے اور ہماری اولاد سے کوئی کوتاہی واقع ہو۔ اور اس کوتاہی کے کفارے سے بھی ہمیں آگاہ فرما تا کہ ہم اس کا تدارک کریں۔ مثلاً اگر حالتِ احرام میں سلا ہوا کپڑا پہنیں یا ناخن کاٹ لیں یا خوشبو استعمال کرلیں یا سر کے بال تراش لیں یا شکار کرلیں تو کیا کرنا چاہیے۔ اور اگر صفا و مروہ کے درمیان سعی بھول جائیں یا اس گھر کا طواف طہارت کے بغیر کریں تو کیا کرنا چاہیے تا کہ ان کوتاہیوں کے بوجھ سے خلاصی پائیں۔

اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ تحقیق تو ہی اپنے گنہگار بندوں پر بار بار رحمت سے توجہ فرمانے والا' رحم فرمانے والا ہے۔ اور ان کی اس دعا سے مسلمانوں اور ان کی اولادوں کے لیے مناسک میں غلطی جیسے احرام میں جنایات وغیرہ کے تدارک کا طریقہ از روئے شرع بیان کیا گیا جیسا کہ کتب فقہ میں وضاحت سے بیان کیا گیا ہے۔ اور اس صورت میں

بھی ان کا کچھ حصہ دوسرے پارے میں ذکر کیا جائے گا' انشاء اللہ العزیز۔

چند بحثیں

یہاں چند بحثیں باقی رہ گئیں۔ اہل تفسیر جن کے درپے ہوتے ہیں اگرچہ ان بحثوں کا حل عین تفسیر کے دوران گزر چکا ہے۔ پہلی بحث یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسماعیل علیہ السلام نے بارگاہِ خداوندی سے درخواست کی ہے کہ ہم دونوں کو مسلمان بنا حالانکہ اس وقت ان دونوں کی مسلمانی یقین کے ساتھ ثابت تھی۔ پس اس سے تحصیل حاصل لازم آئی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اگر اسلام سے مراد مسلمانی کا دین اور اس کا اعتقاد ہے تو ان کا اس دعا سے مقصد اپنے لیے اس دین اور اعتقاد پر ثابت قدمی اور استقامت ہے۔ اور اکثر اوقات عرف میں ہے شے کی ہمیشگی کو اس شے کے لفظ کے ساتھ طلب کرتے ہیں۔ اور اگر اسلام سے مراد اللہ تعالیٰ کی طرف سے سونپی گئی ذمہ داریوں کی پوری اطاعت' یقین کامل' تمام اعضاء اور قوتوں کے ساتھ تعمیل کرنا اور اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی قسمت اور تقدیروں پر راضی ہونا ہے تو ان چیزوں کی طلب ہر شخص کے لیے مفید ہے۔ خواہ نبی علیہ السلام ہو یا غیر نبی اس لیے کہ یہ چیزیں ضبط اور حد سے باہر ہیں' اللہ تعالیٰ کی دائمی امداد اور توفیق کے شامل ہوئے بغیر میسر نہیں ہوتیں۔ بخلاف دین اور اعتقاد کے کہ یہ مضبوط اور محدود چیز ہے۔ اور ایک بار توفیقِ الٰہی اس کے حصول میں کافی ہے۔

دوسری بحث یہ ہے کہ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَا میں لفظ من تبعیض کے لیے ہے۔ پس حضرت ابراہیم و اسماعیل علیٰ نبینا وعلیہما السّلام نے اپنی بعض اولاد کی مسلمانی کی درخواست کیوں کی؟ حالانکہ دعائے خیر میں سب کو شامل کرنا پیش نظر رہنا چاہیے۔ اور خاص نہیں کرنا چاہیے۔ اور اسی لیے اس اعرابی کو جس نے کہ خاص اپنے لیے اور حضور علیہ السلام کے لیے رحمتِ الٰہی کی ان لفظوں سے درخواست کی اللھم ارحمنی و محمدًا ولا ترحم معنا احدا یعنی یا اللہ مجھ پر' حضور علیہ السلام پر رحمت فرما اور ہمارے ساتھ کسی پر رحم نہ فرما۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا لقد حجرت واسعا تو نے وسیع رحمت کو روک دیا ہے۔ اور حدیث شریف میں آدابِ امامت کے بارے میں وارد ہے کہ ولا یخص نفسہ

بالدعاء یعنی امام خاص اپنے لیے دعا نہ کرے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ انہوں نے ایک دفعہ دعائے امامت کے جواب میں حق تعالیٰ سے سنا تھا کہ ان کی اولاد میں سے ظالم اور فاسق ہوں گے۔ دوسری دفعہ دعائے رزق میں سنا تھا کہ ان میں سے کچھ کافر ہوں گے تو ان کے نزدیک یہ بات یقیناً پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی تھی کہ میری بعض اولاد کے کافر ہونے کے ساتھ ارادۂ الٰہی متعلق ہو چکا ہے۔ اور دعا کرنے والے کو چاہیے کہ ارادۂ الٰہی کے خلاف دعا نہ کرے اسی وجہ سے اس دعا میں انہوں نے تخصیص فرمائی۔

تیسری بحث یہ ہے کہ جب امامت کی دعا آپ کی بعض اولاد کے حق میں قبول ہو چکی تھی تو پھر ان کے لیے اسلام کی دعا کیوں درکار ہوئی؟ امامت کا مرتبہ اسلام کے مرتبہ سے بالاتر ہے۔ اور حصولِ اسلام پر موقوف ہے۔ اور جب ان کی بعض اولاد کو امامت حاصل ہو گئی تو اسلام بطریقِ اولیٰ حاصل ہو گیا ہوگا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ان کا اس دعا سے مقصود یہ ہے کہ وہ کثیر جماعت کہ جنہیں اُمت کہا جا سکے مدت دراز تک مسلمانی پر قائم رہے۔ جبکہ دعائے امامت کی قبولیت اگر دلالت کرتی ہے تو صرف اسی حد تک کہ ان کی اولاد کا بعض اگرچہ ایک دو آدمی ہوں منصب امامت پائیں گے۔ گو ان ایک دو کے پیروکار اوروں سے نہ کہ آپ کی اولاد سے۔ پس امامت کی دعا اس دعا سے کفایت نہیں کرتی تھی۔

چوتھی بحث یہ ہے کہ اس امت مسلمہ کا مصداق ان دونوں بزرگوں کی اولاد میں سے کون سی جماعت کے لوگ گزرے ہیں؟ بعض مفسرین نے کہا ہے کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کے بیٹے اور ان کی نسل جو کہ مدت دراز تک توحید اور اسلام پر قائم رہے تھے۔ اور بعض نے کہا ہے کہ ان میں سے ہر دور میں چیدہ چیدہ لوگ باایمان گزرے ہیں۔ جیسے زید بن عمرو بن نفیل اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جدامجد حضرت عبدالمطلب۔ لیکن صحیح یہ ہے کہ اس اُمت مسلمہ کا مصداق حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہیں قریش وغیرہم اور ان کی اولاد۔ اس لیے کہ اگلی دعا میں یہ الفاظ واقع ہیں وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ اور یہ صفت حضرت اسماعیل علیہ السلام کے بیٹوں اور

ان کی قریبی نسل اور اسی طرح زید بن عمرو بن نفیل، قیس بن ساعدہ وغیرہم پر صادق نہیں آتی بلکہ اس لفظ سے صراحتاً معلوم ہوتا ہے کہ وہ رسول علیہ السلام نازل شدہ کتاب کی ان کے سامنے تلاوت کریں۔ انہیں کتاب وحکمت کی تعلیم دیں۔ اور ان کے بواطن کو غفلت اور حجاب سے پاک فرمائیں۔ اور یہ صفات ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جو کہ حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیٰ نبینا وعلیہما السلام کی اولاد سے ہیں کے غیر میں ثابت نہیں ہوئی ہیں۔ اور نہ ہوں گی اور اسی لیے سورۃ الحج کے آخر میں صحابہ کرام (رضی اللہ عنہم) سے خطاب فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا مِلَّةَ اَبِيۡكُمۡ اِبۡرٰهِيۡمَ هُوَ سَمّٰٮكُمُ الۡمُسۡلِمِيۡنَ مِنۡ قَبۡلُ

پس حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیٰ نبینا وعلیہما الصلوٰۃ والسلام کی یہ دعا اس بارے میں نص صریح ہے کہ پیغمبر آخرالزمان صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اللہ تعالیٰ کی طرف سے مبعوث ہیں۔ اور آپ کی امت، اُمت مسلمہ ہے۔ اور اسی نص سے یہود ونصاریٰ پر الزام ہو سکتا ہے۔ اور محققین کے نزدیک صفات کو نصاً بیان کرنا ناموں اور القاب کی نص سے زیادہ قوی ہے۔ ہاں اس قدر شرط ہے کہ ان صفات کو اس طرح ذکر کیا جائے کہ کلی فرد واحد میں منحصر ہو جائے تا کہ شرکت کا احتمال نہ رہے۔

خلفائے راشدین کی خلافت نص کے ساتھ ثابت ہے

اور اسی لیے اہلِ تحقیق کا یہ عقیدہ ہے کہ چاروں خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم کی خلافت اس قسم کی نصوص کی وجہ سے منصوص ہے۔ جیسا کہ آیت استخلاف میں جو کہ سورۃ النور میں ہے۔ اور مرتدین کے ساتھ لڑائی کی آیت میں جو کہ سورۃ مائدہ (آیت ۵۴) میں ہے۔ اور غزوۂ حدیبیہ سے پیچھے رہ جانے والوں کی آیت جو کہ سورۃ الفتح (آیت ۱۶) میں پوری تفصیل اور تکمیل کے ساتھ مذکور ہے۔

سورۃ النور میں استخلاف کی آیت یہ ہے: وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا مِنۡكُمۡ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسۡتَخۡلِفَنَّهُمۡ فِى الۡاَرۡضِ كَمَا اسۡتَخۡلَفَ الَّذِيۡنَ مِنۡ قَبۡلِهِمۡ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمۡ دِيۡنَهُمُ الَّذِى ارۡتَضٰى لَهُمۡ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمۡ مِّنۡۢ بَعۡدِ خَوۡفِهِمۡ اَمۡنًا

يَعْبُدُوْنَنِي لَا يُشْرِكُوْنَ بِي شَيْئًا وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُوْنَ ۔

پانچویں بحث یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام سے توبہ کا کیا معنی؟ کیونکہ وہ گناہ صادر ہونے سے معصوم ہوتے ہیں۔ اور گناہ کے بغیر توبہ کا تصور نہیں ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ جنات الابرار سیئات المقربین کے مطابق بہت سی ایسی چیزیں ہیں جو کہ انبیاء علیہم السلام کے حق میں فروگزاشت کا حکم رکھتی ہیں۔ حالانکہ حقیقت میں وہ گناہ قطعاً نہیں ہیں۔ اور یہ ان بلند منصب کا تقاضا ہے۔

نزدیکانرا بیش بود حیرانی

ہم بیشتر عنایت وہم بیشتر عنا

یعنی مقربین کو حیرانی زیادہ ہوتی ہے (کیونکہ انہیں احساس زیادہ ہوتا ہے) ان پر عنایات بھی زیادہ ہیں۔ اور تکلیف بھی زیادہ اسی لیے حدیث پاک میں آیا ہے یا ایہا الناس توبوا الی اللہ فانی اتوب الیہ فی الیوم مأتہ مرۃ یعنی اے لوگو! اللہ تعالیٰ کے حضور توبہ کرو بیشک میں اس کے حضور دن میں سو مرتبہ توبہ کرتا ہوں۔

اور بعض مفسرین نے کہا ہے کہ جب اسلام کی دعا میں اپنی اولاد کو اپنے ساتھ ملایا تو توبہ کی طلب کے لیے بھی متکلم مع الغیر کے صیغے کو لایا گیا' اپنی اولاد کے اشارہ کے لیے کیونکہ خود تو گناہ سے معصوم ہیں۔ اور جب ایک گروہ کے اکثر اشخاص کسی فعل کے مرتکب ہوں اور توبہ کے محتاج ہوں تو مجاز کے بغیر تمام گروہ کے لیے توبہ کی درخواست صحیح ہے۔ اور جب حضرت ابراہیم واسماعیل علیٰ نبینا وعلیہما السلام نے سوچا کہ اُمت کثیرہ کے اسلام کا قیام جو کہ مختلف آراء اور جدا جدا عقلیں رکھتے ہیں۔ اور ان کا ایک وطیرہ اور ایک طریقہ پر چلنے کو لازم کرنے پر اتفاق محالات عادیہ میں سے ہے' بغیر کسی جامع اور غالب کے تو اس اتفاق کو حاصل کرنے اور اس اتفاق کی مدت دراز تک بقاء کے لیے بارگاہِ خداوندی میں ایک اور دعا پیش کی:

رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُوْلًا اے ہمارے پروردگار! ان لوگوں میں ایک رسول بھیج دے۔ لیکن وہ رسول ہماری اولاد سے خارج نہ ہو۔ بلکہ مِّنْهُمْ اسی اُمت میں سے ہوتا۔ کہ

وہ رسول علیہ السلام اور اس کی مقبول اُمت دونوں ہماری اولاد میں سے شمار ہوں اور ہمیں شرف عظیم اور مرتبہ فخیم حاصل ہو۔ کیونکہ اگر اُمت ہماری اولاد میں سے ہو اور وہ اس رسول علیہم السلام کے محتاج ہوں جو کہ ہماری اولاد میں سے نہیں ہے تو ہمارا شرف اور مرتبہ کیا باقی رہا۔ نیز جب وہ رسول (علیہ السلام) اسی اُمت سے ہوگا تو وہ اس کی ولادت' نشو ونما' نسب' حسب' اخلاق' عادات' صداقت' دیانت' عہد اور امانت سے پوری طرح واقف ہوں گے۔ اور اس کی اقتداء اور پیروی میں سرگرم ہو جائیں گے۔ اور اس کی متابعت سے عار محسوس نہیں کریں گے۔ کیونکہ اپنی جماعت کے ایک شخص کی سرداری انکار کرنے والے نفوس والوں پر اتنی دشوار نہیں ہوتی بخلاف اجنبی کی سرداری کے۔ نیز قرابت' رشتہ داری اور مصاہرت اور بہت سے اسباب اس کی امداد و اعانت کے لیے مہیا ہو جاتے ہیں۔ اور اس کی شریعت کو جاری کرنے اور اس کے حکم کو نافذ کرنے میں انتہائی کوشش کرتے ہیں۔ نیز جب وہ اسی اُمت میں سے ہوگا تو ان پر اس کی شفقت زیادہ ہوگی اور انہیں پڑھانے سمجھانے میں مبالغہ کرے گا۔ کیونکہ آدمی کے نزدیک اپنے اقارب اور رشتہ داروں کی تربیت اجنبیوں کی شرکت سے زیادہ ضروری ہے۔ اور آدمی کی اپنی قوم اور قبیلہ پر حرص اور شفقت جبلت کی وجہ سے اجنبیوں پر حرص و شفقت سے زیادہ ہوتی ہے۔

اور اسی لیے حدیث پاک میں وارد ہے کہ اپنی اُمت میں سب سے پہلے میں اپنے اہلِ بیت کی شفاعت کروں گا۔ پھر بنی ہاشم کی۔ پھر قریش میں سے اقرب کی۔ اور حضرت امیر المومنین ذی النورین رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ فرماتے تھے کہ اللہ تعالیٰ کی قسم اگر بہشت کی کنجی میرے حوالے کر دیں تو میں بنی اُمیہ میں سے کسی کو بھی بہشت سے باہر نہ چھوڑوں اور شک نہیں ہے کہ ایسا رسول علیہ السلام جو کہ حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام کی مجموعی اولاد سے مبعوث ہوا ہو سوائے ذات عالی صفات حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اور کوئی نہیں۔ اور نہ ہوا ہے۔ اس لیے کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد میں اس زمانے تک کوئی رسول (علیہ السلام) مبعوث نہ ہوا تھا۔ اور اگر کوئی زید بن عمرو بن نفیل اور قیس بن ساعدہ کے بارے میں نبوت کا احتمال رکھتا ہے تو رسالت کا احتمال تو قطعاً

نہیں رکھتا۔ اور اگر بالفرض وہ رسول بھی ہوتے تو ان کی اُمت مسلمہ تو بالکل نہ تھی۔ اور اگر بالفرض ان کی اُمت مسلمہ بھی ہوتی تو یہ اوصاف تو ان میں بالکل نہ تھے کہ یَتْلُوْا عَلَیْھِمْ آیا تک یعنی ان پر تیری آیات پڑھیں اور آیاتِ الٰہی کا پڑھنا کسی کتاب کے اس پر نزول کے بغیر نہیں ہوسکتا تو چاہیے کہ اس پر کوئی کتاب بھی نازل ہو۔ اگر چہ اس کتاب کی آیات کی تلاوت کی وجہ سے اس کتاب کے الفاظ اس کے شاگردوں کی زبان پر جاری رہیں گے۔ لیکن نعمت پوری نہ ہوگی مگر اس وقت جب اس کتاب کے معنوں پر انہیں مطلع فرمائیں۔

وَیُعَلِّمُھُمُ الْکِتَابَ اور انہیں کتاب کے معنی سکھائیں۔ جو کہ اس کی عبارت کا ظاہری مدلول ہے۔ گویا ان معنوں کا جاننا نفس کتاب کو جاننا ہے۔ اس لیے کہ وہ معانی پورے طور پر واضح اور روشن ہونے کی وجہ سے الفاظ سے جدا نہیں ہیں۔ اور صرف ان الفاظ کو سنتے ہی کسی غور و فکر اور گہرائی کی ضرورت کے بغیر ذہن میں آجاتے ہیں۔ لیکن کتاب کے ان ابتدائی معنوں کو سمجھنا اس کتاب کے اسرار سے باخبر نہیں کرتا تاکہ اس کتاب کے احکام کی لذت پائیں اور پورے ذوق سے اس کتاب کی تعمیل میں سرگرم ہوجائیں۔ پس چاہیے کہ انہیں اس کتاب کے اسرار سے آگاہ فرمائیں۔

وَالْحِکْمَۃَ اور انہیں وہ سر اور حکمت سکھائیں۔ جو کہ اس کتاب کے ہر ہر حکم اور اس کے ہر ہر لفظ میں سپرد کیے گئے۔ اور چھپائے گئے۔ تاکہ وہ علم ظاہر اور علم باطن کے جامع ہوں۔ اس لیے کہ علم باطن، علم ظاہر کے بغیر زندقہ اور لادینیت بن جاتا ہے۔ اور ظاہری علم، علم باطن کے بغیر تقشف اور حیلہ گری کی طرف کھنچتا ہے۔ اور جب پڑھنے پڑھانے کی ایک حد اور منقطع ہونا ہے اس لیے کہ نہ تو ہر چیز کی تعلیم کے لیے معلم کی قوت کفایت کرتی ہے۔ اور نہ ہی متعلم کی قوت ہر ہر نکتہ یاد کرنے کے لیے وفا کرتی ہے۔ پس چاہیے کہ غیب سے علم حاصل کرنے بلکہ علم لینے کے لیے انہیں نبوت صناعی تک پہنچائے جو کہ ولایت ہے۔

وَیُزَکِّیْھِمْ اور ان کے نفوس اور ارواح کی تختی کو ان کدورتوں سے پاک کرے جو کہ معرفت عیانی کا حجاب بن گئی ہیں۔ اور ان کی صلاحیتوں کے آئینہ کو پوری طرح صیقل فرمائے۔ تاکہ جہاں سے اس پیغمبر علیہ السلام کی لوح مدرکہ پر علومِ غیبیہ کے القاء کا خود بخود

پڑھنا پڑھانا ہوتا تھا' ان پر بھی ہو۔ اور اس تربیت کے ساتھ کہ انتہا کو پہنچے' انہیں حقائقِ الٰہیہ کے انکشاف میں اپنی مانند بنائے۔ مگر اسی حد تک کہ وہ نبوت اصلی نہیں رکھتے۔ گویا حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیٰ نبینا وعلیہما السلام نے جان لیا کہ یہ پیغمبر علیہ السلام خاتم المرسلین ہوں گے۔ اور ان کے بعد کوئی رسول نہیں آئے گا تو ناچار ان کی اُمت میں نبوت کا اثر جو کہ ولایت ہے' ہمیشہ ہمیشہ کے لیے باقی رہے تاکہ وہ اُمت ممکنہ حد تک نبوت کے فیض سے خالی نہ رہے۔ بیت

چوں کہ گل رفت و گلستان شد خراب
بوئے گل راازکہ جویم ازگلاب

اس کے باوجود تجھ سے یہ دعا اس لیے مانگ رہے ہیں۔ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ تحقیق تو نہایت عزت والا اور بے نہایت حکمت والا ہے۔ تیری عزت تقاضا نہیں کرتی کہ کسی کو بلاواسطہ علوم کی تعلیم فرمائے۔ اور اس کے ساتھ ہم کلام ہو۔ اور اپنی آیتیں اس پر اُتارے۔ اور تیری حکمت تقاضا کرتی ہے کہ افرادِ بشر میں کسی کو اپنی ذات وصفات کی معرفت اور دنیا و آخرت میں اچھے نظام کو پہچاننے سے محروم نہ چھوڑے۔ پس ان دونوں تقاضوں کا اجتماع اسی صورت میں میسر ہو سکتا ہے کہ ان کے درمیان ایک شخصیت کو اپنی رسالت کے ساتھ خاص کرے۔ اور اس کے واسطہ سے وہ فیض دوسروں کو پہنچائے کہ تیری عزت بھی قائم رہے۔ گی اور تیری حکمت بھی معطل نہ ہوگی۔ بیت

حکمت محض است اگر لطف جہاں آفریں
خاص کند بندۂ مصلحت عام را

یعنی اگر رب العالمین کا لطف و کرم کسی بندے کو خصوصیت سے نوازے تو عین حکمت کے مطابق ہے۔

چند فوائد

یہاں چند فوائد باقی رہ گئے۔ پہلا فائدہ یہ ہے کہ حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیٰ نبینا وعلیہما الصلوٰۃ والسلام نے تعمیر کعبہ کی حالت میں تین دعائیں فرمائیں اور ہر دعا کو ربنا

کے کلمہ سے شروع اور اسمائے حسنیٰ میں سے دو اسماء سے مزین فرمایا۔ سمیع اور علیم کی دعا کی قبولیت کے ساتھ مناسبت کی وجہ بالکل ظاہر ہے۔ اور اسی طرح توبہ اسلام پر ثابت قدمی اور ادائے مناسک کی توفیق کی دعا کے ساتھ تواب اور رحیم کی مناسبت بھی روشن ہے۔ لیکن بعثت رسول علیہ السلام کی دعا کے ساتھ عزیز اور حکیم کی مناسبت پورے طور پر ظاہر نہیں ہے۔ اور اسی لیے اکثر مفسرین نے یہاں مناسبت کے بیان سے خاموشی اختیار فرمائی اور مناسبت کی وجہ اس تفسیر میں گزر گئی۔

دوسرا فائدہ یہ ہے کہ رسول علیہ السلام کے اوصاف میں تلاوت آیات کو تعلیم کتاب پر اور تعلیم کتاب کو تعلیم حکمت پر اور اسے تزکیہ پر مقدم فرمایا اس ترتیب کی رعایت کرنے میں کیا نکتہ ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس ترتیب میں ادنیٰ سے اعلیٰ کی طرف ترقی ہے۔ اس لیے کہ اپنے پیغمبر علیہ السلام سے اُمت کا فائدہ لینا چار مرتبے رکھتا ہے' بعض' بعض سے فوقیت رکھتے ہیں۔ پہلا مرتبہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل فرمائے گئے الفاظ کو ان سے یاد کریں۔ تاکہ وہ تواتر کے ساتھ نقل کیے جائیں۔ اور ان الفاظ کو حفظ کرنے اور ان کی تجوید و ترتیل میں انتہائی کوشش کریں۔ اور یہ نفع حاصل کرنے کا ادنیٰ مرتبہ ہے۔ جو کہ اُمت کے حافظوں اور قاریوں کو میسر ہے۔ اور یہ مرتبہ حاصل کر کے انہیں رسل علیہم السلام اور ان کی وراثت سے کچھ تشبیہ حاصل ہو جاتی ہے۔ اور اسی لیے حدیث شریف میں وارد ہے کہ جس کے سینے میں قرآن پاک یاد ہے **لقد اور جت النبوة بين كتفيه الاانه لايوحي اليه** بیشک اس کے دونوں کندھوں کے درمیان فیض نبوت مندرج ہو گیا مگر اس کی طرف وحی نہیں ہوتی۔ دوسرا مرتبہ یہ ہے کہ الفاظ کے حفظ کے ساتھ ان کے ظاہری معنوں سے بھی آشنا ہو اور اس کے پہلے معنوں کو رسول علیہ السلام سے حاصل کرے۔ اور اس کے احکام' واقعات' وعد اور وعید کی باحسن وجوہ تحقیق کرے۔ اور یہ مرتبہ علمائے ظاہر کا نصیب ہے۔ اور اس مرتبے میں رسل علیہم السلام اور ان کی وراثت کے ساتھ تشبیہ زیادہ اور قوی ہے۔ اور تیسرا مرتبہ یہ ہے کہ ان دو مرتبوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے اسرار اور حکمتوں کو اس کے احکام اور معاملات میں جو کہ دنیا اور آخرت میں نیکوں اور بُروں کے ساتھ فرماتا

ہے۔ اور فرمائے گا' دریافت کرلے اور ہر حکم' ہر واقعہ اور ہر وعدہ و وعید کو اس کے منشا اور اصل کے ساتھ عوالم غیبیہ الٰہیہ اور اس کے کارخانوں کے نظاموں سے وابستہ جانے اور شیون ظاہر کو ان احکام اور معاملات میں ملاحظہ کرے۔ اور یہ مرتبہ انبیاء علیہم السلام کی وراثت کے کسبی مراتب میں سب سے اعلیٰ ہے۔ چوتھا مرتبہ یہ ہے کہ اس کی روح کا ہر عضو پاک اور صاف ہو جائے۔ اور جس مقام سے پیغمبر علیہ السلام نے پانی پیا ہے۔ اسے بھی تابع ہونے کے اعتبار سے کچھ حصہ مل جائے۔ اور یہ شخص نبی کے قائم مقام ہے۔ اور اس کا وارث کامل ہے کہ گویا پیغمبر علیہ السلام کا ظل اور اس کے بعد اس کا نمونہ باقی ہے۔ اور پیغمبر (علیہ السلام) کے وصال کے بعد خلافت اور وصی ہونے کے لائق ہے۔ اور یہ مرتبہ اُمتیوں کے مراتب سے مطلقاً اعلیٰ ہے۔ لیکن وہبی یعنی عطیہ خداوندی ہے اس کے حصول میں کسب کو کوئی دخل نہیں۔ مگر تیار کرنے اور قریب کرنے کے طریقے سے' ان مرتبوں میں پستی سے بلندی کا فرق جتلانے کے لیے اس ترتیب کو اختیار فرمایا گیا۔

تیسرا فائدہ یہ ہے کہ لفظ وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ جو کہ حرف عطف کے ساتھ واقع ہوا اس کا معطوف علیہ کیا چیز ہے؟ اگر لفظ تقبل معطوف علیہ ہے تو جملہ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ اور جملہ ندائیہ ربنا دونوں معترضہ ہوں گے۔ پہلا تعلیل کے لیے اور دوسرا تاکید دعا کے لیے۔ اور اگر اس کا معطوف علیہ محذوف ہے تو کلام کی تقدیر یوں ہوگی ربنا افعل ھذا واجعلنا مسلمین لك اور ربنا وابعث فیھم رسولا کی ترکیب بھی اسی دستور کے مطابق سمجھنا چاہیے۔

ہم یہاں پہنچے کہ اس صورت میں حرف عطف کو لانا جو کہ معطوف علیہ کو مقدر ماننے کی حاجت پیدا کرنے والا ہوا' کیوں ضروری ہوا؟ اس میں نکتہ یہ ہے کہ اس بات کا پتہ چلے کہ ان دعاؤں سے ہماری غرض تینوں مقاصد کو جمع کرنا ہے نہ کہ تنہا ایک ایک مقصد۔

الحکمة کی تفسیر

چوتھا فائدہ یہ ہے کہ حکمت کی تفسیر میں علماء کا اختلاف ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ حکمت سے مراد قول اور عمل کا درست ہونا ہے۔ اور بعض نے کہا ہے کہ حکمت کی حقیقت بقدر طاقت

بشری دربار حضرت حق کے ساتھ مشابہت ہے۔ اور اسی قول کے موافق وہ ہے۔ جو کہ حدیث صحیح میں وارد ہوا کہ تخلقوا باخلاق اللّٰہ اور قتادہ اور امام شافعی سے مروی ہے کہ یہاں حکمت سے مراد سنتِ نبوی ہے۔ جو کہ ارکان شرع میں سے دوسرا رکن اور اصول دین سے عمدہ اصل ہے۔ اور بعض نے کہا ہے کہ کتاب سے مراد آیات محکمات ہیں۔ اور حکمت سے آیات متشابہات اور ہر تقدیر پر تزکیہ کتاب وحکمت کی تعلیم سے جدا چاہیے پس وہ کیا چیز ہے؟ اکثر مفسرین نے کہا ہے کہ تزکیہ سے مراد عادل ہونے کی گواہی ہے۔ جو کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قیامت کے دن اپنی اُمت کے لیے دیں گے' اور دنیا میں بھی صحابہ کرام' اہلِ بیت اور ازواجِ مطہرات رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین اور بعض تابعین کے فضائل ومناقب میں دی ہے۔ اور ظاہر ہے کہ یہ شہادت تلاوت اور کتاب وحکمت کی تعلیم سے جدا ہے۔ یہ ہیں اس مقام پر مفسرین کے اقوال اور جو کچھ اس آیت کے سیاق وسباق کے مناسب تھا' تفسیر میں گزر چکا۔

قصہ مختصر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اس واقعہ سے پیغمبر آخر الزماں کی نبوت کی صحت اور آپ کی اُمت کی مقبولیت پر نص صریح ہے۔ اور اس پر کہ اس پیغمبر علیہ السلام کا مبعوث ہونا اور اس اُمت کا پیدا ہونا ایک ایسی چیز ہے کہ ان دونوں عالی قدر بزرگوں نے پوری آرزو کے ساتھ دربارِ خداوندی سے اس کے گھر کی تعمیر میں مصروف ہونے کے وقت جو کہ بلاشبہ قبولیت دعا کا وقت تھا اس کی درخواست کی ہے۔ اور اسی لیے امام احمد اور بیہقی کثیر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی روایت کے ساتھ لائے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ بے شک میں اُم الکتاب میں اللہ تعالیٰ کے نزدیک البتہ خاتم النبیین تھا حالانکہ حضرت آدم (علیہ السلام) اپنی طینت میں تھے۔ اور میں تمہیں ابتدا کے متعلق خبر دوں گا۔ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی وہ دعا ہوں جبکہ وہ بیت اللہ کی بنیادیں اُٹھا رہے تھے ربنا وابعث فیھم رسولا منھم اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بشارت اور میری والدہ کا وہ مشاہدہ جو انہوں نے دیکھا کہ ان سے نور کا ظہور ہوتا ہے۔ جس کی وجہ سے شام اور بصریٰ کے محلات چمک اُٹھے۔

اور ظاہر ہے کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم' حضرت ابراہیم واسماعیل علیہما السلام کے راز کے حامل ہوتے تو لازم ہوا کہ ان کی ملت ابراہیمی ملت ہو اور اگر یہودیوں کے حق میں اس ملت کے اکثر احکام جیسے مناسک حج اور قربانی منسوخ ہو گئے تھے تو یہودیوں کی استعداد کی کمی کی وجہ سے تھے کہ وہ نرے ظاہر پرست تھے۔ اور اسرار باطنی سے بالکل محروم۔ خصوصاً محبت وفنا کی راہ کو بالکل نہیں پہچانتے تھے۔ طمع اور خوف کے سوا انہیں اللہ تعالیٰ کے احکام کی تعمیل پر اُبھارنے والی کوئی چیز نہ تھی تو لازماً ان کے حق میں احکامِ الٰہی بھی اسی رنگ میں صادر ہوئے۔ جب اہلِ کمال پیدا ہوئے جو کہ ظاہر و باطن کے جامع ہوئے۔ اور ان کے دل محبت' وجد اور شوق کے لائق ہو گئے تو وہ تمام منسوخ احکام لوٹ آئے اور ملت ابراہیمی از سرِ نو قائم ہو گئی۔ پس اس وقت اس پیغمبر علیہ السلام کی ملت سے انحراف اور روگردانی حقیقت میں ملت ابراہیم علیہ السلام سے انحراف اور روگردانی ہے۔

وَمَنْ يَّرْغَبُ اور کون ہے۔ جو کہ کسی دوسری ملت میں رغبت کرے انحراف اور روگردانی کر کے عَنْ مِّلَّةِ اِبْرٰهٖمَ ملت ابراہیم سے۔ جو کہ ملتوں میں سب سے قدیم اور کامل ہے۔ اور ابراہیم علیہ السلام وہی ہیں جن کی طرف منسوب ہونے میں بنی اسماعیل کے تمام فرقوں اور بنی اسرائیل کے اسباط کو فخر اور فضیلت ہے۔ خصوصاً اس وقت جبکہ اس ملت سے وابستگی کی استعداد کامل طور پر جلوہ گر ہو چکی۔ اور وہ پیغمبر علیہ السلام جنہیں ابراہیم علیہ السلام نے نہایت عاجزی اور آرزو کے ساتھ مانگا تھا' مبعوث ہو چکے۔

اِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهٗ مگر وہ شخص جو بے وقوفی کی وجہ سے اپنے نفس کے حال سے ناواقف ہوا' وہ نہ سمجھا کہ میرے نفس میں کون کون سے لطائف آپس میں ملے ہوئے ہیں۔ اور ہر ہر لطیفہ کا کمال کس رنگ سے حاصل ہوتا ہے۔ اور وہ کون سی ملت ہے۔ جو کہ میرے نفس کے کمالات کے اتحاد کی جامع اور میرے نفس کے تمام لطائف کے حق کو پورا کرتی ہے۔ اور محبت وشوق اور فنائے قلب کی راہ جو کہ مقامِ خلت کی سرحد تک پہنچاتی ہے' کس ملت میں کھلی ہے۔ اور کس ملت میں بند ہے۔ اور ملت ابراہیمی سے انحراف بے وقوفی اور اپنے نفس کے حال سے بے خبری کی دلیل کیونکر نہ ہو۔

وَلَقَدِ اصْطَفَيْنَاهُ فِي الدُّنْيَا اور تحقیق ہم نے ابراہیم علیہ السلام کو دنیا میں برگزیدہ کیا ہے تمام نفسانی کمالات عطا فرما کر۔ نبوت' رسالت' ولایت' قیامت تک آپ کی اولاد اور پیروکاروں میں نورِ نبوت کا سرایت کرنا' مرتبہ خلت تک پہنچانا' مناسک حج کا ظاہر کرنا جو کہ جناب حق تبارک وتعالیٰ کے وصال کا نمونہ ہے۔ آپ پر ان مناسک کے اسرار کھولنا۔ قیامت تک امن وعزت کے ساتھ اس گھر کو باقی رکھنا جو کہ آپ نے ہماری عبادت کے لیے بنایا ہے۔ اور آپ کی اولاد اور پیروکاروں میں نبوت اور مختلف ذوق کی ولایات کے سر کے حاملین کا قیامت تک پیدا ہونا۔ یہ ہیں دنیا میں آپ کی بزرگی کے اسباب اور اگر کسی کو آخرت میں اس صاحب ملت کی شفاعت کی امید اتباع ملت پر برانگیختہ کرے تو حضرت ابراہیم علیہ السلام اس امید کے لائق بھی ہیں۔

وَإِنَّهُ فِي الْآخِرَةِ اور تحقیق وہ آخرت میں اگرچہ اس وقت ان کی نبوت' رسالت اور امامت منقطع ہو چکی گی لَمِنَ الصَّالِحِينَ۔ البتہ صالحین میں سے ہیں۔ ان کی خاص ولایت کے ساتھ جو کہ ان کی نبوت اور رسالت سے افضل ہے۔ اگرچہ آپ کی نبوت ورسالت مختلف ولایات سے افضل ہو گی اور اگرچہ آپ کے یہ سب کمالات درجہ بدرجہ اور عمر تک حاصل ہوئے' ہمیشہ ترقی میں تھے۔ لیکن آپ میں ان تمام کمالات کا تخم صرف اسلام نے بویا ہے۔

إِذْ قَالَ لَهُ رَبُّهُ جبکہ اسے اس کے پروردگار نے فرمایا۔ وحی خفی کے ساتھ۔ اس لیے کہ ابھی تک آپ پر وحی ظاہر نہیں آئی تھی۔ اور آپ مبعوث نہیں ہوئے تھے۔ أَسْلِمْ مطیع ہو جا تمام اسمائے الٰہیہ اور اس کے احکام کا۔ ہر زمانے میں جس کے واسطہ سے بھی پہنچے۔ اور اسی حکم کے عین دوران ان کے پروردگار نے انہیں تمام اسماء کے ساتھ جذب فرمایا۔ اور حضرت نے اس جذب قوی کی وجہ سے بے اختیار ہو کر

قَالَ أَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعَالَمِينَ۔ کہا میں مطیع ہوا اپنے تمام قوی' لطائف' جوارح اور اعضاء کے ساتھ رب العالمین کے لیے جس کے اسماء میں سے کوئی اسم ہر عالم میں ظہور فرما کر اس کی تربیت فرماتا ہے۔ پس کمال کے طالب کو اپنا مطلب حاصل کرنے میں اس کا

توسل کافی ہے۔ اور روح ابراہیمی میں تمام مطلوبہ کمالات کی وسعت سپرد کی گئی ہے۔ طالبان حق میں سے کسی کو بھی آپ کی ملت کی پیروی اور آپ کے مشرب کی اقتداء سے گریز نہیں ہے۔

اور جب اسلام کا معنی جس کا حضرت ابراہیم علیہ السلام کو امر فرمایا گیا اس تفسیر سے معلوم ہوا جو کہ عرفی اسلام سے جدا ہے۔ اور انسانی کمالات کا منتہا ہے۔ تو اس آیت میں مفسرین کو جس اشکال نے حیرت میں ڈال دیا ہے' زائل ہو گیا۔ اور اس اشکال کی صورت یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لیے اسلام لانے کا حکم نبوت کے اعلان سے پہلے درست ہوتا ہے نہ اعلان نبوت کے بعد۔ اس لیے کہ انبیاء علیہم السلام ہمیشہ مسلمان ہوتے ہیں۔ اور کفر تبعی یعنی خاندان کی پیروی سے ان پر حکم کفر جائز نہیں۔ جیسا کہ دوسرے کافروں کے لیے جائز ہے۔ اور بد اعتقادی سے معصوم ہیں۔ تو انہیں اسلام کا حکم تحصیل حاصل اور ثابت شدہ کو ثابت کرنا ہے۔ اور تفاسیر میں اس اشکال کا جواب چند وجوہ سے مذکور ہے۔ پہلی وجہ یہ کہ اس اسلام سے مراد متعارف اسلام نہیں بلکہ کفار کی جفا کر برداشت کرنے میں حکم خداوندی کی اطاعت کا اقرار کرنا ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ یہ کلام بطور مثال ہے' بطور تحقیق نہیں۔ اس لیے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دل میں اپنی قدرت کی علامات اور اپنی وحدانیت کے دلائل ظاہر کرنا بمنزلہ اس قول کے تھا کہ اسلم اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ذات وصفاتِ الٰہی کا عارف ہونا بمنزلہ اس قول کے ساتھ کہ اسلمت۔

اور اصولیوں کے محققین نے ایک اور وجہ کہی ہے۔ جو کہ تیسری وجہ ہے۔ اور اس کا خلاصہ یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام اگرچہ کفر تبعی اور اعتقادی سے صغرسنی اور کبرسنی میں قطعاً معصوم ہوتے ہیں۔ اور خلقتاً اسلام کے ساتھ موصوف۔ لیکن وہ ذمہ داری اور ابتلاء جو کہ اوامر و نواہی کے وارد ہونے پر ثابت ہوتی ہے' وہ ان اوامر اور نواہی کے وارد ہونے پر موقوف ہے۔ پس اسلم سے مراد یہی تکلیفی اور ابتلائی اسلام ہے۔ جو کہ اس امر کے متوجہ ہونے پر موقوف تھا۔ اور یہ تحصیل حاصل کے قبیلے سے نہیں۔

نیز اس تفسیر میں جو کچھ گزرا اس سے ایک اور اشکال زائل ہو گیا جس کے جواب میں

جمہور مفسرین بھی مضطرب ہیں اس کی صورت یوں ہے کہ اذ کا کلمہ ظرف ہے۔ اور از روئے معنی اس کا اصطفاء سے تعلق درست نہیں آتا۔ اس لیے کہ اصطفاء کسی وقت کے ساتھ مقید نہیں ہوتا۔ اور اگر مقید ہوتا تو اس وقت کے ساتھ مقید نہیں ہوسکتا۔

اور اس اشکال کے جواب کا خلاصہ یہ ہے کہ اصطفاء اگرچہ ہمیشہ ہے۔ لیکن بعض اوقات اس کے آثار سب پر حاصل ہو جاتے ہیں۔ پس اس کا کسی وقت کے ساتھ مقید ہونا کہ اس وقت اس کے ظہور کی ابتدا ہوئی ہو اس کے دوام کے خلاف نہیں۔ جیسا کہ کہتے ہیں کہ زید شجاع فی المعرکہ یعنی زید معرکہ کے وقت بہادر ہے' عمرو بحر فی المدرسة عمرو مدرسہ میں علم کا سمندر ہے' بکر کریم فی المعاملة' بکر معاملے میں کریم ہے۔ اور اگر کلمہ اذ کو فعل محذوف کا ظرف قرار دیں یا قال کے متعلق کریں تو یہ اشکال وارد نہیں ہوتا۔ اور اس کے جواب کی ضرورت نہیں رہتی۔

حاصلِ کلام یہ ہے کہ اس آیت سے ثابت ہوا کہ ملتِ ابراہیمی اس قبیل سے نہیں کہ کوئی اس سے روگردانی کرے۔ اور پہلو تہی کرے۔ اور اگر اس ملت کے منکر خصوصاً یہود و نصاریٰ کہیں کہ ہمارے نزدیک بھی یہ بات مسلم ہے کہ ملت ابراہیمی سب ملتوں سے کامل اور ان سے افضل ہے۔ اور تمام ملتوں سے زیادہ کمالات انسانیہ کی جامع ہے۔ لیکن یہ ملت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ خاص تھی جو کہ اوج کمال کو پہنچے ہوئے تھے۔ اور مقام خلت سے مشرف یا ان کی اولاد سے عالی قدر انبیاء علیہم السلام کے ساتھ خاص تھی۔ عوام کو حق نہیں کہ اس ملت کی پیروی کریں۔ اس لیے کہ کمالات کو جمع کرنے کی یہ نوع ان کی استعداد کے دائرہ سے خارج ہے۔ جس طرح کے کسی کو حق نہیں پہنچتا کہ انبیاء علیہم السلام کے ساتھ مخصوص عادات میں ان کی اقتداء کریں۔ جیسا کہ چار سے زیادہ عورتوں کے ساتھ نکاح کرنا اور اس کی مانند دوسرے معاملات۔ پس دوسروں کے حق میں وہ ملت لازم العمل نہیں ہے۔
ان کے جواب میں کہنا چاہیے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام جس طرح اس ملت پر خود عمل فرماتے تھے اسی طرح اپنی اولاد اور پیروکاروں کو بھی ملت کے ساتھ مکلف فرماتے تھے تو معلوم ہوا کہ یہ ملت ان کی مخصوص چیزوں میں سے نہ تھی بلکہ جس طرح آپ نے اپنی حیاتِ

ظاہری میں اس ملت کا حکم دیا تھا' وفات کے بعد بھی اسی ملت کا امر فرمایا ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بیٹوں کی تفصیل

وَوَصّٰى بِهَآ اِبْرٰهٖمُ بَنِيْهِ اور آپ اسی ملتِ ابراہیم کا حکم فرما گئے ہیں' اپنے بیٹوں کو۔ جو کہ آٹھ (۸) تھے' ان میں سب سے بڑے حضرت اسماعیل علیہ السلام ہیں۔ اور آپ کی والدہ حضرت ہاجرہ قبطیہ (رضی اللہ عنہا) ہیں۔ اور حضرت اسحاق علیہ السلام اور ان کی والدہ حضرت سارہ (رضی اللہ عنہا) ہیں جو کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے چچا ہاران کی بیٹی تھیں۔ اور یہ دونوں عالی قدر پیغمبر تھے۔ اور چھ دوسرے یقطن کی دختر قنطورا کنعانیہ کے شکم سے تھے۔ جو کہ خالص عربوں کی نسل سے تھی۔ اور وہ چھ (۶) مدین' مدائن' یقنان' زموان' اسبق اور شوخ تھے۔ جو کہ پیغمبر نہ تھے۔ تو معلوم ہوا کہ وہ ملت حضرت ابراہیم علیہ السلام پر بھی اور آپ کے غیروں پر بھی' آپ کی موجودگی میں بھی اور آپ کے وصال کے بعد بھی واجب العمل تھی۔

اور ابن سعد کلبی نے سے روایت کی ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حضرت اسماعیل علیہ السلام کو مکہ معظمہ میں سکونت پذیر کیا۔ اور ان کی نسل وہاں جاری رہی۔ اور حضرت اسحاق علیہ السلام کو اپنے ساتھ کنعان میں ساکن رکھا۔ اور مدین کو شہر مدین میں جو کہ اسی کے نام سے ملقب تھا۔ اور اس کی اولاد بھی وہیں تھی۔ اور حضرت شعیب علیہ السلام اسی کی اولاد سے ہیں۔ جبکہ مدائن اور دوسرے بیٹوں کو شام اور روم کے شہروں میں پھیلا دیا۔ لیکن یقنان کی اولاد آخر میں مکہ شریف آ گئی اور وہ حضرت اسحاق علیہ السلام کی اولاد کے ساتھ مل گئے۔ اور دوسرے بیٹوں کی اولاد شام کے شہروں میں متفرق رہے۔ دوسرے بیٹوں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی خدمت میں عرض کی کہ آپ نے حضرت اسماعیل علیہ السلام کو خدا کے گھر کے پڑوس میں جگہ دے دی اور حضرت اسحاق علیہ السلام کو اپنے پاس رکھا جبکہ ہم سب کو جدا کر کے غربت اور وحشت کی زمین میں پھینک دیا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا کہ میں مجبور ہوں' مجھے دربارِ خداوندی سے اسی طرح حکم ملا ہے لیکن میں تم میں سے ہر ایک کو اسمائے الٰہی میں سے ایک اسم کی تعلیم دوں گا۔ جو کہ حل

مشکلات اور طلب حاجات میں کافی ہوگا۔ پس آپ نے ان میں سے ہر ایک کو اسمائے الٰہی میں سے ایک اسم کی تعلیم دی۔ کہ قحط کے وقت اس اسم کے ساتھ دعا کرتے تھے تو بارش آ جاتی تھی۔ اور دشمنوں سے مقابلہ کے وقت اس اسم کا توسل لیتے تھے تو فتح پاتے تھے۔ اور ملت کی پیروی صرف حضرت ابراہیم علیہ السلام کی صلبی اولاد کے ساتھ خاص نہ تھی بلکہ

یعقوب علیہ السلام کے بیٹوں کی تفصیل

وَيَعْقُوْبَ اور یعقوب علیہ السلام نے بھی۔ جو کہ حضرت لوط علیہ السلام کی دختر سے حضرت اسحاق علیہ السلام کے بیٹے تھے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پوتے تھے اسی طرح اپنے بارہ (۱۲) بیٹوں کو۔ جو کہ روبین جنہیں روبیل بھی کہتے ہیں، شمعون، لاوی اور یہودا تھے۔ لایان کی دختر لیا کے شکم سے جو کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کے ماموں ہوتے تھے، اور یوسف علیہ السلام اور بنیامین راحیل کے شکم سے جو کہ لایان کی دوسری دختر تھی۔ زیتون، یشاخر، دان، نفتالی، کاد اور انتر جو کہ کنیزوں کے شکم سے تھے، وفات کے وقت مصر میں جمع کر کے فرمایا

يَابُنِیَّ اے میرے بیٹو! اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰى لَكُمُ الدِّيْنَ تحقیق تمہارے لیے حق تعالیٰ نے اس دین کو برگزیدہ کیا ہے۔ جو کہ اسلام ہے گویا اس کے سوا دین ہے ہی نہیں۔ اور جو اعتقاد اور عمل اس کے خلاف ہوگا، مقبول نہیں۔

فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ پس چاہیے کہ تم نہ مرو مگر اس حالت میں کہ تم اسلام پر قائم ہو اور ظاہر ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام، بنی اسرائیل کے جدامجد تھے۔ اور آپ نے اپنی اولاد کو یہودیت و نصرانیت کی وصیت نہ فرمائی بلکہ احکام الٰہی کی اطاعت اور تعمیل کی جو کہ ہر زمانے میں ہر پیغمبر علیہ السلام کی زبان پر جس رنگ میں ظاہر ہوں۔

جواب طلب سوال

یہاں ایک جواب طلب سوال باقی رہ گیا۔ اور وہ یہ ہے کہ موت اضطراری امور میں سے ہے۔ اور نہی کے لیے چاہیے کہ امور اختیاری کے ساتھ متعلق ہو۔ اس کلام میں موت

سے نہی کس طرح واقع ہوئی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ مطلق موت سے نہی نہیں ہے۔ بلکہ اسلام کے سوا کسی دوسری حالت میں موت سے نہی ہے گویا یہ نہی حالتِ اسلام پر قائم دائم رہنے کا امر ہے۔ تاکہ اس حالت کے علاوہ کسی دوسری حالت میں موت نہ آئے جیسا کہ کہتے ہیں کہ لاتصل الاوانت خاشع کہ یہ نماز سے نہی نہیں بلکہ نماز میں خشوع کا حکم ہے۔ اور صحاح میں جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ کی روایت سے آیا کہ میں نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سنا کہ وصال مبارک سے تین روز پہلے آپ فرمارہے تھے لایموتن احدکم الا وھو یحسن الظن بربہ یعنی نہیں چاہیے کہ تم میں سے کوئی مرے مگر اس حالت میں کہ اپنے پروردگار کے ساتھ اچھا گمان رکھتا ہو اور اس کے عفو، کرم اور رحمت کو نصب العین بنائے ہوئے ہو۔

تفاسیر میں لکھا ہے کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے کے یہودیوں نے حضرت ابراہیم صلوٰت اللہ وسلامہ علیٰ نبینا وعلیہ اور حضرت یعقوب علیہ السلام کی وصیت کا قصہ سنا تو انہوں نے کہا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی وصیت کا تو ہمیں علم نہیں کہ کس چیز کے متعلق تھی۔ لیکن حضرت یعقوب علیہ السلام بنفس نفیس اس جہان سے نہیں گئے۔ یہاں تک کہ آپ نے اپنے بیٹوں کو دین یہودیت کی وصیت فرمائی۔ حق تعالیٰ نے ان کے جواب میں فرمایا کہ تم حضرت یعقوب علیہ السلام پر جو کہ پیغمبر تھے، صحیح سند کے بغیر ایک چیز کا دعویٰ کرتے ہو؟

اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَآءَ کیا تم حاضر اور گواہ تھے اِذْ حَضَرَ يَعْقُوْبَ الْمَوْتُ اس وقت جب کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کی وفات کا وقت قریب ہوا خصوصاً اِذْ قَالَ لِبَنِيْهِ جبکہ آپ نے اپنے بیٹوں سے فرمایا مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْۢ بَعْدِيْ کہ میرے بعد کس چیز کی عبادت کرو گے؟ اور اس پوچھنے سے آپ کا مقصد یہ تھا کہ ان کے بیٹے ان کے حضور توحید کا اقرار کریں۔ اور آپ اس اقرار پر ان سے پختہ عہد و پیمان لیں۔ چنانچہ آپ کے بیٹوں نے آپ کا مقصد سمجھ کر

قَالُوْا نَعْبُدُ اِلٰهَكَ کہا کہ ہم آپ کے معبود کی عبادت کریں گے جس کے پاک

اوصاف ہم نے آپ کی زبان مبارک سے سُن رکھے ہیں۔ اور ہم نے قطعی دلائل کے ساتھ اس کے اوصاف کو پہچانا ہے۔ اور وہ آپ کا معبود صرف آپ کے خیال کا بنایا ہوا یا ہم کا تراشا ہوا نہیں ہے۔ بلکہ وہ معبود تمام حق پرستوں کا معبود ہے۔ اور اسی لیے ہم کہتے ہیں

وَاٰلٰهَ اٰبَاءِ كَ اور ہم آپ کے آباء کے معبود کی عبادت کریں گے۔ لیکن وہ آباء نہیں جو کہ مشرک ہو گزرے ہیں۔ اور معرفت ذات سے دُور جا پڑے جیسے آزر بلکہ اِبْرٰاهِيْمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰاقَ جب حضرت یعقوب علیہ السلام کے بیٹوں نے یہ خطرہ محسوس کیا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ اضافت کے متعدد ہونے کی وجہ سے مضاف کے تعدد کا وہم پیدا ہو جائے کہنے لگے اِلٰهًا وَّاحِدًا یعنی ہم عبادت کریں گے اس معبود کی جو کہ ایک ہے۔ جو کہ کسی طور بھی متعدد نہیں۔ اور عبادت کا بھی ہم ایک طور یا ایک طریقے پر التزام نہیں کریں گے بلکہ اس امر میں بھی حکم الٰہی کی پیروی کریں گے۔

وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ اور ہم سب اس کے لیے اس کے حکم کی اطاعت کرتے ہیں۔ اور جس زمانے میں بھی جس پیغمبر علیہ السلام کی زبان کے ذریعے آئے اسے واجب القبول جانتے ہیں۔ اور اس کے مقابلے میں اپنے پرانے طریقے کے مطابق کوئی ضد اور جھگڑا نہیں کرتے۔

اور اے اہلِ کتاب اگرچہ تم ان بزرگوں کی اولاد سے ہو لیکن تم میں ان کی اس اطاعت کا کوئی حصہ بھی نہیں ہے۔ تمہیں حق نہیں پہنچتا کہ ان کی اس اطاعت پر فخر و مباہات کرو اور اپنے آپ کو ان کی طرف منسوب کر کے بزرگی اور فضیلت ثابت کرو اس لیے کہ

تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ یہ ایک ایسی جماعت تھی جو کہ گزر گئی اور ان کی وصیت کا تم میں کوئی اثر باقی نہیں ہے۔ لَهَا مَا كَسَبَتْ اس جماعت کے لیے وہ کچھ ہے جو کچھ وہ کسب کر کے چلے گئے اعتقادات' اعمال اور اخلاق سے وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ اور تمہارے لیے وہ کچھ ہے جو تم کسب کرتے ہو۔ اور تمہیں ان کی طرف منسوب ہونا قطعاً مفید نہیں۔ اس لیے کہ

وَلَا تُسْئَلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ اور تم سے سوال نہیں کیا جائے گا اس کے متعلق جو کہ وہ عمل کرتے تھے۔ اگرچہ بالفرض انہوں نے گناہ کیے ہوں تو اسی طرح ان کی نیکیاں

بھی تمہیں نفع نہ دیں گی جبکہ تم ان کی وصیت پر قائم نہیں رہے ہو۔ تفاسیر میں مروی ہے کہ جب حضرت یعقوب علیہ السلام مصر میں داخل ہوئے تو آپ نے دیکھا کہ وہاں کے لوگ مذہب کا اختلاف رکھتے ہیں بعض بت پرست ہیں' بعض ستارہ پرست اور بعض آتش پرست۔ آپ کو خطرہ ہوا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ میری اولاد ان لوگوں کی صحبت سے گمراہ ہو جائے۔ اسی وجہ سے اپنی وفات کے وقت آپ نے سب کو جمع کر کے اس قسم کا اقرار کرایا اور آپ کے لڑکوں کے اقرار کا خلاصہ یہی تھا کہ اپنے معبود کو مخلوقات میں حلول سے پاک جان کر عبادت کے انداز کو اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق ہر زمانے میں جس رنگ میں آئے' بجالائیں گے۔ اور ملتِ حنفیہ کا خلاصہ یہی ہے۔ جو کہ یہودیت و نصرانیت کے تعصب سے کوسوں دُور ہے۔ اور اسی کا نام اسلام ہے۔ پس یہ دعویٰ کرنا کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنے بیٹوں کو یہودیت کی وصیت فرمائی ہے' انبیاء علیہم السلام پر نرا افتراء ہے۔

چند فوائد

یہاں چند فوائد باقی رہ گئے۔ پہلا فائدہ یہ ہے کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام' حضرت یعقوب علیہ السلام کے آباء سے نہ تھے' انہیں حضرت یعقوب علیہ السلام کے باپوں میں سے کیوں شمار کیا گیا۔ بلکہ حضرت اسحاق علیہ السلام سے پہلے ذکر کیا گیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام اگرچہ حقیقی باپ نہ تھے۔ لیکن حضرت یعقوب علیہ السلام کے چچا ہوتے تھے۔ اور چچا کو باپوں کے زمرہ سے شمار کرنا مجاز متعارف ہے۔ جیسا کہ خالہ بمنزلہ ماں کے ہے۔ اسی لیے حدیث پاک میں آیا الخالة بمنزلة الام۔ نیز حدیث پاک میں وارد ہے کہ اکرموا العباس فانه بقية آبائي یعنی حضرت عباس رضی اللہ عنہ کی تعظیم کرو اس لیے کہ وہ میرے آباء کا بقیہ ہیں۔ نیز حدیث پاک میں وارد ہے کہ عم الرجل صنو ابيه یعنی ایک شخص کا چچا اس کے باپ کا ہمسر ہے۔ جو سلوک باپ سے کرنے کا ہے اس کے ساتھ بھی کیا جائے۔

دوسرا فائدہ یہ ہے دادا کو باپ کہنا حقیقت ہے۔ یا مجاز' امام شافعی رحمتہ اللہ علیہ کے نزدیک مجاز ہے۔ اس لیے فرماتے ہیں کہ حقیقی بھائی' بہن' دادا کے ساتھ وارث ہوتے

ہیں۔ اور امام مالک' امام ابو یوسف اور امام محمد رحمتہ اللہ علیہم کا مذہب بھی یہی ہے۔ اور ان کی دلیل حضرت امیر المومنین مرتضیٰ علی کرم اللہ وجہہ الکریم' عبداللہ بن مسعود اور زید بن ثابت رضی اللہ عنہم کا قول ہے۔ جبکہ امام اعظم رحمتہ اللہ علیہ کے نزدیک حقیقت ہے۔ اور اسی لیے حقیقی بھائی' بہن' دادا کے ہوتے ہوئے وارث نہیں ہوتے' سارا مال باپ کی طرح دادا لے گا اور آپ کی دلیل حضرت امیر المومنین ابوبکر صدیق' حضرت عائشہ' حضرت ابن عباس' حسن بصری طاؤس اور عطا کا قول ہے۔ لیکن اس آیت سے لفظ اب کا جد میں حقیقت ہونا ثابت نہیں کیا جا سکتا جیسا کہ بعض حنفیہ ثابت کرتے ہیں۔ اس لیے کہ یہاں آباء کا اطلاق حضرت اسماعیل علیہ السلام کے ذکر کی دلیل سے بلاشبہ مجازی ہے۔

تیسرا فائدہ یہ ہے کہ فرقہ تعلیمیہ نے کہا ہے کہ معرفتِ الٰہی میں تقلید رسول بھی کفایت کرتی ہے۔ اس لیے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کے بیٹوں نے ذات پاک الٰہی کے اوصاف میں اس کے سوا کچھ نہیں کہا کہ آپ کا معبود اور آپ کے آباء کا معبود ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ انہیں معرفتِ الٰہی دلائل کی رو سے حاصل تھی۔ لیکن چونکہ یہاں حضرت یعقوب علیہ السلام کے دل کی تسلی مقصود تھی اس لیے اس صفت پر اکتفاء کیا تا کہ آپ کا دل مطمئن ہو جائے کہ میرے اور میرے آباء کے طریقے پر قائم رہیں گے۔ اور بعض اہلِ کلام نے کہا ہے کہ اس عبادت کا معنی یہ ہے کہ **نعبد الا له الذی دل علیه وجودك ووجود آبائك كقوله اعبدوا ربكم الذی خلقكم والذين من قبلكم** یعنی ہم اس معبود کی عبادت کرتے ہیں جس پر آپ کا اور آپ کے آباء کا وجود دلالت کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کی مانند کہ آپ اس رب کی عبادت کرو جس نے تمہیں۔ اور تم سے پہلوں کو پیدا فرمایا۔ اور تحقیق یہ ہے کہ معرفتِ الٰہی کی دلیل ہر شخص کی نسبت سے جدا ہے۔ اگر کوئی کسی شخص کے بارے میں اس کے عادات و اطوار' کمال صداقت اور درستگی' عقل و فراست وافر' تجربہ اور رائے صحیح ہونے کو دیکھ کر معتقد ہو جائے کہ صرف اس کے کہنے کو ہی دلیل قوی خیال کرتا ہے تو حقیقت سے دور نہیں۔ اور تعلیمیہ کی مراد یہی ہے۔ تو ان سے لفظی نزاع ہے۔ اس لیے کہ یہ تقلید اصل میں تحقیق ہے۔ تقلید یہ ہے کہ

دلیل کے بغیر کسی کی اتباع کرے ورنہ انبیاء علیہم السلام کے بارے میں اتباع فرض ہے جن کی سچائی معجزات اور خوارق سے، عادات و اخلاق کی درستی اور خطاء و کذب سے پرہیز اظہر من الشمس ہوتی ہے۔ اور تقلید کے باب سے نہیں۔ اور عجیب بات یہ ہے کہ ملت ابراہیم علیہ السلام کے کمال اور آپ کے فضائل کا اعتراف اور اقرار کرنے کے باوجود اہلِ کتاب اس ملت کی پیروی کو ہدایت ہرگز نہیں سمجھتے بلکہ گمراہی قرار دیتے ہیں۔ کیونکہ انہوں نے ہدایت کو اس ملت کے غیر میں منحصر مانا ہے۔

وَقَالُوْا اور اہلِ کتاب نے یعنی یہود و نصاریٰ نے مسلمانوں کو بطریق تقسیم کہا کہ کُوْنُوْا هُوْدًا یہود کے مذہب پر رہو اور یہ یہود کا مقولہ ہے۔ اَوْ یا کہا کہ رہو نصاریٰ۔ اور یہ نصاریٰ کا مقولہ ہے۔ تو ان میں سے ہر فرقہ کہتا ہے کہ ہماری راہ اختیار کرو تاکہ تَهْتَدُوْا تم راہ پاؤ اور ہدایت حاصل کرو۔ اس لیے کہ ہدایت ہماری راہ میں منحصر ہے۔ قُلْ آپ ان کے جواب میں فرمائیں کہ ہدایت تمہاری راہ میں منحصر نہیں ہے۔ بَلْ بلکہ ہم اتباع کریں گے مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ ملت ابراہیمی کی۔ جو کہ یہودیت اور نصرانیت سے زیادہ کامل ہے۔ اور انواع ہدایت کی زیادہ جامع خصوصاً ابراہیم علیہ السلام کی یہ صفت کہ آپ تھے حَنِيْفًا کل ماسوا سے ہٹ کر خدا تعالیٰ کی طرف متوجہ اور یہودیت و نصرانیت میں غیر خدا کی طرف ناجائز میلان بہت ہے۔ کبھی عزیز علیہ السلام کی طرف، کبھی مسیح علیہ السلام کی طرف اور کبھی اپنے پیشواؤں کی سچائی اور درستی کی تحقیق کیے بغیر ان کی طرف جھکتے ہیں۔ اور ان پیشواؤں کے احکام خدا تعالیٰ کے احکام کی مانند سمجھتے ہیں۔ جیسا کہ دوسری آیت میں صراحت سے بیان فرمایا۔ اتخذوا احبارهم ورهبانهم اربابا من دون اللّٰهِ والمسيح بن مريم وما امروا الا ليعبدوا الٰهًا واحدا لا اله الا هو سبحانه عما يشركون (التوبۃ آیت ۳۱) حالانکہ ابراہیم علیہ السلام ان تمام وجوہ شرک و کفر سے مبرا تھے۔

وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ اور ابراہیم علیہ السلام مشرکوں میں سے نہ تھے نہ عبادت میں نہ تخلیق و تدبیر میں۔ اور نہ حلال و حرام قرار دینے میں۔ جبکہ تم سب حضرت عزیر اور مسیح (علیہم السلام) کو عبادت میں اللہ تعالیٰ کا شریک ٹھہراتے ہو۔ اور تخلیق و تدبیر میں اپنے

اسلاف کو شریک کرتے ہو۔ اور تم عقیدہ رکھتے ہو کہ تمہارے اسلاف اللہ تعالیٰ کی مرضی کے خلاف ہمیں فتح و نصرت دیتے ہیں۔ اور روزی پہنچاتے ہیں۔ اور اولاد دیتے ہیں۔ اور آخرت میں اپنی طاقت سے عذاب سے بچائیں گے۔ نیز جادو میں جنوں کی ناپاک روحوں سے مدد مانگتے ہو۔ اور ارواح کواکب کو مدبر مانتے ہو۔ حلال و حرام قرار دینے میں اپنے پیشواؤں' احبار اور راہبوں کو اس کا شریک ٹھہراتے ہو۔ اور ان کی حلال و حرام قرار دی گئی چیزوں کو خدا تعالیٰ کی حلال و حرام قرار دی گئی چیزوں کی مانند سمجھتے ہو اور کتاب کی نصوص اس کے خلاف پانے کے باوجود ان کی تقلید نہیں چھوڑتے ہو۔

چند بحثیں

یہاں چند بحثیں باقی رہ گئیں۔ پہلی بحث یہ ہے کہ ملت ابراہیم علیہ السلام اصول و فروع میں پیغمبر آخر الزماں صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ملت کے بعینہٖ مطابق ہے یا دونوں اصول میں متفق ہیں۔ جیسے توحید' نبوت' معاد' غسل جنابت' ختنہ اور مکارم اخلاص کے اصول صبر' قضا پر راضی ہونا۔ اور اللہ تعالیٰ کے حکم کے لیے سامنے سر تسلیم خم کرنا۔ اور اس قسم کے دوسرے امور اور فروع میں مختلف ہیں اگر پہلی شق کو اختیار کریں تو لازم آتا ہے کہ آخر الزمان پیغمبر علیہ السلام نئی شریعت والے نہ ہوں اور بنی اسرائیل کے انبیاء علیہم السلام کی طرح جو کہ دین موسیٰ علیہ السلام کو رائج کرنے والے تھے' آپ بھی سابقہ دین کو رائج کرنے والے ہوں اور یہ امر صریح طور پر باطل ہے۔ اور اگر دوسری شق کو اختیار کریں تو ملت ابراہیمی کی پیروی کا کیا معنی جن کا قرآن پاک میں جگہ جگہ حکم فرمایا گیا ہے۔ اس لیے یہودیت' نصرانیت اور اسلام تینوں ملتیں ان اصولوں میں متفق ہیں۔ بلکہ تمام شریعتوں کے اور ملتوں کے اصول میں اتفاق رکھتی ہیں اس دلیل سے کہ شرع لکم من الدین ماوصّٰی به نوحا والذی اوحینا الیك وما وحینا به ابراهیم و موسٰی و عیسٰی ان اقیموا الدین ولا تتفرقوا فیه (الشوریٰ آیت ۱۳) نیز اس سورت میں لازم آتا ہے کہ یہ پیغمبر علیہ السلام اور یہ اُمت بھی فروع میں ملت ابراہیمی سے منحرف ہوں۔ اس لیے کہ ایک ملت کے اصول کا اعتراف ساری ملت کے اعتراف کا موجب نہیں ورنہ یہود و نصاریٰ بھی

ملت ابراہیمی کے تابع ہوں اس بحث کے جواب میں علمائے محققین نے دو مسلک اختیار کیے ہیں۔ اکثر محققین نے کہا ہے کہ ان دو ملتوں کا اصول میں اتفاق ہے۔ لیکن جس طرح عقائد کو اصول کہتے ہیں اسی طرح شریعت کے ان قواعد کلیہ کو بھی کہتے ہیں جن سے مسائل جزئیہ نکالے جاتے ہیں۔ نیز کہتے ہیں کہ ملت ابراہیمی کے اصول شریعت مصطفویہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والتحیہ میں اس معنی کے ساتھ بعینہ محفوظ ہیں' ان میں کوئی فرق نہیں۔ اگر ان میں سے نکالے ہوئے فروع میں مصلحت زمانے کے مطابق کوئی فرق ہو تو کوئی حرج نہیں مثلاً تہذیب نفس میں افراط و تفریط کے بغیر سہولت' آسانی اور اعتدال کی راہ چلنا' معاش اور معاد دونوں کے نظام کی مصلحتوں کی رعایت کرنا' عبادت' عادات' اعیاد اور رسموں میں کسی مقام اور کسی مدت کی مشکل پابندیاں نہ لگانا اور قوائے طبعیہ میں سے کسی قوت کو باطل کرنے اور نوع انسانی کی ہمیشہ کی عادتوں میں سے کسی عادت کو بدلنے سے پرہیز کرنا اس شریعت کے ہر حکم میں ملحوظ ہے اور ملت کی اتباع کا معنی یہی ہے نہ کہ جزوی فروع کو بعینہ باقی رکھا جائے۔ بلکہ تحقیق کے مطابق ملت انہیں ملحوظ قواعد کا نام ہے نہ کہ جزوی فروع کا۔ اسی لیے ہم کہتے ہیں کہ ہماری ملت حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ملت ہے۔ اور ہم یہ نہیں کہتے کہ ہمارا دین' آئین اور شریعت حضرت ابراہیم علیہ السلام کا دین' آئین اور شریعت ہے۔ اس لیے کہ شریعت' دین اور آئین میں فروع کا لحاظ بھی ہوتا ہے۔ اور وہ فروع بعینہ محفوظ نہیں ہیں۔

اور اس اتباع کی عام فہم مثال یہ ہے کہ حضرت امام اعظم رحمتہ اللہ علیہ کے دونوں شاگرد جو کہ صاحبین ہیں یعنی امام ابو یوسف اور امام محمد' اجتہاد اور استنباط کی روش میں اپنے امام کے تابع ہیں۔ اور مسائل نکالتے وقت ان کے قواعد کی رعایت کرتے ہیں۔ اور اسی لیے ان کا اجتہاد حضرت امام شافعی رحمتہ اللہ علیہ کے اجتہاد سے جدا ہے۔ اور امام شافعی رحمتہ اللہ علیہ کو کوئی بھی حضرت امام اعظم رحمتہ اللہ علیہ کا تابع نہیں کہتا اور اس کے باوجود قواعد سے نکالی گئی فروع میں اپنے امام کی مخالفت کرتے ہیں۔

اسی طرح شریعت مصطفویہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والتسلیمات کو جاری فرمانے والے نے دستور ابراہیمی اور قانون حنیفی کو یہ شریعت عطا کرنے کے وقت ملحوظ رکھ کر اسی قانون پر بنایا

ہے۔اگر چہ بعض جگہ اس وقت کی فروعی جزئیات اس وقت کے جزئیات کے خلاف واقع ہوئی ہوں اسی لیے ایک اور آیت میں ارشاد ہوا ان اولی الناس بابراھیم للذین اتبعوہ وھذا النبی والذین آمنوا (آل عمران آیت ۶۸) اور اس جواب کا خلاصہ یہ ہے کہ ملت اور شریعت میں فرق ہے۔پس ہماری ملت حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ملت ہے۔اور ہماری شریعت' شریعت محمدی ہے۔اور ہم ملت ابراہیمی کی اتباع کے پابند ہیں نہ کہ ان کی شریعت کے جبکہ یہود و نصاریٰ کو ان کی استعداد کے مطابق دربارِ خداوندی سے دوسری شریعتیں عطا ہوئیں۔جو کہ ملت ابراہیمی کی روش پر نہ تھیں اور قواعد ملت ابراہیمی پر ان کی استعداد کے قاصر ہونے کی وجہ سے نہ چلنے کی بناء پر ان شریعتوں میں ان قواعد کو ملحوظ نہیں رکھا گیا تھا۔اگر چہ اصول عقائد موافق ہوں گے۔پس تمام ملک اور ادیان کا اصول عقائد میں باہمی اتفاق تمام مجتہدین کے اصول اربعہ کتاب سنت' اجماع اور قیاس سے دلیل لینے پر اتفاق کی مانند ہے۔اور اس شریعت کا ملت ابراہیمی کے ساتھ اتفاق حضرت امام اعظم اور صاحبین کے قواعد استنباط باہمی اتفاق کی مانند ہے۔جیسے یہ قاعدہ کہ کتاب پر زیادتی نسخ ہے۔اس لیے خبر مشہور کے بغیر ثابت نہیں ہوگی۔نیز جیسے عموم بلوی اور استحسان اور اسی طرح اور بھی۔اور جب ملت اور شریعت میں فرق واضح ہوگیا۔اور ملت کی اتباع' کا معنی بھی ظاہر ہو گیا تو پتہ چلا کہ اختلاف شریعت کو ملت ابراہیمی سے انحراف نہیں کیا جاسکتا اس لیے کہ انحراف یہ ہے کہ اس کے اصول و قواعد سے تجاوز کیا جائے۔

اور بعض محققین اس طرف گئے ہیں کہ خاتم المرسلین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شریعت بعینہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی شریعت ہے۔اور انہوں نے ملت اور شریعت میں فرق نہیں کیا ہے۔اور کہا ہے کہ اس شریعت کے اصول و فروع بغیر کسی فرق کے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی شریعت کے اصول و فروع کے مطابق ہیں۔لیکن ان معنوں میں کہ ملت ابراہیمی کے تمام احکام اس شریعت میں محفوظ ہیں۔اس طرح کہ ان پر بہت سی چیزیں بڑھائی گئی ہیں۔اور وہ چیزیں بھی ان احکام کے مخالف نہیں ہیں۔بلکہ انہیں احکام کی شرح اور تکمیل ہیں۔پس ملت ابراہیمی متن کا حکم رکھتی ہے۔جبکہ شریعت مصطفوی علیٰ صاحبہا

الصلوٰۃ والسلام اس متن کی شرح کے حکم میں اور انہیں معنوں میں شارح کو ماتن کا تابع کہتے ہیں۔ اور صاحب مشکوٰۃ کو مثلاً صاحب مصابیح کا تابع جانا جاتا ہے۔ ہاں ہمیں ملت ابراہیمی کے احکام تفصیل کے ساتھ اس شریعت کے علاوہ کسی اور راہ سے معلوم نہ ہوئے۔ اور وہ احکام اس شریعت میں زائد احکام کے ساتھ مل کر آئے اس وجہ سے دونوں میں تمیز مشکل ہو گئی لیکن کتاب وسنت کی صریح نصوص جو کہ بے شمار آیات اور احادیث ہیں' کی رو سے اتنی بات یقینی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وہی شریعت لائے ہیں تو آیات میں سے یہ آیت مِلَّةَ اَبِیْكُمْ اِبْرَاهِیْمَ' ثُمَّ اَوْحَیْنَا اِلَیْكَ اَنِ اتَّبِعْ مِلَّةَ اِبْرَاهِیْمَ حَنِیْفًا وغیرہ اور اس احادیث میں سے حضور علیہ السلام کا ارشاد اتیتکم بالحنیفیة السمحة البیضاء ؟

ملت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے احکام اور حضور علیہ السلام کی جدید شریعت

نیز احادیث اور سیر کی رو سے جن کا اس مقام پر ذکر کرنا بڑی طوالت چاہتا ہے' ثابت ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے دشمنوں سے جہاد کرنا' بت توڑنا' ختنہ' عقیقہ' آداب مہمان نوازی' عبادت کے وقت کپڑے پہننا۔ اور زینت اختیار کرنا' نماز میں ہاتھ اُٹھانا' ہر جھکنے اور اُٹھنے کے وقت تکبیر کہنا' چار رکعت چاشت کی نماز' اشہر حرم کا احترام کرنا' نکاح میں محرمات کی حرمت' اس میں گواہوں اور حق مہر کا واجب کرنا' نماز میں سجدے سے پہلے رکوع کرنا' اموال میں سے ایک حصہ اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے جدا کرنا جسے زکوٰۃ کہتے ہیں' مواضع ستر کے ڈھانپنے کا واجب ہونا' بدکاری' لواطت اور عورتوں کے مابین غیر فطری عمل اور دوسرے کبیرہ گناہوں کی حرمت' کعبہ کو قبلہ بنانا' سارے مناسک حج' ساری خصال فطرت' قربانی اور ہدی کے آداب' ستاروں کے احکام کا معتقد نہ ہونا' نجومیوں سے ساعت نہ پوچھنا' ساعتوں' دنوں' مہینوں اور تواریخ کی نحوست کی بحث میں نہ پڑنا' بدشگونی نہ لینا' کہانت پر عقیدہ نہ رکھنا' جنوں دیوں اور پریوں کے نام نذر نہ باندھنا' ان کے لیے ذبح نہ کرنا' رزق' شفا' موت اور حیات کو بلا واسطہ مسبب الاسباب کی طرف سے جاننا' مصیبت کے وقت صبر کرنا' قریبیوں اور دوستوں کی موت پر جزع اور نوحہ بین نہ کرنا' اپنی جان کو اللہ تعالیٰ کی راہ پیش کرنا' باپ کو بیٹے کے اور بیٹے کو باپ کے گناہ میں نہ پکڑنا' کپڑا' جسم' گھر اور جائے

سکونت کو پاک صاف رکھنا' لہو ولعب سے پرہیز کرنا' تصویر بنانے کو جو کہ حق نفس یا اپنے اہل وعیال کے حق کو ضائع کرنے کا موجب ہو' اچھا نہ سمجھنا' کسب معاش کرنا' ضرورت کے بغیر مانگنے سے پرہیز کرنا۔ اور اس قسم کے کام ملت ابراہیمی کے احکام سے ہیں جو کہ بعینہ اس شریعت میں باقی ہیں۔ بلکہ یہی وہ امور ہیں جو کہ اس شریعت کی اصل اور اس دین کی بنیاد ہیں۔ اور ان مذکورہ امور میں سے ہر ایک سے بے شمار فروع نکلتی ہیں۔ جو کہ شاید تمام شریعت کا احاطہ کرلیں۔ البتہ ملت ابراہیمی کے احکام' اس کے نشانات کے مٹ جانے اور کتابوں میں تدوین نہ ہونے اور ان احکام کے جاہلوں کے ہاتھوں آنے اور حضرت موسیٰ اور عیسیٰ (علیہم السلام) اور ان دونوں کے درمیانی زمانہ میں جو کہ طویل مدت تھی' ان احکام میں سے اکثر کے منسوخ ہوجانے کی وجہ سے کلی طور پر دنیا سے اس حد تک چھپ گئے تھے کہ ان احکام پر وحی جدید کے بغیر انسان کے لیے آگاہی ممکن نہ تھی۔ خاتم المرسلین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ احکام وحی کے واسطہ سے حاصل فرمائے اور جہاں سے حضرت ابراہیم علیہ السلام پر نازل ہوئے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر بھی نئے سرے سے نازل ہوئے تو آپ ان معنوں میں جدید شریعت والے ہوں گے اس لیے کہ شریعت کے جدید ہونے میں یہ شرط نہیں ہے کہ اس شریعت کے احکام کسی وقت اور کبھی بھی جہان میں ظاہر نہ ہوئے ہوں۔ بلکہ محو شدہ شریعت کو نئے سرے سے عالم غیب سے حاصل کرنا بھی تجدید شریعت میں کفایت کرتا ہے۔ اور اسی معنی میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دوسرے دینوں کو منسوخ فرمانے والے ہوئے کہ اس منسوخ شریعت کے ناسخات کو پھر اس شریعت منسوخہ کے ساتھ منسوخ فرمایا۔ البتہ کتاب کے جدید ہونے میں یہ بھی ضروری ہے کہ اس سے پہلے وہ کتاب کسی اور پر نازل نہ ہوئی ہو۔

اسی لیے حضرت عزیر علیہ السلام کے بارے میں یہ نہیں کہا جاسکتا کہ آپ جدید کتاب والے تھے یا ان پر تورات اُتری تھی۔ یہ فرق پوری طرح سمجھ کر بہت سی آیات اور بے شمار احادیث کے ظاہری معنوں کو ہاتھ سے نہیں جانے دینا چاہیے کہ دو شریعتوں کے اتحاد پر دلالت کرتی ہیں۔ اور بنی اسرائیل کے انبیاء علیہم السلام جو کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی

شریعت کو رائج کرنے والے تھے اس مدون شریعت کو کتابوں اور انسان کی محفوظ کی ہوئی تحریروں سے حاصل کرتے تھے نہ کہ عالمِ غیب کی طرف سے وحی کے ذریعے سے۔ پس وہ نئی شریعت والے نہیں ہوں گے۔

صاحب شریعت جدیدہ ہونے کی ایک اور وجہ

نیز حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صاحب شریعت جدیدہ ہونے کی ایک اور وجہ یہ تھی کہ آپ نے ملت ابراہیمی کے احکام پر بہت کچھ بڑھایا ہے۔ جیسے نماز، روزہ، زکوٰۃ، مسائل جہاد کی ماہیتیں چاہتیں بیان کرنا اور خلافت کبریٰ یعنی قاضی محتسبین جزیہ خراج کے عامل مقرر کرنا۔ مال فئے اور مال غنیمت کی تقسیم۔ اور وہ مسائل جو کہ جمعہ، جماعات اور عیدین قائم کرنے سے متعلق ہیں۔ فرائض اور ترکہ اور معاملات میں بھی بہت گہرائی فرمائی ہے۔ قضا کے آداب اور فیصلوں کی تفصیلات بھی پوری شرح ربط سے لائی گئی ہیں۔ اس وجہ سے آپ یہی جدید شریعت والے ہوئے۔ اور ظاہر ہے کہ انبیائے بنی اسرائیل علیہم السلام پر احکام تورات کے سوا کسی اور حکم کی تازہ وحی نہیں ہوتی تھی۔ تو حضور خاتم المرسلین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور دوسرے انبیاء بنی اسرائیل علیہم السلام کے درمیان فرق پورے طور پر روشن ہو گیا۔ بلکہ آپ اس شریعت کے لانے میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی مانند ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام بھی بہر حال ملت ابراہیمی کو منظور نظر رکھتے ہیں۔ اور انہیں قواعد پر فروعات بیان فرماتے ہیں۔ پس تحقیق کے مطابق آج اپنے تمام مشمولات سمیت مستقل صرف دو شریعتیں ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شریعت لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت ملت ابراہیمی کے تمام قواعد کی رعایت پر مشتمل نہیں ہے۔ جبکہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ملت ابراہیم کے تمام احکام پر پورے طور پر حاوی ہے۔ اور اس پر چند دوسری چیزوں کا اضافہ کر کے اس کی تکمیل کرتی ہے۔ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شریعت وہی شریعت موسوی ہے۔ لیکن تخفیف، آسانی اور کچھ پابندیوں کو اُٹھا کر۔ گویا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شریعت کا نزول حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شریعت کے نزول کی بنیاد اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی شریعت کی طرف رجوع کی ابتدا تھی۔ لیکن ایک وجہ سے نہ کہ

دوسری وجہ سے جیسا کہ ارہاصات اور تمہیدات کی شان ہے کہ مطلب سے پہلے مطلب کا کوئی نشان دیتی ہیں۔ اور اس طرف ایک راستہ کھولتی ہیں اس بحث کے جواب میں اہلِ تحقیق کا یہی ذوق ہے۔

ملت ابراہیمی کی اتباع کا معنی

اور بعض مفسرین نے کہا ہے کہ ملت ابراہیمی کی اتباع جس کا قرآن مجید میں جگہ جگہ ذکر ہے عقیدے کو اس ملت کے عقائد کے مطابق استوار کرنے کا نام ہے اور بس۔ کیونکہ اس ملت کے عقائد اُمتوں کے تمام گروہوں جیسے ہندو، یونانی، صابی اور مجوسی سے پورے طور پر ممتاز ہیں۔ جیسے یہ کہ معبود ایک ہے۔ اور ستاروں، عناصر اور موالید بنانا درست نہیں۔ اور ہیاکل اور ارواح اختیار کرنا اور عبادت کے وقت ان کی طرف منہ کرنا جائز نہیں۔ اور اللہ تعالیٰ رسل علیہم السلام کو بھیجتا ہے۔ اور ان کے ہاتھوں معجزات ظاہر فرماتا ہے۔ اور فرشتے اللہ تعالیٰ کی طرف سے مخلوق کی طرف قاصد ہیں۔ اور وہ اس کے اور اس کی مخلوقات کے درمیان واسطہ ہیں۔ اور وہ احکام کی تبلیغ میں جھوٹ اور خیانت سے معصوم بندگانِ خدا ہیں۔ اور بے شک اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو احکام کے ساتھ مکلّف فرمایا ہے جن کی وجہ سے قیامت کے دن جنت اور دوزخ کی جزا اور سزا دے گا۔ اور قیامت آنے والی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں۔ اور بے شک ارواح اپنے اجسام کے علاوہ بطریق تناسخ نہیں لوٹتیں۔ اور بے شک غیر اللہ کو سجدہ کرنا حرام ہے۔ اور ذبح کے وقت غیر اللہ کا نام لینا حرام ہے۔ اور نیکوں سے بنائی ہوئی مورتیوں کی تعظیم اور انہیں قبلہ قرار دینا حرام ہے۔

اور چونکہ ملت ابراہیمی کے اصول میں یہ بھی ہے کہ حق تعالیٰ آخری زمانے میں سے ایک رسول علیہ السلام کو مبعوث فرمائے گا اور ان کا دین ساری مخلوق کے لئے واجب القبول ہوگا۔ اور ان کی پیروی اور خدمت سب پر فرض ہوگی۔ پس اس پیغمبر علیہ السلام کی نبوت کا اعتقاد اور ان کے دین کی اتباع بھی ملت ابراہیمی کے اصولی عقائد میں سے ہوئی۔ جس طرح کہ حضور علیہ السلام کی شریعت میں نزول عیسیٰ علیہ السلام اور خروج مہدی علیہ السلام کا عقیدہ اور ان دونوں کی اتباع اصولی عقائد میں سے ہے۔ اور اسی لیے ان دونوں امور کو

عقائد کی کتابوں میں ذکر کرتے ہیں۔ اور دلائل کے ساتھ ثابت کرتے ہیں۔ اور اس قول کی تائید اس سے ہوتی ہے۔ جو کہ تفاسیر میں آیت وَمَنْ يَرْغَبُ عَنْ مِلَّةِ اِبْرَاهِيْمَ اِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهٗ کے سب نزول میں مرقوم ہے کہ حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ نے اپنے دونوں بھتیجوں سے جو کہ سلمہ اور مہاجر تھے کہا کہ ہمیں علم ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے فرمایا کہ میں حضرت اسماعیل (علیہ السلام) کی اولاد سے ایک نبی علیہ السلام مبعوث فرمانے والا ہوں جن کا نام احمد ہوگا۔ تو جو ان پر ایمان لایا اس نے ہدایت اور رشد پائی اور جو ان پر ایمان نہ لایا تو وہ ملعون ہے۔ سلمہ یہ سنتے ہی ایمان لے آئے اور مہاجر نے انکار کیا اور اس کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی۔

لیکن اس تقریر میں خدشہ آتا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی نبوت تمام شریعتوں اور دینوں میں اصولی عقیدوں میں سے ہے۔ جس طرح پچھلوں پر سابقہ انبیاء علیہم السلام کی نبوت پر ایمان لانا فرض ہے۔ اسی طرح پہلوں پر ان انبیاء علیہم السلام کی نبوت پر ایمان لانا فرض ہے۔ جو کہ بعد میں تشریف لائے جن کے متعلق تفصیلی علم ہو ان پر تفصیلی ایمان اور جس کے متعلق اجمالی طور پر علم ہو ان پر اجمالی طور پر ایمان لانا ضروری ہے تو یہ معنی ملت ابراہیمی کے ساتھ خاص نہیں ہے، تمام سابقہ انبیاء علیہم السلام نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وجود کی خبر دی ہے۔ اور اپنی اُمت کو ان کی امداد کی تاکید فرمائی اور اس کے متعلق پختہ وعدے لئے تو اس اعتبار سے خاتم المرسلین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت کا عقیدہ تمام ملتوں اور دینوں کے اصولوں میں سے ہوگا نہ صرف ملت ابراہیمی کے اصولوں سے۔

اور اس خدشہ کے جواب میں کہا جاسکتا ہے کہ آخر الزماں رسول علیہ السلام کی بعثت اور ان کی اُمت کو پیدا کرنے اور ان پر کتاب نازل کرنے کی طلب ملت ابراہیمی کی حقیقت میں داخل تھی۔ اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے کمال کی ایک قسم اسی پر موقوف تھی۔ پس آخر الزماں رسول علیہ السلام گویا حضرت ابراہیم علیہ السلام کے مخصوص خلیفہ ہوئے۔ اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی امامت آپ کی رسالت کے ساتھ پوری ہوگئی۔ اور ان کے دین کے احکام اس زمانے میں گویا حضرت ابراہیم علیہ السلام کے احکام تھے۔ بخلاف

دوسرے انبیاء علیہم السلام کے جو کہ اس امر کے طالب نہیں ہوئے ہیں۔ اور ان کی ملت کی حقیقت میں یہ درخواست نہیں تھی۔ ہاں! حضرت ابراہیم (علیہ السلام) اس موعود کمال کے ساتھ اپنے اُمتیوں کو بشارت دیتے تھے۔ اور حضور علیہ السلام کی امداد اور پیروی کی تاکید کرتے تھے۔ پس فرق واضح ہو گیا۔

لیکن ابھی آیاتِ قرآنی کے الفاظ میں بھی جیسے ثُمَّ اَوْحَيْنَا اِلَيْكَ اَنِ اتَّبِعْ مِلَّةَ اِبْرَاهِيْمَ اور مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرَاهِيْمَ اور الفاظ حدیث میں بھی جیسے اتیتکم بالحنيفية السمحة البيضاء اس تقریر سے ایک اختلاف باقی ہے۔ کیونکہ اپنے عقائد کو کسی ملت کے عقائد کے موافق کرنا اس ملت کی پیروی میں داخل نہیں ہے۔ اور اس کے باوجود اگر اتباع کا معنی یہی ہے تو پیغمبر آخر الزماں صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس پیروی کا حکم دینا ایک قسم کے تکلف سے خالی نہیں ہے۔ نیز بنی اسرائیل کے تمام انبیاء علیہم السلام بھی اسی اتباع کے ساتھ مامور تھے۔ جناب خاتم المرسلین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ اس کی کوئی خصوصیت نہیں ہے۔

اور خلاصۂ کلام یہ ہے کہ ہر شریعت تین چیزوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ پہلی چیز بنیادی عقائد ہیں۔ جیسے توحید' نبوت اور آخرت اور یہ چیز تمام سچی ملتوں اور دینوں میں مشترک ہے۔ اور تمام انبیاء علیہم السلام اس پر اتفاق رکھتے ہیں۔ اس لیے کہ یہ چیز ایک ایسا امر ہے۔ جو کہ اوقات اور زمانوں کے مختلف ہونے کی وجہ سے مختلف نہیں ہوتا۔ اور اس معنی کے ساتھ ہر پچھلی ملت کو پہلی ملت کے تابع کہا جا سکتا ہے۔ کسی ایک نبی علیہ السلام اور ایک اُمت کے ساتھ خاص نہیں۔ دوسری چیز شریعت کے قاعدے کلیے ہیں جن کی طرف احکام کی جزئیات اور مسائل کی شاخیں لوٹتی ہیں۔ اور ہر ہر حکم میں وہ کلیات ملحوظ ہوتی ہیں۔ اور حقیقت میں ملت انہی قواعد کلیہ کا نام ہے۔ اور اس اُمت اور اس پیغمبر علیہ السلام کی ملت ابراہیمی کی پیروی اسی خاص معنی کے ساتھ ہے اس نبی علیہ السلام اور اُمت کے غیر میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ملت کے متعلق یہ اتباع نہیں پائی جاتی۔ تیسری چیز شریعت کے تمام مقرر کردہ طریقے کلیات' جزئیات' اصول اور فروع اور اسی معنی کے ساتھ حضور علیہ السلام جدید شریعت والے ہیں۔ اور انبیاءِ بنی اسرائیل علیہم السلام اسی معنی کے ساتھ حضرت موسیٰ علیہ

السلام شریعت کے تابع تھے۔

دوسری بحث یہ ہے کہ بل حرف عطف ہے۔ اور اِتَّبِعُوْا مِلَّةَ اِبْرَاهِيْمَ یا نتبع ملة ابراهیم جو کہ بل کے بعد مقدر ہے کا کُوْنُوْا هُوْدًا اَوْنَصَارٰى پر عطف درست نہیں ہے۔ اس لیے کہ یہ مقولہ یہود و نصاریٰ کا ہے۔ اور اتبعوا مقولہ پیغمبر علیہ السلام ہے۔ اور غیر کے کلام پر عطف صحیح نہیں اس کا جواب یہ ہے کہ کلام غیر پر تلقین کے طریقے سے عطف جائز ہے۔ جیسا کہ کوئی مخاطب کو کہے اگر ایک مخاطب اس کے جواب میں کہہ دے وزیدا یعنی وزیدا کہہ اور جیسے کوئی کہے اضرب زیدا اس کے جواب میں تو کہے بل اکرمہٗ یعنی بل اکرمة کہہ اور بعض مفسرین نے کہا ہے کہ یہ کلام غیر کے کلام پر عطف کے قبیلے سے تو ہے۔ لیکن رد اور انکار کے طریقے پر یعنی لا تقولوا لنا ذٰلك' واتبعوا انتم ملة ابراهیم۔ یا لا نكون يهودا اونصارىٰ بل نتبع ملة ابراهیم اور صاحب کشاف نے اس عطف کو جاعلك پر ومن ذريتي کے عطف کی مانند قرار دیا ہے۔ جیسا کہ اس آیت کے تحت گزر چکا اور کونوا هودا اونصارىٰ پر لف و نشر کی تحقیق وقالوا الن يدخل الجنة الامن كان هودا اونصارىٰ کے قیاس پر سمجھنا چاہیے اور کلام کو دونوں اقوال کی تقسیم پر اہلِ کتاب کے دونوں فرقوں پر محمول کرنا چاہیے نہ کہ لف و نشر پر کیونکہ او کا حرف اس سے انکار کرتا ہے۔

تیسری بحث

تیسری بحث یہ ہے کہ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ کا جملہ جو کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے شرک کی نفی پر دلالت کرتا ہے' بظاہر مستدرک معلوم ہوتا ہے۔ اس لیے کہ تمام مخاطبین حضرت ابراہیم علیہ السلام کے کمال کے عقیدے پر متفق تھے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام میں شرک کے احتمال کا کسی کے دل میں کھٹکا نہ تھا' یہ جملہ لانے کا کیا مقصد ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ جملہ لانا ان لوگوں کے حال پر تعریض کے لیے ہے۔ جو کہ خود کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کا تابع کہتے تھے۔ اور شرک کرتے تھے۔ یہود جو کہ تشبیہ کے قائل تھے۔ اور حضرت عزیر علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا (نعوذ باللہ) کہتے تھے۔ اور جیسے نصاریٰ جو

کہ تثلیث کے قائل تھے' حضرت مسیح علیہ السلام کو ابن اللہ (نعوذ باللہ) کہتے تھے۔ اور جیسا کہ قریش میں سے مکہ کے جاہل جو کہ صریح بت پرستی کرتے تھے۔ گویا یوں فرمایا گیا ہے کہ تم حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اتباع سے بہت دُور جا پڑے ہو اس لیے کہ تم تو ان کی پہلی بات جو کہ نری توحید اور خالص اسلام ہے' کا بھی انکار کرتے ہو' ان کے دوسرے عقائد اور دوسرے اعمال و اخلاق تک رسائی کیسے ہو گی؟

چوتھی بحث

چوتھی بحث یہ ہے کہ بعض مفسرین نے بَلْ مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ کے لفظ کو اس وضاحت کے ساتھ یہود و نصاریٰ کے کلام کے رد اور ابطال پر محمول فرمایا ہے کہ دین کے معاملہ میں اگر نظر و استدلال پر دارومدار ہے تو ہم نے اس دین کے صحیح ہونے پر قوی دلائل قائم کیے ہیں۔ اور اگر دارومدار تقلید پر ہے تو تقلید کے سلسلہ میں مختلف فیہ کی بہ نسبت متفق علیہ زیادہ درست اور بہتر ہے۔ اور تمام ملتوں والے یعنی یہود و نصاریٰ بلکہ مشرکین عرب بھی دین حضرت ابراہیم علیہ السلام کے صحیح ہونے پر متفق ہیں۔ جبکہ دین یہود کی صحت پر نصاریٰ' نصاریٰ کے دین کی صحت پر یہود اور ان کے دین کی صحت پر مشرکین عرب طنز کرتے ہیں۔ پس دین ابراہیم علیہ السلام جس کی حقیقت تمام گروہوں کے نزدیک مسلم ہے' اتباع بہت بہتر ہو گی۔ اور اگر یہ تعریض اور رد و ابطال سُن کر یہود و نصاریٰ کہیں کہ تم نے یہودیت و نصرانیت کو ہدایت کے دائرہ سے خارج کر دیا۔ اور دونوں کے شرک ہونے کا اشارہ کیا' تم پر لازم آیا کہ تم حضرت موسیٰ اور عیسیٰ علیہما السلام کی شریعت کے کافر ہو جاؤ۔ تو ان کی اس بات کے جواب میں

قُوْلُوْٓا کہو۔ کہ ہم ارکان ایمان میں سے کسی چیز کے ساتھ ہرگز کفر نہیں کرتے۔ اس لیے کہ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ ہم اللہ تعالیٰ پر ایمان لائے۔ جو کہ اس کی تمام آیات اور احکام اور تمام رسل علیہم السلام پر ایمان لانے کو لازم کرتا ہے۔ لیکن اس ایمان میں کچھ تفصیل ہے' ہم اسے مقدم کرتے ہیں جو کہ افضل و اولیٰ ہے پھر اسے جس کے وہ افضل و اولیٰ تابع ہوا ہے۔ اس لیے کہ افضل کا متبوع ہونا بھی افضلیت کا موجب ہے۔ پس اس جہت سے ہم ایمان میں اپنی کتاب کو مقدم کرتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ

وَمَا اُنْزِلَ اِلَيْنَا اور ہم ان تمام آیات واحکام پر ایمان لائے جو کہ ہم پر نازل کیے گئے جو کہ نہایت کامل ہیں۔ وَمَا اُنْزِلَ اِلٰى اِبْرٰهِيْمَ اور اس پر جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف نازل کیے گئے جو کہ ہماری اس شریعتِ کاملہ کے ساتھ پوری مشابہت رکھتے ہیں۔ اور ہمارے رسول علیہ السلام اس کی اتباع کے مامور ہیں۔ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ اور اس کے جو نازل کیا گیا حضرت اسماعیل' اسحاق اور یعقوب علیٰ نبینا وعلیہم السلام اور یعقوب علیہ السلام کی اولاد کی طرف جو کہ بارہ (۱۲) افراد تھے۔ اور ان میں سے یوسف علیہ السلام قطعی پیغمبر ہیں۔ اور دوسروں کی پیغمبری میں اختلاف ہے۔ اور زیادہ صحیح یہ ہے کہ پیغمبر نہ تھے۔ لیکن ان میں سے ایک پر جو کہ نازل ہوا گویا ان سب پر نازل ہوا۔

اور طبرانی اور ابونعیم حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت لائے ہیں کہ آپ نے فرمایا کہ اگر میں قسم اٹھاؤں تو حانث نہیں ہوں گا اس بات پر کہ میری اُمت کے پیش دستوں سے پہلے چند اشخاص کے سوا کوئی بہشت میں نہیں جائے گا۔ جو کہ بیس (۲۰) سے کم اور دس (۱۰) سے زیادہ ہوں گے۔ حضرت ابراہیم' حضرت اسماعیل' حضرت اسحاق' حضرت یعقوب علیہم السلام' حضرت یعقوب (علیہ السلام) کی اولاد' حضرت موسیٰ اور عیسیٰ اور مریم۔ بہر حال یہ جماعت جن کا ذکر کیا گیا' شریعت ابراہیمی کے تابع تھے۔ اور ان پر جو وحی ہوتی تھی' شریعت ابراہیمی کو مکمل کرنے والی تھی۔ پس اس وجہ سے ہم ان کی وحی کو مقدم کرتے ہیں۔

وَمَا اُوْتِيَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى اور اس پر جو حضرت موسیٰ اور عیسیٰ (علیہم السلام) کو تورات' انجیل اور احکام شریعت عطا ہوئے۔ اور اگر چہ یہ دونوں بزرگ بعض متقدمین سے افضل ہیں۔ لیکن انہیں جو کچھ دیا گیا ہے' ان کی اُمتوں کی استعداد کے مطابق دیا گیا ہے۔ تو ان کی شریعت پہلوں کی شریعت سے کچھ پست ہے۔ اسی لیے ہم نے ان کا تاخیر سے ذکر کیا۔ البتہ ان کے کمال اور ان کی شریعتوں کی تفصیل کے پیش نظر ہم ان پر مستقل تفصیلی ایمان لائے ہیں۔ اور ہم نے انہیں اجمال میں داخل نہیں کیا۔ اسی طرح ہم اجمالی طور پر ایمان لائے ہیں اس سب پر مَا اُوْتِيَ النَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ جو تمام پیغمبر علیہم السلام اپنے پروردگار کی طرف سے عطا کیے گئے مصاحف' احکام اور شریعتوں سے۔ اگر چہ اس میں

فاضل اور مفضول کا فرق ہے۔ لیکن

لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ ہم ان میں سے کسی کے درمیان فرق نہیں کرتے کہ بعض پر ایمان لائیں اور بعض کے ساتھ کفر کریں۔ اور ہم سے یہ بُرا کام کیسے ہو سکتا ہے۔ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ اور ہم صرف خدا تعالیٰ کے لیے مطیع ہیں اس کا ہر حکم جو کسی زمانے میں کسی رسول علیہ السلام کی زبان کے ذریعے آئے ہمارے سر آنکھوں پر ہے۔ اگر چہ وہ احکام اُمتوں میں فرق کی وجہ سے فضل اور کمال میں مختلف ہوں۔

چند فوائد

یہاں چند فائدے باقی رہ گئے۔ پہلا فائدہ یہ ہے کہ آسمان سے نازل شدہ کتابوں اور شرائع پر ایمان کے ذکر میں اگر وقت کی ترتیب کا لحاظ رکھیں تو ما انزل الینا کے ذکر کو سب سے پہلے کیوں لائے؟ اس لیے کہ وہ تو سب سے متاخر ہے۔ اور اگر شرافت اور بزرگی کی ترتیب منظور ہے تو مَا اُوْتِيَ مُوْسٰى وَ عِيْسٰى کے ذکر کو مَا اُنْزِلَ اِلٰى اِسْمٰعِيْلَ وَ اِسْحٰقَ وَ يَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ کے ذکر سے پہلے لانا چاہیے۔ اس لیے کہ حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ اولوالعزم پیغمبروں میں سے ہیں۔ اور ان کی کتابیں جو کہ تورات و انجیل ہیں' ان مذکورہ انبیاء علیہم السلام کی وحی سے بالاجماع افضل اور اعلیٰ ہیں؟

اس کا جواب یہ ہے کہ عین تفسیر میں گزرا کہ ان مذکور انبیاء علیہم السلام کے ذکر کو حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام کے ذکر سے پہلے لانا ان کے ان دونوں سے افضل ہونے کی جہت سے نہیں ہے۔ اور نہ ہی ان کی وحی کے ان دونوں کی کتابوں سے افضل ہونے کی جہت سے ہے۔ بلکہ اس بناء پر ہے کہ ان کی وحی حضرت ابراہیم علیہ السلام کی وحی کی تاکید تھی۔ اور وحی ابراہیمی' وحی موسوی اور وحی عیسوی سے افضل و اشرف ہے۔ اور افضل کی تاکید کرنے والا بھی بطور تابع افضل ہو جاتا ہے۔ اگر چہ مستقل افضل نہ ہو۔ جیسا کہ ایک سردار کے ساتھی کسی بادشاہ کے دربار میں باریابی کے لیے اس سردار کے تابع ہونے کی وجہ سے دوسرے سردار پر مقدم ہوتے ہیں اگر چہ مرتبہ میں وہ اس سردار سے پست ہوتے ہیں۔

امام احمد اور بخاری کتاب الادب میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت

لائے کہ لوگوں نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھا کہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں کون سا دین سب سے زیادہ پسندیدہ ہے؟ فرمایا الحنیفیة السمعة یعنی آسان دین حنفی۔ اور حاکم اور ابن عساکر سعد بن عبداللہ بن مالک خزاعی کی روایت کے ساتھ لائے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ احب الدین الی اللّٰہ الحنیفیه السمحة اور ابی بن کعب کے مصحف میں سورۂ لم یکن میں یہ آیت تھی جس کی تلاوت منسوخ ہو چکی ہے۔ اور صحابہ کرام کی کثیر تعداد سے اس آیت کے قرآن پاک میں اسی سورۃ میں ہونے کی شہرت ثابت ہے کہ فرمایا ان ذات الدین عنداللّٰہ الحنیفة السمحة لاالیهودیة' ولا النصرانیة ومن یعمل خیرا فلن یکفره۔ اور بعض محققین نے کہا ہے کہ خدا تعالیٰ پر ایمان لانا اس لیے مقدم فرمایا گیا ہے کہ پیغمبر علیہ السلام وحی اور کتاب سب کی معرفت اسی معرفت پر موقوف ہے۔ اور اسی لیے وہ معرفتِ عقلی ہے' سننے پر موقوف نہیں ہے پھر سابقہ انبیاء علیہم السلام کی معرفت کا راستہ جو کہ زرا سمعی ہے' ہماری نسبت سے اپنے پیغمبر علیہ السلام اور اپنی وحی کتاب کو پہچاننا ہے۔ اور یہ معرفت دلیل کا حکم رکھتی ہے۔ اور سابقہ انبیاء علیہم السلام کی نبوت مدلول کے حکم میں ہے۔ اور دلیل مدلول سے پہلے ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے ما انزل الینا کو سب پر مقدم فرمایا گیا اس کے بعد سابقہ انبیاء علیہم السلام کی تفصیل میں تقدم زمانی کا لحاظ ہے۔ اور اجمال میں لازم ہے کہ اس کے بعد تفصیل واقع ہو تا کہ جو باقی رہ گیا ہے' سب کو اکٹھا کر لے۔ پس یہ ترتیب تفصیلی اور اجمالی ایمان کے ذکر کی سب سے اچھی وجہ ہے۔

دوسرا فائدہ یہ ہے کہ اس آیت سے معلوم ہوا کہ کسی فرق کے بغیر تمام انبیاء علیہم السلام کی شریعتوں اور ان کی کتابوں پر ایمان لانا فرض ہے۔ جس طرح کہ اپنے پیغمبر علیہ السلام اور کتاب پر ایمان لانا فرض ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ اپنے پیغمبر علیہ السلام اور کتاب کی پیروی بھی فرض ہے۔ جبکہ دوسرے انبیاء علیہم السلام اور ان کی کتابوں کی پیروی فرض نہیں ہے۔ جیسا کہ ابن ابی حاتم نے معقل بن یسار رضی اللہ عنہ سے روایت کی کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے تھے کہ تورات' زبور اور انجیل پر ایمان لاؤ لیکن پیروی میں تمہیں صرف قرآن پاک کی ہی گنجائش ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ امام ضحاک اور دوسرے علماء فرماتے تھے

کہ اپنی عورتوں' اولاد' غلاموں' کنیزوں اور ملازموں کو ان انبیاء علیہم السلام کے اسمائے مبارک کی تعلیم دو جو کہ قرآن پاک میں مذکور ہیں تا کہ وہ ان پر ایمان لائیں اس لیے کہ حق تعالیٰ نے اس ایمان کو وہاں فرض قرار دیا ہے جہاں کہ فرمایا قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى وَمَآ اُوْتِيَ النَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ ج لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ (البقرة آیت ۱۳۶) اور یہی وجہ ہے کہ امام احمد' مسلم اور دوسرے محدثین حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت کے ساتھ لائے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سنت فجر کی دو رکعات میں یہ دو آیتیں تلاوت فرماتے تھے۔ پہلی میں قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ الخ اور دوسری میں قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا الخ تا کہ اپنی اُمت کو یہ سکھائیں کہ ہر صبح کو ان پیغمبروں علیہم السلام کے ساتھ اپنے ایمان کو تازہ کریں۔

اولاد یعقوب علیہ السلام کو اسباط اور حسنین کو سبطین کہنے کی وجہ

تیسرا فائدہ یہ ہے کہ لغت میں سبط کا معنی قبیلہ ہے۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کی اولاد کو اسباط کیوں فرمایا گیا؟ کیونکہ ان میں سے ہر ایک قبیلہ نہ تھا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ چونکہ ان میں سے ہر ایک سے ایک ایک قبیلہ معرضِ وجود میں آیا اس لیے ان میں سے ہر ایک کو قبیلہ کا نام دیا گیا جیسا کہ ابن جریر نے اپنی تفسیر میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی کہ اسباط حضرت یعقوب علیہ السلام کے بیٹے ہیں' یہ بارہ (۱۲) تھے' ان میں سے ہر ایک سے لوگوں کا ایک ایک قبیلہ اور جماعت پیدا ہوئی اور اسی معنی سے حضرت حسنین رضی اللہ عنہ کو بھی سبطین کہتے ہیں۔ اس لیے کہ ان سے دو بڑے قبیلے حسنی اور حسینی پیدا ہوئے ہیں۔ اور بعض روایات حدیث میں حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کو خصوصیت کے ساتھ اس لقب کے ساتھ ملقب فرمایا گیا اس وجہ سے کہ ان سے اولاد کی بہت کثرت ہے۔ جیسا کہ صحاح میں وارد ہے کہ انا من حسین وحسین منی سبط من الاسباط گویا اس حدیث میں اس بات کا اشارہ ہے کہ بزرگی' پاکیزگی' علم اور تقویٰ آپ کی اولاد میں بہت رہے گا۔ چنانچہ اسی طرح واقع ہوا۔ اور لفظ سبط کے معنوں میں شرافت' اچھے اخلاق'

صالحیت، تقویٰ اور انبیاء علیہم السلام کی اولاد میں ہونا بھی عرف شرع کے مطابق معتبر ہے اس شرط کو نہ پانے والے کو سبط نہیں کہا جا سکتا اور جب تم نے اپنا ایمان جیسا کہ چاہیے تھا، درست کر لیا۔

فَاِنْ اٰمَنُوْا پس اگر ایمان لائیں یہ یہود و نصاریٰ جو کہ ہدایت کو اپنے دین میں منحصر کرتے ہیں بِمِثْلِ مَآ اٰمَنْتُمْ بِهٖ اس طرح جیسے تم اس پر ایمان لائے ہو۔ یعنی تمام انبیاء و رسل علیہم السلام اور کتابوں پر کسی امتیاز اور تفریق کے بغیر فَقَدِ اهْتَدَوْا پس تحقیق انہوں نے بھی ہدایت پائی اور مہتدی کا لفظ ان پر صادق آیا اگرچہ وہ ان میں منحصر نہ ہوا وَاِنْ تَوَلَّوْا اور اگر وہ اس قسم کے ایمان سے روگردانی کر گئے تو اگرچہ بظاہر حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہم السلام کی اتباع کا دعویٰ کرتے ہیں۔ لیکن فی الواقع دونوں کے تابع نہیں ہیں۔ فَاِنَّمَا هُمْ فِیْ شِقَاقٍ تو نہیں ہیں وہ مگر حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ (علیہم السلام) کی مخالفت میں۔ اس لیے کہ حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) نے اسی ایمان کا حکم دیا ہے۔ تو وہ اگر آپ کے ساتھ جھگڑا اور مقابلہ کریں۔

فَسَیَكْفِیْكَهُمُ اللّٰهُ پس عنقریب خدا تعالیٰ آپ کو ان کے شر سے کفایت فرمائے گا۔ وَهُوَ السَّمِیْعُ اور وہی ہے سننے والا۔ جو کہ ان کی باتیں سنتا ہے، الْعَلِیْمُ جاننے والا۔ جو کہ ان کی نیتوں کو جانتا ہے۔ اور آپ کے بارے میں جو کچھ خفیہ مکر و فریب کرتے ہیں، اسے معلوم ہے۔ نیز وہ آپ کی دعا سنتا ہے۔ اور کلمۂ حق کو بلند کرنے کے لیے آپ کی نیت جانتا ہے۔ پس آپ کو بہمہ وجوہ ان پر کامیابی عطا فرمائے گا اور انہیں مغلوب اور سرنگوں۔

ہم یہاں پہنچے کہ بِمِثْلِ مَآ اٰمَنْتُمْ میں لفظ مثل کا کیا معنی ہے؟ اس لیے کہ مقبول ایمان تو ایک ہے اس میں تعدد نہیں کہ اس میں لفظ مثل استعمال کیا جائے؟ اس سوال کے جواب میں مفسرین نے چند وجوہ بیان فرمائی ہیں۔ پہلی وجہ یہ کہ یہ کلام فرض و تقدیر پر مبنی ہے۔ یعنی اگر یہ لوگ اس ایمان کی مثل کوئی اور ایمان حاصل کریں پھر بھی راہِ ہدایت پالیں۔ بات تو اس میں ہے کہ اس ایمان کے علاوہ جہان میں کوئی اور ایمان موجود نہیں ہے۔ جیسا کہ مشورہ کے مقام پر کہتے ہیں کہ اس اگر تدبیر کی مانند کوئی اور تدبیر تمہارے دل میں آئے تو اس کے

مطابق عمل کرو۔ اور غرض یہ ہوتی ہے کہ اس تدبیر کے سوا کوئی تدبیر راست نہیں آئے گی۔
دوسری وجہ یہ ہے کہ مَآ اٰمَنْتُمْ میں ما مصدریہ ہے نہ کہ موصولہ اور لفظ با استعانت کے لیے ہے۔ یعنی یہ لوگ اخلاص' بے نفاقی' ثابت قدمی اور پختگی میں تمہارے ایمان کی مثل کوئی ایمان لائیں تو لازماً ہدایت پا جائیں۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ یہاں لفظ مثل تعظیم اور سمجھانے کے لیے زائد واقع ہوا ہے۔ جیسا کہ مثلك لاتبخل ہیں کہتے ہیں جس کا معنی ہے انت لاتبخل اور اس توجیہ کی تائید اس سے ہوتی ہے۔ جو کہ بیہقی نے کتاب الاسماء والصفات میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے کہ آپ فرماتے تھے کہ لاتقولوا فان آمنوا بمثل ما آمنتم به فان الله لا مثل له ولكن قولوا فامنوا بالذی آمنتم به یعنی اس آیت کے معنوں کو اُس طرح نہ سمجھو کہ بلکہ اس طرح سمجھو اس لیے کہ لفظ مثل زائد ہے۔ چوتھی وجہ یہ ہے کہ مومن بہ اس قضیہ کے معنی سے عبارت ہے۔ جو کہ حکم اور تصدیق سے متعلق ہے۔ اور قضیہ کا معنی تصدیق کرنے والوں کے ذہنوں کے ساتھ قائم ہونے کے اعتبار سے متعدد اور متغائر ہوتا ہے۔ اس لیے کہ اعراض کی تشخیص ان کے موضوعات کی تشخیص کے تابع ہے۔ پس قضیہ کا یہ معنی جو کہ ایمان والوں کے ذہنوں کے ساتھ قائم ہے اس معنی کا غیر ہے۔ جو کہ اہلِ کتاب کے ذہنوں کے ساتھ قائم ہوگا۔ نہایت کار یہ ہے کہ دونوں طرفوں کے اتحاد اور دونوں میں نسبت وحکم کے اعتبار سے مماثلت ثابت ہے۔ پس اس مغائرت کے پیش نظر لفظ مثل کا استعمال صحیح ظاہر ہوا۔ اگرچہ عرف میں مغائرت نہ جانیں لیکن عرفیات سے حقائق نہیں ٹوٹتے۔

پانچویں وجہ یہ ہے کہ لفظ بمثل میں اور اسی طرح بہ میں حرف با سببیت کے لیے ہے نہ کہ صلۂ ایمان' اور اس صورت میں کلام کا معنی یوں ہوا کہ اگر اہلِ کتاب ان دلائل کی مانند دلائل کی وجہ سے ایمان لے آئیں جن کی وجہ سے تم ایمان لائے تو ضرور ہدایت پا جائیں۔ اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اگرچہ ایمان مومن بہ کے معنوں میں ایک ہے۔ لیکن اس کے دلائل بے شمار ہیں۔ جس طرح مومن کے لیے اپنے پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کو دیکھنا اور ان کے حالات کو سننا اور ان کے معجزات' تمام سمعیات پر ایمان کی دلیل ہیں اسی طرح یہود کے

لیے اپنے پیغمبر علیہ السلام احوال واطوار کو دیکھنا اور سننا اور اپنی کتاب دلیل ہو سکتی ہے۔ اور اسی طرح نصاریٰ کے لیے۔ اور مقصد ہے ان مذکورہ چیزوں پر ایمان لانا نہ کہ طریقے اور دلیل کو معین کرنا۔ اس بناء پر لفظ مثل لانا ضروری تھا۔

چھٹی وجہ یہ ہے کہ مثل سے مراد ایک اور ترتیب ہے۔ جو کہ اس ترتیب سے جدا ہے۔ اور حاصلِ کلام یہ ہے کہ ان تمام چیزوں پر ایمان ضروری ہے خواہ اس ترتیب کے ساتھ یا کسی اور ترتیب کے ساتھ مثلاً اگر یہود پہلے تورات اور حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لائیں اور اس کے بعد دیگر انبیاء علیہم السلام اور ان کی شریعتوں پر تو بھی جائز ہے۔ اور اسی طرح نصاریٰ اگر پہلے حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لائیں اور اس کے بعد دوسرے انبیاء علیہم السلام اور ان کی شریعتوں پر تو بھی جائز ہے۔

یہاں جاننا چاہیے کہ آیت فَسَيَكْفِيكَهُمُ اللَّهُ میں ایک عنقریب واقع ہونے والی کفایت کا وعدہ فرمایا گیا ہے۔ اور اس سورۃ کے نزول کے بعد چند سالوں میں اس وعدے کے مطابق کفایت متحقق ہو گئی۔ یہود میں سے بنو قریظہ کو حضور علیہ السلام نے قتل فرمایا جبکہ بنو نضیر کو جلا وطن فرمایا۔ اور خیبر والوں کو بھی برباد کیا اور جو لوگ یہاں تھے پوری ذلت و رسوائی کے ساتھ جزیہ میں مبتلا ہوئے۔ یہ تو یہودیوں کا حال ہے رہے نصاریٰ تو اس وقت ان سے کوئی فریب اور شر صادر نہیں ہوا تھا۔ بلکہ حبشہ کا بادشاہ جس کا نام نجاشی تھا مسلمان ہو گیا۔ اور نجران والوں نے صلح اور قبولیت جزیہ کے ساتھ اپنے آپ کو زیرِ اطاعت کر دیا اور قیصر بادشاہ روم نے بھی تکبر اور دشمنی اختیار نہ کی اس وجہ سے وہ قہر الٰہی کے صدمہ میں گرفتار نہ ہوئے۔

شہادت عثمان رضی اللہ عنہ کے متعلق اخبار بالغیب

اور حاکم نے مستدرک میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی کہ انہوں نے کہا کہ میں ایک دن حضور علیہ السلام کے دربارِ اقدس میں بیٹھا ہوا تھا کہ اچانک حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ آ گئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ اے عثمان! تو شہید کیا جائے گا اس حالت میں سورۂ بقرہ پڑھ رہا ہو گا۔ اور تیرے خون کا ایک قطرہ اس آیت پر گرے گا کہ فَسَيَكْفِيكَهُمُ اللَّهُ اور ابن ابی داؤد نے کتاب المصاحف میں اور دوسرے

معتبر محدثین نے روایت کی ہے کہ جب مصری لوگ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو قتل کرنے کے لئے گھر میں گھس آئے آپ کے سامنے مصحف مجید کھلا تھا اور آپ تلاوت فرما رہے تھے۔ ان بدبختوں نے پہلے آپ کے دونوں ہاتھوں پر تلوار ماری اور آپ کا خون جاری ہوگیا اور اسی آیت پر پڑا۔ آپ اپنے ایک ہاتھ سے اس خون کو مصحف شریف سے دور کر رہے تھے اور فرما رہے تھے کہ مجھے خدا کی قسم یہ ہاتھ وہ پہلا ہاتھ ہے جس نے مفصلات قرآن کو لکھا ہے۔

اور ابن ابی حاتم' نافع بن ابی نعیم سے لائے ہیں کہ ایک دن زیارت کے لیے مصحف عثمان ایک خلیفہ کے پاس لائے' میں اس وقت حاضر تھا' میں نے خلیفہ سے کہا کہ لوگ کہتے ہیں کہ شہادت کے وقت مصحف آپ کی گود میں تھا۔ اور آپ کا خون آیت فَسَيَكْفِيكَهُمُ اللّٰهُ پر گرا ہے اس خلیفہ نے اس آیت کو کھولا اور میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ اس آیت پر خون کا اثر تھا۔

اور عبداللہ بن احمد زوائد زہد میں عمرہ بنت ارطاۃ عدویہ سے روایت لائے' فرماتی ہیں کہ جس سال کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ شہید ہوئے' میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہ کے ہمراہ حج کے لیے گئی تھی جب ہم مکہ شریف سے مدینہ عالیہ لوٹے' ہمیں پتہ چلا کہ شہادت کے وقت جو مصحف شریف آپ کی گود میں تھا' خون کا پہلا قطرہ اسی پر گرا تھا۔ ہم نے دیکھا کہ اسی آیت پر گرا تھا۔ عمرہ کہتی ہیں کہ اس واقعہ کا اثر ایسا ہوا کہ آپ کے قاتلوں میں سے کوئی بھی صحیح موت نہیں مرا تمام بری موت مرے۔

جواب طلب سوال

یہاں ایک جواب طلب سوال باقی رہ گیا اور وہ یہ ہے کہ تیسرے پارے کے آخر میں سورۂ آل عمران میں اسی آیت کو لوٹایا گیا ہے۔ اور دو جگہ پر اسلوب بیان کو بدلا گیا۔ پہلی تبدیلی یہ ہے کہ اِلَيْنَا کی جگہ عَلَيْنَا لائے ہیں۔ اور دوسری تبدیلی یہ کہ اَلنَّبِيُّوْنَ سے پہلے وما اوتی کے لفظ کو حذف کر دیا گیا۔ اسلوب کی اس تبدیلی میں کیا نکتہ ہے' ہر کلام کی اپنے مقام کے ساتھ مناسبت کس طرح سمجھی جاسکتی ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ اس آیت میں مخاطب تمام ایمان والے ہیں قولوا کی دلیل کے ساتھ جبکہ اُس آیت میں قُلْ آمَنَّا بِاللّٰہِ کی دلیل سے خطاب صرف پیغمبر علیہ السلام سے ہے۔ اور جب نزول کو الیٰ کے ساتھ متعدی کریں تو اس کا معنی پہنچنا اور منتہی ہونا ہوتا ہے۔ اور جب علیٰ کے ساتھ متعدی کرتے ہیں تو اس کا معنی بلاواسطہ واقع ہوتا ہے۔ اور ایمان والوں کے پاس نازل شدہ قرآن پیغمبر علیہ السلام کے واسطہ سے پہنچا ہے نہ کہ بلاواسطہ ان پر واقع ہوا۔ جبکہ پیغمبر علیہ السلام کے قلب مقدس پر بلاواسطہ وارد ہے۔ اس وجہ سے اس آیت میں نزول کا صلہ حرف الیٰ کو کیا گیا اور اُس آیت میں حرف علیٰ کو۔ لیکن چونکہ اس آیت میں نزول کی تعدیت کی ابتدا میں حرف الیٰ کو اختیار کیا گیا تو نظم کلام کی موافقت کے لیے انبیاء علیہم السلام کے ذکر میں بھی اسی حرف کے ساتھ متعدی کیا گیا۔ تا کہ کلام کی روش معنی صحیح ہونے کے باوجود متعدد نہ ہو اس لیے کہ وصول و انتہا اس سے عام ہے کہ بلاواسطہ ہو یا بالواسطہ نبوت واسطہ میں نص نہیں ہے۔

اور وہ جو اہلِ عربیت میں سے بعض اس وجہ پر اعتراض کرتے ہیں کہ اگر یہ فرق صحیح ہوتا تو آیت وَاِذَا قِیْلَ لَھُمْ آمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ قَالُوْا نُؤْمِنُ بِمَآ اُنْزِلَ عَلَیْنَا میں عَلٰی کا استعمال صحیح نہ ہوتا اس لیے کہ یہ کلام یہودیوں سے حکایت ہے۔ جو کہ انبیاء نہ تھے۔ اور ان پر بلاواسطہ نزول نہیں ہوا تھا۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہودی یہ بات فخر و مباہات اور تعصب کے مقام پر کہتے تھے تو اس کلام میں ان کی مراد نزول بلاواسطہ تھا یعنی عَلٰی اَنْبِیَآئِنَا اور اس قسم کے مقام میں اپنے آباء و اسلاف کے مرتبوں کو اپنی طرف منسوب کرنا مجاز متعارف ہے۔ جیسا کہ سادات میں سے بعض کے قول میں واقع ہے کہ فینا النبوۃ والمعراج والکرم اور جب سورۂ آل عمران کی آیت میں مخاطب پیغمبر علیہ السلام ہیں تو کسی تفصیل و وضاحت کی ضرورت نہ تھی اس لیے کہ ان کی قوتِ ایمانی اور ان کے اعتقاد کا تمام ایمانی معتقدات کو جامع ہونا معلوم ہے۔ اس لیے ضروری طور پر وہاں کلام کو اختصار پر مبنی کر دیا گیا اور ما اوتی کے لفظ کو دوبارہ نہ لایا گیا اور حرفِ عطف پر اکتفاء فرمایا بخلاف اس آیت کے کہ اس میں ایمان والوں کو تفصیلی ایمان کی تلقین پیش نظر ہے۔ اور ابھی یہ لوگ

اس مکتب کے نوآموز طفل ہیں' وضاحت و تفصیل ان کے حال کے مطابق ہے۔

نیز سورۂ آلِ عمران کی آیت سے پہلے وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ لَمَآ اٰتَيْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّحِكْمَةٍ گزرا ہے۔ اور جو کچھ تمام انبیاء علیہم السلام کو عطا فرمایا گیا ہے اس کے متعلق اجمالی طور پر علم ہو چکا۔ تو مقامِ اجمال میں اس مطلب کا اعادہ تکرار محض ہوتا ہے۔ البتہ بعض انبیاء علیہم السلام کی تفصیل اور تخصیص کے مقام میں اس کا ذکر مفید ہے بخلاف اس آیت کے کہ اس سے پہلے کوئی ایسی چیز مذکور نہیں ہے کہ اجمالی طور پر تمام انبیاء علیہم السلام کو کتاب و حکمت عطا کرنے کا پتہ دینے والی ہو۔ پس اجمال و تفصیل دونوں میں مَآ اُوْتِيَ کا ذکر ضروری ہوا۔

اُنْزِلَ اور اُوْتِيَ کے فرق کی حکمت

اب ہم یہاں آتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور حضرت ابراہیم علیہ السلام اور آپ کی اولاد کے ذکر میں لفظ نزول وارد فرمایا گیا ہے۔ جبکہ حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیٰ نبینا وعلیہما السلام کے ذکر میں لفظ مَآ اُوْتِيَ لایا گیا ہے' یہ فرق کس وجہ سے ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کی اولاد پر غیب سے احکام اُتارنے کا راستہ وحی بردار فرشتے کا نزول تھا اور بس۔ جیسا کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر بھی اسی راستہ سے علوم ڈالے جاتے تھے۔ جیسا کہ تواریخ سے معلوم ہوتا ہے۔ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ اس باب میں دو طرح سے سلوک ہوتا تھا' پہلے تو زبرجد کی منقش تختیاں دینا جن پر تورات لکھی ہوئی تھی۔ اور دوسرے کسی فرشتے کے واسطے کے بغیر خباء المحضر میں بالمشافہ نازل ہوتا تھا جو کہ تجلی الٰہی کا خیمہ اور بارگاہ تھی۔ اور ان دونوں طریقوں میں کوئی نزول و عروج نہ تھا۔ اور اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ بھی دو طریقوں سے سلوک تھا: پہلے انجیل عطا کرنا' دوسرے ان کے سینے میں روح القدس کا پھونک مارنا اور ان کی زبان میں گفتگو کرنا اور ان دونوں طریقوں میں بھی انہیں کوئی نزول محسوس نہیں ہوتا تھا بلکہ یہ معاملہ لین دین کے قبیلے سے تھا' ان دونوں طریقوں کے فرق کی بناء پر حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ (علیہم السلام) کے ذکر میں مَآ اُوْتِيَ کا لفظ لایا گیا۔ اور جب اس لفظ کو ان کے ذکر میں استعمال کیا گیا تو انبیاء علیہم

السلام کے مجمل ذکر میں بھی اسی لفظ کو کام میں لایا گیا تا کہ ترک کیے گئے لفظ کی طرف رجوع نہ ہو اور معنی کے صحیح ہونے کے باوجود نظم کلام میں انتشار رونما نہ ہو۔

اور یہاں تک جو کچھ مذکور ہوا' ایمان کے ارکان اور اعتقادی واجبات تھے اب فرمایا ہے کہ ایمان والوں کو چاہیے کہ اسی قدر پر قناعت کریں بلکہ اس مرتبے سے اُوپر کی طرف ترقی ڈھونڈیں اور کہیں کہ ہم نے اختیار کیا۔

صِبْغَةَ اللّٰهِ خدا تعالیٰ کے رنگ کو۔ اور ہم نے اپنے آپ کو اس کے رنگ میں رنگین کر لیا۔ جس طرح کہ رنگ کپڑے کے ظاہر و باطن میں داخل ہو جاتا ہے۔ اور اس کی وجہ سے وہ کپڑا دوسرے کپڑوں سے ممتاز ہو جاتا ہے۔ اور اسی طرح توحید الٰہی نے ہمارے رگ و پوست میں آ کر ہمارے اعضاء کو قبضہ میں کر لیا۔ پس ہمارا ظاہر و باطن اور قلب و جسم اسی کی ملکیت ہو گیا جیسا کہ نصاریٰ جب کسی کو اپنے دین میں داخل کرتے ہیں یا نیا بچہ پیدا ہوتا ہے' اسے نصرانی بناتے ہیں۔ ایک زرد رنگ جسے معمور یہ کہتے ہیں' ایک برتن میں ڈالتے ہیں۔ اور اس نئے آدمی کو اس میں غوطہ دیتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ اب یہ شخص نصرانی ہو گیا۔ اور دوسرے ادیان۔ سے پاک ہو گیا۔ لیکن ان کا یہ رنگ دو تین دنوں میں نہانے دھونے کی وجہ سے زائل ہو جاتا ہے۔ اس لیے کہ وہ صرف جلد کے ظاہر پر ہے۔ جبکہ ہمارا رنگ خدا تعالیٰ کا رنگ ہے جو تہہ دل سے جوش مارتا ہے۔ اور باطن و ظاہر کو رنگ دیتا ہے۔

وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً اور رنگین کرنے میں خدا تعالیٰ سے زیادہ اچھا کون ہے۔ اس لیے کہ مخلوقات کا رنگ نہ احاطہ کرتا ہے نہ باقی رہتا ہے۔ اس لیے کہ اگر ظاہری رنگ ہے تو صرف جسم کے چمڑے پر ہے۔ اور اگر باطنی رنگ ہے تو بھی قوائے باطنہ میں سے ایک قوت کے ساتھ مخصوص ہے۔ جیسے فلسفہ کا رنگ صرف قوتِ عقلیہ پر ہے۔ اور بدعت کا رنگ صرف قوتِ وہمیہ پر ہے۔ جو کہ شیطان کا مرکب ہے۔ اور منسوخ ملتوں کا رنگ صرف عادت و رسم پر ہے۔ اور محبت دنیا کا رنگ صرف قوتِ شہویہ پر ہے۔ اور حکومت و سلطنت کا رنگ صرف قوتِ غضبیہ پر ہے۔ اور یہ تمام رنگ ادنیٰ سے دھکے سے جو کہ اس قوم کو پہنچتا ہے' زائل ہو جاتے ہیں۔ اور دوسرے رنگ کے غلبہ کی وجہ سے مغلوب ہو جاتے

ہیں۔ بخلاف اس خدائی رنگ کے کہ نہ تو شبہات' حوادث اور مصیبتوں کے پانی سے متغیر ہوتا ہے نہ کوئی اور رنگ اس پر غالب آتا ہے۔ جیسا کہ رنگ ریزوں کے رنگنے والے رنگ پانی' سورج' دھوئیں اور غبار کی وجہ سے متغیر ہو جاتے ہیں۔ اور انہیں دوسرے رنگ بھی بدل سکتے ہیں۔ اور تخلیقی رنگ جو کہ خدا تعالیٰ کی طرف سے ہیں۔ جیسے یاقوت کی سرخی' مرجان کی زردی' سنگِ موسیٰ کی سیاہی' سنگِ مرمر کی سفیدی اور اسی قیاس پر نباتات' پھلوں' پھولوں' گلستانوں اور چرنے اُڑنے والے حیوانات کے رنگ نہیں بدلتے۔

چنانچہ ضیاء مختارہ میں ابن عباس رضی اللہ عنہما سے لائے کہ بنی اسرائیل نے عرض کی اے موسیٰ علیہ السلام! کیا آپ کا رب رنگ دیتا ہے۔ فرمایا اللہ تعالیٰ سے ڈرو۔ تو آپ کے رب نے آپ کو ندا دی اے موسیٰ! (علیہ السلام) انہوں نے آپ سے پوچھا کہ کیا آپ کا رب رنگ دیتا ہے تو آپ فرمائیں میں مختلف رنگ دیتا ہوں' سرخ' سفید' سیاہ اور سب رنگ میرے رنگ میں ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی علیہ السلام پر یہ آیت اُتاری۔ صِبْغَةَ اللّٰهِ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً اور ہمارے باطن کا یہ رنگ جو کہ خدا تعالیٰ کا رنگ ہے کیونکر زائل ہو سکتا ہے۔ حالانکہ ہم ہمیشہ اس رنگ کے ثبات و دوام کی فکر میں ہیں۔ اور ہمیشہ اس کی بقاء اور جلاء کے علاج میں کوشش کرتے ہیں۔

وَنَحْنُ لَهٗ عَابِدُوْنَ اور ہم صرف اسی کی عبادت کرنے والے ہیں۔ اور عبادت باطن کے رنگ کو دُور کرتی ہے۔ اور قلب اور اعضاء کو چمکاتی اور صاف کرتی ہے۔ پس وہ رنگ ہمیشہ بارونق معلوم ہوتا ہے۔ بلکہ روز بروز زیادہ ہوتا ہے خصوصاً جب ریا' خود بینی اور تعصب قومیت کی آمیزش کے بغیر اخلاص اور قانون کی محافظت کے طریقے سے عبادت ہو کہ یہ باطن کے آئینے سے زنگ دُور کرنے میں تریاق مجرب ہے۔

خدا تعالیٰ کا رنگ کیا ہے؟

ہم اس بات کی تحقیق پر پہنچے کہ یہ خدا تعالیٰ کا رنگ جسے ایمان والوں کو اختیار کرنے کا حکم فرمایا گیا ہے' کیا چیز ہے؟ سب سے زیادہ صحیح یہ ہے کہ وہ رنگ اللہ تعالیٰ کے حضور سر تسلیم خم کرنا اور اطاعت کرنا اور اس کے اوامر و نواہی پر مطمئن ہونا ہے۔ جو کہ اس کے ہر حکم میں

پوری خوشی اور رغبت کے ساتھ تعمیل کرنے کا باعث ہوتا ہے۔ اور تعصب' سخن پروری' اور اپنے آباء و اجداد کی رسم کے ساتھ اپنی وضع اور آئین کی حفاظت کا کوئی رنگ یا مشقتیں یا خلافِ طبع کو قبول کرنے سے کاہلی اور غیر مانوس چیزوں کی گرانی باقی نہیں چھوڑتا۔ اور یہ ملکہ ایمان سے جدا ہے۔ اور ورزش اور کمال ایمان کے سبب سے حاصل ہوتا ہے۔ اور طاعتیں اور اچھی عادتیں جیسے خوف' حیا' محبت' شوق' انکساری' عاجزی' دوام حضور' نگرانی' پرہیزگاری اور تقویٰ سب اس کے آثار میں سے ہیں۔ اور قلب سے قالب تک محیط ہو جاتا ہے۔ اسی لیے اسے رنگ کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ جب کوئی اس حد تک کسی کی مرضی کے تابع ہو جاتا ہے تو کہتے ہیں کہ فلاں تو فلاں کے رنگ میں رنگا گیا ہے۔

اور دوسرے مفسرین نے اس رنگ کی رنگارنگ اور طرح طرح کی تفسیریں کی ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ دین اسلام قبول کرنے کو فعل نصاریٰ سے مشاکلت کی بناء پر جو کہ اپنے بیٹوں اور اولاد کو زرد پانی کے ساتھ رنگین کر کے کہتے تھے کہ اب صحیح نصرانی ہو گیا اس عبارت میں رنگِ خدا کا نام دیا گیا ہے۔ اور بعض نے کہا ہے کہ صبغۃ اللہ سے مراد فطرۃ اللہ ہے۔ جس پر اس نے ہر فرد انسانی کو پیدا فرمایا ہے۔ جیسا کہ دوسری جگہ ارشاد ہوا فِطْرَةَ اللّٰهِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ (الروم آیت ۳۰) اور وہ فطرت جب آدمیوں کے رنگنے کے بغیر خدا تعالیٰ کی مقرر کی ہوئی ہے' تو رنگ طبعی کے ساتھ پوری مشابہت رکھتی ہے۔ جبکہ مختلف مذاہب اور ملتیں جیسے یہودیت' نصرانیت اور مجوسیت یا تو شیطانی القاء کی وجہ سے نفس میں جگہ پکڑتی ہیں یا ماں' باپ' قوم اور خاندان کے گمراہ کرنے کی وجہ سے۔ جیسا کہ حدیث شریف میں وارد ہے **کل مولود یولد علی الفطرۃ فابواہ یہودانہ او ینصرانہ او یمجسانہ** یعنی ہر بچہ فطرت پر پیدا کیا جاتا ہے تو اس کے والدین اسے یہودی یا نصرانی یا مجوسی بنا دیتے ہیں۔

اور بعض نے کہا ہے کہ اس سے مراد ختنہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے دین کی اطاعت کا بدن پر ظاہر ہونے والا اثر یہی ہے۔ جس طرح کپڑے پر رنگ اور بعض نے کہا ہے کہ صبغۃ اللہ اس نفسانی کیفیت سے عبارت ہے۔ جو کہ بندے کو اپنے خالق کے ساتھ حاصل ہوتی ہے۔

اور ہمیشہ قائم رہنے کی بناء پر رنگ کا حکم حاصل کر لیتی ہے۔ اور ظاہر و باطن میں سرایت کرتی ہے۔ جیسے شوق کے ساتھ دوام حضور' صفائی کے ساتھ وحد' انکساری اور فنائے نفس کے ساتھ طہارت اور صوفیا کے عرف میں اس نفسانی کیفیت کو نسبت الی اللہ کا نام دیتے ہیں۔ بلکہ ان میں سے ایک گروہ نے ہر لطیفہ کی نسبت کے لیے جدا جدا رنگ ثابت کیا ہے۔ جیسے سفیدی' سرخی' سیاہی' زردی اور سبزی۔

اور اگر اہلِ کتاب کہیں کہ اگر تم نے فی الحال اپنے آپ کو رنگ خدا کے ساتھ رنگین کیا ہے۔ اور اس کی عبادت میں مشغول ہو گئے ہو تو ہم تو کئی نسلوں سے رنگ خدا میں رنگین اور اس کی عبادت میں مشغول ہیں۔ اور ہمارا دین تمہارے دین سے بہت قدیم ہے۔ اور ہماری کتاب تمہاری کتاب سے پہلے آئی۔ اور ہم میں نبوت و رسالت جاری رہی۔ اور خدا کے بیٹے اور محبوب ہونے کا مرتبہ ہمیں حاصل ہے نہ کہ تمہیں نَحْنُ اَبْنَآءُ اللّٰهِ وَاَحِبَّآءُهٗ (المائدہ آیت ۱۸) اس کی مرضی کے جس طرح ہم واقف ہیں' تم نہیں ہو سکتے ہو تو ان کے جواب میں قُلْ کہو' اَتُحَآجُّوْنَنَا فِی اللّٰهِ کیا تم ہمارے ساتھ خدا تعالیٰ کے متعلق جھگڑا کرتے ہو۔ کہ وہ کس کا ہے' ہمارا یا تمہارا؟ جیسا کہ اہلِ دنیا کسی باغ اور کسی زمین کے بارے میں جھگڑتے ہیں۔ تو تمہارا یہ جھگڑا بالکل فضول ہے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ جس طرح تمہارا ہے' ہمارا بھی ہے۔

وَهُوَ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ اور وہ ہمارا پروردگار اور تمہارا پروردگار ہے۔ اس لیے کہ اس کی ربوبیت کل مخلوقات کے لیے عام ہے۔ ذراتِ عالم کا ہر ذرہ اسی کا پیدا کیا ہوا اور پروردہ ہے۔ اور اگر تم کہتے کہ ہماری عبادات اور طاعات اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں مقبول ہیں۔ جبکہ تمہاری عبادات و طاعات اس کی بارگاہ میں قبول نہیں ہیں۔ تو یہ نزاع بھی نرا بے معنی ہے اس لیے کہ جو عبادت اور طاعت بھی اس کے فرمان پر کی جائے اس کی بارگاہ میں مقبول ہے۔

وَلَنَآ اَعْمَالُنَا اور ہمارے لیے ہمارے اعمال ہیں۔ جو کہ ہم اس کے حکم کے مطابق اس دور میں کر رہے ہیں۔ وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ اور تمہارے لیے تمہارے اعمال ہیں۔ جو کہ تم

نے اس کے حکم کے مطابق اس وقت کیے جب کہ وہ منسوخ نہیں ہوئے تھے۔ فرق صرف اس قدر ہے کہ تمہارے اعمال آباء واجداد کی رسم کی حفاظت کی بناء پر تھے۔ اور تعصب' نفسانیت اور اعراض دنیوی کے ساتھ ملوث خالص اللہ تعالیٰ کے لیے نہ تھے۔ وَنَحْنُ لَهٗ مُخْلِصُوْنَ اور ہم اسی کے لیے عبادت کو خالص کرنے والے ہیں کہ آباء واجداد کی رسم اور تعصب' نفسانیت اور دنیوی اغراض کو ہم اس میں دخل نہیں دیتے۔ اور جب تمہارے یہ دونوں جھگڑے بے دلیل ظاہر ہوئے تو اب تم کیا کہتے ہو؟ آیا یہ کہتے ہو کہ ہمارا دین اور آئین حضرت ابراہیم' اسماعیل' اسحاق اور یعقوب علیہم السلام اور ان کی اولاد کے دین و آئین سے بہتر ہے۔ کیونکہ ظاہر ہے کہ وہ یہودی اور نصرانی نہیں تھے' یہودیت اور نصرانیت ان کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر مقرر ہوئی۔

اَمْ تَقُوْلُوْنَ کیا تم جہالت اور بات پالنے کو کہتے ہو کہ اِنَّ اِبْرَاهِيْمَ وَاِسْمَاعِيْلَ وَاِسْحَاقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطَ کہ تحقیق ابراہیم' اسماعیل' اسحاق' یعقوب (علیہم السلام) اور ان کی اولاد۔ باوجودیکہ تورات اور انجیل کے نزول سے پہلے اور یہودیت ونصرانیت کے مقرر ہونے سے پیشتر ہو گزرے ہیں' كَانُوْا هُوْدًا اَوْ نَصَارٰى یہودی یا نصرانی تھے۔ اور یہ دونوں شقیں باطل ہیں۔ اور اگر اہلِ کتاب سخن پروری اور تعصب کی بناء پر خود اسی شق کو اختیار کریں جس کا باطل ہونا بالکل ظاہر ہے۔ اور کہیں کہ ہاں یہ جماعت اس معنی میں یہودی اور نصرانی تھے کہ ان کی شریعت معمولہ یہودیت ونصرانیت کی شریعت کے مطابق تھی گو تورات وانجیل اور یہودیت ونصرانیت کے تقرر سے پہلے گزر گئے ہوں۔ پس ان کے جواب میں قُلْ کہیے ءَ اَنْتُمْ اَعْلَمُ اَمِ اللّٰهُ کیا تم زیادہ جانتے ہو یا خدا تعالیٰ۔ خدا تعالیٰ نے خود ہمیں خبر دی ہے کہ مَا كَانَ اِبْرَاهِيْمُ يَهُوْدِيًّا وَّلَا نَصْرَانِيًّا وَّلٰكِنْ كَانَ حَنِيْفًا مُّسْلِمًا وَّمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ (آل عمران آیت ۶۷) نیز تعمیر کعبہ کے واقعہ میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام نے دعا کی ہے۔ وَاَرِنَا مَنَاسِكَنَا۔ نیز انہیں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ اور یہودیوں اور نصرانیوں کی شریعت میں خانہ کعبہ کے حج کے مناسک کہاں ہیں؟ اور نماز میں رکوع کہاں

ہے؟ بلکہ تورات اور انجیل میں بھی اسی مضمون کی روشن نصوص موجود ہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کی اولاد بالکل حقیقت حنفیت پر تھے۔ اور ہفتہ کی حرمت اور یہودیت کی دوسری بڑی خصوصی پابندیاں ان پر مقرر نہ تھیں۔ اور اسی قیاس پر لوازم نصرانیت جیسے اتوار کے دن کی تعظیم ان کی شریعت میں نہ تھی۔ لیکن تم ان واضح نصوص کو مناظرہ ومجادلہ کے وقت تعصب اور سخن پروری کی بناء پر چھپا لیتے ہو اور ظاہر نہیں کرتے ہو تاکہ تمہیں خفت اور الزام نہ پہنچے۔

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَتَمَ شَهَادَةً اور اس شخص سے زیادہ ظالم کون ہے۔ جو کہ ایک گواہی کو بھی چھپالے۔ جو کہ ثابت ہو عِنْدَهٗ اس کے نزدیک کہ وہ شہادت مِنَ اللّٰهِ خدا تعالیٰ کی طرف سے ہے۔ جبکہ تم ان تمام واضح شہادتوں کو چھپاتے ہو اور صرف اسی قدر پر اکتفاء نہیں کرتے ہو۔ بلکہ ان نصوص کی تحریف اور انہیں تبدیل کرتے ہو۔

وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ اور اللہ تعالیٰ اس سے غافل نہیں جو کچھ اس چھپانے اور تحریف وتغیر میں کرتے ہو۔ اگر اقتدار والے بادشاہ کا قاصد تم پر نگہبان ہو اس سے ڈر کر اس کے حکم میں جعل سازی اور دھوکہ دہی نہیں کرتے ہو۔ جبکہ اس بادشاہوں کے بادشاہ سے جس کے اقتدار کے سامنے بادشاہوں کا اقتدار بے حقیقت ہے۔ اور وہ تم پر نگہبان اور آگاہی رکھتا ہے' نہیں ڈرتے ہو۔ اور اس کے کلام میں بے دریغ جعل سازی اور دھوکہ کرتے ہو۔ اور اگر تم اس بات پر غرور کرتے ہو کہ ہم انبیاء (علیہم السلام) کی اولاد ہیں۔ اور ہمارے اسلاف مقبولان بارگاہِ خداوندی تھے۔ اور ہمارے گروہ میں نبوت اور رسالت جاری رہی ہے۔ اور انہیں خدا تعالیٰ محبوب رکھتا تھا تو یہ خیال تمہیں کوئی فائدہ نہیں کرے گا' چاہیے کہ تم اپنے اعمال کو ان اسلاف کے اعمال کے مطابق کرو تاکہ تم سرخ رو ہو جاؤ۔

تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ یعنی وہ ایک جماعت تھی جو کہ گزر گئے۔ اور اپنے اعمال اپنے ساتھ لے گئے۔ تمہارے لیے ان اعمال کا ذخیرہ چھوڑ کر نہیں گئے ہیں جو تمہارے کام آئے۔ جس طرح کہ دنیوی مال ومتاع جو کہ باپ اپنے بیٹوں کے لیے چھوڑ جاتے ہیں۔

اور غربت اور ضرورت کے وقت بیٹوں کے کام آتا ہے۔ اس لیے کہ

لَهَا مَا كَسَبَتْ اس جماعت کے لیے جو کہ گزر چکی ہے اس کی جزا ہے جو انہوں نے کمایا۔ اور اگر تمہارے لیے وہ اعمال چھوڑ جاتے تو انہیں اعمال کا بدلہ نہ ملتا بلکہ تمہیں ملتا۔

وَلَكُمْ مَا كَسَبْتُمْ اور تمہارے اس کی جزا ہے جو تم کماتے ہو۔ اگر تمہارے گناہوں کو وہ برداشت کرتے تو ان گناہوں کی سزا انہیں ملتی نہ کہ تمہیں۔ اور عمل کی جزا اس عمل کے کرنے والے کے غیر کو دینا تمہارے نزدیک بھی عدل کے خلاف اور حکمت کے منافی ہے۔ اور تم ان کے اعمال کی جزا کی کس طرح توقع کرتے ہو۔

وَلَا تُسْئَلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ اور تم سے اس کا سوال نہیں کیا جائے گا۔ جو کہ گزشتہ جماعت والے کرتے تھے۔ اور عمل کی جزا نہیں ملتی مگر سوال کے بعد اور غیر کے عمل کے متعلق کسی شخص کو سوال کرنا خلافِ عقل ہے۔ کیونکہ ہر شخص اپنے غیر کے اعمال پر اطلاع نہیں رکھتا تاکہ اس کے جواب میں ذمہ داری سے باہر آئے۔ تو تمہارا یہ خیال نری کم عقلی اور بے وقوفی ہے۔

اور اس تقریر سے معلوم ہوا کہ یہاں اس آیت کا تکرار باوجود یہ کہ ابھی قریب ہی گزرا ہے، تکرار معنوی نہیں ہے کہ بلاغت میں مخل ہو۔ اس لیے کہ پہلے مقام پر اس آیت سے غرض یہ تھی کہ تمہارے اعمال و افعال کسی طرح بھی تمہارے گزشتہ اسلاف کے اعمال و افعال کے ساتھ مناسبت نہیں رکھتے۔ اور ان کی وصیتوں پر تم میں عمل باقی نہ رہا۔ اور یہاں غرض یہ ہے کہ اپنے اسلاف کی نیکی اور بزرگی پر اعتماد کر کے گواہی اور واضح حق کو چھپانے کا اقدام اور دوسرے اعمال قبیحہ کا ارتکاب کمال بے وقوفی اور بے عقلی ہے۔ جو کہ تم سے صادر ہوتی ہے۔

کم عقلی اور بے وقوفی میں اور زیادہ بڑھے ہوئے وہ لوگ ہیں جو کہ تمہیں میں سے ہیں کہ ان کی بے وقوفی اور بے عقلی بالکل آشکارا ہے، عنقریب ظاہر ہو جائے گی اس لیے کہ

سَيَقُوْلُ السُّفَهَآءُ عنقریب بے عقلوں اور بے وقوفوں کا ایک گروہ کہے گا اور ان کی اس حماقت اور کم عقلی کے باوجود صورت انسانی کے ساتھ ان کی صورت کی مشابہت پر نظر

کرتے ہوئے فرمایا ہے۔ مِنَ النَّاسِ کہ لوگوں کے زمرہ سے ہیں۔ ورنہ فہم و عقل میں انسانیت کا کوئی حصہ بھی نہیں رکھتے۔ جب دیکھیں گے کہ مسلمانوں نے نماز میں ایک قبلہ سے دوسرے قبلہ کو منہ کر لیا ہے مَاوَلّٰهُمْ کون سی چیز ان مسلمانوں کو روگردانی کرنے کا باعث ہوئی۔

عَنْ قِبْلَتِهِمُ الَّتِیْ کَانُوْا عَلَیْهَا اپنے اس قبلہ سے جس پر وہ تھے۔ آیا اس قبلہ میں انہوں نے کوئی نقصان پایا یا دوسرے قبلہ میں ان پر کوئی بزرگی اور کمال ظاہر ہوا کہ اس کو چھوڑ کر اس کی طرف متوجہ ہو گئے؟ اگر وہ قبلہ ناقص تھا۔ اور یہ کامل تو شروع سے ہی کامل کو کیوں اختیار نہ کیا۔ اور ناقص کو کیوں نہ چھوڑا۔ تو یہ معاملہ ان کی ناعاقبت اندیشی کی دلیل ہے۔ اور اگر پہلے قبلہ کو یہود کے تعصب کی بناء پر چھوڑا یا قبلۂ دوم کو اس بناء پر اختیار کیا کہ اپنی قوم سے محبت ہے۔ کیونکہ یہ اہلِ مکہ ہیں تو معلوم ہوا کہ انہیں دینی معاملات میں مخالفین کے تعصب اور اپنی قومیت کی جانب داری کا پاس ہے صرف حق کے طالب نہیں ہیں۔ اور آپ جب ان سے اس قسم کی بات سنیں تو جواب میں

قُلْ فرمائیں۔ کہ ان چیزوں میں سے کوئی ایک بھی اس قبلہ سے روگردانی کا باعث نہیں ہوئی۔ اس لیے کہ ہمارے دین کی بنیاد فرمانِ خداوندی ہے نہ کہ اپنی عقل ناقص کی پسندیدہ چیزوں کی پیروی اور نہ ہی تعصب اور اپنی قومیت کا پاس۔ بلکہ ہمارے لیے اس روگردانی کا باعث حکمِ خداوندی ہے کہ ایک مدت تک اس قبلہ کی طرف منہ کرنے کے لیے ہوا تھا اب اس قبلہ کو منہ کرنے کے لیے ہوا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کسی جہت اور مکان کے ساتھ مقید نہیں ہے۔ بلکہ

لِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ اللہ تعالیٰ ہی کے لیے ہے زمین کی مشرق اور زمین کی مغرب۔ جس مکان کو چاہے قبلہ مقرر فرما دے جب چاہے اسے موقوف کر کے دوسرے مکان کو قبلہ بنا دے تو ہم سے روگردانی کی وجہ پوچھنا تمہاری کمال کم عقلی اور بے وقوفی ہے۔ اور تمہارا یہ پوچھنا بعینہ اس شخص کے پوچھنے کی طرح ہے۔ جو کہ کسی شخص کے غلام سے پوچھے کہ اس مدت تک تو یہ کام کرتا رہا اب اس کام کو چھوڑ کر دوسرا کام کیوں نہیں کرتا؟ اور وہ سمجھتا

نہیں کہ غلام کا کوئی ارادہ اور خواہش نہیں ہوتی۔ ارادہ تو صرف مالک کا ارادہ ہے۔ جس کام میں چاہے اسے مصروف کر دے اور اگر ہم سے تمہارا پوچھنا اس غرض سے ہے کہ ہم تمہیں اپنے مالک کے مختلف احکام کے اسرار سے آگاہ کریں تو ہم اس کے تمام اسرار اور مخفی حکمتوں پر مطلع ہی نہیں ہیں نہ ہی تم ان اسرار کے فہم کی صلاحیت رکھتے ہو اس لیے کہ اسرار کو سمجھنے کے لیے ایک اور حوصلہ چاہیے جو کہ تم میں نہیں ہے۔ البتہ تمہارے سامنے ہم اتنا کہتے ہیں کہ قبلہ کا تعین صرف راہِ عبادت دِکھانے کے لیے ہے۔ اصل عبادت میں داخل نہیں ہے۔ اور اپنے بندوں کو راہِ عبادت دِکھانے میں اللہ تعالیٰ کے معاملات مختلف ہیں' کسی کو ایک راہ سے پتہ دیتا ہے تو کسی کو دوسری راہ سے اور وہ راہیں استقامت میں مختلف ہیں۔

یَهْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ اپنے بندوں میں سے جسے چاہے جب چاہے' راہ نمائی فرماتا ہے۔ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ سیدھی راہ کی طرف جو کہ سب سے نزدیک راہ ہے۔ جس طرح کہ اس وقت ہمیں راہ دِکھائی ہے کہ سب سے بہتر قبلہ کا حکم دیا۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ جس طرح آدمی کو قوتِ عقلیہ دی گئی ہے کہ اس قوت کے ساتھ مجردات کا ادراک کرتا ہے قوتِ خیالیہ بھی عطا فرمائی گئی ہے۔ جس کی وجہ سے وہ عالم اجسام میں داخل ہوتا ہے۔ اور جب قوتِ خیالیہ' قوتِ عقلیہ کی مدد کرتی ہے تو اس کا کام زیادہ قوی اور زیادہ مستحکم ہوتا ہے۔ جس طرح انجینئر مقداروں کے احکام کے ادراک کے وقت جب تک کہ صورتوں اور شکلوں کی تصویر و تشکیل نہیں کرتا۔ اور حس اور خیال کو اپنی قوتِ عقلیہ کا مددگار نہیں کرتا' ان احکام کو بخوبی دریافت نہیں کرتا۔ اور اسی طرح جو کوئی کسی بادشاہ یا امیر کا ثناء و تعریف کے ساتھ قرب چاہتا ہے' پہلے اس بادشاہ اور امیر کے رُخ کی طرف منہ کر کے کھڑے ہو جاتا ہے پھر ثنا و تعریف میں مشغول ہو جاتا ہے۔

اور عبادت کی روح جو کہ خشوع ہے کے حصول کا تصور سکون اور دائیں بائیں جھانکنا چھوڑنے کے بغیر نہیں ہے۔ اور سکون اور ترک التفات حاصل نہیں ہوتے مگر اس وقت جب کہ عبادت کرنے والا عبادت کے وقت ایک معین سمت کو لازم کرے۔ اور اس سے نہ پھرے۔ قصہ مختصر ظاہر کا باطن کے ساتھ ایک تعلق ہے کہ توجہ ظاہری میں قصد کا ایک ہونا

توجہ باطنی میں قصد کے ایک ہونے کے سبب سے ہوتا ہے۔اسی وجہ سے نماز میں استقبال قبلہ ضروری ہوا۔لیکن چاہیے کہ وہ قبلہ تمام مخلوق کے لیے ایک معین چیز ہوتا کہ ان کے ظاہر کا اتفاق ان کے باطن کے اتفاق کا موجب ہو۔اور جب ان کا باطن انوار و برکات عبادت کا فیض لینے میں متفق ہو جاتا ہے تو اس عبادت سے دل کو روشن کرنے میں عظیم اثر پیدا ہوتا ہے۔جس طرح ایک مکان میں ایک ہی سمت میں بہت سے چراغوں کا اتفاق بہت عظیم روشنی کرنے کا موجب ہوتا ہے۔اور اسی نکتہ کے لیے جمعہ اور جماعات جاری کیے گئے ہیں۔ لیکن پنجگانہ جماعت میں ایک محلے والوں کا اتفاق نورِ عبادت کے زیادہ ہونے کا موجب ہوتا ہے۔اور جمعہ میں ایک شہر والوں کا اتفاق۔اور حج میں تمام جہان والوں کا اتفاق اور چونکہ سب جہان والوں کا ایک مقام میں ہر وقت اتفاق مشکل ہے تو ناچار اس مکان کی سمت کو اس کے قائم مقام کر کے اوقات نماز اور دوسری عبادات میں اس سمت منہ کرنے کا حکم بطور فرض یا مستحب مصلحت کے عین مطابق ہوا۔نیز چاہیے کہ وہ مکان اور وہ سمت مخلوقات کے ساتھ کوئی تعلق یا محسوس یا معقول کمال نہ رکھتے ہوں۔جیسے انبیاء علیہم السلام اور اولیاء اللہ کے مزارات یا سورج اور چاند یا آگ اور دریا۔ورنہ عوام کے حق میں وہ عبادت اس مخلوقات کی طرف متوجہ اور ان محسوس و معقول کمالات کے ساتھ مصروف ہو جائے گی۔اور باری تعالیٰ کی ذات پاک تک نہ پہنچے گی جیسا کہ چاہیے کہ عینک کا شیشہ رنگین نہ ہو صاف اور بے رنگ ہو تاکہ نگاہ کی شعاع اس سے نکل کر اس چیز تک پہنچے جسے دیکھنا مقصود ہے۔اور عینک کے رنگ کے حجاب میں اُلجھ کر نہ رہ جائے۔اور اسی لیے اس سمت اور اس مکان کے تعین کو امر سماوی غیبی کے ساتھ وابستہ ہونا چاہیے۔اور اپنی عقول اور سوچوں کے ساتھ اس کے تعین و تشخص میں دخل نہیں دینا چاہیے۔

نیز عبادت حضرت معبود کا حق ہے۔اور کسی کے حق کو اس کے حکم کے بغیر کسی مصرف میں خرچ نہیں کرنا چاہیے۔اور جب تک اس کی طرف سے تنخواہ کا پروانہ نہ پہنچے کسی کو نہ دینا چاہیے۔اسی بناء پر حضرت آدم علیہ السلام کے بارے میں جو کہ نوع بشر کے ابوالاباء ہیں۔ اور اس کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام کے حق میں جو کہ ابوالملت ہیں' سب جہتوں سے

کامل جہت اور سب مکانوں سے افضل مکان کو قبلہ ہونے کے لیے معین فرمایا۔ اس لیے کہ کعبہ معظمہ انسان کا خاکی مبداء ہے کہ اس مبداء سے اوپر اسے حس کے ساتھ معلوم نہیں ہوسکتا اور جب یہ کام حس کا کام ہے تو اس کے مدرکات سے بالاتر نہیں جانا چاہیے۔ کیونکہ پہلے گزر چکا کہ زمین کو جو کہ انسان کا اصل عنصری ہے اسی نقطہ کے نیچے سے پھیلا کر بچھایا گیا ہے۔ جب عابد کا ظاہر اپنے مبداء ظاہر کی طرف متوجہ ہوا تو عوامل ظاہرہ اور باطنہ کے باہم ایک دوسرے کے مقابل اور دونوں نسخوں غیب وشہادت کی باہمی مطابقت کی بناء پر اس کا باطن اپنے مبدء باطن کی طرف متوجہ ہوگا۔

اتینا طائعین کہنے کا فیض حضور علیہ السلام سے حاصل ہوا

نیز روایات کے مطابق ثابت ہوا ہے کہ اسی مکان سے ذرۂ محمدیہ علیٰ صاحبہ الصلوٰۃ والتسلیمات نے اپنے پروردگار کے حکم کو قبول فرمایا ہے جب آسمان اور زمین کو اتیا طوعًا اَوْ کَرْھًا کا حکم ہوا۔ اور ساتوں آسمانوں میں سے اس قطعۂ زمین کی محاذات میں جو کچھ تھا' آپ کی پیروی میں جواب میں شریک ہوکر عرض گزار ہوا اتینا طائعین۔ تو جب مشاہدہ میں آنے والی مخلوقات میں سے اس قطعۂ زمین اور اس کی محاذات نے اپنے پروردگار کی طرف توجہ میں تمام ذرات عالم سے سبقت کی ہو تو پھر عبادت کے وقت ان سے روگردانی' قدردانی اور حق شناسی کے خلاف ہے۔

صخرۂ بیت المقدس کو قبلہ قرار دینے کی حکمت

البتہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اُمت کے حق میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زمانے تک اور ان انبیاء علیہم السلام کے حق میں جو کہ ان دونوں کے درمیان تھے' صخرۂ بیت المقدس کو ایک نکتے کے لیے قبلہ بنایا گیا تھا۔ اور وہ نکتہ یہ تھا کہ وہ صخرۂ اپنی ہولناک صورت کے ساتھ جو کہ تھی۔ اور آسمان اور زمین کے درمیان معلق تھا' راہِ عبادت اور اطاعت سے منہ موڑنے والوں کو ڈرانے کے لیے جلاد کے کوڑے کی مانند ہے کہ گنہگار بے اختیار ہوکر اس کے نیچے سر جھکاتے ہیں۔ اور حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کی اُمت محبت اور شوق کی راہ

سے بے خبر تھی' وہ ڈرانے کے بغیر عبادت کا حق ادا نہیں کر سکتے تھے تو ناچار انبیاء علیہم السلام کو بھی اس وجہ سے کہ اُمت کے مقتداء ہوتے ہیں اسی معلق صخراء کی طرف منہ کرنے کا حکم ہوتا تھا۔ نیز اس مقام کی آخرت میں ایک خصوصیت ہے کہ عرشِ الٰہی کی تجلی اسی مقام پر ہو گی۔ اور اہلِ قیامت بھی اسی کے اردگرد کھڑے ہوں گے۔ پس اس مکان کی طرف منہ کرنا حالت قیامت' اعمال کے متعلق باز پرس کے خوف' حساب اور وزن اعمال کو یاد کرانے والا ہے۔ اور اسی راز کی وجہ سے حضرت سلیمان (علیہ السلام) نے جب اس صخرہ پر قبہ تعمیر فرمایا ہے۔ اور اس کے ساتھ ایک مسجد بنائی' مسجد سے باہر بہشت اور دوزخ کی تصویر کو قیامت کی ہولناکیوں کو یاد کرنے کے لیے درست فرمایا ہے۔ اور حضور علیہ السلام جب بعثت کی ابتدا سے حضرت آدم (علیہ السلام) اور حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کے کمالات سے مشرف ہوئے۔ اور آپ نے کعبہ معظمہ کے پڑوس میں نشو ونما پائی اور بچپن سے ہی اس گھر کی تعظیم سے مانوس ہوئے تو پہلے آپ کو اسی گھر کی طرف جو کہ قبلوں سے افضل واکمل تھا۔ منہ کرنے کا حکم دیا گیا۔ یہاں تک کہ آپ کو شب معراج بیت المقدس لے گئے۔ اور اس پڑوس میں جلوہ گر انبیاء علیہم السلام کی ارواح کے ساتھ آپ کی ملاقات واقع ہوئی۔ اور ان کی نبوت کی برکات بھی حضرت آدم و ابراہیم علیہما السلام کے انوار و نبوت کے ساتھ مل گئیں اور وہیں سے آسمان کی طرف چڑھنا حاصل ہوا۔ تو ناچار کچھ مدت کے لیے آپ کو ضروری تھا کہ ان انبیاء علیہم السلام کی نبوت کے آثار و برکات کی تفہیم و تکمیل کے لیے نیز شکرانہ معراج اور اس کے اثر کو باقی رکھنے کے لیے اس قبلہ کی طرف منہ کریں۔ اور توجہ الی اللہ کا اس صورت کے ساتھ مشاہدہ کریں۔ اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نماز میں اس طرح کھڑے ہوتے تھے کہ کعبہ اور بیت المقدس دونوں کا استقبال ہاتھ سے نہ جائے۔ چنانچہ بیہقی اپنی سنن میں ابوداؤد ناسخ و منسوخ میں اور ابن ابی شیبہ' حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت کے ساتھ لائے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مکہ شریف میں بیت المقدس کی طرف نماز ادا فرماتے۔ درآں حالیکہ کعبہ شریف آپ کے سامنے ہوتا۔ اور مدینہ عالیہ تشریف لے جانے کے بعد سولہ (۱۶) ماہ تک یہ سلسلہ رہا پھر آپ کو کعبہ شریف کی طرف پھیر دیا گیا۔ یوں صخرہ

بیت المقدس کا اس وقت استقبال کمالات انبیائے بنی اسرائیل علیہم السلام کے ساتھ تکمیل کے لیے تھا کہ شب معراج ان کی نبوت کے انوار اجمالی طور پر انوارِ محمدیہ کے ساتھ ملحق ہو گئے تھے۔ نیز اس بنا پر کہ اس مقام میں معراج واقع ہونے کے باعث ان کے حق میں اس مقام کو ایک شرف اور فضیلت مل گئی تھی۔ اور اس مقام کا استقبال ذوالقبلتین کے لقب کے سچا ہونے کا باعث ہوا جو کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خصائص میں پہلے انبیاء علیہم السلام سے منقول ہے۔ اور تمام انبیاء (علیہم السلام) کے کمالات کے جمع کرنے کا اشارہ کرتا تھا۔ گویا حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی بعثت کی ابتدا میں حضرت آدم اور حضرت ابراہیم علیہم السلام کے خلیفہ تھے۔ اور معراج کے بعد انبیاء بنی اسرائیل علیم السلام کی خلافت بھی پالی اور جب مدینہ عالیہ کو ہجرت فرمائی تو دونوں قبلوں کا استقبال ممکن نہ تھا۔ کیونکہ وہاں سے دو باہم مقابل سمتوں میں واقع ہیں۔ ناچار حضور علیہ السلام نے یہاں ایک باریک اجتہاد فرمایا۔ اور جان لیا کہ جب مجھے مکہ سے مدینہ عالیہ ہجرت کرنے کا حکم ہوا تو لازماً مکہ کی طرف پشت اور بیت المقدس کی طرف منہ کیے ہوئے جاؤں گا۔ بہتر یہ ہے کہ عبادت کے وقت بھی اسی امر کے تابع رہوں۔ اور استقبال کعبہ پر استقبال بیت المقدس کو ترجیح دے کر مکہ معظمہ سے نکلنے کے دن سے جو کہ ماہ ربیع الاول شریف کا پہلا دن تھا دوسرے سال کے رجب کے نصف تک کہ سولہ ماہ اور کچھ کسر کی مدت ہوتی ہے۔ اور اس مدت کو کسر کی تتمیم کے طریقے سے بعض راویوں نے سترہ ماہ (۱۷) بھی کہا ہے۔ بیت المقدس کی سمت میں نماز ادا فرماتے تھے۔ اور جب کمال محمدی کا عروج اپنے پوری بلندی پر پہنچ گیا اور آپ حضرت آدم' ابراہیم' موسیٰ' عیسیٰ علیہم السلام کے کمالات بلکہ تمام انبیائے بنی اسرائیل کے کمالات کے جامع ہوئے۔ اور غزوۂ بدر جو کہ ظہور خلافت کی ابتدا تھی قریب آ پہنچا تو ناچار آپ کو النہایہ الرجوع الی البدایہ کے حکم کے مطابق پھر سمت کعبہ کی طرف متوجہ کر دیا گیا اور یہ تحویل آپ کے کمال کی انتہا کا اشارہ ہوا۔ اس لیے کہ اس سمت کی طرف ظاہر بدن کی توجہ جب باطن کی جناب حق کی طرف توجہ کو لازم کرنے والی ہے تو وہاں کوئی فاصلہ نہیں ہے۔ اور معراج گویا ذکر نا فاصلہ پائے جانے' مراحل طے کرنے اور منازل سے گزرنے کا پتہ دینے والا ہے۔ اور وہ بُعد اور

دوری کا نشان دیتا ہے۔ عین قرب کے وقت بُعد اور دوری کو یاد نہیں کرنا چاہیے۔ پس حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس ترتیب کے ساتھ دونوں قبلوں کے استقبال کا اتفاق ہوا۔ پہلے آپ کے جبلی کمال کی وجہ سے سب سے کامل قبلہ آپ کو عطا ہوا۔ پھر مزید عروج اور دوسرے انبیاء علیہم السلام کے کمالات حاصل کرنے کے لیے صخرۂ بیت المقدس کی طرف توجہ ضروری ہوئی تا کہ جامع کمالات کی ہیات ناقص نہ رہیں۔ پھر اسی کمال کی طرف رجوع واقع ہوا۔ اسی لیے یہ راہ عبادت کی نزدیک ترین راہ ہوئی جو کہ کمال کی ہر نوع کی جامع اور دونوں طرف استقبال کی برکات پر حاوی ہوئی۔

چند سوالات

یہاں چند ایک جواب طلب سوال باقی رہ گئے۔ ان میں سے ایک سوال یہ ہے کہ ابھی قبلہ کی تبدیلی نہیں ہوئی تھی۔ اور آیت قد نری تقلب وجھك فی السماء جو کہ بیت المقدس کے استقبال کی ناسخ ہے ذکر نہیں ہوئی تھی۔ اور سفہاء کا مقولہ بھی جو کہ اس پر متفرع تھا گفتگو میں نہیں آیا تھا۔ واقعہ کے وقوع سے پہلے پیش بندی کس لیے فرمائی گئی ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ اکثر مفسرین نے کہا ہے کہ آیت قد نری تقدب وجھك فی السماء نزول میں اس سے پہلے ہے پس ان کے مقولے کا باعث ثابت تھا۔ اگرچہ ابھی ان کا مقولہ صادر نہیں ہوا تھا۔ اور جب کسی امر کا باعث متحقق ہو جائے تو گویا وہ امر متحقق ہو گیا۔ اس کا بندوبست کرنا حکیم کی نظر میں واجب کی طرح ہوتا ہے۔ اور اگر نزول کی ترتیب بھی قرأت کی ترتیب کے مطابق ہو تو کہا جا سکتا ہے کہ اس پیش بندی میں چند عمدہ فائدوں کا قصد کیا گیا ہے۔ ان میں سے نفیس فائدہ یہ ہے کہ اس معجزانہ کلام میں غیب کی خبر واقع ہو اور اس کلام کے اعجاز کے دلائل میں سے ایک دلیل ہو۔

دوسرا فائدہ یہ ہے کہ مکروہ واقعہ کا اچانک رونما ہونا آدمی کی طبیعت پر بہت ناگوار اور گراں گزرتا ہے۔ اور اگر اس واقعہ کے رونما ہونے سے پہلے اس کا پتہ چل جائے تو اس کا نفس اس واقعہ کے خیال اور تصور سے مانوس ہو کر اس کے واقع ہونے کے وقت اتنا بے چین اور بے راہ نہیں ہوتا۔ جیسا کہ تجربہ سے معلوم ہوتا ہے۔ تو جب پیغمبر علیہ السلام اور

مسلمانوں کو پہلے ہی پتہ چل جائے کہ بے وقوفوں کا ایک گروہ اس قسم کا بے جا سوال کرے گا تو اس سوال کے واقع ہونے کے وقت پریشان نہیں ہوں گے۔ اور وہ مبنی بر طعن سوال ان کی طبیعت پر ناگوار نہیں ہوگا۔ تیسرا فائدہ یہ ہے کہ جو جواب پہلے سے ہی مہیا اور تیار ہو دشمن کی فی الفور دنداں شکنی کرتا ہے۔ اور سوچنے اور فکر کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ اور دشمن کے نزدیک جواب حاضر تردیدکلی پیدا کرتا ہے۔ اور اسی لیے مثالوں میں عرب کہتے ہیں کہ قبل الرمی یراش السہم۔ تیراندازی سے پہلے تیر جمع کیے جائیں۔

دوسرا سوال یہ ہے کہ ان کے اس سوال میں سفاہت اور حماقت کی دلیل کون سی چیز ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ سفاہت کا معنی عقل کا ہلکا ہونا ہے۔ اور ان کا منسوخ قبلہ چھوڑنے اور مقرر کردہ قبلہ کی طرف منہ کرنے کی وجہ پوچھنا باوجود مسلمانوں کے حال کو جاننے کے کہ یہ خداتعالیٰ کی طرف سے کسی حکم کے نزول کے بغیر کوئی حرکت وسکون نہیں کرتے کم عقلی کی صریح دلیل ہے۔ اور جب کسی ایسے شخص کو جو کہ اپنا مال جا اور بے جا خرچ کرتا ہے۔ اور آخرت کے نفع اور نقصان کو نہیں پہچانتا شرع میں بے وقوف فرمایا گیا ہے جہاں یہ ارشاد ہوا کہ لا تؤتوا السفھاء اموالکم التی جعل اللہ لکم قیاما (النساء آیت ۵) تو جو شخص اپنی آخرت کو بالکل ہی برباد کردے اور اس رسول علیہ السلام پر طعنہ زنی کرے جن کی نبوت دلائل کے ساتھ ثابت ہو وہ کیونکر بے وقوف نہیں ہوگا؟

تیسرا سوال یہ ہے کہ سفہاء کا لفظ ذکر کرنے کے بعد من الناس کے ذکر میں بظاہر کوئی فائدہ معلوم نہیں ہوتا اس لیے کہ کم عقلی بھی آدمیوں کی مخصوص صفت ہے۔ جیسا کہ عقلمندی۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اس لفظ کو لانے کی وجہ دوران تفسیر گزر چکی ہے۔ اور اس کے علاوہ یہاں یہ وجہ ہے کہ اس صفت کے ذکر میں اس بات کا اشارہ ہے کہ ان لوگوں میں آدمی ہونے کے علاوہ کوئی اور علامت نہیں ہے۔ جیسا کہ جاء نی رجل من الرجال میں کہتے ہیں۔ اور رایت انسانا من لاناسی میں مقرر ہے۔ اور جب پیغمبر علیہ السلام کو بے عقلوں کے سوال کے جواب میں تلقین سے فراغت ہوئی اب ایمان والوں کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ جس طرح ہم نے تمہارے قبلہ کو قبلوں سے افضل قرار دیا ہے۔ اسی طرح تمہاری

ملت کو ملتوں سے افضل کیا اور اسی طرح تمہارے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تمام انبیاء علیہم السلام کے کمالات کا جامع کر دیا۔

وَكَذَٰلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطًا اور اسی طرح ہم نے تمہیں درمیانی اُمت کیا۔ اس گھر کی طرح جو کہ شہر کے درمیان ہو یا اس مکان کی طرح جو گھر کے درمیان ہو۔ یا اس مسند کی طرح جو کہ محفل کے وسط میں بچھائی گئی ہو یا اس سردار کی طرح جو کہ حلقۂ مجلس کے درمیان بیٹھا ہو اور سارے اہل حلقہ اس کی طرف منہ کیے ہوئے ہوں اور اس معنی میں جو بھی درمیان ہو ہے اپنے دوسرے ہم جنسوں سے بہتر ہوتا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ تمہارا قبلہ بھی ملت بھی اور رسول کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام بھی ممتاز اور برگزیدہ ہیں۔ اور ہم نے یہ سب کچھ اس لیے کیا۔

لِّتَكُونُوا تاکہ تم ہو جاؤ۔ اپنی اس سرداری اور قابل اعتبار ہونے کی وجہ سے شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ لوگوں پر نافذ الحکم گواہ۔ کہ تمہاری گواہی ان کے بارے میں معتبر ہے۔ اور تمہارا حکم ان میں نافذ' خواہ وہ لوگ یہودی ہوں یا نصرانی' خواہ دوسرے انبیاء علیہم السلام کے امتی ہوں خواہ بے دین ہوں۔ جیسے مجوسی' صابی' ہندو اور یونانی' اور اسی طرح دنیا و آخرت میں واقع ہوا۔ اس لیے کہ دنیا میں حق تعالیٰ نے مسلمانوں کو ظاہری شوکت اور غلبہ عطا فرمایا۔ اور اس وجہ سے مسلمانوں نے سب پر حکمرانی کی اور ان کے درمیان قضیوں کے اپنے احکام کی گواہی کے ساتھ فیصلے کیے اور کرتے ہیں۔ حتیٰ کہ نصاریٰ اور یہودی اپنے پورے غلبہ میں قضا کا مرتب اور مہذب دستور نہیں رکھتے مجبوراً کچہریوں اور فیصلوں میں اسلام کے شرعی احکام سے مدد حاصل کرتے ہیں۔

لوگوں پر مسلمانوں کے گواہ ہونے کی تفصیلات

نیز مسلمانوں کو وسعت ذہن' فراخی علم اور حق کی شناخت میں اس طرح گہرائی عطا فرمائی کہ انہوں نے تمام گروہوں کے علوم کو امتحان کی کسوٹی پر رکھ کر ان علوم کے سچے یا جھوٹے ہونے کی گواہی دی اور ان کی گواہی کی وجہ سے ان گروہوں نے اپنی غلطیوں پر متنبہ ہو کر اپنا مذہب اور معلومات کو بدل دیا۔ اور اپنے مذہب کی توجیہہ کے پردہ میں اپنے

مذہب باطل کی اصل سے ہی دست بردار ہو گئے بلکہ اس کا ذکر کرتے ہوئے شرمانے لگے۔
جیسا کہ نصاری تثلیت کے عقیدہ میں' یہود تشبیہ کے عقیدہ میں' ہندو حلول کے عقیدہ میں' فلاسفہ عقلوں کو واسطہ بنانے' جزئیات کے علم کی نفی' عالم کے قدیم ہونے کے بعد نفس کے فنا ہونے میں' مجوسی حرام چیزوں کو حلال جاننے' ثنویہ خالق کے متعدد ہونے کے قول میں۔
نیز طبیعت کی نفاست' کاریگریاں' قسم قسم کے کھانے اور لباس ظاہر کرنے اور ہر طرح سے لذائذ کا استعمال' پُر فضا مکانات کی ترتیب اور حلال طریقے سے زندگی بسر کرنا اور آسودگی سے رہنا انہیں اس قدر عنایت فرمایا گیا کہ ان امور میں بھی وہ تمام گروہوں کے پیشوا ہیں۔ اور عبادت' ریاضت' تصفیۂ نفس' تنویر باطن' مجاہدات کے نتائج حاصل کرنے' مستقبل کے واقعات کے کشف اور معرفت کے مقدمہ کے طور پر علوم رمل و جفر کے نکالنے میں انہیں اس قدر گہرائی نصیب ہوئی کہ دوسرے لوگ ان امور میں ان کی شاگردی پر بھی فخر کرتے ہیں۔ اور مشہور مثال کے مطابق آنچہ آدم می کند بوزینہ ہم یعنی جو کچھ آدم زاد کرتا ہے بندر بھی وہی کرتا ہے۔ اپنے آپ کو ان کے رنگ میں لاتے ہیں اگرچہ نسبت زربفت بنانے والے اور بوریا بنانے والے کی ہے۔ نیز حکم شرع کے مطابق اس اُمت کا اجماع تمام خلائق کے حق میں ایک لازم القبول حجت ہے۔ جیسا کہ مدعی علیہ کے بارے میں گواہ کی گواہی۔ پس اس اُمت کا حکم عام لوگوں کے بارے میں پیغمبر (علیہ السلام) کے اپنی اُمت کے بارے میں حکم کی مانند ہے۔ جو کہ خطا سے معصوم اور واجب القبول ہے۔ اور آخرت میں جب تجلی الٰہی کے حضور انبیاء علیہم السلام کا اپنی امتوں سے جھگڑا ہوگا۔ اور ہر پیغمبر علیہ السلام کے امتی اس پیغمبر علیہ السلام کی تبلیغ کے منکر ہو جائیں گے۔ یہ اُمت انبیاء علیہم السلام کے لیے گواہی دے گی۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اس اُمت نے تصدیق خدا اور بغیر کسی تفریق اور امتیاز کے تمام انبیاء علیہم السلام کی تصدیق میں نہایت جلدی کی ہے یہ لوگ دوسری امتوں کی نسبت فاسقوں اور جھوٹ بولنے والوں کے مقابلہ میں عدالت اور تقویٰ والوں کا حکم رکھتے ہیں۔ پس دوسروں کے حق میں ان کی شہادت قبول ہوگی جبکہ دوسری امتوں کی گواہی ان کے حق میں مقبول نہ ہوگی۔

نیز چونکہ یہ دوسری امتوں کے زمانے کے بعد پیدا ہوئے ہیں۔ خدا تعالیٰ اور اپنے رسول علیہ السلام کے خبر دینے کی وجہ سے دوسری امتوں کے حالات پر آگاہ ہو گئے ہیں۔ جبکہ دوسرے پہلے زمانے میں ہو گزرے ہیں۔ اور وہ ان کے حالات پر آگاہ نہیں ہوئے پس انہیں دوسروں پر گواہی ممکن ہے۔ اور دوسروں کی ان پر گواہی ناممکن۔ اسی لیے جب ان کی گواہی کے رد میں دوسری امتیں کہیں گی کہ تم کس طرح گواہی دیتے ہو حالانکہ تم ہمارے وقت میں نہیں تھے۔ اور واقعہ کے وقت تم حاضر نہ تھے۔ وہ جواب میں کہیں گے کہ ہمیں رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وسیلے سے اللہ تعالیٰ کی خبر پہنچی اور ہمارے نزدیک یقین کا فائدہ دینے کے لیے یہ خبر دیکھنے اور حاضر ہونے سے کہیں بہتر ہے۔ اور گواہی میں مشہور علیہ کے متعلق یقینی علم چاہیے جس طرح بھی حاصل ہو جائے۔

اور اس قصہ کو سند صحیح کے ساتھ محدثین نے روایت کیا ہے' بخاری اور دوسری صحاح میں مروی ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کو قیامت کے دن بلایا جائے گا۔ تو آپ سے کہا جائے گا کہ کیا آپ نے پیغام حق پہنچایا؟ آپ کہیں گے ہاں۔ تو آپ کی قوم کو بلایا جائے گا تو انہیں کہا جائے گا کہ کیا انہوں نے تمہیں تبلیغ کی؟ تو وہ کہیں گے کہ ہمارے پاس کوئی نبی (علیہ السلام) نہیں آیا۔ پس حضرت نوح علیہ السلام سے کہا جائے گا آپ کے حق میں کون گواہی دے گا؟ آپ کہیں گے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کی امت۔ پس وہ بلائے جائیں گے پس وہ آپ کے حق میں تبلیغ کی گواہی دیں گے۔ اور میں تم پر گواہی دوں گا' تو یہ معنی ہے آیت کریمہ وَكَذَٰلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطًا کا اور وسط سے مراد عادل' اور امام احمد' نسائی اور ابن ماجہ اس قصہ کے تتمہ میں یہ الفاظ بھی لائے ہیں کہ پس کہا جائے گا کہ تمہیں کس نے علم دیا تو وہ کہیں گے ہمارے پاس ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تشریف لائے تو آپ نے ہمیں یہ خبر دی کہ بیشک رسل علیہم السلام نے تبلیغ فرمائی۔

اموات کے متعلق اس امت کے صلحاء کی گواہی کے مطابق جزا و سزا

اور اس اُمت کی مقبول گواہوں میں سے مرنے والوں کے حق میں ان کی گواہی ہے کہ رحمت اور عذاب کے فرشتے اسی کے مطابق مرنے والوں کو جزا و سزا دینے میں عمل

کرتے ہیں۔ لیکن اس گواہی کی قبولیت اس اُمت کے صلحاء اور اہل صدق کے ساتھ خاص ہے۔ بخاری، مسلم اور دوسری صحاح میں حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک دن حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے کسی کا جنازہ لے جا رہے تھے۔ لوگوں نے اس کی تعریف کی، آپ نے فرمایا واجب ہوگئی۔ پھر ایک اور جنازہ لے گئے، لوگوں نے اس کی برائی بیان کی، فرمایا واجب ہوگئی۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے عرض کی یا رسول اللہ! کیا چیز واجب ہوئی۔ ارشاد فرمایا کہ پہلے جنازے پر تم لوگوں نے اچھی تعریف کی اس کے لیے جنت واجب ہوگئی۔ اور اس جنازہ پر تم نے برائی بیان کی اس کے لیے جہنم واجب ہوگئی۔ تم زمین میں اللہ تعالیٰ کے گواہ ہو، اور حکیم ترمذی کی نوادر الاصول میں اس واقعہ کی روایت کے بعد یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس آیت کی تلاوت فرمائی۔

اچھوں کی گواہی پر خدائی فیصلہ

امام احمد، بیہقی نے شعب الایمان میں اور دوسرے محدثین نے روایت کی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے تھے کہ جو مسلمان فوت ہو جاتا ہے۔ اور اس کے چار نزدیکی ہمسائے کہتے ہیں کہ ہم اس کے حال سے جو کچھ جاتے ہیں نیک تھا۔ حق تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں نے تمہاری گواہی کو قبول فرمایا۔ اور اس کے حال سے جو کچھ تم نہیں جانتے ہو اس سے میں نے درگزر فرمائی اور اسے بخش دیا۔ لیکن یہ سب گواہیاں زبان کی حفاظت اور اس کی لگام قابو میں رکھنے کے ساتھ مشروط ہیں چنانچہ مسلم اور دوسری صحاح میں حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ کی روایت سے مروی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے تھے کہ لعنت کرنے والے قیامت کے دن نہ خوش ہوں گے نہ شفیع۔ گویا اس مذموم عادت کو کثرت سے عمل میں لانے سے ایک آدمی اُمت محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والتسلیمات سے باہر ہو جاتا ہے۔ معاذ اللہ۔ اور ایک عظیم اعزاز جو کہ اس اُمت کے ساتھ مخصوص ہے کھو بیٹھتا ہے۔

حضور علیہ السلام کی امت کے لئے خصوصی انعام

سعید بن منصور اور ابن ابی حاتم، کعب احبار سے روایت لائے ہیں کہ اس اُمت کو

تین ایسی چیزیں عطا فرمائی گئی ہیں کہ انبیاء علیہم السلام کے سوا کسی کو میسر نہیں ہیں: پہلی چیز یہ ہے کہ ہر نبی علیہ السلام کو حکم ہوتا تھا کہ بلغ ولاحرج یعنی تبلیغ کرو اور تم پر کوئی تنگی نہیں۔ اور اس اُمت کے لیے بھی فرمایا گیا ہے کہ مَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ (الحج آیت ۷۸) دوسری چیز یہ ہے کہ ہر نبی (علیہ السلام) اپنی اُمت پر گواہ ہوتا ہے۔ جبکہ اس اُمت کے لیے فرمایا گیا ہے لِتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ تیسری چیز یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کو حکم ہوتا تھا کہ تم دعا کرو میں قبول کروں گا۔ جبکہ اس ساری اُمت سے فرمایا گیا ہے

ادعونی استجب لکم (المومن آیت ۶۰)

اور اگر قیامت کے دن دوسری امتیں تمہارے اس اعتبار اور عدالت کا انکار کریں تو تمہارے لیے اپنی عدالت اور اعتبار ثابت کرنے کے لیے ایک سرٹیفکیٹ اور سند ہوگی۔

وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا اور تمہارے رسول (علیہ السلام) تم پر گواہ ہوں گے۔ اس لیے کہ وہ نور نبوت کے ساتھ دین قبول کرنے والے ہر شخص کے مرتبہ سے آگاہ ہیں کہ وہ میرے دین کے کس درجہ میں پہنچا ہے۔ اور اس کے ایمان کی حقیقت کیا ہے؟ اور وہ کون سا پردہ ہے۔ جس کی وجہ سے وہ ترقی سے محروم رہا ہے۔ پس آپ پہچانتے ہیں تمہارے گناہوں کو تمہارے ایمان کے درجات کو تمہارے نیک و بد اعمال کو اور تمہارے اخلاص و نفاق کو اور اسی لیے حکم شرع کی وجہ سے دنیا میں اُمت کے حق میں آپ کی گواہی مقبول اور واجب العمل ہے اور وہ جو آپ اپنے زمانے کے حاضرین جیسے صحابہ کرام، ازواج مطہرات اور اہل بیت یا اپنے زمانے سے غائبوں جیسے اویس، صلہ، مہدی اور قتل کرے گا۔ جسے دجال کے فضائل و مناقب یا حاضروں اور غائبوں کے عیب اور برائیاں بیان فرماتے ہیں ان پر اعتقاد واجب ہے۔

اور یہی وجہ ہے کہ روایات میں آیا ہے کہ ہر نبی علیہ السلام کو اپنے امتیوں کے اعمال پہ مطلع کیا جاتا ہے کہ فلاں آج یوں کر رہا ہے۔ اور فلاں یوں تا کہ قیامت کے دن گواہی ادا کر سکیں۔ اور جب تمہارے پیغمبر علیہ السلام تمہیں عادل قرار دیں اور تمہاری معتبری بیان فرمائیں تو پھر تمہیں دوسری امتوں کے انکار سے کیا خطرہ۔

چند بحثیں جنہیں بیان کرنا واجب ہے

یہاں چند واجب البیان بحثیں باقی رہ گئیں: پہلی بحث یہ ہے کہ اس اُمت کی صفت میں جو وسط فرمایا ہے اس کا کیا معنی ہے؟ اس لیے کہ مرتبہ کے اعتبار سے یہ اُمت تمام امتوں سے اعلیٰ اور بہتر ہے۔ ایک اور آیت کی دلیل سے کہ فرمایا کنتم خیر امة اخرجت للناس (آل عمران آیت ۱۱۰) اور پیدائش کے اعتبار سے سب سے پیچھے اور نیچے۔ پس اس اُمت کا درمیان میں ہونا کس اعتبار سے درست ہوسکتا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس اُمت کے توسط سے مراد اس کا طبعی یا زمانی توسط نہیں بلکہ اس کا توسط وضعی ہے۔ اور توسط وضعی کو بہتر اور اعلیٰ ہونا لازم ہے۔ پس توسط وضعی کا معنی کنائی بہتری اور بلند ہونا ہے۔ اور وہ عین خیریت ہے۔ اور توسط وضعی کے لیے خیریت کے لازم ہونے کا بیان تفسیر میں گزر چکا کہ رکھنے' بنانے' لٹکانے' بچھانے' موتی اور تسبیح کے پرونے وغیر میں جو اعلیٰ اور نفیس تر ہوتا ہے اسے درمیان میں جگہ دیتے ہیں۔ اور اس کی تابع چیزوں کو اس کے اردگرد جگہ دیتے ہیں تاکہ اسے بزرگی کی وجہ سے گھیرے میں لیے ہوئے محفوظ رکھیں اور اسی لیے کہتے ہیں کہ خیریت صرف وسط میں ہے۔ اور اردگرد مشقتیں ہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ اعلیٰ اور بہتر ہونا اس لفظ کا کنائی معنی ہے نہ کہ صریح معنی' اور اہل بلاغت کے نزدیک مقرر قاعدہ کہ الکنایة ابلغ من الصریح۔

اور بعض مفسرین نے اس لفظ کے صریح معنی مراد لیے ہیں۔ اور کہا ہے کہ اس اُمت کے توسط سے مراد عقائد' اعمال' اخلاق' ہر باب میں میانہ روی ہے۔ اس لیے کہ یہ اُمت تمام صفات کمال میں نہ غلو کرتی ہے کہ افراط کی صورت بن جائے۔ اور نہ ہی اس میں اتنی کمی کرتی ہے کہ حد تفریط کو پہنچ جائے۔ اور قابل تعریف یہی میانہ روی ہے۔ نہ یہودیوں کی طرح شان انبیاء علیہم السلام میں اس قدر بے باکی اور کوتاہی کرتے ہیں کہ انہیں معاصی اور گناہوں کی آماجگاہ جان کر ان کی عصمت کا انکار کر دیا حتیٰ کہ انہیں قتل کرنے اور ستانے کے لیے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ اور نہ نصاریٰ کی طرح کہ اپنے نبی (علیہ السلام) کی شان میں غلو اور افراط کرتے ہوئے انہیں مرتبۂ بندگی سے باہر نکال کر بیٹا ہونے کی حد تک پہنچا دیا۔ علیٰ

ہذا القیاس تمام اعتقادات' اعمال اور اخلاق میں میانہ روی اسی اُمت کے نصیب ہے۔ اور بس۔

لیکن اس توجیہہ پر بعض لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ صفات کمال میں درجہ کی بلندی قابل تعریف ہے نہ کہ درمیانہ ہونا' تو مقام مدح میں توسط کو کیوں لانا چاہیے؟ اس اعتراض کا جواب یہ ہے کہ جو قابل تعریف ہے وہ صفات کمال میں مرتبہ کا بلند ہونا ہے۔ لیکن صفت کمال ہونے کے لیے توسط لازم ہے۔ اور معترض پر یہ بلندی مرتبہ اس مرتبہ کے ساتھ مشتبہ ہوگئی ہے۔ جو کہ صفت کمال کو حد کمال سے باہر کر دیتی ہے۔ اور اسے ایک مثال کے ساتھ واضح کیا جاسکتا ہے۔ اگر شجاعت اس درمیانی صفت سے باہر آ جائے۔ اور تہور کی طرف مائل ہو تو صفت کمال نہیں رہے گی کہ شجاعت کے درجہ کی بلندی قابل تعریف وستائش امر ہوتا ہے۔ اور اس کا راز یہ ہے کہ ہر صفت کمال میں جب مرتبہ کی بلندی کا قصد قابل تعریف میانہ روی کا لحاظ کیے بغیر کیا جائے تو لازماً دوسرے کمال میں کمی اور تفریط تک پہنچائے گا جس طرح پیغمبر (علیہ السلام) کے حق میں اعتقادی افراط جناب باری تعالیٰ کی شان تنزیہہ میں تقصیر تک لے گیا اور اس کے لیے مخلوق کی طرح انہوں نے ایک بیٹا ثابت کر دیا۔ پس قابل تعریف وہی میانہ روی ہے نہ کہ بلندی۔ البتہ میانہ روی کے درجات میں بلندی قابل تعریف ہے۔ لیکن وہ بلندی عین میانہ روی ہے۔

اور مفسرین کا ایک گروہ اس طرف ہے کہ وسط جس طرح لغت میں میانہ روی اور متوسط کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ اسی طرح معتبر اور عادل کے معنوں میں بھی آیا ہے۔ جیسا کہ زہیر بن ابی سلمٰی کے بیت میں واقع ہوا۔ ہم وسط یرضی الانام بحکمھم' اذا انزلت احدی اللیالی بمعضم' اور اس کی وجہ یہ ہے کہ حاکم اور پنچ مدعی اور مدعی علیہ کے درمیان ہوتا ہے اس کی رعایت بھی کرتا ہے۔ اور اس کی بھی۔ پس لفظ وسط جو کہ میانہ کے معنوں میں ہے اس کے لیے نقل کر کے دوسری وضع کی گئی ہے۔ جیسے لفظ میانجی فارسی لغت میں سفیر اور وکیل کے معنوں میں۔

دوسری بحث یہ ہے کہ اگر اس اُمت کی گواہی سے مراد آخرت میں گواہی ہے جیسا کہ

از روئے روایات صحیحہ ثابت ہوا۔ اور تمام روایات سے زیادہ صریح روایت حضرت عبداللہ بن مبارک کی ہے کتاب الزہد میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک اپنی سند کے ساتھ کہا کہ جب اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو قیامت کے دن جمع فرمائے گا۔ تو سب سے پہلے اسرافیل کو بلایا جائے گا۔ پس اس کا رب فرمائے گا کہ میرے عہد کے بارے میں تو نے کیا کیا؟ کیا میرا عہد پہنچا دیا۔ تو وہ عرض کرے گا ہاں یا رب میں نے جبریل (علیہ السلام) تک پہنچا دیا۔ پس جبریل (علیہ السلام) کو بلایا جائے گا تو اسے کہا جائے گا کہ کیا تجھے اسرافیل (علیہ السلام) نے میرا عہد پہنچا دیا۔ وہ کہے گا! ہاں۔ پس اسرافیل (علیہ السلام) کو رخصت دے دی جائے گی پھر جبریل (علیہ السلام) سے فرمایا جائے گا کیا تو نے میرا عہد پہنچا دیا؟ وہ عرض کرے گا! ہاں میں نے رسل علیہم السلام کو پہنچا دیا۔ پس رسل علیہم السلام کو بلایا جائے گا تو ان سے کہا جائے گا کیا جبریل (علیہ السلام) نے تمہیں میرا عہد پہنچا دیا؟ وہ کہیں گے! ہاں ہمیں جبریل (علیہ السلام) نے پہنچا دیا۔ اور ہم نے امتوں تک پہنچا دیا۔ پس امتوں کو بلایا جائے گا تو انہیں کہا جائے گا کہ کیا تمہیں پیغمبروں نے میرا عہد پہنچایا' تو ان میں سے کوئی تکذیب کرے گا۔ اور کوئی تصدیق کرے گا۔ پس رسل علیہم السلام عرض کریں گے ان کے خلاف ہمارے پاس گواہ ہیں۔ وہ کہیں گے کون؟ رسل علیہم السلام کہیں گے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی امت۔ پس آپ کی اُمت کو بلایا جائے گا تو انہیں کہا جائے گا کہ کیا تم اس امر کی گواہی دیتے ہو کہ رسل علیہم السلام نے امتوں تک میرا عہد پہنچایا۔ تو وہ کہیں گے! ہاں' تو امتیں کہیں گی اے ہمارے پروردگار! یہ لوگ ہمارے خلاف کیسے گواہی دے سکتے ہیں۔ حالانکہ ہم نے انہیں پایا نہ انہوں نے ہمیں پایا' تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اُمت عرض کرے گی اے ہمارے پروردگار! تو نے ہماری طرف ایک عظیم الشان رسول علیہ السلام بھیجا اور تو نے ہم پر کتاب نازل فرمائی اور اس میں تو نے ہمارے سامنے یہ بیان فرمایا کہ رسل علیہم السلام نے تبلیغ فرمائی' تو ہم ان پر اس کی گواہی دیتے ہیں جس کا تو نے ہم سے عہد لیا۔ پس رب تعالیٰ فرمائے گا انہوں نے سچ کہا۔ پس وہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ

تو لوگوں پر اس اُمت کی گواہی خود صحیح ہوئی لیکن اس صورت میں ان کے رسول علیہ السلام کی ان کے متعلق گواہی کی کیا ضرورت ہے؟ اس لیے کہ انہوں نے وہ گواہی قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کی مبنی بر صداقت خبروں کی وجہ سے بلاواسطہ دی ہے۔ اور انہیں سچی خبروں کی وجہ سے الزام لگائیں گے۔ اور بات ختم ہو جائے گی۔ اور اگر اس اُمت کی گواہی دنیا میں ہے تو اس اُمت نے تمام لوگوں کو نہیں پایا ہے کہ ان پر گواہی دیں۔ اور نہ رسول علیہ السلام نے ظاہری زمانہ کے اعتبار سے ساری اُمت کو پایا کہ ان کے حال پر گواہی دیں۔

اس کا جواب یہ ہے کہ دونوں گواہیاں مراد ہیں دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔ جیسا کہ تفسیر میں گزرا لیکن ان کی گواہی آخرت میں اپنے رسول علیہ السلام کے واسطے سے ہوگی اس لیے کہ دربار خداوندی سے ان تک قرآن مجید رسول علیہ السلام کے وسیلہ سے پہنچا ہے۔ اور انہوں نے انبیاء علیہم السلام کے واقعات کی شرح اور تفصیل آپ کی زبان مبارک سے ہی پائی ہے۔ تو ان کا یہ کہنا کہ تو نے ہماری طرف رسول (علیہ السلام) بھیجا' رسول علیہ السلام سے ہی طلب شہادت کے مرتبہ میں ہے۔ اور رسول علیہ السلام کی خاموشی گویا ان کی تصدیق بن گئی جو کہ ان کے سچے ہونے کے معنی میں ہے۔

لیکن تمام امتوں پر ان کی گواہی تو وہ اس جہت سے ہے کہ انہوں نے عقائد اور اعمال تمام امتوں کے عادات واطوار کی تحقیق کر کے دریافت کیے ہیں۔ اور اپنے رسول علیہ السلام سے حاصل کیے ہوئے قواعد وضوابط اور ان کی نصوص سے دلیل پکڑ کر انہیں سچا اور جھوٹا اور انہیں صحیح اور غلط کہا ہے۔ اگرچہ وہ امتیں ان کے زمانے سے پہلے گزر چکی ہوں۔

تیسری بحث یہ ہے کہ اس آیت کا مفاد یہ ہے کہ ہم نے تمہیں بہتر یا میانہ اُمت اس لیے بنایا ہے کہ تم لوگوں پر گواہ رہو اور رسول علیہ السلام تم پر گواہ ہوں اور اس اُمت کا دوسرے لوگوں پر گواہ ہونا بجائے خود اس اُمت کے بہتر اور میانہ ہونے کا موجب ہے۔ اس لیے کہ اگر یہ اُمت بہتر اور میانہ نہ ہوتی تو افراط وتفریط والوں کے رنگ میں وجود بھی ناقص ہوتا۔ ان کے نقصان پر کس طرح اطلاع ہوتی اور ان کا نقصان کس طرح بیان ہو سکتا۔ جیسا کہ مس کر کے معلوم کی جانے والی اعضاء کی کیفیتوں کے ادراک میں فیصلہ نہیں کر سکتے بلکہ

وہاں انگشت شہادت کی جلد فیصلہ کرے گی جو کہ کسی طرف میلان نہیں رکھتی اور اس کی گواہی اعتدال سے باہر ہونے والی کیفیات کے ادراک میں معتبر ہے کہ خود معتدل ہے۔ لیکن اس اُمت پر رسول علیہ السلام کی گواہی اس اُمت کو کس طرح بہتر یا میانہ بنانے کا موجب ہوسکتی ہے کہ رسول علیہ السلام کا کام بھی اُمت پر گواہی دینا ہے جیسی بھی ہو اچھی یا بری' میانہ ہو یا حد سے تجاوز کرنے والی جیسا کہ آیت فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍۭ بِشَهِيْدٍ (النساء آیت ۴۱) اور يَوْمَ نَبْعَثُ مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ شَهِيْدًا عَلَيْهِمْ مِّنْ اَنْفُسِهِمْ (النحل آیت ۸۹) میں صراحت کی گئی ہے۔

اس کا راز یہ ہے کہ رسول علیہ السلام بیشک میانہ اور معتدل' بہتر اور افضل ہوتے ہیں انہیں اعتدال سے تجاوز کرنے والی کیفیت جو کہ ان کی اُمت میں ظاہر ہوئی ہے کا علم حاصل ہوسکتا ہے۔ اس بحث کا جواب یہ ہے کہ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا کو وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا کی تعلیل میں اس طرح داخل سمجھا جاسکتا ہے کہ مقام کے اعتبار سے علیکم سے مراد علی مقولکم و مدعا کم قرار دینا چاہیے۔ اور ظاہر ہے کہ اگر اُمت سچ کہنے والی اور معتدل نہ ہو اور واجب شے کا اظہار نہ کرے۔ اور ناقص کو ناقص اور کامل ادا نہ کرے تو رسول علیہ السلام جو کہ معصوم ہیں ان کے مقولے کے مطابق اور ان کے دعوے کی تصدیق میں کیسے گواہی دیں؟ یہ جمہور مفسرین کے مذاق کے مطابق اس آیت کی تحقیق ہے۔

اور یہاں ایک نہایت ہی دلچسپ تفسیر ہے۔ جو کہ بعض قدیم مفسرین سے منقول ہے۔ اور یہاں مذکور اکثر اعتراضات سے نجات دیتی ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً میں خاص مخاطب وہ لوگ ہیں جنہوں نے دونوں قبلوں کی طرف نماز گزاری ہے۔ یعنی پہلے مہاجرین اور پہلے انصاری جن کا ایمان میں مرتبہ بلند معروف و مشہور ہے۔ پس فرمایا ہے کہ جس طرح ہم نے تمہیں دونوں قبلوں کے انوار سے منور کیا ہے۔ اسی طرح ہم نے تمہیں ایک متوسط اُمت بنایا تاکہ تم رسول علیہ السلام اور ان کے دوسرے امتیوں کے درمیان واسطہ بنو۔ اور پیغمبروں اور امتوں کے حال کے درمیان تمہارا حال برزخ اور متوسط ہو۔ اس لیے کہ ہم نے تمہیں پیغمبروں (علیہم السلام) کی طرح ان

دوسرے لوگوں کے احوال کے گواہ مقرر کر دیا ہے۔ جو کہ تمہارے بعد آئیں گے۔ تا کہ تم ان کے اعمال' عقائد اور اخلاق کی درستی اور خرابی کی گواہی دو۔ اور کھرے کو کھوٹے سے جدا کرو۔ اور رسول علیہ السلام مناقب اور فضائل کے ضمن میں تمہارے درجات کے کمال کو بیان فرمائیں۔ اور تمہارے واسطہ سے قیامت تک رسول علیہ السلام کی گواہی کا سلسلہ باقی رہے۔ اس لیے کہ رسول علیہ السلام تمہارے کمال پر گواہی دیں اور تم تابعین کے کمال پر اور اسی طرح ہمارے آج کے دن تک' اور اس اُمت میں اللہ تعالیٰ کا یہ سچا وعدہ اس طرح ظاہر ہوا کہ علم ظاہری کی سند اور طریقۂ باطنی کی اجازت کا سلسلہ آج کے دن تک صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے دور سے ٹوٹا نہیں۔ پس اس اُمت کے رسول علیہ السلام گویا اپنی اُمت سے ہر ہر ایک کے حق میں اس کے حال کے مطابق گواہی دیتے ہیں۔ پس اس اُمت کا پہلا دور نبوت اور صرف اُمت کے درمیان متوسط مرتبہ رکھتا ہے کہ وہ ایک طرح سے پیغمبری کا کام کر رہے (گویا پیغمبر نہیں ہیں) اور ایک طرح امتوں کا' اور اسی طرح قیامت تک ہر پہلے طبقہ میں اپنے سے بعد والے طبقے کی نسبت سے۔

ہاں سب سے اوپر کا طبقہ بلاواسطہ فیض نبوی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والتسلیما کی آماجگاہ ہیں۔ اور انہوں نے اپنے بعد والوں سب پر تربیت و اصلاح کا حق چھوڑا ہے۔ پیغمبر علیہ السلام کے کام سے کمال مشابہت رکھتے ہیں۔ جو کہ نچلے طبقات والوں کو نصیب نہیں۔ اور اسی لیے تمام صحابہ کبار رضی اللہ عنہم میں سے دونوں قبلوں کی طرف منہ کر کے نماز ادا کرنے والوں کو وہ بزرگی حاصل تھی جو کہ دوسروں کو نہ تھی۔ کیونکہ انہیں ان لوگوں کے حق میں رسول کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی حیات ظاہری کے زمانے میں اس دین میں داخل ہوتے تھے۔ لیکن آخری دور میں اقتداء و اتباع کا حق ثابت ہے۔ جیسا کہ اُستاذ محترم کے ہوتے ہوئے استاذ کا خلیفہ کہ اس کے عام شاگردوں کے حق میں اُستادی کا حق پیدا کرتا ہے۔

چوتھی بحث یہ ہے کہ اس اُمت کی گواہی کی گزشتہ روایات سے ظاہر یہ ہے کہ ان کی گواہی بعض لوگوں کے حق میں جو کہ کفار ہوں مُضر ہوگی اور بعض کے حق میں جو کہ انبیاء علیہم السلام ہوں گے نافع ہوگی۔ یہ حال ہے آخرت میں ان کی گواہی کا۔ لیکن دنیا میں ان کی

گواہی کے نفع اور ضرر کا ثابت ہونا لوگوں کی نسبت سے بالکل ظاہر ہے۔ اس گواہی کو مطلقاً نقصان دینے والی گواہی کیوں قرار دیا گیا کہ حرف علیٰ کے ساتھ متعدی کیا جو کہ ضرر کے لیے ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ شہادت کے اعتبار کا مقام وہی ہے کہ مُضر شہادت ہو اس لیے کہ نفع پانے والا اپنے گواہ پر جرح نہیں کرتا تا کہ گواہ حاکم کے معتبر رکھنے کا محتاج ہو یا اپنی عدالت ثابت کرے۔ اس نکتہ کے لیے ضرر کو نفع پر غلبہ دے کر شہادت کو علیٰ کے ساتھ متعدی فرمایا

ہم یہاں آتے ہیں کہ یَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا میں یہ توجیہ کیسے چلے گی کہ وہاں گواہی صرف مخاطبین کے نفع کے لیے ہے۔ اور ضرر کی کوئی وجہ نہیں۔ اور اس اشکال کے جواب میں چند وجوہ ذکر کی گئی ہیں۔ پہلی وجہ یہ ہے کہ اگرچہ مخاطبین اس گواہی سے نفع پائیں گے۔ لیکن سابقہ امتوں کے کفار اس گواہی سے ضرر اُٹھائیں گے۔ ان کے ضرر کا لحاظ کرتے ہوئے لفظ علیٰ لایا گیا۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ یہاں علیٰ بمعنے لام ہے۔ جیسا کہ مَاذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ میں ہے۔ لیکن لام سے ہٹ کر یہاں علیٰ کی طرف پھرنے کی وجہ علی النّاس کے ساتھ ہم شکل ہونے کی رعایت ہے۔ جیسا کہ تدین تدان اور جزاء سيئة مثلها میں کہا گیا ہے۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ شہیدا کا صلہ قرائن کے واضح ہونے پر اعتماد کی بنا پر محذوف ہے۔ اور علیکم اس فعل کے ساتھ متعلق ہے۔ جس پر لفظ شہید بطور تضمین ولالت کرتا ہے۔ یعنی مطلقاً و رقیباً' بلکہ کہا جاسکتا ہے کہ یہاں شہادت گواہی کے معنوں میں نہیں ہے۔ بلکہ اطلاع اور نگہبانی کے معنوں میں ہے۔ تا کہ راہ حق سے باہر نہ نکلیں۔ جیسا کہ والله علٰى كل شیء شهيد (المجادلہ آیت ۶) میں اور حضرت عیسےٰ علیہ السلام کے اس مقولہ میں ہے كنت عليهم شهيدًا مادمت فيهم فلما توفيتني كنت انت الرقيب عليهم وانت علٰى كل شيء شهيد (المائدہ آیت ۱۱۷) اور جب یہ نگہبانی اور اطلاع گواہی برداشت کرنے کا راستہ ہے۔ اور گواہی کی برداشت گواہی ادا کرنے کے لیے ہوتی ہے احادیث میں اس شہادت کی قیامت کے دن گواہی کے ساتھ تفسیر کی گئی ہے۔ حاصل معنی کو بیان کرنے کے

لیے نہ کہ لفظ کی تفسیر کے لئے۔

پانچویں بحث یہ ہے کہ شہادت کے صلہ کو پہلے جملہ میں موخر کیوں کیا گیا اور دوسرے جملہ میں مقدم کیوں کیا گیا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ پہلے جملے میں مقصد اس اُمت کی گواہی کو بغیر اختصاص کے تمام لوگوں پر ثابت کرنا ہے۔ جبکہ اس جملہ میں غرض اس اُمت کے رسول علیہ السلام کی گواہی صرف خصوصیت کے ساتھ اسی اُمت کے بارے میں ثابت کرنا ہے۔ اور صلہ کو پہلے لانا اختصاص کا فائدہ دیتا ہے۔ یعنی **علیکم لا علی غیر کم** کہ آپ صرف تم پر گواہی دیں کے نہ کہ کسی اور پر۔

اجماعِ اُمت حجت ہے

چھٹی بحث یہ ہے کہ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اس اُمت کا اجماع حجت ہے۔ اور اس کے مطابق عمل واجب ہے۔ اس لیے کہ **لتکونوا شھداء علی الناس** میں نزول کے وقت سے لے کر قیامت کے قائم ہونے تک ساری اُمت مخاطب ہے۔ جیسا کہ اس قسم کے خطاب میں ہر جگہ اسی طرح مراد لی جاتی ہے۔ جیسے **کتب علیکم الصیام** (البقرہ آیت ۱۸۳)، **کتب علیکم القصاص** (البقرہ آیت ۱۷۸) لیکن اگر یہاں ہم تمام اُمت سے مراد اول سے آخر تک لیں تو تکلیف کا قاعدہ دگرگوں ہو جاتا ہے۔ اس لیے کہ تمام اُمت کے گزر جانے کے بعد کوئی شخص باقی نہ رہے گا جس پر ان کا قول حجت ہو سکے۔ تو معلوم ہوا کہ مراد ہر زمانہ کے لوگ ہیں۔ اور چونکہ ہر زمانہ کے لوگ مخلوط ہوتے ہیں ان میں عالم و جاہل، صالح و فاسق سب موجود ہوتے ہیں۔ اس لیے عقلی قرائن سے معلوم ہوا کہ اعتبار علماء مجتہدین دینداروں کے کہے ہوئے کا ہے نہ کہ ان کے غیر کا۔ بہر حال ان کا غلطی پر اجماع ممکن نہیں ہے۔ ورنہ یہ اُمت بہترین اور عادل نہ ہو گی۔ اور ان میں اور دوسری امتوں میں کوئی فرق نہ رہے گا۔ اور یہ ایک بہت بڑا شرف ہے کہ اس اُمت کو اجماعی صورتوں میں رسول علیہ السلام کے حکم کی طرح قرار دیا گیا ہے۔ جس طرح رسول علیہ السلام کا حکم غلطی سے معصوم واجب القبول ہے۔ اسی طرح اس اُمت کا اجماع غلطی سے معصوم اور واجب القبول ہے۔

اور جب اس قبلہ کی ترجیح جو کہ بالفعل قرار پایا کے بیان اور اس کے کمال جو کہ اُمت کے کمال کی دلیل ہے کی وجوہ کی شرح سے فراغت ہوئی۔ اور مسلمانوں کو بشارت دی گئی کہ اپنے قبلہ کے کمال سے اپنے کمال کو قیاس کریں۔ اب کامل کے منسوخ ہونے کی مدت میں اس کامل سے ناقص کی طرف منتقل ہونے کی حکمت کے بیان پر توجہ فرمائی جارہی ہے کہ اے محبوب علیہ السلام آپ کے کمال اور آپ کی اُمت کے کمال کی اصل یہی تقاضا کرتی ہے کہ آپ کا قبلہ کعبہ ہی ہو اور بیت المقدس کا قبلہ قرار پانا ایک عارضی امر تھا کہ ایک فائدہ کے لیے ہم نے منظور کیا تھا۔ جب وہ فائدہ حاصل ہو گیا تو ہم نے پھر تمہیں تمہارے اصلی قبلہ کی طرف متوجہ فرما دیا۔

وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِي كُنْتَ عَلَيْهَا اور ہم نے مقرر نہیں کیا تھا اس قبلہ کو تمہارا قبلہ جس پر آپ چند روز رہے إِلَّا لِنَعْلَمَ مگر اس لیے کہ ہم جانیں ایسے حال کا جاننا جو کہ معلوم وجوہ کے بغیر محقق نہیں ہوتا۔ اور اس جاننے کے بغیر جزا کا استحقاق اور مدح وثنا یا مذمت و نفرت مرتب نہیں ہو سکتے۔

مَنْ يَتَّبِعُ الرَّسُولَ اسے جو کہ رسول کی پیروی کرتا ہے۔ اس قبلہ کے استقبال میں باوجود کے کہ کامل سے ناقص کی طرف منتقل ہونے کو خلاف معقول جانتے ہیں۔ ممتاز اور جدا ہو کر مِمَّنْ يَنْقَلِبُ اس سے جو کہ پھر جاتا ہے۔ لیکن رسول علیہ السلام کے چہرے کو پشت کر کے نہیں تا کہ کافر ہو جائے بلکہ اپنے چہرے کو رسول علیہ السلام کے چہرے پر متوجہ رکھ کر جس راہ سے آیا تھا واپس چلا جاتا ہے۔

عَلَىٰ عَقِبَيْهِ اپنی دونوں ایڑیوں پر۔ تا کہ اسلام کی حد سے باہر نہ آئے لیکن اس کے دل میں قسم قسم کے شبہات آتے ہیں۔ کہ بہتر اور کامل قبلہ کو چھوڑا اور غیر بہتر اور غیر کامل کو صرف چند یہودیوں کی دلجوئی کے لیے کہ جن کا اس دین میں اس موافقت کی وجہ سے داخل ہونا موہوم ہے اختیار کرنا خلاف حکمت ہے۔ رسول علیہ السلام جو کہ حکمت کے اعلیٰ مرتبہ پر فائز ہونے چاہیں اس قسم کا کام کیوں کرتے ہیں؟ اور پھر رسول علیہ السلام کے خدا نے انہیں یہودیوں کی اس موافقت سے جو کہ بظاہر ان کی پیروی ہے منع کیوں نہ فرمایا حتیٰ کہ کئی سال

اسی پر گزر گئے۔

اور اگر چہ اس قسم کے شبہات جو کہ اللہ تعالیٰ اور رسول علیہ السلام کے احکام کی حکمت کی وجوہ میں تردد ہے کفر نہیں ہوتے لیکن جاہلیت کی سرحد کے قریب پہنچا دیتے ہیں۔ اس لیے کہ عبودیت اور رسول علیہ السلام کی پیروی کا تقاضا یہ ہے کہ حکمت کی ہر وجہ میں تردد نہ کریں۔ اور وجہ حکمت کے ظاہر کرنے کا مطالبہ کیے بغیر پوری خوش دلی کے ساتھ پیروی میں قدم رکھیں۔ اور اجمالی طور پر جان لیں کہ جو کچھ خدا تعالیٰ فرماتا ہے یا اس کے رسول علیہ السلام اپنے اجتہاد کے ساتھ کہتے ہیں۔ اور اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی عتاب اور کوئی انکار نہیں پہنچتا تو بلاشبہ حکمت کے مطابق ہے۔ اگر چہ ہم پر اس کی وجہ پوشیدہ رہے۔ اور موافق حکمت معلوم نہ ہو اور جماعت کفار کو الفت دلانے کی اگر چہ عوام مومنین کے حق میں اتنی وقعت نہیں۔ لیکن حضرت رسول کریم علیہ السلام کے حق میں ایک عظیم عبادت اور ایک بہت بڑا کمال ہے کہ ان کا کام یہی ہے۔ پس کعبہ کا بیت المقدس کے ساتھ منسوخ ہونے کا یہی فائدہ تھا کہ مخلصین شک کرنے والوں سے جدا ہو جائیں۔ خصوصاً اس وقت جبکہ حضرت رسول پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زیادہ تر پیروی کرنے والے قریشی نسل سے تھے۔ اور اپنے آباء واجداد سے تعظیم کعبہ کے عادی تھے۔ اور اسی عظیم قطعۂ زمین کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کا قبلہ سمجھتے تھے۔ اور اس مقام کی مجاورت پر فخر کرتے تھے۔ اور قریشیوں کے علاوہ تمام عرب لوگ بھی اسی مکان کے معتقد اور اس کی تعظیم کے خوگر ہو چکے تھے۔ انہیں اس مکان کی طرف منہ کرنے کو ترک کرنے کا حکم فرمایا گیا اور بیت المقدس کی طرف توبہ کرنے کو مقرر کرنا جس سے عرب لوگ خصوصاً قریشی بالکل آشنا نہ تھے۔ اور جبلی حسد کی وجہ سے اسے قبلۂ بنی اسرائیل سمجھ کر اور اپنے آپ کو بنی اسماعیل سے شمار کر کے اس سے بہت بہت نفرت اور گریز کرتے تھے ایمان کے بہت امتحان کا مقام تھا۔

اور یہ امتحان اور تمیز حکمت الٰہی میں ضروری ہے کہ ہر دین اور ہر ملت بلکہ ہر حکومت میں واقع ہوتا ہے۔ اور اس کا راز یہ ہے کہ ہر ملت اور ہر حکومت کے ظہور اور نشو ونما کے اوائل میں لوگ مختلف نتائج اور جدا جدا اسباب کی وجہ سے اس کے گرویدہ ہو جاتے ہیں۔ کوئی گروہ

اپنی قومی غیرت کا پاس کرتے ہوئے اور کوئی گروہ عزت ووقار کے کمال دنیوی کے مرتبوں میں اپنی ترقیوں کی امید رکھتے ہوئے تو کوئی گروہ معرفت حق اور اس کی پیروی کی وجہ سے شامل ہوتا ہے۔ جب تک انہیں ان کی معلومات اور توقعات کے خلاف حکم نہ دیں اور ذمہ داری نہ سونپیں اور اس ذمہ داری میں ان کے چھپے ہوئے دلی ارادے اور ایمان کے درجات ظاہر نہ ہوں تو مخلصین اور ان کے درجات دوسرے لوگوں سے کس طرح ممتاز ہوں گے۔

اور اگرچہ علم الٰہی ازل میں ہمارے تمام کلی' جزئی' ظاہری اور باطنی واقعات کو محیط ہے اسے امتحان کی ضرورت نہیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ کے کارکن زمین سے لے کر آسمان تک سب اس ظہور وامتیاز کے محتاج ہیں تاکہ ہر کسی کے ایمان اور درجۂ ایمان کے ساتھ اسے پہچانیں اور اس کے حال کے مطابق اس کے ساتھ معاملہ کریں۔ نیز علم ازلی الٰہی ثبوت جزا اور مدح و ثنا یا مذمت وعذاب کے استحقاق کا مدار نہیں ہے۔ اس امر میں مستقبل کا وہ علم چاہیے جو کہ ہر چیز کے ساتھ اس کے وجود اور ظہور کے وقت متعلق ہوتا ہے کہ اس کے مطابق ہر کسی کا بدلہ مقرر ہو اور کارخانہ جزا کے کارکن اسے اپنے عمل کا پیمانہ اور قانون سمجھیں۔

اور اس قبلہ کی طرف متوجہ ہونا مقام امتحان کیوں نہ ہو جب کہ امتحان ہوتا ہی اس چیز کے ساتھ ہے۔ جو کہ نفس اور طبیعت پر ناگوار اور شاق ہو۔

وَاِنْ كَانَتْ لَكَبِيْرَةً اور تحقیق وہ قبلہ منسوخہ یعنی بیت المقدس بہت ناگوار اور گراں تھا اس وقت کے اکثر مسلمانوں پر۔ اس لیے کہ اس وقت مسلمان صرف عرب لوگ تھے۔ اور زیادہ تر قریش' اور ان کے نزدیک کعبہ معظمہ کا قبلہ ہونا تسلیم شدہ تھا۔ اور وہ ہمیشہ اس خطہ کی تعظیم کے معتقد تھے۔ پس اسے چھوڑنا اور نماز میں اس سے منہ موڑنا ان پر بہت گراں تھا۔ نیز وہ جانتے تھے کہ ہماری ملت' ابراہیمی ہے۔ اور ہمارے رسول علیہ السلام حضرت اسماعیل بن حضرت ابراہیم علیہما السلام کی نسل سے ہیں۔ پس لازم ہے کہ ہمارا قبلہ بھی حضرت اسماعیل وابراہیم علیہما السلام کا قبلہ ہو' نہ کہ حضرت موسیٰ' حضرت عیسیٰ اور دوسرے انبیاء بنی اسرائیل (علیہم السلام) کا قبلہ' اور ان میں دانشمند سمجھتے تھے کہ کعبہ معظمہ بیت

المقدس سے اعلیٰ اور افضل ہے۔ اور اعلیٰ سے اسفل اور افضل سے غیر افضل کی طرف منتقل ہونا ترقی معکوس ہے۔ جس سے کہ پناہ مانگی جاتی ہے۔ مشہور مثل ہے کہ نعوذباللہ من الحور بعد الکور۔ پس اس وقت کے تمام مسلمانوں پر بیت المقدس کا قبلہ ہونا گراں تھا۔ اس کے عوام پر اس وجہ سے ان کی الفت وعادت کے خلاف تھا۔ اور ان میں سے خاص اہل نظر لوگوں پر اس وجہ سے کہ ملت ابراہیمی کی پیروی کے منافی ہے۔ اور ان کے اخص الخواص پر جو کہ اہل ذوق تھے اس وجہ سے کہ یہ قرب ووصال کے مرتبوں میں ترقی معکوس کا پتہ دیتا ہے۔

اِلَّا عَلَى الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ مگر ان پر جنہیں اللہ تعالیٰ نے اس حکمت اور بھید کی راہ دکھادی۔ جو کہ اس قبلہ کو مقرر کرنے میں ودیعت اور چھپا ہوا تھا۔ اور انہوں نے نور الٰہی سے پالیا کہ اس قبلہ کے استقبال میں ہمارے رسول علیہ السلام کے کمال کو پورا کرنا منظور ہے۔ چنانچہ ہمارے رسول علیہ اسلام اپنی ظاہری پیدائش کے اعتبار سے مشرب ابراہیمی والے ظاہر اور واقع ہوئے ہیں۔ اور اسی طرح شب معراج آپ کو انبیائے بنی اسرائیل علیہم السلام کی ارواح کے ساتھ ملنے اور وہاں ان کی امامت جو کہ صخرۂ بیت المقدس کی طرف تھی کرانے کے بعد ان کی نبوت کے انوار سے بہت وافر حصہ ملنے والا ہے۔ اور اس ملنے کی تائید اور مدت دراز تک اس کے اثرات کو باقی رکھنا صخرہ کے استقبال کے بغیر جو کہ اس وقت واقع ہوا تھا متصور نہیں ہے۔

نیز جب اللہ تعالیٰ نے ہمیں ہجرت کا حکم دیا تو ناچار ہم صخرہ کی طرف منہ اور کعبہ کی طرف پشت کر کے روانہ ہوئے حتیٰ کہ ہم مدینہ عالیہ پہنچے۔ پس ہمیں نماز میں اسی روش کو قائم رکھنا چاہیے تاکہ ہر نماز کے وقت ہجرت کا مقصد ہمارے سامنے رہے جب تک کہ اللہ تعالیٰ ہماری توجہ کا رُخ کعبہ معظمہ کی طرف اس متبرک مکان کو مشرکوں کے ناپاک ہاتھوں سے جہاد اور لڑائی کے ساتھ چھڑانے کے لیے پھیر دے۔ جیسا کہ جنگ بدر کے قریب واقع ہوا۔

ترمذی اور دوسری صحاح میں مروی ہے کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو استقبال کا حکم ہوتو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کی کہ یارسول اللہ! کہ ہم زندہ لوگ تو اپنی ان

گزشتہ نمازوں کا تدارک کر سکتے ہیں جو کہ ہم نے غیر کعبہ کی طرف ادا کیں کہ باقی عمر میں ہم کعبہ کی طرف نمازیں ادا کریں۔ لیکن ہمارے فوت ہونے والوں کا حال کیا ہے؟ جنہیں اس تدارک کی فرصت نہ ملی اور بیت المقدس کے استقبال کے دوران فوت ہو گئے حالانکہ ہمارا حقیقی قبلہ تو کعبہ تھا اور بس۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تمہارے زندہ اور فوت شدہ سب کے سب اپنی گزشتہ نمازوں پر ثواب میں شامل ہیں۔ اس لیے کہ منسوخ کا حکم بھی اپنے وقت میں برحق ہے۔ جیسا کہ ناسخ اپنے وقت میں حق ہے۔ اور درحقیقت ثواب کا مرتب ہونا ایمان پر ہے۔ جو کہ عمل کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے نہ کہ صرف صورت عمل پر' اور جب وہ بیت المقدس کی طرف منہ کرنے کے مامور تھے تو یہ تقاضائے ایمان تھا۔

وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيْعَ اِيْمَانَكُمْ اور خدا تعالیٰ اس کے ہرگز درپے نہیں ہوا ہے کہ تمہارے ایمان کو ضائع کردے بلکہ تم میں اس وقت ایمان کا تقاضا زیادہ ظاہر تھا اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کے اس حکم کی اطاعت جو کہ اپنی طبیعت اور سمجھ کے خلاف ہو عبودیت کے باب میں اللہ تعالیٰ کے اس حکم کی اطاعت سے زیادہ کامل ہے۔ جو کہ عقل کے مطابق بھی ہو۔ کیونکہ اس اطاعت میں عقل کی اطاعت کی آمیزش بھی ہے۔ اور اگر تمہیں اس قبلہ کے ناقص ہونے کی وجہ سے اس بات کا خوف ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ہماری اس عبادت میں جو کہ اس قبلہ کی طرف واقع ہوئی کوئی نقص پڑ گیا ہو تو اس طرح بھی ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ اس کمال اطاعت کی وجہ سے جو کہ اس قبلہ میں تھی اس قبلہ کا نقصان بھی پورا فرمادے گا۔

اِنَّ اللّٰهَ بِالنَّاسِ تحقیق اللہ تعالیٰ عام بندوں پر خواہ مسلمان ہوں خواہ کافر' نیک ہوں خواہ برے' مطیع ہوں خواہ سرکش لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ بہت مہربان بہت رحم فرمانے والا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سب کی پرورش کرتا ہے' روزی پہنچاتا ہے۔ اور آفات سے حفاظت فرماتا ہے۔ اسے شایان نہیں کہ جہت عبادت کے نقصان کو جبکہ تم نے اسی کے حکم اور فرمان پر اس جہت کو اختیار کیا ہو تمہاری کامل اطاعت کی وجہ سے کامل نہ فرمائے اور اجر میں نقصان کا سبب گردانے۔

چند بحثیں

یہاں چند بحثیں باقی رہ گئیں۔ پہلی بحث یہ ہے کہ لفظ جعل لغت عرب میں دو مفعولوں کے ساتھ متعدی ہوتا ہے۔ جبکہ یہاں اس کا دوسرا مفعول ندارد۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں لفظ جعل اپنے اصلی معنی میں نہیں ہے۔ بلکہ قرار دینے کے معنی میں ہے۔ جو کہ ایک مفعول کے ساتھ متعدی ہوتا ہے۔ اور اگر ہم جعل کو اصلی معنی میں لیں تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ چونکہ اس کا دوسرا مفعول عموم وخصوص کا لحاظ کیے بغیر عین پہلا مفعول ہی ہے اس کا ذکر کرنے سے لفظی تکرار لازم آتا اس بنا پر اس کا حذف کرنا مناسب ٹھہرا اور معنی یہ ہے کہ وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِيْ كُنْتَ عَلَيْهَا قِبْلَةً' اور صاحب کشاف نے کہا ہے کہ الَّتِيْ جَعَلْنَا کا دوسرا مفعول ہے۔ اور قبلہ کی صفت نہیں ہے۔ اور التی کنت علیھا سے مراد کعبہ معظمہ ہے۔ لیکن آیت کا سیاق وسباق اس توجیہ کا انکار کرتا ہے۔ اس لیے کہ قیل وقال تو بیت المقدس کے استقبال کی وجہ میں تھی نہ کہ استقبال کعبہ میں۔ کیونکہ استقبال کعبہ اس وقت کے تمام مسلمانوں کو مرغوب اور مطلوب تھا۔ اور اخلاص والوں اور بے اخلاصوں میں امتیاز بھی بیت المقدس کے استقبال سے ثابت ہوا نہ کہ استقبال کعبہ سے۔ البتہ یہودی استقبال کعبہ میں حرف زنی کرتے تھے۔ لیکن جب وہ ملت سے باہر تھے تو ان کے اعتراض کا کوئی اعتبار نہ تھا کہ انہیں وجہ حکمت سمجھائی جائے۔ اور اسی طرح وہ تفسیر جو کہ قدیم مفسرین سے منقول ہے کہ انہوں نے کنت علیہا کو انت علیہا کے معنوں میں کیا ہے بھی سیاق وسباق کے ساتھ موزوں نہیں ہے۔

ہم یہاں پہنچے کہ كُنْتَ عَلَيْهَا اور وَاِنْ كَانَتْ لَكَبِيْرَةً کے الفاظ اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ یہ آیت استقبال کعبہ مقرر ہونے اور استقبال بیت المقدس کا وقت گزرنے کے بعد آئی ہوگی۔ حالانکہ سَيَقُوْلُ السُّفَهَآءُ سے پتہ چلتا ہے کہ یہ آیت اس واقعہ سے پہلے اُتری ہے تو مطابقت کیسے ہوگی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ لغت عرب میں عنقریب واقع ہونے والی چیز کو واقع اعتبار کرتے ہیں۔ اور اسی روش کے مطابق کلام کرتے ہیں۔ خصوصاً جب کہ اس کلام کے آخر میں امر کا وقوع بھی منظور ہوتا ہے۔ یہاں بھی اسی قسم

کا اعتبار واقع ہے۔ اس لیے کہ یہ آیات بیت المقدس کے استقبال کو منسوخ کرنے کی تمہید کے لیے نازل ہوئی ہیں۔ اور استقبال کعبہ کے حکم پر پہنچی ہیں۔ پس کلام کے اول میں آخری مطلب ملحوظ و منظور ہے۔ جس طرح کہ جب بادشاہ کسی شہر یا ملک سے کسی امیر کو معزول کرنے کے لیے حکم بھیجتے ہیں تو اس حکم سے پہلے اسے معزول کرنے کے عذر کو تمہیداً بیان کرتے ہیں۔ اور فرمان کے آخر میں اس کی معزولی کی تصریح منظور ہوتی ہے۔ اسے کلام کی ابتدا ہی سے معزول قرار دیتے ہیں۔ اور لکھتے ہیں کہ جس وقت تو اس ملک کا والی تھا تو نے یوں کیا' ایسا کیا حالانکہ ابتدا میں ابھی وہ صریحاً معزول نہیں ہوا ہے۔ اسی طرح یہ ہے۔

دوسری بحث یہ ہے کہ علم الٰہی ازل سے ابد تک ہر چیز کے ساتھ متعلق ہے۔ اس میں کوئی تبدیلی اور تجدید نہیں ہے۔ پس لِنَعْلَمَ کا لفظ جو کہ قبلہ مقرر کرنے کے بعد حصول علم پر دلالت کرتا ہے کیا معنی رکھتا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ علم الٰہی کی دو قسمیں ہیں۔ ان میں سے ایک قسم متغیر و متجدد نہیں ہے۔ بلکہ ہر معلوم کے ساتھ جس صفت کے ساتھ وہ معلوم کسی وقت موصوف ہوگا ازل سے ہی متعلق ہے۔ اور ہر چیز اپنے وقت میں جو حالت رکھتی ہے اس میں منکشف ہے۔ اور ایک قسم یہ ہے کہ اشیاء کے وجود کے بعد ان کے موجود ہونے کے ساتھ متعلق ہوتا ہے۔ اور اشیاء کے عدم کے بعد یعنی ان کے وجود کے بعد معدوم ہونے کے ساتھ متعلق ہوتا ہے اور وجود اشیاء سے پہلے ان کے مستقبل میں موجود ہونے کے ساتھ متعلق ہوتا ہے اور اس قسم تغیر و تجدد جاری ہے۔ اور یہاں لنعلم کے لفظ سے یہی علم مراد ہے۔

اور بعض مفسرین نے کہا ہے کہ یہاں سے علم سے مراد خارج میں تمیز ہے۔ اور تمیز وجود کی فرع ہے۔ اور بعض نے کہا ہے کہ علم کو اپنی طرف منسوب فرمایا ہے۔ جبکہ اس سے مراد رسول علیہ السلام اور ایمان والوں کا جاننا ہے۔ جو کہ مجازی طور پر ذات خداوندی کی طرف منسوب ہے۔ جس طرح کہ بادشاہ کہتے ہیں کہ ہم نے فلاں شہر کو فتح کر لیا ان کے لشکر نے فتح کیا ہوتا ہے۔ اور فرا نے کہا ہے کہ مراد مخاطبین کا علم ہے بطریق کنایہ' جس طرح کہ ایک عقلمند اور ایک جاہل ایک دوسرے کے ساتھ جھگڑا کریں۔ جاہل کہے کہ ایندھن آگ کو جلاتا ہے۔ اور عقل مند کہے کہ آگ ایندھن کو جلاتی ہے۔ آؤ ہم دونوں کو جمع کرتے

ہیں۔ اور دیکھتے ہیں کہ کون کسے جلاتا ہے۔ اور اس سے مراد اس کی مراد یہ ہوتی ہے کہ جاہل کو پتہ چل جائے۔ لیکن کلام کو منصفانہ رنگ میں ادا کرتا ہے۔ (اقول وباللہ التوفیق۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ واجب الوجود ہے اور تمام صفات کمالیہ کا جامع لہٰذا اس کی ہر صفت کے متعلق تعبیر اور بیان میں صفت کمال کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔ اس لئے ایسے مقام پر ترجمہ اس انداز میں کیا جائے کہ کمال ذات وصفات مجروح نہ ہو۔ اس حقیقت کے پیش نظر حضرت مولانا الامام احمد رضا بریلوی قدس سرہ نے فی الحقیقت اپنے ترجمۃ القرآن مسمی ''کنزالایمان'' میں ایمان کی صحیح ترجمانی فرمائی ہے جہاں آپ نے اس کا یہ ترجمہ کیا ہے: ''اے محبوب! تم پہلے جس قبلہ پر تھے ہم نے وہ اسی لئے مقرر کیا کہ دیکھیں کون رسول کی پیروی کرتا ہے اور کون الٹے پاؤں پھر جاتا ہے''۔ نیز امام اہل سنت غزالی زماں علامہ سیّد احمد سعید کاظمی نور اللہ مرقدہ اپنے ترجمہ ''البیان'' میں یہ ترجمہ کرتے ہیں'' (اے حبیب!) آپ جس قبلہ پر تھے ہم نے وہ اسی لئے مقرر کیا تھا کہ ہم ظاہر (کر کے ممتاز) کر دیں ان لوگوں کو جو رسول کی پیروی کرتے ہیں ان سے جو الٹے پاؤں پھر جاتے ہیں''۔ الناقل محمد محفوظ الحق غفرلہ)

تیسری بحث یہ ہے کہ مَنْ يَّتَّبِعُ الرَّسُوْلَ اور كُنْتَ عَلَيْهَا کے الفاظ سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ استقبال بیت المقدس دراصل رسول کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اجتہاد سے تھا اس کے بغیر کہ اس کے استقبال کے متعلق صریح امر خداوندی آئے ورنہ من یطیع امر اللہ' اور القبلة التی امر ناك بها فرمایا جاتا۔ البتہ جب دربار خداوندی سے اس اجتہاد کے بارے کوئی رُکاوٹ اور انکار نہ ہوا تو اس نے وحی صریح کا حکم کر لیا جیسا کہ رسول کریم علیہ السلام کے تمام اجتہادات کا حال ہے۔ اور اسی لیے فرمایا وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِىْ كُنْتَ عَلَيْهَا یعنی ماقررنا ها بعد ان كنت عليها باجتهادك۔ اور سب سے زیادہ صحیح قول یہی ہے کہ بیت المقدس کا استقبال وحی صریح میں نہ تھا۔ بلکہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صخرۂ بیت المقدس کی طرف انبیاء علیہم السلام کی امامت' ہجرت کے حکم اور اس قسم کے امور سے اس کا استنباط فرمایا تھا۔

چوتھی بحث یہ ہے کہ مِمَّنْ يَّنْقَلِبُ عَلٰى عَقِبَيْهِ کے الفاظ سے مفسرین کے مقرر کردہ قانون کے مطابق کہ یہ الفاظ کفر وارتداد کے لیے بطور استعارہ جانتے ہیں معلوم ہوتا ہے کہ استقبال بیت المقدس کے وقت کچھ لوگ مرتد ہو گئے ہوں تا کہ ان میں سے مخلصیت کا امتیاز ثابت ہو سکے حالانکہ کوئی صحیح روایت اس مفہوم کی تائید نہیں کرتی۔ اور وہ جو ابن جریر نے اپنی تفسیر میں ابن جریج سے نقل کیا ہے کہ مجھے یہ بات پہنچی کہ مسلمانوں میں سے چند لوگ مرتد ہو گئے۔ انہوں نے کہا کبھی یہاں کبھی بیت المقدس؟ تو اس کی سند قابل اعتماد نہیں ہے۔ جبکہ صحاح میں اس کے خلاف منقول ہے کہ اس وقت تک ارتداد اور نفاق بالکل نہ تھا۔

اس کا جواب دوران تفسیر گزر چکا کہ انقلاب علی العقبین ارتداد و کفر کے استعادہ کے لیے نہیں ہے۔ بلکہ پتہ دیتا ہے کہ ایمان قائم تھا شبہات کے ساتھ۔ اور وہ کمزور ایمان کی ایک قسم ہے۔ اور اسی لیے بیہقی نے اپنی سنن میں اور ابن ابی حاتم اور دیگر قابل اعتماد لوگوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے کہ انہوں نے مِمَّنْ يَّنْقَلِبُ عَلٰى عَقِبَيْهِ کی تفسیر اہل شک کے ساتھ کی ہے۔ اور عطاء نے فرمایا ہے **لیتمیز من یسلم الامر ومن لا یسلم** یعنی تا کہ حکم ماننے اور نہ ماننے کے درمیان امتیاز ہو جائے۔

کراہت طبعی کے باوجود اطاعت تقاضائے ایمان ہے

پانچویں بحث یہ ہے کہ انداز کلام کے مطابق ذہن میں یوں آتا ہے کہ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيْعَ اِيْمَانَكُمْ کا جملہ ان لوگوں کی تسلی کے لیے ہے جن پر استقبال بیت المقدس گراں تھا۔ گویا فرمایا گیا ہے کہ اگرچہ بیت المقدس کا استقبال تم پر ناگوار، گراں اور تمہاری طبع اور سمجھ کے خلاف واقع ہوا تھا۔ لیکن یہ گمان نہ کرنا کہ تمہاری وہ تمام نمازیں جو کہ تم نے طبعی کراہت کے باوجود اس سمت ادا کی ہیں ضائع ہو گئی ہوں اور اجر کے لائق نہ ہوں۔ اس لیے کہ کراہت طبعی کے باوجود حکم خداوندی کی اطاعت تقاضائے ایمان ہے۔ ضائع ہونے کے قابل نہیں۔ اور اسی لیے حدیث پاک میں فرمایا ہے کہ پورے طور پر وضو کرنا جس وقت کہ طبعاً اچھا نہ لگتا ہو۔ جیسا کہ سخت سردی کے وقت گناہوں کے کفارہ کا سبب ہے۔ البتہ جب طبعی کراہت اس حد تک پہنچ جائے کہ نیک عمل سے تکلیف وملال ہو اور صرف رسم پوری

کرنے یا اپنے التزام کا پاس کرنے کے لیے ملال کے ساتھ ادا کرے تو اجر وثواب میں نقصان کا موجب ہوتا ہے۔ پس خوش دلی کے باوجود کراہت طبعی اور قلبی طور پر ملال اور خوش دلی کے بغیر کراہت فرق کا لحاظ رکھنا چاہیے۔

لیکن صحیح روایات میں وارد ہوا ہے کہ یہ آیت حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے سوال کے جواب میں اُتری جیسا کہ تفسیر میں گزرا' اور احتمال ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا اس سوال سے یہی مقصد ہو کہ وہ لوگ جو استقبال بیت المقدس کے وقت فوت ہو گئے۔ اسی استقبال کو ناگوار اور گراں جانتے ہوئے نماز میں اسے بجالاتے تھے کہیں ایسا نہ ہو کہ ان کی نمازیں اجر کے بغیر ہوگئی ہوں اور انہوں نے فوت ہونے والوں کی تخصیص اس لیے کی کہ زندوں کو اگرچہ ان نمازوں کا ثواب اور اجر ہاتھ نہ لگا لیکن باقی عمر میں کہ اپنے دلی طور پر پسندیدہ قبلہ کی طرف منہ کریں گے۔ اور خوش دلی سے نماز ادا کریں گے تو جو اجر ضائع ہو گیا اس کا تدارک ہو جائے گا۔ بخلاف فوت ہونے والوں کے اور اس صورت میں کلام کے اجزاء صریح طور پر ایک دوسرے کے مناسب ہو جاتے ہیں۔

اور بعض مفسرین نے ایمان کو نماز پر محمول کیا ہے۔ جیسا کہ صحیح بخاری میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے۔ اور اس تفسیر کے مطابق ایمانی اعمال میں نماز کا عظیم مرتبہ ثابت ہوتا کہ حق تعالیٰ نے اسے عین ایمان قرار دیا۔ اور اسی لیے حدیث شریف میں وارد ہے کہ الفرق بین العبد دین الکفر ترک الصلوٰۃ اور سورۂ روم کی آیت وَاَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَلَا تَکُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ سے اسی مطلب کی ایک مہک آتی ہے۔

اور جب مسلمانوں کو قبلہ کے مسئلہ میں ہر طرف سے تسلی دی گئی اور کسی شک وشبہ منافقوں کی طعن وتشنیع اور کمزور ایمان والوں کے کھٹکے کی کوئی گنجائش نہ چھوڑی۔ اب فرمایا جا رہا ہے کہ اگرچہ ہم مہربانی اور رحمت کی وجہ سے جو کہ ہم عام لوگوں پر خصوصاً ایمان واطاعت والوں پر کرتے ہیں بیت المقدس کی طرف توجہ کا اجر بھی کامل کر دیں گے۔ لیکن درحقیقت وہ قبلہ کعبہ شریف کے کمال کے مقابلے میں ناقص ہے۔ اگرچہ امرِ الٰہی کی تعمیل کے پیش نظر اس سمت نماز کی ادائیگی کامل ہوئی اور ذاتی طور پر کامل کی استعداد کا تقاضا یہ ہے کہ وہ طبعی

طور پر کامل بالذات کا طالب ہو اور ہماری مہربانی اور رحمت کے شایاں یہ ہے کہ کامل بالذات کو کاملہ بالذات سمت کی طرف منہ کرنے کا حکم دیں تاکہ اس کا اجر وثواب جہت استقبال کے اعتبار سے بھی اور امرِ الٰہی کی تعمیل کے اعتبار سے بھی کمال پر کمال حاصل کرے۔ اور اسی وجہ سے

قَدْ نَرٰی ہم گاہے گاہے نظر رحمت وعنایت سے دیکھتے ہیں تَقَلُّبَ وَجْهِكَ آپ کے چہرے کا اُٹھنا نزول وحی کے انتظار میں جس کا مضمون استقبال کعبہ ہو فی اطراف و جوانب السَّمَآءِ آسمان میں، کبھی آپ آسمان کی ایک سمت دیکھتے ہیں کہ شاید جبریل علیہ السلام اس سمت سے نمودار ہوں اور مجھے استقبال کعبہ کا حکم خداوندی پہنچائیں۔ اور کبھی دوسری طرف۔ پس آپ اس حالت میں ایک پیارے بچے کی طرح جو کہ کسی چیز کے حاصل کرنے کا مشتاق ہو اور بار بار اپنے چہرے کو اس چیز کے آنے کی سمت کو پھرتا ہے ہماری نظر میں ہیں۔ اور ہم جانتے ہیں کہ آپ کا یہ سب اشتیاق آپ کی بلندی استعداد اور نشہ کا کمال ہے کہ آپ کامل بالذات کے طالب ہوئے ہیں۔ اور ہماری عنایت کے کارخانہ میں اس طلب کا جو کہ استعداد کی زبان سے کی جائے پورا کرنا ضروری ہے۔

فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضٰهَا ہم آپ کو لازماً اس قبلہ کی طرف متوجہ کردیں گے جسے آپ پسند کرتے ہیں چند وجوہ سے۔

کعبہ شریف کو پسند کرنے کی وجوہ

پہلی وجہ یہ ہے کہ اس قبلہ کا کمال ذاتی آپ کی استعداد کے کمال کے مطابق ہے:
دوسری وجہ یہ ہے کہ آپ کی ملت' ابراہیمی ملت ہے تو چاہیے کہ آپ کا قبلہ بھی ابراہیمی قبلہ ہو۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ آپ کی بعثت پہلے تو عرب کی طرف ہے۔ اور پھر دوسرے لوگوں کی طرف' اور قدیم زمانہ سے عرب لوگ اس قبلہ کو اپنے فخر کی جگہ اور اسے اپنے لیے زیارت اور طواف کا مقام سمجھتے ہیں۔ پس اس قبلہ کا استقبال ان کے کمال اطاعت اور اس دین سے نفرت نہ کرنے کا موجب ہے۔ چوتھی وجہ یہ ہے کہ جس شہر میں کہ یہ قبلہ واقع ہے آپ کی جائے ولادت ہے۔ اور جبلی طور پر آدمی اس بات کا خواہاں ہوتا ہے کہ ہر قسم کی عزت اور

بزرگی میرے وطن کو حاصل ہو۔ پانچویں وجہ یہ ہے کہ استقبال بیت المقدس کے وقت یہودی طعنہ دیتے تھے کہ اس رسول (علیہ السلام) کا حال بھی عجیب ہے کہ شریعت میں ہماری مخالفت کرتا ہے۔اور پھر قبلہ کے معاملہ میں ہماری پیروی کرتا ہے۔اور دعویٰ کرتا ہے کہ میں حضرت ابراہیم اور اسماعیل علیہما السلام کی ملت پر ہوں اور پھر ان کے قبلہ کو چھوڑ کر اس قبلہ کی طرف توجہ کرتا ہے۔معلوم ہوا کہ اپنے کاروبار میں حیران ہے۔اور ایک طریقے کو لازم نہیں پکڑتا۔

اس لیے ہم بھی آپ کی پسند کو پسند کرتے ہیں فَوَلِّ وَجْهَكَ پس اپنے چہرے کو نماز میں کعبہ کی طرف پھیر لیں شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ' مسجد حرام کی وضع کے مطابق جو کہ اس قبلہ کے اردگرد بنائی گئی ہے۔اور ہر طرف اس کے دروازوں کا رُخ اسی گھر کی طرف واقع ہے نہ کہ دوسرے مکانات کی طرح کہ وہ ایک طرف سے کعبہ شریف کے مقابل ہوتے ہیں دوسری طرف سے نہیں۔

مسجد حرام کی وجہ تسمیہ کا بیان

اور اس کا نام مسجد حرام اس وجہ سے رکھا گیا ہے کہ کاملین کے لیے وہاں غیر خدا کی طرف نظر کرنا حرام ہے۔نیز اس مسجد کی وہ حرمت وعزت ہے کہ تمام روئے زمین پر کوئی اور مسجد ایسی عزت وحرمت نہیں رکھتی۔(اقول و باللہ التوفیق- اس سلسلے میں حدیث شریف کے مطابق مسجد حرام میں ایک نماز دوسری مسجدوں میں ایک لاکھ نماز کے برابر ہے۔لیکن امام مالک رحمتہ اللہ علیہ کے نزدیک مسجد نبوی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والتسلیمات میں نماز ادا کرنا مسجد حرام سے بھی افضل ہے۔ویسے افضلیت ثواب کے کئی گنا زیادہ ہونے میں منحصر نہیں ہے۔گو مسجد حرام میں مضاعفت ثواب مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے زیادہ ہو لیکن بے شمار قسم کی کرامات' برکات' فتوح' فیوض اور منافع جو کہ مدینہ مطہرہ کے ساتھ مخصوص ہیں اس کی افضلیت کے لیے کافی ہیں۔نیز مضاعفت ثواب کثرت تعداد کی وجہ سے ہے۔جبکہ عزت ونفاست اس سے وراء ہے۔ہوسکتا ہے کہ ایک چیز لاکھ چیزوں سے زیادہ قیمتی ہو۔جیسا کہ ایک موتی لاکھ روپوں کے برابر ہوتا ہے۔تو ہوسکتا ہے کہ مسجد شریف مدینہ عالیہ میں

ایک نماز حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قرب اور پڑوس کی برکت سے مسجد حرام کی لاکھ نماز سے زیادہ نفیس اور عظیم ہو اسی لیے امام اہل سنت اعلیٰ حضرت مولانا الشاہ احمد رضا خاں بریلوی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔ طیبہ نہ سہی افضل مکہ ہی بڑا زاہد ہم عشق کے بندے ہیں کیوں بات بڑھائی ہے۔ اس مسئلہ تفاضل بین الحرمین کے متعلق جذب القلوب الی دیار المحبوب کا مطالعہ مفید ہے۔ محمد محفوظ الحق غفرلہٗ ناقلاً عن شرح الشیخ المحقق للمشکوٰۃ)۔

اور اگر وہ قبلہ آپ کا پسندیدہ ہے۔ اور آپ کے کمال کے مناسب ہے۔ لیکن میں نے آپ کے پیروکاروں کو بھی آپ کی تبعیت میں اس قبلہ میں شریک فرمادیا اسی لیے آپ کو اور آپ کے امتیوں کو جمع کر کے میں خطاب فرماتا ہوں۔

وَحَيْثُ مَا كُنتُمْ اور تم جہاں بھی ہو خواہ مدینہ میں خواہ کسی دوسرے شہر میں حتیٰ کہ عین بیت المقدس میں فَوَلُّوا وُجُوهَكُمْ شَطْرَهٗ پس اپنے چہرے کو اسی مسجد کی طرف پھیر لو تاکہ تم اپنے رسول علیہ السلام کی پیروی میں وہ کمال حاصل کرو جسے پہلے انبیاء علیہم السلام نے باوجودیکہ تم سے افضل تھے بھی یہ کمال نہ پایا۔ اور اگر تمہارے دل میں یہ اندیشہ ہو کہ اس قبلہ میں بہمہ وجوہ خوبیاں ہیں۔ لیکن اتنی بات ہے کہ اہل کتاب کے قبلہ کے مخالف اور اہل جاہلیت کے قبلہ کے مطابق ہے۔ پس اس اندیشے سے اپنے دل کو پراگندہ مت کرو اس لیے کہ اہل کتاب اگرچہ نماز میں اس قبلہ کے غیر کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ لیکن اپنی کتابوں کی بشارت کی رو سے تمہارے رسول علیہ السلام کو دو قبلوں والا جانتے ہیں۔

وَاِنَّ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتَابَ لَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ اور تحقیق جو کتاب دیئے گئے ہیں ضرور جانتے ہیں کہ تمہاری یہ توجہ الی الکعبہ ہی حق ہے۔ اس لیے کہ ان کی کتابوں میں اس بات کا وعدہ ہے کہ پیغمبر آخر الزمان صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ملت ابراہیمی پر مبعوث ہوں گے۔ اور ان کا قبلہ کعبہ معظمہ مقرر ہوگا۔ اور یہ حق ایسا نہیں جسے اس رسول علیہ السلام اور ان کی اُمت نے اپنے اجتہاد کے ساتھ اپنے لیے اختیار کیا ہو اور ان کا اجتہاد درست ہوا ہو۔ بلکہ ایسا حق ہے۔ جو کہ مخصوص ہے مِنْ رَّبِّهِمْ ان پروردگار کی طرف سے۔ لیکن وہ جان بوجھ کر اس اُمت کی اس فضیلت بلکہ ان کے تمام فضائل کو چھپاتے ہیں۔ اور ان کی کتابوں

میں ان کلمات کو جو کہ اس رسول علیہ السلام کی نعت میں وارد ہوئے ہیں تحریف کرتے ہیں۔

وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ اور خدا تعالیٰ اس سے غافل نہیں ہے جو کچھ تم عمل کرتے ہو۔

نیز اہل کتاب جانتے ہیں کہ درحقیقت قبلہ ایسی چیز چاہیے جس کی طرف نماز میں سجدہ واقع ہو۔ اور ان کا قبلہ جو کہ بیت المقدس میں معلق پتھر ہے سجدے کی سمت واقع نہیں ہو سکتا۔ اس لیے کہ جب وہ ہوا میں معلق ہے تو ہوا۔ اور آسمان کا حکم رکھتا ہے پس جو چیز کہ اس کی سمت سجدہ واقع ہو کعبہ کے سوانہیں۔ ہاں آسمان دعا کا قبلہ ہے نہ کہ نماز کا قبلہ اور وہ جو اس کے حکم میں ہے۔ جیسے صخرۂ بیت المقدس اسے بھی چاہیے کہ دعا کا قبلہ ہو نہ کہ نماز کا قبلہ اور وہ بھی اس کے حق میں جو کہ اس کے نیچے کھڑا ہو۔ اور ان کے حق میں ہم نے اس قبلۂ دعا کو حقیقت عبادت کو پانے میں ان کی استعداد کے قاصر ہونے کی وجہ سے اور خوف و طمع پر ان کے قصور نظر کی وجہ سے قبلۂ نماز بنا دیا تھا۔ جب رسول کریم علیہ السلام اور ان کی اُمت معنائے عبادت کے راز کو پہنچی۔ اور ان کی عبادت نے دعا سے امتیاز حاصل کیا۔ اور انہوں نے جان لیا کہ عبادت کا دارومدار معبود کے ذاتی کمال پر ہے نہ کہ اس سے خوف و طمع پر۔ اور مقام عبادت سوال کے مقام سے جدا ہے تو ہم نے ان کے حق میں قبلۂ عبادت کو اپنی اصل پر مقرر کر دیا۔

نیز کعبہ معظمہ پورا گھر ہے۔ جو کہ کسی غیر کے تعلق کے بغیر خدا کے نام پر بنایا گیا۔ جبکہ صخرۂ بیت المقدس اللہ تعالیٰ کی قدرت کے آثار سے ایک معلق پتھر ہے۔ ایک پتھر کو پورے گھر کے ساتھ دیکھا جا سکتا ہے کہ کتنی نسبت ہے۔ اگرچہ وہ پتھر بڑا اور وسیع ہو۔

چند جواب طلب سوالات

یہاں چند جواب طلب سوالات باقی رہ گئے۔ پہلا سوال یہ ہے کہ پہلے گزر چکا کہ استقبال بیت المقدس شب معراج کے بعد اور ہجرت کے بعد حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اجتہاد کی وجہ سے مقرر ہوا تھا۔ جبکہ آیت سے معلوم ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم استقبال کعبہ پر راضی تھے نہ کہ استقبال بیت المقدس پر۔ ان دونوں امور میں ایک تعارض معلوم ہوتا

ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں دو احتمال ہیں پہلا یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اجتہاد بدل گیا ہوگا۔ اور اس کا سبب یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے استقبال بیت المقدس کو زیادہ تر اس لیے منظور فرمایا تھا تاکہ اس قبلے کے استقبال کے ساتھ یہودیوں کے دِلوں میں الفت پیدا کی جائے۔ اور کمالات انبیاء بنی اسرائیل علیہم السلام اور ان کے انوار سے استفادہ بھی جاری اور باقی رہے۔ جب آپ یہودیوں کی متابعت سے مایوس ہو گئے۔ اور وہ استفادہ بھی کمال کو پہنچا تو اس قبلہ یعنی کعبہ کی ترجیح کی وجوہ کو آپ کی نظر میں جلوہ گر کر دیا گیا حتیٰ کہ آپ اپنی استعداد کے مطابق طبعی طور پر اس سمت کو منہ کرنے کے خواہاں ہوئے۔
دوسرا احتمال یہ ہے کہ بیت المقدس کے استقبال کے زمانہ میں ہی آپ استقبال کعبہ کو پسند کرتے ہوں لیکن یہود کی تالیف قلب اور ارواح انبیاء علیہم السلام کے ساتھ ملنے کے اثر کو پورا کرنے کے لیے جس کا شب معراج اتفاق ہوا تھا آپ نے اس استقبال کو بیت المقدس کے ساتھ اختیار فرمایا ہو۔ جس طرح کوئی آدمی ایک اچھے مکان سے دوسرے مکان میں جو کہ اتنا اچھا نہیں ہوتا کسی مصلحت اور کمال کا استفادہ کرنے کے لیے منتقل ہوتا ہے۔ اور پسند اسی پہلے مکان کو کرتا ہے۔

(اقول وباللہ التوفیق - استقبال قبلہ نماز کی شرائط میں سے ہے۔ تحویل قبلہ بحوالہٗ قرآن کریم ایک مہتم بالشان مسئلہ ہے۔ جو کہ سیّد الانبیاء والمرسلین حبیب ربّ العالمین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عظمت ومحبوبیت کا شاہکار ہے اور حکمت خداوندی کا بحر ناپیدا کنار۔ یہاں احتمالات کی اپنی ذہنی تصویر کہ یوں ہوگا یا یوں گا'' جچتی نہیں۔ دراصل اس مسئلہ کی صحیح تعبیر اور مفید تعظیم رسول علیہ السلام تصویر نہ ہے جو کہ امام اہل سنت اعلیٰ حضرت مولانا امام احمد رضا بریلوی قدس سرہ نے اپنے ایک وعظ میں فرمائی ہے۔ بحوالہ حدیث پاک۔ میں نے دنیا و مخلوقات دنیا اسی لئے بنائی کہ میری بارگاہ میں تمہاری جو عزت و منزلت ہے ان پر ظاہر فرمادوں۔ آگے چل کر فرماتے ہیں۔ قال اللہ تعالیٰ: وما جعلنا القبلة التی کنت علیها الا لنعلم من یتبع الرسول ممن ینقلب علیٰ عقبیه۔ ہم نے نہ کیا وہ قبلہ جس پر تم تھے مگر اس لئے کہ علانیہ ظاہر ہو جائے کہ کون براہ غلامی تمہارا اتباع کرتا ہے اور کون

الٹے پاؤں پھرتا ہے۔ دیکھو آیت کریمہ صاف ارشاد فرماتی ہے کہ فرضیت قبلہ صرف اس لئے ہوئی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعظیم واطاعت کرنے والوں کی پہچان سب کو ہو جائے۔ پھر وما خلقت الجن والانس الا لیعبدون پر گفتگو میں فرماتے ہیں کہ عبادت سے حضرت عزت جل جلالہٗ کو نہ کوئی نفع نہ اس کے ترک سے کوئی ضرر۔ وہ غنی حمید ہے۔ احکام عبادت کی تشریح اسی لئے ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے غلامان مطیع وفرمانبردار۔ ان کے حکم سے الٹے پاؤں پھر جانے والے نابکار سب پر ظاہر ہو جائیں۔ عبادت الٰہی اور تعظیم ومحبت رسالت پناہی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم متلازمین ہیں۔ الناقل محمد محفوظ الحق غفرلہ)

دوسرا سوال یہ ہے کہ نص قرآنی کی رو سے جو کہ یہاں پانچ جگہ واقعہ ہوئی صریح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ نماز کا قبلہ پوری مسجد حرام ہے نہ صرف کعبہ ہے۔ حالانکہ ساری اُمت کا اجماع اس بات پر ہے کہ قبلہ صرف کعبہ ہے نہ کہ مسجد حرام اور صحیح احادیث میں بھی یہی آیا ہے۔ چنانچہ بخاری میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت سے موجود ہے کہ لوگ قبا میں نماز صبح میں مصروف تھے کہ اچانک ان کے پاس ایک آنے والا آیا اور اس نے کہا کہ آج کی رات حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر قرآن اُترا ہے۔ اور آپ کو حکم دیا گیا ہے کہ کعبے شریف کو منہ کریں تو تم بھی اسی طرف منہ کرلو اور ان کے چہرے شام کی طرف تھے پس وہ کعبے کی طرف پھر گئے۔ نیز صحیحین میں حضرت ابن عباس (رضی اللہ عنہ) کی روایت سے آیا انہوں نے کہا کہ مجھے اسامہ ابن زید نے خبر دی کہا کہ جب نبی پاک علیہ السلام بیت اللہ میں داخل ہوئے آپ نے اس کی ساری طرفوں میں دعا مانگی اور نماز نہ پڑھی۔ یہاں تک کہ اس سے باہر تشریف لے آئے اور کعبے شریف کی طرف منہ کر کے دو رکعت ادا فرمائیں اور اس کے علاوہ کتب احادیث میں اخبار متواترہ موجود ہیں کہ تحویل قبلہ کعبہ کے ساتھ ہوئی۔ ملکہ ابن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت اور دوسری روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ استقبال کعبہ کا حکم قرآن مجید میں ہے۔ حالانکہ یہ آیت مسجد حرام کے استقبال پر دلالت کرتی ہے۔ پس وہ قرآن جو کہ کعبہ کی طرف تحویل قبلہ پر دلالت کرتا ہے کہاں ہے؟ اس کا جواب عین

تفسیر میں گزر چکا کہ لفظ شطر یہاں بمعنے مثل ہے۔ اور عرب لوگ جس طرح نحو کے لفظ کو مثل کی جگہ استعمال کرتے ہیں۔ بلکہ اصل میں جانب کے لیے وضع کیا گیا ہے۔ اسی طرح لفظ شطر جو کہ اصل میں کسی شے کے ٹکڑے کے لیے وضع کیا گیا ہے جہت اور جانب نیز مثل اور طور کے معنوں میں بھی استعمال کرتے ہیں۔ یہاں اسی استعمال کے مطابق وارد ہوا ہے۔ پس مراد کعبہ کی طرف منہ پھیرنا ہے۔ اور الی الکعبہ کا لفظ جو کہ تولیت کا صلہ تھا قبلۃ ترضاہا کے قرینے سے حذف فرمایا گیا ہے۔ اور شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ کا لفظ لانے کی غرض یہ ہے کہ لمبی صفوں کو چاہیے کہ کعبہ شریف کی محاذات میں دائرہ باندھ کر کھڑے ہوں جس طرح کہ مسجد حرام اس کے دائرہ پر ہے نہ کہ سیدھی قطاروں میں کہ اس صورت میں کعبہ کی محاذات سے باہر ہو جائیں گے۔ اور جو قرآن کہ کعبہ کی سمت تحویل قبلہ پر دلالت کرتا ہے قبلۃ ترضاہا کا لفظ ہے۔ لیکن فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ کو ساتھ ملا کر کیونکہ یہ بات یقین کے ساتھ معلوم ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مرغوب اور پسندیدہ استقبال کعبہ تھا نہ کہ استقبال مسجد حرام اور اگر لفظ شطر کو جانب اور جہت کے معنی میں قرار دیں جو کہ متعارف ہے تو ہم کہیں گے کہ مسجد حرام کی جانب سے مراد وہ جانب ہے۔ جس جانب مسجد حرام روئے توجہ رکھتی ہے۔ اور وہ جانب نہیں ہے مگر جانب کعبہ

ہم یہاں پہنچے کہ جانب کعبہ کو اس طرح بیان کیوں فرمایا گیا اور صراحت کے ساتھ الی الکعبۃ یا جانب الکعبہ کیوں نہ فرمایا گیا؟ تو اس کی وجہ یہ ہے کہ مسجد کا لفظ ذہن کی ادنی توجہ سے اس پر دلالت کرتا ہے کہ سجدہ کی جگہ ہے نہ کہ استقبال کی جگہ۔ پس لازمی طور پر استقبال کی سمت کی رعایت اس مسجد میں بھی کی جائے گی ورنہ مسجد نہ ہوگی۔ وہی جہت استقبال اس مسجد کی جانب ہے پس یہ عبارت جانب کعبہ سے کنایہ لطیف ہوا **والکنایۃ ابلغ من الصریح۔**

اور اس مقام میں کنائے کے راستہ پر چلنے میں ایک نکتہ ہے۔ اور وہ استقبال کعبہ کی دلیل جتلاتا ہے گویا یوں فرمایا کہ مسجد حرام اہل کتاب کے اقرار کے ساتھ مبارک اور حرمت والی مسجد ہے۔ اور حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام کے وقت سے نماز اور

سجدوں کی ادا کے لیے بنائی گئی۔ اس مسجد کے سجدوں کی جانب دیکھو کہ کس سمت پڑتے ہیں۔ اس سمت کو اپنا قبلہ مقرر کرو۔ اور اسی لیے بار بار اسی کنایہ اس مقام پر جو کہ اہل کتاب کے سامنے حجت بیان کرنے کا مقام ہے استعمال فرمایا گیا اور صریح لفظ کعبہ سے سکوت فرمایا گیا۔ صحابہ کبار رضوان اللہ علیہم اجمعین نے جو کہ وحی اور قرآن کے رمز شناس تھے اس کنایہ کو صریح سے بہتر طور پر سمجھ کر کہہ دیا کہ قد انزل علیہ قرآن وان امر باستقبال الکعبہ۔

اور دوسرے مفسرین اس سوال کے جواب میں مختلف ہیں۔ صاحب شرح السنۃ کہتے ہیں کہ ابن عباس (رضی اللہ عنہ) سے روایت آئی کہ بیت اللہ اہل مسجد کا قبلہ ہے' اور مسجد اہل حرم کا قبلہ ہے' اور حرم اہل مشرق اور اہل مغرب کا قبلہ ہے' اور امام مالک رحمتہ اللہ علیہ کا قول یہی ہے۔ لیکن اس جواب پر یہ اعتراض متوجہ ہوتا ہے کہ جب حضور علیہ السلام آیت تحویل کے نزول کے وقت مدینہ منورہ میں تھے تو اس جواب کے مطابق چاہیے کہ آپ کو حرم کی طرف متوجہ فرمایا جاتا نہ کہ مسجد کی طرف کہ اکثر متاخرین اس طرف گئے ہیں کہ یہاں مسجد حرام سے مراد کعبہ ہے' احادیث متواترہ اور اجماع اُمت کی دلیل سے۔ اور اس سے مراد کے دو راستے ہیں پہلا یہ کہ کل کے جزو پر اطلاق کے قبیلے سے ہو' یہ مجاز کا مشہور علاقہ ہے' دوسرا یہ کہ مسجد سے مراد جہت سجدہ ہو نہ کہ محل سجدہ اور مسجد کا شرعی معنی' اور پہلی تقدیر پر حقیقت کے مقابلہ میں مجاز کو اختیار کرنے میں نکتہ یہ ہے کہ جہت کعبہ کی مراعات کا اشارہ ہو کہ کعبہ سے دوری کی حالت میں کفایت کرتی ہے۔ اور عین کعبہ کی رعایت دور والوں کے لیے ضروری نہیں ہے' اور امام اعظم رحمتہ اللہ علیہ کا یہی مذہب ہے' اور امام شافعی رحمت اللہ علیہ کے اقوال میں سے ایک قول اور اس مذہب پر بہت سے دلائل قائم ہیں۔ اس لیے کہ دور والوں کے لیے عین کعبہ کے استقبال میں بہت حرج ہے۔ اور یہ بات یقین کے ساتھ معلوم ہے کہ تحویل کے وقت قبا اور دوسری مساجد والوں نے بلا تامل جہت کعبہ کو منہ کیا۔ خصوصاً ان لوگوں کو جنہیں نماز صبح کے وقت خبر پہنچی۔ اور اس وقت تاریکی تھی' دوران نماز اس حالت میں عین کعبہ کی تشخیص کا کس طرح تصور ہو سکتا تھا' اور حضور علیہ السلام نے ان لوگوں کے عمل کا انکار نہ فرمایا۔ اور ان کی نماز فاسد ہونے کا حکم نہ فرمایا۔

اور جو شخص صحابہ کرام اور تابعین کے غزوات اور لشکروں میں غور کرے بلاشبہ جان لے کہ جہت کعبہ کے استقبال پر اکتفاء کرنا ان کے لیے کافی تھا۔ اور وہ عین کعبہ کا قصد ہرگز نہیں کرتے تھے۔ اس لیے کہ دلائل ہندسیہ سے مدد لیے بغیر عین کعبہ کی تشخیص نہیں کی جاسکتی اور وہ نہ ان دلائل کو جانتے تھے۔ اور نہ ہی ان دلائل کا سیکھنا فرض جانتے تھے۔ اگرچہ دور والوں کے لیے عین کعبہ کی تشخیص اتنی بعید نہیں ہے۔ اس لیے کہ ہر دو نقطے جو آسمان اور زمین میں فرض کیے جائیں ان کے درمیان دلائل ہندسیہ کی مدد سے ملانے والا خط نکالا جاسکتا ہے' اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک عین کعبہ کے استقبال کا معنی یہی ہے کہ نمازی کا سجدہ زمین کے عظیم دائرہ کی کسی قوس پر واقع ہو جو کہ اس کے ہر دو قدم سے بھی گزرتی ہے۔ اور اس کے محل سجدہ سے بھی۔ اور وسط کعبہ سے بھی۔ بشرطیکہ یہ قوس نصف دائرہ سے کم ہو اس حد تک معرفت دائرۂ ہندسیہ اور اس کام کے دوسرے طریقے سے ہو سکتی ہے۔ لیکن یہ معلوم ہے کہ صحابہ و تابعین رضی اللہ عنہم اس تفتیش و تحقیق کی طرف بالکل متوجہ نہ تھے' اور عرب و عجم کے نو مسلموں خصوصاً جنگلیوں کو اس طریقے کی معرفت عطا نہ کی۔

تشخیص قبلہ کی علامات کا بیان

ہاں علامات کے ساتھ قبلہ کی تشخیص ان کے درمیان رائج تھی۔ اور علامات کی تین قسمیں لکھی ہیں پہلی زمینی' دوسری ہوائی' تیسری آسمانی' زمینی علامات جیسے پہاڑ' نہریں' شہر اور دیہات ہوائی علامات جیسے مختلف سمتوں کی ہوائیں ضبط میں نہیں آتیں مگر یہ کہ کسی مسافر کے راستے میں اونچا پہاڑ واقع ہو اور وہ پہلے سے جانتا ہے کہ یہ پہاڑ قبلہ کی طرف منہ کرنے والے کے سیدھے ہاتھ پر واقع ہے یا اُلٹے ہاتھ پر یا بالکل سامنے یا پس پشت' اور اسی طرح منزل سے سیر کی ابتدا کے وقت ایک ہوا شمال سے یا جنوب سے چلنا شروع ہوتی ہو اور وہی ہوا راستہ میں جاری رہے اس سے سمت کی تشخیص لازماً ہو سکتی ہے' رہی آسمانی علامات تو روزانہ چاہیے کہ شہر سے باہر آنے سے پہلے زوال کے وقت سورج کا ملاحظہ کرے کہ اس کے دونوں ابروؤں کے درمیان ہوتا ہے یا سیدھی آنکھ پر یا اُلٹی آنکھ پر یا ان اعضا کے سامنے سے کچھ ہٹ کر ہے تھوڑا یا زیادہ' اور شمالی شہروں میں کہ مسلمانوں کی زیادہ تر رہائش

گا ہیں بھی شہر ہیں۔ سورج ان تین روشوں سے کم ہی تجاوز کرتا ہے۔ اور اسی طرح عصر کے وقت بھی سورج پر نگاہ رکھے' اور غروب کے وقت بھی کہ کس سمت غروب ہوتا ہے قبلہ کی طرف منہ کرنے والے کی دائیں جانب یا بائیں جانب اور اس کے سامنے کی طرف کچھ مائل ہے یا اس کی پچھلی طرف' اور اسی طرف عشاء کے وقت شفق پر دھیان کرے۔ اور صبح کے وقت طلوع کو دیکھے' اور موسم گرما کے مشرق اور موسم سرما کے مشرق میں امتیاز کے متعلق احتیاط کرے' غالب طور پر سمت قبلہ سے غلطی نہ ہوگی' اور رات کے وقت قوی علامت ستارۂ جدی ہے۔ جسے قطب کہتے ہیں اسے شہر میں قبلہ کی طرف مستقبل ہو کر دیکھے کہ گدی پر رہتا ہے یا دائیں کندھے پر یا بائیں کندھے پر یہ مکہ شریف سے شمال میں واقع شہروں میں ہے۔ اور ان شہروں میں جو کہ مکہ شریف سے جنوب میں واقع ہیں ان میں ان روشوں کے خلاف ہوگا۔ اور جب یہ علامات یاد ہوگئیں تو ان کے مطابق راستے میں استدلال کرے۔

اور طویل راستہ طے کیا ہو جس کی وجہ سے آسمانی روشیں بدل گئی ہوں تو چاہیے کہ جب کسی شہر میں وارد ہو تو اس شہر کے طلوع' غروب اور قطب کو ملاحظہ کرے یا اس شہر کے دانشوروں سے تحقیق کرے یا اس شہر کی مسجد جامع کے محراب کو دیکھے۔ اور آئندہ اس کے مطابق عمل کرے۔ لیکن ظاہر ہے کہ یہ سب علامتیں عین کعبہ کی تشخیص میں کفایت نہیں کرتیں' دلائل ہندسیہ کی مدد کے بغیر یقین حاصل نہیں ہوتا اگر ہر نمازی کو عین کعبہ کی پہچان کی ذمہ داری سونپی جائے تو بہت بڑا حرج واقع ہوتا ہے کہ اس کی مثل شرع شریف میں وارد نہیں ہوا۔

تیسرا سوال یہ ہے کہ لغت میں لفظ قد تقلیل کے معنوں میں ہے۔ جبکہ یہاں تقلیل درست نہیں ہوتا اس لیے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چہرۂ انور کی گردش کو خداتعالیٰ کا دیکھنا ہمیشہ تھا نہ کہ گاہے گاہے۔ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ دوران تفسیر گزر چکا کہ دیکھے جانے والی شئی کے وقوع کی قلت کے پیش نظر یہاں تقلیل کا معنی درست ہے نہ کہ دیکھنے کی قلت کے اعتبار سے' اور جب کوئی چیز فی نفسہ کم واقع ہو نظر میں بھی کم آئے گی اور ظاہر ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چہرۂ انور کا آسمان کی طرف گردش کرنا دائمی اور اکثری نہ تھا۔ بلکہ گاہے گاہے تھا۔ پس یہاں لفظ قد کے استعمال میں کسی تکلف کی حاجت

نہیں ہے۔

اور بعض مفسرین نے کہا ہے کہ یہاں قد کثرت کے معنوں میں ہے' اور جس طرح کہ لفظ رُب جو کہ اصل میں تقلیل کے معنوں میں ہے تکثیر کے معنوں میں بھی استعمال کرتے ہیں اسی طرح لفظ قد کو بھی کبھی تکثیر کے معنوں میں استعمال کرتے ہیں۔ شاعر کے قول کی دلیل سے' قد اترك القرن مصفر انامله' کان اثوابه مجت بفرصاد' اور ان میں سے بعض نے کہا ہے کہ یہاں لفظ قد بمعنے تحقیق ہے۔ جیسے قد یعلم اللّٰہ المعوقین منکم میں۔ گویا مضارع کو ماضی کا حکم دیا گیا ہے۔

چوتھا سوال یہ ہے کہ قبلہ کا استقبال پورے بدن کے ساتھ فرض ہے حتیٰ کہ انگلیوں کے سر بھی سجدہ اور قعدہ کی حالت میں اسی طرف متوجہ رکھنے چاہئیں جبکہ اس آیت میں صرف چہرے کو جس پر لفظ وجہ دلالت کرتا ہے کیوں ذکر کیا گیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ چہرے کو ایک سمت میں متوجہ کرنا تمام بدن کو اس سمت متوجہ کرنے کو لازم کرتا ہے۔ نیز چونکہ اعضائے انسانی میں سے چہرہ سب سے زیادہ عزت والا ہے اس کا قبلہ کی سمت متوجہ کرنا معلوم ہو گیا تو قیاس کے ساتھ دوسرے اعضاء کی اس سمت میں توجہ معلوم ہو گئی۔ البتہ گدی' پشت اور ایڑیاں ان سب اعضا کو چہرے کے متوجہ کرنے کے باوجود متوجہ کرنا ممکن نہیں ہے۔ اس لیے انہیں ساقط کر دیا گیا۔ بلکہ توجہ کا معنی بدن کی اسی طرف کو کعبہ کی طرف پھیرنے میں منحصر ہے۔ جو کہ چہرے کی جہت میں واقع ہے۔ اور اس باب میں اصل چہرہ ہے۔ اور دوسرے اعضاء اس کے تابع' اور اسی وجہ سے تمام اعضا کے رُخ اور پشت کو عرف اور لغت میں چہرے کے رُخ اور پشت کے ساتھ اعتبار کرتے ہیں۔ اور رُخ اور پشت کے ساتھ تعبیر کرتے ہیں۔

پانچواں سوال یہ ہے کہ اس آیت میں مسجد حرام کی طرف منہ کرنے کو مطلقاً فرمایا ہے۔ معلوم نہیں کہ کس کس حالت میں مراد ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اس قسم کے خطابات میں مراد کو سمجھنے میں قرآئن حالیہ اور قالیہ کفایت کرتے ہیں۔ تصریح کی حاجت نہیں ہے۔ کیونکہ ظاہر ہے کہ گفتگو قبلہ کے مقدمہ میں تھی۔ اور قبلہ کو چہرے کے سامنے رکھنا نماز میں

Marfat.com

واجب ہے نہ کہ غیر نماز میں' ہاں دوسرے حالات میں اس طرف منہ کرنا مستحب ہے۔ اور عبادت میں داخل ہے۔ جیسے سونے' قرآن کریم کی تلاوت کرنے ذکر کرنے' دعا کرنے اور قربانی کرنے کی حالت میں بلکہ مطلق بیٹھنے کی حالت میں روبقبلہ بیٹھنا حدیث صحیح کی دلیل کے ساتھ مستحب ہے کہ فرمایا بہترین مجلس وہ ہے۔ جس میں قبلہ کی طرف رُخ ہو۔

نماز میں استقبال قبلہ کی تفصیل

اور نماز میں بھی استقبال قبلہ کی ایک تفصیل ہے۔ اگر نماز فرض ہے تو اس میں استقبال قبلہ ہر حالت میں فرض ہے سوائے حالت خوف کے' اور اگر نماز فرض نہیں ہے تو استقبال قبلہ اس میں بھی فرض ہے۔ لیکن مقیم ہونے کی صورت میں' اور سفر کے دوران شہر سے باہر استقبال قبلہ ضروری نہیں' فرض اور وتر کے سوا۔ سوار ہوکر نماز ادا کرنا جس سمت میں بھی منہ ہو جائز ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت کی دلیل سے جو کہ بخاری اور مسلم میں موجود ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دوران سفر سواری پر نفل نماز ادا فرماتے تھے جس طرف بھی متوجہ ہو۔ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک سفر میں پیدل مسافر کے لیے چلنے کے دوران نماز فرض کے سوا دوسری نماز جس سمت اس کی راہ ہو ادا کرنا جائز ہے' اور امام اعظم اور امام احمد کے نزدیک پیادہ کو اس طرف نماز جائز نہیں۔ اور اگر دوران سفر کسی ایسی جگہ پہنچ جائے کہ سمت قبلہ معلوم نہ ہو تو سب سے پہلے چاہیے کہ کسی معتبر سے پوچھے اور اس کے کہنے پر عمل کرے۔ اور اگر کوئی معتبر نہ ہو تو علامات اور قرائن سوچ کر سمت قبلہ کو اپنے ذہن میں مقرر کرے۔ اور اس سمت نماز ادا کرے' پھر اگر معلوم ہو جائے کہ وہ سمت قبلہ کی سمت نہ تھی اس کی نماز درست ہوگئی قضا نہیں آتی۔ اس لیے کہ اس کے حق میں قبلہ وہی جہت ہے۔ جو کہ اس کے ذہن میں قرار پائی۔

اور جب ثابت ہوا کہ اہل کتاب حقیقت استقبال کعبہ کو سمجھتے ہیں۔ اور جان بوجھ کر حق پوشی کرتے ہیں تو ان سے اس قبلہ کی متابعت کی توقع نہیں رکھنا چاہیے۔ اور دل کو ان کی موافقت کے ساتھ متعلق نہیں کرنا چاہیے۔

وَلَئِنْ اَتَيْتَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتَابَ اور اگر آپ لائیں ان لوگوں کے پاس جو کہ

کتاب دیئے گئے ہیں اپنے قبلہ کے برحق ہونے پر بِكُلِّ آيَةٍ ہر دلیل۔ اور نشان جو کہ ممکن ہے۔ جیسا کہ ان میں سے کچھ دلیل اور نشان گزر چکے اور ان میں سے عمدہ یہ ہے کہ آپ نے انہیں اس قبلہ کے برحق ہونے کو جاننے کی خبر دی حالانکہ وہ اس راز کو چھپانے میں بہت مبالغہ کرتے تھے۔ اور کسی کو اس کا نشان تک نہ دیتے تھے۔ چہ جائیکہ کہ ایک اُمی شخصیت کو ان کی کتابوں پر آگاہی ہو لیکن وہ آپ کے تمام اعجاز کے باوجود

مَا تَبِعُوْا قِبْلَتَكَ آپ کے قبلہ کی پیروی نہیں کریں گے۔ اس لیے کہ ان کا ارادہ ہے کہ آپ کو اپنے تابع کریں نہ خود آپ کے تابع ہوں۔ وَمَا اَنْتَ بِتَابِعٍ قِبْلَتَهُمْ اور آپ ان کے قبلہ کے پیرو ہرگز نہیں ہیں۔ اس لیے کہ اب آپ کا قبلہ کعبہ کی سمت کو مقرر ہو چکا اور ہرگز منسوخ نہیں ہوگا۔ اگر بالفرض منسوخ ہونے کا احتمال بھی ہوتا پھر بھی آپ کا ان کے قبلہ کی پیروی کرنا کس طرح متصور ہوتا اس لیے کہ وہ ایک قبلہ پر متفق نہیں ہیں۔ یہودی اپنا قبلہ صخرہ بیت المقدس کو بناتے ہیں۔ جبکہ نصاریٰ بیت المقدس کے مشرقی مکان کو کہ جہاں حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کی روح پھونکی گئی قبلہ قرار دیتے ہیں۔

وَمَا بَعْضُهُمْ بِتَابِعٍ قِبْلَةَ بَعْضٍ اور ان میں سے بعض جو کہ یہودی ہیں پیروی کرنے والے نہیں بعض کے قبلہ کی جو کہ نصاریٰ ہیں۔ پس آپ کا قبلہ کے بارے میں ان کے اختلاف کے باوجود ان کے قبلہ کی پیروی کرنا دو نقیضوں کی پیروی کے قبیلے سے ہے۔ جو کہ عقل مند کے نزدیک محال ہے۔

اور اگر یہ اپنے قبلہ کے بارے میں اختلاف کی وجہ یہ بتائیں کہ پہلے اللہ تعالیٰ کا حکم استقبال صخرہ کے متعلق آیا تھا۔ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت اور آپ کی روح مبارک کے اس عالم میں اُترنے کے بعد وہ مکان جو کہ آپ کی روح پھونکے جانے کا مقام تھا اللہ تعالیٰ کے حکم سے قبلہ قرار پایا۔ تو ہم کہتے ہیں کہ پس کیا بعید ہے کہ اب ان دونوں مقامات کے سوا کسی دوسرے مکان کو قبلہ بنانے کے متعلق حکم خداوندی آیا ہو۔ اور یہ دونوں حکم منسوخ ہو چکے ہوں۔ اور جب منسوخ ہو جائے تو پھر کوئی اور دلیل نہیں کہ اس کی پیروی کی جائے بلکہ صرف ہوائے نفسانی اور دلی خواہش کا حکم رہ جاتا ہے۔ جس کی پیروی دین

کے معاملات میں حرام ہے۔

وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَاءَ هُمْ اور اگر بفرض محال آپ جو کہ مخلوقات میں افضل اور گناہ سے معصوم ہیں ان کی خواہشات نفسانی کی پیروی کریں جنہیں یہ اپنے گمان میں احکام الٰہی جانتے ہیں مِنْ بَعْدِ مَا جَآءَ كَ مِنَ الْعِلْمِ اس کے بعد کے آپ کے پاس وحی کے ذریعے علم قطعی آیا ہے کہ ان کا قبلہ دوسرے قبلہ کے ساتھ جو کہ ان سے کامل ہے منسوخ ہو گیا۔

اِنَّكَ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِیْنَ تحقیق آپ اس محال تقدیری پر ظالموں میں سے ہوں گے اس لیے کہ ادنیٰ کو اعلیٰ پر ترجیح دے کر امر الٰہی کی مخالفت کی' اور آپ کا ظالم ہونا قطعاً محال ہے تو آپ کا تابع ہونا بھی محال ہے۔

(اقول وباللہ التوفیق -یاد رہے کہ یہ ترجمہ ظاہری الفاظ کو دیکھ کر کیا گیا اور اسی لیے حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مقام عصمت نبوت کے تحفظ کے لیے بفرض محال اور محال تقدیری کا قول کرنا پڑا جو کہ ایک قسم کا تکلف ہے۔ چونکہ عظمت رسول علیہ السلام کا مسئلہ نہایت اہم اور نازک ہے۔ اس لیے حبك الشیء یعمی ولصیم کے بمصداق اہل محبت اس ترجمہ سے متفق نہیں ہیں۔ بلکہ ان الفاظ کا درست اور عظمت رسالت علی صاحبہا الصلوٰۃ والتسلیمات کے مطابق صحیح ترجمہ وہ ہے۔ جو کہ امام اہل سنت شیخ العرب والعجم اعلیٰ حضرت مولانا الشاہ امام احمد رضا بریلوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے مشہور آفاق ترجمہ القرآن مسمّی بہ کنز الایمان میں کیا ہے' اور وہ یہ ہے۔ اور (اے سننے والے کسے باشد) اگر تو ان کی خواہشوں پر چلا بعد اس کے کہ تجھے علم مل چکا۔ تو اس وقت تو ضرور ستم گار ہوگا۔ محمد محفوظ الحق غفرلہٗ)

دو جواب طلب سوالات

یہاں دو جواب طلب سوال باقی رہ گئے۔ پہلا سوال یہ ہے کہ بعض یہودی بلاشبہ ہمارے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قبلہ کے تابع ہوئے ہیں۔ جیسے عبداللہ بن سلام' اور اسی طرح نصاریٰ میں سے بھی بعض نے پیروی کی جیسے نجاشی اور ذی مخمر' تو آیت مَا تَبِعُوْا قِبْلَتَكَ کا مضمون کس طرح درست ہوگا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں تمام اہل کتاب کی پیروی مراد ہے۔ اس لیے کہ الذین کا لفظ عموم کے الفاظ سے ہے۔ اور جو واقع

ہوا ہے وہ بعض افراد کی پیروی ہے۔ اور ان میں سے بعض کے پیروی کرنے سے تمام کی سلب کی نفی نہیں ہوتی۔

اور بعض مفسرین نے کہا کہ اَلَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتَابَ سے خاص علمائے اہل کتاب مراد ہیں۔ اور اس آیت کے نزول کے بعد اہل کتاب کے علماء میں سے کوئی بھی اس قبلہ کا پیروکار نہ ہوا۔ عبداللہ بن سلام اور نجاشی وغیرہما اس آیت کے نزول سے پہلے اسلام لائے تھے۔ اور جواب میں سب سے زیادہ صحیح یہ ہے کہ تبعیت قبلہ سے مراد مستقل طور پر سمت قبلہ کی طرف توجہ ہے نہ کہ قبول اسلام کے ضمن میں، اور اہل کتاب کے نزدیک کعبہ کی طرف توجہ کے برحق ہونے کے باوجود ان میں سے کسی سے بھی یہ توجہ واقع نہ ہوئی۔ حالانکہ احتمال تھا کہ اپنی نماز میں کبھی اس قبلہ کی طرف بھی متوجہ ہوں۔ اس لیے کہ یہ حضرت ابراہیم و اسماعیل اور دوسرے گزشتہ انبیاء علیہم السلام کا قبلہ رہا ہے۔ اور اس کی عظمت کا ثبوت تسلیم شدہ۔

دوسرا سوال یہ ہے کہ اھواھم میں جمع کے صیغے کو اختیار کرنے کی کیا وجہ ہے؟ حالانکہ ان کے دِلوں کی خواہش ایک چیز تھی جو کہ نماز میں ان کے قبلہ کی طرف استقبال ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ پہلے گزر چکا کہ اہل کتاب کے دو گروہ قبلہ کے مسئلہ میں ایک دوسرے سے مختلف تھے۔ ہر ایک کی دلی خواہش اپنے قبلہ کا استقبال تھا۔ پس ان کی خواہش میں تعدد واقع ہو گیا۔ اور جمع کا صیغہ جو کہ اکثر ایک سے اوپر کے لیے مستعمل ہوتا ہے صحیح الاستعمال ہوا۔ نیز طالبوں کی کثرت کے اعتبار سے طلب متعدد ہو جاتی ہے۔ نیز ان کے قبلہ کی طرف توجہ اگرچہ ایک خواہش ہے۔ لیکن اس کے مراتب اور افراد کے اعتبار سے خواہشات مختلف ہیں۔ نیز قبلہ کی طرف نماز گزارنا ان کے چند مقاصد کو ضمن میں لیے ہوئے ہے، پہلا قصد اپنے قبلۂ کامل سے پھرنا، دوسرا ان کے قبلہ کی سمت کی معرفت میں ان سے پوچھنا اور انہیں مشارالیہ قرار دینا۔ تیسرا نماز میں اس کی طرف منہ کرنا، چوتھا اپنے آپ کو ان کے طعن وطنز کی جگہ بنانا۔ تا کہ وہ کہہ سکیں کہ ان کے دین کا رکنِ اعظم جو کہ نماز ہے ہماری پیروی کیے بغیر پورا نہیں ہوتا۔

نیز ان کے قبلہ کی طرف نماز ادا کرنا اس آیت کے معنوں میں متعین نہیں ہے مگر صرف

اس جہت سے کہ مقدمۂ قبلہ میں وارد ہوئی۔ جبکہ اعتبار عموم لفظ کا ہوتا ہے نہ کہ موقع کے خاص ہونے کا۔ پس لفظ اہواء کفار کے تمام اعتقادات کو شامل ہے خواہ قبلہ کے مقدمہ میں ہو یا اس کے غیر میں، اور اس آیت کی دوسری بحثیں وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَاءَهُمْ بَعْدَ الَّذِیْ جَاۗءَكَ مِنَ الْعِلْمِ مَالَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِیٍّ وَّلَا نَصِیْرٍ کی تفسیر میں پہلے گزر چکیں، تکرار کی ضرورت نہیں۔

اگر آپ کے دل میں گزرے کہ اگر میرا قبلہ سمت کعبہ کے ساتھ مقرر ہو گیا تو چاہیے کہ اہل کتاب بھی اس بات کا یقین کر لیں اور بار بار اس قبلہ کے نسخ اور ان کے منسوخ قبلہ کی طرف میری توجہ کی آرزو نہ کریں۔ اور یہ نہ کہیں کہ اگر ہمارے قبلہ کی طرف لوٹ آئیں تو ہم امید کرتے ہیں کہ یہ ہمارے وہی صاحب ہیں جن کے ہم منتظر ہیں تا کہ دوسرے لوگوں کو اس قبلہ کے ثبوت اور میرے متعلق وہ پیغمبر (علیہ السلام) ہونے میں کوئی شک وشبہ نہ پڑے جس کا آخر زمانے میں آنے کا وعدہ کیا گیا اور سابقہ کتب میں ذکر کیا گیا تو آپ جان لیں

اَلَّذِیْنَ اٰتَیْنٰهُمُ الْكِتٰبَ جنہیں ہم نے کتاب دی ہے خواہ یہودی ہوں خواہ نصرانی یَعْرِفُوْنَهٗ اس مسئلہ کو پہچانتے ہیں کہ آپ کا ان کے قبلہ کے منسوخ ہونے کے بعد اس کی پیروی کرنا مقصود نہیں ہے۔ اور نہ ہی ہوگا۔ اور یہ کہ آخر زمانے میں موعود رسول (علیہ السلام) جن کا ذکر پہلی کتابوں میں ہے آپ ہی ہیں۔ اور اس رسول علیہ السلام کا قبلہ کعبہ معظمہ ہوگا نہ کہ بیت المقدس۔ اور ان کی یہ شناخت اس قبیلے سے نہیں جو کہ معجزات اور خارق عادات دیکھنے پر ثابت ہوتی ہے۔ اور اس میں سب لوگ شریک ہیں۔ اور اس شناخت کا حاصل آپ کی نبوت کے علم کے بغیر کوئی اور چیز نہ ہوگی۔ بلکہ ان کی یہ شناخت اشخاص کی شناخت کے قبیلے سے ہے۔ جو کہ اس سے عبارت ہے کہ اشخاص کی تمیز ان کے مشخصات کے ساتھ جیسے نسب، قبیلہ، جائے ولادت، جائے سکونت، چہرہ، رنگ، روش، آئین اور قد وقامت۔ اس لیے کہ آپ کے ان سب مشخصات کو اپنی کتابوں سے آپ کی تشریف آوری سے پہلے یاد کیے ہوئے ہیں۔ اور جب آپ عالم موجودات میں رونق افروز ہوئے تو انہوں نے اپنی سابقہ معلوم صفات، حلیہ، شمائل اور تمام مشخصات کو آپ میں دیکھ کر

آپ کو پہچان لیا کہ یہ وہی شخصیت ہیں جن کی آمد کا وعدہ ہم نے اپنی کتابوں میں دیکھا تھا۔
كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَ هُمْ جس طرح کہ اپنے بیٹوں کو دوسروں کے بیٹوں کے درمیان پہچانتے ہیں۔ اگرچہ قدوقامت اور اکثر امور میں دوسرے بچوں کے ساتھ شریک ہوں لیکن ان کی نظر میں اپنے بیٹے دوسرں کے بیٹوں سے مشتبہ نہیں ہوتے۔ لیکن اس مقدمہ کے اظہار میں مختلف ہیں۔ ان میں سے کچھ لوگ حق پرستی کے رنگ میں اظہار بھی کرتے ہیں وَاِنَّ فَرِيْقًا مِّنْهُمْ اور تحقیق ان میں سے ایک فریق لَيَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ البتہ حق کو جان بوجھ کر چھپاتے ہیں۔ لیکن حق واقعی ان کے چھپانے سے چھپا نہیں رہتا اس لیے کہ

اَلْحَقُّ حق وہی ہے۔ جو کہ نازل ہوتا ہے مِنْ رَّبِّكَ آپ کے پروردگار کی طرف سے خواہ سابقہ کتابوں کو جاننے والے اس کے موافق اظہار کریں۔ اس لیے کہ حق کی اصل سند آپ کے پروردگار تک پہنچتی ہے۔ انہیں بھی اگر معلوم ہوا ہے تو کتب الٰہیہ سے معلوم ہوا ہے۔ جو کہ پہلے انبیاء علیہم السلام پر اُتری تھیں نہ کہ اپنے عقلی افکار سے۔ پس جب آپ پر کتاب الٰہی کا نزول بلا واسطہ ہوا تو حق صریح آپ کو معلوم ہو گیا۔

فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ پس نہ ہوں شک کرنے والوں سے۔ اس شبہ کی وجہ سے کہ پہلی کتابوں کو جاننے والے اس وحی کے خلاف کہتے ہیں۔ اس لیے کہ وحی قطعی کسی شبے کا محل نہیں ہوتا کہ سابقہ وحی کو جاننے والوں کی مخالفت اور موافقت کو اس کی امداد اور موافقت کے لیے طلب کیا جائے۔ البتہ یہ طلب اولیاء اللہ کے کشف اور صلحاء کے الہام میں ضروری ہے۔ کیونکہ دلیل قطعی نہیں ہے۔ بلکہ ظنی ہے۔ اور خطا کا احتمال بھی رکھتا ہے جب تک کہ وحی کو جاننے والوں سے اس کی وحی کے ساتھ موافقت اور مخالفت کی تحقیق نہ کر لی جائے اس کے مقبول کرنے اور رد کرنے میں اطمینان حاصل نہیں ہو سکتا۔

(اقول وباللہ التوفیق- یہاں بھی وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ الخ کا حاشیہ دیکھ لیا جائے۔ جب مفسر علام کی تحریر کے مطابق انہیں علم ہے کہ وحی قطعی اشتباہ کی جگہ نہیں ہوتی تو کیا جس رسول علیہ السلام کے قلب مقدس پر یہ وحی اُتری انہیں اس کی قطعیت وحمیت کا

یقین نہیں ہوگا؟ لازماً ہوگا۔ بلکہ اس قطعیت کا علم لازمی ہوتا ہے تو پھر ایسے مفروضے قائم کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ اس لیے اس کا صحیح، معیاری اور عظمت سید عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا احترام کرتے ہوئے مزاج قرآنی کے مطابق حقیقی اور واقعی ترجمہ وہ ہے۔ جو کہ امام اہل سنت الشاہ احمد رضا خان محدث بریلوی رحمۃ اللہ علیہ نے کیا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ (اے سننے والے) یہ حق ہے تیرے رب کی طرف سے (یا حق وہی ہے جو تیرے رب کی طرف سے ہو، تو خبردار تو شک نہ کرنا محمد محفوظ الحق غفرلہٗ)۔

چند جواب طلب سوالات

یہاں چند جواب طلب سوالات باقی رہ گئے۔ پہلا سوال یہ ہے کہ لفظ معرفت زیادہ تر جزوی اشخاص کی ان کی مشخصات اور خصوصیات کے ساتھ شناخت، میں استعمال ہوتا ہے۔ اور لفظ علم معانی واحکام جاننے میں۔ جبکہ یہاں جب لفظ معرفت استعمال فرمایا گیا ہے یوں معلوم ہوتا ہے کہ مراد وہی مشخصات کے ساتھ شناخت ہے کیونکہ پیغمبر ہونے کو جاننا، اور اس کی وجہ تفسیر میں بھی گزر چکی کہ پیغمبر علیہ السلام کی پیغمبری کا علم صرف معجزات دیکھنے سے حاصل ہوتا ہے۔ اور اس میں اہل کتاب اور غیر اہل کتاب یکساں ہیں۔ نیز اہل کتاب کے مقابلہ میں صرف ایک پیغمبر (علیہ السلام) کے متعلق علم ثابت کرنا اتنا مفید نہیں ہے۔ اس لیے کہ اکثر کتابوں میں دیکھے ہیں۔ پس انہیں الزام اسی معرفت کے ساتھ زیادہ لائق اور موزوں ہے نہ کہ نبوت اور پیغمبری کے علم کے ساتھ لیکن صحیح روایات میں آیا ہے کہ حضرت امیر المومنین عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ سے جو کہ یہود کے عظیم احبار میں سے تھے۔ اور مشرف باسلام ہو چکے تھے پوچھا کہ آپ ہمارے رسول کریم علیہ السلام کو کیسے پہچانتے ہیں؟ عبداللہ بن سلام (رضی اللہ عنہ) نے کہا کہ میں اپنے بیٹے کے میرا بیٹا ہونے کے یقین سے پہلے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رسالت پر یقین رکھتا ہوں۔ اس لیے کہ مجھے آپ کی رسالت میں کسی وجہ سے بھی شک نہیں ہے۔ جبکہ اپنے بیٹے کے بیٹا ہونے میں شک کی گنجائش ہے۔ احتمال یہ کہ اس کی ماں نے خیانت کی ہو اور غیر کے بیٹے کو میری طرف منسوب کر دیا ہو۔ حضرت امیر المومنین رضی اللہ عنہ نے حضرت

عبداللہ بن سلام (رضی اللہ عنہ) کے سر کا بوسہ لیا۔ اور ان کی تحسین و آفریں فرمائی۔

اور اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ مراد حضور علیہ السلام کی نبوت اور پیغمبری کا علم ہے نہ کہ آپ کی شخصیت پاک کی معرفت، اور اس مراد پر یہ سوال وارد ہوتا ہے کہ بیٹے کے بیٹے ہونے کا علم علومِ قطعیہ میں سے نہ تھا جو کہ احتمال نقیض سے پاک ہوتے ہیں کہ یہاں پیغمبر علیہ السلام کی پیغمبری کو جو کہ قطعیت کی تاکید اور احتمال نقیض کے نہ ہونے کی متقاضی ہے تشبیہ دی جاتی۔ اس روایت سے پیدا ہونے والے اس اشکال کا کیا حل ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ اس مقولہ سے حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ کی مراد بھی تھی کہ ہمیں پیغمبر علیہ السلام کی پیغمبری کے علم کے متعلق کیا پوچھنا چاہیے کہ یہ علم تو ہمارا ادنیٰ مرتبہ ہے۔ اور اس معرفت سے جو کہ اس آیت میں ہماری طرف منسوب کی گئی ہے مراد یہ علم نہیں ہے۔ اس لیے کہ یہ علم ہمارے بیٹوں کے بیٹے ہونے کے علم سے زیادہ قوی ہے۔ اور اقوی کی تشبیہ اضعف کے ساتھ دینا لائق نہیں بلکہ ہمیں اس پیغمبر علیہ السلام کی خصوصیت اور مشخصات کے بارے میں پوچھنا چاہیے جو کہ شناخت سے عبارت ہے۔ اور حضرت امیر المومنین عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے بھی اسی معنی کو ان سے سن کر انہیں بوسہ دیا تھا۔ اور آفرین کی تھی۔ پس کوئی اشکال نہیں ہے۔

یعرفون ابناء ھم میں بیٹوں کی تخصیص کی وجہ

دوسرا سوال یہ ہے کہ حلیہ کی معرفت میں جو کہ التباس اور اشتباہ کا محل نہیں ہوتا جس طرح بیٹے ضرب المثل ہیں اسی طرح بیٹیاں بھی۔ پس بیٹوں کے ذکر کو خاص کرنا کس نکتہ کی بنا پر اختیار فرمایا گیا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ بیٹے اندر باہر آنے جانے کی وجہ سے مشہور و معروف ہوتے ہیں۔ اور باپوں کی صحبت میں زیادہ رہتے ہیں۔ اور مرد ہونے کی شرافت اور صورت و سیرت میں مناسبت کی وجہ سے باپوں کے دلوں میں زیادہ جگہ رکھتے ہیں۔ پس ان کی معرفت باپوں کے حق میں لڑکیوں کی معرفت سے زیادہ مضبوط اور قوی ہے۔ اور اگر برابری بھی ہو تو مذکر ہونے کی شرافت ان کے ذکر کی متقاضی ہے۔

اوامر ونواہی متعلقہ نبوت کی حقیقت

تیسرا سوال یہ ہے کہ رسول علیہ السلام کو شک سے بھی نہی فرمانے کا کیا معنی؟ کہ ان کی ذات تو شک سے بالاتر ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ پیغمبر علیہم السلام سب لوگوں کی طرح مکلف، مامور اور منہی ہیں۔ اور پہلے گزر چکا کہ انبیاء علیہم السلام کی خلقی عصمت امرونہی ابتلائی کے منافی نہیں۔ پس نہی میں معصیت کے لائق ہونا درکار نہیں ہے۔ البتہ مکلف ہونا درکار ہے۔ اور وہ محقق ہے۔ اور اسی قاعدے پر ان تمام اوامر ونواہی کو جو کہ قرآن مجید میں انبیاء علیہم السلام کی طرف متوجہ ہیں سمجھنا چاہیے اور جگہ جگہ تکلف نہیں کرنا چاہیے۔ جیسے لاتدع مع اللّٰہ الٰھًا آخر، اور جیسے فاعلم انه لا اله الا اللّٰه۔

اور مفسرین کی ایک جماعت نے جو کہ خواہ مخواہ اس قسم کے اوامر ونواہی سے معصیت کے قابل ہونا سمجھتے ہیں کہا ہے کہ یہ نہی ان لوگوں کے حال کے ساتھ تعریض کے باب سے ہے۔ جو کہ شک رکھتے تھے یا رکھیں گے۔ جیسا کہ اس آیت میں لئن اشرکت لیحبطن عملك اور اس قسم کی آیات میں قرار پایا ہے۔ اور اس کا حاصل یہ ہے کہ اس قسم کے اوامر اور نہی کو انبیاء علیہم السلام کی طرف متوجہ کرنا دوسرں کے سنانے کے لیے ہے۔ جیسا کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے کہ آپ فرماتے تھے کہ قرآن پاک ایاك اعنی فاسمعی یا جارة (یعنی میں نے تیرا ہی قصد کیا ہے پس اے پڑوسن تو سن) کے انداز پر اُترا ہے۔ بہر حال مدعا یہ ہے کہ دلائل قطعیہ کے ساتھ حق واضح ہونے کے بعد کسی کی مخالفت اور موافقت کا کوئی اندیشہ نہیں ہونا چاہیے۔ اور ایک رائے اور ایک آئین پر اتفاق حاصل کرنے کے درپے نہیں ہونا چاہیے کہ یہ اتفاق نوع انسانی میں جو کہ اختلاف کے لیے پیدا کی گئی ہے محال ہے۔ اور اگر تم افرادِ انسانی کی معنوی اور صوری توجہ کے بارے میں غور کرو تو عظیم اختلاف پاؤ گے اس حد تک کہ اس نوع کا ہر ہر فرد ظاہر میں بھی اور باطن میں بھی کسی دوسری طرف متوجہ ہے۔

وَلِكُلٍّ اور ہر شخص، ہر فرقہ، ہر ملک اور ہر ریاست کے لیے وِّجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيهَا ایک جہت ہے کہ وہ اپنے چہرے کو اس طرف رکھتا ہے باطن میں کسی کا اسلام کی طرف منہ

ہے۔ اور کسی کا کفر کی طرف۔ کوئی مندر اور آتش کدہ کو جاتا ہے تو کوئی مسجد و مدرسہ میں، کوئی مال اور کارخانہ کے ساتھ دل باندھتا ہے۔ اور کوئی رعب اور مرتبہ کے ساتھ، کوئی خوبصورت عورتوں پر نگاہیں جمائے ہوئے ہے۔ اور کسی کی توجہ پیارے بیٹوں پر ہے۔ کسی کا دل عبادت خداوندی میں مصروف ہے۔ اور کوئی ہوائے نفسانی کی پیروی کا دلدادہ۔ ہر قوم کی ایک راہ، ایک دین اور ایک قبلہ گاہ ہے۔ رہا ظاہر میں تو کسی نے بتوں کو قبلہ بنایا ہے، کسی نے ستارہ اور آفتاب کو، کسی نے آگ کے عنصر کو، کسی نے دریائے گنگا کو، کسی نے تلسی اور پیپل کے درخت کو، کسی نے کوہ سوالک کو، کسی نے اولیاء کی قبروں کو، کسی نے شہیدوں اور جنوں کے تہہ خانوں کو، اور کسی نے برحق شریعت کے مطابق کعبہ اور بیت المقدس کو۔

(اقول وباللہ التوفیق- یادرہے کہ یہاں اولیاء اللہ کے مزارات کو قبلہ قرار دے کر ان کی طرف منہ کر کے نماز ادا کرنا مراد ہے کہ قطعاً ناجائز ہے۔ جبکہ مسلمان انہیں نماز کا قبلہ نہیں مانتے بلکہ فقہاء نے صاف طور پر لکھا ہے کہ جب قبر سامنے ہو اور نمازی اور قبر کے درمیان کوئی چیز حائل نہ ہو تو مکروہ تحریمی ہے (منقول از بہار شریعت بحوالۂ درمختار و عالمگیری) قبر کی زیارت کرنا اور ہے۔ جو کہ بالکل درست ہے۔ بلکہ خود مفسر علام نے ابتدا تفسیر میں اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ کی تفسیر میں فرمایا ہے کہ آنکھوں کی عبادت کعبہ شریف اور قرآن مجید کو دیکھنا، مقربین کو دیکھنا جیسے انبیاء علیہم السلام اور اولیاء اللہ اور شہدا اور صلحاء کی قبور کی زیارت کرنا" پتہ چلا کہ مزارات کو قبلہ نماز گرداننا حرام اور ناجائز ہے۔ البتہ ان کی زیارت آنکھوں کی عبادت ہے۔ محمد محفوظ الحق غفرلہٗ)۔

پھر بیت المقدس کو منہ کرنے والوں کے درمیان بھی اختلاف ہے۔ یہودی صخرہ کا استقبال کرتے ہیں۔ اور نصاریٰ شرقی مکان کا، اور کعبہ کی طرف منہ کرنے والوں میں بھی ایک نہایت عظیم اختلاف ہے۔ وہ لوگ جو کہ عین مسجد حرام میں نماز کے لیے کھڑے ہوتے ہیں آپس میں ایسا اختلاف رکھتے ہیں کہ ایک نماز ادا کرنے والے کی جہت دوسرے نماز ادا کرنے والے کی جہت کے ساتھ ہرگز متفق اور متحد نہیں ہوتی۔ ہر شخص کعبہ کے ایک علیحدہ نقطہ کا استقبال کرتا ہے۔ اور جو مسجد حرام سے باہر واقع ہیں ان کا اختلاف اپنے شہروں اور

ملکوں کی جہات کے اختلاف کے تابع ہے۔ روم، شام اور مدینہ منورہ والے جنوب کی سمت کو متوجہ ہوتے ہیں۔ اور یمن، عدن اور جزائر والے سمت شمال کو، عراق، فارس، ہند اور سندھ والے سمت مغرب کو اور جدہ اور مغرب والے سمت مشرق کو، اور ان علاقوں کے لوگ عین ان جہات کو منہ کرنے میں دو جہتوں کے درمیان ان چار مختلف جہتوں میں سے ایک کی طرف مختلف ہے۔ پس اس زبردست اختلاف کے باوجود جو کہ ایک قبلہ کی طرف ظاہری توجہ میں رونما ہوا تو سارے جہان کا ظاہر و باطن میں اتفاق کیسے ممکن ہوگا؟ تو واجب یہ ہے کہ اس خیال سے گزر جاؤ اور جو کام مقصود بالذات ہے اسے ہاتھ سے جانے نہ دو۔

فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ پس ایک دوسرے سے اصلی نیکیوں میں سبقت حاصل کرو جو کہ بالذات نیکی ہیں۔ اور دوسری نیکیوں کا وسیلہ نہیں ہیں۔ جیسے نماز، روزہ، ذکر، تلاوت، مخلوق پر احسان، فقرا کی دل جوئی، غریبوں کے حالات کی خبر گیری، پروردگار سے محبت اور مقتضیات شہوت وغضب کو برا سمجھنا۔ نہ استقبال قبلہ کی طرح کہ اس کا اپنی ذات کی حد تک نیکی کا تصور نہیں ہے۔ بلکہ عبادات بدنی میں توجہ صحیح کرنے کے لیے قرار پایا۔ اور جیسے کپڑے اور بدن کو نماز کے لیے پاک رکھنا۔ اور جیسے آخرت کو یاد کرانے اور دل کو دنیا سے اُٹھانے کے لیے زیارت قبور۔ اور جیسے نعت خوانی اور منقبت خوانی صلحاء کی محبت حاصل کرنے کے لیے تاکہ ان کے طریقے پر چلا جائے مستحسن ہے۔ اور جیسے ذکر اور تلاوت میں شد اور مد کہ کیفیت شوق کو بڑھانے کے لیے ان کا لحاظ کیا جاتا ہے۔

اور اگر تمہیں جہات قبلہ کے اختلاف میں اس بات کا اندیشہ ہے کہ جب سب لوگوں کا ایک جہت پر اتفاق نہیں ہوگا تو تعین قبلہ کی غرض یعنی تمام مخلوق کی عبادات کے انوار کا باہم منعکس ہونا حاصل نہ ہوگا۔ پس اس وجہ سے بھی اندیشہ مت کرو کیونکہ اصلی غرض بارگاہ خداوندی میں عبادت کی قبولیت ہے۔ اور حشر ونشر کے دن رب العالمین کے حضور سرخ رو ہونا ہے کہ اس دن تمام عابد اور ان کی عبادات پیش ہوں گی اور اس پیشی میں عبادتوں کی جہتوں کا اختلاف خلل نہیں ڈالتا۔ اس لیے کہ

أَيْنَمَا تَكُونُوا جہاں بھی تم ہو گے مشرق میں یا مغرب میں، عبادت میں یا باطل

کاموں میں، اسلام میں یا کفر میں اور طاعت میں یا معصیت میں یَأْتِ بِكُمُ اللّٰهُ جَمِيعًا تمہیں سب کو اللہ تعالیٰ محشر میں ایک جگہ لے آئے گا۔ اور اس وقت تمام عابدوں کی عبادات کے انوار باہم منعکس ہوں گے۔ اور ناقص کامل کے ساتھ مل کر مرتبہ پائے گا۔ اور یہی ہے شفاعت کا معنی، اور اسی طرح کفر و بطالت کا اثر پیشواؤں اور پیچھے چلنے والوں کے جمع ہونے کی وجہ کئی گنا بڑھ جائے گا۔ اور ہر کسی کو مقابر و مدافن اور منازل و مساکن کے مختلف ہونے کے باوجود ایک جگہ جمع کرنا اللہ تعالیٰ کی قدرت کے سامنے آسان کام ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ بیشک اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔ وہ ایسا کر سکتا ہے کہ مختلف جہتوں کی عبادتوں کو جو کہ اس کے امر سے واقع ہوئی ہیں ایک عبادت کا حکم دے کر سب کے آثار کو ایک فرد میں جمع فرمائے اور عظیم ترقی عطا فرمائے۔

چند ابحاث

یہاں چند بحثیں باقی رہ گئیں۔ پہلی بحث یہ ہے کہ وجہۃ کی تعلیل کیوں نہیں کرتے اور عِدۃ اور هِبۃ کی طرح اسے محذوف الفاء کیوں نہیں کرتے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اصل میں تعلیل، فعل اور اس کے تابع کا حق ہے۔ جیسے مصدر اور دوسرے مشتقات۔ جب وجہۃ کو مصدر اعتبار کریں تو تعلیل کرتے ہیں۔ اور جہۃ کہتے ہیں۔ اور جب اسے اسم اعتبار کریں اس جہت کے لیے جو کہ چہرے کے سامنے ہے تو تعلیل نہیں کرتے، اور اسی لیے ولدۃ میں جو کہ ولید کی جمع ہے واؤ کو ہا کے ساتھ باقی چھوڑا گیا ہے۔ اور اسے حذف نہیں کیا۔

اوقات نماز میں تعجیل اور تاخیر کا بیان

دوسری بحث یہ ہے کہ لفظ فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ سے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے استنباط فرمایا ہے کہ نماز کو اول وقت میں گزارنا افضل ہے۔ تاکہ استباق کا معنی ثابت ہو جائے۔ اور دوسرے لوگوں سے پہلے ادا کرے۔ اور اس استنباط کی نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حدیث صحیح مؤید ہے کہ آپ نے فرمایا کہ اے علی تین چیزوں میں تاخیر مت کرو، نماز جب اس کا وقت ہو جائے، جنازہ جب حاضر ہو جائے۔ اور دوشیزہ جب اس کا کفو یعنی اس

کے مناسب شوہر مل جائے۔ لیکن نماز ظہر کو موسم گرما کی شدت میں موخر کرنا مستحب ہے۔ اور اسی طرح تہائی رات تک نماز عشاء کی تاخیر۔ اس باب کی صحیح احادیث کی دلیل سے مستحب ہے۔ اور امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اول وقت سے نماز کی تاخیر بہتر ہے۔ کیونکہ کثرت جماعت کا موجب ہوتی ہے۔ اور انتظار کا ثواب بھی حاصل ہوتا ہے۔ مگر نماز مغرب کو جلدی ادا کرنا بہر حال بہتر ہے۔ اور نماز ظہر کی بھی موسم گرما کے سوا جلدی ادائیگی بہتر ہے۔ البتہ اتنی بات پر تو اُمت کا اجماع ہے کہ یقین کے ساتھ وقت داخل ہونے کے بعد نماز کی تیاری میں سستی یا دوسرے امور میں مشغول ہونا ممنوع ہے۔ اور استباق خیرات ظاہرا اسی قدر پر دلالت کرتا ہے۔ وہ شخص جو جماعت کی انتظار میں بیٹھا ہے نماز پڑھنے والے کے حکم میں ہے۔ اور فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ کے حکم کی تعمیل میں معروف ہے۔

ہر ہر عبادت کرنے والوں کے قبلہ کا بیان

تیسری بحث یہ ہے کہ مفسرین نے وَلِكُلٍّ وِجْهَةٌ کو برحق قبلوں پر جو کہ بارگاہ خداوندی کے پسندیدہ ہیں محمول فرمایا ہے۔ کہتے ہیں کہ مقربین کا قبلہ عرش، روحانیوں کا قبلہ کرسی، کروبین کا قبلہ بیت المعمور۔ دعا کا قبلہ آسمان۔ زمینی فرشتوں کا قبلہ جسم آدم علیہ السلام، انبیائے بنی اسرائیل علیہم السلام کا قبلہ بیت المقدس۔ حضرت آدم، حضرت ابراہیم اور حضرت محمد رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا قبلہ کعبہ معظمہ اور ارواح کا قبلہ سدرۃ المنتہیٰ ہے۔ لیکن اس صورت میں فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ کے الفاظ موزوں نہیں ہوتے مگر اس توجیہہ کے ساتھ کہ مقصد نیکی حاصل کرنا ہونا چاہیے۔ طریقوں کی خصوصیات کی گہرائی میں اُترنا نہیں چاہیے۔ اس لیے کہ تمام عبادت گزاروں کا خصوصیات طرق میں اتفاق ممکن ہے نہ مطلوب۔ اتنا چاہیے کہ عبادت کا طریقہ معبود کو پسند اور اس کی رضا کے مطابق ہو اور وحی صریح کے ذریعے اس طریقے کے ساتھ رضائے خداوندی کا تعلق معلوم ہو گیا ہو۔

اور یہی وجہ ہے کہ ایک طریق عبادت اور اس کی ایک طرز جس طرح ہم نے عبادت گزاروں کے تمام افراد میں طلب نہیں فرمائی ہے۔ اسی طرح ہر ہر فرد کے حق میں تمام اوقات میں اس کی رعایت واجب نہیں فرمائی۔ پس آپ کو چاہیے کہ ہر شہر میں اس شہر کے

قبلہ کی سمت توجہ کا رُخ کریں۔ اور اپنے شہر یا اپنے ملک کی سمت پر اصرار نہ کریں۔ اور نہ کہیں کہ میرا قبلہ اس سمت تھا میں اس سے نہیں پھرتا۔

وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ اور جس شہر سے کہ آپ سفر کے لیے باہر آئیں تو راستہ میں اس شہر کی سمت قبلہ کا التزام نہ کریں بلکہ تعین جہت کے بغیر نفس قبلہ کا لحاظ فرمائیں۔

فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ پس اپنے چہرے کو مسجد حرام کی طرف پھیر لیں۔ جو کہ دور والوں کے بارے میں کعبہ کی مانند ہے۔ اور اس مسجد کا استقبال جو کہ کعبہ معظمہ کے اردگرد ہے دور والوں کے لیے استقبال کعبہ کو لازم کرتی ہے۔ جو کہ قبلۂ حقیقی ہے۔ البتہ اگر ایک آدمی مسجد حرام کے متصل واقع ہوا۔ اور اس کی نظر میں مسجد حرام کی اطراف کعبہ کی محاذات اور غیر محاذات میں جدا جدا ظاہر ہوں تو اس کے لیے مسجد حرام کی جانب استقبال کافی نہیں بلکہ اس جانب کا استقبال ضروری ہے۔ جو کہ کعبہ کے بالکل سامنے ہو تاکہ اپنی حقیقی قبلہ سے منحرف نہ ہونے پائے۔

وَاِنَّهٗ اور تحقیق کعبہ کا یہ استقبال کسی سمت اور جہت کے تعین کے بغیر لَلْحَقُّ البتہ ثابت ہے۔ بغیر تبدیلی اور تغیر کے، اور اسی قدر نازل ہے مِنْ رَّبِّكَ تیرے پروردگار سے، لیکن سمتوں اور جہتوں کو خاص کرنا جناب خداوندی کو منظور نہیں بلکہ سفر و حضر اور ایک ملک سے دوسرے ملک اور ایک ریاست سے دوسری ریاست کی طرف بدلنے اور منتقل ہونے کے حالات کے اختلاف کی طرف سپرد ہے۔

وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ اور خدا تعالیٰ اس سے غافل نہیں ہے جو کچھ تم عمل کرتے ہو۔ جس سمت کہ تم کعبہ کا استقبال کرتے ہو تمہاری نماز اللہ تعالیٰ کے ہاں صحیح ہے۔ اور اس کے دربار اس پر ثواب کا وعدہ ہو چکا ہے۔ اور احتمال ہے کہ یہ جملہ ڈرانے اور جھڑکنے کے لیے ہو یعنی خدا تعالیٰ اس سے بے خبر نہیں ہے جو تم آئندہ زمانے میں عمل کرو گے۔ اور بدعت کے طریقے سے کعبہ کی جہات میں سے ایک ایک جہت کو تقسیم کر لو گے۔ اور اپنی اختیار کردہ جہت کی ترجیح اور تفضیل میں ہر شخص کوئی بات کرے گا مثلاً حنفیہ جنوب کی جہت کو اختیار کریں گے۔ اور ان کا امام کعبہ کی شمالی جانب کھڑا ہوگا۔ اور فخر کے مقام میں

کہیں گے کہ ہمارا قبلہ ابراہیمی قبلہ ہے۔اس لیے کہ آپ میزاب کی طرف متوجہ ہوتے تھے۔اور شافعیہ مغرب کی جہت کو اختیار کریں گے۔اوران کا امام کعبہ کی مشرقی سمت کھڑا ہو گا۔اور مقام فخر میں کہیں گے کہ ہم کعبہ کے دروازے کا استقبال کرتے ہیں۔اور ہمارا قبلہ منصوص قبلہ ہے کہ فرمایا وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰاهِيْمَ مُصَلًّى. علیٰ ہذاالقیاس مختلف شہروں کے لوگ اپنی جہتوں کی ترجیح میں اسی قسم کی باریکیاں لائیں گے۔لیکن یہ سب شعری نکات ہیں۔اور دین والوں کے نزدیک توجہ کے لائق نہیں ہیں۔آپ کے پروردگار کی طرف سے نازل ہونے والا حکم صرف اسی قدر ہے کہ استقبال کعبہ کو لازم کرنا چاہیے۔اور سفر وحضر اور ایک شہر سے دوسرے شہر کو ہجرت کے وقت اسے چھوڑنا نہیں چاہیے۔جس طرح کہ اس سے پہلے ہجرت کے وقت جب آپ مکہ سے باہر آئے اور کعبہ کو پشت اور صخرہ کو منہ کر کے روانہ ہوئے تو آپ نے استقبال کعبہ موقوف کر دیا۔اور صخرہ کا استقبال اختیار کیا۔ اب ایسا نہ کریں

وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ اور آپ جہاں سے باہر آئیں گو مکہ شریف سے ہو اور اس وقت کعبہ کو پشت کر کے روانہ ہوں فَوَلِّ وَجْهَكَ پس آپ اپنے چہرے کو نماز کے وقت پھیر لیں اپنے مقصد کی سمت سے شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ مسجد حرام کی طرف۔جو کہ کعبہ معظمہ کے اردگرد ہے۔اور مکہ سے باہر والوں کے حق میں کعبہ کا حکم رکھتی ہے۔اور اس کا استقبال کعبہ کے استقبال کو مستلزم ہے۔اور یہ حکم صرف آپ کی ذات پاک کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ آپ اور آپ کے امتیوں کو عام ہے۔اور منسوخ ہونے والا ہرگز نہیں ہے

وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ اور تم سب جہاں بھی ہو، خواہ رسول علیہ السلام خواہ امت، خواہ حضر میں خواہ سفر میں، خواہ راہ اور صحرا میں خواہ منزل اور سرا میں، خواہ مسجد میں، خواہ گھر میں، خواہ بازار میں

فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ پس اپنے چہروں کو اپنے پیغمبر (علیہ السلام) کی پیروی میں اسی مسجد حرام کی سمت پھیر لو اور اس کی مخالفت ہرگز نہ کرو۔ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ تاکہ نہ ہو لوگوں کو۔خواہ عرب ہوں، خواہ یہودی اور خواہ نصرانی عَلَيْكُمْ حُجَّةٌ تم پر الزام کی

دستاویز، اس لیے کہ یہ سب فرقے استقبال کعبہ چھوڑنے میں چند وجوہ کے ساتھ الزام دیتے تھے۔ ان میں سے بعض کہتے تھے کہ اس پیغمبر (علیہ السلام) کا حال عجیب ہے کہ دعویٰ ملت ابراہیمی کی اتباع کا کرتا ہے۔ اور قبلۂ ابراہیم کو ترک کرتا ہے۔ اور ان میں سے بعض کہتے تھے کہ یہ شخص بہت متعصب ہے کہ قریش کی مخالفت کے لیے ابراہیم اور اسماعیل (علیہم السلام) کے قبلہ کو بھی چھوڑ دیا۔ حالانکہ خود بھی ابراہیم اور اسماعیل (علیہم اسلام) کی اولاد سے ہے۔ اور ان کی بزرگی کا معترف۔ پس استقبال کعبہ کے ساتھ طعن کی یہ وجوہ بالکل زائل ہو گئیں اور کسی شخص کو الزام رکھنے کا موقع نہ رہا۔

اِلَّا الَّذِیۡنَ ظَلَمُوۡا مِنۡهُمۡ مگر وہ لوگ جو کہ ان میں سے ظلم پیشہ ہیں۔ اور عناد اور تعصب کے طریقے سے ہر کلام اور ہر واقعہ کو اس کے محل کے غیر پر محمول کرتے ہیں۔ کہ ابھی طعن سے دست بردار نہیں ہوں گے بلکہ ان میں سے بعض کہیں گے کہ یہ استقبال کعبہ حق پرستی اور ملت ابراہیمی کی اتباع کے طریقے پر نہیں ہے۔ بلکہ اپنے شہر اور اپنی قوم کی محبت اور اپنے آباء واجداد کے آئین کے ساتھ الفت کی جہت سے ہے۔ اور ان میں سے بعض کہیں گے کہ یہ شخص اپنے کاروبار میں حیران ہے کبھی کوئی چیز اختیار کرتا ہے۔ اور کبھی کوئی چیز۔ اس استقبال کعبہ پر کہ جسے اب اختیار کیا ہے کوئی بھروسہ نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ عنقریب پھر جائے گا لیکن جب ان کے طعن کی یہ سب وجوہ محض عناد اور صریح عقل کے خلاف ہیں۔

فَلَا تَخۡشَوۡهُمۡ پس ان سے مت ڈرو اس لیے کہ ان کے ان بے اصل اقوال سے جن سے صریح تعصب اور عناد ٹپکتا ہے تمہارے دین کی صحت میں عقل مندوں کے نزدیک کوئی خلل نہیں پڑتا۔ وَاخۡشَوۡنِیۡ اور مجھ سے ڈرو۔ میرے فرمان کی مخالفت اور ان کے طعن کا پاس کر کے مجھے ناراض کرنے میں اور عار کو دفع کرنے کو میرے حکم کے بجالانے پر ترجیح دینے کی وجہ سے۔ س لیے کہ میری ناراضگی ابدی خسارے اور ہمیشہ کی ہلاکت کا موجب ہے۔ جبکہ طعن، عار اور یہ تکلیف جو ان کے ان بے ہودہ کلمات کو سننے سے تمہیں لاحق ہوتی ہے چند دن سے زیادہ نہیں ہے۔ اور جلد فنا اور زائل ہونے کے باوجود اس کے پیچھے ایک عظیم اجر وثواب ہے۔ نیز جب میری عظمت اور جلال تمہارے دلوں کو پُر کر دے تو

تمہارے دل اور نگاہ میں مخلوق کی کوئی قدر و وقعت نہیں رہتی۔ اس لیے کہ مخلوقات کا لحاظ اور ان کا پاس کرنا حضرت خالق کی تعظیم میں کوتاہی کرنے سے پیدا ہوتا ہے۔ جیسا کہ حضرت امیر المومنین مرتضیٰ علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا ہے کہ خالق کی عظمت تیری نگاہ میں مخلوق کو حقیر بنا دیتی ہے۔

ایک نہایت مشکل سوال

یہاں ایک نہایت مشکل سوال باقی رہ گیا اور اس کے جواب کا کافی حصہ دوران تفسیر گزر چکا۔ سوال یہ ہے کہ مسجد حرام کی سمت توجہ کو ان آیات متصلہ میں تین مرتبہ بیان فرمایا اس تکرار کا سبب کیا ہے؟ علماء نے اس سوال کے جواب میں چند وجوہ ذکر کی ہیں۔ پہلی وجہ یہ ہے کہ پہلی آیت میں خطاب ساکنان حرم سے ہے۔ اور دوسری آیت میں ساکنان جزیرۂ عرب سے اور تیسری آیت میں تمام ساکنان زمین سے۔ لیکن اس وجہ پر اعتراض وارد ہوتا ہے کہ قرینے کے بغیر ان تخصیصات کا چھپانا بلاغت سے بہت دور ہے۔ نیز پہلی بار خطاب جناب رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ہے۔ اور آپ اس وقت حرم کے سکونت رکھنے والوں میں سے نہ تھے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ تعدد کے اعتبار سے اس مضمون کا تکرار اس مضمون کے تین طریقوں سے صحیح ہونے پر استدلال ہے۔ اور قاعدہ ہے کہ ایک مدعا کے لیے چند دلیلیں بیان کرتے ہیں تو ہر دلیل کو اس مدعا کے ساتھ مربوط کرنے کے لیے دلیل بیان کرنے سے پہلے اس مدعا کا تکرار کرتے ہیں۔ پس پہلے مرتبہ میں مسجد حرام کی طرف توجہ کو اس دلیل سے ثابت فرمایا ہے کہ اہل کتاب اس کے برحق ہونے کو جانتے ہیں۔ اور تورات اور انجیل اس کے صحیح ہونے پر واضح گواہی دیتی ہیں۔ اور دوسرے مرتبہ میں اسی مضمون کو ایک اور دلیل سے ثابت فرمایا کہ رسول علیہ السلام پر وحی کا آنا اس حکم پر آگاہی ہے، وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا، اور تیسرے مرتبہ میں اسی مضمون کو ایک اور دلیل سے ثابت فرمایا کہ مقصد تحویل پر نظر کرتے ہیۓ جو کہ لوگوں کے الزام کو دور کرنا ہے یہ تحویل واجب کی طرح تھا۔ پس اس مضمون کا تین جگہ تکرار فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ اور وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ وغیرہ کے تکرار کی مانند ہے۔ اس قدر فرق ہے کہ ان آیات کا تکرار

دلائل بیان کرنے کے بعد نتیجہ نکالنے اور فرع بٹھانے کے مقام میں واقع ہوا جبکہ اس مضمون کا تکرار استدلال سے پہلے دعویٰ کے مقام میں ہے۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ پہلی آیت میں اس وہم کی گنجائش تھی کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ تحویل صرف رسول علیہ السلام کو راضی کرنے اور ان کی دل جوئی کرنے کے لیے واقع ہوئی ہو۔ تو دوسری آیت میں فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضٰهَا کے مضمون کو لوٹائے بغیر امر کے تکرار سے اس وہم کو زائل فرما دیا جبکہ تیسری آیت میں اس تحویل کا مقصد بیان کر کے پوری تسلی وتشفی دی گئی۔

چوتھی وجہ یہ ہے کہ پہلی آیت حالات کے عموم کے لئے، دوسری آیت مقامات کے عموم کے لیے اور تیسری آیت زمانوں کے عموم کے لیے ہے۔ تاکہ منسوخ ہونے کا شبہ بالکل نہ رہے۔

پانچویں وجہ یہ ہے کہ واقعات میں یہ پہلا واقعہ ہے۔ جس میں ہماری شریعت میں نسخ ظاہر ہوا۔ پس اس واقعہ میں تاکید مزید اور پختگی کی ضرورت پڑی اور تاکید کی مضبوط حد یہ ہے کہ تین بار ہو اور اس وجہ پر اعتراض وارد کرتے ہیں کہ جملۂ مؤکدہ میں حرف واؤ نہیں آتا۔ اس لیے کہ فصل کا مقام نہیں ہے۔ اور ان جملہ میں حرف واؤ واقع ہوا ہے۔ تو چاہیے کہ تاکید نہ ہو اور جواب میں کہتے ہیں کہ جو تاکید تکرار پر واقع ہوتی ہے۔ اگر تاکید پانے والے جملے میں حرف واؤ آیا ہو تو چاہیے کہ تاکید کرنے والے جملے میں واؤ کا تکرار کیا جائے تاکہ تاکید عطف کے ساتھ تاکید جملہ میسر آئے اور معطوف اور عاطف دونوں کی تاکید متحقق ہو۔ جیسا کہ اس جملہ کے بارے میں جاء نی زید و ذھب عمرو وذھب عمرو کہتے ہیں۔ لیکن ابھی پہلی بار واقع ہونے والے وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ میں واؤ لانے کے متعلق سخن باقی ہے۔ اور سب سے صحیح یہ ہے کہ پہلی بار کے وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ میں سابقہ مضمون کی تاکید نہیں ہے۔ اس لیے کہ سابقہ مضمون مدینہ منورہ میں اور دوسری اقامت کی جگہوں میں مسجد حرام کی سمت توجہ کرنا ہے۔ جبکہ وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ کا مضمون شہر اور وطن سے باہر نکلنے کی حالت میں اس سمت توجہ کرنا ہے۔ اور یہ دونوں مضمون ایک دوسرے

سے بالکل جدا ہیں کہ ان دونوں کے درمیان عبثیت ہے نہ لازم کرنا۔ البتہ جو وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ دوسری مرتبہ واقع ہوا ہے بلاشبہ اپنے سابق کی تاکید ہے۔ اور اس تاکید کی وجہ دوران تفسیر گزر چکی۔

نیز یہاں بعض لوگ سوال کرتے ہیں کہ معاندین کے قول کو حجت کیوں کہا گیا؟ حالانکہ بالکل بے اصل ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ حجت کو اس دلیل کے ساتھ خاص کرنا جو کہ شبہ اور مغالطہ کے مقابلہ میں سچے مقدمات سے مرکب ہو متاخر متکلمین کا عرف ہے جبکہ کلام اللہ کے عرف میں ہر دلیل کو خواہ اس کے مقدمات سچے ہوں یا جھوٹے حجت کہتے ہیں۔ جیسا کہ آیت حجتهم داحضة عند ربهم میں۔ اور لغوی معنی بھی اسی عرف کے موافق ہے۔ اس لیے کہ شبہ والا بھی قصد کرتا ہے کہ اپنے مقابل پر غلبہ پائے۔ اور اسی لیے اپنے شبہ کو درستی کے رنگ میں اشکال کی صورت' ان کی شرائط اور صغریٰ کو کبریٰ کی تالیف کی رعایت میں لاتا ہے۔ اور ان امور سے قطع نظر اس قسم کے مقامات میں تمسخر کا دروازہ کھلا ہے۔

اور جب اس تحویل کی اغراض میں سے عمدہ غرض جو کہ مخالفین کے شبہات کو دفع کرنا ہے فراغت ہوئی۔ اب دو دیگر اغراض بیان فرمائی جارہی ہیں۔ اور ارشاد ہوتا ہے کہ میں نے اس قبلہ کو پوری تاکید کے ساتھ تمہارے لیے اس لیے مقرر فرمایا تا کہ تمہارے حق میں لوگوں کے طعن کی گنجائش نہ رہے۔

وَلِأُتِمَّ نِعْمَتِي عَلَيْكُمْ اور اس لیے کہ اپنی نعمت کو تم پر پورا کروں۔ اس لیے کہ تم اپنی نماز اور عبادت میں جہات میں سے افضل واکمل کی طرف متوجہ ہو جاؤ اور کئی گنا برکات و انوار حاصل کرو۔

وَلَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ تا کہ تم حقیقت عبادت کی راہ پاؤ۔ اس لیے کہ تم اپنے جسم کی اپنے خاکی مبدء کی طرف توجہ سے اپنی روح کی مبدء حقیقی طرف توجہ تصور کرو، اور حدیث پاک میں وارد ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سنا کہ ایک شخص اپنی دعا میں کہہ رہا تھا اللهم انی اسئلك تمام النعمة، اے میرے اللہ! میں تجھ سے پوری نعمت مانگتا ہوں۔ فرمایا تو کچھ جانتا ہے تمام نعمت کیا ہے؟ تمام نعمت جنت میں داخل ہونا ہے۔ اور حضرت

امیر المومنین مرتضیٰ علی کرم اللہ وجہہ سے مروی ہے کہ تمام النعمۃ الموت علی الاسلام۔

ایک جواب طلب سوال

یہاں ایک جواب طلب سوال باقی رہ گیا اور وہ یہ ہے کہ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں پر تمام نعمت تو صرف بیت المقدس سے سمت کعبہ کو تحویل قبلہ سے واقع ہوا حالانکہ سورۂ مائدہ کی آیت جو کہ حجۃ الوداع کے عرفہ کے دن نازل ہوئی اس پر دلالت کرتی ہے کہ اتمام نعمت اس روز ہوا۔ اور وہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ہر نعمت کا اتمام جدا جدا ہے۔ مقدمۂ قبلہ میں اتمام نعمت اس وقت محقق ہوا جبکہ دین کے تمام ارکان کے مقدمے میں اتمام نعمت اس روز ہوا۔ کہا جاسکتا ہے کہ اتمام کے درجے بھی مختلف ہیں۔ پس نماز میں کمال اور فضیلت والی جہت کی طرف توجہ کرنا مقدمہ عبادت میں اتمام نعمت کی ایک قسم ہے۔ جبکہ حج ادا کرنا اور مناسک بیان کرنا اتمام کامل ہے۔ اور دونوں امور کعبہ کے ساتھ متعلق ہیں۔ لیکن اتمام نعمت کے مرتبوں میں سے پہلا مرتبہ اس کی طرف توجہ تھی۔ جبکہ اتمام نعمت کے مرتبوں میں سے آخری مرتبہ اس کے طواف، زیارت اور مناسک کی ادائیگی کو پہنچنا ہے۔

اور انتہاء میں تم پر یہ اتمام نعمت اور ہدایت کاملہ کَمَا اس اتمام نعمت اور اس ہدایت کی مانند ہے۔ جو کہ ہم نے ابتدا میں تمہیں عطا فرمائی۔ پس ابتدا و انتہا میں ہماری نعمتیں ہی تمہیں شامل ہیں۔ اور ہماری ہدایت سے ہی تم ہدایت یافتہ ہو۔

اَرْسَلْنَا فِیْکُمْ رَسُوْلًا ہم نے اپنے مقام عظمت سے تمہارے درمیان ایک رسول (علیہ السلام) بھیجا کہ تمہارے ہادی و مرشد ہوں اور یہ ابتدا میں ہماری ہدایت ہے۔ پھر ہم نے اس رسول (علیہ السلام) کو کیا مِنْکُمْ تم میں سے کہ عربی نژاد اور قریشی نسب ہیں۔ اور یہ ابتدا میں ہمارا اتمام نعمت ہے۔ اس لیے کہ کسی قوم کی طرف رسول علیہ السلام کو بھیجنا ایک عظیم نعمت ہے۔ اور اس نعمت کو پورا کرنا یہ ہے کہ وہ رسول (علیہ السلام) بھی اسی قوم سے ہوتا کہ اس ساری قوم کو اس کے وجود سے بزرگی اور فخر حاصل ہو۔ اور قیامِ قیامت تک وہ بزرگی اور فخر باقی اور جاری رہے۔ اور کیا ہی اچھا کہا گیا بیت، گنند خویش وتبار تو نازمی زیبد، بحسن دلکش

تو گر قبیلہ ناز کند، یعنی تیرے خویش واقارب ناز کرتے ہیں۔ اور اگر تیرے دلکش حسن پر قبلہ ناز کرے تو زیبا ہے۔ نیز عرب کے حال سے مشہور یہ ہے کہ اپنے غیر کی اطاعت سے بہت غیرت اور عار کرتے ہیں۔ پس ہم نے اس رسول (علیہ السلام) کو عرب کے بہترین قبائل سے گردانا۔ تاکہ کسی کو ان کی اتباع واطاعت سے کسی قسم کی عار نہ ہو۔ پھر وہ رسول علیہ السلام صرف ہمارے زبانی پیغامات پہنچانے پر ہی اکتفاء نہیں کرتے۔ بلکہ

یَتْلُوْا عَلَیْکُمْ اٰیٰتِنَا تم پر ہماری آیات تلاوت فرماتے ہیں۔ ہمارے اس معجزانہ کلام کی تمہاری لغت میں۔ تاکہ تمہارے نزدیک ان کی زبان سے بھی ان کی رسالت کی سند اور دستاویز ثابت ہو جائے۔ اور تم بلا تکلف ذات وصفات وافعال اور ہمارے احکام کے اسرار کی معرفت پالو۔ اور ہماری پسند کو ناپسند سے پہچان لو۔ اور رسول علیہ السلام کے اس جہان سے تشریف لے جانے یا دربارِ رسالت سے تمہارے دور ہونے کی وجہ سے تمہاری ہدایت کا سبب ناقص نہ ہو جائے۔ نیز ان آیات کو تم نمازوں اور ذکر وعبادت کے دوسرے اوقات میں تلاوت کرو اور بے حد ثواب پاؤ، اور ان آیات سے تمام علوم کا استفادہ کرو، اور تمہیں دنیا وآخرت کی خیر ہر حال میں حاصل رہے۔

پھر وہ رسول علیہ السلام ہمارے پیغامات پہنچانے اور ہماری آیات کی تلاوت کرنے پر ہی اکتفاء نہیں فرماتے۔ اور تمہیں تمہاری روش اور اختیار پر ہی نہیں چھوڑتے کہ جو چاہو ان آیات سے سمجھ لو۔ اور اگر چاہو تو ان آیات کے مطابق عمل کرو اور اگر چاہو تو عمل ترک کر دو۔ بلکہ تمہارے نفسوں کی اصلاح میں کوشش فرماتے ہیں۔

وَیُزَکِّیْکُمْ اور تمہارے عقائد، اعمال اور اخلاق کو اس کتاب کے احکام کے مطابق پاک فرماتے ہیں تاکہ تمہیں کامل تہذیب حاصل ہو۔ اور وہ رسول علیہ السلام جب اس جہان سے چلے جائیں تو دوسروں کی تکمیل میں تم ان کی نیابت کرو، اور اسی لیے وَیُعَلِّمُکُمُ الْکِتٰبَ اور کتاب کے ظاہری معنی سکھاتے ہیں وَالْحِکْمَۃَ اور اس کتاب کے اسرار اور وقائق جو کہ اس کے ہر ہر حکم میں مخفی اور چھپے ہوئے ہیں۔ تاکہ تم صرف علم ظاہر پر اکتفاء کر کے صرف سطحیت تک نہ رہ جاؤ۔ اور صرف علم باطن پر اکتفاء کر کے بے لگام اور ہر شے کو جائز

قرار دینے والے نہ بن جاؤ۔ بلکہ دونوں کے جامع ہو کر نبوت کی وراثت حاصل کرو۔ اور تکمیل کا رُتبہ پاؤ۔ اور اگر چہ یہ دونوں علم یعنی کتاب کے ظاہر کا علم اور اس کے باطن کا علم کتاب کے نزول کے بعد معروف لغت کے مطابق ممکن تھا کہ تمہارے بعض ذہین لوگ ارشادِ رسول علیہ السلام سے مدد لیے بغیر خود بخود حاصل کر سکتے لیکن ابھی کئی چیزیں باقی تھیں کہ جنہیں فکری اور ذہنی قوت کے ساتھ ہرگز دریافت نہیں کیا جا سکتا تھا۔ تو اس سعی و کوشش کو انتہا تک پہنچایا جائے۔ اور اسی لیے یہ رسول علیہ السلام تمہارے حق میں عظیم نعمت ہوئے جو کہ تمہیں ان چیزوں کی نشاندہی فرماتے ہیں۔

وَيُعَلِّمُكُمْ مَّالَمْ تَكُونُوا تَعْلَمُونَ اور تمہیں وہ چیزیں سکھاتے ہیں جنہیں تم اپنی فہم و فراست کے زور سے نہیں جان سکتے ہو۔ جیسے رکعات کی تعداد، نماز کے اوقات کو معین کرنا، وضو توڑنے والی چیزیں، تفصیل اور حد کے ساتھ غسل کے اسباب، زکوٰۃ کی مقدار اور دیت کی مقدار مقرر کرنا، گزشتہ امتوں کے صلحاء اور اشقیاء کے واقعات ان کے علاوہ جو کہ کتاب میں ہیں۔ حشر و نشر۔ وزن اعمال۔ پل صراط سے گزرنا۔ منازل جنت۔ طبقات دوزخ۔ ہر عمل کی مقدار کے مطابق ثواب اور عذاب کی خصوصیات۔ اور ذات پاک الٰہی کی بعض صفات جیسے ہنسنا وغیرہ جو کہ کتابوں میں نہیں ہیں۔ اور جب تم نے جان لیا کہ تم اس قدر میرے احسان کے گروی اور انعام سے معمور ہو۔

یادِ الٰہی کے مختلف شعبے

فَاذْكُرُونِي تو مجھے یاد کرو جس رنگ میں ممکن ہو، زبان کے ساتھ، جیسے میرے کلام کی تلاوت، اور ذکر کے حلقوں میرے نام کی یاد، تسبیح، تکبیر، تہلیل اور ہر اچھے کام پر بسم اللہ پڑھنا، اور دل کے ساتھ کہ کمال توجہ اور استغراق کے ساتھ بے کیف حاضری کہ اہل سلوک اور اشغال کا حصہ ہے۔ یا توحید، معارف ذات و صفات و افعال کے دلائل میں اور اپنے بندوں کے ساتھ میرے معاملات کے اسرار اور اپنی مخلوق میں میری مخفی حکمتوں میں غور کے ساتھ کہ میں نے ہر ذرہ میں اپنی معرفت کی راہ کھولی ہے۔ اور اپنی صفات میں سے کسی صفت پر کوئی دلیل رکھتی ہے۔ جو کہ علمائے راسخین کا حصہ ہے۔ یا میرے انعام کے وعدے

اور سزا کی وعید میں غور کرنے اور میرے ساتھ دل میں خوف و طمع کی کوئی کیفیت پیدا کرنے کے ساتھ ذکر کرو جو کہ عام پرہیز گاروں کا حصہ ہے۔

ہر عضو کی معصیت اور اس سے ممانعت

اور اعضاء کے ساتھ ذکر دو طریقوں سے ہے۔ پہلا طریقہ یہ کہ ہر عضو کو میرے ان ممنوع چیزوں سے جو کہ اس عضو کے متعلق ہیں مجھے یاد کر کے مجھ سے ڈر کر باز رکھو۔ جیسے اجنبی عورت اور خوبرو بے ریش لڑکے پر نظر ڈالنا جو کہ آنکھ سے متعلق ہے۔ اور غیبت، چغلی، گالی گلوچ اور جھوٹے افسانے بیان کرنا جو کہ زبان سے متعلق ہے۔ اور بلا وجہ مار پیٹ اور قتل جو کہ ہاتھ سے متعلق ہے۔ اور گانے بجانے والوں کو ساز لہو و لعب کی باتیں اور جھوٹے افسانے سننا جو کہ کان سے متعلق ہیں۔ اور شراب خانہ' فاحشہ عورتوں کے چکلے' اور حکام کے پاس جاسوسی کے لیے جانا جو کہ پاؤں سے متعلق ہے۔ اور بدکاری، لواطت اور سحاق جو کہ شرم گاہ کے ساتھ متعلق ہے۔ اور حرام کھانا جو کہ لبوں، دانتوں، گلے اور معدہ کے ساتھ متعلق ہے علیٰ ہذا القیاس۔

دوسرا طریقہ یہ ہے کہ ہر عضو کو اس کام میں جس وقت کہ میں نے اس کام کا حکم دیا ہے مجھے یاد کر کے اور میرا فرمان بجالانے کا قصد کر کے مصروف کر دو کہ ان تمام صورتوں میں میں تمہیں یاد آتا ہوں۔ اور تمہارا ذہن میری طرف متوجہ ہوتا ہے۔ اور اگرچہ میرا ذکر تمہاری اسی عقل اور ذہن کی توجہ کا نام ہے۔ جو کہ مجھ سے متعلق ہوتی ہے۔ لیکن اس التفات اور توجہ کے اسباب سب کے سب ذکر کا حکم رکھتے ہیں۔ اس لیے کہ اس تک پہنچاتے ہیں۔ اور جب تم ایسا کرو گے اذکر کم میں بھی تمہیں یاد فرماتا ہوں۔ اور میرا یاد کرنا یہ ہے کہ میں تمہارے حال پر ایک جدید توجہ اور ایک تازہ عنایت مصروف کروں کہ اس توجہ اور عنایت کی وجہ سے تمہاری دنیا و آخرت کے کام درست ہوں۔ اور تمہارے گناہ گر جائیں۔ اور تمہارے درجات قرب بلند ہو جائیں۔ اور تمہارے ثواب کا اندازہ اور استحقاق بڑھ جائے۔ اور اگرچہ تمہارا مجھے یاد کرنا تمہارے اوقات کو یوں محیط ہو تو میری نعمتوں کے شکر کی ایک نوع کی ادائیگی کا موجب ہوتا ہے۔ لیکن تمہیں چاہئے کہ اس ذکر میں میری نعمتوں کے

شکر کا ارادہ کرو اور شکر کی نیت سے بجالاؤ۔ واشکروالی اور میری نعمتوں کا شکر ادا کرو۔ اس لئے کہ جب اس قسم کا ذکر شکر کی نیت سے خالی ہو گرچہ دوسری ترقیوں کا موجب ہوتا ہے۔ لیکن استحقاق نعمت میں زیادتی کا موجب نہیں ہوتا۔ اور جب شکر کی نیت کے ساتھ ہو تو نعمتوں کے فیضان میں زیادتی کا موجب ہوتا ہے۔ اور مجھے اس طرح یاد کر کے شکر ادا کرنے کے باوجود اسے دوسرے افعال کے ساتھ مت ملاؤ جو کہ میری نعمتوں کی ناشکری کی دلیل ہوں۔

وَلَا تَكْفُرُوْنِ اور میری ناشکری نہ کرو۔ اس لیے کہ اگر ایک جہت سے شکر ادا کرو گے تو دوسری جہت سے کفران نعمت کا ارتکاب کرو گے۔ اس شخص کی طرح جو کہ زبان اور دل سے بہت ذکر کرتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کے نام پر مال خرچ کرنے سے بخل کرتا ہے۔ یا کسی بے گناہ کی کسی سردار یا بادشاہ کے دربار میں سفارش کے لیے زبان کو حرکت دینے میں کمی کرتا ہے تو تمہارا وہ شکر خالص شکر نہیں رہے گا۔ کہ تم اس کی وجہ سے میرے شکر سے عہدہ برآ ہو جاؤ اور تمہارا ذمہ پاک ہو جائے۔ اور میری نعمتوں کے مزید استحقاق کا موجب ہو جائے۔

چند بحثیں

یہاں چند بحثیں باقی رہ گئیں۔ پہلی بحث یہ ہے کہ اس آیت میں وَيُزَكِّيْكُمْ کے لفظ کو يُعَلِّمُكُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ سے پہلے ذکر کیا گیا ہے۔ حالانکہ اس آیت کے ساتھ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا کی قبولیت کو بیان فرمایا گیا ہے۔ جو کہ آپ نے اپنی مسلمان اولاد کے لیے مانگی تھی۔ اور آپ کی دعا میں وَيُزَكِّيْهِمْ' وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ کے بعد واقع ہوا تھا۔ قبولیت کو چاہیے کہ دعا کے مطابق ہو۔ اس کا جواب یہ ہے کہ قبولیت اصل مطلب کے حصول میں دعا کے مطابق ہوتی ہے۔ لیکن اس مطلب کے ذکر اور متعدد مطالب کی ترتیب ذکری میں قبولیت کی دعا کے ساتھ موافقت لازم نہیں۔ ترتیب ذکری میں حالات کے تقاضے کی رعایت کی جانی چاہیے کہ یہی بلاغت ہے۔ اور وہاں مقتضائے حال وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ کو پہلے لانا تھا۔ اور یہاں اس کے برعکس۔
اس مجمل کی تفصیل یہ ہے کہ بلاشبہ کتاب و حکمت کی تعلیم حصول تزکیہ کے لیے ہے

ورنہ خالی کتاب وحکمت کا علم مقصود بالذات نہیں ہوتا۔ پس تزکیہ مقصود بالذات ہے۔ اور کتاب وحکمت کی تعلیم اس کا وسیلہ، اور دعا کے طلب کے وقت پہلے مبادی اور وسائل کو طلب کرنا چاہیے۔ اس کے بعد مقاصد واغراض کو۔ اس لیے کہ طلب فعلی کی شان یہی ہے۔ اور طلب قولی اس کے مطابق چاہیے جبکہ قبولیت دعا کے بیان کے وقت جو کہ احسان جتلانے اور انعام گننے کا مقام ہے پہلے مقصود بالذات کو مقدم کرنا چاہیے کہ طلب کرنے والے کی نظر اسی طرف متوجہ ہے۔ اور وہ اسی کو عظیم نعمت اور اپنا اصلی مقصد شمار کرتا ہے۔ اور تفسیر کے بیان میں اس اسلوب کو بدلنے کے لیے ایک اور وجہ گزری ہے مگر گہرے غور وفکر پر موقوف ہے۔ اسے سمجھنا چاہیے۔

دوسری بحث یہ ہے کہ لَاتَكْفُرُوْنَ کا جملہ جو کہ کفران سے نہی ہے جملہ وَاشْكُرُوْالِىْ کی تاکید ہے۔ جو کہ شکر کا امر ہے یا اس کا بیان ہے پس اس جملہ کا اس جملے پر عطف نہیں کرنا چاہیے تھا کہ عطف مغایرت پر دلالت کرتا ہے۔ حرف عطف لانے میں نکتہ کیا ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ حرف عطف لانے میں نکتہ یہ ہے کہ شکر کا امر اور کفران سے نہی دونوں مقصود بالذات معلوم ہوں۔ اگر حرف عطف نہ ہوتا تو یہی معلوم ہوتا کہ ان میں سے ایک مقصود بالذات ہے۔ اس لیے کہ وَلَاتَكْفُرُوْنَ کو تاکید پر محمول کرتے، اور جملہ وَاشْكُرُوْالِىْ مقصود بالذات ہو جاتا اور اگر اس کا بدل یا بیان قرار دیتے تو دوسرا جملہ مقصود بالذات ہو جاتا۔ جیسا کہ اقول له ارحل ولاتقيمن عندنا میں کہا گیا ہے۔

تیسری بحث یہ ہے کہ اس آیت میں بندوں کے یاد کرنے کا مطلقاً نتیجہ اپنا یاد کرنا قرار دیا ہے۔ حالانکہ بعض اوقات بندے ذکر الٰہی بے ادبی اور بے تعظیمی سے ملا کر یا غفلت اور عین معصیت میں کرتے ہیں۔ اور یقین ہے کہ وہ ذکر رب العزت کے عنایت تازہ کے ساتھ یاد فرمانے کے نتیجے کو نہیں پہنچتا۔ اس بحث کے جواب میں دو طریقے ہیں۔ پہلا طریقہ یہ ہے کہ ابن عساکر اور دیلمی نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت فرمائی کہ حضور علیہ السلام نے اس آیت کی تفسیر میں ارشاد فرمایا کہ تم مجھے میری اطاعت کے ساتھ یاد

کرو میں تمہیں اپنی بخشش کے ساتھ یاد کروں گا۔ تو جس نے مطیع ہو کر میرا ذکر کیا تو مجھ پر حق ہے کہ اسے اپنی مغفرت کے ساتھ یاد کروں۔ اور جس نے مجھے میرا نافرمان ہو کر یاد کیا تو مجھ پر حق ہے کہ میں اسے غضب کے ساتھ یاد کروں۔ اور عبد بن حمید، ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اس آیت کی تفسیر میں لائے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ذکری لکم من ذکر کم لی یعنی اپنے حق میں میرے ذکر کو میرے حق میں اپنے ذکر پر قیاس کرو، اگر تم مجھے اچھی وجہ سے یاد کرتے ہو میں بھی تمہیں اچھی وجہ سے یاد فرماتا ہوں۔ اور اگر بدی کی حالت میں یاد کرتے ہو تو میں بھی تمہیں اسی کے مطابق یاد فرماتا ہوں۔

اور ابن جریر نے سدی سے روایت کی کہ بندوں میں سے کوئی شخص یاد خدا نہیں کرتا مگر یہ کہ خدا تعالیٰ بھی اسے یاد فرماتا ہے۔ اور اگر آدمی ایمان والا ہے تو اسے مغفرت و رحمت کے ساتھ یاد فرماتا ہے۔ اور اگر کافر ہے تو اسے عذاب اور لعنت کے ساتھ یاد فرماتا ہے۔

اور امام احمد کتاب الزہد میں اور بیہقی شعب الایمان میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے لائے ہیں کہ حق تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام پر وحی فرمائی کہ ظالموں کو کہہ دیں کہ مجھے یاد نہ کریں۔ اس لیے کہ اگر مجھے یاد کریں گے تو میں بھی انہیں یاد کروں گا اور میرا انہیں یاد کرنا یہی ہے کہ میں انہیں لعنت کروں۔

عبد بن حمید اور ابن ابی حاتم نے عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے کہ آپ سے کسی نے پوچھا بتائیں کہ قاتل ناحق، شراب خور، چور اور زانی، اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتے ہیں۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا فاذکرونی اذکرکم یعنی کیا انہیں بھی اللہ تعالیٰ یاد کرتا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے جواب میں فرمایا کہ جب ان میں سے کوئی اللہ تعالیٰ کا ذکر کرے تو اللہ تعالیٰ اسے اپنی طرف سے لعنت کے ساتھ یاد فرماتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ چپ ہو جائے۔

دوسرا طریقہ یہ ہے کہ دونوں جگہوں پر ذکر کو قرینۂ مقام کے ساتھ اس طرح خاص کرنا چاہیے کہ رضائے الٰہی اور اس کی بارگاہ میں مرتبہ کے استحقاق کا موجب ہو جائے۔ اسی لیے پرانے مفسرین اس ذکر کے متعلقات کے تعین میں رنگارنگ گفتگو کر گئے ہیں۔ جیسے مجھے

میری اطاعت کے ساتھ یاد کرو میں تمہیں اپنی رحمت اور مغفرت کے ساتھ یاد کروں گا، تم مجھے مجاہدہ کے ساتھ یاد کرو میں تمہیں مشاہدہ کے ساتھ یاد کروں گا، تم مجھے دعا کے ساتھ یاد کرو میں تمہیں قبولیت کے ساتھ یاد کروں گا، تم مجھے عاجزی کے ساتھ یاد کرو میں تمہیں فضل وکرم سے یاد کروں گا، تم مجھے لوگوں کے ہجوم میں یاد کرو میں تمہیں ملائکہ کے ہجوم میں یاد کروں گا۔ تم مجھے خوشحالی کے وقت یاد کرو میں تمہیں تکلیف کے وقت یاد کروں گا۔ تم مجھے راحت میں یاد کرو میں تمہیں تمہارے رنج کے وقت یاد کروں گا، تم مجھے آسانی کے وقت یاد کرو میں تمہیں تنگی کے وقت یاد کروں گا۔ تم مجھے زندگی میں یاد کرو میں تمہیں تمہاری موت کے بعد یاد کروں گا۔ تم مجھے دنیا میں یاد کرو میں تمہیں آخرت میں یاد کروں گا۔ تم مجھے عبودیت کے ساتھ یاد کرو میں تمہیں ربوبیت کے ساتھ یاد کروں گا۔ تم مجھے صدق واخلاص سے یاد کرو میں تمہیں مزید خصوصی رحمتوں سے یاد کروں گا۔ اور ان عبادات میں سے بعض میں ضرورت کے وقت اللہ تعالیٰ کے یاد کرنے کا اشارہ ہے۔ جو کہ مہمات کی اصلاح کے لیے خاص عنایت اور خصوصی توجہ سے عبارت ہے۔ واللہ اعلم

ذکر الٰہی شکر کے قائم مقام ہے

چوتھی بحث یہ ہے کہ احسان کرنے اور احسان شمار کرنے کے مقام میں ذکر کا حکم دینے سے معلوم ہوتا ہے کہ صرف ذکر الٰہی بھی شکر کا کام کرتا ہے۔ اور شکر کے قائم مقام ہوتا ہے۔ اور یہ مسئلہ احادیث صحیحہ کی رو سے ثابت ہے۔ طبرانی نے اوسط اور ابونعیم نے حلیہ میں روایت کی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اے ابن آدم جب تک تو نے میرا ذکر کیا میرا شکر ادا کیا۔ اور جب تو نے مجھے بھلا دیا تو میری ناشکری کی۔ اور بیہقی نے شعب الایمان میں زید بن اسلم رضی اللہ عنہ سے روایت کی کہ ایک دن حضرت موسیٰ علیٰ نبینا وعلیہ السلام نے بارگاہ خداوندی میں عرض کی بار خدایا! مجھے بتایا جائے کہ میں تیرے شکر سے کس طرح عہدہ برا ہو سکتا ہوں۔ اس لیے کہ مجھ پر تیری نعمتیں ہر لمحہ شمار سے باہر ہیں۔ جبکہ میری عبارت قاصر۔ حق تعالیٰ نے فرمایا میرا ذکر کرو بھلاؤ نہیں تو جب تو نے میرا ذکر کیا میرا شکر کیا اور جب مجھے بھلا دیا تو یہ میری ناشکری ہے۔

ذکر-شکر-دعا اور استغفار کے ثمرات

اور بیہقی نے شعب الایمان میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کی کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ جس نے چار چیزیں پائیں اس نے دیگر چار چیزیں بھی پالیں، اور اس کی تفسیر اللہ تعالیٰ کی کتاب میں ہے، جس نے ذکر الٰہی کی توفیق پائی اسے بلاشبہ حق تعالیٰ یاد فرماتا ہے اس لیے کہ قرآن پاک میں ہے: فاذکرونی اذکرکم، اور جس نے دعا کی توفیق پائی قبولیت بھی پالی اس لیے کہ قرآن مجید میں ہے اُدْعُوْنِیْ اَسْتَجِبْ لَكُمْ، (المؤمن آیت ۶۰) اور جس نے توفیق شکر پائی اس نے نعمت کی زیادتی بھی پائی اس لیے کہ قرآن پاک میں ہے لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ (ابراہیم آیت ۷)، اور جس نے استغفار کی توفیق پائی مغفرت بھی پائی اس لیے کہ قرآن پاک میں ہے اِسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ اِنَّهٗ كَانَ غَفَّارًا۔ (نوح آیت ۱۰)

نیز اسی کتاب میں خالد بن ابی عمران رضی اللہ عنہ کی روایت سے ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کے حکم کی اطاعت کرے خدا تعالیٰ کا ذکر کرنے والا ہے۔ اگرچہ نماز، روزہ (نفلی) اور تلاوت قرآن پاک کم کرے، اور جو خدا تعالیٰ کی نافرمانی کرے خدا تعالیٰ کو بھولنے والا ہے۔ اگرچہ نماز، روزہ اور تلاوت قرآن زیادہ کرے، اور اس حدیث پاک میں اس بات کا اشارہ ہے کہ گناہوں سے بچنا اور حدود الٰہی کی رعایت کرنا خدا تعالیٰ کو یاد رکھنے میں عمدہ امور ہیں۔

اور صحیحین میں وارد ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اے ابن آدم! اگر تو مجھے اپنے دل میں یاد کرے میں بھی تجھے دل میں یاد کرتا ہوں۔ اور اگر تو مجھے حلقے اور اجتماع میں یاد کرے میں بھی تجھے کروبین، ملائکہ مقربین اور ارواح انبیاء علیہم السلام کے حلقے اور اجتماع میں یاد کرتا ہوں۔ اور یہ حلقہ اور اجتماع تیرے حلقے اور اجتماع سے بہتر ہے۔ اور اگر تو ایک بالشت بھر میرے قریب ہو تو میں گز بھر قریب ہوتا ہوں۔ اور تو میری طرف قدم قدم آئے تو میں تیری طرف دوڑ کر آتا ہوں۔

ذکر الٰہی کی فضیلت

اور سنن ابن ماجہ اور دوسری معتبر کتابوں میں وارد ہے کہ حق تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں اپنے بندے کے ساتھ ہوتا ہوں جب وہ مجھے یاد کرتا ہے۔ اور اس کے دونوں لب میرے نام کے ساتھ جنبش کرتے ہیں۔ اور جامع ترمذی اور دوسری صحاح میں وارد ہے کہ ایک شخص نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھا کہ یارسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)! اسلام میں بے شمار عبادات ہیں مجھے ایک عمدہ چیز کا حکم فرمائیں جس میں کلی طور پر مصروف ہو جاؤں کیونکہ میں اسلام کی تمام عبادات کو کما حقہ ادا نہیں کر سکتا۔ آپ نے فرمایا تمہاری زبان اللہ تعالیٰ کے ذکر سے تر رہے۔

بیہقی اور دوسرے محدثین نے روایت کی کہ جب معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ، حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے رخصت ہوئے۔ اور یمن کی طرف روانہ ہوئے تو آپ نے حضور علیہ السلام سے بہت سی چیزیں پوچھیں۔ آخری بات جس پر گفتگو ختم ہوئی یہ تھی کہ یارسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)! اعمال خیر میں سے کون سا عمل اللہ تعالیٰ کے نزدیک زیادہ محبوب اور مقبول ہے۔ آپ نے فرمایا کہ آدمی مرتے دم تک اللہ تعالیٰ کے ذکر میں رطب اللساں رہے۔

ذکر خدا۔ مسجد سے وابستگی اور والدین کی تعظیم کی فضیلت

ابوبکر ابن ابی الدنیا ابوالمخارق کی روایت سے لائے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ شب معراج میرا ایک شخص پر گزر ہوا کہ وہ پورے کا پورا عرش کے نور میں گم تھا میں نے کہا یہ کون ہے؟ کیا کوئی فرشتہ ہے؟ کہا گیا فرشتہ نہیں ہے یہ وہ شخص ہے۔ جس کی زبان دنیا میں اللہ تعالیٰ کے ذکر سے تر تھی۔ اور اس کا دل ہمیشہ مسجدوں کے ساتھ وابستہ رہتا تھا۔ اور اس نے کبھی اپنے والدین کو لوگوں سے گالی نہ دلائی۔

اور امام احمد کی کتاب الزہد میں اور دوسری معتبر کتابوں میں وارد ہے کہ لوگوں نے حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ کے پاس کہا کہ فلاں نے اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے سو (۱۰۰)

غلام آزاد کیے ہیں۔ حضرت ابوالدرداء نے فرمایا کہ فی الواقع اللہ تعالیٰ کے نام پر اس قدر دینا بہت ہے۔ لیکن اس سے دو چیزیں افضل ہیں پہلی چیز وہ ایمان جسے آدمی دن رات لازم رکھتا ہے۔ اور دوسری چیز یہ کہ اس کی زبان ہمیشہ ذکر الٰہی سے تر رہے۔ پھر حضرت ابوالدرداء نے فرمایا کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ کیا میں تمہیں اللہ تعالیٰ کے نزدیک تمہاری بہترین عبادت، تمہارے پاکیزہ ترین عمل، تمہارے درجات کو زیادہ بلند کرنے والے کام جو کہ تمہیں سونا چاندی خرچ کرنے سے زیادہ بہتر ہو اور اس سے بھی بہتر ہو کہ تم جہاد میں دشمنوں کے مقابلہ میں آؤ وہ تمہیں شہید کریں۔ اور تم انہیں قتل کرو کی خبر نہ دوں؟ لوگوں نے عرض کی یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! کیوں نہیں آپ ہمیں اتنے عظیم عمل کا نشان اور خبر ضرور عطا فرمائیں۔ آپ نے فرمایا اللہ تعالیٰ کا ذکر۔

اور بیہقی نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کی کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ ہر چیز صیقل یعنی چمکانے والا ہے۔ اور دِلوں کو چمکانے والا اللہ تعالیٰ کا ذکر ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کے عذاب سے نجات دینے میں کوئی چیز اتنی کارگر نہیں ہوتی جتنا کہ اللہ تعالیٰ کا ذکر کارگر ہوتا ہے۔ اور یہ الفاظ آپ نے دو مرتبہ فرمائے۔ لوگوں نے عرض کی کہ یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کیا اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد بھی ذکر الٰہی کے برابر نہیں ہے، فرمایا نہیں ہے۔ اگرچہ مرد مجاہد اپنی تلوار کو اتنا چلائے کہ ٹوٹ جائے۔

اور طبرانی، بزار اور بیہقی، ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت سے لائے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ جو شب بیداری سے عاجز ہو جائے۔ اور بخل کی وجہ سے راہ خدا میں مال خرچ نہ کر سکے۔ اور بزدلی کی بنا پر خدا تعالیٰ کے دشمنوں کے ساتھ جہاد نہ کر سکے تو اسے چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کا ذکر بہت زیادہ کرے۔ کیونکہ ان نقصانوں کا تدارک کرے گا۔ نیز مذکور محدثین حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت سے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے لائے ہیں کہ جسے دربار خداوندی سے چار چیزیں عطا ہوئیں اسے دنیا و آخرت کی بھلائی حاصل ہو گئی، شکرگزار دل، ذکر کرنے والی زبان، تکلیف پر صبر کرنے والا جسم اور بیوی جو کہ آدمی کی عزت اور مال پر نگہبان اور امین ہو۔

اور ابن حبان، حضرت ابو سعید الخدری رضی اللہ عنہ کی روایت سے لائے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ بہت سے لوگ اونچی مسندوں پر بیٹھ کر اور نرم تکیوں پر آرام کر کے ذکر خدا میں مشغول ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ انہیں اس دنیوی تعیش وتلذذ کے باوجود ذکر کی برکت سے جنت میں بلند درجات عطا فرمائے گا۔ اور صحیحین میں وارد ہے کہ خدا تعالیٰ کو یاد کرنے والا زندہ آدمی کی مانند ہے۔ اور جو خدا تعالیٰ کو یاد نہیں کرتا مردے کی مانند ہے۔

اور طبرانی ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کی روایت سے لائے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ اگر کوئی شخص جھولی میں روپے ڈال کر تقسیم کرنا شروع کر دے اور دوسرا اس کے برابر خدا تعالیٰ کو یاد کرنا شروع کر دے تو بلاشبہ اللہ تعالیٰ کو یاد کرنے والا افضل ہوگا۔

اور طبرانی اور بیہقی متعدد روایات کے ساتھ لائے ہیں کہ جنتیوں کے دل میں کسی چیز پر حسرت نہیں رہے گی مگر اس ساعت پر جو کہ ان پر گزری اور انہوں نے اس میں یاد خدا نہ کی۔ اور صحیح مسلم اور دوسری صحاح میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مروی ہے کسی جگہ کوئی جماعت اللہ تعالیٰ کے ذکر کے لیے نہیں بیٹھی مگر فرشتے ان کے اردگرد حلقہ باندھ لیتے ہیں۔ اور انہیں اللہ تعالیٰ کی رحمت ڈھانپ لیتی ہے۔ اور ان پر سکینہ نازل ہوتا ہے۔ اور حق تعالیٰ انہیں اپنی بارگاہ کے مقربین میں خوبی کے ساتھ یاد فرماتا ہے۔ اور اسی مضمون کو ابن ابی الدنیا نے ان الفاظ کے ساتھ روایت کیا کہ حضرت ابو ہریرہ اور ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے دونوں نے کہا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے ذکر والوں کے لیے چار چیزیں ہیں۔ ان پر سکینہ نازل ہوتا ہے۔ انہیں رحمت ڈھانپ لیتی ہے، ان کے اردگرد ملائکہ حلقہ باندھ لیتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ انہیں اپنی بارگاہ کے حاضرین میں یاد فرماتا ہے۔

محافل ذکر اور ملائکہ کی حاضری

اور صحیحین میں وارد ہے کہ اللہ تعالیٰ کے فرشتوں میں سے بہت سے فرشتے اہل ذکر کی تلاش میں گلی گلی پھرتے ہیں۔ اور جہاں بھی کسی جماعت کو ذکر میں مشغول دیکھتے ہیں ایک دوسرے کو آواز دیتے ہیں کہ ادھر آؤ یہ تمہارا مقصد یہاں ہے۔ پس وہ فرشتے اپنے پروں کا

احاطہ کر کے حلقہ باندھ کر آسمان تک کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اور جب اہل ذکر فارغ ہو کر منتشر ہو جاتے ہیں تو وہ فرشتے آسمان پر چلے جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں پوچھتا ہے۔ حالانکہ وہ خوب جانتا ہے کہ تم کہاں سے آئے ہو؟ فرشتے کہتے ہیں کہ تیرے بندوں کے پاس سے آئے ہیں جو کہ زمین میں ہیں۔ اور تجھے یاد کرتے ہیں۔ اور تیرے لیے تسبیح و تہلیل کرتے ہیں۔ حق تعالیٰ فرماتا ہے کہ کیا انہوں نے مجھے دیکھا ہے؟ فرشتے کہتے ہیں نہیں۔ حق تعالیٰ فرماتا ہے کہ اگر وہ مجھے دیکھ لیں تو کیا کریں۔ وہ عرض کرتے ہیں کہ اگر تجھے دیکھ لیں تو یقین ہے کہ تیرے ذکر میں زیادہ مصروف ہوں۔ اور پوری محنت اور کوشش کے ساتھ تجھے یاد کریں۔ پھر حق تعالیٰ پوچھتا ہے کہ مجھے یاد کرنے سے کیا چیز چاہتے ہیں۔ اور کس چیز سے پناہ ڈھونڈتے ہیں۔ فرشتے عرض کرتے ہیں کہ جنت چاہتے ہیں۔ اور دوزخ سے پناہ ڈھونڈتے ہیں؟ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ انہوں نے ان دونوں کو دیکھا ہے؟ فرشتے عرض کرتے ہیں کہ بے دیکھے جنت کے طالب اور دوزخ سے گریزاں ہیں۔ اور یقین ہے کہ اگر دیکھ لیں تو اس کے زیادہ طالب ہوں اور اس سے اور زیادہ بھاگیں۔ حق تعالیٰ فرماتا ہے کہ پس گواہ رہو کہ میں نے انہیں بخش دیا، اور ان کا مقصد انہیں عطا فرماتا۔ ان فرشتوں میں سے ایک عرض کرتا ہے، کہ ان میں فلاں آدمی بھی تھا۔ لیکن ذکر والوں سے نہ تھا۔ کسی کام کے لیے آیا تھا اور بیٹھ گیا۔ حق تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں نے اسے بھی بخش دیا۔ ان لوگوں کا وہ رتبہ ہے کہ ان کے پاس بیٹھنے والا بھی خلاصی پا جاتا ہے۔

اور صحیح مسلم اور دوسری صحاح میں وارد ہے کہ ایک دن حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے آستانہ پاک سے باہر تشریف لائے۔ اور ایک حلقے کے پاس کھڑے ہوئے۔ اور پوچھا کہ تم کس مقصد کے لیے حلقہ باندھے بیٹھے ہو۔ انہوں نے عرض کی کہ ہم یاد خدا کے لیے بیٹھے ہیں۔ اور اس کا شکر کر رہے ہیں کہ اس نے ہمیں اسلام کی ہدایت فرمائی۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ قسم کھا کر کہو کہ تم اسی مقصد کے لیے بیٹھے ہو۔ انہوں نے قسم کھا کر عرض کی، آپ نے فرمایا کہ میں نے تمہیں اس وجہ سے قسم نہیں دی کہ میں تم پر جھوٹ کی تہمت رکھتا ہوں لیکن میرے پاس جبرئیل علیہ السلام آئے تھے۔ اور مجھے خبر دے گئے ہیں کہ اللہ

تعالیٰ فرشتوں کے سامنے تم پر فخر فرماتا ہے میں نے چاہا کہ تم سے فخر کی وجہ کی تحقیق کروں۔

اور امام احمد اور بیہقی، ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی روایت سے لائے کہ حق تعالیٰ قیامت کے دن فرمائے گا کہ آج اس تمام مجمع کو معلوم ہو جائے گا کہ بزرگی کیا ہے؟ اور بزرگی کے لائق کون ہے۔لوگوں نے پوچھا کہ یارسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)! ہمیں خبر دیجے تا کہ ہم ان جماعت کے علاوہ کسی کو بزرگ اور کریم نہ کہیں۔فرمایا اہل کرم وہ لوگ ہیں جو کہ ذکر کی محفلوں میں بیٹھتے ہیں۔

نیز مذکور محدثین نے روایت کی ہے کہ لوگ کبھی بھی اللہ تعالیٰ کے ذکر کے لیے جمع نہیں ہوتے مگر ان کے فارغ ہونے کے بعد آسمان سے فرشتہ ندا دیتا ہے کہ بخشے ہوئے جاؤ۔ تمہاری برائیاں نیکیوں سے بدل گئیں۔نیز حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کی ہے کہ عذاب قبر سے کوئی عمل اتنی نجات نہیں دیتا جتنی کہ اللہ تعالیٰ کا ذکر دیتا ہے۔

اور بے شمار محدثین حضرت ابوالدرداء، ابی بن کعب، عبادہ بن صامت، عبداللہ بن عمر، معاذ بن جبل اور سلمان فارسی رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین سے بے شمار روایات لائے ہیں کہ یہ بزرگ ذکر کو مال خرچ کرنے، جہاد کرنے اور دوسری عمدہ عبادات پر ترجیح دیتے تھے۔ان میں سے کسی نے فرمایا کہ ایک تکبیر دنیا و مافیہا سے بہتر ہے۔اور کوئی کہتے تھے کہ میں سو مرتبہ اللہ اکبر کہوں مجھے یہ سو دینار خرچ کرنے سے زیادہ محبوب ہے۔کسی نے فرمایا کہ اگر میں صبح کی نماز سے طلوع شمس تک ذکر کروں یہ مجھے اس سے کہیں زیادہ محبوب ہے کہ میں گھوڑوں کی پشتوں پر بیٹھ کر فی سبیل اللہ جہاد کروں۔اور اسی طرح عصر کے بعد غروب شمس تک،کوئی فرماتے تھے کہ اگر دو شخص ایک مشرق سے اور دوسرا مغرب سے چلے ان میں سے ایک کے پاس سونا ہو جس میں سے وہ حق کے سوا خرچ نہیں کرتا۔اور دوسرا اللہ تعالیٰ کا ذکر کرے۔یہاں تک کہ وہ راستہ میں ملیں تو وہ ان دونوں میں افضل وہ ہوگا جو اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتا ہے۔اور کسی نے فرمایا کہ اگر کوئی آدمی اپنے معاصرین کو کھانا کھلاتا ہوا فوت ہو جائے۔اور دوسرا قرآن کی تلاوت کرتا اور اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتا ہوا فوت ہو تو میں اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنے والے کو افضل دیکھتا ہوں۔اور اس مقام میں تحقیق یہ ہے کہ ہر عمل کی افضلیت

اس کی تاثیر کے محل کے اعتبار سے مختلف ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ذکر تہذیب نفس، غفلت کے علاج اور حجاب اُٹھانے میں افضلیت رکھتا ہے۔ اگرچہ مال خرچ کرنا اور جہاد ثواب زیادہ کرنے اور درجات بلند کرنے میں افضل ہو جائے۔

اور ابن ابی شیبہ، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے لائے ہیں کہ اہل ذکر آسمان والوں کی نظر میں اس طرح چمکتے دکھائی دیتے ہیں جس طرح زمین والوں کی نظر میں ستارے۔ اور طبرانی متعدد روایات کے ساتھ لائے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے تھے کہ تجلی الٰہی کی دائیں جانب ایک جماعت نور کے منبروں پر بیٹھی ہوگی جن کے حال پر انبیاء علیہم السلام اور شہدا رشک کریں گے۔ حالانکہ وہ انبیاء (علیہم السلام) اور شہدا نہیں ہوں گے، اور جب لوگوں نے پوچھا کہ یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) وہ جماعت کون لوگ ہوں گے؟ فرمایا کہ وہ لوگ ایک ہی گروہ سے نہیں ہیں۔ بلکہ مختلف فرقوں اور مختلف شہروں سے کہ انہوں نے صرف خدا تعالیٰ کی رضا کے لیے دوستی پیدا کی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کے ذکر کے لیے جمع ہوتے ہیں۔

نماز فرض کے بعد دعا مسنون ہے

اور ابن ابی شیبہ، حضرت امام باقر رضی اللہ عنہ سے لائے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک کوئی چیز ذکر اور شکر سے زیادہ محبوب نہیں ہے۔ اسی لیے یہاں جو احسان کرنے کا مقام ہے انہیں دو چیزوں کو طلب فرمایا ہے کہ فَاذْكُرُونِىٓ اَذْكُرْكُمْ وَاشْكُرُوْا لِىْ وَلَا تَكْفُرُوْنِ اور یہی وجہ ہے کہ صحاح ستہ میں وارد ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہر فرض نماز کے بعد خود بھی یہ دعا فرماتے تھے، اور معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو بھی اس دعا کی ہمیشگی کا حکم فرمایا ہے کہ

اللھم اعنی علی ذکرك و شکرك وحسن عبادتك.

شکر کی حقیقت اور اس کی فضیلت کا بیان

اور ہم یہاں پہنچے کی شکر کی حقیقت جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے یہ ہے کہ ایک شخص ہر نعمت الٰہی کو وہیں خرچ کرے جہاں اللہ تعالیٰ کی مرضی ہے۔ اور اس کے غیر پسندیدہ کام سے

روک رکھے۔ اور یہ مرتبہ بہت دشوار ہے۔ اور شرع شریف میں اس عبادت کی ادائیگی کے لیے جو کچھ مقرر ہے اس کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں سے ہر نعمت کو جب اس نعمت کی طرف توجہ کرے اپنی لیاقت اور قابلیت کے بغیر محض اللہ تعالیٰ کا فضل جانے، پھر خود کو اور اپنے اعمال کو اس نعمت کا شکر ادا کرنے سے قاصر سمجھے۔ پھر ممکن حد تک شکر کے جامع الفاظ کو جو کہ تمام نعمتوں کو محیط ہوں اختیار کرنے میں کوشش کرے۔ پھر ہر ہر نعمت کو اس کے وارد ہونے کے وقت میں اگرچہ وہ نعمت ظاہری عقل کے اعتبار سے نعمت معلوم نہ ہو جدا جدا ملاحظہ کر کے اس پر زبانی حمد و ثنا یا مالی جود و عطا یا بدنی نماز، روزہ یا ذبح و قربانی ادا کرے۔

اور بیہقی، حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی روایت کے ساتھ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے لائے ہیں کہ جب حق تعالیٰ اپنے کسی بندے کو کوئی نعمت عطا فرماتا ہے۔ اور وہ بندہ جانتا ہے کہ یہ نعمت محض خدا تعالیٰ کی طرف سے ہے۔ اللہ تعالیٰ صرف اس کے اس جاننے کو اس نعمت کا شکر لکھواتا ہے۔ اس سے پہلے کہ زبان سے تعریف کرے۔ اور ایک شخص بعض اوقات اپنے لیے کپڑا خریدتا، سیتا اور پہنتا ہے۔ اور پہننے کی ابتدا میں حمد الٰہی کرتا ہے تو وہ کپڑا ابھی اس کے زانوں تک نہیں پہنچتا کہ اسے شکر گزاروں سے لکھ دیتے ہیں۔ اور اسی طرح جب کسی سے گناہ سرزد ہوتا ہے۔ اور اس کے دل میں ایک ندامت اور شرم پیدا ہوتی ہے اللہ تعالیٰ اس بندے کے اعمال نامہ میں اس گناہ کی توبہ لکھا دیتا ہے اس سے پہلے کہ زبان سے استغفار کرے یا توبہ کرے۔

اور امام احمد کتاب الزہد میں اور بیہقی ابو مجلز سے لائے ہیں کہ انہوں نے کہا کہ میں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اپنے رب تعالیٰ سے سوالات کی کتاب میں پڑھا ہے کہ ایک دن حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بارگاہ خداوندی میں عرض کی کہ بارخدایا مجھے کیسے ممکن ہو کہ تیرے شکر سے عہدہ برا ہو سکوں حالانکہ مجھ پر تیری کمترین نعمت اس سے کہیں بڑی ہے کہ میرے تمام اعمال اس کے مقابل ہو سکیں، وحی آئی کہ اے موسیٰ اب تو نے میرا شکر ادا کیا کہ تو نے خود کو میرے شکر سے عاجز جانا۔

اور بیہقی، شعب الایمان میں حضرت امیر المومنین مرتضیٰ علی کرم اللہ وجہہ سے لائے کہ جو شخص صبح کے وقت کہے: **الحمد للّٰہ علی حسن المساء والحمد للّٰہ علی حسن المبیت والحمد للّٰہ علی حسن الصباح** اس نے اپنے شب و روز کا شکر ادا کر دیا، اور بیہقی اور ابن ابی شیبہ نے عبداللہ بن سلام سے روایت کی ہے کہ ایک دن حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جناب الٰہی میں عرض کی کہ بار خدایا! جو شکر تیری بارگاہ کے لائق ہے کیا ہے؟ ارشاد ہوا کہ چاہیے کہ تیری زبان میرے ذکر سے تر ہو۔ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے عرض کی بار خدایا! بعض اوقات ہم ایسی حالت میں ہوتے ہیں کہ اس حالت میں ہم تیرا ذکر بے ادبی سمجھتے ہیں۔ جیسا کہ بول و براز، جنابت اور بے وضوئی۔ ارشاد ہوا کہ میرے ذکر کو کسی حالت میں نہ چھوڑو، ہر حال کے مناسب کوئی ذکر کرو۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عرض کی کیا کہوں؟ فرمایا کہہ **سبحانك اللھم لا الٰہ الا انت جنبتنی الاذی سبحانك وبحمدك لا الٰہ الا انت۔**

نیز بیہقی نے روایت کی ہے کہ ایک شخص حضور علیہ السلام کی خدمت میں آتا اور سلام کرتا، اور آپ اس سے پوچھتے کہ **کیف اصبحت** یعنی تو نے کیسے صبح کی؟ وہ عرض کرتا احمد اللہ الیک یعنی میں آپ کی طرف اللہ تعالیٰ کی حمد کرتا ہوں۔ حضور علیہ السلام اس کے لیے دعا فرماتے۔ ایک دن وہ حاضر ہوا۔ اور آپ نے اس سے پوچھا کہ **کیف اصبحت انت یا فلاں** اس نے عرض کی **بخیر ان شکرت** حضور علیہ الصلوٰۃ وسلام نے خاموشی اختیار فرمائی۔ اس نے پوچھا کہ یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) آپ میری احوال پرسی کے بعد ہمیشہ دعا فرماتے تھے۔ اور آج آپ نے احوال پرسی فرمائی دعا نہیں فرمائی، آپ نے ارشاد فرمایا کہ میں ہمیشہ تجھ سے احوال پرسی کرتا تھا۔ اور تو شکر کرتا تھا۔ اور آج تو نے شکر میں شک کی۔

مختلف اعضاء کا شکر

نیز بیہقی ابو حازم سے لائے کہ آنکھ کا بھی ایک شکر ہے۔ اور ہاتھ پاؤں کا بھی ایک شکر ہے۔ اور پیٹ کا بھی ایک شکر ہے۔ اور شرم گاہ کا بھی ایک ہے۔ یہ گمان مت کرو کہ

شکر صرف زبان سے ادا ہوتا ہے۔ چاہیے کہ شکر تمام اعضا کے ساتھ ہو، اور جو شخص زبان سے شکر کرتا ہے۔ اور تمام اعضا کے ساتھ شکر ادا نہیں کرتا وہ اس شخص کی طرح ہے۔ جس کے پاس ایک گودڑی ہو۔ اس نے گودڑی کا ایک گوشہ اپنے ہاتھ میں پکڑ رکھا ہو حالانکہ اس کا تمام بدن ننگا ہے۔ یہ گودڑی اسے گرمی، سردی، برف اور بارش سے ہرگز فائدہ نہیں دیتی۔

اور ترمذی اور ابن ماجہ میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت سے وارد ہے کہ شکر گزار کھانا کھانے والے کے لیے صبر کرنے والے روزہ دار کی مثل اجر ہے۔ اور بیہقی اور ابن ابی الدنیا متعدد روایات سے لائے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے تھے کہ دو عادتیں جس میں ہوں اسے اللہ تعالیٰ شاکر وصابر لکھتا ہے۔ اور جس میں نہ ہوں وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک شاکر وصابر نہیں ہے۔ ایک یہ کہ دین کے معاملہ میں اپنے سے بالاتر کو دیکھے اور اس کی اقتدا کرے، اور دوسری یہ کہ دنیوی معاملات میں اپنے سے نچلے کو دیکھے اور خدا تعالیٰ کا شکر ادا کرے۔ اور جو شخص دنیا میں بالاتر کو دیکھے اور اپنے حال پر حسرت وافسوس کرے یا اپنے دین میں نچلے کو دیکھے اور اپنے آپ کو خود بینی میں ڈال دے اللہ تعالیٰ اسے شاکر لکھتا ہے نہ صابر۔

اور ابو داؤد اور نسائی میں وارد ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے تھے کہ جو شخص صبح کے وقت کہے **اللھم ما اصبح بی اوباحد من خلقك من نعمة فمنك وحدك لاشریك لك فلك الحمد ولك الشکر**، تو اس نے اس دن کا شکر ادا کر دیا، اور جو شام کے وقت اسی طرح کہے تو اس نے رات کا شکر ادا کر دیا۔

ابن ابی الدنیا، حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ جو کسی تکلیف یا مصیبت والے کو دیکھے اور کہے **الحمد للہ الذی عافانی مما ابتلاك و فضلنی علی کثیر ممن خلق تفضیلا** تعریف ہے اس خدا تعالیٰ کی جس نے مجھے اس بلا اور مصیبت سے بچایا جس میں تجھے بتلا کیا ہے۔ اور اس نے مجھے تجھ پر اور اپنی مخلوق میں سے بہتوں پر فضیلت دی۔ پس اس نے اس نعمت کا شکریہ ادا کر دیا۔ لیکن علماء نے کہا ہے کہ اس شکر کو اس طرح کہے کہ وہ مصیبت والا نہ سنے تاکہ اس کا دل نہ ٹوٹے۔ اور ابو داؤد اور ترمذی سے وارد

ہے کہ جب حضور علیہ السلام کے پاس اچھی خبر پہنچتی یا کوئی پسندیدہ امر حاصل ہوتا تو آپ شکر ادا کرنے کے لیے سجدہ میں گر جاتے، اور ابن ابی الدنیا نے حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ سے روایت کی کہ ایک دن حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ آج میری جبرئیل علیہ السلام سے ملاقات ہوئی انہوں نے مجھے عمدہ بشارت دی اور کہا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جو شخص آپ پر ایک بار درود بھیجے گا میں اس پر دس بار درود بھیجتا ہوں اور جو آپ پر ایک بار سلام کہے میں اس پر دس مرتبہ سلام کہتا ہوں۔ میں نے اس بشارت کی خوشی میں اللہ تعالیٰ کے حضور سجدۂ شکر ادا کیا۔

خرائطی حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ کی روایت کے ساتھ لائے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے تھے کہ **افضل الذکر لا الہ الا اللہ وافضل لشکر الحمد للہ**۔ اور ابن ابی شیبہ، ابن سعد اور دوسرے محدثین حضرت شداد بن اوس رضی اللہ عنہ کی روایت سے لائے ہیں کہ حضور علیہ السلام فرماتے تھے کہ جب دنیا کے لوگ سونے اور چاندی کو زیادہ کرنے میں مصروف ہو جائیں تو تمہیں چاہیے کہ یہ کلمات زیادہ کہو **اللھم انی اسئلک النبات فی الامر والعزیمۃ علی الرشد واسئلک قلبا سلیما ولسانا صادقا واسئلک خیر ماتعلم واعوذبک من شرماتعلم واستغفرک لماتعلم انک انت علام الغیوب**۔

چند نعمتوں کا شکر ادا کرنے کے طریقے کا بیان

اور شرع شریف میں چند چیزوں کو چند نعمتوں کا شکر ادا کرنے کے لیے مقرر فرمایا ہے۔ بچے کی ولادت کا شکر عقیقہ ہے۔ اور اس کے سر کے بالوں کے برابر چاندی کو تول کر خیرات کرنا۔ اور نکاح کا شکر ولیمہ ہے۔ اور نیا کپڑا پہننے کا شکر یہ ہے کہ پرانا کپڑا اللہ تعالیٰ کے نام پر کسی محتاج کو دے دے۔ اور روزہ رکھنے کا شکر صدقۃ الفطر اور عید کے دن وسعت، تکلف اور زیب وزینت کرنا ہے۔ اور ادائے حج کا شکر عید الاضحیٰ کی قربانی اور اس دن میں تکلف اور زیب وزینت ہے۔ اور کھانے، پینے اور نیند سے بیدار ہونے کا شکر زبانی اذکار ہیں جو کہ ان اوقات میں حدیث شریف میں وارد ہوئے ہیں۔ اور مال کا شکر یہ ہے کہ اپنے

آپ پر اس کا اثر ظاہر کرے۔ اور لباس اور خوراک میں مفلسوں کی صورت اختیار نہ کرے۔ اور جانوروں کی سواری کا شکر یہ ہے کہ کبھی کبھی محتاجوں کو عاریۃً دے دے۔ اور مویشیوں کا شکر یہ ہے کہ ان میں سے ایک جانور کا دودھ اللہ تعالیٰ کی راہ میں مستحقوں کو دے دیا جائے۔ اور کھیتی اور پھلوں کا شکر یہ ہے کہ اس کے کھانے سے کسی کو نہ روکے۔ لیکن اگر کوئی چاہے کہ اُٹھا کر لے جائے تو مزاحمت کا حق ہے۔ اور صنعت کا شکر یہ ہے کہ ضرورت مند کی اس کے ساتھ مدد کرے مثلاً لکھنا اور سینا، اور قرآن پاک اور مسائل دین کی تعلیم دینا نعمت علم کا شکر ہے۔ علیٰ ہذا القیاس۔

اور چونکہ ان تین ذمہ داریوں میں جو کہ ذکر، شکر اور ترک کفران نعمت ہیں تمام احکام شرعیہ داخل ہو گئے۔ اس لیے کہ ذکر و شکر جیسا کہ گزر چکا تمام طاعتوں کو گھیرے میں لینے والے ہیں۔ اور کفران نعمت تمام منہیات کو محیط ہے۔ اور احکام شرعیہ کو پورے طور پر کمال کے ساتھ ادا کرنا بہت دشوار اور مشکل ہے تو ناچار اس مشکل کو آسان کرنے کے لیے ایک طریقے کا نشان دیا گیا ہے۔ اور فرمایا ہے

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اے وہ لوگو! جو ایمان لائے ہو اگر ذکر، شکر۔ اور میری نعمتوں کی ناشکری چھوڑنے کا حق ادا کرنا تم پر دشوار ہو تو اسْتَعِیْنُوْا بِالصَّبْرِ صبر کے ساتھ مدد طلب کرو۔ کہ ہمارے لشکروں میں سے ایک عظیم لشکر ہے۔ اور خاص تمہاری نوع جو کہ انسان ہے کہ ساتھ ہم نے متعین فرمایا تا کہ تمہاری مہمات میں تمہارا مددگار ہو۔

انسان کے ساتھ صبر کی تخصیص کا بیان

اور یہی وجہ ہے کہ جانوروں میں صبر کا تصور نہیں ہے کہ محض خواہش رکھتے ہیں نہ کہ عقل۔ اور فرشتوں میں بھی تصور نہیں کہ محض عقل رکھتے ہیں نہ کہ خواہش۔ پس صبر جو کہ شہوت وغضب کے تقاضوں کے مقابلہ میں ثابت قدمی سے عبارت ہے اس نوع کے سوا کسی مخلوق میں ہم نے پیدا نہیں فرمایا ہے۔ لیکن یہ نوع' تو اپنے وجود کی ابتدا میں اس کا فرد بمنزلۂ جانور ہوتا ہے کہ غذا کی خواہش کے سوا اور کچھ نہیں رکھتا، پھر کچھ مدت کے بعد اس پر کھیل کود کی خواہش غلبہ کرتی ہے۔ پھر جماع کی خواہش لیکن جب اس حد کو پہنچتا ہے تو اس

میں ایک عقل بھی پیدا ہو جاتی ہے۔ جو کہ اس کے رُخ شہوت کو دنیوی لذت سے پھیرتی ہے۔ اور آخرت کی سعادت کی طرف متوجہ کرتی ہے۔ اور اس وقت عقل وشہوت دونوں کے اسباب میں جنگ اور جھگڑا پڑ جاتا ہے۔ اگر عقل نے شہوت کو مغلوب کر لیا۔ اور اپنے قبضہ میں لے لیا تو یہی ہے صبر کا معنی۔

اقسام صبر

صبر کی دو قسمیں ہیں، بدنی اور نفسانی۔ بدنی کی بھی دو قسمیں ہیں، فعلی یا انفعالی، فعلی جیسے مشقت والے کام کرنا۔ اور انفعالی جیسے تکالیف اور دکھوں پر ثابت قدم رہنا۔ اور نفسانی اس سے عبارت ہے کہ نفس کو طبعی تقاضوں سے روکے، اگر پیٹ اور شرمگاہ کی خواہش سے بند کرے تو اسے عفت کہتے ہیں۔ اور اگر فضول طلب کرنے سے بند کرے اسے زہد و قناعت کہتے ہیں۔ اور اگر مصیبت کے وقت جزع وفزع، آواز بلند کرنے، چہرے پر طمانچہ مارنے اور گریبان اور کپڑے کو پھاڑنے سے بند کرے اسے صبر عرفی کہتے ہیں۔ اور اگر امیری اور دولت مندی کی حالت میں تکبر، نخوت اور ہم نشینوں سے اونچا ہونے سے بند کرے تو اسے فراخی حوصلہ کہتے ہیں۔ اور اگر جنگ کی حالت میں بھاگنے پھسلنے سے بند کرے اسے شجاعت کہتے ہیں اور اگر حالت غضب میں مارنے اور گالی دینے سے بند کرے تو اسے حلم یعنی بردباری کہتے ہیں۔ اور اگر مہمات میں سے کسی مہم کو سرانجام دینے میں بے چینی اور حیرت سے بند کرے تو اسے بھی وسعت حوصلہ کہتے ہیں۔ اور اگر بھید ظاہر کرنے سے بند کرے تو اسے رازداری کہتے ہیں۔ پس یہ شکر الٰہی دینی اور دنیوی مہمات میں سے ہر مہم میں مددگار ہے۔

اور صبر کی حقیقت یہ نہیں ہے کہ آدمی تکلیف وہ کام کی کدورت نہ پائے۔ یا پائے اور اسے مکروہ نہ سمجھے۔ اس لیے کہ یہ دونوں کام غیر ممکن ہیں۔ بلکہ صبر کی حقیقت یہی ہے کہ کدورت اور طبعی کراہت کے باوجود اپنے آپ کو اس سے روکے جو کہ عقل اور شرع کے منافی ہے۔ اور خود کو گھبراہٹ شکایت کے اظہار سے باز رکھے۔ اور اگر آنسو جاری ہوں یا چہرے کا رنگ متغیر ہو جائے تو صبر کے منافی نہیں ہے۔ اس لیے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے

اپنے شاہزدے حضرت ابراہیم رضی اللہ عنہ کی وفات کے وقت گریہ فرمایا ہے۔ اور غم واندوہ کا اظہار ان لفظوں کے ساتھ فرمایا واللہ انا بفراقك یا ابراهیم لمحزونون، اور جب لوگوں نے اس بارے میں عرض کی تو ارشاد فرمایا اس قدر غم اور ملال اور آنسو بہانا رحمت الٰہی کے تقاضوں سے ہے۔ اور اس قسم کے تعلقات کے بارے میں یہ حکم ظاہر ہوا انما یرحم اللہ من عبادہ الرحماء، اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے رحم کرنے والوں پر رحم فرماتا ہے۔ نیز فرمایا ان العین تدمع والقلب یحزن ولانقول الا ما یرضی ربنا، یعنی آنکھ آنسو بہاتی ہے۔ اور دل غم کرتا ہے۔ اور اس امر میں بندے کا کوئی اختیار نہیں ہے۔ اور اتنا سا کام حد تکلیف میں داخل نہیں ہوسکتا کہ لَا یُکَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا البتہ ہم اپنی زبان کو بند کرتے ہیں تاکہ اس پر اللہ تعالیٰ کی رضا کے خلاف کوئی حرف نہ آئے۔

اور یہاں جاننا چاہیے کہ صبر وہی ہے جو کہ درد، مصیبت اور نفس کے قلق کے اوائل میں واقع ہو، اور جب مصیبت کی تیزی ٹوٹ گئی، اور نفس کو اس کا صدمہ بھول گیا تو اس وقت جزع وفزع اور شکایت کا ترک کرنا صبر میں شمار نہیں ہوتا۔ بلکہ اسے تسلی اور بھول جانا کہتے ہیں۔ اور وہ بھی ایسا امر ہے۔ جو کہ اضطرار کے ساتھ واقع ہوتا ہے۔ اور اسی لیے حکماء نے کہا ہے کہ اگر کسی کو تکلیف دیں کہ مصیبت پر ہمیشہ بے قراری کرے تو یہ تکلیف مالا یطاق ہوگی۔

فضائل صبر اور صابرین کا بیان

اور اس قابل تعریف خلق جس کا نام صبر ہے کے فضائل میں سے یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کتاب عزیز میں ستر (۷۰) سے کچھ اوپر مقامات پر اس کی تعریف فرمائی ہے۔ اور دارین کی اکثر خوبیاں اس اچھی خصلت کے ساتھ وابستہ فرمائیں۔ ان میں سے وجعلنا هم ائمة یهدون بامرنا لما صبروا، (السجدۃ آیت ۲۴) تمت کلمة ربك الحسنیٰ علیٰ بنی اسرائیل بما صبروا، (الاعراف ۱۳۷) ولنجزین الذین صبروا اجرهم باحسن ما کانوا یعملون (النحل آیت ۹۶) انما یوفی الصابرون اجرهم بغیر حساب (الزمر آیت ۱۰) اور اس آیت سے معلوم ہوا کہ ہر نیکی کا ایک مقرر اجر ہے صبر کے سوا کہ اس کا اجر مقدار اور اندازے میں نہیں آتا۔

اور صبر کے فضائل سے یہ ہے کہ عمدہ عبادت جو کہ روزہ ہے محض صبر ہے کھانے، پینے اور جماع سے۔ اور حدیث قدسی میں اس عبادت کے بارے میں وارد ہوا کہ الصوم لی وانا اجزی بہ۔ نیز نصرت وامداد کو صبر پر معلق فرمایا ہے ان تصبروا وتتقوا ویاتوکم من فورھم ھذا یمددکم ربکم بخمسة آلاف من الملائکہ مسومین۔ (آل عمران آیت ۱۲۵) نیز صابراں کو اپنی خصوصی عنایات کا مرکز قرار دیا ہے آیت اولئك علیھم صلوٰت من ربھم ورحمة واولئك ھم المھتدون (البقرہ آیت ۱۵۷) میں، اور صحیح حدیث میں وارد ہے کہ الصبر نصف الایمان۔ اس لیے کہ ایمان پورا نہیں ہوتا مگر اسے ترک کرنے سے جو کہ نادرست ہے۔ اور اس پر عمل کرنے سے جو کہ درست ہے۔ اور ان دونوں امور کی ہمیشگی صبر کے بغیر نہیں ہوتی۔ پس اس حساب سے صبر پورا ایمان ہے۔ چنانچہ اسی اعتبار سے حضرت امیر المومنین مرتضیٰ علی کرم اللہ وجہہ اور عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے کہ الصبر ھو الایمان کلہ صبر پورا ایمان ہے۔ لیکن چونکہ کبھی نادرست کو چھوڑنا اور درست کو عمل میں لانا دلی خواہش اور نفسانی طلب کے موافق ہوتا ہے، کبھی نہیں ہوتا۔ پس جو پہلی قسم سے ہے اس میں صبر کی ضرورت نہیں پڑتی۔ شارع کی نظر نے باریک بینی فرما کر اسے نصف ایمان قرار دیا۔ پس جو علاج کہ شرع شریف کی مشکل تکلیفات کو نفس پر آسان کرنے میں مفید ہے صبر کی عادت کو اپنانا ہے۔ جو کہ ذکر میں بھی، شکر میں بھی اور کفران نعمت کو ترک کرنے میں بھی عظیم اثر کرتا ہے۔

اور اگر اس خلق کو اپنانے کے باوجود بھی تم اس پر بعض تکالیف شرعیہ گرانی کریں یا معاش کی حوائج ضروریہ حاصل کرنے میں عاجز آجاؤ اور اس وجہ سے تمہیں ذکر، شکر اور ترک کفران نعمت کی فرصت میسر نہ ہو تو تمہیں ایک اور چیز کا بھی پتہ دیتا ہوں۔ اور فرماتا ہوں

وَالصَّلٰوةِ اور مدد طلب کرو نماز کے ساتھ، اس لیے کہ نماز ایک مرکب عبادت اور مجرب تریاق ہے۔ جو کہ چند اجزا سے بنا ہے۔ جس کا جزو اعظم اور ارکان کا خلاصہ دعا ہے۔ جو کہ ہر جزو کل کی مشکل کشائی اور محتاج کی حاجت برآری ہے۔ اور باوجود اس کے کہ قضائے حاجات کا سبب ہے ایک مستقل عبادت ہے۔ اور ذکر و شکر کی جامع صورت۔ پہلی

اس مصروفیت میں تمہارے نفس وطبع کی تسلی بھی ہوتی ہے کہ میں اپنی ضروریات کو حاصل کرنے کے درپے ہوں اور معاش کی کوشش اور تلاش میں۔ اور مقصد بھی ہاتھ سے نہیں جاتا جو کہ ذکر وشکر ہے۔ اور مہمات اور حوائج میں نماز کے ساتھ استمداد کا طریقہ پہلے گزر چکا، کہ اس کی قسموں میں صلوٰۃ الحاجت ہے ہر مقصد کے لئے، اور بارش طلب کرنے کے لیے صلوٰۃ الاستسقاء اور بے چینی دور کرنے کے لیے مطلق نوافل ہیں۔ اور حدیث شریف میں وارد ہے کہ اذاحزبہ امر فزع الی الصلوٰۃ یعنی جب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کوئی امر پریشان کرتا تو آپ نماز میں مشغول ہو جاتے۔

نماز کی بدولت حل مشکلات

اور حاکم اور بیہقی نے روایت کی ہے کہ ایک دفعہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ پر غشی طاری ہوگئی یہاں تک لوگوں نے گمان کیا کہ فوت ہو گئے ہوں۔ اور ان کے نزدیک سے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ اور مکان خالی کر دیا۔ اس مایوسی کے وقت میں ان کی اہلیہ ام کلثوم بنت عقبہ مسجد میں حاضر آئیں، اور یہ آیت پڑھی کہ یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِیْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ اور نماز میں مشغول ہو گئیں۔ ایک ساعت نہ گزری تھی کہ انہیں افاقہ رونما ہوا، اور آپ نے دوبارہ زندگی پائی۔ اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نماز جب کہ ظالم بادشاہ کے لوگ حضرت سارہ رضی اللہ عنہا کو لے گئے پہلے ذکر ہو چکی، اور جریج راھب کی نماز جب کہ اسے بدکاری کی تہمت لگائی گئی، بھی بخاری اور مسلم میں مذکور ہے۔

قصہ مختصر اس کے باوجود کہ نماز ذکر اور شکر کو شامل ہے معتائے کی دعا کی ایک ایسی تصویر ہے کہ اس سے بہتر تصویر ممکن نہیں ہے۔ اور دعا کے ساتھ مدد طلب کرنا پرانے اور نئے مسلمانوں کی عادت ہے۔ اور تم صبر اور نماز کے ساتھ مدد طلب کرنے سے کس طرح غافل ہو سکتے ہو حالانکہ

اِنَّ اللّٰهَ تحقیق اللہ تعالیٰ۔ کہ ہر مہم اور ہر حاجت میں حقیقی مددگار وہی ہے مَعَ الصّٰبِرِیْنَ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ اس لیے کہ صبر کرنے والے تکلیف کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے خلق سے جو کہ صبور اور حلیم ہے اپنے آپ کو متخلق کرتے ہیں۔ اور جس نے اپنے

آپ کو اخلاق الٰہی سے متخلق کیا علمی اور قدرتی معیت جو کہ اللہ تعالیٰ کو ہر مخلوق کے ساتھ ثابت ہے کے علاوہ اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کو ایک اور معیت حاصل ہو گئی، اور اس معیت خاصہ کے آثار سے وہ توفیق، امداد، تائید اور نصرت ہے۔ جو کہ نفس، شیطان اور انسانی جنی دشمنوں کے خلاف ملتی ہے جو کہ ذکر اور شکر سے روکنے والے اور کفران نعمت کا باعث ہوتے ہیں۔ نیز جب اللہ تعالیٰ تمہارے ساتھ ہو تو تمہارا مقصد حاصل ہو گیا۔ کہ ذکر، شکر اور کفران نعمت کی ترک سے بھی اسی کو ڈھونڈتے ہو، اور جب یہ معیت خاصہ صرف صبر پر مرتب ہوتی ہے تو نماز پر بطریق اولیٰ مرتب ہو گی جو کہ ذکر، شکر اور صبر کی جامع ہے۔ بلکہ نماز خود معراج المومنین اور قرب و مناجات کی صورت ہے۔ اسی حالت میں خاص معیت کا حصول تو اس عمل کی طبیعت کا تقاضا اور اس کے ارکان کو پورا کرنے والا ہے نہ کہ اس کی جزا اور نتیجہ۔ اسی لیے یہ ارشاد نہ ہوا کہ اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الصَّابِرِیْنَ وَالْمُصَلِّیْنَ۔

اور جب ثابت ہو گیا کہ صبر کرنے والوں کو حضرت حق جل و علا کی خاص معیت حاصل ہوتی ہے۔ اور یہ بات قطعی طور پر معلوم ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر کمال کا جامع ہے۔ اس کی معیت ہر کمال کی معت کو اس کے حامل کی استعداد کے مطابق لازم کرتی ہے۔ نیز یقین کے ساتھ ثابت ہے کہ صبر کی قسموں میں سے جو اعلیٰ اور اکمل ہے خدا تعالیٰ کی راہ اور اس کی اطاعت میں جان جانے پر صبر کرنا ہے۔ جیسا کہ کہتے ہیں الجود بالنفس اقصی غایة الجود یعنی جان کی سخاوت کرنا، سخاوت کی انتہائی حد ہے۔ کسی لذت کے فوت ہونے یا مال کے نقصان یا کسی دوسرے کی موت پر صبر کرنا جو کہ اپنے سے قرابت کا تعلق رکھتا ہو۔ اس کے مقابلہ میں اتنی حیثیت نہیں رکھتا۔ پس صبر کرنے والوں خصوصاً صبر کرنے والوں میں سے اس اعلیٰ و اکمل فرد کے کمال حیات حاصل کرنے میں کوئی شک مت کرو جو کہ اس ذات مقدس کی صفات ذاتیہ میں سے پہلی صفت ہے۔

وَلَا تَقُوْلُوْا اور مت کہو لِمَنْ یُّقْتَلُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ اس کے بارے میں جو کہ اللہ کی راہ میں قتل کیا جائے۔ اور جہاد میں صبر کرنے والوں میں سے ہو کہ وہ اَمْوَاتٌ مردہ ہیں۔ اس لیے کہ جب آدمی مرتا ہے اس کی روح جدا ہو جاتی ہے۔ پس جسم کو روح کی جدائی کی

وجہ سے حس و حرکت اور ادراک و شعور کے نہ ہونے کی شکل میں موت رونما ہوتی ہے۔ اور روح میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔ جیسے وہ قوتوں کی حامل تھی اب بھی ہے۔ اور جو شعور و ادراک رکھتی تھی اب بھی رکھتی ہے۔ بلکہ زیادہ صاف اور روشن۔ اس لیے کہ اسے بدن کی تدبیر اور امور سفلی میں توجہ ادراک میں صفائی سے مانع ہوتی تھی۔ اور جب بدن سے جدا ہوئی وہ مانع اُٹھ گیا۔ پس روحوں کو مطلقاً خواہ شہید کی روح ہو یا عام مومنین کی روح یا کافر و فاسق کی روح اس معنی کے ساتھ مردہ نہیں کہا جا سکتا۔ مرنا جسم کی صفت ہے کہ اس سے شعور و ادراک اور حرکات و تصرفات اس کے ساتھ روح کے تعلق کی وجہ سے ظاہر ہوتے تھے۔ اور اب نہیں ہوتے۔

دو وجہ سے روح کی موت

البتہ روح کو دو وجہ سے موت لاحق ہوتی ہے۔ پہلی وجہ یہ کہ بدن سے جدا ہونے کے بعد ترقی سے محروم ہو جاتی ہے۔ اور جب تک کہ بدن کے ساتھ متعلق تھی ترقی کا میدان اس پر فراخ تھا، اور دوسری وجہ یہ کہ بعض فوائد اور لذتیں جیسے کھانا، پینا، سیر اور ادراک کہ جن کی جسم کے ساتھ متعلق ہونے کی وجہ سے اسے عادت ہو چکی تھی اس کے ہاتھ سے نکل جاتے ہیں۔ اور اسی لیے شرع شریف میں بھی موت کا حکم دیتے ہیں۔ مگر صرف انہیں امور میں، مثلاً کہتے ہیں کہ اس کے اچھے بُرے عمل ختم ہو گئے اور اس کے کام کا خاتمہ اس پر ہوا، ار سعادت یا شقاوت پر مرا، اور اس کے بعد اس سے جو کچھ رہ گیا اسے پانے کا تصور نہیں رہتا۔ نیز کہتے ہیں کہ اس کا مال وارثوں کی وراثت ہو گیا۔ اس لیے کہ اسے اس جگہ مال کی کوئی ضرورت نہ رہی، اور اس کی عورت نکاح سے فارغ ہو گئی۔ اگر عدت گزرنے کے بعد کسی دوسرے کے ساتھ نکاح کرے تو جائز ہے۔ اس لیے کہ وہ تعلق جو اس عورت کے ساتھ رکھتا تھا۔ اور اس سے فائدہ لیتا تھا اس جسم پر موقوف تھا۔ اور وہ جسم اس سے جدا ہو گیا جیسا کہ سوار نے اپنا گھوڑا بیچ دیا اب اسے زین اور لگام کی کوئی ضرورت نہ رہی، اور سوداگر جب دکانداری چھوڑ دے پھر اسے مال بڑھانا ممکن نہیں۔ اس کا وہی جمع کیا ہوا اس کے پاس ہے۔

لیکن اس دو معنوں میں ارواح کی موت بھی راہ خدا میں شہید ہونے والوں کے سوا ہے۔ رہے راہ خدا میں شہید ہونے والے تو حقیقت میں وہاں ان دونوں معنوں میں بھی موت نہیں ہے۔

بَلْ بلکہ وہ اَحْيَآءٌ زندہ ہیں۔ اس لیے کہ وہ ہمیشہ ترقی، اجر اور ثواب کی زیادتی میں ہیں۔ اور ان کا وہ عمل جس پر کہ وہ فوت ہوئے ہیں۔ اور جس میں انہوں نے جان دی ہے ان کا دائمی عمل قرار پایا ہے گویا ابھی کر کے گئے ہیں۔

شہیدوں کی حیات کی کیفیت

اور بخاری و مسلم کی حدیث میں وارد ہے کل ابن آدم یختم علی عمله اذامات الاالمجاهد فی سبیل اللّٰهِ فانه ینمی له عمله الی یوم القیامة۔ ہر آدمی جب مرتا ہے اس کے عمل پر مہر لگادی جاتی ہے مگر وہ شخص راہِ خدا میں جہاد میں شہید ہو کہ اس کا عمل قیامت تک جاری ہے۔ گویا جہاد کر رہا ہے۔ اور اسی طرح ان کے جسمانی نفع اور لذتیں بھی ختم نہیں کی گئی ہیں۔ بلکہ بدنوں سے ان کی ارواح کے جدا ہونے کے ساتھ ہی انہیں دوسرے بدنوں کے سات متعلق کر دیا گیا ہے۔ تاکہ ان جسموں کے واسطہ سے جسمانی فوائد اور لذتیں حاصل کریں۔

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ موطاء میں اور امام احمد، ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ، کعب بن مالک کی روایت سے لائے ہیں کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ شہیدوں کی روحیں طوطیوں اور نیل کنٹھ کی مثل سبز رنگ جانورروں کے شکم میں رکھ دی جاتی ہیں۔ اور انہیں اجازت دے دی جاتی ہے کہ بہشت کے ہر درخت اور ہر پھل سے سیر ہو کر کھائیں اور جنتی نہروں سے شراب، پانی، دودھ اور شہد میں سے جو چاہیں پئیں۔ اور ان کے آشانے وہ قندیلیں ہیں جو کہ عرش کے ساتھ لٹکتی ہیں وہاں آرام کرتے ہیں۔ اور اس حدیث کی اصل متواتر ہے۔ اور صحیحین میں بھی موجود ہے۔ البتہ شہیدوں کی ارواح اس جہان کے فوائد اور دنیوی تکلیفات سے دور جا پڑی ہیں۔ لیکن جسمانی فوائد کسی قسم کی تکلیف کے بغیر رکھتی ہیں۔ اور غم اور دکھ قطعاً نہیں دیکھتیں۔ تو حقیقت میں ان کی زندگی دنیوی زندگی سے زیادہ کامل ہے۔

وَلٰکِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ لیکن تمہیں شعور نہیں ہے، کہ وہ ابھی تک اعمال کی ترقی اور جسمانی فوائد اور لذتوں میں تمہارے ساتھ شریک ہیں۔ بلکہ اس جہت سے تم سے زیادہ اور فزوں ترین ہیں کہ ان کے وہ جسم تمہارے نگاہ سے غائب ہیں۔ اور تمہارے جہاں سے علیحدہ ایک اور جہان میں ان کا رزق اور سیر و تفریح مقرر ہے۔ اس شخص کی طرح جو کہ یورپ میں پھل کھاتا ہے۔ اور شگوفوں اور گلزار کی سیر کرتا ہے۔ اور ہندوستان والے جب اسے نہیں دیکھتے ہیں مردہ گمان کرتے ہیں۔ نیز اس جہت سے کہ تم ان کے چھوڑے ہوئے جسموں کو دفن کرتے ہو۔ اور بے روح جانتے ہو اور پھر ان کی ارواح کی زندگی کا کوئی اثر ان جسموں میں ظاہر نہیں ہوتا اگرچہ فرق عادت کے طور پر ضائع اور بوسیدہ ہونے سے محفوظ رہتے ہیں اس شخص کی طرح جو کسی کے گھر کو ویران اور خالی دیکھ کر اس کی موت کا حکم کرے۔

ایک جواب طلب سوال۔ شہداء کی حیات اور مسئلہ تناسخ میں فرق

یہاں ایک جواب طلب سوال باقی رہ گیا، اور وہ یہ ہے کہ شہداء کی ارواح کے ان جسموں سے جدا ہونے کے بعد سبز رنگ جانوروں کے جسموں کے ساتھ متعلق ہونے کے درمیان اور تناسخ کے درمیان جو کہ اہل اسلام کے نزدیک باطل ہے فرق کس طرح سمجھا جا سکتا ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ تناسخ یہ ہے کہ روح ایک بدن سے جدا ہونے کے بعد دنیا ہی میں دوسرے جسم عنصری کے ساتھ متعلق ہو جائے۔ اور نئے سرے سے نشو و نما پائے، اور دنیوی خلقت کے تمام لوازمات اس میں ثابت ہوں جبکہ اس قسم کا تعلق جو کہ ارواح شہداء کو اُڑنے والے جانوروں کے جسموں کے ساتھ ہوتا ہے عالم عناصر سے بھی باہر ہے۔ اور نشو و نما بھی نہیں رکھتا، اور دنیوی خلقت کے تمام لوازمات بھی اس میں موجود نہیں ہیں۔ پس یہ تناسخ کے باب سے نہیں ہے۔

اور یہ بھی اس صورت میں ہے کہ ان سبز رنگ جسموں کے لیے پہلے سے کوئی اور روح متعلق نہ ہو اور اگر ان جسموں کی پہلے سے روح حیوانی ہو اور ان کی ارواح کو ان زندہ اجسام میں رزق سے بہرہ ور کرنے کے لیے داخل کیا گیا ہو تو تناسخ کے ساتھ بالکل مشابہت نہیں

رہتی لیکن حدیث پاک کے الفاظ فی صور طیر خضر یعنی سبز پرندوں کی شکلوں میں پہلے احتمال کی تائید کرتے ہیں۔

اور شہیدوں کو یہ خصوصیت اس وجہ سے حاصل ہوئی کہ وہ عمل جس کی وجہ سے انہوں نے بارگاہ خداوندی میں قرب حاصل کیا یہی موت اور جسم سے روح کا تعلق ختم ہونا تھا۔ جب اللہ تعالیٰ کی حکمت تقاضا کرتی ہے کہ ہر عمل کا بدلہ اس عمل کی صورت کے مناسب ہوتا ہے تو ان کی ارواح کو جسموں سے جدا ہونے کے بعد دوسرے جسموں کے ساتھ متعلق کر دیا گیا تاکہ یہ تعلق اس تعلق کا عوض ہو جائے جو کہ منقطع ہوا۔ پس عالم برزخ میں شہیدوں کی زندگی جزا کے طور پر ہے نہ کہ ابتدا سے اور نہ ہی اعادۂ حیات، اور جزا کے لیے اگر تناسخ ثابت ہوتا تو ابتدائی حیات کے قبیل سے ہوتا۔ پس فرق واضح ہو گیا۔

اور انہیں تحقیقات سے وہ اشکال بھی زائل ہو گیا جو کہ یہاں وارد کرتے ہیں۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اس آیت اور آیت وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا میں جس زندگی کی تصریح کی گئی ہے اس سے کیا مراد ہے؟ اگر اس سے حقیقت حیات مراد ہے۔ یعنی روح کا ان بدنوں کے ساتھ تعلق جو کہ وہ رکھتے تھے تو واقع کے خلاف بھی ہے۔ اور شرع کے بھی۔ اس لیے کہ شہداء کے حق میں بھی موت کا حکم کیا گیا ہے۔ اور ان مردوں کے احکام جاری کیے گئے جیسے وراثت کی تقسیم، وصیتوں کو جاری کرنا، منکوحہ کی عدت، نکاح ختم ہونا اور دفن وغیرہ، اور اگر مراد یہ ہے کہ ان کی ارواح اپنے شعور اور ادراک کے ساتھ باقی ہیں۔ اور قسم قسم کے ثواب سے مسرور اور خوش۔ تو یہ معنی شہیدوں کے ساتھ خاص نہیں ہے۔ بلکہ نجات پانے والے سب لوگوں کا یہی حکم ہے۔ اور صرف روح کا ادراک و شعور کے ساتھ باقی رہنا تو ہر مومن اور ہر کافر اور ہر صالح اور ہر فاسق کے حق میں عام ہے۔

اور اس کا جواب یہ ہے کہ شہیدوں کی زندگی ان لذتوں کو پوری طرح حاصل کرنے کے لیے جو کہ جسمانی آلات پر موقوف ہیں جسموں کے ساتھ ارواح کے متعلق ہونے کے معنی میں ہے نہ کہ سابقہ اجسام کے ساتھ ارواح کا متعلق ہونا اور نہ ہی ادراک و شعور کے ساتھ روح کا باقی رہنا، اور یہ زندگی، جزائی زندگی ہے کہ انہیں ان کے عمل کا ثواب اس

صورت میں دیا گیا ہے۔ پس شہیدوں کی خصوصیت ظاہر ہوگئی۔

اور جب ارشاد فرمایا گیا کہ ذکر و شکر کی ادیگی اور اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی ناشکری ترک کرنے میں صبر اور نماز کے ساتھ مدد مانگو۔ اور وہ لوگ جو کہ صبر کو انتہائی مرتبوں تک پہنچا کر تمہاری نظر سے غائب ہو گئے۔ اور اس جہان سے گزر گئے مردہ نہ کہو۔ اب فرمایا جارہا ہے کہ اس طرح خیال نہ کرنا کہ ہم تمہیں فضول چھوڑیں گے۔ اور تمہیں ذکر، شکر اور ترک کفران نعمت الٰہی بغیر کسی مشقت کے میسر ہوگا۔ بلکہ ہم تمہارے لیے ان عبادات کی رکاوٹیں بھیجیں گے، اور تمہارے صبر کے جوہر کو امتحان کی کسوٹی پر پرکھیں گے تاکہ ہم ظاہر کریں کہ ذکر، شکر اور ترک کفران نعمت کی رکاوٹوں کے باوجود صبر کرتے ہو یا نہیں۔

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ اور ہم تمہیں ضرور آزمائیں گے۔ لیکن اس حد تک نہیں کہ طاقت کو صبر سے تنہا کر دے۔ اور آزمائش کی حد سے نکل کر عاجز کرنے اور تکلیف مالایطاق تک پہنچ جائے بلکہ بِشَیْءٍ تھوڑا سا کہ اسے برداشت کر سکو۔ مِنَ الْخَوْفِ دشمنوں کے خوف سے۔ تاکہ دشمنوں کی ایذاء کے خطرے کے باوجود دین اسلام پر تمہارا صبر آزمایا جا سکے، اور یہ امتحان ہجرت کے بعد شروع ہوا جبکہ اپنے گھربار کو چھوڑ کر نکل آئے اور اپنے ان قریبیوں اور رشتے داروں سے دور ہو گئے جن سے امداد اور امن کی توقع ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ مسلمانوں کو مدینہ عالیہ سے نکلنا دشوار ہو گیا۔ قبائل عرب میں سے ہر قبیلہ انہیں ستانے کے درپے ہو گیا۔ جو یہودی مدینہ شریف کے گرد و پیش اسکونت پذیر تھے ان کی دشمنی اور انہیں ستانے پر کمربستہ ہو گئے۔ اور انتہائی خطرہ جنگ احزاب میں رونما ہوا۔ حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ نے سورۂ احزاب میں ان کے اس حالت کی حکایت فرمائی کہ هنالك ابتلى المؤمنون وزلزلوا زلزالًا شديدًا، اور یہ دشمنی اور عداوت صرف اسلام کی وجہ سے تھی۔ اور کچھ نہیں تھا۔

نیز تمہاری آزمائش کروں گا قدرے وَالْجُوْعِ اور بھوک سے اس لیے کہ کفار کے خوف کی وجہ سے تمہیں سفر، نوکری اور کمائی کے اور اسباب ممکن نہ ہوں گے، اور تم میں سے بعض نے جو کچھ بچا رکھا ہوگا جنگ، لڑائی، اسباب جہاد حاصل کرنے اور اس سفر کے

اخراجات میں صرف ہو جائے گا۔ اور یہ صورت بھی ابتدائے اسلام میں ہجرت کے بعد رونما ہوئی۔ یہاں تک کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھوک کے غلبہ کی وجہ سے بنفس نفیس شکم مبارک پر پتھر باندھتے، اور حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ جو کہ مال داری میں مشہور تھے کی یہ حالت ہوگئی کہ ایک دن حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھوک کی شدت کی وجہ سے بیتاب ہو کر اپنے دولت خانہ سے باہر تشریف لائے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے ملاقات ہوئی انہوں نے عرض کی کہ یارسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)! کیا وجہ ہے کہ آپ گھر سے بے وقت باہر تشریف لائے ہیں، آپ نے فرمایا بھوک کی وجہ سے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے عرض کی کہ اللہ تعالیٰ کی قسم میں بھی بھوک کی وجہ سے باہر آیا ہوں۔ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی اضطراری بھوک کا یہ حال تھا جو کہ روزی نہ ملنے کی وجہ سے تھی۔

رہی اختیار بھوک جو کہ روزہ سے عبارت ہے تو وہ بھی ہجرت کے دوسرے سال میں فرض ہوا، اور رسول کریم علیہ السلام کی زبان پاک سے اس عبادت کے بے شمار فضائل وارد ہوئے، اور صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے جو کہ ثواب کے مشتاق تھے روزے کا اہتمام اور کثرت کرنے میں کافی مبالغہ کیا۔

وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ نیز اور ہم تمہارے مال کم کر کے تمہیں آزمائیں گے، کہ اس کا اکثر حصہ جہاد میں خرچ ہوگا۔ اور اس کا کچھ حصہ کفار کی لوٹ کھسوٹ میں چلا جائے گا۔ اور جو باقی بچے گا وہ زکوٰۃ، صدقہ فطر اور مہمانوں اور یتیموں کے حقوق واجب کرنے اور اپنے اور اپنے اہل وعیال پر محتاجوں کے ایثار کی ذمہ داری سونپنے کی وجہ سے دمبدم کم ہوتا رہے گا۔ اور کفار کی فوج آنے کی وجہ سے کھیتوں کی بربادی اس کے علاوہ ہوگی۔

وَالْاَنْفُسِ اور تمہاری جانوں کو کم کر کے اس لیے کہ ہر گھر کے قریبی اور رشتہ دار جنگوں میں پے در پے قتل کیے جائیں گے۔ اور سفر جہاد کی مشقت میں بھوک، پیاس، صدموں اور مصیبتوں کی وجہ سے ضائع ہو جائیں گے۔ یہاں تک کہ ہر سال مہاجرین اور انصار میں واضح طور پر کمی واقع ہوتی تھی۔ غزوۂ احد میں انصار میں سے ستر (۷۰) افراد شہید ہو گئے،

اور بیرِ معونہ کی جنگ میں بھی ان میں سے ستر (۷۰) آدمی شہید ہو گئے، اور احد کی ظاہری ہزیمت کے بعد مدینہ عالیہ میں کوئی گھر ایسا نہ تھا جہاں سے رونے کی آواز نہ آتی ہو، اور جو ان پے در پے جنگوں میں زندہ باقی رہ گئے تھے انہیں کسی کو ہاتھ پاؤں ٹوٹنے، کسی کو نابینا اور بہرہ ہونے اور دیگر آفتوں کی وجہ سے جسم میں نقصان پہنچا تھا، اور حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ کا ہاتھ مبارک شل ہو گیا تھا، اور اسی طرح دوسرے بھی تھے۔

وَالثَّمَرَاتِ اور دل و جگر کے میوے کم کر کے جو کہ اولاد اور اطفال سے عبارت ہے۔ اور ان کا فوت ہونا آدمی پر جان ضائع ہونے اور کسی عضو کے تلف ہونے سے زیادہ دشوار ہوتا ہے۔ اور اسی لیے اس مصیبت کو تمام مصیبتوں کے بعد ذکر کیا گیا، اور حدیث صحیح میں وارد ہے کہ جب کسی مسلمان کا بیٹا فوت ہو جاتا ہے اللہ تعالیٰ روحیں قبض کرنے والے فرشتوں سے فرماتا ہے کہ کیا تم نے میرے بندے کے بیٹے کی روح قبض کر لی؟ وہ عرض کرتے ہیں ہاں، پھر فرماتا ہے کہ کیا تم نے اس کے دل اور جان کا میوہ قبض کر لیا؟ وہ عرض کرتے ہیں ہاں، حق تعالیٰ فرماتا ہے کہ پھر میرے اس بندے نے کیا کہا؟ وہ عرض کرتے ہیں کہ اس نے تیری حمد کی اور انا للہ وانا الیہ راجعون کہا۔ بارگاہ خداوندی سے حکم ہوتا ہے کہ میرے بندے کے لیے جنت میں ایک گھر بناؤ اور اس کا بیت الحمد نام رکھو۔

اور اگر پھلوں سے مراد درختوں ک پھل لیے جائیں تو تکرار لازم آتی ہے۔ اس لیے کہ وہ تو مال کے نقصان میں داخل ہے۔ نیز اسے مصیبت جان کے بعد لانا اتنا موزوں نہیں رہتا، اور حضرت امام شافعی رحمتہ اللہ علیہ سے منقول ہے کہ آپ فرماتے تھے خوف سے مراد اللہ کا خوف، اور بھوک سے رمضان المبارک کے روزے، اور مالوں کے نقصان سے زکوٰۃ، صدقات اور جانوں کے نقصان سے بیماریاں اور اللہ تعالیٰ کی راہ میں شہید ہونا، اور پھلوں کی کمی سے مراد اولاد کا فوت ہونا مراد ہے۔

مذکورہ مصیبتوں کی ترتیب ذکری کی وجہ

اور ان مصیبتوں کے ذکر کی اس ترتیب کی وجہ یہ ہے کہ پہلے خوف کو لایا گیا اس لیے کہ یہ زندگی کی چاشنی کو فوراً برباد کر دیتا ہے۔ پھر بھوک کو کہ اس میں ہلاک ہونے کی توقع

ہوتی ہے۔ پھر مالوں کا نقصان جو کہ بھوک تک پہنچتا ہے۔ اور مالی نقصان سے زیادہ تر خوف بھوک لاحق ہونے کا ہوتا ہے۔ پھر جہاد کو لایا گیا جو کہ غالب طور پر قتل تک پہنچاتا ہے۔ پھر میووں اور اولادوں کے نقصان کو لایا گیا جو کہ موت کے معنوں میں بلکہ موت سے بھی اونچا ہے۔ کیونکہ آدمی موت کے بعد اپنی نسل کے باقی رہنے کی وجہ سے اپنے آپ کو باقی سمجھتا ہے۔ اور جب اولاد نہ رہی تو اس کی پوری طرح موت واقع ہوگئی اگرچہ ابھی خود زندہ رہے۔

اور جب تم ان آزمائشوں میں صبر کیا اور کامل طور پر عہدہ برآ ہوگئے تمہیں حق تعالیٰ کی خاص معیت نصیب ہوگئی۔ تو اے رسول علیہ السلام! ان کے صبر کے امتحان کے بعد ان کے حال سے خاموشی اختیار نہ فرمائیں بلکہ ان کی قدردانی فرمائیں۔

وَبَشِّرِ الصَّابِرِيْنَ اور ان مصیبتوں پر صبر کرنے والوں کو بشارت دیں کہ خدا تعالیٰ ان کے ہمراہ ہے۔ خصوصاً اَلَّذِيْنَ ان صبر کرنے والوں کو جو صرف جزع وفزع چھوڑنے اور شکایت نہ کرنے پر ہی اکتفاء نہیں کرتے۔ بلکہ ہر مصیبت کو اللہ تعالیٰ کے ذکر اور شکر کا وسیلہ بناتے ہیں۔ اور رضائے الٰہی کو حاصل کرنے کا باعث سمجھتے ہیں۔ یہاں تک کہ

اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ جب انہیں کسی قسم کی مصیبت پہنچتی ہے جیسی بھی ہو چھوٹی ہو یا بڑی ان کے نزدیک ایسا ہے کہ گویا نماز کا وقت آگیا، اور وہ اس مصیبت کی وجہ سے خدا تعالیٰ سے ہرگز غافل نہیں ہوتے بلکہ اس کی یاد میں مشغول ہوکر

اللہ تعالیٰ کی ملکیت کے تقاضے

قَالُوْا کہتے ہیں کہ ہمیں اس مصیبت کی وجہ سے بے چین کیوں ہونا چاہیے؟ اس لیے کہ اِنَّا تحقیق ہم جو کہ اپنے نفس کے مالک نہیں ہیں کہ مصیبتوں سے اپنی حفاظت ہمارے ذمہ ہو اور ہم اس فکر میں پڑیں۔ بلکہ ہم سب مملوک اور بندے ہیں لِلّٰهِ، اللہ تعالیٰ کے لیے اور جو کسی کا مملوک ہوتا ہے اس کی حفاظت اس کے مالک اور خداوند کے ذمہ ہوتی ہے۔ اور جب ہمارا خداوند سب جہانوں پر غالب ہے تو ہمیں کسی چیز سے ڈرنا نہیں چاہیے خواہ دشمن، ظالم، کفار اور اشرار ہوں۔ خواہ ہلاک کرنے والے جانور جیسے شیر، چیتا، بچھو اور سانپ، خواہ

فاسد اخلاط۔ نیز جب ہم خدا تعالیٰ کے بندے ہیں۔ اور ہر مملوک کا رزق اس کے مالک کے ذمہ ہے۔ اور ہمارا مالک صاحب خزائن ہے تو ہمیں بھوک سے کیوں ڈرنا چاہیے۔ اگر اس نے کسی وقت کسی حکمت اور مصلحت کی وجہ سے ہمیں غذا نہ دی جیسا کہ شفقت کرنے والا طبیب جو کہ ہیضہ کے مریض کو غذا سے روک دیتا ہے لازماً دوسرے وقت میں خوراک عطا فرمائے گا۔ اور اسی طرح ہماری جان، مال اور اولاد اسی کی ملک ہے۔ اور ہمارے ہاتھوں میں عاریتاً ہے۔ اگر مالک عاریت واپس لے لے تو بے جا کیوں ہونا چاہیے۔ خصوصاً جب کہ ہمیں محض اپنے فضل وکرم سے ان مصیبتوں پر ایک عظیم عوض اور ثواب کا وعدہ فرمایا ہے۔

وَاِنَّآ اِلَیۡهِ رٰجِعُوۡنَ اور تحقیق ہم اسی کی طرف لوٹیں گے۔ تو اس نے ہمارے ساتھ جو وعدہ فرمایا ہے عطا فرمائے گا۔ اور اس کی عطا ان نقصانات سے کہیں زیادہ ہوگی۔ نیز جب ہم تمام مملوک اور بندے ہیں، تو ہمارے پاس جو کچھ ہے یہ بھی اسی کی بخشش اور عطا ہے۔ وہ عطا کیا ہوا واپس لے سکتا ہے۔ اور پھر دے سکتا ہے۔ اور جو نہیں دیا نئے سرے سے انعام فرما سکتا ہے۔ تو ہمیں ان نقصانات سے کیا غم۔ اور اگر چند روز کی جدائی کی وجہ سے ہمیں کوئی تکلیف حاصل ہو تو بھی کسی غم اور ملال کا مقام نہیں۔ اس لیے کہ سب کا لوٹنا اسی کی طرف ہے وہ چند دن کی جدائی بھی دائمی وصال اور ہمیشہ کی صحبت کے ساتھ بدل جائے گی۔

اور حدیث پاک میں وارد ہے کہ ایک دفعہ ہوا کہ جھونکے سے چراغ بجھ گیا تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَیۡهِ رٰجِعُوۡنَ فرمایا۔ حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے عرض کی یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)! کیا یہ بھی کوئی مصیبت تھی؟ فرمایا ہاں، ہر وہ چیز جس سے آدمی کے باطن میں ایک قلق اور اس کے دل میں اس کے متعلق ایک پریشانی ہو مصیبت ہے۔ نیز حدیث شریف میں وارد ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ کوئی مصیبت پہنچے تو وہ جزع وفزع کے مقام پر یہ کلمہ بار بار کہے حق سبحانہ وتعالیٰ اسے اس مصیبت کا اچھا عوض عنایت فرماتا ہے۔ اور اس مصیبت کا اجر وثواب اس کے حق میں ذخیرہ ہوتا ہے۔

انا للہ وانا الیہ راجعون کہنے کے مواقع اور برکات

حضرت ام المومنین سلمہ رضی اللہ عنہا فرماتی تھیں کہ جب ابوسلمہ رضی اللہ عنہ جو کہ آپ کے پہلے شوہر اور بہت بزرگ اور نیک انسان تھے کی وفات ہوئی مجھے یہ حدیث پاک یاد آ گئی۔ میں نے اپنے دل میں سوچا کہ اس بزرگ شخصیت کا اچھا عوض کیا ہوگا؟ لیکن میں نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فرمان کے مطابق یہ کلمہ کہا۔ حق تعالیٰ نے مجھے ان کے عوض حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عطا فرمائے کہ میں آپ کے نکاح سے مشرف ہوئی۔

اور طبرانی، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت سے لائے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ میری اُمت کو ایک ایسی چیز عطا فرمائی گئی ہے کہ پہلی اُمتوں میں سے کسی کو عطا نہ ہوئی، اور وہ کلمہ استرجاع یعنی اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ہے کہ مصیبت کے وقت کہنا چاہیے، اور امام بیہقی نے شعب الایمان میں حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ سے روایت کی کہ یہ کلمہ سابقہ انبیاء علیہم السلام کو عطا نہیں فرمایا گیا۔ اُمتیوں کا کیا مقام، اس کی دلیل یہ ہے کہ حضرت یعقوب علیٰ نبینا وعلیہ السلام والتحیۃ نے حضرت یوسف علیہ السلام کے انتہائی غم کے وقت یہی کہا یَا اَسَفَا عَلٰی یُوْسُفَ، اور اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ نہ کہا، اور بیہقی، حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت کے ساتھ لائے کہ جس میں چار چیزیں جمع ہو جائیں اللہ تعالیٰ اس کے لیے جنت میں گھر بناتا ہے: پہلی چیز یہ کہ اپنے کاروبار میں خدا تعالیٰ کے حضور التجاء کرے: دوسری چیز ہر مصیبت کے وقت انا للہ وانا الیہ راجعون کہے: تیسری چیز جب دربار خداوندی سے اسے کوئی نعمت ملے الحمد للہ کہے: چوتھی چیز یہ کہ جب اس سے کوئی گناہ سرزد ہو استغفر اللہ کہے۔

اور امام احمد، ابن ماجہ اور بیہقی، حضرت امام حسین علیہ السلام کی روایت کے ساتھ لائے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ اگر کسی مسلمان کو کبھی کوئی مصیبت آئی ہو ایک مدت کے بعد وہ مصیبت یاد آ جائے۔ اور نئے سرے سے اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ کہے اللہ تعالیٰ اسے اس مصیبت کا تازہ اجر عطا فرماتا ہے۔ گویا کہ وہ مصیبت اسے آج ہی پہنچی ہے۔ اور حکیم ترمذی نے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کی روایت

کے ساتھ پرانی نعمت اور تازہ حمد کے بارے میں اسی قسم کی روایت فرمائی، اور طبرانی، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت کے ساتھ لائے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے تھے کہ موت کی وجہ سے بے قراری اور گھبراہٹ انسان کی جبلت ہے تو جب تم میں سے کسی کے پاس اپنے مسلمان بھائی کی وفات کی خبر پہنچے تو اسے چاہیے کہ اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ وَاِنَّا اِلٰى رَبِّنَا لَمُنْقَلِبُوْنَ کہے تا کہ اپنی موت بھی نظر میں آ جائے۔ اور کیا ہی اچھا کہا گیا کہ اے جامی یہ بہتر ہے کہ اس مرحلہ میں تو یہ عادت اختیار کرے کہ دوسروں کی موت سے اپنی موت کے متعلق غور کرے۔

نیز حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ لائے ہیں کہ ایک دفعہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاپوش مبارک کا چمڑے کا تسمہ ٹوٹ گیا تو آپ نے اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ پڑھا، اور فرمایا کہ یہ بھی ایک مصیبت ہے۔ اور بزار اور بیہقی، حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت کے ساتھ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے، رائے ہیں کہ جب تمہارے جوتے کا تسمہ ٹوٹ جائے تو چاہیے کہ اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ پڑھو، اور اسے ایک مصیبت سمجھو۔ اور اس پر ثواب کی امید رکھو۔ بلکہ ابن ابی الدنیا اور دیلمی نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک شخص کو دیکھا کہ اس نے چمڑے کے تسمہ کی جگہ اپنے جوتے میں لوہے کی میخ لگائی ہوئی ہے آپ نے فرمایا تو بہت لمبی آرزو والا معلوم ہوتا ہے۔ اور علاوہ ازیں چمڑے کے تسمہ کے ٹوٹنے کے ثواب سے محروم رہتا ہے۔ اگر تیرے جوتے کا چمڑے میں تسمہ ٹوٹ جائے۔ اور تو اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ کہے تو اپنے پروردگار کی طرف سے برکتیں، رحمتیں اور ہدایت پائے۔ اور تیرے حق میں اس کی یہ عنایت دنیا و مافیہا سے بہتر ہو۔

اور دیلمی، حضرت ام المومنین عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت کے ساتھ لائے کہ ایک دفعہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کہیں سے تشریف لائے۔ اور آپ کے انگوٹھے مبارک میں کانٹا چبھ گیا تھا۔ آپ بار بار استرجاع فرمار ہے تھے۔ اور اس جگہ کو اپنے ہاتھ سے مل رہے تھے۔ جب میں نے آپ کا استرجاع سنا تو نزدیک ہوئی اور میں نے دیکھا کہ اس کانٹے کا ہلکا سا اثر انگوٹھے کی جلد میں رہ گیا ہے۔ میں بہت ہنسی اور عرض کی کہ میرے ماں باپ آپ

پر فدا ہوں اس نامعلوم کانٹے سے اس قدر استرجاع؟ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تبسم فرمایا۔ اور میرے کندھے پر ہاتھ مارا اور فرمایا کہ اے عائشہ جب اللہ تعالیٰ چاہتا ہے بڑے کو چھوٹا اور چھوٹے کو بڑا کر دیتا ہے۔ آسان مصیبت سے پر حذر رہو۔

اور حضرت سعید بن المسیب اور حضرت حسن بصری رضی اللہ عنہما کے معمول میں سے تھا کہ ان دونوں بزرگوں کی جب نماز باجماعت رہ جاتی تو بلند آواز کے ساتھ استرجاع کرتے تھے۔ یہاں تک کہ لوگ اظہار افسوس کے لیے آتے تھے۔ المختصر اس قسم کے صبر کرنے والے جو کہ مصیبت کو ذکر، شکر اور رب العالمین کے حضور درجۂ قرب کا وسیلہ سمجھتے ہیں۔ اور اس مصیبت کو نماز کا وقت آنے کی طرح جانتے ہیں۔

اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ وہ لوگ ان پر نازل ہوتی ہیں صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ ان کے پروردگار کی طرف سے خاص تازہ عنایات کہ ان عنایات کی وجہ سے آخر میں نافرمانی کا خوف نہیں رہتا۔ اور ان عنایات کے ہوتے ہوئے کوئی گناہ اثر نہیں کرتا۔ اور حقیقت میں صلوٰتِ اللہ تعالیٰ کی انہیں خاص عنایات کا نام ہے۔ جو کہ معصیت کے نقصان سے مطلقاً بے خوف کر دیتی ہیں۔ اور اسی لیے بنیادی طور پر حضرات انبیاء علیہم السلام کے ساتھ مخصوص ہیں، اور ان لوگوں کو بھی عنایت خصوصی کا فیض عطا کرنے میں انبیاء علیہم السلام کی طرح کر دیا گیا ہے۔ فرق یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے حق میں وہ عنایت خصوصی گناہوں سے معصوم ہونے کا موجب ہوتی ہے۔ اور ان سے کوئی گناہ صادر نہیں ہوتا جبکہ ان لوگوں کے حق میں ان کی استعداد کم ہونے کی وجہ سے اسی قدر اثر کرتی ہے کہ کیے ہوئے۔ اور نہ کیے ہوئے گناہ برابر ہوتے ہیں۔

اور اسی لیے ترمذی، ابن ماجہ اور دوسری صحاح میں وارد ہے کہ جس کے تین نابالغ بچے فوت ہو گئے ہوں اسے جنت کی کنجی اور دوزخ کی آگ سے مضبوط ڈھال حاصل ہو گئی۔ اور جب بعض مردوں اور بعض خواتین نے پوچھا کہ یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اگر کسی کے دو بچے یا ایک بچہ فوت ہوا ہو اسے یہ مرتبہ مل جاتا ہے؟ تو آپ نے فرمایا ہاں۔ خدا تعالیٰ کی قسم نامکمل گرنے والا بچہ بھی اپنی والدہ کو اپنی ناف کے ساتھ کھینچ کر جنت

میں لے جائے گا۔ اگر اس نے بے صبری نہ کی ہو اور اللہ تعالیٰ سے ثواب کی امید رکھی ہو۔

اور امام مالک موطأ میں اور بیہقی شعب الایمان میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت کے ساتھ لائے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے تھے کہ ایک ایمان والے شخص کو جان، مال اور اہل وعیال میں پے در پے مصیبتیں آتی ہیں۔ یہاں تک کہ قیامت کے دن جب بارگاہ خداوندی میں حاضر ہوگا تو اس پر کوئی گناہ نہیں رہے گا۔

اور امام احمد، نسائی، بیہقی اور حاکم قرۃ مزنی کی روایت کے ساتھ لائے ہیں کہ ایک شخص حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی خدمت میں حاضر ہوتا تھا۔ اور اس کے ہمراہ اس کا لڑکا ہوتا تھا۔ ایک دن حضور علیہ السلام نے اس سے پوچھا کہ معلوم ہوتا ہے کہ تجھے اس بیٹے سے بہت محبت ہے کہ اپنے سے جدا نہیں کرتا۔ اس نے عرض کی یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)! جس قدر اللہ تعالیٰ آپ کو درست رکھتا ہے مجھے اس بیٹے سے محبت ہے۔

(اقول وباللہ التوفیق - یہ ظاہری اور نسبی اعتبار سے ہے۔ جو کہ ایک جبلی مجبوری ہے۔ ایمانی نکتہ نظر سے حضور علیہ السلام کے ساتھ جب تک ساری کائنات سے زیادہ محبت نہیں ہوگی ایمان نہیں ملتا لَايُؤْمِنُ اَحَدُكُمْ حَتّٰى اَكُوْنَ اَحَبَّ اِلَيْهِ مِنْ وَّالِدِهٖ وَلَدِهٖ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ۔ ورنہ حضور علیہ السلام اس کی اصلاح فرماتے۔ آپ کی خاموشی دلالت کرتی ہے کہ یہ محبت ایسی ہے۔ جو کہ ایمان کے لیے مخل نہیں۔ اور وہ نسبی اعتبار سے ہے۔ محمد محفوظ الحق غفرلہٗ) چند دنوں کے بعد حضور علیہ السلام نے اس شخص کو مجلس میں گم پایا، اور لوگوں سے اس کی احوال پرسی فرمائی۔ عرض کی گئی کہ اس کا جو بیٹا اس کے ہمراہ ہوتا تھا فوت ہو گیا۔ اور اسے شدید رنج وغم ہوا۔ حضور علیہ السلام اس کی ملاقات کے لیے تشریف لے گئے، اور اسے فرمایا کہ قیامت کے دن تو جنت کے جس دروازے پر جائے گا وہ اسی سمت سے دوڑتا ہوا آ کر تیرے لیے وہ دروازہ کھول دے گا۔ اور اس واقعہ کی بعض روایات میں یہ بھی وارد ہے کہ وہ تیرے لیے جہنم کے ہر ہر دروازے پر کھڑا ہوگا تا کہ تجھے اس میں آنے سے روکے۔ اسے ابن ابی الدنیا نے کتاب العزی میں اسی طرح ذکر فرمایا ہ

اور بیہقی، حضرت انس رضی اللہ عنہ سے اور حاکم صحیح سند کے ساتھ بریدہ اسلمی رضی اللہ

عنہ سے لائے کہ ایک دن ہم حضور علیہ السلام کی خدمت میں حاضر تھے کہ اچانک کسی نے خبر دی کہ انصار کی فلاں عورت کا ایک بیٹا فوت ہوگیا۔ وہ بہت بے چینی اور گھبراہٹ میں مبتلا ہے۔ حضور علیہ السلام اُٹھے اور صحابہ کرام (رضی اللہ عنہم) بھی آپ کے ہمراہ روانہ ہوئے جب اس خاتون کے گھر پہنچے اس سے تعزیت فرمائی اور تسلی دی اور ارشاد فرمایا کہ تو اس قدر بے قراری کیوں کرتی ہے۔ اس نے عرض کی کہ میں جزع کیوں نہ کروں کیونکہ میرا کوئی بیٹا نہیں بچتا۔ میں تو رقوب ہوں یعنی ایسی بے نصیب جس کا کوئی بچہ نہیں بچتا۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا یہ غلط ہے۔ رقوب وہ ہے۔ جس کی سب اولاد زندہ ہو ان میں سے کوئی بھی اس کے لیے آخرت کا ذخیرہ نہ بنا ہو۔ جان لے کہ جس مسلمان عورت کے تین بچے فوت ہو جائیں۔ اور وہ ان کی وجہ سے اجر کی طالب ہو اس کے لیے جنت واجب ہو جاتی ہے۔ حضرت امیر المومنین عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کی یارسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)! اگر دو بچے فوت ہوں۔ فرمایا دو بچوں کا بھی یہی حکم ہے۔ پھر ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سید القراء نے عرض کی کہ میرا ایک بیٹا گزرا ہے۔ فرمایا ایک بیٹا بھی یہی حکم رکھتا ہے۔ لیکن چاہیے کہ تو نے معصیت کے صدمہ کی ابتداہی سے صبر کیا ہو۔

اور ان خاص عنایات کے باوجود کہ صبر کرنے والوں کو معصیت اور گناہ کے خوف سے امن میں کر دیا۔ اور انبیاء علیہم السلام کی طرح مشرف فرمایا انہیں عام عنایات بھی عطا فرمائی جائیں گی جو کہ آخرت میں قسم قسم کے ثواب کا موجب ہیں۔ چنانچہ فرمایا **وَرَحْمَةٌ**

اور ان پر ان کی جان اور مال تلف ہونے کے بدلے اللہ تعالیٰ کی مہربانی ہے۔ جس طرح کہ صبر کرنے اور جزع وفزع نہ کرنے پر خاص عنایات تھیں۔

وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُونَ اور وہ لوگ وہی ہیں راہ پانے والے۔ عین مصیبت کی حالت میں جو کہ بارگاہ خداوندی سے دوری کا مضبوط سبب تھی۔ اور شکایت اور ناراضگی کا دروازہ کھولنے والی۔ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے قرب اور اس کی رضامندی حاصل کرنے کے لیے ایک راہ کھول لی، اور انہوں نے دوری اور محرومی کے اس سبب کو عین قرب ووصال کا سبب بنالیا۔ اور راہ پانے کا کمال یہی ہے کہ ہر طرف سے اپنے مقصد کا سراغ پیدا کریں،

اور ہر گوشے سے اپنا مدعا حاصل کریں۔ جیسا کہ حدیث پاک میں وارد ہے کہ مرد مومن کا حال عجیب ہے کہ اس کا ہر کام خیر ہے۔ اگر اسے اچھی حالت میسر ہو تو اللہ تعالیٰ کی حمد کرتا ہے۔ اور اس وسیلے سے قرب خداوندی اور اجر و ثواب کا مستحق بنتا ہے۔ اور اگر اسے پریشان کن حالت کا سامنا ہو تو استرجاع یعنی اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ کہتا ہے۔ اور صبر کرتا ہے۔ اور اس راستے کے ذریعے سے نزدیک ہو جاتا ہے۔ اور اجر و ثواب کا مستحق ہوتا ہے۔ گویا اس کے لیے ہر طرف سے قرب کی راہ کھول دی گئی ہے۔

نکتہ

ہم یہاں آ گئے کہ صلوات میں جمع کا صیغہ اور رحمت میں مفرد کا صیغہ اختیار کرنے میں کیا نکتہ ہے؟ اس کا نکتہ یہ ہے کہ صلوٰۃ حق تعالیٰ کی خاص عنایات سے عبارت ہے کہ اس قسم کے صبر کرنے والوں پر چند وجہ سے عنایت ہوتی ہے۔ پہلی وجہ یہ ہے کہ جب وہ مصیبت کے وقت یہ عمل کرتے ہیں تو دوسرے بھی ان کی پیروی کرتے ہوئے یہی طریقہ اختیار کرتے ہیں تو انہیں اس راہ سے کارخانہ نبوت کی برکات سے ایک قسم کا حصہ مل جاتا ہے کہ وہ اچھی رسم کا باعث ہوئے، اور لوگوں نے ان کی اقتداء میں قرب کا راستہ پایا۔

دوسری وجہ یہ کہ دشمن اور کسی کی خرابی پر خوش ہونے والے جو کہ زیادہ تر جن وانس کے شیطان، حاسد اور منافق ہوتے ہیں ان سے یہ کلمہ سن کر ذلیل اور نامراد ہو جاتے ہیں۔ اور وسوسہ اور کھیل مذاق سے باز رہتے ہیں۔ اور اس راہ سے بھی انہیں منصب رسالت کی برکت حاصل ہو جاتی ہے۔ کیونکہ رسل علیہم السلام کا ہمیشہ کا کام شیاطین کو دھتکارنا اور کفار اور منافقوں کو جلانا ہے۔ اور حقیقت میں جہاد کی اصل اور خلاصہ یہی ہے۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ ان کے عزم کی پختگی اور اللہ تعالیٰ کے دین میں ان کی جدوجہد اور قضا پر راضی رہنے کا ذوق اعلیٰ مقام تک پہنچتا ہے۔ اور وہ بھی نبوت کی میراث ہے۔ تو گویا انہوں نے تین راہوں سے اس درود کا فیض پایا جو کہ انبیاء علیہم السلام کے ساتھ مخصوص ہے۔ اور ان وجوہ کے متعدد ہونے کی طرف اشارہ کرنے کے لیے صلوات کے لفظ کو بصیغۂ جمع لایا گیا۔ بہ خلاف لفظ رحمت کے کہ اس کی گردشیں تمام اہل طاعت پر عام ہے۔ اور اس

میں کوئی اختلاف نہیں، جو بندہ کہ خدا تعالیٰ کے حکم کی اطاعت جس طرح بھی بجالائے اس کا مستحق ہو جاتا ہے۔

اور صحیح حدیث پاک میں حضرت امیر المومنین عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ سے آیا کہ آپ اس آیت کی تفسیر میں فرماتے تھے کہ نعمت العدلان وِ نعمت العلاوۃ یعنی اس آیت میں تین چیزوں کا وعدہ فرمایا گیا۔ صلوات اور رحمت جو کہ ایک دوسرے کے ساتھ ملی ہوئی ہیں۔ اور ہدایت اور راہ پانا جو کہ ان کے علاوہ ہے۔ اور حضرت امیر المومنین رضی اللہ عنہ کی اس تفسیر سے غرض یہ ہے کہ صلوات اور رحمت اس جماعت کی کسبی ہیں کہ انہوں نے صبر، استقامت کے زور اور استرجاع کے معنی کا لحاظ کر کے اپنے لیے انہیں ثابت کیا ہے۔ اور ہدایت پانا محض وہبی ہے ان کے عمل پر موقوف جذب کے قبیلے سے نہیں ہے۔ اور لغت میں عدلین اونٹ کے ان دو وزنوں کو کہتے ہیں جنہیں باہم برابر کر کے پالان کے دونوں طرف ڈال دیتے ہیں۔ اور اس کا علاوہ چھوٹا سا بوجھ ہے جو ان دونوں کے اوپر رکھ دیتے ہیں۔ اور آیت ما اصاب من مصیبۃ الا باذن اللّٰہِ ومن یومن باللّٰہِ یھد قلبہ میں اسی مضمون کی طرف اشارہ ہے۔ یعنی جو شخص مصیبت کے وقت اپنے ایمان کے تقاضے پر قائم رہا حق تعالیٰ اس پر معرفت کی ایک راہ کھول دیتا ہے۔ اور اسے اپنی طرف کھینچ لیتا ہے۔

رضا بالقضا کے دو طریقے

اسی لیے محققین نے فرمایا ہے کہ رضا بالقضا دو طریقوں سے ہے، صرف اور جذب۔ صرف یہ ہے کہ جب بھی آدمی کا دل کسی چیز کے ساتھ تعلق پیدا کرے۔ اور اس کا دل اس توجہ کے ساتھ کمال حاصل کرے حق تعالیٰ اس کے حق میں اس چیز کو تکلیف، غم اور ملال کا باعث کر دیتا ہے۔ جیسا کہ حضرت یعقوب علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کو جب حضرت یوسف علیہ السلام کے ساتھ خوب تعلق حاصل ہو گیا تو حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کو حسد پیدا کر دیا گیا۔ یہاں تک کہ انہوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کو حضرت یعقوب علیہ السلام سے جدا کر دیا، اور حضرت یعقوب علیہ السلام انتہائی دکھ، غم اور ملال

برداشت کرنے کے بعد ذکر حق کے لیے فارغ ہو گئے۔ اور اسی طرح حضرت آدم علیہ السلام کو جب جنت کے ساتھ حد سے زیادہ تعلق حاصل ہوا۔ تو شیطان کو مسلط کر دیا گیا۔ یہاں تک کہ آپ جنت سے باہر تشریف لائے۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنے قبائل اور کنبوں کے ساتھ جو کہ اہل مکہ تھے زیادہ تعلق پیدا ہوا تو انہیں حضور علیہ السلام کے بغض اور دشمنی پر کھڑا کر دیا گیا۔ یہاں تک کہ آپ نے وہاں سے ہجرت فرمائی۔ اور جب مدینہ منورہ میں ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی طرف پورے طور پر توجہ ہو گئی تو منافقوں کو اکسایا گیا۔ یہاں تک کہ انہوں نے بہتان کی جھوٹی تہمت سے اس محبت کی صفائی کو غبار آلود کر دیا۔ علیٰ ہذا القیاس اپنے تمام برگزیدہ بندوں کے ساتھ اسی قسم کے معاملات رونما ہوئے۔

اور جذب یہ ہے کہ آدمی کو اپنے خیال میں اس قدر مغلوب کر دیا جائے کہ اپنے آپ سے بھی بے خبر ہو جائے۔ دوسری نفسانی خواہشات کا تو مقام ہی کیا؟ جیسا کہ کمترین نوکر جو کہ بادشاہ کے حضور پہنچتا ہے۔ اور بادشاہ کی عظمت کے مشاہدہ میں مستغرق ہو کر اپنے آپ سے اور اپنی تمام لذتوں سے بے خبر ہو جاتا ہے۔ اور اس حالت میں رضا بالقضا کی حالت خود بخود حاصل ہو جاتی ہے۔ اور اس کی پہلی راہ کو جو کہ صرف ہے مشکل اور دشوار جانتا ہے۔ اور راہ جذب کو آسان اور ہموار سمجھتا ہے۔ اور اسی لیے کہا گیا ہے کہ اے صنم! اگر مجھے قلندر کی راہ دکھائے تو لائق ہے۔ کیونکہ میں نے پارسائی کی راہ ورسم کو دور اور طویل پایا۔

اور جب صابرین کے فضائل کے بیان سے فراغت ہوئی اب گواہی پیش کرنے کے طریقے پر فرمایا کہ اگر تمہیں ہماری اس خاص معیت کے بارے میں جو کہ ہم صبر کرنے والوں اور مصیبت میں مبتلا لوگوں کو عطا کرتے ہیں۔ اور ان پر اپنی صلوات اور رحمتیں نازل فرماتے ہیں۔ اور انہیں خلائق کے پیشوا اور انبیاء علیہم السلام کے فیض سے مشرف فرماتے ہیں اب بھی کسی قسم کی شک باقی ہو تو اپنی سمجھ کے مطابق اس مدعا کی دلیل سنو۔

صفا ومروہ کا محل وقوع ۔ تعارف اور فضیلت

إِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ تحقیق صفا اور مروہ۔ جو کہ کعبۂ معظمہ کے مقابل دو چھوٹی

پہاڑیاں ہیں اس کی مشرقی سمت میں جنوب کی طرف مائل صفا اور شمال کی طرف مائل مروہ، اور صفا ایک بڑے پہاڑ کی جڑ میں ہے۔ جسے ابوقبیس کہتے ہیں۔ اور مروہ قعیقعان کی آگے کو نکلی ہوئی چوٹی ہے۔ اور حجر اسود سے کوہ صفا تک دو سو باسٹھ (۲۶۲) گز اور اٹھارہ (۱۸) انگشت کا فاصلہ ہے۔ اور صفا سے مروہ تک سات سو ستر (۷۷۰) گز کا فاصلہ ہے۔ اور اصل میں یہ دونوں پہاڑیاں دوسرے پہاڑوں کی طرح تھیں کہ انہیں کوئی بزرگی اور فضیلت حاصل نہ تھی بلکہ بڑائی اور جوہر سنگ کی خوبی کے اعتبار سے دوسرے پہاڑوں کے مقابلہ میں کم تھیں لیکن صبر کرنے والوں اور خدا تعالیٰ کے فیصلے پر راضی رہنے والوں میں سے دو افراد جو کہ حضرت ہاجرہ رضی اللہ عنہا اور حضرت اسماعیل علیہ السلام ہیں ان دونوں کے متصل اس مقام پر جہاں اب چاہ زمزم ہے، اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کے حکم پر بلا اور خوف میں ڈال کر اُترے اور اس پتھریلے جنگل میں جہاں پانی تھا نہ گھاس، آدمی تھا نہ ساتھی اپنے آپ کو دشمنوں کے خوف اور چیرنے اور ڈسنے والے جانوروں کے خطرہ میں ڈالا، اور بھوک اور پیاس کو صرف حکم الٰہی کی فرماں برداری کے لیے جو کہ انہیں اس وقت کے رسول حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زبان سے پہنچا تھا برداشت کر کے سکونت اختیار فرمائی، اور حضرت ہاجرہ رضی اللہ عنہا کو اپنے بیٹے حضرت اسماعیل علیہ السلام کی وفات کا خوف بلکہ اس حالت میں اپنی جان کی ہلاکت کا خوف یقین کی طرح تھا۔ ان تمام مصیبتوں پر اللہ تعالیٰ کی رضا طلب کرتے ہوئے صبر اختیار کیا، اور جب حضرت اسماعیل علیہ السلام پیاس کی وجہ سے ہلاکت کے قریب ہوئے حضرت ہاجرہ رضی اللہ عنہا بے قرار ہو کر پہلے نزدیکی پہاڑ صفا پر آئیں۔ پھر جب اپنا مقصد پورا نہ ہوا اس پہاڑ سے نیچے اُتر کر نشیبی میدان میں دوڑتے ہوئے مروہ پر آئیں۔ اور اسی طرح سات مرتبہ چکر لگائے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے ساتھ اپنی خاص معیت کو ظاہر فرمایا۔ اور غیب سے زمزم کا پانی پھوٹ نکلا۔ اور اس معیت کا اثر یہ ہوا کہ جس شخص نے ان بلا رسیدوں کی اقتداء کی اور ان کے دستور کے مطابق اوپر اور نیچے آیا اور دوڑ دھوپ کی تو وہ بارگاہ خداوندی میں مقبول ہو جاتا ہے۔ اور اس وقت سے یہ دونوں پہاڑ دعا کی قبولیت کی جگہ بن گئے۔ اس حد تک کہ یہ دونوں پہاڑ اب مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ، اللہ

تعالیٰ کے نزدیک دینداری کی علامات سے ہیں۔

شعائر کے معنی کا بیان

شعائر اصل میں شعیرۃ کی جمع ہے یا شعارہ کی جمع ہے۔ بمعنے علامت، اور دین کے عرف میں شعائر اللہ عبادت کے مکانات، زمانوں، علامتوں اور اوقات کو کہتے ہیں۔ مکانات عبادت جیسے کعبہ، عرفہ، مزدلفہ، تینوں جمرات، صفا، مروہ، منیٰ اور تمام مسجدیں ہیں۔ عبادت کے زمانے جیسے رمضان پاک، حرمت والے مہینے، عیدالفطر، عید قرباں، جمعہ اور ایام تشریق ہیں۔ اور عبادت کی علامات جیسے اذان، اقامت، ختنہ، نماز با جماعت، نماز جمعہ اور عیدین کی نمازیں ہیں۔ اور ان تمام چیزوں میں علامت ہونے کا معنی ثابت ہے۔ اس لیے کہ عبادت کا مکان اور زمانہ بھی عبادت بلکہ معبود کی یاد دلاتا ہے۔ المختصر صفا اور مروہ کا شعائر اللہ میں سے ہونا صرف حضرت ہاجرہ رضی اللہ عنہا کے صبر کی برکت سے حاصل ہوا، کہ حضرت حق عزوجل کی معیت خاصہ ان کے حق میں انہیں دو پہاڑوں کے درمیان جلوہ گر ہوئی، اور ان کی مشکل حل فرمائی۔ اس کے بعد ان دونوں پہاڑوں میں شعائر اللہ ہونے کا معنی ان کے بمنزلہ ذاتی جوہر کے ہو گیا۔ اس لیے کہ مالموں کے حق میں ان کے درمیان سات بار سعی کرنا اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی سات صفات کے ساتھ متحقق ہونا ہے۔ اس کے بعد کہ طواف کے ساتھ چکروں کی وجہ سے ان صفات کا تخلق ہوا، اور قاصروں اور ناقصوں کے حق میں اہل کمال کے ساتھ تشبیہ ہے۔ اور یہ معنی عوارض طاریہ کی وجہ سے ان دونوں سے زائل نہیں ہوتا۔ جس طرح کہ خانہ کعبہ اس وجہ سے کہ غلبہ کفار کے وقت بیت الاصنام اور بت خانہ ہو گیا تھا اہل جہاں کا قبلہ اور مطاف ہونے سے معزول اور جدا نہیں ہوا کیونکہ جو کچھ ذات میں ہے اس کی وجہ سے زائل نہیں ہوتا جو کچھ غیر میں ہے۔ اسی طرح یہ دونوں باصفا پہاڑ اس وجہ سے کہ مکہ کے جاہل اس پر اساف اور نائلہ کو رکھ کر پوجا کرتے تھے۔ اور اصل میں اساف اور نائلہ مرد اور عورت تھے کہ عین کعبہ میں ایک نے دوسرے کی طرف شہوت کے ساتھ ہاتھ بڑھایا اور بدکاری کا ارادہ کیا جس کی بنا پر جوہر سنگ میں مسخ ہو گئے تھے۔ اور اس وقت کے عقل مندوں نے لوگوں کی عبرت کے لیے اساف کو صفا پر اور نائلہ کو مروہ پر رکھ

دیا تھا۔ ان جاہلوں نے پتھر سے تراشی ہوئی صورت کو بت خیال کر کے انہیں معبود بنالیا۔ اور یہاں تک گمراہی میں گرفتار ہوئے کہ مسخ شدہ بت اور گھڑے ہوئے بت میں فرق نہ پہچان سکے۔ اور ہر سال ان دونوں پہاڑوں کے درمیان ان کی پوجا کے لیے ایک اجتماع کرتے۔ شعائر اللہ ہونے سے معزول اور جدا نہیں ہوئے ہیں۔ بلکہ یہ معنی ان کے بمنزلہ جوہر ذاتی کے ہے کہ غیر کی وجہ سے زائل نہیں ہوتا۔

فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ تو جو خانہ کعبہ کا عرفات سے حج کرے اَوِ اعْتَمَرَ یا عمرہ کرے اپنے گھر سے یا حرم کے باہر سے۔

حج اور عمرہ کے درمیان فرق کا بیان

اور حج اور عمرہ کے درمیان فرق یہ ہے کہ حج میں عرفات میں جانا شرط ہے۔ اور وہاں سے خانہ کعبہ کے طواف کے لیے آنا، اور عمرہ میں عرفات میں جانا شرط نہیں۔ اگر عمرہ کرنے والا مکہ شریف کے بیرون سے آتا ہے تو اسے سیدھا مکہ شریف میں آنا چاہیے۔ اور طواف کرنا چاہیے۔ اور اگر مکہ شریف کا ساکن ہے تو اسے حرم سے باہر جانا چاہیے۔ اور وہاں سے احرام باندھ کر خانہ کعبہ کے طواف کے لیے آنا چاہیے۔ نیز حج سال میں صرف ایک بار ہوتا ہے۔ اس لیے کہ عرفہ کے دن جو کہ ذوالحجہ کی نو (۹) تاریخ ہے کو عرفات جانا حج کی شرط ہے۔ اور یہ دن ایک سال میں مکرر نہیں آسکتا، اور عمرہ ہر روز ہو سکتا ہے۔ اس لیے کہ کوئی خاص وقت مقرر نہیں۔ اور بہرحال صفا مروہ کے درمیان سعی کرنا دونوں عبادتوں میں ضروری ہے۔ تو جو حج کا قصد کرے یا عمرے کا

فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ تو اس پر گناہ کا کوئی کھٹکا نہیں ہے کفار اور بت پرستوں کی مشابہت کی رو سے اَنْ يَّطَّوَّفَ بِهِمَا اس میں کہ ان دونوں پہاڑوں کا طواف کرے۔ خانہ کعبہ کے طواف کی تاکید اور تکمیل کے لئے۔ اس لیے کہ کفار اور بت پرستوں کی مشابہت کی وجہ سے گناہ کا خطرہ وہاں معتبر ہوتا ہے جہاں شرع کا حکم ظاہر وارد نہ ہو۔ جبکہ یہ دونوں پہاڑ حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیٰ نبینا وعلیہما السلام والتحیۃ کے وقت سے طواف اور سعی کا مقام ہیں۔ اور ان دونوں پہاڑوں پر بت رکھنے کی وجہ سے مطاف ہونے سے باہر نہیں آئے جیسا

کہ خانہ کعبہ اس کے اردگرد اور اس کے اندر بت رکھنے کی وجہ سے مطاف ہونے سے باہر نہیں آیا، اور جب اس گھر کا حج اور عمرہ اس حالت میں کیا جاسکتا ہے تو ان دونوں پہاڑوں کا طواف کیوں نہیں کیا جاسکتا۔

اور یہود و نصاریٰ اس وجہ سے تم پر طعنہ کریں۔ اور کہیں کہ تم بتوں کے مکانات کی تعظیم کرتے ہو۔ اور ان مکانات کا طواف کرتے ہو۔ اور اپنے آپ پر کفار اور بت پرستوں کی مشابہت گوارا کرتے ہو، اور یہ تمام ملتوں اور دینوں کے خلاف ہے تو ان کے اس طعنہ کی پرواہ مت کرو، اور تنگ دل نہ ہو اس لیے کہ معاملہ خدا تعالیٰ کے ساتھ ہے۔ اور تمہاری نیت حج اور عمرہ بجالانا ہے۔ بتوں کی تعظیم نہیں۔ اور حج و عمرہ بلاشبہ نیک کام ہیں۔ اور ان کا بجالانا طاعت ہے۔

وَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا اور جو اطاعت کی نیت سے کوئی نیک کام کرے فَإِنَّ اللّٰهَ شَاكِرٌ تو بے شک اللہ تعالیٰ اس کے عمل کا قدردان ہے۔ ضائع نہیں فرماتا اگرچہ بظاہر بت پرستوں کے ساتھ مشابہت پیدا ہوگئی ہو جیسے عاشوراء کے دن کا روزہ۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ عَلِيمٌ عمل کرنے والوں کی نیتوں کو جاننے والا ہے، تو جو ان مکانات میں بتوں کی تعظیم کی نیت سے جاتا ہے اس کے عمل کو رد فرمادیتا ہے۔ اور جو مناسک کی ادائیگی کی نیت سے جاتا ہے اس کے عمل کو قبول فرماتا ہے۔

سعید بن منصور، عبد بن حمید، ابن جریر اور دوسرے محدثین نے شعبی سے روایت کی ہے کہ کوہ صفا پر ایک بت تھا جسے اساف کہتے تھے، اور کوہ مروہ پر بھی ایک بت تھا جسے نائلہ کہتے تھے۔ اور اہل جاہلیت خانہ کعبہ کے طواف کے بعد جب ان دونوں پہاڑوں کے درمیان سعی کرتے تھے تو ان دونوں بتوں کو بوسہ دیتے تھے۔ اور ہاتھ لگاتے تھے۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مدینہ عالیہ میں تشریف لائے۔ اور سورۃ الحج میں خانہ کعبہ کے طواف کا حکم آیا اور صفا اور مروہ کے درمیان سعی کا ذکر نہ ہوا، لوگوں نے عرض کی یارسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)! صفا و مروہ کے درمیان اہل جاہلیت ان دو بتوں کے لیے دوڑتے تھے۔ یہ سعی شعائر اللہ سے نہیں ہے تو ہمیں کیا ضرورت ہے کہ ان دونوں پہاڑوں

کے درمیان سعی کریں۔ بلکہ اس بات کا خوف ہے کہ اگر ہم بھی اس سعی کے مرتکب ہوں تو جب تو ہم نے اہل جاہلیت کی مشابہت اختیار کی ہوگی۔ اللہ تعالیٰ نے یہ آیت بھیجی اور ان کے دلوں سے گناہ کا خطرہ دور فرمایا۔

نیز انہیں محدثین نے جن کا ذکر ہوا امام مجاہد سے روایت کی ہے نصاریٰ اور از رہ طعن کہتے تھے کہ ان دو پتھروں کے درمیان سعی جاہلیت اور بت پرستوں کے عمل سے ہے نہ کہ ملت ابراہیمی کے احکام سے۔ حق تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی، اور بخاری و مسلم میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت سے یوں آیا کہ دور جاہلیت میں انصاری منات پرست تھے۔ اور جاہلیت کا قانون یوں تھا کہ جو شخص کسی بت کو پوجتا تھا وہ کسی دوسرے بت کی جگہ پر ہرگز نہیں جاتا تھا۔ اسی وجہ سے انصاری حضرات صفا اور مروہ کے قریب نہیں جاتے تھے۔ جب اسلام کی عمل داری آئی تو اپنی عادت کے مطابق صفا و مروہ پر جانے سے تردد کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ آیت کریمہ بھیجی۔ اس آیت سے اسی بات پر دلیل ہوتی ہے کہ صفا و مروہ خدا تعالیٰ کی عبادت کے مقامات اور اس کے نشانات ہیں۔ اور جب کسی چیز کے بارے میں قطعی دلیل کے ساتھ ثابت ہو جائے کہ شعائر اللہ سے ہے تو کفار سے مشابہت کا اس میں کوئی اثر نہیں سمجھنا چاہیے۔ اور اپنی نیت کو اللہ تعالیٰ کے لیے خالص کر کے بجالانا چاہیے۔ ہاں کفار کی مشابہت اس وقت کسی عمل کے حرام ہونے کا موجب ہوتی ہے جب اس کا پسندیدہ ہونا یقینی دلیل کے ساتھ ثابت نہ ہوا ہو جیسے نوروز اور مہرجان کی تعظیم اور ہندوؤں کی عیدیں منانا جیسے ہولی، دوالی، بسنت اور دسہرہ یا ان جیسا لباس پہننا اور ان کے معابد میں جانا قشقہ لگانا، داڑھی اور مونچھ کو مصیبت کے وقت بالکل صاف کر دینا، گلے میں زنار ڈالنا اور کھانا کھاتے وقت قصداً سر اور جسم کو ننگا کرنا۔

(اقول وباللہ التوفیق۔ مذکورہ وضاحت سے پتہ چلا کہ ہندوؤں کے تہوار ہولی دیوالی۔ بسنت۔ دسہرہ وغیرہ منانا حرام ہے۔ نیز کفار اشرار سے نفرت اور بیزاری کا تقاضا بھی یہی ہے۔ لیکن مسلک دیوبند کے مستند اور ان کے تسلیم شدہ عالم ربانی رشید احمد گنگوہی سے سوال ہوا کہ ہندوؤں کے تہوار ہولی یا دیوالی وغیرہ میں ہندوؤں سے پوڑی وغیرہ لینا اور کھانا کیسا

ہے تو جواب میں لکھا کہ درست ہے (ملاحظہ ہو فتاویٰ رشیدیہ جلد دوم ص ۱۰۷) جبکہ شہداء کربلا کے ایصال ثواب کے لئے لگائی سبیل کا شربت حرام ہے (فتاویٰ رشیدیہ حصہ سوم ص ۱۱۴) محمد محفوظ الحق غفرلہٗ)

اور اگر عطلقاً کفار کی مشابہت اگرچہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں پسندیدہ افعال میں ہو حرمت کا موجب ہوتی تو لازم آتا کہ حج، عمرہ، ختنہ، عقیقہ، عاشوراء کا روزہ، قربانی، حرمت والے مہینوں کی تعظیم، ہدی اور قلائد کی تعظیم اور ملت ابراہیمی کی باقی ادائیں۔ جو کہ اس وقت کے کافروں میں رائج تھیں یا سورج اور چاند گرہن کی نماز، اس وقت صدقہ دینا، غلام آزاد کرنا، مہمانوں کی ضیافت اور برسرِ راہ مسافروں کے لیے پانی مہیا رکھنا جو کہ ہندوؤں کا معمول ہے حرام ہوتا۔

صفا ومروہ کی سعی کا حکم

ہم یہاں پہنچے کہ ہماری شریعت میں صفا ومروہ کے درمیان سعی کرنے کا کیا حکم ہے۔ اگرچہ اس لفظ سے کہ **فلاجناح علیه ان یطوف بهما** یوں ظاہر ہوتا ہے کہ یہ عمل ضروری نہیں۔ اس کا کرنا اور نہ کرنا برابر ہے۔ لیکن **من شعائر الله** کا لفظ اس بات پر صریح نص کرتا ہے کہ یہ عمل ضروری ہے۔ اور شارع کے نزدیک مطلوب۔ اور اسی لیے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس وہم کو دور کرنے کے لیے جو کہ پہلے سے پیدا ہوتا ہے ارشاد فرمایا ہے **ان الله کتب علیکم السعی فاسعوا** کہ اللہ تعالیٰ نے تم پر سعی لکھ دی فلہذا سعی کرو۔ شافعیہ نے لفظ کتب کے ظاہر سے جو کہ عرف قرآن مجید میں ایجاب کے صیغوں سے ہے۔ جیسے **كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلٰى**، (البقرہ آیت ۱۷۸) **كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ** (البقرۃ آیت ۱۸۳) اور اسی کی مانند دوسری آیات سے دلیل لے کر اس سعی کی فرضیت کا قول کیا ہے۔ اور اس کی ترک سے حج اور عمرہ کو باطل سمجھتے ہیں۔ اور قربانی وغیرہ دینے سے اس کے تدارک کو ممکن شمار نہیں کرتے، جیسا کہ ارکان کی شان ہے۔ اور حنفیہ کہتے ہیں کہ یہ حدیث خبر آحاد ہے۔ اور قرآن مجید میں جو لفظ اس سعی کی طلب کرتا ہے لفظ شعائر اللہ کے سوا اور نہیں ہے۔ اور شعائر اللہ کا فرض ہونا لازم نہیں، جیسا کہ اذان، نماز عیدین کی

جماعت، قربانی، ہدی اور قلائد، تو زیادہ احتیاط یہ ہے کہ اس سعی کو عمل میں ترک کرنے کو جائز قرار نہ دیا جائے۔ لیکن اس کی فرضیت ورکنیت کے اعتقاد کی بھی جرأت نہیں کرنا چاہیے۔ اور ان کے نزدیک واجب کا یہی معنی ہے۔ اور اس صورت میں کہ چھوٹ جائے ان کے نزدیک اس کا تدارک ہدی کے ذبح کرنے کے ساتھ ممکن ہے۔

فلاجناح علیہ ان یطوف بھما کا مفہوم حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی زبانی

اور امام مالک نے موطا میں اور بخاری، مسلم اور دوسرے صحاح والوں نے ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے بھانجے عروہ بن زبیر رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ انہوں نے ام المومنین رضی اللہ عنہا کی خدمت میں عرض کی کہ اس آیت میں غور فرمائیں اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَۃَ مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰہِ فَمَنْ حَجَّ الْبَیْتَ اَوِاعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَیْہِ اَنْ یَّطَّوَّفَ بِھِمَا کہ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر کوئی شخص ان دونوں پہاڑوں کا طواف نہ کرے تو کوئی ڈر نہیں۔ حضرت ام المومنین رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ اے میرے بھانجے تو نے صحیح نہیں کہا۔ اور ٹھیک نہیں سمجھا۔ اگر یہ معنی اللہ تعالیٰ کی مراد ہوتا تو یوں ارشاد ہوتا کہ فَلَا جُنَاحَ عَلَیْہِ اَنْ یَّطَّوَّفَ بِھِمَا، اور اب جبکہ طواف سے گناہ کی نفی کی ہے شرعی طور پر امکان عام ثابت ہوتا ہے۔ جو کہ وجوب، استحباب اور اباحت کا احتمال ہے۔ لیکن جب ان الصفا والمروۃ من شعائر اللہ بھی فرمایا ہے۔ اور حضور علیہ السلام نے اپنے حج اور عمرہ میں ان دونوں پہاڑوں کے طواف پر ہمیشگی فرمائی ہے تو معلوم ہوا کہ یہ طواف واجب ہے۔ اور طواف سے گناہ کی نفی اس بنا پر وارد ہوئی تھی کہ انصاری منات کی پرستش کرتے تھے۔ اور وہ کوہ مثال پر ایک بت تھا جو کہ مقام قدید کے بالمقابل ہے۔ اور اس کی زیارت کے لیے مدینہ سے احرام باندھتے تھے، اور اساف اور نائلہ کے صفا و مروہ پر ہونے کی وجہ سے وہاں جانے سے گریز کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے شبہ کو دور کرنے کے لیے گناہ کی نفی فرمائی۔ حقیقت میں جو اباحت کہ اس لفظ سے ظاہری طور پر سمجھ آتی ہے حالت طواف میں

ان دونوں بتوں کے پائے جانے کی طرف لوٹتی ہے نہ کہ نفس طواف کی طرف۔ جس طرح کہ اگر کسی کے کپڑے پر ایک شرعی درم سے کم کوئی نجاست لگی ہو اور اسے کوئی حنفی فقیہ فرمائے کہ لاجناح علیك ان تصلی فیه صلوٰة الظهر اس سے نماز کی اباحت سمجھی نہیں جاتی بلکہ حالت نماز میں اس نجاست کے پائے جانے کی اباحت سمجھی جاتی ہے۔ ہاں اگر طواف چھوڑنے کو صریح مباح کرتے تو وہ سمجھ درست ہوتی۔

صفا و مروہ کی سعی احادیث کے حوالے سے

اور ابن جریر، حضرت قتادہ سے لائے کہ ان دونوں کے درمیان طواف حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیٰ نبینا و علیہم السلام کی سنت سے تھا۔ اور حاکم نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی کہ آپ نے لوگوں کو صفا مروہ کے درمیان طواف کرتے دیکھا اور فرمایا کہ یہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی والدہ کی میراث ہے۔ جو کہ تمہارے لیے چھوڑی ہے۔ اور خطیب سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ سے لائے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام تشریف لائے۔ اور آپ کے ہمراہ حضرت ہاجرہ اور اسماعیل علیہ السلام تھے۔ آپ نے دونوں کو بیت اللہ کے قریب اُتارا۔ حضرت ہاجر رضی اللہ عنہا نے عرض کی کیا آپ کو اللہ تعالیٰ نے اس کا حکم دیا ہے؟ فرمایا ہاں۔ پس بچے کو پیاس لگی تو حضرت ہاجرہ رضی اللہ عنہا نے دیکھا تو سب سے زیادہ قریب کوہ صفا نظر آیا، آپ دوڑیں اور اس کے اوپر پہنچ گئیں۔ اِدھر اُدھر دیکھا کچھ نظر نہ آیا، پھر دیکھا تو مروہ سب سے زیادہ قریب نظر آیا، تو وہاں پہنچ کر دیکھا کچھ نظر نہ آیا۔ آپ صفا پر آئیں۔ فرمایا آپ نے سب سے پہلے صفا اور مروہ کے درمیان سعی کی۔ الخ۔

اور ابوداؤد اور ترمذی، حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی روایت کے ساتھ لائے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے تھے کہ بیت اللہ کا طواف، صفا و مروہ کے درمیان سعی اور جمرات کی رمی تو صرف اللہ تعالیٰ کا ذکر قائم کرنے کے لیے مقرر کیے گئے کسی اور مقصد کے لیے نہیں۔ اور ابن ابی شیبہ حضرت امیر المومنین عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے لائے ہیں کہ جو شخص خانہ کعبہ کے حج کی نیت سے آئے اسے چاہیے کہ پہلے بیت اللہ کے قریب آئے اور اس کے اردگرد سات بار گھومے۔ پھر مقام ابراہیم علیہ السلام کے پاس آئے اور اس کے

پیچھے نماز طواف کی دو رکعتیں ادا کرے۔ پھر کوہ صفا کی طرف متوجہ ہو اور اس پہاڑ پر یہاں تک اوپر آئے کہ خانہ کعبہ نظر آئے وس وقت کعبہ شریف کی طرف منہ کر کے کھڑا ہو کر سات مرتبہ اللہ اکبر کہے اور ہر دو تکبیر کے درمیان اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا اور حضرت پیغمبر علیہ السلام پر دورد شریف پڑھنے میں مشغول ہو۔ اور اللہ تعالیٰ سے اپنی حاجت طلب کرے، پھر مروہ کی طرف جائے۔ اور اسی طرح اس پہاڑ پر عمل کرے۔

سات جگہ رفع یدین کیا جائے

نیز حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت کے ساتھ لائے کہ سات جگہ دونوں ہاتھوں کو اُٹھانا چاہیے۔ پہلی جگہ جب نماز کے لیے کھڑا ہو، دوسری جگہ جب خانہ کعبہ کی زیارت کرے، تیسری جگہ صفا پر، چوتھی جگہ مروہ پر، پانچویں عرفات میں وقوف کے وقت، چھٹی جگہ مزدلفہ میں بھی وقوف کے وقت، ساتویں جگہ رمی جمار کے وقت۔

ارزقی، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت کے ساتھ لائے کہ صفا و مروہ کے طواف میں سنت یہ ہے کہ صفا سے اتر کر آہستہ آہستہ چلے۔ یہاں تک کہ جب پانی کی گزرگاہ کے نشیبی حصہ میں آئے تو دوڑنا شروع کر دے۔ حتیٰ کہ نشیب سے اوپر آ جائے پھر آہستہ آہستہ چلتا جائے۔ یہاں تک کہ مروہ پر پہنچ جائے۔ اور اسی طرح جب مروہ سے صفا کی طرف پلٹے تو عمل کرے، اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت سے لائے کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حج کیا تو اسی مقام پر لبیک کہتے ہوئے دوڑے۔ بارگاہ خداوندی سے جواب میں لبیک عبدی کا خطاب دل نواز سنا، اور یہاں آپ کی دعا یہ تھی کہ رب اغفر وارحم انك انت الاعز الاکرم، اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما اور دوسرے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے یہاں طویل دعائیں منقول و ماثور ہیں۔

ظاہر بین فقہاء کا بہت بڑا اشکال

ہم یہاں پہنچے کہ یہاں ظاہر بین فقہا کا بہت بڑا اشکال ہے۔ اور اس اشکال کا منشا یہ ہے کہ سن ۱۶۴ ہجری میں کہ مہدی عباس نے حج کیا، اور اس نے مسجد حرام کو وسیع کرنے کا حکم

دیا۔تو وہ مقام جس میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سعی فرمائی تھی مسجد حرام میں داخل ہو گئی۔ مہدی نے محمد بن عباد بن جعفر کے گھر کو جو کہ مسجد حرام کے متصل تھا سعی کی جگہ قرار دیا۔ پھر ظاہر بین فقہاء کو اس وجہ سے عظیم اشکال پیدا ہوا۔ اور انہوں نے کہا کہ صفا اور مروہ کے درمیان سعی امور تعبدیہ سے ہے۔ جو کہ ایک معین مکان کے ساتھ متعلق ہے۔ اور اس سے پھرنا جائز نہیں۔ جس طرح طواف، خانہ کعبہ کے ساتھ اور وقوف، عرفات کے ساتھ مخصوص ہے۔ اور جب اس قسم کی عبادات مکان معین کے علاوہ معتبر نہیں ہوتیں تو اب لوگوں کی سعی ضائع گئی۔ اس لیے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سعی کا مقام مسجد میں داخل ہو گیا۔ اور مسجد میں سعی ممکن نہیں۔ اور معمول بھی نہیں۔

اس کا جواب اہل تقلید کے حق میں یہ ہے کہ امام مالک، امام ابو یوسف اور امام محمد اس وقت موجود تھے، اور امام شافعی اور امام احمد بھی اس زمانے کے بعد عنقریب ہی درجۂ اجتہاد کو پہنچ گئے۔ اور کسی نے سعی کے اس بدلنے پر انکار نہ کیا۔ تو اجماع ثابت ہو گیا۔

اور اہل تحقیق کے حق میں یہ ہے کہ شارع کا مطلوب صفا و مروہ کے درمیان سعی ہے۔ اور اس وقت ان دونوں پہاڑوں کے درمیان سیدھی راہ چلتی تھی۔ اس میں سعی کرتے تھے۔ اس کے بعد دوسرا راستہ ان دونوں پہاڑوں کے درمیان جاری ہوا۔ وہ نیا راستہ پہلے راستہ کا قائم مقام ہو گیا۔ جس طرح جب کسی مسجد میں ضرورت کی بنا پر شارع عام سے کچھ حصہ داخل کریں تو اسے مسجد کا حکم حاصل ہو جاتا ہے۔ اور اس میں اعتکاف صحیح ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ ازیں بعض محقق مورخین نے لکھا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عہد مبارک میں سعی کی جگہ بہت وسیع تھی۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ مبارک کے بعد لوگوں نے اس میدان میں گھر بنا لیے تھے، اور سعی کے اندازے کے مطابق جگہ چھوڑ دی۔ محمد بن عباد بن جعفر کا گھر بھی اسی قسم کے مکانوں میں سے ایک بنایا ہوا تھا۔ تو مہدی نے اس گھر کو ڈھا کر اس کا کچھ حصہ مسجد حرام میں داخل کر دیا۔ اور کچھ حصہ سعی کے لیے چھوڑ دیا۔ تو حقیقت میں سعی کی جگہ میں پورے طور پر تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔ یہ ہے حال صفا و مروہ کا جو کہ دراصل شعائر اللہ سے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کی اس خصوصی عنایت کے یاد آنے کا مقام جو

کہ حضرت ہاجرہ رضی اللہ عنہا اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کے لیے ان کے صبر کی وجہ سے ظہور پذیر ہوئی۔

اور اگر یہود و نصاریٰ تم پر ان دونوں پہاڑوں کے طواف کا ان دونوں پر بت رکھنے کی وجہ سے دیدہ دانستہ طعن کریں۔ اور کہیں کہ تم بھی بت پرستوں کی طرح بتوں کے مکانات کی تعظیم کرتے ہو۔ اور اہل جاہلیت کے اعمال کی طرح عمل کرتے ہو۔ تو ان کے اس طعن سے دل تنگ نہ ہونا۔ اس لیے کہ وہ جانتے ہیں کہ صفا و مروہ کے درمیان سعی حضرت ہاجرہ رضی اللہ عنہا کے زمانے سے متوارث ہے۔ اور اس وقت بتوں کا نام و نشان نہ تھا۔ لیکن وہ اپنی ان معلومات کو چھپاتے ہیں تاکہ تم پر طعن کرنے کی وجوہ میں سے کوئی وجہ ان کے ہاتھ لگے لیکن وہ نہیں سمجھتے کہ ہم اس حق چھپانے کی وجہ سے ملعون بنتے ہیں۔ اگرچہ اس چھپانے سے مسلمانوں پر طعن ہوتا ہے۔ اس لیے کہ

اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْتُمُوْنَ بے شک جو لوگ چھپاتے ہیں مَآ اَنْزَلْنَا مِنَ الْبَيِّنٰتِ اس چیز کو جو ہم نے شعائر اللہ کی ظاہری علامات سے اُتاری ہے وَالْهُدٰى اور وہ چیز جو شعائر اللہ کی پہچان کے لیے عقل کی راہ نمائی کرتی ہے مِنْۢ بَعْدِ مَا بَيَّنّٰهُ اس کے بعد ہم نے اپنی اس نازل کردہ چیز کو اس طرح واضح کر دیا ہے کہ شعائر اللہ اور کفار کے معابد کے درمیان کوئی اشتباہ نہیں رہتا، اور ہمارا یہ واضح بیان اہل مطالعہ اور باریک بینوں ہی کے ساتھ خاص نہیں بلکہ عام ہے لِلنَّاسِ تمام لوگوں کے لیے خواہ ذہین ہوں خواہ کند ذہن، خواہ طالب علم ہوں خواہ ان پڑھ۔ اور ہم نے اسے خبر احاد کی طرح نہیں کیا ہے کہ کسی کے پاس پہنچی ہو اور کسی کے پاس نہ پہنچی بلکہ ہم نے اسے درج کیا ہے

فِي الْكِتٰبِ عین کتاب میں جو کہ متواتر ہے۔ اور متواتر کو چھپانا ممکن نہیں۔ لیکن وہ کمال عناد کی وجہ سے متواترات کو بھی چھپانے کی کوشش کرتے ہیں۔ پس بلاشبہ

اُولٰٓئِكَ يَلْعَنُهُمُ اللّٰهُ وہ لوگ ان پر اللہ تعالیٰ لعنت فرماتا ہے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کے مقصد کا مقابلہ کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ لوگوں کو ہدایت دینا اور ان کی جہالت کو دور کرنا چاہتا ہے۔ جبکہ یہ لوگوں کی گمراہی اور جہالت کی بقا چاہتے ہیں۔

وَيَلْعَنُهُمُ اللّٰعِنُوْنَ اور ان پر لعنت کرتے ہیں، لعنت کرنے والے۔ رہے فرشتے اور انبیاء (علیہم السلام) اور اولیاء کی ارواح تو وہ اس وجہ سے کہ وہ لوگ ان کی کوشش کو برباد کرتے ہیں۔ اس لیے کہ وہ حضرات مخلوق کی ہدایت کے لیے کتب الٰہی لانے اور لوگوں کو اس کے احکام پہنچانے میں ساری زندگیاں مصروف رہے ہیں۔ اور یہ لوگ چاہتے ہیں کہ ان کی تمام کوشش کو ضائع کر دیں۔ اور رہے جن وانس کے کفار اور فاسق و فاجر لوگ تو اس وجہ سے کہ ہر شخص اپنے مقصد کے وقت کہتا ہے کہ اس پر خدا تعالیٰ کی لعنت جو حق کو چھپائے۔ اور وہ لعنت ان پر پڑتی ہے۔ بلکہ ان معنوں میں وہ خود اپنے آپ کو لعنت کرتے ہیں۔ اور رہے حیوانات اور جمادات تو اس وجہ سے کہ جب ان کی حق پوشی کی نحوست کی وجہ سے جہان کی ویرانی ہوتی ہے، قحط پڑتے ہیں۔ وبائیں نازل ہوتی ہیں۔ تو ہر خشک وتر کی روح ملکوتی آہ وزاری کرتی ہے۔ اور جن کی نحوست کی وجہ سے بلا میں گرفتار ہوئے ہیں انہیں لعنت کرتی ہیں۔

امر واقعی کو چھپانے کی سزا اور نحوست اور اس کی مختلف صورتیں

اور اگرچہ اس آیت کا ورود ان یہود ونصاریٰ کے بارے میں ہے۔ جو کہ مسلمانوں پر طعن کرنے کے لیے خانہ کعبہ اور صفا ومروہ کی عظمت کو جو انہیں معلوم تھی چھپاتے تھے۔ لیکن اس کا مضمون ہر اس شخص کے بارے میں عام ہے جو جان بوجھ کر ایک امر واقعی کو اس کے اظہار کی ضرورت کے وقت چھپائے جیسا کہ عناد کی وجہ سے کفر کرنے والا کہ ایمان کے دلائل کو دل سے جانتا ہے۔ اور زبان پر نہیں لاتا۔ یا کوئی گواہ جو کہ کسی مقدمہ پر آگاہی رکھتا ہے۔ اور اپنی گواہی کو چھپاتا ہے۔ تاکہ کسی کا حق ضائع ہو جائے۔ اور علمائے سو جو کہ دیدہ دانستہ حق کو از رہ تعصب چھپاتے ہیں۔ اور ظالم حکام جن کے نزدیک کسی کا حق ظاہر ہوا اور وہ طمع اور پاسداری کی وجہ سے اس کے مطابق فیصلہ نہ کریں۔ اور اسے مصلحت ملکی قرار دیں۔ اور رشوت لینے والے جج جو کہ طمع کی وجہ سے حق کو باطل اور باطل کو حق کر دیں۔ اور بددیانت مشیر جو کہ ملک اور ملت کی معلوم بہتری کو چھپائیں اور اس کے خلاف مشورہ دیں۔

ابن ماجہ اور دوسرے محدثین براء عازب رضی اللہ عنہ کی روایت سے لائے کہ ایک

دن ہم حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ہمراہ ایک جنازہ میں تھے، حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ قبر میں کافر کی دونوں آنکھوں کے درمیان ایسی گرز مارتے ہیں کہ اس کی آواز کو انسانوں اور جنوں کے سوا ہر جانور سنتا ہے۔ اور اس کافر پر لعنت کرتا ہے۔ اور یہی معنی ہے اس آیت کا وَيَلْعَنُهُمُ اللّٰعِنُوْنَ، اور بیہقی، عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے اس آیت کی تفسیر میں لائے کہ جب دو آدمی ایک دوسرے پر لعنت کرتے ہیں اس لعنت کو فرشتے آسمان پر لے جاتے ہیں۔ اور اس لعنت کو ڈالنے کی اجازت چاہتے ہیں۔ اگر وہ شخص لعنت کے قابل ہوتا ہے تو اس پر گرتی ہے۔ اور اگر وہ لعنت کے قابل نہیں تو کہنے والے پر لوٹتی ہے۔ اور اگر وہ بھی اس کے قابل نہیں تو یہودیوں اور دوسرے مستحقین لعنت پر پڑتی ہے۔ اور کیا ہی اچھا کہا گیا ہے کہ کسی نے کسی دوست پر تیر چلایا۔ اچانک وہ دشمن کے کینہ سے پر سینے پر لگ گیا۔

اور ترمذی، ابن ماجہ اور حدیث کی دوسری معتبر کتابوں میں حضرت ابوہریرہ، ابن عباس، ابن عمر، ابن مسعود، ابوسعید خدری اور دوسرے صحابہ کرام علیہم الرضوان سے یہ مضمون ثابت ہوا کہ جسے اللہ تعالیٰ نے کوئی علم دیا ہو اور کوئی اسے اس علم کے متعلق سوال کرے۔ اور یہ شخص اس علم کو چھپائے۔ اور بیان نہ کرے اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کے منہ آگ کی لگام ڈالے گا۔ اور ابن ماجہ کی روایت میں ابوسعید رضی اللہ عنہ سے یہ قید بھی وارد ہوئی کہ من كتم علما ينفع الناس في امر الدين یعنی جس نے ایسا علم چھپایا جو کہ لوگوں کو دین کے بارے میں نفع دیتا ہے۔ اور اس حدیث بلکہ اس آیت کریمہ سے یہ بھی استنباط کیا گیا ہے کہ علوم دینیہ کی تعلیم پر مزدوری اور اجرت لینا حرام ہے۔ اس لیے کہ اس آیت اور اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ علم دین کی تعلیم فرض ہے۔ اور فرض ادا کرنے پر اجرت لینا درست نہیں ہے۔ جیسے فرض نماز، روزہ۔ نیز اس آیت سے یہ بھی سمجھا جا سکتا ہے کہ خبر واحد کو قبول کرنا اور اس پر عمل کرنا واجب ہے۔ اس لیے کہ اظہار کا فرض کرنا عمل کو فرض کرنے کے لیے ہے۔ ہاں وہ علوم جو کہ دین کے ساتھ تعلق نہیں رکھتے اور مکلفین شرعی ذمہ داریوں کو ادا کرنے کے لیے ان علوم کے محتاج نہیں ہیں۔ جیسے علم طب، ہندسہ اور اکثر فنون ریاضی

وطبعی، علم تاریخ، نظم، شعر اور انشاء، ان پر اجرت لینا جائز ہے۔

علوم دینیہ کی تعلیم پر اجرت لینے کے مسئلہ کی باریکی

لیکن یہاں ایک باریکی سمجھنی چاہیے کہ نفس تعلیم پر اجرت حرام ہے۔ لیکن کسی کے گھر سفر کر کے تعلیم کے لیے جانا یا بچوں کو صبح سے شام تک پابندی میں رکھنا تعلیم کے علاوہ ایک کام ہے۔ اس کام کے عوض اجرت لینا بلاشبہ حلال ہے۔ اور اسی طرح کسی مدرسہ میں مدت دراز تک بیٹھنے کی پابندی بھی اجرت کا عوض ہوسکتی ہے۔ اور ابن ماجہ، حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی روایت سے لائے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا جس وقت اس اُمت کا پچھلا گروہ پہلوں کو لعنت کرنا شروع کر دے۔ جیسا کہ اس وقت روافض کے فرقہ میں یہ برا کام رواج پا چکا ہے تو اس وقت جس نے کسی حدیث کو چھپائے رکھا تو گویا اللہ تعالیٰ کی تمام نازل کی گئی کتابوں کو چھپا کر رکھا، اور طبرانی اوسط میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت کے ساتھ لائے کہ اس شخص کی مثال جو کہ علم سیکھے اور پھر اس کا اظہار نہ کرے۔ اور پوشیدہ رکھے اس شخص کی مانند ہے۔ جس نے بہت بڑا خزانہ جمع کرلیا ہے۔ اور خرچ نہیں کرتا، اور بخاری اور ابن ماجہ میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے نقل ہے کہ آپ فرماتے تھے کہ اگر ایک آیت کلام اللہ میں نہ ہوتی تو میں کسی کے پاس حدیث کی روایت نہ کرتا، اور آپ نے یہ آیت پڑھی اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْتُمُوْنَ الخ لیکن یہ سب غضب اور لعنت اس شخص کے ساتھ خاص ہے۔ جس نے آخر عمر تک حق چھپانے پر اصرار کیا۔ ورنہ اس وعید سے نکل آتا ہے۔ اس دلیل سے

اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا مگر وہ لوگ جنہوں نے حق پوشی سے توبہ کرلی۔ اور صحیح توبہ یہ ہے کہ اس کام پر ندامت صرف خوف خدا اور اس کے عذاب سے ڈرتے ہوئے دل میں پیدا ہو۔ اس شخص کی طرح نہیں جو کسی کی امانت کا منکر ہو گیا۔ اور جب لوگوں نے اسے ملامت کی تو ظاہر کر دی۔ یا اس شخص کی طرح کہ حاکم نے اس کی گواہی رد کر دی تو اس نے اپنی گواہی رد ہونے کی عار کی وجہ سے امر واقعی کا اظہار کر دیا۔ کہ یہ توبہ کے باب سے نہیں۔ اور انہوں نے صرف توبہ پر ہی اکتفاء نہیں کی بلکہ ان کی حق پوشی کی وجہ سے جو خرابی رونما ہوئی تھی اس

کے تدارک کے لیے بھی انہوں نے کوشش کی ہے۔

وَاَصْلَحُوْا اور اصلاح کر لی۔ اس کی جسے اپنی حق پوشی سے خراب کر دیا تھا۔ جیسے لوگوں کے عقائد، اعمال اور ان کے ضائع شدہ اموال، اور آئندہ کے لیے حق پوشی سے دست بردار بھی ہو گئے۔

وَبَيَّنُوْا اور بیان کرنا شروع کر دیا اس حق کو جو کہ انہیں معلوم ہے۔ فَاُولٰٓئِكَ پس وہ لوگ اگرچہ ان کی حق پوشی کی وجہ سے بعض لوگ اپنے نفس کی شامت کی وجہ سے گمراہی میں رہ گئے ہوں لیکن جب انہوں نے اپنی طرف سے اظہار حق میں کوشش کیا اَتُوْبُ عَلَيْهِمْ ان پر میں رحمت کے ساتھ رجوع فرماتا ہوں۔ اور ان کی توبہ قبول کرتا ہوں۔ اور انہیں اس لعنت سے نکال دیتا ہوں جس کے وہ مستحق ہو گئے تھے۔ وَاَنَا التَّوَّابُ اور میں ہی بار بار توبہ قبول فرمانے والا، بلکہ لعنت کے بدلے ان پر فضل وثواب نازل فرماتا ہوں۔ اس لیے کہ میں ہی ہوں اَلرَّحِيْمُ اپنے بندوں پر بہت مہربان۔

ہاں اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بے شک جو لوگ ان کی حق پوشی کی وجہ سے کافر ہو گئے۔ اور ان کی طرف سے یا ان کے غیر کی طرف سے بیان حق پہنچنے کے باوجود کفر سے باز نہ آئے وَمَاتُوْا وَهُمْ كُفَّارٌ اور وہ اس حال میں مر گئے کہ کافر تھے

اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ لَعْنَةُ اللّٰهِ وہ لوگ ان پر خدا تعالیٰ کی لعنت پڑی کیونکہ انہوں نے حق چھپانے والوں کی تقلید اختیار کی۔ باوجودیکہ ان کے پاس بیان حق پہنچا۔ و اور اسی طرح ان پر لعنت پڑی الْمَلٰٓئِكَةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ فرشتوں اور سب لوگوں کی حتیٰ کہ خود ان کی بھی اس لیے کہ بعض اوقات وہ خود اپنے آپ کو لعنت کرتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ جس نے دیدہ دانستہ حق کا انکار کیا اس پر لعنت ہے۔ اور ان کی یہ لعنت منقطع نہ ہو گی جس طرح کہ پہلے گروہ کی لعنت توبہ کرنے کی وجہ سے منقطع ہو گئی تھی اس لیے کہ موت کے بعد توبہ کا وقت نہ رہا اور موت سے پہلے انہوں نے توبہ نہ کی۔ پس وہ

خَالِدِيْنَ فِيْهَا اس لعنت میں ہمیشہ رہیں گے، اور اثر کے منقطع ہونے سے قطع نظر وہ لعنت ان کے حق میں کم نہیں ہو گی۔ تو

لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ ان سے عذاب ہلکا نہیں کیا جائے گا۔ ہیشگی کی وجہ سے بلکہ ان کا دکھ چڑ ابد لنے کی وجہ سے دم بدم زیادہ ہوگا۔

وَلَاهُمْ يُنْظَرُوْنَ اور نہ ہی انہیں مہلت دی جائے گی کہ کچھ بستا لیں۔ اور عذاب برداشت کرنے کے لیے تازہ قوت حاصل کرلیں۔ اس لیے کہ تخفیف اور مہلت بھی لعنت سے نکالنے کی ایک قسم ہے۔ اور وہ ان کے حق میں محال ہے۔

اور جب دوسروں کی حق پوشی کی وجہ سے کفر اور گمراہی پر اصرار کرتے ہوئے مرنے والوں کا حال ایسا ہوگا تو حق پوشوں کا حال جنہوں نے حق پوشی پر اصرار کیا ہو اور توبہ نہ کی ہو قیاس کرلینا چاہیے کہ کیا ہوگا۔

اور اس آیت میں اس بات پر دلیل ہے ہ کافر جب اپنے کفر پر مرجائے اس پر لعنت جائز ہے۔ اگرچہ موت کی وجہ سے مکلف ہونے کی حد سے باہر آچکا۔ جیسا کہ کافر اگر پاگل ہوجائے۔ اور پاگل ہونے کی وجہ سے مکلف ہونا زائل ہوگیا بھی قابل لعنت و برأت رہتا ہے۔ اور اسی طرح موت اور جنون کے بعد اہل ایمان اور اہل اصلاح کے استغفار، رحم طلب کرنے اور ان سے محبت کرنے کا حال ہے۔ اس لیے کہ اس طرح مکلف ہونے کا زائل ہونا حکم ما کان کو عما کان علیہ سے بدل دیتا ہے۔ کیونکہ عبرت خاتمہ کی ہوتی ہے۔ نیز اس آیت سے سمجھا جاسکتا ہے کہ جب تک کسی کی موت کفر پر یقین کے ساتھ معلوم نہ ہو اس پر لعنت جائز نہیں۔ شرط کے نہ ہونے کی وجہ سے مشروط کے نہ ہونے کی ضرورت کی وجہ سے، اور ان کافروں کی یہ کون سی قسم ہے جنہوں نے مرتے دم تک اپنے کفر پر اصرار کیا ہمیشہ کی لعنت میں نہ ہوں۔

وَاِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ اور تمہارا حقیقی معبود ایک معبود ہے۔ اور بس۔ تو جس۔ نے اس کے حکم سے منہ پھیرا اور اس کے غیر کی پوجا کی طرف لپکا اس کی رحمت سے دور جا پڑا اور اس نے اللہ تعالیٰ کے خاص بندوں کی طرف سے جو کہ فرشتے اور آدمی ہیں نفرت اور ملامت پائی۔ ہاں اگر واقع میں چند افراد شان معبودیت رکھتے تو احتمال تھا اگر ان میں سے ایک فرد ایک بندے پر عبادت میں کوتاہی اور اپنے احکام کی نافرمانی کی وجہ سے غضب میں آکر

اسے اپنی بارگاہ سے دھتکار دیتا۔ اور دوسرا افراد اسے اپنی رحمت میں جگہ دے دیتا اور اسے لعنت سے باہر نکال دیتا، جس طرح کہ نوکری اور آقائی، رعیت گری اور بادشاہی میں اس قسم کا احتمال ممکن اور واقع ہے۔ اس لیے کہ آقائی اور بادشاہی، استادی اور پیری اور مخلوق کے اس قسم کے مرتبے متعدد مقامات پر پائے جاتے ہیں۔ اور ایک جگہ میں منحصر نہیں ہوتے۔ یہاں کہ مرتبہ معبودی وخدائی ہے یہ احتمال ممکن ہی نہیں۔ اس لیے کہ

لَآ اِلٰهَ اِلَّاهُوَ اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ اور جس طرح معبودیت اس میں منحصر ہے۔ اسی طرح وہی ہے اَلرَّحْمٰنُ رحمت عام کا مالک کہ اس نے ہر چیز کو اس کے معاش کے منافع وجود سے لے کر صفات وآثار بخشے ہیں۔ اور اسی طرح وہی ہے اَلرَّحِیْمُ یعنی خاص رحمت کا مالک کہ اپنے فضل وکرم سے بعض مخلوق کو راہ ہدایت دکھا دیتا ہے۔ اور اس راہ پر چلنے کی توفیق بخشا ہے۔ اور آخرت کے ثواب کا مستحق کر دیتا ہے۔ تو جس نے اس کے ساتھ کفر کیا اور اس کے حکم سے سر پھیرا اپنے آپ کو اس کی رحمت سے دور پھینک دیا، اور جب کوئی دوسرا رحمٰن ورحیم نہیں ہے تو لازماً رحمت کی ضد میں جو کہ لعنت ہے جا پڑا اور اس رحمان اور رحیم کی رحمت سے مایوس ہوا۔ تو اسے تخفیف عذاب کی توقع اور مہلت وفرصت کی امید کہاں سے رکھنی چاہیے کہ یہ دونوں چیزیں تو رحمت کے آثار سے ہیں۔ جبکہ اس نے رحمت کے دروازے کو کہ جہان میں اس دوراز ے کے سوا اور کوئی دروازہ ہے ہی نہیں اپنے آپ پر بند کر دیا۔

اگر کفار کہیں کہ معبودیت، رحمانیت اور رحیمیت کا واحد محض کی ایک ذات میں منحصر ہونا تمہارا دعویٰ ہے اس دعویٰ پر کیا دلیل رکھتے ہو کہ ہمیں ابدی لعنت سے ڈراتے ہو؟ ہمارے ذہن میں یہ بات ہرگز نہیں آتی کہ صرف ذات واحد اس قدر بے انتہا نعمتوں کا فیض عطا کرنے کی گنجائش کر سکے۔ جیسا کہ ابن جریر، ابن المنذر، ابن ابی حاتم اور ابوالشیخ نے روایت کی ہے کہ جب آیت وَاِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ مدینہ عالیہ میں نازل ہوئی کفار مکہ نے اسے سن کر بہت تعجب کیا، کہنے لگے کہ ایک معبود میں سارے لوگوں کی کیسے گنجائش ہو سکتی ہے۔ حالانکہ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کہتا ہے کہ تمہارا معبود ایک ہے۔ اسے ہمارے

پاس کوئی نشانی لانی چاہیے اگر وہ سچوں میں سے ہے؟ ہم کہتے ہیں کہ اس دعویٰ کے بے شمار دلائل ہیں۔ علویات سے بھی اور سفلیات سے بھی۔ اور ان دونوں کے عوارض سے بھی اور وسائط سے بھی۔ اس لیے کہ

اِنَّ فِی خَلْقِ السَّمٰوٰتِ بے شک ساتوں آسمانوں کی پیدائش میں

آسمانوں کی گردش کی مقدار کا بیان

کہ سات سیاروں کی مختلف حرکات ایک شان اور ایک رنگ میں اور ان کا ٹھہرنا، لوٹنا اور استقامت، اور ان حرکات کا کبھی برجوں کے تواتر پر ہونا اور کبھی ان کے غیر پر ہونا ان پر دلالت کرتی ہیں۔ اور ان ساتوں آسمانوں میں سے ہر ایک قسم قسم کے عجائب رکھتا ہے کہ فن ہیئت کی واقفیت رکھنے والوں نے ان میں بعض عجائبات کو دریافت کیا ہے۔ اور شریعت لانے والوں نے بعض دوسرے عجائب کو بیان فرمایا۔ جیسے یہ کہ ہر آسمان علیحدہ فرشتوں کا مسکن ہے۔ اور ہر آسمان میں قضاء وقدر کا کارخانہ ایک جداگانہ رنگ رکھتا ہے۔ اور انبیاء علیہم السلام اور کاملین کی ارواح کو ان میں سے ہر ایک کے ساتھ ایک خصوصیت ہے۔ اور عبادت گزاروں کی عبادت اور دعا کرنے والوں کی دعا ہر آسمان سے گزرتی ہے۔ اور ایک جداگانہ قوت پیدا کرتی ہے۔ اور ہر آسمان میں شان الٰہی کا ظہور اور اس ذات پاک کا جلوہ ایک جداگانہ رنگ میں ہے۔ اور ان میں سے ہر ایک میں نور کی قندیلیں جو کہ چمکتے ستارے ہیں لٹکتے کھڑے ہیں۔ اور تمام ستاروں کے مطالع اور ان کے مغارب آسمان کے اجزاء میں سے دوسرا حکم اور علیحدہ اثر رکھتے ہیں۔ اور ہر آسمان کی حرکت کا اندازہ جدا، مثلاً سورج کا آسمان تین سو پینسٹھ (۳۶۵) دن اور ایک کسر میں، چاند کا آسمان اٹھائیس (۲۸) دن میں، عطارد اور زہرہ کے آسمان سورج کے آسمان کی مانند اپنی گردشیں پوری کرتے ہیں، زحل کا آسمان تیس (۳۰) سال میں، مشتری کا آسمان بارہ (۱۲) سال میں، مریخ کا آسمان دو (۲) سال میں، ثوابت کا آسمان چھ ہزار تیس (۶۰۳۰) سال میں یا پچیس ہزار دو سو (۲۵۲۰۰) سال میں اور آسمان محیط ایک (۱) دن میں، اور اسی طرح مشرق یا مغرب کی طرف توجہ میں یا شمال وجنوب کی طرف مائل ہونے میں ان کی حرکات، اور اسی طرح ہر ستارے کا اس

مقدار کے ساتھ مخصوص ہونا جو کہ چھوٹے اور بڑے ہونے کی وجہ رکھتا ہے سے، اور جو رنگ رکھتا ہے۔ جیسے زہرہ کی سفیدی، زحل کی تاریکی، مشتری کی چمک، مریخ کی سرخی، قمر کی تاریکی، اور عطارد کی زردی۔ اور اسی طرح افلاک کی ترکیب، ایک حرکت کا دوسری حرکت کے ساتھ رابطہ، ستاروں کے اطوار کا مختلف ہونا۔ جو کہ اتصالات اور انفصالات کے پیدا ہونے کو لازم ہیں۔ اور ان سے عالم سفلی میں قسم قسم کی تاثیریں ظاہر ہوتی ہیں۔ اور سب کی سب عین حکمت کے مطابق اور درست انداز میں

وَالْاَرْضِ اور زمین کی پیدائش میں۔ جو کہ ایک گول شکل رکھتی ہے۔ اور جہان کے عین وسط میں ایسی سطح رکھتی ہے کہ جب اس پر سورج پڑتا ہے تو اس کے جسم کی کثافت کی وجہ سے سورج کے مقابلہ میں ایک مخروطی شکل کا سایہ پیدا ہوتا ہے۔ جو کہ سورج کی طرح حرکت کرتا ہے۔ اور جہان میں نور اور روشنی کو لینا متحقق ہوتا ہے۔ یہاں تک جب چاند اس مخروطی شکل کے سایہ میں پڑتا ہے تو گرہن لگ جاتا ہے۔ نیز زمین کو غیبی تدبیر کے ساتھ کرۂ آب سے کسی قدر خالی کیا گیا ہے۔ تاکہ اس پر جانور اور درخت قرار پکڑ سکیں، اور زمین کے قطعات کے اطوار کو آسمان کی نسبت مختلف کیا گیا تاکہ سورج اور دوسرے ستاروں کا زمین کے شہروں میں رہنے والوں کے سروں کی محاذات سے گزرنا مختلف ہو۔ اور اس اختلاف کی وجہ سے مختلف فصلیں اور آدمیوں میں گوناگون مزاج اور قسم قسم کی عادات پیدا ہوں۔ اور افقوں کے اختلاف کی وجہ سے طلوع ہونے والے اور طلوع کے مقامات مختلف ہوں۔

اور اس سب کچھ کے باوجود زمین کو نباتات اور درختوں کے اُگنے کا مقام، اور دانے، غلے، میوے اور پھل نکلنے کی جگہ بنایا گیا۔ کہیں درختوں کے ہجوم نے جنگل کی صورت اختیار کی۔ اور کہیں دریا اور نہریں جاری ہیں۔ اور کہیں کان نکلتی ہے۔ گویا معدنیات کا خزانہ ہے، کہیں چشمہ جوش مارتا ہے۔ تو کہیں اونچے پہاڑ سر آسمان کو لگائے ہوئے ہیں۔ کہیں تحت الثریٰ تک رگ و ریشہ پہنچائے ہوئے گڑھے، اور ان عجائبات کے باوجود زمین جہان کا بوجھ اپنے اوپر لیے ہوئے ہے۔ مخلوقات سے کئی قسموں کا ظلم قبول کر کے شاہ و گدا کو پناہ دیتی ہے۔ اور اس کا کوئی احسان نہیں مانتا۔ آدمیوں کی خلقت کا مادہ بھی ہے۔ اور ان کی جائے

معاش، سجدہ گاہ اور محل عبادت بھی، اس کا ایک قطعہ خدا کا گھر ہونے کی طرف منسوب ہے تو دوسرا قطعہ رب العزت کے محبوب، بندۂ خاص کے جسد مقدس کا مدفن۔ ان نورانی مقامات کے سامنے انوار آسمانی گویا کچھ بھی نہیں ہیں۔ آسمانوں میں فرشتوں کی عبادت گاہیں ان تجلیات کے آشیانوں کا رشک دل میں لیے ہوئے۔

وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ اور شب وروز کے اختلاف میں جو کہ علویات اور سفلیات کے عوارض ہیں۔ آسمانی سورج کی مخروطی شکل کی شعاع جس کا سر سورج کے مرکز سے لگا ہوا۔ اور اس کا نچلا حصہ زمین کے کناروں میں سے ایک کنارے کے ساتھ لگا ہوا ہے دن کی حقیقت ہے۔ اور زمین کا تاریک سایہ جس کا نچلا حصہ آفاق میں سے کسی افق کے ساتھ لگا ہوا ہے۔ اور اس کا سراس سے مقابل سورج کے نقطہ سے چسپاں رات کی حقیقت ہے۔ اور ان دونوں کا کامل نزاع اور اختلاف ہے۔ یہ تاریک اور وہ نورانی، یہ سرد اور وہ گرم، یہ سیاہ اور وہ سفید، یہ ایک سمت کو جاتی ہے وہ دوسری سمت کو، یہ ایک ملک میں اور وہ کسی دوسرے ملک میں، یہ آرام اور نیند کا وقت اور وہ کام اور کسب کا وقت، یہ خلوت کا وقت اور وہ جلوت کا وقت، یہ چھپنے کا اور وہ ظاہر ہونے کا وقت، اور اگر ہر رات کو دوسری رات کے ساتھ اور ہر دن کو دوسرے دن کے ساتھ اور اسی طرح سال کی راتوں کو سال کے دنوں کے ساتھ قیاس کریں ایسا اختلاف نمودار ہوتا ہے۔ جس کی انتہا نہیں۔ اور دونوں کا رنگ اور لمبائی ایک دوسرے کی ضد پر ہے۔ رات سے جو کم ہوتا ہے دن میں اس قدر زیادتی ہوتی ہے۔ دن رات کا مجموعی دورہ چوبیس (۲۴) گھنٹے ہے۔ چھ (۶) مہینے رات لمبی اور دن چھوٹا اور چھ (۶) ماہ اس کے برعکس۔ اور جہاں قطب زیادہ بلند ہو جاتا ہے بعض اوقات تمام دورہ ایک (۱) دن ہوتا ہے۔ بلکہ بعض مقامات پر کہ فلک محیط کا قطب سر کے مقابل ہو جاتا ہے چھ (۶) مہینوں تک دن رہتا ہے۔ اور اسی طرح رات۔

اور دنوں اور راتوں میں شادی کا دن اور ماتم کا دن، ولادت کی رات اور وفات کی رات، جنگ اور لڑائی کا دن۔ اور عیش اور جشن کا دن۔ بیماری کا دن اور شفا کا دن، تکلیف کی رات اور راحت کی رات، فقر و فاقہ کی رات اور دولت اور امیری کی رات، چاندنی رات اور

اندھیری رات، عابدوں کی رات اور چوروں کی رات آپس میں کس قدر اختلاف رکھتی ہیں۔ حالانکہ دونوں سورج کی حرکت کے ساتھ وابستہ ہیں۔ اور دونوں حیوان اور انسان بلکہ نباتات اور درختوں کی روزی میں مصروف کار ہیں۔ دونوں ضدوں کا ایک کام پر اتفاق عجیب کاموں میں سے ہے۔ نیز رات کے پہلے حصے میں لوگوں پر نیند کا غلبہ پہلے نفخہ میں موت کا نمونہ ہے۔ اور ان کا طلوع فجر کے نزدیک بیدار ہونا دوسرے نفخہ میں موت کے بعد زندگی کا نمونہ ہے۔ اور فجر مستطیل کے ظہور کے ساتھ رات کی تاریکی کا پھٹ جانا نادر چیزوں میں سے ہے۔ گویا کہ صاف پانی کی ایک نالی گدلے دریا کے درمیان جاری ہے۔ اور آپس میں ہرگز نہیں ملتے۔

وَالْفُلْكِ اور کشتیوں کے چلنے میں۔ اور یہ صنعت اور ترکیب صرف درباہ خداوندی سے حضرت نوح علیہ السلام پر القاء ہوئی حتیٰ کہ غرق ہونے سے امن کا سبب ہوئی۔ اس کے بعد لوگوں میں رائج ہوئی۔ بخلاف دوسری صنعتوں اور ترکیبوں کے جیسے عمارات، چھکڑا اور ہل وغیرہ کہ لوگوں نے اپنی سوچ کے ساتھ بنائے ہیں۔ نیز پانی کی سطح پر کشتی کا چلنا محض قدرت الٰہی کے ساتھ وابستہ ہے۔ اس لیے کہ پہلے تو یہ پانی کے قوام کے پتلا ہونے پر موقوف ہے۔ اور اسی لیے دریائے شمالی میں جو کہ حد سے زیادہ ٹھنڈک کی وجہ سے سال کا اکثر منجمد رہتا ہے کشتی نہیں چلتی۔ دوسرے کشتی کے مادہ کے خفیف اور ہلکا ہونے پر موقوف ہے کہ کھلے مسام درمیان میں ہونے اور ان کی کثرت کی وجہ سے ہوا کے خفیف جسم کا ظرف بن سکے۔ ورنہ تانبے اور لوہے کا ایک پہیہ وزن کی وجہ سے پانی کی سطح پر نہیں رہ سکتا۔ اور ہزاروں من تانبہ اور لوہا کشتی میں لاد کر ایک ریاست سے دوسری ریاست تک لے جاتے ہیں۔ تیسرے ان ہواؤں کا بھیجنا جو کہ کشتی کے چلنے میں مددگار ہوں۔ اور اعتدال کے اندازے سے چلیں تاکہ موجوں کے تلاطم اور گرداب کے پیچ وتاب کے ٹکراؤ سے بچی رہے۔ خاص کر اَلَّتِیْ وہ کشتیاں جو تَجْرِیْ فِی الْبَحْرِ کہ ٹھاٹیں مارتے ہوئے دریائے شور میں چلتی ہیں جس کا کوئی کنارا نظر نہیں آتا۔ روئے زمین بالکل نظر نہیں آتا، اور پہاڑ، مینار اور راستہ پہچاننے کے دوسرے طریقے بالکل گم، اور وہاں فریادرسی کا راستہ بالکل بند اور

سورج پانی میں سے طلوع کرتا ہے۔ اور اسی میں غروب ہو جاتا ہے۔ سورج، چاند، ستاروں اور دریا کے پانی کے سوا کوئی چیز نظر نہیں آتی۔ اگر ان کشتیوں میں سوار ہونے والوں کے دِلوں کو بارگاہ خداوندی سے تقویت نہ ملے اس قسم کے سخت حالات پر کس طرح صبر کیا جا سکتا ہے۔ پھر یہ اللہ تعالیٰ کی تدبیر ہے کہ ہر ملک اور ہر ریاست کو اجناس اور سامانوں کے تحائف میں سے کسی چیز کے ساتھ مخصوص فرمایا۔ کہیں سونا زیادہ ہے۔ اور پھل نایاب اور کہیں گھوڑے زیادہ ہیں۔ اور خوراک کم۔ کہیں غلہ کافی ہے۔ اور پھل زیادہ مگر سونا کم اور کہیں کوئی چیز کہیں کوئی چیز۔ اگر یہ خصوصیتیں نہ ہوتیں تو کون سا آدمی اپنے آپ کو پر خطر سفر اور خطرناک دریا میں ڈالتا تھا، پھر ایک ملک کے سامان کو دوسرے ملک تک منتقل کرنے کے لیے لوگوں میں ضرورتیں ظاہر کیں، اور تجارت کے نفع کا شوق دِلوں میں پختہ کیا حتیٰ کہ وہ اس خیال کی وجہ سے اپنے آپ کو اس قسم کی سختیوں میں ڈالتے ہیں۔ اور بعض لوگوں کو حج اور انبیاء علیہم السلام اور اولیاء اللہ کی زیارت کا شوق بے چین کیے لے جاتا ہے۔

لفظ بحر اور اس کے معنی کی تحقیق - دریائے شور کی خلیجوں کا جغرافیہ

اور لغت عرب میں بحر دریائے شور کا نام ہے۔ اور میٹھے دریا کو بحر نہیں کہتے مگر کبھی مجاز اور استعارہ کے طور پر۔ اور دریائے شور کی اصل جو کہ اکثر اطراف سے زمین کی آبادی کو محیط ہے اس قابل نہیں کہ اس میں کشتیاں چلیں، اور آمد و رفت کریں۔ اس لیے کہ اس میں آباد جزائر نہیں ہیں۔ اور اس کے ساحلی علاقے بھی آباد نہیں ہیں۔ لیکن اس بحر محیط کے چند قطعے آباد زمین کے وسط میں آ گئے، اور ایک ملک کے سامان کو دوسرے ملک میں منتقل کرنے کا باعث ہوئے، اور ان میں کشتیوں کا چلنا مروج ہے۔ اس میں سے وہ ہے جو جنوب کی طرف سے آیا اور محیط مشرقی کے ساتھ متصل ہے۔ اور محیط غربی سے جدا چار شاخیں ہیں۔ جب ان چاروں کو مغرب کی طرف سے شمار کریں پہلے سب خلیج بربر ہے۔ کیونکہ یہ خلیج ملک حبشہ سے بربر کی حدود سے گزرتی ہے۔ اور جنوب سے شمال تک اس خلیج کا طول ایک سو ساٹھ (۱۶۰) فرسخ ہے۔ اور اس کا عرض پینتیس (۳۵) فرسخ۔ اس کے مغربی بازو پر کفار حبشہ کے شہر ہیں۔ دوسری خلیج احمر ہے۔ جس کا طول جنوب سے شمال تک چار سو ساٹھ (۴۶۰) فرسخ

ہے۔اوراس کا عرض منتہیٰ کے نزدیک ساٹھ (۶۰) فرسخ ہے۔(ہر فرسخ تین (۳) میل کی مسافت ہے۔ہر میل چار ہزار (۴۰۰۰) گز کا ہوتا ہے۔اور ہر گز چوبیس (۲۴) انگشت یعنی چھ (۶) مٹھی کا ہوتا ہے)،اور جہاں یہ خلیج پوری ہوئی وہاں سے فسطاط مصر تک شہر واقع ہیں۔ اوراس خلیج کے مشرقی بازو ہر سواحل حجاز اوراس کی بندرگاہیں ہیں۔ان میں سے فرضہ ہے۔ جوکہ رسول پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مدینہ منورہ کی بندرگاہ ہے۔اوراسی بندرگاہ میں مصر اور حبشہ کے قافلے ملک حجاز میں آتے ہیں۔اوران میں سے جدہ مبارکہ ہے۔جوکہ مکہ معظمہ کی بندرگاہ ہے۔پھر یمن کے سواحل بھی اسی خلیج پڑ ہیں۔یہاں تک کہ اس کے مشرقی زاویہ پر عدن کا شہر واقع ہے۔

تیسری خلیج فارس ہے۔اس کا جنوب سے شمال تک طول چار سو ساٹھ (۴۶۰) فرسخ ہے۔اوراس کا عرض ایک سو اسی (۱۸۰) فرسخ کے قریب ہے۔اوراس کے مغربی بازو کے سواحل پر ملک عمان ہے۔اوراسی لیے اس خلیج کو بحر عمان کہتے ہیں۔اور حجاز، یمن اور طائف کی تمام عرب ولایتیں اس خلیج کے مغربی بازو اور خلیج احمر کے مشرقی حصہ کے درمیان واقع ہیں۔اوراسی لیے اس ولایت کو جزیرۂ عرب کہتے ہیں۔اور مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ بھی اسی ولایت میں ہیں۔اس خلیج کے مشرقی بازو کے ساحل میں فارس کے شہر پھر ہرموز پھر مکران پھر سندھ کی دوسری بندرگاہیں ہیں۔

چوتھی خلیج اخضر ہے۔اور یہ خلیج بھی جنوب سے شمال کو آتی ہے۔اور مثلث الشکل ہے۔اس کا مشرقی بازو محیط شرقی کے ساتھ متصل ہے۔اوراس کا مغربی بازو پانسو فرسخ ہے۔ اوراس بازو کے سواحل پر آبادی ہے۔اوراسی لیے اسے بحر چین کہتے ہیں۔اوراس بحر کے مغربی گوشے سے بحر فارس کے مشرقی گوش تک کو بحر ہند کہتے ہیں۔اس لیے کہ دکن، گجرات اور کچھ کی ولایت اس کے ساحلوں پر واقع ہیں۔اور جو مشرق و مغرب کی طرف سے آتا ہے ایک بہت بڑی خلیج ہے۔جوکہ مغرب کے اکثر شہروں سے گزرتی ہے۔اور سوڈان کی سرزمین کے مقابل ہے۔اور مصر اور شام کے شہروں تک پہنچتی ہے۔اور یہ تمام شہر اس کے جنوبی بازو پر ہیں۔لیکن اس کا شمالی بازو اندلس اور صقالیہ کے شہروں پر گزرتا ہے۔یہاں

تک کہ روم کے شہروں تک پہنچتا ہے۔اور وہاں سے اس خلیج کی ایک شاخ صقالیہ کی زمین کے شمال سے گزر کر ملک بلغار پر گزرتی ہے۔اور اس مقام تک اس خلیج کا طول ایک سو (۱۰۰) فرسخ اور اس کا عرض تینتیس (۳۳) فرسخ ہے۔اور ان اطراف سے گزر کر مشرق کی سمت کو جاتی ہے۔اور زیادہ تر خشک پہاڑوں اور غیر آباد زمین پر گزرتی ہے۔اور اس سے آگے اس کی انتہا معلوم نہیں ہے کہ کہاں ہے۔یہ ان دریاؤں کا حال ہے۔جو کہ بحر محیط سے متصل ہیں۔اور جو بحر محیط سے متصل نہیں۔پس بحر طبرستان، جیلان، باب الابواب، خزر اور ارمن ہے۔اس لیے کہ یہ سب ولایتیں اس کے ساحلوں پر واقع ہیں۔اور یہ بحر مستطیل شکل کا ہے مشرق و مغرب سے دوسو پچاس (۲۵۰) فرسخ سے زیادہ طول رکھتا ہے۔اور شمال سے جنوب کو دوسو (۲۰۰) فرسخ کے قریب عرض، اور جب اس بحر کو بحر محیط سے متصل دریاؤں کے ساتھ جمع کریں تو بحر محیط کے علاوہ سات بحر عظیم پوری سرزمین میں گنے جاتے ہیں۔اور سبعۃ ابحر کا لفظ جو قرآن مجید میں آیا اسی کی طرف اشارہ ہوسکتا ہے۔

اور باوجود یکہ ان سمندروں میں داخل ہونا بہت بڑی ہلاکت ہے اس سے نجات اسی کشتی کی تدبیر سے ہے۔جو کہ الہام غیبی کے ساتھ انسان کو معلوم ہوئی، اور اس تدبیر میں صرف سمندروں کی ہلاکت گاہوں سے نجات ہی کی رعایت نہیں کی گئی بلکہ یہ کشتیاں ان ٹھاٹھیں مارتے ہوئے سمندروں میں چلتی ہیں۔

بِمَا يَنْفَعُ النَّاس اس چیز کے ساتھ جو کہ لوگوں کو نفع دیتی ہے۔جیسے ایک ملک سے دوسرے ملک تک عبور کرنا، اور اسباب، اموال تجارت اور عمارت کی تعمیر کے بھاری سامان کو لے جانا اور لانا۔اور تھوڑی سی مدت میں پاؤں چلنے کی مشقت اور جانوروں کی سواری کے بغیر جنہیں باندھنا اور ان کا کھولنا اور ان کے چارے اور خوراک کی فکر زندگی کی حلاوت کو خصوصاً دور دراز مقامات پر پہنچنے کے وقت اور تھکاوٹ اور پریشانی کے وقت برباد کردیتی ہے طویل فاصلہ طے کرنا۔اور کشتیوں کے نفعوں میں سے عمدہ یہ ہے کہ استراحت اور نیند کی حالت میں اس کی وجہ سے مراحل سے کیے جاسکتے ہیں۔گویا ایک گھر ہے۔جو کہ پانی کی سطح پر رواں ہے۔بلکہ ایک شہر ہے۔جو کہ پرندے کی مانند جارہا ہے۔کشتی کے سواروں کو بھی

اپنی تجارت یا اپنے مقاصد تک پہنچنے سے نفع ہے۔ اور ان لوگوں کو بھی جن کے ملک میں یہ کشتیاں لنگر انداز ہوتی ہیں نایاب و مرغوب چیزیں پانے کی وجہ سے نفع ہے۔ اور اسی لیے بما ینفع الناس فرمایا گیا، اور کشتی کے سواروں کے ساتھ تخصیص نہ فرمائی گئی، اور اس لفظ میں کشتی اور بحری جہاز کی سواری اور تجارت سے نفع حاصل کرنے کے جواز پر دلیل ہے۔

وَمَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ اور اس میں جو اللہ تعالیٰ نے نازل کیا ہے مِنَ السَّمَآءِ آسمان کی طرف سے۔ جو کہ پانی کی جائے قرار اور معدن بالکل نہیں۔ اس لیے کہ طبعی طور پر پانی زمین پر قرار پانے کا تقاضا کرتا ہے۔ پس صرف اس کی قدرت اور رحمت کا اثر ہے کہ اس طرف سے بے شمار دریا اُترتے ہیں۔

مِنْ مَّآءٍ ایسی قسم کا پانی۔ جو کہ سمندر کے پانی سے علیحدہ ہے ذائقہ میں بھی اور اثر میں بھی۔ کیونکہ سمندر کا پانی شور ہے۔ اور وہ میٹھا۔ سمندر کا پانی کھیتی اور حیوان کی کھال کو جلانے والا ہے۔ اور وہ کھیتوں کی نشوونما میں مدد کرنے والا اور حیوانات کے جسموں کو نفع بخش۔ سمندر کا پانی پیاس بالکل دور نہیں کرتا۔ اور وہ پیاس کا قلع قمع کرنے میں محسوس تاثیر رکھتا ہے۔ سمندر کا پانی سیاہ، گدلا اور غلیظ اور وہ صاف شفاف اور پتلے قوام والا، اور مشترکہ منافع بھی رکھتا ہے۔ جیسے پاک کرنا، نشانات مٹانا، خشک چیزوں کو نرم کرنا اور ہر صنعت میں داخل ہونا بلکہ اپنے جوہر کے اچھا ہونے کی وجہ سے یہ منافع اس میں سمندر کے پانی کے مقابلہ میں اکثر اور بیشتر ہیں۔ خصوصاً بعض صنعتیں اسی پانی پر موقوف ہیں کڑوا پانی ان میں کارآمد نہیں ہوتا یا اسے خراب کر دیتا ہے۔ جیسے غلوں کو پکانا، رنگ بنانا، اور مٹھائیاں اور اندرسہ وغیرہ کی ترکیب۔

پھر اس نازل کیے ہوئے پانی کو ضائع نہ فرمایا کہ اس کے اُترنے کے وقت کوئی اس سے نفع حاصل کرے۔ ورنہ پھر اس سے نفع لینے کی راہ نہ رہے۔ بلکہ زمین میں بعض قطعات کو ایسی خاصیت عطا فرمائی کہ وہ پانی اس کے اندر جا کر دوسرے قسم قسم کے چشموں جیسے فواروں، آبشاروں اور دوسرے جاری چشموں سے جوش مارتا ہے۔ اور بعض دوسرے قطعات کو اور خاصیت عطا فرمائی کہ اس پانی کو اپنے اندر کھینچ کر سنبھال رکھا تاکہ جب کوئی

کنواں یا نہر کھودی جائے وہ پانی نکلے اور کام آئے اور یہ قدرت تو تمام زمین میں مشترک ہے کہ اس پانی کو جذب کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ اگر اس پانی کو اپنی تہہ میں نہ لے جائے یا دوسری راہ سے جاری اور ساری نہ کرے تو اپنی قوت نامیہ کو اس سے ضرور بڑھاتی ہے۔

فَاَحْیَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا پس اس پانی کے ساتھ زمین کو اس کی موت کے بعد زندہ کر دیا۔ کہ اس زمین کی معطل شدہ قوت اس پانی کی وجہ سے پھر اپنے کام میں لگ گئی۔ جس طرح حس و حرکت زائل ہونے والا مردہ پھر زندگی میں لوٹتا ہے۔ اور اس سے قسم قسم کے سبزے، گھاس، درخت، بیلیں، شگوفے، گلاب کے پھول اور پھل نکلتے ہیں۔ اور اس میں نالیاں اور نہریں جاری ہوتی ہیں۔ گویا مردے کے جسم کا خشک شدہ خون اس کی رگوں میں نئے سرے سے جاری ہو گیا۔ اور اس کی خالی شدہ ہڈیوں پر گوشت پوست، بال اور اس کے گرے ہوئے ناخن اُگ آئے۔ اور گمشدہ رونق اور تازگی پالی گئی اور گیا ہوا پانی نہر میں پھر سے آ گیا۔ حیوانات کے رزق وافر مقدار میں پیدا ہو گئے۔ اور حیوان کی بے شمار اقسام کی ولادت کا مادہ حاصل ہو گیا۔

وَبَثَّ فِيْهَا اور اس تدبیر کے ساتھ اس زمین میں پھیلا دی مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ ہر متحرک حیوان کی جنس۔ اس لیے کہ حیوان کی دو قسمیں ہیں، تولدی جو کہ خود بخود پیدا ہوتا ہے۔ جیسے ٹڈی، سانپ، بچھو، مینڈک، پتنگے کی اقسام، اور کیڑے مکوڑے اور اس قسم کا وجود اس بارش اور زمین کی چھپی ہوئی حرارت کے ابلنے کے ساتھ وابستہ ہے یا حرارت اور رطوبت کے جمع ہونے کی وجہ سے معتدل بدبول جائے۔ اور حیات حیوانی کو قبول کرلے۔

توالدی جیسے گائے، اونٹ، آدمی اور سب چرنے اور اُڑنے والے جانور، اور اس قسم کی بقا نباتات، غلوں، میووں اور پھلوں کے ساتھ وابستہ ہے کہ اس قسم کی غذا بھی چیزیں ہیں۔ اور ان چیزوں کا وجود بارش آنے اور زمین کی قوت نامیہ کے اُبھرنے پر موقوف ہے۔ اور اگر کوئی اچھی طرح سوچے تو اس حقیقت کو پالے کہ بہار کی ابتدا سے جس طرح درختوں اور سبزوں کی نشو نما شروع ہوتی ہے۔ اور گرما کے آخر میں انتہا کو پہنچتی ہے۔ اور پختگی پیدا کرتی ہے۔ اسی طرح حیوانات کے اجسام موسم برسات کی ابتدا سے نشو ونما، بڑھنا اور موٹا

ہونا شروع کرتے ہیں۔ اور خریف کے اوائل میں کمال حسن و جمال، اور وافر گوشت اور چربی کے ساتھ زیب و زینت پکڑتے ہیں۔ اور دودھ اور فضلات پختگی، پکنا اور قوام کا اعتدال بہم پہنچاتے ہیں، پھر آہستہ آہستہ جس طرح درختوں میں پتے گرنا، بے رونقی اور سایہ اور پھل کم ہونا شروع ہوتا ہے۔ اسی طرح حیوانات کے ابدان میں گوشت چربی اور ان کے دودھ کی کمی اور انحطاط محسوس ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ بہار کے قرب میں پوری کمزوری اور گوشت، چربی اور دودھ کی قلت ہو جاتی ہے۔ اور جب بارش برسنا شروع ہوتی ہے تو اپنی سابقہ حالت کی طرف رجوع کرتے ہیں۔

ہاں آدمی جو اپنے لیے خوراک ذخیرہ کرتے ہیں۔ اور درندے کہ جن کی خوراک دوسرے حیوانات کا گوشت ہے بظاہر اس تبدیلی سے محفوظ رہتے ہیں۔ لیکن آخر میں ان کا بھی کھانے، پینے، رونق اور تازگی میں وسعت کا مدار فصل برسات کے اچھے ہونے پر ہے۔ اور چونکہ یہاں خشکی کے جانوروں کا ذکر ہے۔ جو کہ زمین میں پھیلے ہوئے ہیں وَبَثَّ فِيهَا مِنْ كُلِّ دَابَّةٍ کی دلیل سے' تو بحری جانوروں کا بارش کے پانی سے بے نیاز ہونا قابل توجہ نہیں۔ اس کے باوجود علوم حیوان کے ماہرین نے لکھا ہے کہ اگر ایک سال بارش نہ برسے تو دریائی جانور اندھے ہو جاتے ہیں۔ اور ان کی بینائی کمزور ہو جاتی ہے پس وہ بھی بارش کے پانی کے محتاج ہوتے ہیں۔

اور احتمال ہے کہ وَبَثَّ فِيهَا مِنْ كُلِّ دَابَّةٍ کا جملہ انزل پر معطوف ہو، تو بارش کی دلیل کے علاوہ ایک دوسری دلیل بیان فرمائی ہے۔ لیکن اس صورت میں فیہا کی ضمیر کے لیے کوئی خاطر خواہ مرجع میسر نہیں آئے گا مگر تکلف کے ساتھ جیسا کہ پوشیدہ نہیں۔ اور ہر تقدیر پر جو کتاب حیوۃ الحیوان، کتب تشریح حیوانات اور عجائب المخلوقات مطالعہ کرتا ہے وہ اس وسیع کارخانے سے کچھ تعارف حاصل کر لیتا ہے۔ وَمَا يَعْلَمُ جُنُودَ رَبِّكَ إِلَّا هُوَ.

ذکر عجائبات حیوانات

اور حیوانات کی عجائبات میں سے یہ ہے کہ قسم قسم کی صورتیں اور بے شمار شکلیں رکھتے ہیں۔ خصوصاً آدمی تمام حیوانات سے صورتوں اور شکلوں کے اختلاف کے ساتھ مخصوص

ہے، حضرت امیر المومنین عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ ایک شخص نے ان کے پاس ازرہ تعجب کہا کہ شطرنج کا مقدمہ نہایت عجیب ہے کہ شطرنج کا رقعہ باوجودیکہ اتنا طول وعرض نہیں رکھتا لیکن اس میں معمار کھنے کی اس قدر وسعت رکھی گئی ہے کہ اگر ایک شخص ہزار بار کھیلے اس کی دو بازیاں متفق نہیں ہوتیں، ہر بار دوسری بازی ظاہر ہوتی ہے۔ آپ نے فرمایا کہ میں تجھے اس سے بھی زیادہ عجیب شے کی نشاندہی کرتا ہوں جو کہ قدرت الٰہی کے کمال کی دلیل ہے۔ دیکھ کہ آدمی کا چہرہ ایک مربع بالشت بھی نہیں ہے۔ پھر اس میں ہر عضو کے مقامات مقرر ہیں جو کہ بدلتے نہیں، ابرو، آنکھ، کان، ناک اور منہ کو اپنی مقرر جگہوں سے ہٹایا نہیں جاسکتا۔ اس کے باوجود اگر تو اس نوع کے بے شمار افراد کا تجسس کرے تو دو آدمیوں کی صورت میں ایک دوسرے کے مشابہ نہ پائے۔ ہر ایک امتیازی وجہ رکھتا ہے۔ اور اگر یہ تدبیر الٰہی نہ ہوتی تو لوگ ایک دوسرے سے ممتاز نہ ہوتے اور بہت بڑا اشتباہ پڑ جاتا، اور ان کے معاش اور حوائج کا انتظام درہم برہم ہو جاتا۔

اور اگرچہ کشتیوں کا چلنا، آسمان کی طرف سے بارش کا آنا اور زمین میں جانوروں کا پھیلنا اللہ تعالیٰ کی وحدت اور رحمت کے مستقل دلائل ہیں۔ لیکن اگر غور کیا جائے تو یہ تمام دلائل ایک دوسری دلیل پر متفرع ہیں۔ اور وہ

ہواؤں کی گردش کے فوائد

وَتَصْرِيفِ الرِّيَاحِ اور ہواؤں کو گردش دینے میں مختلف سمتوں سے جیسے مشرق، مغرب، شمال، جنوب اور وہ گوشے جو کہ ان طرفوں میں سے ہر دو طرفوں کے درمیان ہیں۔ اور بدلنا ہے ان ہواؤں کا سردی سے گرمی کے ساتھ اور بالعکس۔ اور تری سے خشکی کے ساتھ اور بالعکس۔ اور تیز سے نرمی کے ساتھ اور بالعکس۔ اس لیے کہ ہواؤں کی گردش اور ان کے چلنے کے ساتھ کشتیوں کی روانی، بارش کا آنا اور اس کا منقطع ہونا وابستہ ہے۔ اور ہر جانور کی زندگی سانس لینے کی جگہوں اور نتھنوں کی راہ سے ہوا کھینچنے کے ساتھ ہے۔ تاکہ اس کے ساتھ اندرونی حرکات کو تسکین دے۔ اور اسے دم بدم دوسری ہوا چاہیے تاکہ اس گرم ہوا کے بدلے اس ہوا کو کھینچے اور اس گرم ہوا کو باہر لائے، اور اگر ہواؤں کی تحریک مناسب طریقے

سے نہ ہوتو وبائی مواد کی اصلاح نہ ہو، اور جوہر روح کے فساد، اخلاط کے بدبودار ہونے اور تغیر ارواح کا موجب ہوں۔ اور ہلاکت کا ذریعہ ہوں۔ پھر بارش کے مقدمہ میں ہواؤں کے فوائد اس سے زیادہ ہیں کہ ان کا احاطہ کیا جاسکے۔ زراعت اور کاشت کاری کرنے والے زراعت اور پھلوں کی ہر تبدیلی میں ہواؤں کے محتاج ہوتے ہیں۔ اور ایک جگہ سے دوسری جگہ تک بادل کو چلانے، اسے اٹھانے، درختوں کی پیوند کاری، اور پھلوں کے اُگنے اور پکنے میں ان کی تاثیریں محسوس کی جاتی ہیں۔ اور اسی طرح بادل کے اجزا کو جدا جدا کرنے اور اس کے تار و پود بکھیرنے میں اور نظام عالم میں یہ سب چیزیں درکار ہیں۔ ایک وقت بارش چاہیے۔ اور ایک اس کا منقطع ہونا۔ کبھی بادل کا آنا نفع دیتا ہے۔ اور کبھی نقصان۔ پس رحمت الٰہی کا کمال ہے کہ ہر حاجت کے ضروری اسباب مہیا فرمائے۔ اور ہواؤں کے نادر اثرات میں سے لشکروں کی فتح و شکست ہے۔ جیسا کہ حدیث پاک میں وارد ہے کہ نصرت بالصبا واھلکت عاد بالدبور یعنی میری بادصبا کے ساتھ مدد کی گئی اور عاد کو پچھوا ہوا سے ہلاک کیا گیا۔

نیز کبھی ہوا بیماری کا سبب ہوتی ہے کبھی باعث صحت۔ اور کبھی بادل کو جمع کرتی ہے۔ اور بارش لاتی ہے۔ اور کبھی بادل کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیتی ہے۔ اور زمین کو خشک کرتی ہے۔ کبھی درختوں کو پھل لاتی ہے۔ اور کبھی پھلوں کو بلکہ پتوں کو اُتار پھینکتی ہے۔ اور اسی لیے مسلم اور دوسرے معتبر محدثین کی روایت کے ساتھ حدیث شریف میں وارد ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ جب تم ہوا کے نقصان سے ڈرو تو ہوا کو برا نہ کہو اس لیے کہ ہوا خود بخود نہیں چلتی بلکہ اسے تو حکم دیا گیا ہے۔ تم نے خداتعالیٰ کا حکم نہیں سنا وتصریف الریاح، لیکن یوں کہو اللھم انا نسئلك من خیر ھذہ الریح وخیر مافیھا ونعوذ بك من شرھا وشر ما فیھا۔

ہواؤں کی اقسام نیز ریاح اور ریح میں فرق

اور ابن ابی حاتم نے ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے روایت کی کہ قرآن پاک میں لفظ ریاح جمع کے ساتھ واقع ہوا اس سے مراد رحمت کی ہوائیں ہیں۔ اور جہاں ریح

بلفظ مفرد فرمایا اس سے مراد عذاب کی ہوا ہے۔ جیسا کہ ومن آیاته ان یرسل الریاح مبشرات (الروم آیت ۴۶) اور عاد کے واقعہ میں ارسلنا علیهم الریح العقیم، (الذاریات آیت ۴۱) اور حدیث پاک میں جو کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہ کی روایت سے صحاح میں آئی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہی اشارہ ہے کہ جب ہوا چلنے لگتی ہے تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے اللهم اجعلها ریاحا ولا تجعلها ریحا، اور ابو عبید، ابن ابی الدنیا اور دوسرے محدثین حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے لائے ہیں کہ قرآن پاک میں حق تعالیٰ نے ہوا کی آٹھ قسمیں بیان فرمائی ہیں۔ ان میں سے چار آثار رحمت ہیں۔ اور چار آثار عذاب، رہیں آثار رحمت تو ناشرات مبشرات مرسلات اور ذاریات ہیں۔ اور رہیں آثار عذاب تو خشکی میں عقیم اور صرصر، اور سمندر میں عاصف اور قاصف۔

اور ابوالشیخ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی یہ مضمون روایت کیا۔ نیز عیسیٰ بن ابو عیسیٰ خیاط سے لائے کہ ہوا کی سات قسمیں ہیں صبا، دبور، جنوب، شمال، خروق، نکبا اور ہوائے قائم۔ صبا مشرق سے آتی ہے۔ اور دبور مغرب سے۔ جنوب، جنوب سے۔ شمال، شمال سے۔ نکبا صبا اور جنوب کے درمیان سے، خروق شمال اور دبور کے درمیان سے اور ہوائے قائم مخلوق کے سانسوں کا مادہ ہے۔ اور ابوالشیخ حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت کے ساتھ لائے۔ اور ابن ابی الدنیا اور ابن جریر، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت کے ساتھ کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے تھے کہ باد جنوب جنت سے ہے۔ اور یہ وہی ہوا ہے۔ جسے اللہ تعالیٰ نے لواقح فرمایا ہے۔ اور لوگوں کے لیے اس میں بہت فوائد رکھے اور شمال اصل میں دوزخ سے نکلتی ہے۔ لیکن راستے میں اس کا جنت پر گزر ہوتا ہے تو اسے جنت کا ایک اثر حاصل ہو جاتا ہے۔ اور اس کی ٹھنڈک اسی سے ہے۔ لیکن اس حدیث کا موقع حجاز کے شہر اور اس بازو کے علاقے ہیں۔ اس لیے کہ دریائے شور ان شہروں کے جنوبی حصہ پر واقع ہے جو ہوا اس سمت سے اُٹھتی ہے اس میں حد سے زیادہ نمی ہوتی ہے۔ اور کھیتی کی افزائش کرتی ہے۔ بخلاف شمال کے کہ خشک پہاڑوں سے گزر کر آتی ہے۔ جیسا کہ ہندوستان میں باد دبور۔

اور بخاری اپنی تاریخ میں حضرت ابوالدرداء کی روایت سے لائے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے تھے کہ اللہ تعالیٰ جنت میں ہوا کو پیدا کرتا ہے۔ اور اس کے آگے مضبوط دروازہ بند کر دیتا ہے کہ اس دروازے کی درزوں سے گزر کر ہوا تمہارے پاس پہنچتی ہے۔ اگر وہ دروازہ کھلا ہو تو ہوا کی تیزی کی وجہ سے آسمان اور زمین کی ہر شے متاثر ہو۔ نیز ابوالشیخ نے بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے نقل کیا ہے کہ اگر تین دن تک ہوا نہ چلے تو آسمان اور زمین کے درمیان بدبو پیدا ہو جائے۔ اور ابن ابی شیبہ نے روایت کی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ رات، دن، سورج، چاند اور ہوا سے اگر تمہیں کوئی تکلیف پہنچے تو ان چیزوں کو برا مت کہو اس لیے کہ یہ چیزیں خود بخود کچھ نہیں کرتیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں کسی قوم پر باعث رنج وعذاب کر دیتا ہے۔ اور دوسری قوم پر موجب رحمت وراحت۔

اور بیہقی، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت کے ساتھ لائے کہ ایک شخص نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں ہوا پر لعنت کی۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا کہ ہوا کو لعنت مت کر۔ اس لیے کہ اسے حکم ملتا ہے۔ اور جو کسی ایسی چیز کو لعنت کرے جو لعنت کی مستحق نہیں وہ لعنت اسی پر واپس آتی ہے۔ نیز ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت سے لائے کہ جب بھی تیز ہوا چلتی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے دونوں زانوؤں پر کھڑے ہو جاتے اور اس طرح دعا فرماتے **اللھم اجعلھا رحمۃ ولاتجعلھا عذابا اللھم اجعلھا ریاحا ولاتجعلھا ریحا**، ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ اس دعا کی تفسیر کتاب اللہ میں ہے کہ فرمایا **ارسلنا علیھم ریحا صرصرًا** (القمر آیت ۱۹) **وارسلنا علیھم الریح العقیم** (الذاریات آیت ۴۱) **وارسلنا الریاح لواقح** (الحجر آیت ۲۲) **ان یرسل الریاح مبشرات** (الروم آیت ۴۶)

وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ اور اس بادل میں جو کہ اللہ تعالیٰ کے مسخر کرنے کی وجہ سے لٹکتا رہتا ہے بَيْنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ آسمان اور زمین کے درمیان۔ حالانکہ پانی کی طبیعت نازل ہونے کا تقاضا کرتی ہے۔ تو اس کا اپنی طبع کے خلاف کرۂ ہوا میں لٹکتے رہنا کس غلبے والے کی اور مسخر کرنے والے کی تاثیر کے بغیر نہیں ہے جو اسے تقاضائے طبعی سے روکتی ہے۔ نیز اگر

ہمیشہ بادل چھائے رہتے تو بندوں کو بہت بڑا نقصان لاحق ہوتا۔ کہ سورج کی شعاع چھپ جاتی۔ اور رطوبتیں کثرت پکڑتیں۔ اور ضرورتوں کے لیے آمد ورفت بند ہو جاتی۔ اور اگر بادل بالکل نہ ہوتا تو قحط اور خشکی کا موجب ہوتا۔ تو بادل کے مادہ کو ایک مقرر اندازے کے مطابق رکھنا اور ضرورت کے وقت لانا اور ضرورت ختم ہونے کے بعد نیست و نابود چیز کی طرح کر دینا کہ اصلاً اس کا نام ونشان باقی نہیں رہتا یہ سب کچھ نہیں ہے مگر ایک ایسے مدبر کی تدبیر کے ساتھ جو کہ حکمت والا ہے۔

اور کوئی بادل کے جسم میں غور کرے اس کے بہت بڑا ہونے میں بھی۔ اور اس کے تہ نہ تہ آنے میں بھی۔ اور اس کے نیچے اوپر ہونے میں بھی۔ اور اس کے پھیلنے اور کشادہ ہونے میں بھی۔ حتیٰ کہ ایک لحہ بھر میں تمام افق کو گھیر لیتا ہے۔ اور اس کے لحہ بھر میں پارہ پارہ ہونے میں بھی۔ یہاں تک کہ اس کا نام ونشان باقی نہیں رہتا۔ اور اس کی رعد، برق، صاعقہ اور قوس میں بھی اور اس میں آفتاب کی شعاعوں کے منعکس ہونے کی وجہ سے اس کے رنگوں کے مختلف ہونے میں بھی خصوصاً طلوع و غروب کے قریب، اور گرمی کے مارے ہوئے تشنہ لبوں اور صحرا نوردوں پر اس کے سایہ فگن ہونے میں بھی اور اس کے بننے اور ظاہر ہونے میں بھی کہ ٹکڑے ٹکڑے پیدا ہوتا ہے۔ اور آخر میں وزنی پہاڑ معلوم ہوتا ہے۔ اور آسمان کا چہرہ چھپا دیتا ہے۔ اور غصہ میں بپھرے ہوئے شیر کی طرح شور کرتا ہے۔ اور مست ہاتھی کی طرح بلکہ سرپٹ دوڑتے ہوئے گھوڑے کی طرح جلدی کرتا ہے۔

لَاٰيٰتٍ دلائل ہیں۔ معبود کی وحدانیت پر بھی۔ اور رحمانیت اور رحیمیت پر بھی۔ لیکن ان آٹھوں دلائل سے ان تین نتائج کا اخذ کرنا تھوڑے سے معقول سلیقہ پر موقوف ہے۔ اور اسی لیے باوجودیکہ یہ آٹھوں دلائل خاص و عام کے مشاہدہ میں ہیں۔ اور ساری مخلوق کی نظر میں جلوہ گر ہیں کہا جا سکتا ہے کہ مخصوص ہیں لِقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ اس قوم کے لیے جو اپنی عقل کو نظر و فکر میں استعمال کر کے کارفرما ہوتے ہیں۔ اور اسی لیے حدیث پاک میں اس عظیم آیت کے بارے میں وارد ہوا کہ ویل لمن لاکھا بین لحییہ ولم یتفکر فیھا یعنی اس پر افسوس ہے۔ جو کہ اس آیت کو اپنے دونوں رجسٹروں کے درمیان میوے کی طرح چبانے پر

اکتفاء کرے۔ اوران دلائل میں جواس میں مذکور ہیں غور وفکر نہ کرے۔ اور بعض روایات میں ویل لمن قرء هذه الأية فمج بها وارد ہے۔ یعنی افسوس ہے اس شخص پر جواس آیت کو پڑھ کرکلی کے پانی کی طرح پھینک دے، اوران دلائل کودل میں جگہ نہ دے۔

آٹھوں دلائل مذکورہ کی تینوں مطالب کے ساتھ مطابقت

اوران آٹھوں دلائل کی ان تین مطالب پر عام فہم طریقے سے مطابقت یہ ہے آسمان کے منافع کرزمینی منافع کے ساتھ مربوط کرنے کاان دونوں میں ایک ہی کی تدبیر کے جاری ہونے کے بغیر تصورنہیں ہوسکتا۔ بلکہ تمام آسمانوں اورزمین کی تمام مختلف ریاستوں میں وہی ایک تدبیر جاری ہے۔ اوراگر ہرآسمان میں اس آسمان کی مدبر ایک روح ہوتی اورزمین میں دوسری روح یادوسری ارواح کسی تعلق اورربط کے بغیر تو ایک کے منافع دوسرے کے ساتھ باہم مربوط نہ ہوتے۔ تواگر ہرآسمان میں اوراسی طرح زمین کے مختلف حصوں میں ارواح مدبرہ موجود بھی ہوں تو بھی لازماً ایک حکم کی مغلوب اورایک حاکم کے زیرتسخیر ہوں گے۔ اور معبودیت کے لائق جوکہ منفرد، مستغنی اور ہرماسواپر غالب ہونے کی متقاضی ہے وہی ایک ذات ہوگی نہ کہ مغلوب ارواح جوکہ اپنے خواص اورآثار میں صادر کرنے میں اپنے ہم مرتبہ کی محتاج ہیں۔ اورمنفرد نہیں ہیں۔ یہ ہے اس راہ سے وحدت ثابت کرنے کا طریقہ۔

رہ گیارحمت عامہ اورخاصہ کو ثابت کرنا توبالکل ظاہر ہے۔ اس لیے کہ زمین میں قسم قسم کی صورتوں کوقبول کرنے والے مواد آسمان کے مختلف اطوار کی وجہ سے جوکہ ان کی تحریک سے معرض وجود میں آتے ہیں یکے بعد دیگرے اس مواد پر گرتے ہیں۔ تو معلوم ہوا کہ وہ مدبرواحد رحمان بھی ہے۔ اوررحیم بھی۔

اوراسی طرح دن اوررات کا اختلاف معبود کی وحدت اوراس کی رحمت پر دلیل صریح ہے۔ اس لیے کہ اگر ظلمت اورتاریکی کسی دوسرے کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ اورروشنی اور چمک کس اور کے ہاتھ یں تواحتمال تھا کہ ان میں سے ہرایک تاریکی کے وقت روشنی یاروشنی کے وقت تاریکی لائے۔ اوردونقیضوں کا اجتماع لازم آتا۔ اوراگر ان میں سے ایک اپنے کام میں اس کام کے وقت معطل ہوجاتا اوراسے ممکن نہ ہوتا کہ اپنا تقاضا ظاہر کرسکے تو عاجز

اور پامال ہوتا۔ اور معبودیت کی قابل نہ رہتا، اور کم از کم اس کارخانے میں خود جھگڑے اور کھینچا تانی نمودار ہو جاتی۔ حالانکہ رات اور دن کا باہم آگے پیچھے آنا اور بڑھنا اور گھٹنا ایک طریقے اور ایک ڈھب پر جاری اور دائمی ہے۔ نیز ان دونوں رنگوں کا جہان میں باہمی تبادلہ حصول اعتدال اور جانوروں کے کام کے انتظام کا سبب ہے۔ کہ تاریکی کا ہمیشہ رہنا جہان کو انتہائی درجہ ٹھنڈا کرنے والا ہے۔ جبکہ نور اور شعاع کا دوام اسے حد درجہ گرم کرنے والا ہے۔ تو معلوم ہوا کہ اس کارخانہ کا مدبر اس معقول وجہ کے ساتھ کمال رحمت رکھتا ہے۔ اور اسی طرح معبود کی وحدانیت کے وجود پر کشتیوں کی دلالت بہت روشن ہے۔ کیونکہ کشتیاں جو ہر ارضی غالب رکھتی ہیں۔ اور بلاشبہ جو ہر ارضی پانی سے زیادہ بھاری ہے۔ تو چاہیے کہ پانی کی تہ میں بیٹھ جائیں۔ اور پانی کی سطح پر نہ ٹھہر سکیں۔ اور اگر کہیں کہ اس لکڑی والے ڈھانچے کے اجزا میں ہوا داخل ہو جاتی ہے۔ اور اسے ہلکا کر دیتی ہے تو ہم کہتے ہیں کہ یہ سب بھی لازماً کسی اور کے ہاتھ میں ہے۔ اور اس کے باوجود کشتی کو پتھر، لوہے اور اس قسم کی چیزوں سے پر کرنے کی صورت میں یہ کفایت نہیں کرتا کیونکہ اس وقت ہوا بہت قلیل ہے ان بھاری بھرکم اجسام کو ہلکا کرنے میں اس کے اثر کی پیش نہیں جاتی جیسے کہ لوہے کا بہت تنگ اور ہلکا اندر سے خالی گیند بنائیں اور اس میں بہت سی ہوا پھونک کر اسے بند کر دیں تو لازماً پانی کی تہہ میں بیٹھ جاتا ہے۔ تو بہتر یہی ہے کہ اسباب کا سفر چھوڑ دیں اور یہ معاملہ بلاواسطہ قیوم مطلق کے ارادہ کے سپرد کر دیں۔ نیز اگر دریائے شور کی روح مدبر کشتیوں کے لکڑی کے جسم کے مدبر اور ہوائی جسم کے مدبر جو کہ اس کے مسام کے اندر اثر کر کے اسے پانی کے اوپر کھڑا رکھتا ہے کے حکم سے مغلوب ہوتی تو قابل عبادت نہ ہوتی۔ کہ مغلوب مدبر معبود ہونے کے لائق نہیں۔ اور اگر مغلوب نہ ہوتی تو ان تمام بوجھوں کو سمندر کے پانی کی سطح پر کیوں گھومنے دیتی ہے۔ اور مزاحمت کیوں نہیں کرتی۔ تو معلوم ہوا کہ یہ دونوں کسی اور کے حکم کے مغلوب ہیں جس نے ہر ایک کو دوسرے کے ساتھ صلح میں ڈال دیا۔ اور مطیع کیا۔

اور اسی طرح اس تدبیر کی رحمت پر دلالت بہت ظاہر ہے۔ پہلے تو غیب سے اس تدبیر کا الہام کمال رحمت ہے۔ دوسرے وہ رحمت جو مسافروں، تاجروں اور ان لوگوں کے

حق میں ہے جن کے پاس دور دراز کے علاقوں کے سامان اور نفیس چیزیں بہت جلد پہنچ جاتی ہیں اظہر من الشمس ہے۔ اور اسی طرح مقام ہوا سے پانی کا اُترنا حالانکہ پانی ہوا سے زیادہ بھاری ہے اس مقام پر مخالف کس طرح معرض وجود میں آ گیا۔ پھر اگر پانی کے جسم کی روح مدبر جسم ہوائی کی روح مدبر کا غیر ہے تو ملک غیر میں کیسے متصرف ہوتی ہے۔ اور وہ غیر اپنی ملک میں اس کے تصرف میں مزاحمت کیوں نہیں کرتا۔ اگر مقہور و مغلوب ہے تو قابل عبادت نہیں ہے۔ اور اگر مطیع اور مسخر ہے تو دوسرے سے مغلوب ہے۔ جس نے ایک کو اس دوسرے کا مطیع اور مسخر کر دیا ہے۔

اور اس کارخانہ میں رحمت کا ثبوت اس قدر ظاہر ہے کہ بیان سے بے نیاز ہے۔ اس لیے کہ زمین کو سبزوں، درختوں، پھلوں اور میووں کے ساتھ زندہ کرنا جو کہ حیوان کی روزی کے انتظام کا سبب بھی ہے۔ اور ان کے حال کے اچھا ہونے کا باعث بھی۔

اور ہواؤں کی گردش میں وحدت اس طرح ثابت ہوتی ہے کہ اگر جہان کی طرفوں میں سے ہر طرف کا مالک کوئی دوسرا شخص ہوتا تو مختلف سمتوں والی ہوائیں ایک کام میں مصروف نہ ہوتیں۔ حالانکہ بارش کے مقدمہ میں تجربہ سے ثابت ہوا کہ تمام ہوائیں خدمت کرتی ہیں۔ نیز جب بھی ایک سمت سے ہوا کی حرکت ہوتی۔ تو دوسری سمتوں سے ہوتی ورنہ چار سمتوں کے مالکوں میں سے ایک عاجز اور ناقص ہوتا، اور لازم آتا کہ مختلف سمتوں کی ہوائیں ہمیشہ ایک وقت میں جمع رہیں۔ اور جہان کا کاروبار برباد کر دیں۔ اور اس گردش میں رحمت کا ثبوت بھی ظاہر اور روشن ہے۔ جیسا کہ دوران تفسیر اس کا کچھ حصہ گزرا۔ بلکہ بارش، بادل اور کشتی کے کارخانہ کی بنیاد سب کی سب ہوا پر ہے۔ اور درخت اور پھل زیادہ امداد ہوا سے ہی لیتے ہیں۔ اور حیوانات کے سانس ہوا پر موقوف ہیں۔ اور اسی لیے کہا گیا ہے کہ زندگی برباد ست یعنی زندگی ہوا پر ہے۔

اور اسی طرح بھاری بادل کا آسمان اور زمین کے درمیان لٹکتا کھڑا رہنا جس میں کروڑوں من پانی موجود ہے ایسے قیوم کی تدبیر پر صریح دلیل ہے۔ جو کہ نہ تو ہوا کے طبعی تقاضا کے مطابق اسے اوپر جانے دیتا ہے۔ اور نہ ہی پانی کے طبعی تقاضا کے مطابق اسے

نیچے گرنے دیتا ہے۔ اور دونوں طبیعتوں کو ان کے تقاضوں سے روک کر اپنے حکم کے نیچے رکھتا ہے۔ اور اگر اس کارخانہ کی ارواح مدبرہ مختلف ہوتیں تو ان میں سے ہر ایک روح چاہتی کہ میں اپنے بادل کو اس جگہ کھڑا کروں تا کہ میرا بادل نہ برسے، اور اس کا بادل برسے۔ تو اس کارخانہ میں بہت بڑا خلل واقع ہو جاتا، اور اس کارخانہ میں وجوہ رحمت اظہر من الشمس ہیں۔

اسم اعظم

ہم یہاں پہنچے کہ حدیث شریف میں حضرت اسماء بنت یزید بن السکن النصاریہ رضی اللہ عنہا کی روایت کے ساتھ وارد ہے۔ جیسا کہ ابوداؤد، ترمذی اور ابن ماجہ لائے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا اسم اعظم قرآن پاک کی ان دو آیتوں میں ہے وَاِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ لَآاِلٰهَ اِلَّاهُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ اور الٓمّٓ اَللّٰهُ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ۔ (آل عمران آیت ۲۶) نیز دیلمی نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کی کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے تھے کہ سرکش جنوں پر کوئی چیز ان دو آیتوں سے زیادہ سخت نہیں ہے۔ جو کہ سورۂ بقرہ میں ہیں وَاِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ دونوں آیتوں کے آخر تک۔

جن وغیرہ کے آسیب کو دفع کرنے کی دعا

اور ابن عساکر، ابن رشمہ سے لائے کہ وہ آیات جن کی برکت سے خدا تعالیٰ جن کا آسیب اور جنوں کو دور کرتا ہے جو شخص انہیں ہر روز پڑھے ان چیزوں میں سے جو کچھ ہوگا بالکل ختم ہو جائے گا۔ یہ آیات ہیں وَاِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ، آیت الکرسی، سورۂ بقرہ کا آخر۔ اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ سے لے کر الْمُحْسِنِيْنَ تک، اور سورۂ حشر کا آخر۔ نیز کہتے تھے کہ مجھے خبر پہنچی ہے کہ یہ آیت عرش کے خزانوں پر لکھی ہیں۔ نیز کہتے تھے کہ ان آیات کو اپنے بچوں کے لیے لکھ کر دیں تا کہ گھبراہٹ اور ڈر سے پناہ رہے۔

ان آیات کے مضمون کی ان مقاصد کے لیے مناسبت کیا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ آثار ان آیات کے خواص سے ہیں، خواص میں مناسبت تلاش کرنے کی ضرورت نہیں

ہوتی۔ اور اس کے باوجود کہا جا سکتا ہے کہ اسم اعظم شیون الٰہیہ میں سے کسی شان سے عبارت ہے۔ جس کا عموم واطلاق ذات مقدس کے عموم واطلاق کے مشابہہ ہوتا ہے۔ اور اس قسم کی شیون بہت ہیں۔ اور جس طرف سے بھی گہری نظر گہرائی میں اُترے شیون الٰہیہ میں سے کسی ایک شان پر واقع ہوتی ہے جو یہ صفت رکھتی ہے جب عارف اس شان میں عموم واطلاق کے ساتھ جو کہ اس میں ہے گہری نظر سے دیکھتا ہے تو حکم دیتا ہے کہ وہی اسم اعظم ہے۔ اسی لیے حدیث پاک چند چیزوں کے بارے میں وارد ہوا کہ اسم اعظم ہے۔

ہمارے زیر بحث مسئلہ میں اگر انعام، احسان، کارکشائی اور ساری مخلوق کی حاجت روائی کی راہ سے گہری نظر ڈالیں تو ساری کائنات کو گھیرنے والی رحمت خواہ ابتدائی ہو یا انتہائی یہ صفت رکھتی ہے۔ کہ اس آیت کا مدلول ہے۔ اور اگر قیومیت مطلقہ اور چھپے ہوئے وجود اور ہستی کو بالقوۃ کے مقام سے بالفعل میں ظاہر کرنے کے اعتبار سے غور کی جائے تو حیی وقیوم کی شان یہ صفت رکھتی ہے۔ جو کہ آل عمران کی آیت کا مدلول ہے۔ اور دونوں نظروں میں فرق یہ ہے کہ نظر اول بالاصل ماہیات کے ملاحظہ، ان کے اپنے تقاضوں کو چاہئے۔ ان ماہیات کے اپنے تقاضوں پر کمالات استعدادی اور استحقاقی کے فیضان پر مبنی ہوئی اور جس کا فیضان استحقاقی ہے۔ اور ظاہر کے مطابق اس کی استعداد نہیں صرف فضل اور انعام ہے۔ اور دوسری نظر ذات اقدس کی ہر چیز کی تقویم حقیقی پر مبنی ہے۔ اس طرح کہ فی نفسہ اسے ہیچ ہے جو کچھ ہے اپنے کمالات کا اظہار ہے۔ اور ہر نظر اپنے مرتبہ میں درست ہے۔ اور حقیقت تک پہنچی۔

اور اسی طرح یہ دونوں آیتیں پہلی آیت اجمالاً اور دوسری آیت تفصیلاً جتلاتی ہیں کہ معبود، رحمٰن اور رحیم ایک ہے۔ ضروریات کا مرجع، بلائیں دور کرنے والا اور آفات سے حفاظت کرنے والا وہی ہے۔ اور جو کچھ اس کا غیر ہے صرف بے حقیقت نمائش ہے۔ اور یہ معنی سرکش جنوں کی کسر شان میں جگر میں تیر کی طرح بیٹھتا ہے کہ ان کی سرکشی کی بنیاد فرعون صفت ہونے اور معبود بننے پر ہے۔ خصوصاً دوسری آیت میں اس امر کی تصریح ہے کہ جنوں کی سیر اور گردش کی جگہ جو کہ آسمان اور زمین ہے۔ اور ان کی شورش کا وقت جو زیادہ تر

تاریکی اور رات کا وقت ہے۔ اور ان کے کام کا آلہ جو کہ بدن کی بیرونی اور اندرونی ہوائیں ہیں سب کے سب مخلوق اور ایک معبود کے حکم کے مقہور ہیں جو کہ ساری مخلوقات کا حاکم ہے۔ اور جس طرح اس نے شیطانوں کو ایک قدرت بخشی ہے کہ اس کی وجہ سے ایذاء دے سکتے ہیں اسی طرح وہ ایسا کر سکتا ہے کہ دوسری مخلوقات کو ان کا شر دور کرنے کی قدرت بخش دے، اور اس کی رحمت عام ہے۔ اور وہ اس رحمت کے ساتھ ہر مخلوق کی نگہبانی اور اس کی حفاظت فرماتا ہے۔ اور یہی وہ چیزیں ہیں جو کہ شیطانوں کے لشکروں کی شکست کا باعث ہوتی ہیں۔

ایک جواب طلب سوال

یہاں ایک جواب طلب سوال باقی رہ گیا جس کا خلاصہ یہ ہے کہ معبود حقیقی کی وحدانیت اور اس کی رحمت کے دلائل گنتی اور شمار کی حد سے باہر ہیں۔ جیسا کہ عربی میں کہتے ہیں

وفی کل شی له آیة　　　تدل علی انه واحد

یعنی ہر شے میں اس کی علامت ہے۔ جو کہ اس کے ایک ہونے پر دلالت کرتی ہے۔
اور فارسی میں کہتے ہیں ہر گیاہے کہ

از زمیں روید　　　وحدہٗ لاشریک لہ گوید

یعنی زمین سے جو گھاس اُگتی ہے وحدہ لاشریک کہتی ہے۔

تو اس آیت میں ان آٹھ دلائل کی تخصیص کا باعث کیا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ چیزیں جو اس آیت میں ذکر کی گئیں ہر خاص اور عام کے مشاہدہ میں ہیں۔ اور ہر کسی کے سامنے موجود، اور اس کے باوجود ان چیزوں کی اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور رحمت پر دلالت کئی وجہ سے دوسری مخلوقات کی دلالت سے زیادہ واضح اور قوی ہے۔

اس مبہم مسئلہ کی وضاحت یہ ہے کہ معبود کو چاہیے کہ انتہائی تعظیم کا مستحق ہو۔ یہاں تک کہ اس سے اوپر کسی تعظیم کا تصور نہ ہو۔ اور اس جہان میں اگر کوئی کسی کی تعظیم کرتا ہے تو چند چیزوں کی بناء پر کرتا ہے: پہلی چیز یہ کہ اس کی زمین میں سکونت رکھتا ہے۔ جیسے رعایا: دوسری چیز یہ کہ اس کے سائے اور اس کی روشنی میں وقت گزرتے ہیں۔ جیسے لشکری جو کہ خیمہ میں

آرام کرنے ار مشعل اور چراغ سے روشنی لینے کے لیے سردار کی خوشامد اور چاپلوسی کرتے ہیں: تیسری چیز یہ کہ اوقات گزارنے کے لیے اس کا محتاج ہو اس وجہ سے اس کی تعظیم کرتا ہے: چوتھی چیز یہ کہ پر خطر سفر میں اس کی رہنمائی اور نگہبانی کا محتاج ہو جیسے اہل شہر جو کہ اسی وجہ سے دیہات والوں اور گوجروں کے ساتھ چاپلوسی اور خوشامد کے ساتھ پیش آتے ہیں: پانچویں چیز یہ کہ اس کے ہاتھ سے یا اس کے خزانے سے روزی پاتا ہے۔ اور کھاتا ہے۔ جیسے ملازم جو کہ آقاؤں کی تعظیم میں جھکتے ہیں: چھٹی چیز یہ کہ وہ مویشی، سواری اور دوسری نفع بخش حیوانات کو پالتا ہے۔ اور ضرورت کے وقت عاریۃً دیتا ہے۔ اور ان کے دودھ، مکھن اور دہی کے ساتھ سیر کرتا ہے۔ ان لوگوں کی طرح جو کہ عاریۃً سوای اور بار برداری کا جانور لینے اور دودھ اور دہی بخشنے کی امید پر اونٹوں، گھوڑوں اور مویشیوں والوں کی خوشامد کرتے ہیں۔

ساتویں چیز یہ ہے کہ بیماری سے صحت اس کے ہاتھ میں ہے۔ اور اخلاط بدنی کو سنوارنے اور بگاڑنے کا کام اس کے قبضہ میں ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ عام لوگ طبیبوں اور اہل تجربہ کے ساتھ تعظیم و توقیر کے ساتھ پیش آتے ہیں۔ اور ٹونے ٹونکے والوں اور جھاڑ پھونک کرنے والوں کو کہ جن، دیو اور پری کے آسیب کے مقدمہ میں ان کے محتاج ہوتے ہیں خدائی کے قریب تک پوجتے ہیں۔

آٹھویں چیز یہ کہ عجائب و غرائب والا ہے۔ اور جادو ٹونے خوب جانتا ہے۔ اور ایسی چیزیں ظاہر کرتا ہے جن کی دریافت عقل سے باہر ہے۔ چنانچہ عوام زیادہ تر انہیں کی وجہ سے فریفتہ ہوتے ہیں۔ اور اس کی تعظیم کے لیے سر خم کرتے ہیں۔ تو اس آیت میں معبود کی وحدانیت کے اثبات کے لیے انہیں آٹھ چیزوں کو یاد فرمایا گیا۔ گویا اس طرح ارشاد ہوا کہ اگر تم کسی دوسرے کی بے انتہا تعظیم اس وجہ سے کرتے ہو کہ اس کے مکان میں سکونت رکھتے ہو تو یہ ہیں میرے آسمان اور زمین اور تمام مکانات کا مرجع یہی دو مکان ہیں۔ تو اس اعتبار سے بھی انتہائی تعظیم مجھ میں منحصر ہے۔ اور اسی طرح زمان جو کہ رات اور دن سے عبارت ہے میری ملک ہے۔ اور جس زمانے کو کوئی اپنی طرف منسوب کرتا ہے یا دوسرے کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ جیسے روز کالیکا، روز بالو، نوروز، مہربان، یا ہولی یا دوالی تو شب و روز

میں داخل ہے۔ جو کہ میری ملک ہے۔

اور اسی قیاس پر تمہاری معاش کی انتہا تین چیزوں میں سے ایک کے ساتھ ہے۔ تجارت کہ جس کا عمدہ حصہ دریا اور جہاز ہے۔ اور اسی لیے تاجر کے اچھے مرتبہ میں اس کو مثال کے طور پر لاتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ فلاں شخص مال کے جہاز روانہ کرتا ہے۔ اور اس پر خطر سفر میں ساتھی اور نگہبانی صرف میری عنایت ہے۔ نیز جہاز اور کشتی جو کہ اس سفر کی سواری ہے اس کا بنانا میرے الہام غیبی سے تم نے سیکھا ہے۔ بخلاف دوسری بنائی گئی ترکیبوں کے جیسے بیل گاڑی اور ہل وغیرہ کہ بنی آدم نے انہیں اپنی سوچ کے ساتھ نکالا ہے۔ اور کھیتی باڑی کہ اس کی بنیاد ہی بارش کے آنے پر ہے۔ اور وہ صرف میرے ارادہ اور رحمت کے ساتھ وابستہ ہے۔

اور مویشیوں کی پرورش کرنا نسل کو بڑھانا، ان کے دودھ، اون پشم اور کھال حاصل کرنا، حیوان کی زندگی اور بقا اس کی روح اور اعضا کی حفاظت کے ساتھ صرف میری قدرت کے اثر سے ہے کسی کو حیوان کی عمروں میں کوئی دخل نہیں ہے۔ اور اگر اپنے جسموں اور جانوروں کو شفایاب کرنے اور بیمار کرنے میں کسی معبود کے محتاج ہوتے ہیں۔ اور اس وجہ سے اس کی خوشامد اور چاپلوسی میں مصروف ہوتے ہیں تو ہواؤں کو گردش دینا اور ان کے ذریعے جسموں کو صحت یاب اور بیمار کرنا صرف میرا کام ہے۔ اگر ہزاروں طبیب جمع ہو جائیں۔ اور لاکھوں دوائیں استعمال ہوں تو بھی ایسا نہیں کر سکتے کہ فصلوں کو اپنی طبیعتوں پر کھینچ لیں اور ہر موسم کی ہوا کو اس موسم کی طبع کے مطابق کر لیں یا اس سے زہر اور وبائیت کو دور کر دیں۔

اور اگر جنوں اور شیطانوں سے جو کہ دیو اور پری سے عبارت ہیں ڈر کر ان کے بڑوں یا ٹونے ٹوٹکے پڑھنے والوں کے پاس التجاء لے جاتے ہیں تو وہ بھی مجھ تک پہنچتی ہے کہ شیطانوں اور جنوں کے عمل کا آلہ ہواؤں کا مادہ ہے۔ اور اگر عجائب وغرائب کا تماشہ دیکھتے ہو تو اگر ہزار شعبدہ باز اور مداری جمع ہو جائیں۔ اور دس ہزار طلسم اور جادو بروئے کار لائیں میرے ایک عادی اور ہمیشہ سے جاری فعل کی حکایت نہیں کر سکتے کہ میں بھاری بھرکم بادل کو

کروڑوں من پانی کے ساتھ حیلہ اور صنعت کے بغیر اور کسی چیز پر وزن رکھے بغیر آسمان اور زمین کے درمیان معلق رکھتا ہوں۔ اور اس سے ایک قطرہ تک نہیں گرتا جب تک کہ میں حکم نہ کروں، اور جب دنیوی نعمتوں میں سے ہر نعمت انہیں چیزوں سے نکلتی ہے۔ اور انہیں کی شاخوں کی ایک شاخ' تو حقیقتاً اور اصالۃً رحمت بھی میرے ساتھ مخصوص ہوگی۔

اور دوسرے لفظوں میں کہا جاسکتا ہے کہ یہ آٹھوں دلائل جو کہ اس آیت میں مذکور ہیں تمام مخلوقات کو جامع ہیں۔ اس لیے کہ آسمان کی پیدائش میں ستارے، برج، فرشتے اور ارواح مندرج ہوئیں، اور زمین کی تخلیق میں نہریں، پہاڑ، چشمے اور کانیں آگئیں، اور دن رات کے اختلاف میں سال، مہینے، گھنٹے، منٹ اور نور وظلمت کی اقسام لپٹ گئیں بلکہ تمام رنگ بھی داخل ہوگئے۔ اور بارش آنے میں فضا کی ساری کائنات پیش نظر ہے۔ اور زمین کو زندہ کرنے میں دانوں، غلوں، میووں، پھلوں، سبزیوں، پھولوں اور کلیوں کی اقسام جلوہ گر، اور ہواؤں کی گردش میں کرۂ ہوا۔ اور آوازوں اور نعمتوں اور تمام آلات عجیبہ کے جہاں کے سارے عجائب جیسے ہوا کی چکی اور چرخہ کہ اسے ہوا کے ساتھ حرکت دے کر کاتتے ہیں۔ اور ساعت پہچاننے کے اکثر اسباب جو کہ وقت پر عجیب وغریب آوازیں دیتے ہیں سمجھے جاتے ہیں۔ اور کشتیوں کے چلنے میں ان تمام گھڑی گئی ترکیبات کی طرف اشارہ ہوا جو کہ موالید ثلاثہ یعنی حیوانات، نباتات اور جمادات سے مل کر تازہ خاصیت بہم پہنچاتی ہیں۔ اس لیے کہ کشتی ایک ایسا مرکب ہے۔ جو کہ بنایا گیا ہے جسم معدنی یعنی لوہے سے اور جسم نباتی یعنی لکڑی سے اور جسم حیوانی یعنی ملاح اور اس کے مددگاروں سے جو کہ ضرورت کے مطابق اسے چلانے میں بادبانوں اور بنے ہوئے رسوں سے مدد لیتے ہیں۔

اور اس کے باوجود کشتی کا چلنا دو جسم عنصری کے ساتھ وابستہ ہے، پانی اور ہوائے متحرک۔ اور آسمان اور زمین کے درمیان معلق بادل تمام فضائی علامات کی طرف اشارہ ہے۔ جیسے نیزے، دم دار ستارے، گیسو، ہالہ اور قوس کہ ان سب کا پیدا ہونا ایک نہج پر ہے۔ اور جب یہ چیزیں تمام جواہر کو گھیرنے والی ہوئیں اور عمدہ اعراض کو بھی محیط ہوئیں اور کوئی اور عقل یا حس میں آنے والی مخلوق باقی نہ رہی کہ جس سے استدلال کیا جاسکے۔ نیز یہ آٹھوں

دلائل جامع ہیں دلیل ہونے اور نعمت ہونے کو۔ اور اس کے باوجود عام نعمتوں میں امیر و غریب ذلیل و شریف، صحیح و مریض، عالم و جاہل، مومن و کافر اور نیک اور بد ان میں یکساں اور برابر ہیں تو ان دلائل ظاہرہ سے توحید ورحمت پر جو کہ حاضر نعمتیں ہیں نشان دینا اس بات کا کمال سبب ہوتا ہے کہ تمام مخلوقات اس ذات پاک کو عبادت اور محبت کے ساتھ خاص کریں۔ اور اس کے غیر کو اس کے برابر نہ جانیں۔

وَلیکن مِنَ النَّاسِ آدمیوں کے گروہ سے۔ جو کہ شعور اور عقل کے ساتھ تمام مخلوقات سے ممتاز ہیں۔ اور ہر نعمت کے مرتبے کو پہچانتے ہیں مَنْ یَتَّخِذُ ایسے لوگ ہیں جو کہ اپنے لیے پکڑتے ہیں کمال گمراہی کی راہ میں آکر اور حد آدمیت سے باہر ہو کر مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ، اللہ تعالیٰ کے سوا۔ کہ حقیقی منعم اور بالذات محبوب اس کے سوا جہاں میں اور کوئی نہیں ہے اَنْدَادًا خدا کے ہم پایہ۔ حالانکہ اس قدر ظاہری دلائل منع کرتے ہیں اس سے کہ اس کا غیر اس کے برابر نہیں ہو سکتا۔ اگرچہ ایک ہو چہ جائیکہ ان تمام خداؤں کا ہجوم، پھر وہ برابری کے اعتقاد پر ہی اکتفاء نہیں کرتے۔ بلکہ ہر چیز میں انہیں خدا کے برابر کرتے ہیں حتیٰ کہ

یُحِبُّوْنَھُمْ انہیں دوست رکھتے ہیں کَحُبِّ اللّٰہِ اس دوستی کی طرح جو کہ خدا تعالیٰ کے ساتھ رکھنی چاہیے۔ اس کے لیے کہ اللہ تعالیٰ کو بالذات اور بالاصالۃ دوست رکھنا چاہیے۔ اور جو اس کے علاوہ ہے یا تو اس کے حکم کے ساتھ محبوب ہے۔ جیسے انبیاء علیٰ نبینا علیہم الصلوٰۃ والسلام اور اولیاء وصلحاء یا اس بنیاد پر کہ اللہ تعالیٰ کے کرنے سے اس شخص کی حاجت روائی کا وسیلہ ہو جیسے مال، اولاد، وطن اور گھر۔ جبکہ یہ لوگ محب بالذات و بالاصالۃ کا تعلق سمجھے بغیر انہیں دوست رکھتے ہیں۔ تو ان میں سے بعض اپنے ہم جنسوں کو طبیعت کی پستی اور نفس کے کمینہ پن کی وجہ سے خدا تعالیٰ کے ساتھ محبت میں برابر کرتے ہیں۔ جیسے عورتیں، بیٹے، آباء واجداد، احباب، رئیس، بادشاہ اور حاکم۔ اور ان کی محبت کی مساوات کی دلیل یہ ہے کہ جب بھی ان اشخاص کی مرضی اللہ تعالیٰ کی مرضی کے ساتھ یا آباء واجداد کے طریقے کا التزام اور رئیسوں، بادشاہوں اور حاکموں کی اطاعت حکم شرع کے خلاف واقع ہو

تو یہ تردد میں پڑ جاتے ہیں۔ اور حیرت کے گرداب میں پھنس جاتے ہیں کہ ہمیں کیا کرنا چاہیے۔ اس طرف کو ترجیح دینا چاہیے یا دوسری طرف کو۔ انہیں راضی رکھنا چاہیے یا خدا تعالیٰ کو۔

اور بعض اپنی غیر جنس کو جیسے سونا، چاندی، سامان اور جانور، خدا تعالیٰ کے برابر کر دیتے ہیں۔ اور دلی توجہ اور ان کی خبر گیری میں اور ان کے حال کے اہتمام اور انہیں زیادہ کرنے اور بار آور کرنے میں اس قدر منہمک ہوتے ہیں کہ خدا تعالیٰ سے غافل ہو جاتے ہیں۔ اور اس کی عبادت کے اوقات کو ضائع کر دیتے ہیں۔ اور ان میں کچھ لوگ ارواح مدبرہ اور مخلوقات پر مقرر کیے گئے فرشتوں یا ارواح انبیاء علیہم السلام، اولیاء، راہبوں، احبار اور علماء کو بندگی خدا اور اس کی بالاستقلال محبوبیت کے تعلق کو ملاحظہ کیے بغیر محبت خدا میں برابر کرتے ہیں۔ اور ان کے نام کی نذریں اور قربانیاں دیتے ہیں۔ اور ان کے احکام کو ان کے ماخذ میں غور کیے بغیر اللہ تعالیٰ کی وحی ناطق کے برابر شمار کرتے ہیں۔ بلکہ ان میں سے بعض لوگ ان کے ہیکلوں کی صورتوں، قبروں، معبدوں، مسکنوں اور نشست گاہوں کے ساتھ وہ افعال عمل میں لاتے ہیں جو کہ مسجد اور خانہ کعبہ کے لیے کرنے چاہئیں۔ زمین پر سر رکھنا، ارد گرد پھرنا، اور نماز میں قبلہ کی طرف منہ کر کے کھڑے ہونے کی طرح ہاتھ باندھ کر کھڑے ہونا حالانکہ ان کی یہ محبت اللہ تعالیٰ پر ایمان کا تقاضا نہیں۔ اور خدا تعالیٰ کے لیے نہیں کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں مفید ہو اور اس کی رضا مندی میں کام آئے کیونکہ یہ محبت مخلوق کی محبت سے گزر گئی ہے۔ اور ایمان میں لازم ہے کہ مخلوق اور خالق کی محبت میں فرق کیا جائے۔

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اور جو لوگ ایمان لائے اگرچہ ان چیزوں میں سے بعض کو خدا کے لیے اور اس کے حکم کے ساتھ محبوب رکھتے ہیں۔ اور اس کی نعمت کے پہنچنے کا واسطہ جانتے ہیں۔ اور اس کا مطیع بندہ سمجھتے ہیں۔ لیکن اس حد تک نہیں کہ خدا تعالیٰ کے برابر کر دیں بلکہ وہ اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ نہایت سخت اور پختہ ہیں خدا تعالیٰ کی دوستی میں ان چیزوں کی نسبت سے بھی اس لیے کہ خدا تعالیٰ کو بالاصالۃ دوست رکھتے ہیں۔ اور ان چیزوں کو ان میں محبت الٰہیہ کے

ظہور کی جہت کے اندازے اور اللہ تعالیٰ کے حکم کے اندازے کے مطابق دوست رکھتے ہیں۔ اور جب وہ ان چیزوں میں محبت الٰہی کی جہت نہیں پاتے تو ان کی محبت ان چیزوں کے ساتھ بغض اور عداوت کے ساتھ بدل جاتی ہے۔ نیز ہر چیز اور کمال کو ذات الٰہی کے ساتھ مخصوص اور اسی کی جناب سے فائض سمجھتے ہیں۔ اور واسطوں کو پہلا سبب نہیں جانتے، اور اگر سبب جانیں تو اسی کے کرنے سے جانتے ہیں۔ جیسے قلم، دوات، سیاہی، کاغذ، منشی، خدمت گار، چوبدار، خزانے کا داروغہ اور پرگنہ کا عامل عطائے خسروی کے پروانہ میں۔

اور اس برابر کرنے والے لوگوں کی محبت کی نسبت سے بھی۔ اس لیے کہ ان لوگوں نے استحقاق کے بغیر ان چیزوں کے ساتھ دوستی بہم پہنچائی جبکہ خدا تعالیٰ کے ساتھ ایمان والوں کی دوستی ذاتی استحقاق کے ساتھ ہے۔ اور جو چیز استحقاق کے ساتھ ہو زیادہ سخت اور زیادہ مضبوط ہوتی ہے۔ ں چیز کے مقابلہ میں جو بغیر استحقاق کے ہو۔ نیز ایمان والوں کی اللہ تعالیٰ کے ساتھ دوستی دائم اور باقی ہے۔ اور ان لوگوں کی ان چیزوں سے دوستی زائل اور فانی۔ اس لیے کہ کافر عذاب دیکھتے ہی ان سے بیزار ہو جائیں گے۔ اور نعرۂ محبت کی بجائے بیزاری چاہیں گے۔ جیسا کہ عنقریب آتا ہے۔ نیز اہل ایمان کی اللہ تعالیٰ سے دوستی راحت وشدت، مرض وصحت، شادی غمی اور لذت ورنج میں یکساں ہوتی ہے۔ جبکہ جاہلوں کی ان چیزوں سے دوستی جب دیکھتے ہیں کہ ان چیزوں کی دوستی سے ہمیں کوئی نقصان اور مشقت پہنچتی ہے تو عداوت اور نفرت میں بدل جاتی ہے۔ اور جس وقت اپنے معبودوں اور مشکل کشاؤں کی امداد سے مایوس ہو جاتے ہیں تو ان سے توجہ کا رُخ پھیر لیتے ہیں۔ اور خدا تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں چنانچہ آیت فاذا رکبوا فی الفلك دعو االلّٰہ مخلصین له الدین (العنکبوت آیت ۶۵) میں ان لوگوں کے اس حال کی حکایت مذکور ہے۔ اور آیت یوم یفر المرء من اخیه وامه وابیه (عبس آیت ۳۴) میں لکھی ہے۔

محبت الٰہی کا کیا معنی ہے؟

ہم یہاں آئے کہ محبت خدا کیا معنی رکھتی ہے۔ علمائے ظاہر کہتے ہیں کہ محبت خواہش کی ایک قسم ہے۔ اور خواہش متعلق نہیں ہوتی مگر اس چیز کے ساتھ جس کا ہونا اور نہ ہونا عقل

کے نزدیک محتمل ہو۔ اور باری تعالیٰ کی ذات وصفات جب واجب الوجود ہیں تو اس کی ذات وصفات کے ساتھ محبت عقل میں نہیں آتی تو محبت الٰہی کا معنی یہی ہے کہ اس کی عبادت اور طاعت کو درست رکھے یا اس کے ثواب اور اس کی رضامندی کو درست رکھے۔

اور اہل سلوک ومحبت کہتے ہیں کہ کمال محبت بالذات ہے۔ اور محبت دل کے مائل ہونے کا نام ہے خواہ کسی غرض پر مبنی ہو یا نہ۔ اس لیے کہ اگر محبت میں کوئی غرض بھی ضرور ہوتی۔ اور ہم ہر چیز کو کسی چیز کے لیے دوست رکھتے تو دور اور تسلسل لازم آتا ہے۔ اور جب بھی ہم اپنے حال سے وجدان اور تجربہ کے ساتھ پاتے ہیں کہ بعض اوقات ہم عالم شخص کو اس سے کسی غرض کی توقع کے بغیر صرف اس کے علم کے لیے دوست رکھتے ہیں۔ اور اسی طرح مرد شجاع کو صرف اس کی شجاعت اور مرد زاہد کو اس کے زہد کی وجہ سے تو ذات اقدس الٰہی جو کہ ہر کمال کی جامع ہے۔ اور ہر کمال اس کا ذاتی ہے کیوں محبوب نہیں ہوسکتی۔ اور اس کی یاد جتنی زیادہ کی جائے۔ اور اس کی قدرت وحکمت کی علامات کو جتنا زیادہ تر نظر میں لایا جائے۔ اور اپنے اوپر اور تمام مخلوقات پر اس کی نعمت واحسان کو جتنا زیادہ ملاحظہ کیا جائے وہ محبت ترقی اور زیادتی اختیار کرتی ہے۔ یہاں تک کہ سلطان محبت دل پر غالب آجاتا ہے۔ اور اس کے غیر کی طرف توجہ نہیں رہتی، اور نفسی حظوظ سے فنا حاصل ہوتی ہے۔

محبت الٰہیہ کی علامت

اور محبت الٰہیہ کی علامت یہ ہے کہ اس کے محبوں اور محبوبوں کو دوست رکھے۔ اور اس سے بغض رکھنے والوں، اور جن پر وہ ناراض ہے انہیں دشمن سمجھے۔ اس کی نافرمانی کے قریب نہ جائے۔ اور عبادت کو پوری خوش دلی اور شوق سے ادا کرے۔ اور خوش دلی کے ساتھ اس کی راہ میں مال قربان کرے۔ اور بے شمار آیات اور احادیث میں محبت کو اس بارگاہ کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔ اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے حق میں لفظ خلیل ارشاد فرمایا گیا۔ اور خدا تعالیٰ کی محبت کو نجات کے دلائل میں سے بہترین قرار دیا گیا۔ جیسا کہ صحیحین میں وارد ہے کہ ایک بدوی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت عالیہ میں حاضر ہوا۔ اور اس نے پوچھا کہ قیامت کب آئے گی؟ حضور علیہ السلام نے فرمایا قیامت کے لیے کیا تیاری کی

ہے کہ اس کے آنے کے متعلق پوچھتا ہے؟ اس نے عرض کی یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)! میں نے نہ روزے زیادہ رکھے۔ اور نہ زیادہ نمازیں۔ اس قدر ہے کہ خدا تعالیٰ اور اس کے رسول علیہ السلام کے ساتھ تہ دلی سے محبت کرتا ہوں۔ آپ نے فرمایا خوش رہ۔ ہر شخص اپنے محبوب کے ساتھ ہے۔

محبت کی حقیقت

اور اس مقام کی تحقیق یہ ہے کہ محبت، ارادہ اور خواہش سے وراء ایک جدا کیفیت ہے۔ اور اس کیفیت کا نتیجہ مجبوری کے، ساتھ کسی چیز کی طرف جھکاؤ ہے۔ ہاں یہ کیفیت چونکہ ارادہ والی چیزوں کے غیر میں پیدا نہیں ہوتی تو ارادہ کے مشابہہ ہو جاتی ہے۔ نیز کبھی یہ کیفیت نفع و نقصان کے تصور کے بعد ارادہ اور خواہش کی طرح دل پر وارد ہوتی ہے۔ اس وجہ سے اسے عین ارادہ سمجھتے ہیں۔ حالانکہ یہ کیفیت نہ ارادہ ہے۔ اور نہ ارادے پر موقوف ہے۔ بلکہ اگر کوئی کیفیت اس کیفیت کے ساتھ مشابہت رکھتی ہے تو وہ جسموں کا طبعی جھکاؤ ان کے مکانوں کی طرف ہے۔ اس قدر فرق ہے کہ یہ جھکاؤ ارادہ والی مخلوق میں ہوتا ہے۔ اور وہ جھکاؤ ارادہ سے خالی مخلوق ہیں۔ اور یہ جھکاؤ دل اور روح میں ہوتا ہے اور وہ جھکاؤ بدن اور جسم پر خصوصاً وہ محبت جو کہ کسی غرض کے ساتھ بالکل ملوث نہیں ہوتی' جیسے اپنے بیٹے اور اپنے نفس کی محبت مکان کی طبعی محبت کے ساتھ بہت مشابہت رکھتی ہے۔ اسی لیے بعض عرفاء نے فرمایا ہے جس کا ترجمہ یہ ہے کہ ہر عنصر کا جھکاؤ اپنے اصلی مقام کی طرف ہوتا ہے۔ میری شورش مستانہ کا راز میرے اصل کی کشش ہے۔ اور ایک دوسرے عارف نے فرمایا۔ تو مقناطیس ہو گیا ہے تو ہمارے دل تیری کشش کی وجہ سے تیری طرف جھکتے ہیں۔

مختصر یہ کہ خدا تعالیٰ کے ساتھ بندے کی محبت کو ان محبتوں کے زمرے سے نہ سمجھا جائے جو کہ کسی غرض اور کسی نفع و نقصان کے تصور اور کچھ حاصل ہونے کی امید پر مبنی ہوتی ہے۔ اور آیات و احادیث کی تاویل میں قدم نہ رکھنا چاہیے، اور اسی لیے عتاب کے مقام پر فرمایا: یحبونھم کحب اللہ۔ اس لیے کہ مخلوق کی محبت کا انداز اور ہوتا ہے۔ اور محبت خالق کا رنگ جدا۔ بلکہ اگر ان لوگوں کی محبت کے حال کو جو کہ مخلوقات کو خدا کے برابر کر دیتے

ہیں۔اور محبت میں اس کے برابر کرتے ہیں اچھی طرح کھنگالیں تو لازماً ان کی وہ محبت کسی نفع اور ضرورت کے وقت کسی مدد کے خیال پر مبنی پائیں گے۔اگرچہ اس محبت کے لائق بھی حضرت حی لا یموت کی ذات پاک ہے نہ کی مخلوقات لیکن ان لوگوں کی بصیرت کی نگاہ پر مضبوط پردہ پڑ گیا اللہ تعالیٰ کے غیر میں امداد کے معتقد ہو جاتے ہیں۔اور اللہ تعالیٰ کو حلیم اور بردبار سمجھتے ہیں۔اور اس کی غیرت اور اس کے عذاب کی شدت سے ڈرتے ہیں۔

وَلَوْ يَرَى اور اگر جانیں الَّذِينَ ظَلَمُوْا جو لوگ ظلم کرتے ہیں خدا تعالیٰ کے ہمسر بنانے اور انہیں نذروں، قربانیوں، عبادت، طاعت اور محبت میں خدا تعالیٰ کے برابر کرنے کی وجہ سے

اِذْ يَرَوْنَ الْعَذَابَ جس وقت کہ دنیا میں عذاب الٰہی دیکھتے ہیں۔کوئی مصیبت آنے یا بیماری پیدا ہونے یا غربت کے غلبہ کی وجہ سے۔اور جس وقت کہ ان چیزوں کی امداد کی توقع رکھتے ہیں، کہ ہمارے پاس آئیں۔اور ہمیں اس عذاب سے خلاصی دلائیں، اور ان کی توقع کے مطابق واقع نہیں ہوتا

اَنَّ الْقُوَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا اس مضمون کو کہ تمام کاموں میں قدرت اور طاقت صرف خدا تعالیٰ کے لیے ہے۔مال، اولاد، یار دوست، بادشاہ، حاکم، پیغمبر (علیہ السلام)، پیر، فرشتہ اور کوئی بھی اللہ تعالیٰ کے حکم کے بغیر مدد نہیں کر سکتے۔اور اگر انہیں اپنے طور پر کوئی قوت بھی ہوتی اللہ تعالیٰ کے ساتھ انہیں برابر کرنا ہرگز روا نہ تھا۔اس لیے کہ خدا تعالیٰ غیور ہے۔مخلوق کو اس کے برابر کرنے سے غضب فرماتا ہے۔

وَاَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعَذَابِ اور یہ کہ خدا تعالیٰ کا عذاب سخت ہے۔تو اپنے ہمسر قرار دیئے ہوؤں سے دست بردار ہو جاتے بلکہ بیزار ہو جاتے۔لیکن یہ لوگ اس وقت ان دونوں مسائل کو بھی نہیں جانتے بلکہ عذاب الٰہی کو ہمسروں کی ناخوشی اور ان کی ناراضگی اس کوتاہی پر جو کہ ان کی نذریں، قربانیاں، طاعت، عبادت اور محبت میں کی گئی ہے محمول کرتے ہیں۔اور ان کی رضا اور چاپلوسی میں کوشش کرتے ہیں۔ہاں اس وقت جان لیں گے جبکہ انہیں کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔

وَاِذْ تَبَرَّءَ الَّذِیْنَ اتُّبِعُوْا جب بیزار ہو جائیں گے وہ جن کی اتباع کی گئی۔ اور ان کے کہنے پر لوگوں نے خدا کے ہمسر بنائے۔ جیسے گمراہی کے پیشوا' بے دین رئیس' اور حکام اور وسوسہ ڈالنے والے شیاطین مِنَ الَّذِیْنَ اتَّبَعُوْا ان لوگوں سے جو ان کے تابع ہو کر کفر میں پڑ گئے تھے۔ اور وہ دنیا میں اپنا بازار گرم کرنے کے لیے لوگوں کو جھوٹے وعدے دیتے تھے۔ اور کہتے تھے۔ اگر آخرت میں تمہیں کوئی نقصان پہنچا تو ہمارے ذمہ ہے اس وقت پہلو تہی کریں گے، اور کہیں گے کہ ہم ان سے واقف نہیں ہیں۔ اور ہم نے انہیں اس کفر کا مشورہ نہیں دیا تھا تا کہ ان کے کچھ عذاب کا تحمل لازم نہ آئے۔ لیکن یہ پہلو تہی کرنا اور بیزاری کا اظہار کرنا بھی فائدہ نہ دے گا۔ اس لیے کہ حق تعالیٰ علام الغیوب ہے ان کے گمراہ کرنے پر مطلع ہے انہیں فارغ نہیں چھوڑے گا۔ بلکہ اپنی سزا پائیں گے۔

وَرَاَوُا الْعَذَابَ اور مخلوق کو گمراہ کرنے کی وجہ سے عذاب بھی دیکھیں گے۔ وَتَقَطَّعَتْ بِهِمُ الْاَسْبَابُ اور ان کے حق میں خلاصی کے تمام اسباب منقطع ہو جائیں گے۔ کیا تابعیت اور متبوعیت' اور کیا رشتہ داری اور دوستی' اور کیا انکار' بیزاری اور گریز۔ اور کیا پکے وعدے اور قسمیں جو کہ دنیا میں ایک دوسرے کے امداد اور تعاون کے لیے باندھے تھے۔ اور جب پیروی کرنے والے دیکھیں گے کہ ہمیں گمراہ کرنے والوں نے ہماری مددگاری سے پہلو تہی کر لی اس وقت جانیں گے کہ ہمسر' بنانا نری غلطی تھی۔ اور ہر چیز میں قدرت اور طاقت صرف خدا تعالیٰ کے لیے ہے۔ ورنہ ہمارے گمراہ کرنے والے ہمسر' مدد کرتے اور یہ ہم سے نہ بھاگتے۔ نیز جان لیں گے کہ حق تعالیٰ گرچہ حلیم اور بردبار ہے۔ لیکن غیور ہے۔ اور اس کی غیرت کی شدت کا اثر اس کے عذاب کی شدت ہے کہ ہمارے گمراہ کرنے والوں نے اس سے اس قدر ہراساں ہو کر ہم سے کنارہ کشی کرتے ہیں۔ لیکن اس وقت ان دونوں مسائل کو جاننا کچھ مفید نہ ہوگا۔ اور مجبوراً کف افسوس ملیں گے۔

وَقَالَ الَّذِیْنَ اتَّبَعُوْا اور گمراہ کرنے والوں کے پیچھے چل کر کفر میں گرنے والے اور خدا تعالیٰ کے ہمسر بنانے والے جب دیکھیں گے کہ یہاں ہمارے گمراہ کرنے والوں کو ہم سے بیزاری کرنے اور کنارہ کرنے کا کوئی فائدہ نہ ہوا۔ اور انہوں نے گمراہ کرنے کا عذاب

دیکھا اور چکھا تو معلوم ہوا کہ بیزاری کی جگہ دنیا تھی نہ آخرت اور وہ ہمارے ہاتھ سے نکل گئی تو کہیں گے

لَوْ اَنَّ لَنَا كَرَّةً کاش ہمیں دنیا میں پھر لوٹنا ہوتا کہ ہم ان سے اپنا انتقام لیں۔ فَنَتَبَرَّءَ مِنْهُمْ تو ہم بھی ان سے دنیا میں بیزاری کریں۔اور بیزار ہونا ہمیں نفع دے۔ كَمَا تَبَرَّءُوْا مِنَّا جس طرح انہوں نے یہاں ہم سے بیزاری اختیار کی۔اگرچہ انہیں اس بیزاری نے نفع نہ دیا لیکن یہ محال آرزو حسرت و افسوس کے سوا نہیں کوئی نفع نہ دے گی، اور ان کے حق میں اسی ایک حسرت پر اکتفاء نہ ہوگا۔ بلکہ

كَذٰلِكَ اسی طرح يُرِيْهِمُ اللّٰهُ اَعْمَالَهُمْ حق تعالیٰ ان کے تمام اچھے بُرے اعمال دکھائے گا

حَسَرٰتٍ حسرتیں ہی حسرتیں۔ فقط دلوں کی حسرتیں ہی نہ رہیں بلکہ ان حسرتوں کے آثار سخت مصیبتیں ہو کر پڑیں عَلَيْهِمْ ان پر۔ اس لیے کہ ان کے اچھے اعمال جیسے خیرات، صدقات اور وہ عبادتیں جو کہ خدا تعالیٰ کے لیے کرتے تھے کفر کی وجہ سے نامقبول اور ضائع ہوئیں۔ان اعمال پر انہیں حسرت ان کے نامقبول اور ضائع ہونے کی وجہ سے ہو گی۔اور ان کے بُرے اعمال جیسے ہمسروں کی پوجا، نذریں اور قربانیاں جو کہ ان کے نام پر دیتے تھے غیرت الٰہی کی شدت اور اس کے عذاب کی شدت کا موجب ہوئے۔ ان اعمال پر ان کی حسرت ان کی قباحت اور نقصان کی وجہ سے ہو گی۔اور یہ حسرتیں ختم ہونے والی بالکل نہیں ہیں۔اس لیے کہ ان حسرتوں کا ختم ہونا عذاب کے خاتمہ کی وجہ سے ہے جبکہ ان سے عذاب کا منقطع ہونا اس وقت ہوگا کہ وہ دوزخ سے باہر آئیں۔

وَمَا هُمْ بِخٰرِجِيْنَ مِنَ النَّارِ اور وہ دوزخ سے باہر آنے والے نہیں ہیں۔ اگرچہ ایمان والے جو کہ گناہوں کی شامت کی وجہ سے دوزخ میں آئے تھے، پیغمبروں علیہم السلام اور قرآن پاک کی شفاعت سے یا ایمان کی بنا پر باہر آئیں گے۔اور عربی کے قاعدہ کے مطابق جو کہ معتزلہ کے نزدیک بھی تسلیم شدہ ہے۔جیسا کہ ما انا قلت کی ترکیب میں اس کی تصریح کی گئی ہے اور کہا ہے کہ مسند الیہ کو ایسے اسم صفت سے پہلے لانا جو کہ فعل کے معنی میں

ہے۔ اور اسے حرف نفی کے متصل لانا مسند الیہ کے ساتھ نفی کو خاص کرنے کا موجب ہے۔ اور اس کے غیر کے لیے اس کا اثبات ہوتا ہے۔ اس بات پر صریح دلیل ہے کہ مومن گناہ گار دوزخ میں آنے کے بعد اس سے باہر آئیں گے۔ تاکہ دوزخ سے باہر نہ آنا کافروں کے ساتھ خاص ہو۔

اور جب انہیں معلوم ہو گیا کہ اغواء اور گمراہ کرنے والوں کی خدا تعالیٰ کی ناراضگی میں پیروی کرنا یہ نتیجہ دیتا ہے کہ حسرت و افسوس کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آتا، اور اللہ تعالیٰ کے عذاب سے کسی طرح چھٹکارا میسر نہیں آتا۔ پس

یَاۤاَیُّهَا النَّاسُ اے لوگو! حکم شرع کے خلاف اپنے پیشواؤں کے پیچھے لگ کر چیزوں کو اپنے اوپر حرام نہ کرو، کیونکہ اس قسم کی پیروی بھی شریک بنانے کی ایک قسم ہے۔ جیسے یہودی بعض چیزوں کو جو کہ ان کی منسوخ شریعت میں حرام تھیں جیسے اونٹ کا گوشت، اس کا دودھ، چربی، دنبہ اور ناخن والے جانور جیسے کبوتر، شتر مرغ کو اب بھی حرام سمجھتے ہیں۔ اور مشرکین مکہ بحیرہ، وصیلہ، سائبہ اور حام کو حرام جانتے ہیں۔ اور ہندو گائے اور بھینس کے گوشت کو، اور عرب کے بعض قبائل جو کہ بنو ثقیف، بنو عامر بن صعصعہ، خزاعہ اور بنو مدلج ہیں گھی اور پنیر کو، اور بعض تکلفاً عبادت کرنے والے مسلمان ٹھنڈے پانی اور لذیز کھانے کو، اور بعض جاہل اپنی یا عزیزوں کی بیماری میں نذر باندھتے ہیں کہ فلاں کھانے پینے کی چیز کو میں نے اپنے اوپر حرام کیا تاکہ شفا حاصل ہو۔ اور بعض ناعاقبت اندیش کسی غصے اور غیرت کی بنا پر قسم کھا کر کسی چیز کو اپنے اوپر حرام کرتے ہیں۔ اس لیے کہ اپنے اوپر کسی چیز کو حرام کرنا گویا کارخانہ خدائی میں شرکت ہے۔ کیونکہ حلال اور حرام قرار دینے کا منصب تو اسی کا ہے۔ دوسرے کے لائق نہیں کہ اس کی ملک میں تصرف کرے۔ اور اس قبیح فعل کو پورے طور پر ترک کرنا یوں ہے کہ جس طرح ان چیزوں کی حرمت سے توبہ کرو اسی طرح

كُلُوْا مِمَّا فِي الْاَرْضِ کھاؤ اس سے جو زمین میں ہے۔ اس لیے کہ زمین اور اس میں جو کچھ ہے خدا تعالیٰ کی مِلک ہے۔ اور تم اس کے بندے، اور جب مالک نے اپنے بندے کو اپنی ملک میں سکونت عطا کی تو اس کی روزی بھی اسی ملک پر تنخواہ رکھ دی۔ ہاں اتنا

چاہیے کہ وہ چیز

حَلٰلًا حلال ہو کہ آخر الزمان رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شریعت میں اس سے منع نہ کیا گیا ہو۔ نیز چاہیے کہ وہ چیز طیبا پاک ہو غیر کے حق سے۔ اور اسے لوٹ کھسوٹ خیانت۔ دھوکہ۔ رشوت۔ سود اور چوری کے ساتھ اس کے مالک سے نہ لیا ہو۔ اس لیے کہ کوئی چیز اپنی ذات میں حلال ہو لیکن دوسرے کا حق اس سے متعلق ہو اور وہ دوسرا اس کے کھانے پر راضی نہیں ہے تو یوں ہوا کہ کوئی پاک چیز نجاست سے آلودہ ہو گئی۔ اور ناپاک ہو گئی۔ اور پاک نہ رہی، اور جب کسی چیز میں یہ دونوں شرطیں جمع ہو جائیں، تو اس کے کھانے سے پرہیز نہ کرو۔ اس لیے کہ پھر بھی اس چیز سے پرہیز کرنا خلاف شرع شیطانی وسوسہ ہے۔

وَلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ اور شیطان کے قدموں کی پیروی مت کرو۔ اور اس کے قدم بقدم مت چلو۔ کہ خدا تعالیٰ کے حکم کے مقابلہ میں تم اپنی طرف سے دوسرا حکم لاتے ہو۔ جس طرح کہ شیطان نے حکم الٰہی کے مقابلہ میں جو اسے حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنے کے بارے میں ہوا تھا ایک شق نکال لی تھی کہ اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ خَلَقْتَنِيْ مِنْ نَّارٍ وَّخَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ اور تم شیطان کی پیروی کس طرح اختیار کرتے ہو حالانکہ

اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ تحقیق وہ تمہارا ایسا دشمن ہے۔ جو کہ اپنی دشمنی کھلے عام ظاہر کرتا ہے۔ اور جس شخص نے اپنے دشمن کی پیروی کی اس نے دیدہ دانستہ اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈال دیا۔ اور اس کی تمہارے ساتھ دشمنی صرف اسی حلال کو حرام کرنے کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ وہ ہر چیز میں تمہاری دشمنی کرتا ہے۔ اس لیے کہ

اِنَّمَا يَاْمُرُكُمْ نہیں حکم دیتا وہ تمہیں۔ اور مشورہ نہیں دیتا مگر بِالسُّوْٓءِ اعمال میں بدی کے ساتھ تاکہ تم اخروی عذاب کے مستحق ہو جاؤ۔ وَالْفَحْشَآءِ اور بے حیائی اور اخلاق میں بے مروتی کے ساتھ تاکہ مخلوق اور خالق دونوں کی نظر میں تم حقیر ہو جاؤ۔

وَاَنْ تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ مَالَا تَعْلَمُوْنَ اور یہ کہ تم خدا تعالیٰ پر جھوٹ باندھتے ہوئے وہ کہو جس کی حقیقت تم نہیں جانتے ہو۔ تاکہ تم کفر کی تصریح میں گرفتار ہو جاؤ، اور

تمہارے اعتقادات جو کہ تمہارے ایمان کا سرمایہ ہے برباد ہو جائیں۔

اور اگر کوئی کہے کہ بعض اوقات شیطان ان چیزوں کے علاوہ اور باتوں کا حکم بھی دیتا ہے۔ چنانچہ ایک بزرگ سے منقول ہے کہ اسے شیطان صبح کی نماز کے لیے بیدار کرتا تھا۔ اس لیے کہ ایک دفعہ صبح کی نماز ان سے فوت ہو گئی تھی۔ وہ اس قدر روئے تھے کہ رحمت الٰہی کے دریا نے جوش مارا اور اسے کئی گنا زیادہ ثواب اسی وقت عطا فرمایا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ شیطان اپنے ہر امر و نہی میں بدی کا قصد رکھتا ہے۔ اگر چہ اس بدی کے ضمن میں اسے کوئی نیکی بھی پہنچتی ہے۔ مثلاً کبھی ایسی چیز سے جو بہت بہتر ہوتی ہے دوسری چیز کی طرف کھینچتا ہے۔ جو کہ بہتری میں اس سے کم تر ہوتی ہے۔ تا کہ آہستہ آہستہ اسے اپنے حکم کی اطاعت میں مطیع کرے۔ اور اسے نری بدی میں لگا دے۔ اور کبھی اس چیز سے جو کہ نیک ہوتی ہے۔ لیکن اسے حاصل کرنا آسان کسی ایسی چیز کی ظرف کھینچتا ہے۔ جو کہ نسبتاً زیادہ نیک اور زیادہ مشکل ہوتی ہے۔ تا کہ مشقت کی زیادتی کی وجہ سے اس سے نفرت پیدا کرے۔ اور چھوڑ دے، اور وہ اس سے محروم رہے۔ اور کبھی کسی کام میں ثواب عظیم حاصل ہونے کے خوف سے کسی ایسے کام میں مصروف کرتا ہے۔ جس میں اتنا ثواب نہیں ہوتا۔ اگر چہ نیک ہو۔ جیسا کہ بزرگ کے واقعہ میں کیا۔ پس اس کا مقصد اس ثواب سے محروم کرنا تھا نہ کہ نماز کی ادائیگی۔

قصہ مختصر جس نے قرآن پاک یہاں تک سنا ہو گا یقین کے ساتھ جانتا ہے کہ شیطان، بارگاہ خداوندی کا ملعون اور اس کی رحمت سے دھتکارا ہوا شخص ہے۔ اور حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد کے ساتھ اس کی دشمنی موروثی ہے۔ اور وہ انہیں گمراہ کرنے پر کمر بستہ ہے۔ اور ظاہر ہے کہ جب حکم دینے والا ملعون اور مردود ہو تو اس کا مامور اور مطیع کیا ہو گا۔ نیز جب حکم دینے والا موروثی دشمن ہو وہ مامور کو کیا حکم دے گا۔ اگر چہ اس آیت کا ورود حلال کو حرام قرار دینے سے منع کرنے میں ہے۔ لیکن ان دو قیود سے معلوم ہوتا ہے کہ کھانے میں احتیاط کرنا چاہیے تا کہ حلال پاک ہو اور جو چیز حلال نہ۔ و جیسے مردار، خون، شراب، خنزیر اور دوسرے درندہ اور نجاست کھانے والے جانور یا حلال تو ہو مگر غیر کے حق کے تعلق کی وجہ سے

پاک نہ ہو جیسے غیر کی ملک اس کی اجازت کے بغیر جیسے بھیڑ، بکری جو کسی سے چھینی ہو یا وہ کھانا جو بطور رشوت لیا ہو اس کا کھانا جائز نہیں۔

اسی لیے ابن مردویہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی کہ ایک دن یہ آیت حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے پاس پڑھی جا رہی تھی کہ سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے اسی حالت میں عرض کی یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)! دعا فرمائیں اللہ تعالیٰ مجھے مستجاب الدعوات بنائے۔ آپ نے فرمایا کہ اے سعد اپنے کھانے میں بہت احتیاط کر کہ حلال اور پاک ہو۔ حتیٰ کہ تو خود مستجاب الدعوات ہو جائے گا۔ اس کے ساتھ قسم فرما کر ارشاد فرمایا کہ بعض اوقات ایک آدمی اپنے پیٹ میں لقمۂ حرام ڈالتا ہے۔ اور اس لقمہ کی نحوست کی وجہ سے چالیس دن تک اس کی دعا قبول نہیں ہوتی اور جس شخص کا گوشت حرام، سود اور رشوت کے ساتھ اُگا ہو جہنم کی آگ اس سے زیادہ لائق ہے۔

اور عبد بن حمید نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی کہ ہر وہ قسم اور نذر جو کہ آدمی سے غصہ کی حالت میں سرزد ہوتی ہے خطوات شیطان میں داخل ہے۔ نیز حضرت حسن بصری رضی اللہ عنہ سے لائے کہ ایک شخص نے ان کے پاس کہا کہ میں نے قسم کھائی ہے کہ اگر میں فلاں کام کروں تو اپنے زانوؤں کے بل چل کر خانہ کعبہ کا حق ادا کروں۔ آپ نے فرمایا کہ یہ خطوات شیطان سے ہے۔ سوار ہو کر حج کر اور اپنی قسم کا کفارہ ادا کر۔ نیز حضرت جابر بن زید رضی اللہ عنہ سے روایت لائے کہ ایک شخص نے نذر باندھی تھی کہ اپنی ناک میں سونے کا چھلا ڈالے تو حضرت جابر بن زید (رضی اللہ عنہ) نے اسے فرمایا کہ یہ سب کچھ خطوات شیطان سے ہے۔ قسم کا کفارہ ادا کر اور یہ کام مت کر کہ تو ساری زندگی مصیبت میں گرفتار رہے گا۔ نیز ابو مجلز سے لائے کہ وہ **لاتتبعوا خطوات الشیطٰن** کی تفسیر میں کہتے تھے کہ اس سے مراد معصیت کی نذر ماننا ہے۔

اور عجیب بات یہ ہے کہ یہ لوگ شیطان کے جال میں گرفتار ہو کر اپنے آباء واجداد کی رسم تحریم حلال پر اس طرح اصرار کرتے ہیں کہ اسے شریعت خداوندی سے زیادہ تر سمجھتے ہیں حتیٰ کہ

وَاِذَا قِیۡلَ لَهُمُ اتَّبِعُوۡا مَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ اور جب انہیں کہا جاتا ہے کہ اس حکم کی پیروی کرو جو خدا تعالیٰ نے نازل فرمایا ہے۔ اور شیطان کے وسوسہ اور اپنے آباء واجداد کے طریقے کو چھوڑ دو قَالُوۡا کہتے ہیں کہ ہم خدا کے حکم کی پیروی نہیں کرتے اس لیے کہ ہم میں یہ قابلیت کہاں کہ حکم الٰہی کی حقیقت کو دریافت کر سکیں۔ نیز یہ یقین کہاں سے حاصل کریں کہ تم نے جو کچھ کہا ہے حکم الٰہی ہے۔

بَلۡ نَتَّبِعُ مَاۤ اَلۡفَيۡنَا عَلَيۡهِ اٰبَآءَنَا بلکہ ہم اس رسم ورواج کی پیروی کرتے ہیں جس پر ہم نے اپنے گزشتہ آباء واجداد کو پایا۔ جو کچھ وہ قدیم زمانے سے کھاتے تھے ہم بھی کھاتے ہیں۔ اور جس چیز کو وہ حرام جانتے تھے ہم حرام سمجھتے ہیں۔ اس لیے کہ ہمارے گزشتہ آباء و اجداد زیادہ دانا اور عقل مند تھے۔ اگر وہ اس رسم ورواج میں کوئی نقصان پاتے تو ان کا یہ معمول کبھی نہ ہوتا۔ نیز اگر ہم اپنے آباء واجداد کی مخالفت کر کے کھانے اور پینے میں بیبا کی کریں تو مخلوق خصوصاً اپنے رشتہ داروں اور کنبے والوں کے مطعون ہوں گے، اور وہ ہمیں برادری سے خارج کر دیں گے۔ اور ہمارے ساتھ بیٹھنا اٹھنا، باہم نکاح اور کھانے پینے کا تعلق ختم کر دیں گے۔ جیسا کہ ہندوؤں میں اسی عذر کی وجہ سے بقال، کایہ اور راجپوت وغیرہ اپنے رواج اور رسم سے نہیں پھرتے، اور بعض جاہل مسلمان بھی ان سے سیکھنے کی وجہ سے بیوگان کا نکاح ترک کرنے اور دوسری باطل رسموں میں اسی قسم کے عذر بیان کرتے ہیں۔

اور ابن اسحاق اور ابن ابی حاتم، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے لائے کہ ایک دن حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یہودیوں سے ہم کلام ہوئے۔ اور انہیں اسلام کی خوبیاں اس قدر سمجھائیں اور قبول اسلام کو ترک کرنے میں انہیں اس قدر لاجواب فرمایا کہ کوئی عذر کی گنجائش نہ رہی۔ اور بات یہاں ختم ہوئی کہ رافع بن خارجہ اور مالک بن عوف اور ان کے دوسرے دانش مندوں نے کہا کہ آپ کے دین کی سچائی تسلیم کرتے ہیں۔ لیکن ہم اس کی پیروی کرتے ہیں جس پر اپنے آباء واجداد کو پایا وہ ہم سے زیادہ عالم اور اچھے تھے تو حق تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی اور ارشاد فرمایا کہ ان سے پوچھئے

یعنی کیا وہ اپنے باپوں کی پیروی ہر حال میں کریں گے خواہ صحیح ہوں یا غلط۔ وَلَوْ كَانَ اٰبَآءُ هُمْ اگر چہ آباء واجداد ہوئے ہوں کہ الولد سر لابیہ کے مطابق ان کی عقل کا نمونہ یہ ہیں

لَا یَعْقِلُوْنَ شَیْئًا کہ کسی چیز کو نہیں سمجھتے تھے۔ اچھی بُری اور نفع ونقصان اور پاگلوں کی طرح بے ربط حرکتیں کرتے تھے۔

وَلَا یَهْتَدُوْنَ اور نہ ہی کسی کے سمجھانے اور راہ دکھانے پر راہ پاتے تھے۔ اس لیے کہ کسی کے سمجھانے سے وہی سمجھتا ہے۔ جسے کچھ عقل وشعور ہو۔ جبکہ انہیں معاد کی عقل بالکل نہیں ہے گو معاش کی عقل رکھتے ہوں۔ اور بالکل ظاہر ہے کہ اگر کسی کے آباء واجداد پاگل اور بے عقل گذرے ہوں وہ ان پاگلوں کی پیروی نہیں کرے گا تو یہ لوگ ہر حال میں اپنے آباء واجداد کی پیروی اپنے لئے کس طرح اختیار کر سکتے ہیں۔ اور یہ اپنے آباء واجداد کی معاشی عقل پر فریفتہ ہو کر دین کے معاملہ میں ان کے اقوال وافعال کی پیروی کرتے ہیں تو صریح غلطی ہے۔ اس لیے معاش کی عقل اور ہے۔ اور دین کی سمجھ اور۔ ان کے آباء واجداد دین کے مقدمات کو بالکل نہیں سمجھتے تھے۔ بلکہ ان مقدمات میں وہ انسانیت کی حد سے باہر نکل گئے تھے، اور سنا کہ انسان کلام کو سنتا ہے یا مضمون کو سمجھنا اور نفع ونقصان اور اچھائی برائی کو دریافت کرنا انہیں بالکل حاصل نہ تھا۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ وہ بلاشبہ کافر تھے۔

وَمَثَلُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا ان کی مثال جو کہ کافر ہو جاتے ہیں۔ دین کے مقدمات کو سمجھنے اور دوسروں کو وہ مقدمات سمجھانے میں بالکل كَمَثَلِ الَّذِیْ اس لَا یَعْقِلُ جانور کی مثال ہے۔ جو کہ یَنْعِقُ کوے کی طرح جمع کرنے یا بھگانے کے لیے آواز نکالتا ہے بِمَا لَا یَسْمَعُ ان حروف اور اوزان کے ساتھ کہ خود بھی ان حروف واوزان سے نہیں سنتا اِلَّا دُعَآءً مگر بلانے کو وَّنِدَآءً اور آواز کو اور وہ کام جس کے لیے بلاتا ہے یا وہ چیز جس سے ڈراتا یا بھگاتا ہے اسے اس آواز سے بالکل دریافت نہیں ہوتی، اور جب خود کو دریافت نہ ہو تو دوسرے سننے والوں کو کس طرح دریافت ہو، اور جب اصل مطلوب اور جس سے بھاگنا ہے دریافت نہ ہو تو اس کا نفع ونقصان کو خصوصاً آخرت میں کس طرح دریافت ہوگا۔ پس سمجھنے

کے بغیر یہ سننا نہیں ہے۔ اسی لیے کہا جارہا ہے کہ تمام کفار خواہ پیشوا یا پیروکار' خواہ آباء و اجداد ہوں یا اولاد صم بہرے ہیں کہ کچھ نہیں سنتے، اور اگر بالفرض اس سننے کو سننا اعتبار کریں تو بلاشبہ حق کے اظہار اور اس کے مقتضا کے مطابق بولنے میں بکم گونگے ہیں۔ اس لیے کہ ان کی زبان س حق کا اظہار نہیں ہوسکتا، اور اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ سب کے سب حقیقت میں نظر کرنے میں عمی اندھے ہیں۔ جب انہوں نے اس حقیقت ہی کو نہ پایا تو اسے بیان کس طرح کر سکتے ہیں۔ اور جب سمجھنا احساس کی فرع ہے۔ اور محسوسات، معقولات کا ابتدائیہ ہیں۔ اور انہوں نے ان مبادیات کو گم کردیا ہے۔

فَهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ پس وہ مقدمات دین میں کچھ عقل نہیں رکھتے۔ گو جانوروں کی طرح معاش کی رکھتے ہوں۔ اور جب انہیں مقدمات دین میں کوئی سمجھ نہ ہوئی تو ان کی پیروی بالکل پاگلوں کی پیروی ہوئی۔

چند فوائد

یہاں چند فائدے باقی رہ گئے۔ پہلا فائدہ یہ ہے کہ يَاأَيُّهَا النَّاسُ عام خطاب ہے مسلمانوں اور کافروں کو حالانکہ حنفیہ اور اکثر اہل اصول کے نزدیک کفار فروع دین کے ساتھ مخاطب نہیں ہوسکتے اور یہ خطاب فروع کے ساتھ خطاب ہے

اس کا جواب یہ ہے کہ کافر جب ثواب کی اہلیت نہیں رکھتے تو اس عمل کے ساتھ جس پر مرتب ہونے والا حکم ثواب ہوتا ہے مخاطب نہیں ہو سکتے۔ رہیں عادات اور معاملات کے قبیلے سے مباح چیزیں کہ ان کا کرنا نہ کرنا برابر ہے۔ نہ تو ان کے کرنے سے ثواب کی توقع ہے۔ اور نہ ان کے نہ کرنے سے عذاب کا خطرہ یہ حکم نہیں رکھتیں۔ ان کے ساتھ کافر کو بھی خطاب ہوتا ہے۔

دوسرا فائدہ یہ ہے کہ یہاں اس آیت کے سیاق میں الفینا کا لفظ واقع ہوا جبکہ سورۂ مائدہ اور سورۂ لقمان میں وجدنا فرمایا۔ ایسا کہنے کی وجہ کیا ہے؟ اہل عربیت نے لکھا ہے کہ الفیٰ ہر صورت میں دو معنوں کے ساتھ متعدی ہوتا ہے۔ اور وجد دو معنوں میں مشترک ہوتا ہے۔ ایک معنی میں ایک مفعول کے ساتھ متعدی ہوتا ہے۔ اور دوسرے معنی میں دو مفعول

کے ساتھ متعدی ہوتا ہے۔تو قرآن پاک کے پہلے مقام میں جو لفظ کہ دو مفعول کے ساتھ متعدی معنی میں صریح نص تھا لائے اس لیے کہ مقصود وہی معنی ہے۔اور آنے والے مقام پر وجدنا کے لفظ کی شہرت کی بنا پر اکتفاء فرمایا اس لیے مقصود معنی کا قرینہ پہلے گزرا ہے۔اور اہل تدقیق نے کہا ہے کہ الفی اور وجدا اگرچہ اصل معنی میں مشترک ہیں جو کہ کسی صفت پر پانا ہے۔لیکن الفی زیادہ تر ان معنوں میں استعمال ہوتا ہے جو عقل سے پائے جاتے ہیں۔اور وجد زیادہ تر محسوس چیزوں میں۔اور جب اس سورۂ میں پہلے مذکور ہوا ہے کہ یہ لوگ درحقیقت شیطان کے تابع ہیں۔اور اس کی دشمنی سے بے خبر،اور شیطان اور اس کی دشمنی محسوس نہیں ہے تو مناسب ہوا کہ یہاں ان کے فریب کھانے کے مقام میں لفظ الفی استعمال ہو،اور سورۂ مائدہ میں اس بات کا ذکر ہے کہ دور جاہلیت کے پرانے لوگ بحائر اور سوائب کو حرام کرتے تھے،اور خدا تعالیٰ پر افتراء کرتے تھے،اور یہ دونوں امر محسوس اور سنے ہوئے تھے۔اور اسی طرح سورۂ لقمان میں اس بات کا ذکر ہے کہ بعض لوگ عقلی اور شرعی دلیل کے بغیر مقدمات دین میں جھگڑتے ہیں۔اور بلاشبہ یہ امر بھی محسوس اور سنا گیا ہے۔اس لیے یہاں ان دونوں سورتوں میں لفظ وجد مناسب ہوا۔

تیسرا فائدہ یہ کہ اس سورۂ میں لَایَعْقِلُوْنَ شَیْئًا ارساد ہوا جبکہ سورۂ مائدہ میں اسی آیت کی مثل میں لَایَعْلَمُوْنَ شَیْئًا۔یہ فرق کس نکتے پر مبنی ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ مذمت کے مقام پر عقل کی نفی علم کی نفی سے زیادہ سخت ہے۔ اس لیے کہ آدمی عقل مند ہونے کے باوجود جاہل ہوسکتا ہے۔جبکہ بے عقل نہیں ہوتا مگر بچہ یا پاگل۔اور جب یہاں کفار نے بل نتبع ماوجدنا کہہ کر صریح عناد اور انکار کیا تو یہاں ان کے پیشواؤں سے عقل کی نفی مناسب ٹھہری۔اور سورۂ مائدہ میں کفار سے صرف اس قدر حکایت ہوئی کہ حسبنا ماوجدنا علیہ آباء نا اور اس دعویٰ کے رد میں علم کی نفی بھی کفایت کرتی ہے۔اس لیے کہ جہالت پر اکتفاء نہیں ہوسکتا۔

چوتھا فائدہ یہ ہے کہ اس آیت میں دو طریقوں سے تقلید کے ابطال کا اشارہ ہے۔پہلا یہ کہ مقلد سے پوچھنا چاہیے کہ تو جس کی تقلید کرتا ہے تیرے نزدیک حق پر ہے یا نہیں؟اگر

اس کا حق پر ہونا نہیں پہچانتا تو اس کے باطل ہونے کے احتمال کے باوجود تو اس کی تقلید کیوں کرتا ہے۔ اور اگر تو اس کے حق پر ہونے کو پہچانتا ہے تو کس دلیل کے ساتھ پہچانتا ہے۔ اگر دوسرے کے تقلید کرنے کی وجہ سے پہچانتا ہے تو بات اس میں چلے گی اور تسلسل لازم آئے گا۔ اور اگر عقل کے ساتھ پہچانتا ہے تو اسے معرفت حق میں صرف کیوں نہیں کرتا، اور اپنے آپ پر تقلید کی عار کو گوارا کرتا ہے۔

دوسرا طریقہ یہ کہ جس کی تو تقلید کرتا ہے۔ اگر اس نے بھی اس مسئلہ کو تقلید کے ساتھ جانا ہے تو تو اور وہ برابر ہو گئے۔ اسے کیا ترجیح رہی کہ تو اس کی تقلید کرتا ہے۔ اور اگر اس نے دلیل کے ساتھ جانا ہے تو تقلید اس وقت پوری ہوتی ہے جب تو بھی اسی مسئلہ کو اسی دلیل کے ساتھ جانے۔ ورنہ اس کا مخالف ہو گا نہ کہ مقلد۔ اور جب تو نے بھی وہ مسئلہ دلیل کے ساتھ جانا تقلید ضائع ہو گئی۔

(اقول و باللہ التوفیق - یاد رہے کہ یہاں جس تقلید کا رد ہے وہ ایمان اور عقائد میں تقلید ہے۔ کیونکہ ایمان مقلد معتبر نہیں۔ جیسا کہ کتب عقائد میں اس کی صراحت ہے۔ فروع وجزئیات میں تقلید جو کہ ائمہ مجتہدین کی تقلید ہے درست اور معمول اُمت ہے حتیٰ کہ مفسر علام خود حنفی مقلد ہیں۔ چنانچہ صاحب تفسیر روح البیان زیر آیت **نصیبھم غیر منقوص** (سورۃ ھود) فرماتے ہیں **وفی الآیۃ ذم التقلید وھو قبول قول الغیر بلا دلیل وھو جائز فی الفروع والعملیات ولا یجوز فی اصول اللہ والاعتقادیات بل لابد من النظر والاستدلال**۔ محمد محفوظ الحق غفرلہ)۔

پانچواں فائدہ یہ ہے کہ پہلے پارے میں اس آیت کی مانند آیت میں **فَھُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ** فرمایا۔ اور یہاں **فَھُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ**۔ یہ فرق کس وجہ سے ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ آیت اس پارہ میں منافقوں کے بارے میں تھی جو کہ ایمان تک پہنچ کر اس سے دور جا پڑے تھے، اور یہ طاقت نہ رکھتے تھے کہ پھر ایمان کی طرف رجوع کریں جبکہ اس پارے میں کافروں کے بارے میں ہے جنہوں نے سرے سے ایمان کو پہچانا ہی نہیں۔ اور کبھی اس سے آشنا نہ ہوئے۔ اور اس کے حسن کو نہ سمجھے۔ تو ہر لفظ اپنے مقام پر اس حد تک موزوں ہے

کہ وہاں دوسرا لفظ نہیں لایا جا سکتا۔

اور جب اس ضرب المثل سے معلوم ہوا کہ کفار جب تک شیطان کے جال میں گرفتار ہیں خطاب الٰہی کو سمجھنے کی قابلیت بالکل نہیں رکھتے، اور حیوانات کی طرح انہیں عقل معاد کے بغیر عقل معاش نصیب ہوئی۔ تو اس حالت میں ان سے اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ احکام کی پیروی کا کیا امکان؟ اس لیے کہ اتباع اس وقت ہو سکتی ہے جب اسے انسان کے سننے کی طرح ادراک اور شعور کے ساتھ سنیں اور سمجھیں۔ اور پھر اسے ایک دوسرے سے بیان کریں۔ جبکہ وہ اس معاملہ میں بہرے، گونگے۔ اور اندھے ہیں۔ پس سمجھنا چاہیے کہ یاایھا الناس میں خطاب عام صرف حجت لازم کرنے اور عذر دور کرنے کے لیے ہے۔ مقصود بالذات خطاب ایمان والوں کے ساتھ ہے۔ اسی لیے دوسری مرتبہ خطاب کو خاص کر کے ہم فرماتے ہیں

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو۔ اور تمہارے حواس اور عقلیں مقدمات دین کو دریافت کرنے میں صحیح اور درست ہیں۔ بے کار نہیں۔ تو سمجھو کہ ایمان اور محبت خداوندی کے تقاضا کے لائق نہیں کہ تم لذیذ اور مزے دار چیزوں کے کھانے سے پرہیز کرو بلکہ ایمان کا مقتضیٰ یہ ہے کہ حکمت الٰہی کو اس سے مقصود حد تک پہنچاؤ، اور جن چیزوں کو اللہ تعالیٰ نے کھانے کے لیے پیدا فرمایا ہے ان سے حد مقصود انہیں کھانا ہے۔ اور محبت کا تقاضا یہ ہے کہ جو کچھ عطا فرمائے اسے پوری دل جمعی اور خوشی کے ساتھ جہاں اسے منظور ہے استعمال کرنا چاہیے۔ یہاں تک کہ عشاق نے معشوقوں کے ہاتھ سے کڑوی شے کو بھی میٹھا سمجھ کر کھایا ہے۔ تو

کُلُوْا مِنْ طَیِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰکُمْ ان حلال اور پاکیزہ چیزوں سے کھاؤ جو ہم نے تمہیں روزی عطا فرمائی ہے۔ اگرچہ ذائقہ میں لذیذ اور قیمتی ہوں۔ اور اگر تمہیں اس بات کا خوف ہے کہ اگر ہم اس طرح کی لذیذ اور اچھی چیزیں کھائیں گے تو حظ نفس میں گرفتار ہو جائیں گے، اور اللہ تعالیٰ کی عبادت سے پیچھے رہ جائیں گے۔ تو ایسی تدبیر کرو کہ عین حظ نفس میں مشغول ہونے میں عبادت میں بھی مصروف رہو۔

وَاشْكُرُوْا لِلّٰهِ اور اللہ تعالیٰ کے لیے شکر کرو۔ اس لیے کہ لذیذ نفیس شے کا کھانا جو کہ طبعی طور پر مرغوب ہو شکر کو دل کی گہرائی سے نکالتا ہے۔ اور اس قسم کا شکر ایک عمدہ عبادت ہے جو کہ منعم حقیقی کی محبت میں اضافہ کرنے کا موجب ہے۔ اور اس قسم کی عبادت جیسا کہ اس کا حق ہے نفس کے لذت حاصل کیے بغیر ادا نہیں ہوتی۔ تو اس لذت حاصل کرنے کو وسیلۂ عبادت بناؤ۔ اور وسیلۂ عبادت کو عبادت سمجھو۔ اور یہی ہے عارفوں کی شان کہ عادتوں کو عبادت بنالیتے ہیں۔

ہاں ناقص لوگ عبادت کو نفس کشی، فقر و فاقہ، خشک چیزوں کے کھانے اور چیتھڑے پہننے میں منحصر خیال کرتے ہیں۔ اس بنا پر کہ ان کی طبیعت اسی عبادت سے الفت رکھتی ہے۔ اور وہ اپنے مقتداؤں سے اسی قسم کی عبادت کو دیکھتے سنتے آئے ہیں۔ لیکن حقیقت میں یہ خالص عبادت خداوندی نہیں ہے۔ بلکہ اپنی طبیعت اور عادت کی رضا کی بھی اس میں ملاوٹ ہے۔ جس طرح کہ کسی حکمت کی بنا پر مالک اپنے کسی غلام کو راحت، نیند اور آرام کرنے کا حکم نہ دے، اور وہ غلام کم نگاہی کی وجہ سے سمجھے کہ یہ چیزیں مجھے اپنے مالک کی خدمت سے باز رکھتی ہیں۔ تو چاہیے کہ میں نیند، آرام اور راحت کو ترک کر دوں، اور مشقت طلب خدمات میں کوشش کروں کہ یہ اطاعت حقیقت میں اپنے وہم اور خیال کی اطاعت ہے نہ کہ اپنے مالک کی اطاعت۔ تو تم ایسا نہ کرنا۔

اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ اگر تم خالص اسی کی عبادت کا قصد کرتے ہو۔ اور اپنے وہم، خیال، الفت اور عادت کو دخل نہیں دیتے ہو۔ کیونکہ عبادت سے مقصود معبود کی رضا مندی ہے۔ جس طرح بھی راضی ہو۔ (بیت) گر سلطان دیں مجھ سے طمع چاہے تو اس کے بعد قناعت کے سر پر خاک

شکر کے لئے لذائذ و نفائس کا استعمال

اور جس طرح نفس کو توڑنا اور لذائذ کو چھوڑنا ایک قسم کی عبادت کا موجب ہے۔ جو کہ صبر ہے۔ اسی طرح کھانے پینے کی خداداد نعمتوں میں وسعت کرنا عبادت کی ایک اور قسم کا موجب ہے۔ جو کہ شکر ہے۔ بلکہ یہ قسم محبت کی راہ تک کھینچ لیتی ہے۔ اور معبود کی محبت بڑی

بنیاد ہے۔ اور اس کے باوجود شکر اس دربار پاک سے مطلوب بھی ہے۔ تو اس کے اسباب اور موجبات کو ترک کرنا اس دربار کی طلب کے خلاف راستہ پر چلنا ہے۔ جس سے بندگی میں رخنہ پڑتا ہے۔

اور معتبر راویوں کی روایت کے ساتھ حدیث قدسی میں آیا کہ انی والجن والانس فی نبأ عظیم اخلق ویعبد غیری وارزق ولشکر غیری یعنی میں جنوں اور انسانوں کے ساتھ عجیب قصہ میں واقع ہوا ہوں کہ پیدا میں کرتا ہوں اور وہ عبادت دوسروں کی کرتے ہیں۔ اور رزق میں دیتا ہوں اور وہ شکر دوسروں کا کرتے ہیں۔

اور فقہا نے لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نعمتیں جو کہ بندہ تک پہنچتی ہیں ان کا کھانا مباح ہے۔ اور جوامر کلوا میں وارد ہے اجازت کے لیے ہے شرعی تکلیف کے لیے نہیں۔ لیکن کبھی کھانا واجب بھی ہوتا ہے۔ جیسا کہ اس وقت جب مرنے کی قریب ہو جائے۔ اور کمزوری کی وجہ سے چلنے کی طاقت نہ رہے۔ اور کبھی مستحب ہوتا ہے۔ جیسا کہ مہمانوں کی موافقت کے لئے۔ اور حضرت زید بن علی بن الحسین علیہ السلام جو کہ شہید کے نام کے ساتھ مشہور ہیں سے منقول ہے کہ آپ فرماتے تھے کہ اگر کوئی شخص ان تین موقعوں پر کھانا کھانے اور پکانے میں تکلف کرے تو اس کا حساب نہیں ہوگا۔ اور آخرت کے حساب میں معاف ہوگا۔ مہمانوں کے لیے اگر چہ خود بھی اس طعام سے کھائے۔ روزہ دار کی سحری اور افطار کے لیے گو خود ہو۔ اور بیمار کے لیے جو کہ طعام کی رغبت کم رکھتا ہے مگر جنس کی نفاست کے ساتھ۔

لیکن صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین میں سے بعض نے لذیذ اور نفیس چیزوں کی اباحت میں نص صریح کے باوجود ازرہ احتیاط ان کے کھانے میں منعم سے ہٹ کر نعمت میں مصروف ہونے اور نفس پروری کا موقع اختیار کرنے کا خوف محسوس کر کے عام لوگوں کو اس سے ڈرایا ہے۔ اور مقتدا ہونے کے منصب کی حفاظت کی بنا پر خود بھی اس سے پرہیز فرمائی، اور اسی مکتبہ فکر سے وہ ہے جو ابن سعد، حضرت عمر بن العزیز رضی اللہ عنہ سے لائے کہ آپ نے ایک دن اپنی مجلس میں فرمایا کہ میں نے رات مالیدہ کھایا تھا۔ اس سے پیٹ میں ہوا ہو گئی۔ اس لیے کہ اس قسم کے کھانوں کی مجھے عادت نہیں۔ خوشامدیوں نے عرض کی اے

امیر المومنین! حق تعالیٰ اپنی کتاب میں فرماتا ہے کہ کُلُوْا مِنَ طَیِّبٰتِ مَارَزَقْنٰکُمْ وَاشْکُرُوْ اللّٰہَ. آپ لذیذ کھانے کیوں نہیں کھاتے۔ آپ نے فرمایا حیرت ہے کہ تم نے اس آیت سے کیا سمجھا؟ طیب سے مراد کمائی کا حلال ہونا ہے نہ کہ نفاست اور لذت۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ قبول نہیں کرتا مگر پاک اور بے شک اللہ تعالیٰ نے ایمان والوں کو اس چیز کا حکم دیا جس کا پیغمبروں علیہم السلام کو حکم دیا پس فرمایا یاایھا الرسل کلوا من الطیبات، واعملوا صالحا (المومنون آیت ۵۱) اور فرمایا یاایھا الذین آمنوا کلوا من طیبات مارزقنکم، پھر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس شخص کا ذکر فرمایا جو دراز سفر کر کے پریشان سر بکھرے بالوں کے ساتھ اور غبار سے اٹا ہوا حج کے لیے جاتا ہے۔ اور وہاں آسمان کی طرف دونوں ہاتھ پھیلا کر عرض کرتا ہے یارب یارب حالانکہ اس کی خوراک حرام، اس کی پوشاک حرام اور اس کا پینا حرام، اور عمر کی ابتدا سے اس نے حرام کے ساتھ پرورش پائی۔ اس کی دعا کہاں قبول ہو، اور یہ حدیث صحیح مسلم، ترمذی اور دوسری معتبر کتابوں میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت کے ساتھ موجود ہے۔

لیکن حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کی اس توجیہہ پر متاخرین نے دو طرح سے اعتراض کیا ہے۔ پہلا یہ کہ اگر طیبات سے مراد حلال چیزیں تھیں تو حرف ن جو کہ تبعیض کے لیے ہے مناسب نہ ہوتا۔ اس لیے کہ حلال سارے کا سارا کھانے کا ہے تو حلال کے کھانے کو بعض کے ساتھ کیوں مقید فرمایا جاتا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اس صورت میں تبعیض کے معنی کو کھانے کی حلال چیزوں کے اجزاء پر نظر کر کے سمجھنا چاہیے نہ کہ اس کے افراد پر نظر کر کے کہ اشکال لازم آئے، اور جو چیز حلال ہے اس کے بعض اجزاء حرام ہیں انہیں نہ کھایا جائے۔

ذبح شدہ جانور کی سات چیزیں حرام ہیں

جیسے خون، غدود، دونوں شرم گاہیں، کپورے، مثانہ، پتہ، اور مغز حرام۔ جیسا کہ فقہ کی کتابوں میں اس کی تصریح کی گئی ہے۔ نیز ہر کھانے کی چیز سے سیری سے زیادہ کھانا اس حد

تک کہ ہیضہ پیدا کرے حرام ہے۔ تو ہر حلال سے کھانے کی اجازت اس کے بعض کے ساتھ مقید ہوگی۔

دوسرا اعتراض یہ ہے کہ اگر طیب سے مراد حلال ہو تو گزشتہ آیت یعنی یا ایھا الناس کلوا مما فی الارض حلٰلا طیبا میں بے فائدہ تکرار لازم آئے گا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ بے فائدہ تکرار نہیں ہے۔ بلکہ حقیقت کھولنے والی صفت ہے اس بات کو جتلانے کے لیے کہ حلال چیز جس طرح شرعاً جائز ہے۔ اسی طرح پاک اور پاکیزہ بھی ہے کہ اس میں نجاست کی آلائش نہیں۔ اور بالفرض اگر طیب سے مراد حلال ہو تو لازم نہیں ہے کہ اس کی لذیذ چیزوں کی وسعت سمجھی جائے۔ اس لیے کہ طیب کے معنوں میں علمائے سلف نے بہت اختلاف کیا ہے۔ اور لذیذ اور طبیعت کو خوش لگنے والی شے اس کے معنوں میں سے ایک معنی ہے۔ کیا ضروری ہے کہ وہی معنی مراد ہوں۔

اور بعض نے کہا ہے کہ طیب، حلال سے زیادہ خاص ہے۔ اور اس کا معنی یہ ہے کہ اس کا کسب کسی گناہ کے ساتھ ملا ہوا نہ ہو۔ جیسا کہ تجارت میں جھوٹی قسم اُٹھا کر فروغ دینا، اور کرایہ پر لینے کے معاملات میں جانوروں کی پشت پر زیادہ بوجھ رکھنا، اور کاشکاری میں بیلوں اور کارکنوں سے ان کی ہمت سے زیادہ کام لینا۔

اور بعض نہ کہا ہے کہ حلال وہ ہے کہ مفتیان شرع اس کے حلال کا فتویٰ دیں، اور طیب وہ ہے کہ اپنے دل میں بھی اس کی حرمت کا شبہ نہ ہو۔

گروی مکان کے کرایہ کا بیان

جیسے گروی مکان کا کرایہ اور گروی زمین کی پیداوار کہ مالک رضا و رغبت کے ساتھ حلال کر دیتا ہے۔ اور اس کی وجہ سے علمائے دین اس سے منع نہیں کر سکتے۔ لیکن گروی رکھنے والا اپنے دل میں سمجھتا ہے کہ اس کی یہ رضا و رغبت قرض کی محتاجی کی وجہ سے ہے تو یہ رضا کے معنی میں نہیں ہے۔ اور انہیں صورتوں کے بارے میں حدیث پاک میں وارد ہوا ہے کہ استفت قلبك ولو افتاك المفتون یعنی اگرچہ مفتی تجھے فتویٰ دے دیں مگر اپنے دل میں سے فتویٰ پوچھ۔

اور بعض نے کہا ہے کہ حلال طیب وہ ہے۔ جو کہ بقدر ضرورت روزمرہ کے خرچ کے طور پر اکتفاء کرے۔ اور نفس کو اس کے حقوق کے سوا نہ دے، اور اس کی خوشیوں پر دل نہ رکھے۔ مثلاً کھانے کی چیز سے بھوک دور کرنے کے اندازے پر اکتفاء کرے۔ اور پوشاک سے ستر پوشی اور گرمی و سردی دور کرنے کے اندازے پر اور جائے سکونت سے اس قدر عورتوں کا پردہ ہو بارش اور گرمی و سردی کو روک سکے۔ اور کیا ہی اچھا کہا گیا۔

حضرت لقمان بانسری کے گلے اور سرنگی کے سینے کی طرح تنگ جھونپڑی رکھتے تھے۔ آپ ساری رات پیچ و تاب میں رہتے۔ اور دن میں آدھے دھوپ میں۔ ایک فضول آدمی نے ان سے پوچھا کہ یہ کیسا گھر ہے چھ بالشت اور تین کانے۔ آپ نے ٹھنڈی سانس اور روتی آنکھ سے فرمایا کہ یہ اس کے لیے بہت ہے۔ جیسے فوت ہونا ہے۔

یہاں جاننا چاہیے کہ حدیث شریف میں وارد ہوا ان اطیب ما اکل الرجل من کسبہ وان ولدہ من کسبہ بہت پاکیزہ چیز جسے آدمی کھاتا ہے وہ ہے جو اس کی کمائی ہو اور اس کی اولاد اس کی کمائی میں سے ہے۔

بہترین کمائی کا بیان

اور علماء نے کمائیوں کی ترجیح میں کلام کی ہے۔ اور بہترین کمائی جہاد ہے۔ اس لیے کہ حدیث پاک میں وارد ہوا کہ ہر نبی علیہ السلام کو ایک پیشہ عطا کیا گیا، اور میرا پیشہ راہ خدا میں جہاد ہے۔ اور اس کسب کی بہتری کی وجہ یہ ہے کہ غازی اپنی طرف سے دین کا بول بالا کرنے کے لیے کوشش کرتا ہے۔ اور اس عبادت کے ضمن میں غنیمت کے طور پر مال حلال پاتا ہے۔ لیکن شرط یہ ہے کہ عزم کے وقت غنیمت حاصل کرنے کے خیال کو دل میں ہرگز جگہ نہ دے اور اپنی نیت کو خالص رکھے۔ اس کے بعد تجارت ہے۔ خصوصاً وہ تجارت جو کہ مسلمانوں کی ضروریات کو ایک ملک سے دوسرے ملک اور ایک شہر سے دوسرے شہر تک کھینچنے کا سبب ہو کہ اس کے بارے میں حدیث شریف میں وارد ہے الجالب مرزوق والمحتکر ملعون۔ ضرورت کی چیزیں پہنچانے والے کو رزق ملتا ہے۔ اور ذخیرہ اندوزی کرنے والا ملعون ہے۔ اور جب اس قسم کا تاجر مسلمانوں کی خدمت اور ان تک ان

کی ضروریات پہنچانے کی نیت کو دل میں جگہ دے تو اس کی تجارت عبادت کا حکم پیدا کرتی ہے۔

اس کے بعد زراعت ہے کہ اس میں لوگوں اور جانوروں کی روزی حاصل کرنے کی اچھی نیت بھی ہوتی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی رحمت پر جو کہ بارش اور ہوا ہے قوی بھروسہ اراعتماد بھی متحقق ہوتا ہے۔ ان تین کسبوں کے بعد دوسرے کسب آپس میں اتنی فضیلت نہیں رکھتے۔ ہاں کتابت جس میں علوم دینیہ کی حفاظت، احکام شرعی کو اکٹھا کرنا، انبیاء علیہم السلام کے واقعات اور اولیاء اللہ کے ملفوظات کہ پہنچانا متحقق ہے بہتر معلوم ہوتی ہے۔

اس کے بعد دوسرے پیشے اور صنعتیں جو کہ بقائے عالم کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں۔ جیسے معماری، گلکاری، اینٹیں پکانا، چونا بنانا، تیل نکالنا، روئی بیلنا، سوت کاتنا، جولاہوں کا کام یعنی کپڑا ابننا، درزیوں کا کام، اور آٹا پیسنا بہتر ہیں۔

ان صنعتوں میں سے جو صرف تکلف، زینت حاصل کرنے فخر ومباہات اور دولت کی رونق ہوتی ہیں۔ جیسے زرگری، نقاشی، کارچوب، حلواگری، عطر فروشی اور رنگریزی، پھر یہ صنعتیں بھی جب اپنے موقع پر ہوں تو کراہت نہیں رکھتیں۔ بخلاف ان کسبوں کے جن میں نجاست کی آلودگی یا مخلوق کی بدخواہی یا اللہ تعالیٰ کی نافرمانی پر مدد، یا دین فروشی یا زیادہ جھوٹ بولنا، فریب اور دغا لازم آتا ہو جیسے شراب کشی، قصابی، جاروب کشی، چمڑہ رنگنا، ذخیرہ اندوزی، غسالی، مردے نہلانا، ناچ رنگ کرنا، ڈانس کرنا، نقالی، گھڑا بجانا، دلالی، وکالت، اجرت امامت واذان وخدمت مسجد، تلاوت قرآن اور اس کی تعلیم کی اجرت یہ سب مکروہ ہیں۔ (متاخرین نے یہ اجرت اس اعتبار سے جائز قرار دی ہے کہ نماز پڑھانے، اذان دینے اور قرآن پاک پڑھانے پر تو نہیں۔ البتہ پابندی وقت اور پابندی مقام کی اجرت لے سکتا ہے)۔

الحتصر! اس آیت کا مضمون یہی ہے کہ جو چیز بلاشبہ حلال ہے۔ اگرچہ لذیذ، نفیس اور قیمتی ہو اس کا کھانا جائز اور ادائے شکر کی نیت سے مستحب ہو جاتا ہے۔ متقضائے ایمان اور مقتضائے محبت الٰہی کے خلاف بالکل نہیں ہے۔ ہاں ایمان کے خلاف اور محبت الٰہی کے

منافی یہ ہے کہ اس کی حرام قرار دی ہوئی چیزوں کو کھائے اور اس کی رضامندی سے دور جا پڑے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے تم پر لذیذ چیزیں اور منفعتیں حرام نہیں فرمائی ہیں۔ بلکہ

اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ تم پر ان چیزوں میں سے حرام نہیں کیں کہ جنہیں کھانا طبائع سلیمہ والوں کا معمول ہے۔ جیسے ہرن، بکری، بھیڑ، گائے، بھینس، نیل گائے، گورخر، اونٹ، کبوتر، چڑیا، تیتر، بٹیر اور دوسرے چرنے اُڑنے والے جانور مگر

اَلْمَيْتَةُ مردار جو کہ خود بخود مر گیا ہو یا اسے کسی۔ نے وجہ شرعی کے خلاف ذبح یا شکار کیا ہو جیسے اس کا گلا گھونٹ کر مارا ہو یا لکڑی، پتھر اور ڈھیلا مار کے مارا ہو یا اوپر سے نیچے پھینک کر مارا ہو یا ایک جانور نے دوسرے جانور کو سینگ مار کر مارا ہو یا اسے درندے نے مارا ہو کہ یہ سب چیزیں مردار ہیں۔ اور تم پر مردار کو حرام کرنا عین حکمت کے مطابق ہے۔

مردار کو حرام قرار دینے کی حکمت

اس لیے کہ جانور کے بدن کو پاک کرنے والی روح ہے۔ جب روح اس سے جدا ہو گئی تو اس کی بدبوؤں کی اصلاح کرنے والی شے اس میں نہ رہی تو ان بدبوؤں نے اس کے سارے بدن کو خراب کر دیا۔ اس لیے وہ بدبودار، بدمزہ اور بُری تاثیر والا ہو گیا۔ یہاں تک کہ زہر پیدا کر دی جو کہ اسے مارنے والی ہوئی، اور اگر بھنگی اور چم رنگ اس کے کھانے کے عادی ہو گئے ہوں اور اس سے ضرر نہ پائیں تو یہ معتبر نہیں کہ جب زہر کی عادت ہو جائے تو نقصان نہیں دیتی۔ اور اس کے باوجود ان لوگوں کے اخلاق، شکلیں اور صورتیں مردار کھانے کی وجہ سے یہاں تک تغیر پذیر ہوتی ہیں کہ دائرہ انسانیت سے خارج نظر آتے ہیں۔ اگر اللہ تعالیٰ تم پر مردار کو حرام نہ فرماتا تم بھی اسی طرح ناپاک، بدطبع، بدخلق اور بدشکل ہو جاتے، اور نفس کی رذالت اور طبیعت کے کمینہ پن میں گرفتار ہو جاتے۔

ہاں جانور کے بدن سے روح جدا ہونے کے وقت اس کے خون کو جو کہ تعفن کا باعث ہے۔ اور تمام فاسد اخلاط کا حامل ہے۔ جب نام خدا کے ذکر کے ساتھ نکال دیں تو روح کے پاک کرنے کا بدل یہ تطہیر قائم ہو جاتی ہے۔ اور شکار میں اگرچہ اس طرح خون نکالنا کہ بالکل دور ہو جائے ممکن نہیں ہے۔ لیکن نام خدا کا ذکر اسے پاک کرنے میں روح کے قائم

مقام ہو جاتا ہے۔ اسی لیے شکار میں ذبح ضروری نہیں ہے۔ جہاں بھی اللہ تعالیٰ کے نام کے ساتھ زخم لگا دیں حلال ہو جاتا ہے۔

(اقول وباللہ التوفیق - یہاں اس قدر وضاحت ضروری ہے کہ وہ زخم تیر، تلوار، نیزہ وغیرہ کا ہو جو کہ جارح ہے۔ اگر تکبیر پڑھ کر بندوق وغیرہ سے فائر کیا اور جانور نشانہ بن کر گر پڑا اور ختم ہو گیا تو حلال نہ ہو گا۔ جب تک کہ اسے زندہ پکڑ کر ذبح نہ کیا جائے۔ کیونکہ گولی زخم نہیں لگاتی جسم کو توڑتی ہے۔ از افادات امام اہل سنت حضرت علامہ ابوالبرکات سید احمد صاحب قادری امیر مرکزی انجمن حزب الاحناف لاہور)۔

ہاں وہ جانور جو کہ اپنے قبضہ میں ہیں خون نکالے بغیر نہیں کھائے جا سکتے۔ اور خون نکالنے کا طریقہ یہ ہے کہ حلقوم (یعنی سانس کی نالی) مری (یعنی خوراک کی نالی) اور گردن کی دو بلند رگوں کو کسی تیز چیز کے ساتھ خواہ لوہے سے ہو یا پتھر اور لکڑی سے کاٹنا چاہیے۔ اس لیے کہ خون جمع ہونے کی جگہ دل اور جگر کے ارد گرد ہے۔ اور اس کے اس مکان سے باہر آنے کا سب سے قریبی راستہ یہی سمت ہے۔ اسی لیے طبیبوں کے نزدیک مقرر ہے کہ وہ ان جگہوں میں جمع شدہ مواد کو قے کے ساتھ باہر لاتے ہیں۔ نیز اگر خون کو جانور کے جسم سے دوسری سمت کھینچ کر باہر پھینکنا چاہیں تو اس کی موت دیر لگاتی ہے۔ اور جانور کو بے فائدہ عذاب اور تکلیف دینا لازم آتا ہے۔ بخلاف اس راہ کے کہ بالکل مہلت نہیں دیتا اور جانور کو جلدی ختم کر دیتا ہے۔ نیز جب سانس اندر اور باہر جانے کا راستہ یہی ہے۔ اور سانس روح کی مدد کرنے والا ہے تو چاہیے کہ روح کو اور روح کے سواری کو جو کہ خون ہے اسی راستہ سے باہر لایا جائے۔

نیز روح اور خون غذا سے پیدا ہوتے ہیں۔ اور غذا اسی راستہ سے جاتی ہے۔ تو روح اور خون کو جدا کرتے وقت بھی اسی راہ کو اختیار کرنا چاہیے۔ نیز جب خون اوپر کی سمت حرکت کرتا ہے روح بھی اس کے ہمراہ حرکت میں آتی ہے۔ اور اوپر کی طرف حرکت میں اسے کدورت سے خلاصی اور صفائی مہیا ہوتی ہے۔ اور خباثت کم ہوتی ہے۔ اور اس بات کی قابلیت نصیب ہو جاتی ہے کہ جنت کی خاک ہو جائے۔

مختصر یہ کہ اگر مردار کو جس میں بہت بڑی خباثت پیدا ہوگئی ہے، نہ اس میں روح کی طہارت رہی اور نہ ہی نام خدا کی طہارت اسے لاحق ہوئی کھاتے ہو اور وہ شے تمہارے جسم کا جزو بن جاتی ہے تو تمہاری ارواح کو ناپاک چیزوں کے ساتھ ایک تعلق ثابت ہو جاتا ہے۔ اور ایک خباثت پیدا کرتا ہے۔ پس شیطانوں کی اروح کی طرح ان ارواح سے اللہ تعالیٰ کی محبت منقطع ہو جاتی ہے۔ اور اس جزو خبیث میں ایک زہر اور بدبو موجود ہے اس کے علاوہ ہوتا ہے۔

مچھلی اور مکڑی کے ذبح سے مستثنیٰ ہونے کی وجہ

ہاں دو جانور رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حدیث پاک کے مطابق ذبح سے مستثنیٰ ہیں کہ آپ نے فرمایا دو جانور مردار ہمارے لئے حلال ہیں، ایک مچھلی اور دوسرا جانور ٹڈی۔ رہی مچھلی تو اس لیے کہ اس کے بدن کا مادہ پانی ہے۔ اور پانی بالطبع پاک اور پاک کرنے والا ہے۔ تو جس طرح نجاست پانی میں اثر نہیں کرتی اسی طرح اس آبی جانور سے روح کے جدا ہونے کا بھی اثر نہیں ہوتا اور اس کے ذبح کی حاجت نہیں رہی۔ رہی ٹڈی تو اس وجہ سے کہ توالد و تناسل کے بغیر پیدا ہوتی ہے۔ اور جاری خون نہیں رکھتی۔ اس کے ساتھ روح کا تعلق پہاڑ، درخت اور دوسرے جمادات کے ساتھ ارواح ملکوتیہ کے تعلق کی مانند ہے۔ اور اس قسم کے تعلق والی روح کا جدا ہونا پلید کرنے کا موجب نہیں ہوتا۔ اور اگرچہ تمام دریائی جانور اور تمام پیدا ہونے والے حشرات الارض اس علت میں مشترک ہیں۔ لیکن مچھلی اور ٹڈی کے سوا جب اپنے خبث ذاتی یا نجاست سے پیدا ہونے اور نجاستوں کی غذا کھانے کی وجہ سے حرام اور مضر ہیں بخلاف مچھلی اور ٹڈی کے کہ ان مضرتوں اور ذاتی اور عارضی خباثت سے پاک ہیں یہ استثناء نہیں رد کے ساتھ خاص ہوگئی۔

مردار کے اجزاء سے نفع لینے کا بیان

ہم یہاں آئے کہ مردار میں سے کس کس چیز کے ساتھ نفع لینا درست ہے۔ اور مردار کے اجزاء سے کون کون سی چیز حرمت میں داخل ہے۔ اس آیت کی رو سے خود کھانا تو بالکل

حرام ہوا۔ البتہ مردار ایسے جانوروں کو کھلانا جنہیں گوشت کھانے کی عادت ہے۔ جیسے باز، شکرا، کتا اور بلی مختلف فیہ ہے۔ اور ظاہر یہ ہے کہ جائز ہو۔ اور مردار کی چربی روشنی کے لیے جیسے شمع اور چراغ کام میں لانا درست ہے۔ اس لیے کہ حدیث شریف میں وارد ہے کہ لوگوں نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھا کہ اگر ایک چوہا تیل میں گر کر مر جائے تو اس تیل کو کیا کیا جائے؟ آپ نے فرمایا چراغ میں جلا لو اور اسے کھاؤ ہرگز نہیں۔ اور مردار کے بال اور اس کی پشم اور سینگ، ناخن اور مردار کی ہڈیاں سب پاک ہیں۔ ان کا استعمال جائز ہے۔ اس لیے کہ سورۂ نحل میں اپنی نعمتوں کے بیان میں حق تعالیٰ فرماتا ہے کہ من اصوافھا واوبارھا واشعارھا اثاثا ومتاعًا الی حین زندہ اور مردہ کی تفصیل کے بغیر۔ نیز حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانۂ مبارک میں ان چیزوں خصوصاً ہاتھی کی ہڈی اور اس کے دانتوں کا استعمال رائج تھا، اور ہاتھی یقیناً ذبح نہیں ہوتا، اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کے استعمال سے منع نہ فرمایا، اور اسی طرح مردار کی کھال جب اسے دواؤں اور مصالحوں کے ساتھ نجس رطوبتوں سے پاک کرلیں نفع لینے کے قابل ہو جاتی ہے۔ اور اگر دھوپ یا مٹی کے ساتھ خشک کرلیں تو بھی یہی حکم رکھتی ہے۔ اس لیے کہ صحیحین میں وارد ہے کہ ایک دفعہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دیکھا کہ لوگ ایک مردہ بکری کو جو کہ ام المومنین حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا کی ملک تھی کھینچے لیے جا رہے تھے۔ آپ نے فرمایا کہ تم نے اس کی کھال کیوں نہ اتار لی۔ ہر کھال جسے دباغت کے ساتھ خشک کرلیا جائے پاک ہو جاتی ہے۔

اور اسی طرح اگر ایسا جانور جو جاری خون نہیں رکھتا جیسے مکھی، مچھر، بچھو اگر کسی پانی یا دوسری چیز میں مر جائے وہ پانی ناپاک نہیں ہوتا۔ اس سے نفع لیا جا سکتا ہے۔ اس لیے کہ یہ جانور جو رطوبت رکھتے ہیں درختوں اور نباتات کی رطوبت کے مشابہ ہے۔ تعفن پذیر نہیں ہے۔ اور وہ کیڑا جو بعض میووں میں ہوتا ہے۔ جیسے گولر وغیرہ یا سرکے میں پڑ جاتا ہے بھی یہی حکم رکھتا ہے۔ بلکہ اس میوے اور سرکے کے تابع اس کرم کا کھانا بھی جائز ہے۔ البتہ اس کرم کو اس میوے اور اس سرکے سے باہر نکال کر جدا کھانا درست نہیں۔ اور مردہ جانور کا

دودھ اور شیر وان امام اعظم رحمتہ اللہ علیہ کے نزدیک جائز ہے۔ اور اسی طرح مردہ جانور کا انڈا اگر سخت ہو گیا ہو ان کے نزدیک دھونے کے بعد ناپاک ہو جاتا ہے۔ کیونکہ یہ چیزیں موت کا حکم قبول نہیں کرتیں، اور نہ ہی مردہ کے ساتھ متصل اجزا ہیں۔ بلکہ طبیعت ان چیزوں کو جدا کرنے اور پھینکنے کے لیے راہ درست کرتی ہے۔

اور اگر کوئی شخص حرام جانور کو جیسے کتا اور بلی شرعی طریقے پر ذبح کرے اس کے حکم میں اختلاف ہے۔ امام اعظم رحمتہ اللہ علیہ کے نزدیک پاک ہو جاتا ہے۔ لیکن اس سے کھانا جائز نہیں۔ جبکہ امام شافعی رحمتہ اللہ علیہ کے نزدیک پاک بھی نہیں ہوتا۔ اور نجاست میں مردار کا حکم رکھتا۔

وَالدَّمُ اور خون، اس لیے کہ اجزائے حیوان میں متعفن رطوبات کی اصل خون ہے۔ گوشت اور چمڑا سب اسی سے اُگتے ہیں۔ اور پہلے اس کے ساتھ روح کا تعلق پس روح کا اس سے جدا ہونا اسے نجس کرنے میں بہت بڑا اثر کرتا ہے۔ بلکہ حقیقت میں روح کی سواری وہی ہے۔ اور بدن سے روح کا جدا ہونا روح کے اس سے جدا ہونے سے عبارت ہے۔ تو روح کے جدا ہونے کے بعد طہارت کے قابل نہیں رہتا۔ گویا جانور کے اجزا سے یہ جز و نجس العین ہے کہ کسی تدبیر کے ساتھ پاک نہیں ہو سکتا۔ نیز اس کا تعفن اور فساد ذاتی ہے۔ جبکہ دیگر اجزائے بدن کا تعفن اور فساد اس کے اخلاط کی وجہ سے ہے۔ اور ذاتی شے عوارض کی وجہ سے زائل نہیں۔

کون سا خون حرام اور ناپاک ہے

ہم یہاں پہنچے کہ جو خون حرام اور ناپاک ہے کون سا خون ہے؟ صرف وہ خون جو رگوں میں جاری ہوتا ہے یا وہ خون جو گوشت پر چمٹ کر گوشت کی صورت اختیار کرنے کی استعداد میں ہے؟ امام اعظم رحمتہ اللہ علیہ کے نزدیک حرام اور ناپاک وہی جاری خون ہے۔ اور خون کے جو قطرے گوشت پر چمٹے ہوتے ہیں حرام ہیں نہ ناپاک۔ اگر گوشت کو دھوئے بغیر پکائیں تو اسے کھانا جائز ہے۔ البتہ طبیعت کے ستھرے پن کے خلاف ہے۔ اور امام شافعی کے نزدیک وہ خون اور یہ خون دونوں حرام اور ناپاک ہیں۔ اگر گوشت کو دھوئے بغیر پکایا جائے کھایا نہیں جا سکتا۔

اور صحیح حدیث پاک میں وارد ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ ہمارے لیے مردار کی دو قسمیں جو کہ مچھلی اور ٹڈی ہے حلال ہوئی ہیں۔ اسی طرح دو قسم کے خون بھی حلال ہوئے ایک جگر بند جسے لغت ہندی میں کلیجی کہتے ہیں۔ اور دوسرا اطحال جسے ہندی لغت میں تلی کہتے ہیں۔ اس لیے کہ تمام اعضا میں سے یہ دو عضو گویا جما ہوا خون ہے۔ اور گوشت کی صورت سے دور۔ اور اس کے باوجود عضو ہونے کے حقیقت پر نظر کرتے ہوئے حلال ہیں۔ اور خون کا کھانا اخلاق کی درندگی کی طرف مائل کرتا ہے۔ اور مزاج میں غصہ اور ہلکا پن پیدا کرتا ہے۔ جیسا کہ حبشیوں میں ہے۔ جو کہ خون کھانے کی عادت رکھتے ہیں۔ اور چمرنگوں میں اسے دیکھا اور محسوس کیا جاتا ہے۔ تو یہ عین حکمت الٰہی ہے کہ ان چیزوں کو حرام فرمایا۔

نیز اگر تم مردار کا خون کھاتے تو جو نقصان تمہیں مردار کھانے سے لاحق ہوتا ہے لاحق ہوتا۔ اور اگر تم زندہ جانوروں کا خون فصد کر کے کھینچ کر کھاتے جیسا کہ حبشی کرتے ہیں تو یہ صورت عین خون خوار درندوں کی صورت ہو جاتی، اور تم دائرہ انسانیت سے خارج ہو جاتے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ تمہارے جانور اس وجہ سے کہ حیوان کی قوت کا مادہ اور اس کی روح کا سہارا خون ہے تمہارے ضروری کاموں سے کمزور ہو جاتے۔ اور ضرورت کے وقت تم ان کے منافع سے محروم ہو جاتے۔ اور ان کا گوشت بے لذت ہو جاتا، اور سواری اور بوجھ اُٹھانے میں کام نہ آتے۔ بلکہ ان کے دودھ اور نسل میں واضح طور پر نقصان رونما ہوتا پس تمہاری ملک حلال جانوروں کے خون کو حرام فرمانا بلاتشبیہ حکیم اور کسی بستی کے رئیس کے حکم کی مانند ہے جو اس بستی کے مزارعین کو دیتا ہے کہ کھیتی کو نشو ونما کی ابتدا میں سبز اور کچا نہ کھائیں کہ انجام کے طور پر اس میں بہت نقصان ہے۔

وَلَحْمَ الْخِنْزِيْرِ سؤر کا گوشت۔ اگر چہ مردار نہ ہو، اور اسے شرعی طریقے کے مطابق ذبح کیا گیا ہو۔

سؤر کا گوشت حرام دینے کی حکمت

اس لیے کہ یہ جانور نجاستوں کی طرف بہت زیادہ مائل ہے خصوصاً آدمیوں کی

نجاستوں کی طرف کیونکہ اس کی خوراک بنی آدم کی تمام نجاستیں اور فضلات ہیں۔ اور اس کا گوشت انہیں نجاستوں سے پیدا ہوتا ہے۔ پس اس کا گوشت کھانا گویا اپنی نجاست کھانا ہے۔ نیز اس جانور کی روح حد سے زیادہ حرص، حد سے زیادہ شہوت اور حد سے زیادہ بے حیائی اور بے غیرتی رکھتی ہے کہ کسی جانور کی روح ان عادتوں میں اس قدر حد سے گزری ہوئی نہیں۔ اور اسی وجہ سے جو لوگ اس جانور کے گوشت کو بطور ہمیشگی استعمال کرتے ہیں۔ جیسے نصاریٰ اور ہندوؤں کی بعض قومیں ان عادتوں میں اس جانور کے ساتھ مشابہت رکھتی ہیں بے غیرتی میں اور عزت کی حفاظت نہ کرنے میں بھی، مال کو جمع کرنے میں بھی اور نجاستوں کے ساتھ آلودگی میں بھی۔

اور چونکہ اس جانور کی روح کا تعلق اس کے پورے بدن کے ساتھ ہے اس کی روح کی خباثت اس کے تمام اجزا میں سرایت کرتی ہے۔ پس اس کا سارا بدن آدمی کے فضلے کی طرح ہے کہ گوشت، چمڑا، بال، ناخن، پٹھا اور تار میں سے کوئی چیز نفع کے قابل نہیں رہی۔ اگرچہ کھانے میں صرف اس کا گوشت کے سوا کچھ بھی نہیں آتا ہے۔ اسی لیے اس آیت میں صرف اس کے گوشت کے ذکر پر اکتفاء فرمایا گیا ہے۔ کیونکہ پہلے ذکر کھانے کا ہو رہا ہے۔ لیکن تمام اُمت کا اس بات پر اجماع ہے کہ یہ جانور نجس العین ہے۔ اس سے کسی چیز کے ساتھ نفع نہ لیا جائے مگر امام اعظم اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہما نے اس کے بالوں سے بوریاں اور خورجیاں وغیرہ بننے کو جائز قرار دیا ہے۔

وَمَا اُهِلَّ بِهٖ اور وہ جانور جس کے متعلق آواز دی گئی اور شہرت دی گئی کہ لِغَیْرِ اللّٰہ غیر اللہ کے لیے ہے۔ خواہ وہ غیر بت ہو یا ناپاک روح کہ بھوگ کے طریقے سے اس کے نام پر دیتے ہیں، خواہ کسی گھر یا سرائے پر مسلط کوئی جن جو کہ جانور دیئے بغیر وہاں رہنے والوں کی تکلیف دینے سے دست بردار نہیں ہوتا یا توپ چھوڑنے نہیں دیتا، خواہ کوئی پیر یا پیغمبر (علیہ السلام) کے لیے اس طرح زندہ جانور مقرر کر کے دیں کہ یہ سب حرام ہے۔ اور حدیث صحیح میں وارد ہے کہ ملعون من ذبح لغیر اللہ یعنی جو شخص جانور ذبح کر کے غیر اللہ کا قرب ڈھونڈے ملعون ہے۔ خواہ ذبح کے وقت نام خدا لے یا نہ لے۔ اس لیے کہ جب اس

نے شہرت دی کہ یہ جانور فلاں کے لیے ہے تو ذبح کے وقت خدا کے نام نے کوئی فائدہ نہ دیا کیونکہ وہ جانور اس غیر کی ملک کی طرف منسوب ہو گیا۔ اور ایسی خباثت پیدا ہو گئی جو کہ مردار کی خباثت سے زیادہ ہے۔ اس لیے کہ مردار نے خدا تعالیٰ کے نام کے ذکر کے بغیر جان دی ہے۔ اور اس جانور کو اس غیر کی ملک سے قرار دے کر مارا ہے۔ اور وہ عین شرک ہے۔ اور جب اس خبث نے اس میں سرایت کی اب خدا کا نام ذکر کرنے کے ساتھ حلال نہیں ہوتا جیسے کتا اور سؤر کہ اگر خدا کے نام پر ذبح کیے جائیں حلال نہیں ہوتے۔

اور اس مسئلہ کی حقیقت یہ ہے کہ جان کو جان پیدا کرنے والے کے غیر کے لیے نیاز کرنا درست نہیں ہے۔ اور کھانے پینے کی چیزوں اور دوسرے اموال کو بھی اگرچہ غیر اللہ کا قرب ڈھونڈنے کے طریقے پر دینا حرام اور شرک ہے مگر ان چیزوں کا ثواب جو کہ دینے والے کو لوٹتا ہے غیر کے لیے مقرر کرنا جائز ہے۔ اس لیے کہ انسان کو حق پہنچتا ہے کہ اپنے عمل کا ثواب اپنے غیر کو بخش دے۔ جس طرح اسے یہ حق پہنچتا ہے کہ اپنا مال اپنے غیر کو دے دے۔ اور جانور کی جان مملوک نہیں ہے۔ تاکہ اسے کسی کو بخشا جا سکے۔ نیز اس طریقے سے مال دینا ثواب کو واجب کرتا ہے کہ آدمی اس سے نفع پاتے ہیں۔ اور جب فوت ہونے والے اس جہان سے جدا ہو کر عین مال کے ساتھ نفع لینے کے قابل نہیں رہے ہیں انہیں نفع پہنچانے کا شرع شریف میں یہ طریقہ قرار پایا کہ اموال کے ثواب کو مستحقین تک پہنچائیں۔ وہ ان کی طرف لوٹا دیں، اور جب جانور کی جان زندگی میں آدمی کے نفع لینے کے بالکل قابل نہیں ہے تو مرنے کے بعد بھی اس کے نفع لینے کے قابل نہ ہو گی۔ ہاں فوت ہونے والے کی طرف سے قربانی کرنا حدیث صحیح میں آیا ہے۔ لیکن اس کا معنی یہی ہے کہ خدا کے لیے جان دینے کا جو ثواب ہے اس فوت ہونے والے کو بخش دیا جائے نہ یہ کہ فوت ہونے والے کے لیے ذبح کیا جائے۔

اور بعض ناواقف مسلمان اس مقام پر کجروی کرتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ گوشت پکا کر مرنے والوں کے نام پر دینا بلاشبہ جائز ہے۔ اور ہم بھی اس فوت شدہ کے نام پر ذبح کرنے سے اسی قدر قصد کرتے ہیں۔ انہیں سمجھانے کے لیے ایک نکتہ کافی ہے کہ ان سے کہا

جائے کہ جب تم غیر خدا کے نام پر جانور ذبح کرنے کی نذر کرتے ہو اگر اس جانور کے عوض اسی مقدار کا گوشت خرید کر اور پکا کر فقراء کو کھلاؤ تمہارے ذہن میں وہ نذر ادا ہوتی ہے یا نہیں اگر ہوتی ہے درست کہتے ہو کہ ذبح کرنے سے تمہارا مقصد اس فوت ہونے والے کے ثواب کے لیے گوشت کھلانے کے سوا کچھ نہ تھا۔ ورنہ تم نے ذبح کے ساتھ تقرب کی نذر کی ہے۔ اور شرک صریح لازم آتا ہے۔

اور اس آیت کے لفظ میں جو کہ قرآن مجید میں چار جگہ وارد ہوا غور کرنا چاہیے ما اہل بہ لغیر اللہ فرمایا ہے نہ کہ وماذبح باسم غیر اللہ تو خدا کے نام کے ساتھ ذبح کرنا یہ شہرت دینے اور آواز نکالنے کے ساتھ کہ فلاں گائے فلاں کی اور بکری فلاں کی کوئی فائدہ نہیں کرتا، اور اس جانور کا گوشت حلال نہیں رہتا۔

اور وما اہل کو ذبح پر محمول کرنا لغت اور عرف کے خلاف ہے۔ لغت عرب اور اس دیار کے عرف میں اس وقت اہلال بمعنی ذبح کسی شعر اور کسی عبارت میں بالکل نہیں آیا بلکہ لغت عرب میں اہلال آواز بلند کرنے اور شہرت دینے کے معنوں میں ہے۔ جیسے چاند کا اہلال، نومولود بچے کا اہلال اور اہلال بمعنے تلبیۂ حج وغیرہ مستعمل ہوتا ہے۔ اور اگر کوئی کہے اھللت للہ تو ذبحت للہ کے معنوں میں ہرگز نہیں سمجھا جائے گا۔ نیز اگر اہل کو ذبح پر محمول کیا جائے تو ذبح لغیر اللہ مراد ہوگا ذبح باسم غیر اللہ کہاں سے سمجھا جائے تاکہ ان لوگوں کا مقصد حاصل ہو۔ پس اس عبارت میں اہلال کو ذبح کے معنوں میں لینا، پھر لغیر اللہ کو باسم غیر اللہ کی جگہ قرار دینا کلام الٰہی کی تحریف کے قریب پہنچا جاتا ہے۔ تفسیر نیشاپوری میں کہتے ہیں کہ علماء نے اجماع کیا ہے کہ اگر کسی مسلمان نے کوئی جانور ذبح کیا اور اس کے ذبح سے غیر اللہ کا تقرب قصد کیا مرتد ہو گیا۔ اور اس کا ذبیحہ مرتد کا ذبیحہ ہے۔

اور دور جاہلیت میں کفار گھر سے نکلتے وقت اور راستہ میں بتوں کے نام کی آواز بلند کرتے تھے۔ اور جب مکہ معظمہ پہنچتے تھے۔ اور خانہ کعبہ کا طواف کرتے تھے ان کا خانہ خدا کا یہ طواف ان سے مقبول نہ تھا۔ اسی لیے حکم ہوا کہ فلا یقربوا المسجد الحرام بعد عامهم هذا۔ تو یہاں بھی جب انہوں نے آواز نکالی اور شہرت دی کہ یہ جانور فلاں سے

ہے۔ اور اس کے نام پر ہے۔ اور ہم اس کے لیے کرتے ہیں۔ اور ذبح کے وقت خدا کے نام پر ذبح کرنا یا حلال ہونے کا حکم بالکل مرتب نہ ہوا، اور اس کا راز یہ ہے کہ عوام کے نزدیک جانور ذبح کرنے کا طریقہ جیسا بھی مقرر ہے جانور کی جان کو اس تک پہنچانے کے لیے جس کے لیے منظور ہے متعین ہے۔ جیسا کہ فاتحہ، قل اور درود پڑھنا کھانے پینے کی چیزوں کو ارواح تک پہنچانے کے لیے متعین ہے خواہ ان ارواح کو ثواب پہنچانے کا قصد کریں یا تقرب، دفع شر اور چاپلوسی اور خوشامد کے قصد سے۔ ہاں اس جانور پر خدا کے نام کا ذکر کرنا اس وقت فائدہ دیتا ہے کہ غیر خدا کے تقرب کو دل سے دور کر کے اور اس شہرت اور آواز شہرت کے خلاف اور آواز دیں کہ ہم اس کام سے باز آئے۔

ما اھل بہ لغیر اللہ اور ما اھل لغیر اللہ بہ کے فرق کی وجہ

ہم یہاں آئے کہ اس سورۃ میں لفظ بہ کو لفظ لغیر اللہ سے پہلے لایا گیا۔ جبکہ سورۃ مائدہ، انعام اور نحل میں بعد میں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اصل یہی ہے کہ با کو فعل کے متصل اور دوسرے متعلقات سے پہلے لائیں۔ اس لیے کہ یہاں با فعل کو متعدی کرنے کے لیے ہے۔ جیسے ہمزہ اور تضعیف۔ تو حتی الامکان فعل سے ملی ہوتی ہے۔ اور یہ قرآن کا پہلا مقام ہے اس مقام پر اپنی اسی اصل پر استعمال فرمایا گیا ہے۔ اور دوسری سورتوں میں جو کہ انکار کا مقام اور سرزنش کا مدار ہے پس غیر اللہ کے قصد سے ذبح کرنا پہلے آیا۔ اور اسی لیے باقی سورتوں میں فلا اثم علیہ کو بھی موقوف رکھا گیا۔ اس لیے کہ قرآن پاک کی ابتدا میں سنا ہوا آیا ہے۔ اور یہ چاروں چیزیں جو ذکر کی گئیں یعنی مردار، خون، سور کا گوشت اور وہ جانور جو غیر اللہ کے لیے مقرر کر کے ذبح کریں اس جنس سے ہے۔ جو کہ تمام فرقوں پر تمام حالات میں حرام ہے۔ اور اس قبیل سے نہیں کہ ایک فرقے پر حرام ہو اور دوسروں کے لیے حلال جیسے زکوٰۃ کا مال اور صدقات یا ایک حالت میں حرام ہو اور دوسری حالت میں حلال جیسے گرم زہریلی مضر دوا جو کہ گرم مزاجوں پر حرام ہے۔ اور جب اس کا مزاج ٹھنڈک پیدا کرے حلال ہوتی ہے۔ ہاں مجبوری کے وقت ان چیزوں کا کھانا حرام ہونے کے باوجود معاف ہے۔

(اقول وباللہ التوفیق- وما اھل بہ لغیر اللہ سے متعلق مفسر علام کے حوالے

جو کچھ یہاں لکھا ہے جمہور مفسرین کے تحقیق کے خلاف ہے بلکہ آپ کا مسلک اس مسئلہ میں جمہور مفسرین کے عین مطابق ہے جیسا کہ رسالہ عمدۃ النصائح فی مسئلۃ الذبائح میں ہے۔ چنانچہ بے شمار مفسرین نے وہی ترجمہ کیا ہے۔ جس سے آپ نے اختلاف کیا ہے۔ چنانچہ برصغیر کے نامور مفسر قرآن کریم شیخ العرب والعجم فنافی المصطفیٰ امام اہل سنت اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا بریلوی رحمتہ اللہ علیہ نے جمہور مفسرین کے مطابق یہ ترجمہ فرمایا،''اور وہ جس کے ذبح میں غیر خدا کا نام پکارا گیا''، چنانچہ چند عبارات ملاحظہ فرمائیں، اے ذبح علی اسم غیرہ، وما کانوا یرفعونہ، عندالذبح لالھتھم (جلالین) اے رفع بہ الصوت عندذبحہ للصنم (بیضاوی)، والمعنی مارفع الصوت عندذکاتہ بغیراللہ اے باسم غیراللہ کما اذا قال باسم الات والعزیٰ (الصاوی حاشیہ الجلالین) قال الربیع من انس یعنی ما ذکر عند ذبحہ اسم غیر اللہ وکان الکفار اذا ذبحو الالھتھم یرفعون اصواتھم بذکرھا (تفسیر مظہری) وماصیح فی ذبحہ غیر اللہ (جمل علی الجلالین) وحرم مارفع بہ الصوت عند ذبحہ للصنم، وکانوا اذا ذبحوا لالھتھم یرفعون اصواتھم بذکرھا ویقولون باسم الات والعزیٰ (روح البیان) ان تمام تفاسیر میں اسی بات کی صراحت ہے کہ جانور اس صورت میں حرام ہوگا جب ذبح کے وقت غیر اللہ کا نام پکارا جائے۔ چنانچہ انہیں تصریحات کی روشنی میں تفسیر نوارالعرفان میں سورۂ مائدہ زیر آیت وَمَآ اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ فرماتے ہیں یعنی غیر اللہ کے نام پر ذبح کیا گیا جیسے کفار عرب کا دستور تھا کہ بتوں کے نام پر جانور ذبح کرتے تھے۔ جانور کی زندگی میں اس پر غیر خدا کا نام لینا حرام نہیں کر دیتا۔ دیکھو بحیرہ اور سائبہ بتوں کے نام پر چھوڑے جاتے تھے مگر حلال تھے۔ مسلمان انہیں ذبح کریں۔ اور کھائیں۔ جب خود گنگا کا پانی اور مشرکین کی پوجا کی گائے کا پینا کھانا جائز، اور مندر کے پتھر اور پیپل کے درخت کا استعمال جائز تو ان کے نام پر چھوڑا ہوا جانور کیوں حرام ہوگا؟

نیز تفسیراتِ احمدیہ میں اسی زیر بحث آیت کے تحت ملا جیون رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں وماا ھل بہ لغیراللہ معناہ ذبح لاسم غیر اللہ مثل لات وعزی و اسماء

الانبیاء اغیر ذالك، ومن ھھنا علم ان البقرۃ المنذورۃ للاولیاء کما ھو الرسم فی زماننا حلال طیب لانه لم یذکر اسم غیر اللّٰه علیھا وقت الذبح وان کانوا ینذرونھا له یعنی ما اھل به لغیر اللّٰه کے معنی ہیں جانور غیر اللہ کے نام پر ذبح کیا جائے مثلاً لات اورعزیٰ بتوں کے نام پر یا انبیاء علیہم السلام کے نام پر، اور یہاں سے معلوم ہوتا ہے کہ جو گائے اولیاء کے لیے نذر کی جاتی ہے۔ جیسا کہ ہمارے زمانہ میں رسم ہے وہ حلال طیب ہے۔ کیونکہ اس پر ذبح کے وقت غیر خدا کا نام نہیں لیا گیا۔ خواہ وہ اس کی ان کے لیے نذر کرتے ہوں۔ فلہذا مسئلہ بے غبار ہے۔ علاوہ ازیں عالم اسلام کے نامور مستند و معتمد اور مرجع الانام والاعلام مفسرین کی صرف تفاسیر کے نام درج کئے جاتے ہیں جنہوں نے من وعن وہی ترجمہ کیا ہے جو کہ محولہ بالا تفاسیر میں مذکور ہے۔ تفسیر مدارک' جامع المضر ات' مفردات امام راغب اصفہانی' لسان العرب' مصباح' فتح الرحمٰن بکشف مایلبس فی القرآن' کشاف' الکواشی' حاشیہ عبدالحکیم' شیخ زادہ خازن' روح المعانی' تفسیر کبیر' ابوالسعو د بغوی' سواطع الالہام' تنویرالمقیاس' نسفی' سراج منیر' فتح الرحمٰن شاہ ولی اللہ دہلوی' توضیح' درمنثور' فتح القدیر' ابن کثیر۔ ان اکابر کی تصریحات اور پھر حضرت مفسر علام قدس سرہ العزیز کے والد بزرگوار حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی جنہیں آپ نے تفسیر کے آغاز میں لسان العرفان' ترجمان القرآن' خاتمۃ المحدثین' وارث علوم سیّدالمرسلین' حکم امت مصطفویہ' معجزہ از معجزات نبویہ جیسے عظیم القاب کے ساتھ یاد کیا ہے کی وضاحت کے بعد آپ کا ان کے مسلمات کے خلاف لکھنا قطعاً خارج از امکان ہے۔ اصل صورت یہ ہے کہ آپ کی جامعیت' مرکزیت اور ہمہ گیر علمی برتری کو مفید مقصد استعمال کرنے کے لئے آپ پر افتراء و بہتان ہے جسے اہل علم کی اصطلاح میں مدلیس کہتے ہیں۔ آپ کا دامن اس سے بالکل پاک ہے۔ محمد محفوظ الحق غفرلہٗ)

فَمَنِ اضْطُرَّ تو جو شخص مجبور کردیا گیا ان چیزوں کے کھانے پر۔

اضطرار کی چند صورتیں

اس [illegible] کی [illegible] صورتیں ہیں۔ پہلی [illegible] رت یہ ہے کہ بھوک کی وجہ سے بیتاب ہو

جائے۔اور کوئی حلال چیز کھانے کو نہ پائے یا تو حاصل کرنے کی طاقت نہ ہونے کی وجہ سے یا نہ پانے کی وجہ سے۔اور یہاں تک کمزور ہو جائے کہ نماز میں کھڑے ہونے کی طاقت نہ رہے۔اور اسے معلوم ہو کہ اس وقت اگر میں جان بچانے کے اندازے کے مطابق نہیں کھاؤں گا تو آئندہ روزی کی تلاش اور کسی کے پاس اپنے حال کے اظہار اور سوال نیز بازار میں آمدورفت سے رہ جاؤں گا۔یا کسی سفر میں ایسا حادثہ رونما ہو اور اس میں منزل اور آبادی تک پہنچنے کی طاقت نہ رہے تو اس وقت اسے جان باقی رکھنے اور طاقت کی حفاظت کے اندازے کے مطابق ان چیزوں کا کھانا معاف ہے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ کسی مرض میں گرفتار ہو جائے۔اور ان چیزوں کے سوا کوئی دوا نہ پائے۔یا دین پر پختگی رکھنے والے حکیم اتفاق کر کے کہہ دیں کہ اس بیماری کی دوا انہیں چیزوں سے ہے۔جیسے ضیق النفس جو کہ زیادہ تر بچوں کو لاحق ہوتی ہے۔اور اسے ہندوستان کی لغت میں ڈبہ کہتے ہیں کہ اس کا علاج خرگوش کا خون ہے۔

تیسری صورت یہ کہ کوئی ظالم جو کہ ہلاک کرنے اور شدید تکلیف دینے پر قدرت رکھتا ہے۔اور وہ اسے ان چیزوں کے کھانے پر مجبور کرتا ہے۔اور اس کے ذہن میں بھی یقین حاصل ہو جائے کہ اگر میں ان چیزوں کو نہیں کھاؤں گا تو یہ مجھے فی الواقع ہلاک کر دے گا۔یا میرے اعضا میں سے کسی عضو کو ضائع کر دے گا۔یا میرے عزیزوں میں سے کسی کو اسی قسم کی تکلیف دے گا۔مگر شرط یہ ہے کہ اس مجبوری میں

غَیْرَ بَاغٍ لذت کا طالب نہ ہو، کہ کوئی حلال چیز موجود رکھتا ہے۔لیکن کراہت طبعی کی وجہ سے نہیں کھاتا حتیٰ کہ اس نوبت تک پہنچ جائے۔وَّلَا عَادٍ اور نہ حد سے تجاوز کرنے والا کہ جان بچانے اور طاقت کی حفاظت کی قدر سے زیادہ کھاتا جائے۔اور پیٹ بھر لے۔تو اگر ان شرائط کے ساتھ مجبوری کی حالت میں ان چیزوں سے کھالیں فَلَآ اِثْمَ عَلَیْہِ تو اس پر کوئی گناہ نہیں ہے۔اگرچہ یہ چیزیں اپنی حرمت پر باقی ہیں۔اس لیے کہ جب اس نے ان خبیث چیزوں کو کراہت کے باوجود مجبوری کی حالت میں کھایا تو ان چیزوں کی خباثت نے اس کی روح کے جوہر میں اثر نہ کیا، اور اس مجبوری سے حرام کھانے میں گناہ کے رفع ہونے

کو بعید کیوں جاننا چاہیے۔ حالانکہ

اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ بے شک اللہ تعالیٰ ایسے بڑے گناہوں کو بخشنے والا ہے۔ جو کہ آدمی کسی مجبوری اور اضطرار کے بغیر کرتا ہے۔ اور اس بے چارے کو جس نے اس حد تک مجبور ہو کر حرام کھایا ہے کیوں نہ معاف کرے، اور اس کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ رَحِیْمٌ مہربان ہے۔ اور اس کی مہربانی تقاضا کرتی ہے کہ اس کی جان اور طاقت کی حفاظت جس طرح بھی میسر ہو جائز رکھے۔

ایک جواب طلب سوال

یہاں ایک جواب طلب سوال باقی رہ گیا، اور وہ یہ ہے کہ انما کا لفظ حصر کے لیے ہے تو اس آیت سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک ان چار چیزوں کے سوا کھانے کی چیزوں میں سے کوئی چیز حرام نہ ہو۔ حالانکہ ہماری شریعت میں اور بھی بہت سی چیزیں جیسے درندے مثلاً شیر، گرگ، چیتا، تیندوا، بجو، گیدڑ، بن بلاؤ، کتا، اور بلی اور اسی طرح درندہ پرندے جیسے باز، شاہین، شکرا اور تمام حشرات الارض جیسے سانپ، بچھو، چوہا، نیولا، جنگلی چوہا اور دوسرے نجاست کھانے والے جانور جیسے کوا، چیل، گدھ اور گدھا حرام ہیں۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف بلا واسطہ حرام کرنے کی نسبت کے اعتبار سے حصر ہے۔ اور قرآن پاک میں خدا تعالیٰ کی حرام کی ہوئی چیز ان چار چیزوں کے علاوہ اور کوئی نہیں۔ ہاں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان چار چیزوں کے علاوہ اور چیزوں کو جن میں سے بعض ذکر کی گئیں حرام فرمایا ہے۔ لیکن جب قرآنی نص اس مضمون کے ساتھ آئی کہ تمہارے رسول علیہ السلام جو کچھ حرام فرمائیں حرام جانو۔ جیسا کہ آیت **ویحل لهم الطیبات ویحرم علیهم الخبائث** (الاعراف آیت ۱۵۷) میں مذکور ہے۔ وہ چیزیں بھی شریعت میں حرام ہو گئیں۔ اگرچہ اللہ تعالیٰ نے بلا واسطہ ان چیزوں کو حرام نہیں فرمایا۔ اور اس جواب کی تقریر اس طرح سورۂ انعام کی آیت سے صریح طور پر معلوم ہوتی ہے کہ فرمایا **قل لا اجد فیما اوحی الی محرمًا علٰی طاعم یطعمه** الخ اور از روئے حدیث شریف بھی یہی تقریر معلوم ہوتی ہے اس لیے کہ پہلے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تمہید

فرما کرارشاد فرمایا ہے الاان ماحرم رسول اللہ مثل ماحرم اللہ یعنی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جسے حرام قرار دیا وہ اللہ تعالیٰ کے حرام قرار دیئے ہوئے کی مثل ہے۔ پھر فرمایا الالایحل لکم الحمار الاصل ولاکل ذی ناب من السباع ولا لقطة معاهدة الاان یستغنی عنها ربها، خبردار تمہارے لیے گھریلو گدھا حلال نہیں۔ اور نہ ہی ذی ناب درندہ اور نہ ہی گری ہوئی چیز مگر جب اس سے اس کا مالک لاپرواہ ہو جائے۔

اور عین تفسیر میں اس سوال کا ایک دوسرے جواب کی طرف اشارہ گزرا ہے، غور کرنا چاہیے، اور اس کا خلاصہ یہ ہے کہ مراد طیبات میں سے محرمات کا حصر ہے۔ اور طیبات وہ چیزیں ہیں جن کا کھانا ان میں موجود لذت اور منفعت کی وجہ سے شہروں اور قصبوں کے رہنے والے سلیم الطبع لوگوں میں رائج اور معمول ہے۔ اور خنزیر بھی اسی باب سے ہے۔ اس لیے کہ نصاریٰ اس کے گوشت کو گوشتوں میں سے افضل لکھتے ہیں۔ اور اس کے کھانے میں بہت بدنی منافع بیان کرتے ہیں۔ اور اس کی لذت اور ذائقہ بھی اس کے کھانے والوں کی زبان سے سنا جاتا ہے۔ اور جامع بغدادی اور دوسری کتب مفردات میں لکھتے ہیں کہ خشکی اور تری کے خنزیر کا گوشت زود ہضم ہوتا ہے۔ اور جلدی گزر جاتا ہے۔ اور غذا کم دیتا ہے۔ مگر قوت کے ساتھ ہوتا ہے۔ اور جالینوس نے کہا ہے کہ انسان کی طرح معتدل المزاج ہوتا ہے۔ اور کہتے ہیں کہ جو لوگ آدمی کا گوشت کھاتے ہیں اگر خنزیر کا گوشت کھائیں رنگ، ذائقہ اور بو میں فرق نہیں کر سکتے، اور یہ اس کے مزاج انسانی کے ساتھ مشابہت اور مناسبت کی دلیل ہے۔ انتہی۔

پس خنزیر کے گوشت کو اس معنی میں طیبات کی فہرست سے اس کی خباثت باطنی، رذالت اخلاق، نجاسات سے ملوث ہونے اور دوسری قباحتوں کی وجہ سے مستثنیٰ قرار دینا ضروری ہوا تو حصر بلا تکلف صحیح ہوا۔ اس لیے کہ مطلق محرمات کا حصر نہیں ہے۔ بلکہ وہ خباثت کہ ان میں سے بعض مذکور ہوئے بحث سے خارج ہیں۔ اور یحرم علیهم الخبائث میں داخل۔ کلام صرف طیبات پر مخصوص کیا گیا ہے۔ اور ان میں سے ان چار چیزوں کے سوا کوئی چیز حرام نہیں ہے۔ گویا کلام کا خلاصہ یوں ہوا اے ایمان والو ان پاکیزہ

چیزوں سے کھاؤ جو ہم نے تمہیں رزق عطا فرمایا کیونکہ طیبات میں سے تم پر صرف مردار، خون، لحم خنزیر اور وما اہل لغیر اللہ حرام کیا گیا۔ ان چاروں کے سوانہیں۔ تو اپنے اوپر ان کے ماسوا طیبات کو چھوڑ کر تنگی مت کرو۔

یہاں جاننا چاہیے کہ جس طرح مضطر کو ان چار چیزوں کے کھانے میں رخصت ہے۔ اسی طرح دوسری چیزوں میں بھی رخصت ہے۔ اور وہ جو امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہے کہ اگر کوئی شخص پیاس کی شدت کی وجہ سے مجبور ہو جائے اسے شراب پینا جائز نہیں۔ اور اگر لقمہ اس کے حلق میں اٹک جائے تو جائز ہے کہ شراب کے ساتھ اس لقمے کو نیچے اُتارے۔ تو بظاہر یہ فرق بعید سا معلوم ہوتا ہے۔ لیکن گہری نظر دیکھنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ شراب تشنگی کو دور کرنے والی نہیں بلکہ پہلے سے زیادہ پیاس کا موجب ہوتی ہے۔ اگرچہ ٹھنڈی ہو۔ تو اسے اس غرض کے لیے پینا مفید نہیں ہے۔ اگرچہ مجبور آدمی اس کے ظاہری قوام پر جو کہ پانی کی طرح ہے فریفتہ ہو کر گمان کرتا ہے کہ میری پیاس اسے پینے سے دور ہو جائے گی۔ جبکہ لقمہ نیچے اتارنا ہر پتلی چیز کا کام ہے تو اس غرض کے لیے مفید ہو گی، اور اضطرار دور کرنے والی ہو گی۔

شراب اور تمام حرام چیزوں کے ساتھ دوا کرنے کا بیان

اور شراب اور تمام محرمات کے ساتھ دوا کرنے میں اختلاف ہے۔ صحیح حدیث میں جو کہ بخاری اور مسلم میں موجود ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے استسقاء کے مریضوں کی ایک جماعت کو اونٹ کا پیشاب پینے کا حکم دیا ہے۔ اور بظاہر دوسری محرمات کا بھی اسی پر قیاس ہے۔ لیکن تجربہ یا دیندار حکیموں کا کہنا شرط ہے۔ اور بے دین حکیموں جیسے نصاریٰ اور ہندو کا کہنا کافی نہیں۔ اسی طرح فاسق مسلمان حکیم۔

نیز جاننا چاہیے کہ اکثر علماء کے نزدیک مانگنا خواہ زبان کے ساتھ ہو یا اظہار حال کے ساتھ ان چیزوں بلکہ تمام محرمات کے کھانے پر مقدم ہے۔ جبکہ محرمات کا کھانا غیر کے مال کو اس کی رضامندی کے بغیر کھانے پر مقدم ہے۔ جیسے چھیننا، چوری کرنا، امانت میں خیانت اور رشوت۔ اس لیے کہ ان محرمات کے کھانے میں کسی کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا، اور کسی کا حق

تلف نہیں ہوتا۔ اور کسی کے دل میں کوئی سوزش پیدا نہیں ہوتی۔ جبکہ غیر کا مال اس کی مرضی کے بغیر کھانے میں غیر کو بھی ضرر پہنچتا ہے۔ اور حق اسلام یا ذمہ اور عہد کا حق بھی تلف ہوتا ہے۔ اور اس کا دل بھی جلتا ہے۔ خصوصاً وہ مال جو دین فروشی اور دنیا کی طمع فاسد کے لیے حق الٰہی کے حکم کو چھپانے کی وجہ سے کسب کیا جاتا ہے کہ اس کی حرمت مردار جانور کے خون سے ہزاروں مرتبہ زیادہ شدید اور سخت ہے۔ اور کسی حالت میں حلال نہیں خواہ اختیار اور فراخی کی حالت ہو اور خواہ تنگی کی۔

اور یہ لوگ جو جانوروں اور ان کے اجزا و اعضا کے حلال و حرام ہونے میں بحث کرتے ہیں۔ اور اس مسئلہ میں مسلمانوں کے ساتھ لڑائی جھگڑے میں پڑ جاتے ہیں غیر کا مال کھانے سے بالکل پرہیز نہیں کرتے۔ اور شیر مادر کی طرح ہضم کر جاتے ہیں۔ شاید اس حرام مال کھانے کے عذاب کی شدت سے واقف نہیں ہیں یا جانتے ہوئے کو نہ جانا ہوا سمجھتے ہیں۔ حالانکہ

اِنَّ الَّذِیۡنَ یَکۡتُمُوۡنَ مَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰہُ تحقیق وہ لوگ جو کہ اس علم کو چھپاتے ہیں جو کہ اللہ تعالیٰ نے ہدایت خلق کے لیے اُتارا ہے۔ اور وہ علم اسرار اور دقائق کی قسم کا نہیں کہ عوام کی عقل اسے دریافت کرنے تک نہ پہنچ سکے۔ اور وہ اسے سمجھ نہ سکیں کہ اس قسم کے علم کو چھپانا جائز بلکہ واجب ہے۔ بلکہ اس علم کو اللہ تعالیٰ نے کیا ہے

مِنَ الۡکِتٰبِ اس کتاب سے۔ جو کہ متواتر، معمول اور مروج ہے۔ تا کہ عام مخلوق اس کی وجہ سے ہدایت پائے۔ تو اس چھپانے میں انہوں نے ارادہ الٰہی کے خلاف عمل بھی کیا کہ اللہ تعالیٰ نے لوگوں کی ہدایت اور ان کا علم چاہا جبکہ انہوں نے ان کی گمراہی اور جہالت چاہی۔ اور مخلوق اور اپنے مذہب والوں کا حق بھی ضائع کیا۔ کہ انہیں ہدایت اور علم سے محروم رکھا۔ اور عجیب بات یہ ہے کہ ان دو قباحتوں پر اکتفاء نہیں کرتے۔

وَیَشۡتَرُوۡنَ بِہٖ ثَمَنًا قَلِیۡلًا اور اس منزل من اللہ حکم کے عوض دنیا کا تھوڑا سا سامان خریدتے ہیں جو کہ ثواب آخرت کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں۔ اور ان کا یہ خریدنا دو طریقوں کے ساتھ ہے: پہلا طریقہ یہ کہ جب منزل من اللہ حکم اپنے مقصد کے خلاف ہو اور

اس کے اظہار کی صورت میں اپنی سرداری کے زائل ہونے اور اپنی پیری میں کمی واقع ہونے یا اپنے قریبیوں، رشتے داروں، دوستوں اور محبت والوں کو کسی قسم کا نقصان پہنچنے کا ڈر ہو تو اسے اپنی اس طمع کے حصول کی خاطر پوشیدہ رکھتے ہیں۔ اور بالکل ظاہر نہیں کرتے۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ جب منزل من اللہ حکم فتویٰ پوچھنے والے کے مقصد کے مطابق ہو اور اس کے بیان کرنے میں اپنا بھی کوئی نقصان نہ ہو بغیر کوئی مال لیے یا کسی منفعت کے اسے بیان نہیں کرتے، اور روایت نہیں کرتے۔ تو حرام مال کھانے میں جسے یہ ہدیہ، نذرانہ اور شکرانہ کہتے ہیں ان لوگوں کا حال مردار، خون اور خنزیر کھانے والوں سے بدتر ہے۔ کیونکہ ان کے کام کی انتہا اسی قدر ہے کہ نجس چیز اپنے پیٹ میں ڈالتے ہیں نہ کہ کسی دل کو سوزش پہنچا کر اپنے باطن میں آگ کے حصے کو جگہ دیتے ہیں۔ جبکہ یہ لوگ ان کا حال یہ ہے

اُولٰٓئِكَ مَا يَاْكُلُوْنَ یہ لوگ نہیں کھاتے فِيْ بُطُوْنِهِمْ اپنے پیٹوں میں۔ جو کہ ان کے باطن سے کنایہ ہے اِلَّا النَّارَ مگر آگ۔ اگرچہ ان کے ہاتھ، منہ اور حلق میں لذیذ کھانے اور نفیس شیرینی کی صورت حاصل کی ہو۔ اس شخص کی طرح جسے لذیذ کھانے اور اعلیٰ قسم کی مٹھائی میں زہر ہلاہل کھلائیں۔ جو کہ پیٹ میں جاتے ہی آگ کی طرح شعلہ زن ہوتی ہے۔

ہاں یہ مال ان کے حقیقی پیٹوں میں جو کہ ان کے باطن ہیں آگ ہو جاتا ہے۔ اور زہر اسی شکم مجازی میں جو کہ شکم حقیقی کا غلاف ہے۔ اور بمنزلہ اس کی کھال کے ہے آگ ہو جاتا ہے۔ اور اس وجہ سے اس مال کی تاثیر انہیں جلدی سے معلوم نہیں ہوتی، اور عجیب بات یہ ہے کہ اس مال کا کھانا ان کے باطن کو جلانے پر ہی اکتفاء نہیں کرتا بلکہ ان کی یہ سب پابندی اور سختی جو کہ وہ محبت الٰہی اور اس کی رضا طلبی کے دعوے کی بنا پر جانوروں اور ان کے گوشت اور اعضاء کو کھانے میں کرتے ہیں انہیں برباد کر دے گی۔ اور ان کے دعویٰ کے برعکس اللہ تعالیٰ کے غضب اور ناراضگی کے آثار نمودار کرے گی۔

وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ اور خدا تعالیٰ ان کے ساتھ بلاواسطہ گفتگو نہیں فرمائے گا۔ بلکہ اگر انہیں کوئی عتاب اور ڈانٹ ہوگی تو فرشتوں کے ذریعے ہوگی۔ جیسے اَخْسَئُوْا فِيْهَا وَلَا تُكَلِّمُوْنِ۔ (المؤمنون آیت ۱۰۸) اس لیے کہ انہوں نے دنیا میں ضرورت کے وقت کلام الٰہی

کو ظاہر نہ کیا، اور خدا تعالیٰ کے ارشادات زبان پر نہ لائے، اور لوگوں تک نہ پہنچائے۔ تو ان کی یہی سزا ہے کہ اس کی ہمکلامی کے شرف سے محروم رہیں۔ اے کاش عین عذاب کے دوران اگر انہیں کلام الٰہی کا سننا نصیب ہوتا تو اس کلام کے سننے کی لذت کی وجہ سے انہیں وہ عذاب بھول جاتا، اور وہ اپنے باطن میں ایک راحت پاتے۔ لیکن یہ دولت بھی انہیں کبھی حاصل نہیں ہوگی۔ یہاں تک کہ یَوْمَ الْقِيَامَةِ قیامت کے دن۔ جو کہ دربار عام کا دن ہے۔ اور اس دن ہمکلامی اتنی عزت اور شرف نہیں رکھتی کیونکہ نیک و بد کمینے اور عزت والے حتیٰ کہ بعض کافر بھی کلام پاک کو سنیں گے۔ جس طرح کہ دربار عام کے دن اور کچہری کے وقت گنہگار اور مجرم بھی بادشاہوں کی باتیں سنتے ہیں۔

اور کاش کے وہ اس دولت سے محروم رہتے اور آگ کا عذاب ان کے گناہوں کا کچھ وبال پاک کر دیتا۔ اور غضب الٰہی کی آگ بجھ جاتی۔ اور عذاب چکھانے کے بعد انہیں گناہوں کی میل سے پاک کر دیا جاتا لیکن یہ بھی ہوتا ہے کہ

وَلَا يُزَكِّيهِمْ اور عذاب کے ساتھ انہیں پاک نہیں کرے گا۔ تاکہ پاک ہونے کے بعد جنت میں داخل ہونے کے قابل ہو جائیں۔ جس طرح ایمان والے گنہگار پاک ہوں گے۔ اس لیے کہ یہ لوگ درگزر کرنے، معاف کرنے اور تخفیف و راحت کے قطعاً لائق نہیں ہیں

وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ اور ان کے لیے ایک دردناک عذاب ہے۔ ہر طرف سے اور ہر وقت میں، اور کیوں نہ ہو کہ انہوں نے اپنی نجات کا سرمایہ برباد کر دیا۔ اس لیے کہ

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ اشْتَرَوُا الضَّلَالَةَ بِالْهُدَىٰ یہ لوگ وہ نقصان اٹھانے والے ہیں جنہوں نے گمراہی کو ہدایت کے عوض خریدا۔ اور مقدمات دین میں ہدایت سے بہتر کوئی چیز نہیں۔ جبکہ گمراہی سے بدتر کچھ نہیں۔ جس طرح انہوں نے اپنی گمراہی اپنی ہدایت کے عوض اختیار کی اسی طرح اللہ تعالیٰ کی مخلوق کی گمراہی کو ان کی ہدایت پر اختیار کیا کہ ان سے علم دین کو چھپایا

وَالْعَذَابَ بِالْمَغْفِرَةِ اور اسباب عذاب کو اسباب مغفرت کے بدلے خریدا۔ اور آخرت میں عذاب سے زیادہ نقصان دہ کوئی چیز نہیں۔ اور بخشش سے زیادہ نفع بخش کوئی چیز

نہیں۔ پس ان دونوں معاملات میں انہوں نے اپنے لیے آگ کو پسند کیا۔

فَمَآ اَصۡبَرَهُمۡ عَلَى النَّارِ تو یہ لوگ آگ پر کتنے زیادہ صابر ہیں۔ گویا اسے پسندیدہ اور مرغوب چیز جان کر اپنی جان اور مال کے ساتھ اس کی خریداری کرتے ہیں۔ اور اگر کسی کے دل میں گزرے کہ ان کا عذاب کو مغفرت کے بدلے خریدنا اور آگ پر صابر ہونا اس معاملہ سے اس وقت معلوم ہو کہ عذاب کے اسباب یقین کے ساتھ عذاب تک لے جائیں۔ اور مغفرت کے اسباب یقین کے ساتھ مغفرت کا ذریعہ بنیں اور یہ بات ثابت نہیں ہے۔ کیونکہ احتمال ہے کہ عذاب کے اسباب کو ڈرانے اور دھمکانے کے لیے شریعت میں عذاب کا سبب بیان کیا ہو اور فی الواقع ایسا نہ ہو۔ جس طرح کہ کئی دفعہ بادشاہ ڈرانے دھمکانے کے لیے کچھ کہتے ہیں۔ اور وعدہ کرتے ہیں۔ اور اس کے مطابق عمل نہیں کرتے۔ اور اسی طرح مغفرت کی سمت میں احتمال ہے کہ رغبت دلانے کے لیے فرمایا گیا ہو۔ ہم کہتے ہیں ہ

ذَالِكَ یہ معنی۔ کہ عذاب کے اسباب کا ثابت ہونا بمنزلہ عذاب کے ثابت ہونے کے ہے۔ اور اسی طرح اسباب مغفرت کا ثابت بمنزلہ مغفرت کے ثابت ہونے کے ہے درست اور صحیح بلکہ دلیل سے ثابت ہے بِاَنَّ اللّٰهَ اس وجہ سے کہ اللہ تعالیٰ دوسرے بادشاہوں کی طرح نہیں ہے کہ اس کی کلام میں جھوٹ کا نقص راہ پائے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اس مسئلہ کو کسی کی زبان سے بیان نہ فرمایا بلکہ نَزَّلَ الۡكِتَابَ کتاب کو اُتارا ہے۔ جو کہ اسباب عذاب اور اسباب مغفرت کے بیان پر مشتمل ہے۔ اور بادشاہ اگر خلاف واقع ڈرائیں تو احکام اور منشور میں نہیں لکھتے۔ پھر کتاب کا نازل کرنا خوش طبعی، مبالغہ آرائی اور فریب دینے کے انداز میں نہیں بلکہ بِالۡحَقِّ یعنی نری حکمت کے ساتھ ہے جو کہ مبالغہ اور فریب دینے کا مقام ہرگز نہیں۔ تو خدا تعالیٰ کے وعدوں کو صرف ڈرانے دھمکانے یا رغبت و طمع دلانے پر ہرگز محمول نہیں کرنا چاہیے۔

وَاِنَّ الَّذِيۡنَ اخۡتَلَفُوۡا تحقیق وہ لوگ جو اپنے دل میں مختلف خیالات لاتے ہیں۔ فِى الۡكِتَابِ کتاب الٰہی کے بارے میں۔ کہ اس میں جو ڈرانے دھمکانے کی بات اور ترغیبات ہیں وہ صرف ڈرانے اور دلیر کرنے کے لیے ہیں یا فی الواقع ایسا ہونا ہے

لَفِیْ شِقَاقٍ بَعِیْدٍ البتہ اللہ تعالیٰ کے ارادے کی دور و دراز مخالفت میں ہیں۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے کتاب نازل کرنے سے ہدایت اور تعلیم کا ارادہ فرمایا ہے۔ اور یہ کہتے ہیں کہ وہ صرف فریب دیتا ہے۔ اور جاہل بناتا ہے۔ جس طرح کہ بچوں کو فریب دیتے ہیں۔ اور جاہل بناتے ہیں۔

یہ ہے حال ان لوگوں کا جو کہ کتاب کے بارے میں تردد اور مختلف خیالات رکھتے ہیں۔ لیکن جو لوگ کہ کتاب کے وعدوں کو یقینی طور پر صرف ڈرانے اور دلیر کرنے کے لیے سمجھتے ہیں۔ اور اس معنی کا یقین کرتے ہیں۔ اور اسی یقین پر اعتماد کر کے اسے بدلنے اور چھپانے اور اس کے احکام بیان کرنے پر رشوت لینے میں جرءت کرتے ہیں۔ پس ان کی نوبت ارادہ الٰہی کی مخالفت سے گزر کر عداوت اور مقابلہ تک پہنچ گئی ہے۔ جو کہ بلاشبہ آگ میں داخل ہونے کا سبب ہے۔

چند جواب طلب سوالات

یہاں چند جواب طلب سوالات باقی رہ گئے: پہلا سوال یہ ہے کہ آیات الٰہی کو چھپانے کا ذکر اور اس کی سزا کا بیان آیت اُولٰٓئِكَ يَلْعَنُهُمُ اللّٰهُ وَيَلْعَنُهُمُ اللّٰعِنُوْنَ میں عنقریب گزرا ہے۔ اسی مضمون کو یہاں دوبارہ لانا ظاہر کے اعتبار سے نرا تکرار معلوم ہوتا ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ دونوں آیتوں کے مضمون میں فرق ہے، تکرار نہیں ہے۔ گزشتہ آیت میں صرف آیات الٰہی کو چھپانے کی سزا مذکور ہوئی۔ جبکہ اس آیت میں رشوت یا دنیوی منفعت کی غرض فاسد کی بنا پر چھپانے کی سزا ہے۔ اور اسی لیے جو وعید اس آیت میں مذکور ہے اس وعید سے زیادہ سخت ہے۔ جو کہ گزشتہ آیت میں مذکور ہوئی۔ اور ہم یہاں آئے کہ اس آیت میں اس بُرے فعل سے توبہ کرنے والوں کی استثناء نہ فرمائی کیونکہ گزشتہ آیت میں اس کے ذکر کرنے پر ہی اکتفا فرمایا گیا۔

دوسرا سوال یہ ہے کہ یہاں فِیْ بُطُوْنِهِمْ کے لفظ کا کیا فائدہ؟ اس لیے کہ کھانا پیٹ ہی میں ہوتا ہے؟ اہل عربیت نے اس سوال کے دو جواب لکھتے ہیں۔ ایک یہ کہ اس لفظ کو لانا

مجاز کے توہم کو دور کرنے کے لیے ہے۔ اس لیے کہ کھانا کبھی پیٹ کے علاوہ میں بھی بطور مجاز استعمال ہوتا ہے۔ کہتے ہیں کہ فلاں نے سردی کھائی ہے۔ اور طمانچہ کھایا ہے۔ تو اگر یہ لفظ نہ ہوتا تو احتمال تھا کہ یاکلون نارا کے لفظ سے آگ کا ان کی کھال تک پہنچنا سمجھا جاتا جیسا کہ تمام دوزخیوں کا حال ہے۔ اور مراد یہ ہے کہ وہ لوگ صرف آگ میں جلنے کا عذاب ہی نہیں دیئے جائیں گے بلکہ آگ کی چنگاریاں ان کے پیٹ کے اندر ڈالیں گے۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ عرب کے استعمال میں اکل فی بطنہ یعنی اس نے اپنے پیٹ میں کھایا اس وقت کہتے ہیں جب پیٹ بھر کر کھایا ہو۔ اکل فی بعض بطنہ کے مقابلہ میں۔ تو یہ لفظ لانے سے ان کا آگ کو پیٹ بھر کر کھانا سمجھا گیا۔ جس طرح کہ حرام مال کو پیٹ بھر کر کھاتے تھے۔ اور اس سے ضرورت کی حد تک اکتفاء نہیں کرتے تھے۔

تیسرا سوال یہ ہے کہ آگ پر ان کے صبر سے تعجب جو کہ فَمَاۤ اَصْبَرَهُمْ عَلَى النَّارِ سے سمجھا جاتا ہے آگ پر ان کے صبر پر موقوف ہے۔ حالانکہ انہیں صبر بالکل نہیں ہوگا۔ جیسا دوسری آیت سے معلوم ہوتا ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ آگ پر ان کے صبر سے مراد اس آگ کو دیکھنے کے بعد نہیں ہے۔ بلکہ اسے دیکھنے سے پہلے اسباب آتش کے ارتکاب میں ان کی جرءت اور لاپرواہی کو بطور تھکم صبر کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے۔

چوتھا سوال یہ ہے کہ اِنَّ الَّذِیْنَ اخْتَلَفُوْا فِی الْكِتٰبِ میں ان مکسورہ اپنے مدخول سمیت جملہ ہے۔ جبکہ ان مفتوحہ جو کہ ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ نَزَّلَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ اپنے مدخول سمیت مفرد ہے۔ جملے کا عطف مفرد پر کس طرح صحیح ہوگا؟

اس کا جواب یہ ہے کہ وَاِنَّ الَّذِیْنَ اخْتَلَفُوْا فِی الْكِتٰبِ میں حرف واؤ حرف عطف نہیں ہے۔ بلکہ حال کے لیے ہے پس کوئی اشکال لازم نہیں آتا ہے۔ اور بعض مفسرین نے یہاں ان مکسورہ کو ان مفتوحہ کے معنوں میں رکھا ہے۔ اور اس کسرہ کو دخول کی جہت سے لازمی خیال کیا لیکن اس وجہ کا تکلف ہونا ظاہر ہے۔

اگر علمائے اہل کتاب جو کہ حق پوشی کرتے ہیں۔ اور رشوت کھاتے ہیں کہیں کہ تم نے

ہمیں گمراہی اور عذاب کے خریدار اور ہدایت اور مغفرت کے فروخت کرنے والے کیوں قرار دیا ہے۔ حالانکہ ہم نے اپنے لیے آثار ہدایت اور اسباب مغفرت سے بہت سی چیزیں حاصل کی ہیں۔ اور کر رہے ہیں۔ کم از کم اتنا تو تم بھی دیکھتے ہو کہ ہم نماز کے اوقات میں خدا تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ اور بخشش اور ہدایت میں اس قدر بھی کافی ہے، ہم کہتے ہیں کہ یہ سب کچھ غلط ہے۔ اس لیے کہ

لَیْسَ الْبِرَّ نیکی نہیں۔ کہ ہدایت کا اثر اور مغفرت کا سبب ہو سکے اَنْ تُوَلُّوْا کہ نماز کے وقت تم پھرو وُجُوْهَكُمْ اپنے چہروں کو۔ اس کے بغیر کہ تم درست عقائد کے ساتھ اپنے دلوں کو پاک کرو اور بخل کی آلائش، حب مال، بدعہدی اور جزع وفزع سے صاف کرو۔ اس لیے اس منہ پھیرنے کی انتہا یہ ہے کہ تمہاری توجہ واقع ہو

قِبَلَ الْمَشْرِقِ مشرق کی طرف۔ اگر تمہارا قبلہ اس مکان سے کہ جس میں نماز پڑھتے ہو سمت مشرق کو ہو وَالْمَغْرِبِ اور مغرب کی طرف۔ اگر تمہارا قبلہ اس مکان سے کہ جس میں نماز پڑھتے ہو مغرب کی طرف ہو، اور مشرق ومغرب کو منہ کرنے سے کوئی نیکی حاصل نہیں ہوتی۔ کیونکہ یہ کام مشرکین اور سورج کو پوجنے والے بھی کرتے ہیں۔ اگر تم اپنے چہرے کو حقیقتاً قبلے کی طرف پھیرتے ہو تو اپنے دل کو بھی صاحب قبلہ کی طرف پھیرتے۔ جب تم نے یہ کام نہیں کیا معلوم ہوا کہ وہ بھی تمہارا مقصود نہ تھا، اور جب مشرق اور مغرب کا حال کہ دونوں مشہور طرفیں ہیں۔ اور مشرکین اور سورج کو پوجنے والوں کی بہت بڑی تعداد کے نزدیک قابل تعظیم اور عبادت کا قبلہ ہیں اس طرح ہے کہ ان کی طرف منہ کرنا اصلاً خوبی اور نیکی نہیں رکھتا تو جنوب وشمال اور دوسری درمیانی طرفوں کا حال اس سے بدتر ہوگا۔

وَلٰكِنَّ الْبِرَّ لیکن نیکی۔ جو کہ ہدایت کا اثر اور مغفرت کا سبب ہے متوجہ ہونا مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ اس کا ہے۔ جو کہ اللہ تعالیٰ پر ایمان لایا۔ اور اللہ تعالیٰ پر ایمان حاصل نہیں ہوتا مگر اس وقت جب کہ اسے موجود، بے مثل، باطن اور ظاہر کو جاننے والا، ہر چیز پر قادر، زندہ مختار جو کہ کسی کا مجبور نہ ہو، ضرورتوں سے پاک، کسی کی جبلی محبت سے غیر مجبور، عورت اور بیٹے سے پاک، سنتا، دیکھتا، ثواب وعذاب میں وعدے کا سچا، احکام میں حکیم مطلق، شریعتوں اور

دینوں کو منسوخ کرنے اور جس قبیلہ اور قوم سے چاہے پیغمبروں (علیہم السلام) کو بھیجنے۔ اور جس زبان میں چاہے کتابیں اتارنے پر قادر اعتقاد کرو، اور تم یہ اعتقاد نہیں رکھتے ہو۔

وَالْيَوْمِ الْآخِرِ اور روز آخرت پر بھی ایمان لایا۔ اس وضع کے ساتھ کہ اس دن کے احوال اللہ تعالیٰ کی کتابوں اور انبیاء علیہم السلام کی زبانوں سے معلوم ہوئے۔ اپنے اسلاف کی شفاعت پر اعتماد کے بغیر۔ اور بغیر اس کے کہ اپنے فرقے کو نسب وحسب کی شرافت کی بنا پر قابل عذاب نہ جانیں۔ یا اپنے عذاب کو دوسروں کے عذاب سے کمتر اور چند دن خیال کریں۔ یا دار الثواب کو صرف اپنے لیے اور اپنے فرقے کے لیے خاص خیال کریں۔

وَالْمَلٰئِكَةِ اور فرشتوں پر بھی ایمان لائے کہ خدا تعالیٰ کے فرماں بردار بندے ہیں۔ اور اس کی رضا کے سوا کچھ نہیں کرتے۔ اور انہیں دشمن نہیں سمجھنا چاہیے۔ کہ خدا تعالیٰ کے محبوب ہیں۔ اور اس کے مطیع، اور اسی طرح ان کے بارے میں افراط اور حد سے گزرنے کا ارتکاب نہیں کرنا چاہیے۔ جس طرح کہ ہندو اور اہل جاہلیت کرتے تھے، اور کہتے تھے کہ یہ لوگ استقلال کے ساتھ جہان کی تدبیر کرتے ہیں۔ اور خدا تعالیٰ کے لیے بمنزلہ بیٹیوں کے ہیں۔

وَالْكِتٰبِ اور کتاب الٰہی پر بھی ایمان لائے۔ جو کتاب بھی ہو اپنے پر اُتری ہو یا اپنے غیر پر۔ اپنی لغت میں یا دوسری لغت میں۔ اپنی شریعت کے احکام کے مطابق ہو یا اس کی ناسخ، اور یہ ایمان حاصل نہیں ہوتا مگر اس وقت جب اس کتاب کو لفظی اور معنوی تحریف اور تبدیلی، فاسد تاویلات، اور اپنی بات پالنے کے لیے یا دنیوی اغراض، مال، مرتبہ اور بادشاہوں اور احکام کا قرب حاصل کرنے کے لیے باطل توجیہات سے محفوظ رکھے، اور اس کے مرتبہ کو اس سے بلند سمجھے کہ کوئی حقیر اور بے وقعت چیز اس کے عوض قرار دے۔

وَالنَّبِيّٖنَ اور تمام انبیاء علیہم السلام پر ایمان لائے۔ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر اپنے زمانے تک امتیاز اور تعصب کے بغیر۔ جبکہ تم نے بعض انبیاء علیہم السلام کو شہید کیا جیسے حضرت شعیا، زکریا، یحییٰ اور اپنے گمان میں عیسیٰ علیٰ نبینا علیہم السلام کو۔ اور تم نے بعض کی تکذیب اور انکار کیا۔ اور انہیں شہید کرنے کے درپے ہوئے۔ اور جادو کیا۔ زہر دیا۔ اور

جنگ کرنے کے لیے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ جیسے پیغمبر آخر الزماں جو کہ خاتم المرسلین اور افضل انبیاء ہیں علیہ وعلیہم الصلوٰت والتسلیمات، تو جو اس قسم کا ایمان لایا اور ان چیزوں کا گرویدہ ہو کر اس نے اپنے عقیدے کو درست کیا؛ اور اپنے دل کو جہل مرکب اور فساد معرفت سے پاک کر لیا۔ اس لیے کہ آدمی کا ایک مبداء ومعاد ہے۔ جو کہ خدا تعالیٰ کی ذات پاک ہے۔ اور ایک معاد ہے۔ جو کہ روز آخرت ہے۔ جب خدا تعالیٰ پر ایمان لایا اور روز آخرت کی تصدیق کی اس نے اپنے مبدء کی معرفت کا ایک رابطہ پیدا کر لیا۔ لیکن اسے اپنے مالک کی پسندیدہ چیزوں کو جاننے میں کہ روز آخرت اس کے کام آئیں، اور اس کی ناپسندیدہ چیزوں کو جو کہ اس روز مضر اور مہلک ہوں انبیاء علیہم السلام کو جاننے اور ان کا گرویدہ ہونے کے بغیر کوئی چارہ نہیں تاکہ ان کی زبان سے اپنے مالک کی پسند اور ناپسند کو پہچانے، اور اگر پیغمبر (علیہ السلام) موجود نہ ہوں تو اللہ تعالیٰ کی کتابوں کی طرف رجوع کریں۔ جو کہ پیغمبروں (علیہم السلام) کے ہمراہ نازل ہوئیں۔ اور یہاں سے اپنے عقیدے کو حل کریں۔ اور جب پیغمبری کا سلسلہ اور کتاب کا نزول فرشتوں کے ساتھ مربوط ہے فرشتوں پر ایمان کتاب اور پیغمبروں (علیہم السلام) پر ایمان سے پہلے ہے۔ اور جب پیغمبروں (علیہم السلام) کو بھی اصالتہً احکام الٰہی کتاب کے واسطے سے معلوم ہوتے ہیں تو کتاب پر ایمان لانا پیغمبروں (علیہم السلام) پر ایمان لانے سے بھی پہلے ہوا۔ تو جب مکلّف نے ان ساری چیزوں کو دل وجان کے ساتھ قبول کر لیا۔ اس کے ذمہ جو دلی تصدیق تھی ادا کی لیکن ابھی اسے اپنی اس تصدیق پر ایک گواہ گزارنا چاہیے۔ اس لیے کہ تصدیق دل کا کام ہے ہر کسی پر ظاہر نہیں ہوتا۔ اور بہترین چیز جو کہ اس تصدیق پر گواہ ہو سکتی ہے مال کا دینا ہے۔ جو کہ دل کی تہہ میں جگہ رکھتا ہے۔ اور پورا گرویدہ ہوئے بغیر ممکن نہیں ہے کہ کوئی کسی کے لیے مال دے۔ گو نفاق کے ساتھ تعظیم، سلام، ذکر اور تعریف کر سکتا ہے۔ پس صحیح ایمان والا وہ شخص ہے۔ جس نے یہ کام بھی کیا۔

وَاٰتَى الْمَالَ اور مال دیا۔ لیکن اس وقت نہیں کہ اس مال سے بے پرواہ اور مستغنی ہو گیا ہو، کہ اس وقت دینا گرویدہ ہونے کی دلیل نہیں ہے۔ بلکہ عَلٰى حُبِّهٖ اس مال کی محبت کے

باوجود کہ خود بھی اس کا محتاج ہے۔ اور زندگی کی امید رکھتا ہے اور صحت مند بدن رکھتا ہے۔ اور ڈرتا ہے کہ اگر میں نے یہ مال دے دیا تو محتاج اور فقیر ہو جاؤں گا۔ پھر وہ مال اسے بھی نہیں دیتا جس سے کسی نفع کی توقع ہو۔ بلکہ صرف خدا تعالیٰ کی رضامندی کے لیے صرف کرتا اور دیتا ہے

ذَوِي الْقُرْبٰى قریبیوں کو تا کہ خیرات بھی ہو اور صلہ رحمی بھی اور عوض طلب کرنے سے دور بھی۔ اس لیے کہ اہل قرابت کی یہی عادت ہے کہ اپنے قریبیوں کی دی ہوئی چیز کو شمار میں نہیں لاتے بلکہ انہیں جس قدر دیا جائے شکایت کا دروازہ اسی قدر زیادہ کھول دیتے ہیں۔ نیز دوسرے لوگ بھی اس دینے کو خاطر میں نہیں لاتے۔ اور اس کے ساتھ آدمی کی تعریف نہیں کرتے، اور صاحب خیرات نہیں جانتے۔ تو اس دینے میں کسی وجہ سے بھی دینے والے کے دل میں عوض کا کھٹکا نہیں ہو سکتا خصوصاً جو صاحب قرابت بدسلوک اور جفا کار ہو۔

اس لیے حدیث شریف میں جسے بیہقی اور دوسرے محدثین نے روایت کیا ہے وارد ہے کہ بہترین خیرات وہ ہے جو تو اپنے قریبی کو دے جو کہ ناقدر شناس ہوتا ہے۔ نیز بیہقی لائے ہیں کہ لوگوں نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھا کہ یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)! اتی المال علی حبہ کا کیا معنی ہے۔ اس لیے ہر شخص مال کو دوست رکھتا ہے، آپ نے فرمایا اس کا معنی یہ ہے کہ تو اس وقت مال دے کہ تیرے دل میں عمر کی درازی اور مال دینے پر غربت کا خوف کھٹکے، اور تو دیر نہ کرے، حتیٰ کہ جب تیری روح حلق میں پہنچے اس وقت تو کہے کہ فلاں کو اس قدر دے دیں، اور فلاں کو اس قدر۔ حالانکہ اس وقت تیرا مال، تیرا مال نہیں ہے: دوسروں کا مال ہو گیا۔

اور ترمذی اور دوسری صحاح میں موجود ہے کہ فقیر کو خیرات دینا ایک خیرات ہے۔ اور اپنے اہل قرابت کو دینا دو چیزیں ہیں خیرات بھی حق قرابت کی ادائیگی بھی۔ اور احتمال یہ ہے کہ حبہ کی ضمیر خدا تعالیٰ کی طرف راجع ہو یعنی مال صرف خدا تعالیٰ کی دوستی پر دے نہ کہ اپنے ذمہ ایک واجب کی ادائیگی پر۔ جیسے زکوٰۃ اور کفارۃ مثلاً زکوٰۃ کے اندازے سے زیادہ

دے یا اس مال سے دے جس میں حد نصاب سے کمی کی وجہ سے زکوٰۃ واجب نہیں ہوتی۔ یا یہ کہ جنس نامی نہیں ہے۔ جیسے کپڑا، پوشاک، حویلی، دکان اور اس صورت میں مال دینے کی مغایرت زکوٰۃ دینے سے جو کہ آئندہ ذکر کی گئی ہے بالکل ظاہر ہے۔

اور بعض نے کہا ہے کہ یہ ضمیر مال دینے کی طرف لوٹتی ہے۔ جو کہ اتی المال سے سمجھا جاتا ہے۔ یعنی مال دینے کو مکروہ اور ناگوار نہ سمجھا بلکہ مرغوب اور پسندیدہ جانا اور خوش دلی کے ساتھ ادا کیا۔ ہر صورت میں اہل قرابت کو دینا مقدم ہے۔ اور اسی لیے فقہاء نے لکھا ہے کہ مال کی زکوٰۃ کو ایک شہر سے دوسرے شہر تک لے جانا اچھا نہیں بلکہ ہر شہر کے مال کی زکوٰۃ اسی شہر کے محتاجوں کو دینا چاہیے۔ مگر یہ کہ زکوٰۃ دینے والے کے قریبی رشتے دار دوسرے شہر میں ہوں تو انہیں مقدم کرے۔ اور اپنے مال کی زکوٰۃ اس شہر میں بھیجے۔ اور قریبیوں کے استحقاق کو یہاں سے سمجھا جا سکتا ہے کہ مال کی وراثت کا مرتبہ قرب کے درجوں کے اعتبار سے بھی انہیں کو ہے۔ اور وارث نہ ہونے کی صورت میں ابتدائے اسلام میں ان کے لیے وصیت فرض تھی۔ اب بھی مال کے تہائی حصے میں مستحب ہے۔

ہم یہاں پہنچے کہ حصول ثواب کے لیے قریبیوں میں غربت اور احتیاج شرط ہے یا نہیں؟ آیت کا اطلاق اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ قریبیوں کو مال دینا عموماً اچھائی اور نیکی کے قبیلے سے ہے۔ لیکن جب یتیموں میں فقر واحتیاج شرط ہے۔ تو یہاں سے یہ بات نکھر گئی کہ قریبیوں میں بھی شرط ہو، اور قرینہ ظاہر ہونے کی بنا پر لفظوں میں ذکر نہ فرمایا، اور تحقیق یہ ہے کہ برّ اور نیکی کے اصل ثواب کے حصول کے لیے اقارب میں فقر واحتیاج شرط نہیں ہے کہ صلہ رحمی ہوتی ہے۔ اگر چہ خیرات نہ ہو، اور صلہ رحمی ثواب میں صدقہ سے کم نہیں ہے۔ ہاں صدقہ اور خیرات اس وقت ہوتا ہے کہ محتاج بھی ہوں۔ اسی لیے زکوٰۃ اور دوسرے صدقات اور کفارے فقر واحتیاج کے بغیر اقارب کو نہیں دیے جا سکتے

وَالْيَتَامٰى اور یتیموں کو مال دے۔ جو کہ بچپنے میں باپوں کے بغیر ہوتے ہیں خواہ مرد ہوں یا عورتیں۔ اس لیے کہ صغر سنی اور کم عمری کی وجہ سے روزی کی تلاش اور کمائی نہیں کر سکتے۔ اور باپ نہ ہونے کی وجہ سے ان کی کوئی خبر لینے والا نہیں۔ پس انہیں اپنی ساری نوع

والوں سے حکمی قرابت مل گئی ہے گویا حق تعالیٰ نے تمام مال داروں کو ان کے باپ مقرر فرما دیا، اور اس وجہ سے اور سخت محتاج ہونے کی وجہ سے انہیں ذوی القربیٰ کے متصل ذکر کیا گیا ہے۔

وَالْمَسَاكِينَ اور بے مایہ لوگوں کو مال دے۔ جن کی آمدنی ان کے خرچ کے مقابلے میں کم ہے، کہ کمائی کرتے اور راس المال رکھتے ہیں۔ اور یہاں اس فرقہ سے وہ لوگ مراد ہیں جو سوال اور اظہار حاجت نہیں کرتے۔ اور قناعت، صبر اور سکون کے ساتھ وقت گزارتے ہیں۔ صریح حدیث پاک کی دلیل سے جو کہ صحاح میں وارد ہے **لیس المسکین الذی تردہ التمرۃ والتمرتان واللقمۃ واللقمتان ولکن المسکین الذی لایجد غنی یغنیہ ولایفطن لہ فیتصدق علیہ** یعنی مسکین اسے نہ سمجھو جو کہ دروازوں کھڑا ہو جاتا ہے۔ اور ایک لقمہ اور دو لقمے ہر گھر سے وصول کر کے لے جاتا ہے۔ بلکہ مسکین وہ ہے۔ جو کہ اپنی ضرورت کی کفایت کے مطابق مال نہیں پاتا اور کوئی اس کے حال سے باخبر نہیں تاکہ اسے خیرات پہنچے۔ اس دلیل سے کہ اس آیت میں سوال کرنے والوں کو علیحدہ ذکر فرمایا گیا ہے پس مساکین ان کے علاوہ ہوں گے۔

وَابْنَ السَّبِيلِ اور راستہ طے کرنے والے مسافر کو مال دے۔ جس کے پاس خرچ نہیں یا سواری اور سایہ نہیں رکھتا۔ گو اپنے وطن میں مال دار ہو۔ خصوصاً جب مہمان ہو جائے کہ گویا وہ زبان حال سے سوال کرتا ہے۔ اور اسی لیے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اس خصوصیت پر نظر فرماتے ہوئے ابن السبیل کی تفسیر مہمان کے ساتھ فرمائی ہے۔ چنانچہ ابن ابی حاتم ان سے روایت کرتے ہوئے فرماتے تھے **ابن السبیل ھو الضیف الذی ینزل بالمسلمین۔**

وَالسَّائِلِينَ اور مال دے سوال کرنے والوں کو خواہ مسلمان ہوں خواہ کافر۔ اگرچہ ان کی حقیقت معلوم نہیں ہوتی لیکن جب انہوں نے مانگنے کی ذلت اور گداگری کی عار اپنے اوپر گوارا کر لی تو ان کے محتاج ہونے پر صریح دلیل ہوئی کہ آدمی ضرورت کے بغیر اس ذلت اور عار کو اپنے اوپر گوارا نہیں کرتا۔ اسی لیے مسند امام احمد اور ابوداؤد میں حضرت امام حسین

رضی اللہ عنہ کی روایت کے ساتھ واقع ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ للسائل حق وان جاء علی فرس، اور ابن ابی شیبہ نے سالم بن ابی الجعد سے روایت کی کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ للسائل حق وان جاء علی فرس مطوق بالفضہ یعنی سائل کا ایک حق ہے۔ اگر چہ ایسے گھوڑے پر سوار ہو کر آئے جس کی گردن میں چاندی کا طوق ہو، اور ترمذی نے امام نجید کی روایت کے ساتھ جو کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بیعت کرنے والوں میں سے تھیں روایت لائی گئی کہ اس نے عرض کی یارسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)! ایک سائل میرے دروازے پر آتا ہے۔ اور میرے پاس اسے دینے کے قابل کوئی چیز موجود نہیں ہوتی، فرمایا جو کچھ موجود ہو دے دے، اور اسے خالی نہ پھیر۔ اگر چہ بکری اور بھیڑ کا جلا ہوا سم ہو۔ اور ابونعیم ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مرفوعاً لائے کہ جو سائل دروازے پر آتا ہے مومن کے لیے خدا تعالیٰ کا ہدیہ ہے۔

وَفِی الرِّقَابِ اور مال دے گردنیں آزاد کرانے میں۔ خواہ قیدی اور اسیر مسلمان ہوں کافروں کے قبضے میں اور یہ شخص کچھ مال دے کر انہیں کفار کی قید سے چھڑا لے۔ اور خواہ مقروض ہوں جو کہ قرض خواہوں کے ہاتھوں مقید ہو گئے ہیں۔ اور یہ شخص ان کا قرض ادا کر دے، اور اگر چہ یہ لوگ کھانے اور پہننے میں محتاج نہیں ہیں۔ لیکن مخلوق کی قید سے رہا ہونے میں مال کے محتاج ہیں۔

علمائے عربیت کا اشکال اور اس کا جواب

اور یہاں علمائے عربیت کا ایک قوی اشکال ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ فی الرقاب ظرف ہے۔ جبکہ پہلے ذوی القربی اپنے معطوفات کے ساتھ مل کر مفعول بہ تھا۔ جہت عمل کے اختلاف کے باوجود ظرف کا مفعول بہ پر عطف کس طرح درست ہوگا؟ اس اشکال کا جواب دو طریقوں سے دیا گیا ہے: پہلا طریقہ یہ ہے کہ یہ عطف حذف فعل پر محمول ہے اس تقدیر کے ساتھ کہ وَاٰتَی الْمَالَ فِی الرِّقَابِ۔ پس جملے کا عطف جملے پر ہوا نہ کہ ظرف کا عطف مفعول بہ پر، اور اسی طریقے کو صاحب کشاف نے لَقَدْ نَصَرَکُمُ اللّٰہُ فِیْ مَوَاطِنَ کَثِیْرَۃٍ وَّیَوْمَ حُنَیْنٍ (التوبۃ آیت ۲۵) میں اختیار کیا اور نَصَرَکُمْ یَوْمَ حُنَیْنٍ مقدر کیا،

اور اسے جملہ کے عطف کے باب سے گردانا تا کہ ظرف زمان کا عطف ظرف مکان پر لازم نہ آئے۔

دوسرا طریقہ یہ ہے کہ یہ ظرف ایک دیگر ظرف محذوف پر معطوف ہے۔ جو کہ والسائلین سے متعلق ہے۔ یعنی والسائلین فی حوائجھم وفی فك الرقاب، اور سوال عام ہے قال کی زبان کے ساتھ ہو یا حال کی زبان کے ساتھ، اور اس مقام کی تحقیق یہ ہے کہ عطف کے صحیح ہونے کا مدار معنی پر ہے صورت لفظ پر نہیں۔ اور یہاں معنوی اعتبار سے جہت کا اختلاف نہیں ہے۔ اس لیے کہ رقاب اور جو اس سے پہلے گزرے دونوں مال کے مصارف ہیں۔ اور انہیں مال دیا جاتا ہے۔ نہ کہ زمان اور مکان کو۔ مال دینا گو اس مدخول کے ظاہر کے اعتبار سے ہوتا ہے۔ اور وہ نہیں ہوتے۔

اور اسلوب کے بدلنے میں نکتہ یہ ہے کہ اس مصرف میں قیدیوں اور مقروضوں کو دینا معمول نہیں بلکہ مال انہیں دینا چاہیے جنہیں قید کر کے لیے گئے ہیں یا وہ اپنا قرض مانگتے ہیں تا کہ یہ چھوٹ جائیں۔ بخلاف سابقہ مصارف کے کہ مال انہیں دینا چاہیے۔

یہ ہیں مال خرچ کرنے اور مخلوق کے حقوق جو کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں حقوق اللہ کی ادائیگی سے مقدم ہیں ادا کرنے کی رو سے ایمان حقیقی کے شواہد۔ پھر چاہیے کہ حقوق اللہ کو بھی کما حقہ ادا کریں۔

وَاَقَامَ الصَّلٰوۃَ اور نماز کو کمال کے ساتھ درست قائم کرے۔ اس لیے کہ نماز ظاہر سے لے کر باطن تک آدمی کے تمام اعضا اور اجزاء کو مشغول کرنے والی عبادت ہے۔ اور اس نے جب اسے درست کیا تو ہر عضو سے حق الٰہی کی ادائیگی ثابت ہو گئی۔ پس حق بدنی جو کہ ہر روز پانچ وقت اس کے ذمہ واجب تھا کی ادائیگی سے فارغ ہوا

وَاٰتَی الزَّکٰوۃَ اور زکوٰۃ دے جو کہ مال میں اللہ تعالیٰ کا حق ہے۔ تا کہ اس حق کی ادائیگی سے بھی فارغ ہو جائے۔ گو ذکر کیے گئے چھ مصارف میں مال دینے سے مخلوق کی ضرورتوں کی کفایت کی تھی، اور زکوٰۃ ایک معین اندازے کا نام ہے اس مال سے جس پر پورا سال گزرا ہو بشرطیکہ وہ حد نصاب کو پہنچا ہو اور نصاب کی حد چاندی سے ۵۲ (باون) تولے

اور سونے سے ساڑھے سات تولے اور سامان تجارت کو جو کسی جنس سے بھی ہو سونے یا چاندی کے نصاب کی قیمت کے ساتھ مقرر کر کے زکوٰۃ دینا چاہیے، اور ان کی زکوٰۃ میں واجب مقدار چالیسواں حصہ ہے۔ لیکن مویشی اور کھیتی باڑی جو کہ خراج کی زمین میں نہ ہوتو اس میں طویل تفصیل ہے۔ جو کہ فقہ کی کتابوں میں لکھی ہوئی ہے۔

اور جب زکوٰۃ دینا قریبیوں، یتیموں، مسافروں، سائلوں اور قیدیوں کو مال دینے سے جدا شمار کیا گیا تو معلوم ہوا کہ وہ دینا زکوٰۃ دینے سے جدا ہے۔ اور اس میں بعض واجب یا فرض ہے۔ جیسے ان قریبیوں کی خبر گیری جو کہ محرم ہیں۔ اور محتاج ہیں۔ اور جیسے مجبور مسافر کی خبر گیری، صدقہ نظر، نذریں، کفارے اور قربانی، اور ان میں سے بعض مروت اور مستحب ہے۔ اور اسی لیے اس دینے کا مطالبہ اس سے بھی ہوتا ہے۔ جس پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے یا واجب ہے۔ اور اس نے ادا کر دی ہے۔ اور یہی معنی ہے اس حدیث پاک کا جو کہ ترمذی، ابن ماجہ نے حضرت فاطمہ بنت قیس رضی اللہ عنہا سے روایت کی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ مال میں زکوٰۃ کے سوا بھی ایک حق ہے۔ اور یہ آیت تلاوت فرمائی، اور بخاری اپنی تاریخ میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت سے لائے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھا گیا کہ کیا زکوٰۃ دینے کے بعد مال پر کوئی حق واجب رہتا ہے؟ آپ نے فرمایا ہاں، اور یہ آیت تلاوت فرمائی وآتی المال علی حبہ الخ۔

اور وہ جو حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے مروی ہے کہ زکوٰۃ نے مال میں ہر حق کو منسوخ کر دیا، اور مال میں زکوٰۃ کے سوا کوئی حق نہیں تو اس سے مراد یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کا معین حق زکوٰۃ کے سوا اور کوئی چیز نہیں۔ اور یہ حقوق جو پہلے ذکر کیے گئے معین نہیں ہیں۔ پھر مخلوق کے حقوق ہیں نہ کہ حقوق خدا۔ اور ابھی تک جو ذمہ داریاں کہ بیان ہوئیں اس قبیلے سے تھیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے لوگوں پر خواہ اپنے لیے خواہ اپنی مخلوق کے لیے ان کے لازم کیے بغیر لازم فرمایا ہے۔ لیکن اس پر نظر کرتے ہوئے جو لوگوں کے ذمہ خود لازم کرنے کی وجہ سے لازم ہوتی ہیں۔ پس نیک لوگ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اور اپنے عہد کو پورا کرنے والے۔ خواہ وہ عہد اللہ تعالیٰ کے ساتھ باندھیں اور کوئی نذر اپنے اوپر مقرر کریں یا کسی نیک کام پر

اس کے نام کی قسم کھائیں۔ اور مخلوق کے ساتھ کوئی عہد باندھیں۔ یا کسی کی امانت پکڑیں یا کسی کے ساتھ نیک وعدہ کریں کہ ان سب صورتوں میں وفا واجب ہے۔ لیکن وفا کی نیت چاہئے جو کہ دل میں پختہ ہوتی ہے۔ اِذَا عَاهَدُوا جس وقت کہ عہد باندھیں۔ تو اگر اس وقت پورا کرنے کی نیت نہ تھی۔ اور بعد میں لوگوں کی ملامت کے خوف یا کسی منفعت کی طمع سے پورا کیا تو یہ معتبر نہیں ہے۔ کیونکہ اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ، اور اسی طرح اگر عہد باندھنے کے وقت وفا کی نیت پختہ تھی۔ لیکن بعد میں ناچاری اور ناطاقتی کی وجہ سے یا کسی ظالم کے ڈر کی وجہ سے وفا نہ کر سکا تو معذور ہے۔ اور اس کا بے وفاؤں میں شمار نہیں ہوتا۔

اور عہد کو پورا کرنا اگرچہ بظاہر نیک کاموں میں سے کسی ایک کام کے ساتھ معلوم ہوتا ہے۔ لیکن حقیقت میں تمام معاملات کو شامل ہے۔ جن کا بندوں کو خدا کے ساتھ یا مخلوق کے ساتھ اتفاق ہوتا ہے۔ جیسے پیری مریدی، شاگردی اُستادی، اُمت ہونا اور نبی ہونا یہ سب کے سب دونوں طرف سے اللہ تعالیٰ کے عہد کو ضمن میں لیے ہوئے ہیں کہ اس تعلق کے لوازمات کو کماحقہ ادا کریں، اور اسی طرح دین اسلام میں داخل ہونا اور کسی نیکی میں شروع ہونا گویا اس کے لازمی حقوق کو پورا کرنے پر عہد باندھنا ہے۔ اور اسی لیے وہ لوگ جو کہ اس زمانے میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ بیعت کرتے تھے کبھی تنگی اور آسانی اور خوشی غمی میں حکم قبول کرنے پر۔ کبھی اس بات پر کہ سچی بات کہیں گے جہاں بھی ہوں۔ اور دین کے مقدمہ میں کسی سے نہ ڈریں۔ اور تقیہ اور رعایت نہ کریں۔ اور کبھی اس بات پر کہ کسی مخلوق سے سوال نہ کریں۔ اور یہ چیزیں ان کے ذمہ زیادہ لازم ہو جاتی تھیں۔ حتیٰ کہ اصحاب صفہ میں سے بعض جنہوں نے دینا اور مال جمع کرنے کو ترک کرنے پر بیعت کی تھی۔ اور وفات کے وقت ایک دو اشرفیاں ان کی جیب سے برآمد ہوئیں وعید شدید کا مورد ہوئے۔

اور نکاح، وکالت، شرکت، مضاربت اور اکثر معاملات وفائے عہد کی طرف لوٹتے ہیں۔ اور اس اچھی عادت کے بغیر کسی معاملے کا حق شریعت کے مطابق ادا نہیں ہو سکتا، اور اسی لیے اسلوب کو بدل کر اور فعل سے اسم کے ساتھ لا کر اس خصلت کو بیان فرمایا، اور یہ سب

خصلتیں جو کہ ذکر ہوئیں ہم نے برّ اور نیکی کا کچھ حصہ تمہارے سامنے بیان فرمایا ہے۔ عموم کے طریقے پر بیان فرمایا:

وَالصَّابِرِیْنَ اور یاد کرو صابروں کو جن کے حق میں عنقریب آیت وَبَشِّرِ الصَّابِرِیْنَ میں کیا بشارت گزری ہے۔ اور وہ نیکی کے کس مرتبے میں ہیں۔ خصوصاً جب ان کا صبر تمام سختیوں کو گھیرنے والا ہوتا ہے تو صبر کرتے ہیں

فِی الْبَاْسَآءِ شدت فقر میں، تمہاری طرح نہیں کہ باوجودیکہ اتنے محتاج نہیں ہو رشوتیں تیل کھانے سے صبر نہیں کرتے ہو۔

وَالضَّرَّآءِ اور مرض، درد اور تکلیف میں۔ نہ کہ تمہاری طرح کہ ایک کھانا کھانے سے گرچہ لذیذ اور نفیس تھا تنگ آکر کہا لَنْ نَّصْبِرَ عَلٰی طَعَامٍ وَّاحِدٍ

وَحِیْنَ الْبَاْسِ اور جنگ کے وقت کہ غلے اور پانی کا قحط بھی، دشمنوں کا ہجوم اور خوف بھی اور جسمانی تکلیفیں، بے خوابی، زخم اور اعضا کا ضائع ہونا بھی رونما ہوتا ہے۔ تمہاری طرح نہیں کہ تم نے اِذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَا اِنَّا هٰهُنَا قَاعِدُوْنَ کہا، اور جسے ان تین حالتوں میں صبر کی عادت ہو تو جانا جا سکتا ہے کہ اس کا صبر کامل ہے۔ اس لیے کہ آدمی پر جو مصیبتیں آتی ہیں۔ اور صبر کے امتحان کا وقت آتا ہے سب کے سب تین قسم ہیں۔ پہلی قسم مال کا نقصان جس کا انجام فقر ہے۔ دوسری قسم بدن کا نقصان جس کا شروع درد، رنج، بیماری، زخم، صدمے اور خواریاں ہیں۔ تیسری قسم جان کی ہلاکت کہ اس کا زیادہ تر خطرہ جنگ کے وقت ہے۔ اور یہ تینوں مصیبتیں سختی اور شدت میں اسی ترتیب کے ساتھ ترقی کرتی ہیں۔

نیز ان کی جزا جانی جا سکتی ہے کہ یہ صرف حکم الٰہی کی اطاعت کے لیے ہے۔ ورنہ انسانی افراد اپنی طبیعتوں میں موجود مختلف جرءتوں کے اعتبار سے ان میں سے بعض مصیبتوں کی پرواہ نہیں کرتے۔ مثلاً بعض لوگ جنگ کے وقت بالکل بے جا نہیں ہوتے بلکہ تھوڑی سی بیماری جو ظاہر ہوتی ہے تو حواس کھو بیٹھتے ہیں۔ اور بعض دوسرے فقیری برداشت کرنے میں بہت ثابت قدم ہوتے ہیں۔ جبکہ جنگ کے نام سے ان کے چہرے

زرد پڑ جاتے ہیں۔ علیٰ ہذا القیاس۔ اور جوان تمام حالات میں ثابت قدم رہے اطاعت الٰہی سے مغلوب ہونے کے بغیر نہیں ہوسکتا۔

مختصر یہ کہ نیکوکاری ان اوصاف کا جامع ہونے سے عبارت ہے۔ اگر ان میں سے ایک وصف بھی فوت ہو جائے تو نیکوکاری کا نام درست نہیں ہوتا۔ تو اہل کتاب جنہوں نے تمام اوصاف فوت کر دیے ہوں حتیٰ کہ خدا تعالیٰ پر ایمان لانے میں اس قدر کوتاہی کی کہ حضرت عزیر اور مسیح علیہما السلام کو خدا کے بیٹے قرار دے دیا، اور یہودیوں نے یَدُاللّٰہِ مَغْلُوْلَۃٌ کہا، اور نصاریٰ حلول واتحاد کی طرف چلے گئے، اور آخرت کے بارے میں بھی اسی قسم کی بوگس چیزوں کے معتقد ہوئے، کبھی کہتے کہ لَنْ یَّدْخُلَ الْجَنَّۃَ اِلَّا مَنْ کَانَ ھُوْدًا اَوْنَصَارٰی، اور کبھی لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَیَّامًا مَّعْدُوْدَۃً، اور فرشتوں پر ایمان لانے میں سے بہترین کو جو کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام ہیں اپنا دشمن قرار دے دیا۔ اور ملائکہ کی عصمت کے سرے سے ہی منکر ہو گئے، اور کتاب پر ایمان لانے میں عجیب قسم کی بانٹ اور تقسیم کی۔ اس کے ایک حصے کے معتقد ہو گئے جبکہ دوسرے کے بارے میں کفر اختیار کیا، اور اسی طرح انبیاء علیہم السلام پر ایمان کے بارے میں بھی۔ حتیٰ کہ انبیاء علیہم السلام کی ایک کثیر جماعت کو شہید کر دیا۔ اور اپنا وہ مال دینے کا کیا امکان جس کے بدلے انہوں نے دین کو بیچ دیا۔ اور آیات الٰہی اور اس کے احکام کر دنیا کے تھوڑے سامان کے بدلے ہاتھ سے چھوڑ دیا۔ اور اپنے عہدوں کو توڑنا ان کی ہمیشہ کی عادت ہے۔ جیسا کہ پہلے پارے میں گزرا۔ اور ان کی بے صبری بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں بار بار ظاہر ہوتی تھی۔ یہاں تک کہ انہوں نے صاف کہہ دیا لَنْ نَّصْبِرَ عَلٰی طَعَامٍ وَّاحِدٍ اور عمالقہ کی جنگ میں ان کی بزدلی اس حد تک پہنچ گئی کہ انہوں نے اِذْھَبْ اَنْتَ وَرَبُّکَ کہا۔ تو انہیں نیکوکاری کا دعویٰ کیسے درست آئے جبکہ ان اوصاف میں ایک وصف بھی نہیں رکھتے۔ ہاں نیکوکار وہی لوگ ہیں جو کہ ان تمام اوصاف کے جامع ہیں۔ اس کی وجہ ظاہر ہے۔ اس لیے کہ نیکوکاری یا اعتقاد میں ہے یا اعمال اور اخلاص میں۔

اُولٰٓئِکَ وہ ان اوصاف کے جامع لوگ اَلَّذِیْنَ صَدَقُوْا وہ ہیں جو کہ اعتقادات میں

سچے ہیں وَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُتَّقُوْنَ اور وہ لوگ وہی ہیں جو اخلاق و اعمال میں متقی ہیں۔ پس کسی وجہ سے خلل نہیں رکھتے، اور ان کی نیکوکاری ظاہر و باطن میں کمال کو پہنچی۔

ایک سوال اور اس کا جواب

ہم یہاں آتے ہیں کہ صابرین کی وصف کو منصوب کیوں لائے کیونکہ سابقہ صفات بھی مرفوع ہیں۔ اور اس صفت کا ان صفات پر عطف تقاضا کرتا ہے کہ یہ بھی مرفوع ہو۔ اہل عربیت کہتے ہیں کہ اس نصب کو مدح واختصاص کی نصب کہتے ہیں۔ جب چند صفات میں سے کسی صفت کو مزید شرافت وعظمت سے امتیاز دینا چاہیں تو معنوی امتیاز کو جتلانے کے لیے اعراب میں امتیاز دے دیتے ہیں۔ اور سختیوں اور جنگ کے معرکوں میں صبر کرنا ایک عمدہ صفت ہے اسے سابقہ صفات سے ممتاز کرنا ضروری تھا۔ اس بنا پر اس کے اعراب کو سابقہ صفات کے اعراب سے بدل کر رفع سے نصب لائے۔ گویا یوں فرمایا ہے کہ ہم صابروں کو مدح عظیم اور نیکی کے کمال کے ساتھ خاص کرتے ہیں۔ اور ابوعلی فارسی کہتے ہیں کہ مقام مدح یا مقام ہجو میں تو اگر بہت سی صفات کو ذکر کرے تو بلاغت کا تقاضا یہ ہے کہ تو ان صفات کا اعراب مختلف لائے۔ اور سب کو اپنے موصوف پر یکساں نہ لائے اس لیے کہ مدح وہجو کا مقام طوالت اور مبالغے کی جگہ ہے۔ اور جب صفات کے اعراب مختلف ہو گئے تو معنوں میں طوالت حاصل ہوگئی۔ اس لیے کہ اعراب کے مختلف ہونے کی صورت میں کلام یوں معلوم ہوتا ہے گویا چند قسم کا کلام ہے۔ اور اعراب مختلف نہ ہوں تو سارا کلام ایک جملہ ہو جاتا ہے۔

اور علمائے عربیت میں سے بعض محققین نے اس کے جواب میں کہ حرکت کا اختلاف مدح وہجو میں مبالغہ کا فائدہ کیوں دیتا ہے کہا ہے کہ مدح وہجو کا اصل سامع کی کلام سے ہے۔ اس لیے کہ جب کوئی شخص دوسرے کو خبر دیتا ہے کہ فلاں نے ایسا کیا۔ غالب طور پر سامع اس کا نام سن کر یا تو اس کی مدح وثنا کرتا ہے۔ اور کہتا ہے کہ کیا خوب آدمی کا آپ نے ذکر کیا یا وہ کتنا عقلمند ہے یا کتنا قابل ہے یا اسی طرح اس کی ہجو اور مذمت کرتا ہے۔ پس مدح اور ہجو کے وقت متکلم چاہتا ہے کہ اپنے آپ کو سامع قرار دے اسی انداز سے بات کرے اس کی بنا

پر اعراب کا اختلاف مدح اور ذم کی دلیل ہوتا ہے۔

اور حدیث شریف میں ابن مردویہ اور عبد بن حمید کی روایت کے ساتھ وارد ہے کہ ایک شخص حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کے پاس آیا اور اس نے پوچھا کہ ایمان کیا ہے؟ آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی اور آخر تک پہنچائی۔ اس شخص نے کہا کہ یہ آیت میرے سوال کا جواب نہیں ہوئی۔ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ایک شخص نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت عالیہ میں آکر اسی قسم کا سوال کیا تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کے سامنے یہ آیت تلاوت فرمائی۔ وہ بھی راضی نہ ہوا جیسے تو راضی نہیں ہوا حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسے فرمایا کہ قریب آ، جب نزدیک ہوا تو ارشاد فرمایا کہ ایمان کی علامت یہ ہے کہ جب تجھ سے نیکی سرزد ہو تو اپنے دل میں خوش ہو اور اس کے ثواب کی امید رکھے۔ اور جب تجھ سے برائی صادر ہو تو غمگین ہو اور اس کی سزا کا ڈر تیرے دل میں اثر کرے، اور ابن ابی شیبہ، حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے لائے کہ جو اس آیت پر عمل کرے اس کا ایمان کامل ہو جاتا ہے۔

اور فی الواقع اس آیت میں غور وخوض کے بعد واضح ہو جاتا ہے کہ شرعی ذمہ داریوں میں سے کوئی چیز اس آیت کے مضمون سے باہر نہیں ہے۔ اور حکیم ترمذی نے ابوعامر اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت کی کہ میں نے پوچھا یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)! نیکی کا کمال کیا ہے؟ آپ نے فرمایا کہ خلوت میں تو وہی کرے جو کہ کھلے عام کرتا ہے اور ابن عساکر، حضرت زید بن رفیع سے لائے کہ ان سے کسی نے خارجیوں کے متعلق پوچھا کہ ان کی تکفیر میں آپ کیا فرماتے ہیں وہ قبلہ والے ہیں۔ اور نماز روزہ اسلامی طریقے پر ادا کرتے ہیں۔ زید بن رفیع نے فرمایا کہ استقبال قبلہ اور نماز روزے پر فریفتہ نہ ہو جاؤ۔ تم نے سنا نہیں کہ حق تعالیٰ کیا فرماتا ہے؟ لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ الخ تو جس نے اپنا ایمان ان چیزوں کے ساتھ درست کر لیا مومن ہے۔ اور جو ان میں سے ایک چیز کا منکر ہوا کافر ہے۔

اور جب تم نے جان لیا کہ نیکوکاری کی قسموں میں سے بہترین قسم صبر ہے۔ تو اس

نسلت کو بھی ہاتھ سے نہ جانے دینا، خصوصاً اس وقت کہ تمہارے قریبیوں اور متوسلین میں سے کوئی کسی کے ہاتھوں مارا جائے۔ اور تمہیں قاتل سے انتقام کا غصہ، مقتول کی جدائی کا صدمہ، مقتول کی حفاظت سے پورے طور پر اپنے عاجز ہونے کی شرمندگی اور ذلت کا لاحق ہونا ایک دوسرے کے ساتھ جمع ہو کر عجیب حالت پیدا کر دے اور اس وقت بے صبری کر کے تم چاہو کہ قصاص میں برابری پر اکتفاء نہ کرو بلکہ ایک شخص کی بجائے چند آدمیوں کو قتل کر دو۔ اور قاتل کے ساتھ اسے کے بیٹے، بھائی اور رشتے داروں سے قصاص لے لو یا مقتول عورت کے عوض قتل کرنے والی عورت کو قتل کرنے پر اکتفاء نہ کر کے اس کے مردوں جیسے شوہر اور بیٹا بھی قتل کر دو۔ یا اپنے غلام کے عوض جو کہ کسی شخص کے غلام کے ہاتھوں مارا گیا ہو صرف غلام کے قتل پر اکتفاء گوارا نہ کرو اور چاہو کہ اس غلام کے مالکوں کو بھی قتل کر دو، اور جان لو

یَاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اے با ایمان لوگو! تمہارے ایمان کا تقاضا یہی ہے کہ بارگاہ خداوندی سے تم پر جو کچھ لکھا گیا ہے کسی حالت میں بھی اس سے آگے نہ بڑھو۔ کُتِبَ عَلَیْکُمُ الْقِصَاصُ تم پر خون میں برابری کرنا لکھا گیا ہے۔ فِی الْقَتْلٰی مقتولوں کے مقدمہ میں، تو ہر مقتول کو دوسرے مقتول کے برابر رکھو۔ اور اپنی محبت اور قرابت یا علم، فضل، نسب، بزرگی، ذات میں اچھے ہونے، خوبصورتی اور بدصورتی، اور باہمی نیکی اور برائی کی وجہ سے ترجیح اور امتیاز کا سبب نہ بناؤ کہ ایک مقتول کے بدلے چند آدمیوں کو قتل کر دو۔ اس لیے کہ اگر اس قسم کی ترجیح اور امتیاز کو دخل دو گے تو قصاص کا مسئلہ ختم ہو جائے گا۔ اور جاری نہ رہے گا۔ اس لیے کہ ہر شخص کے نزدیک اپنا مقتول زیادہ پیارا اور قیمتی ہوتا ہے۔ جس طرح تم اپنے مقتول پر غم اور صدمہ پیدا کرتے ہو دوسرے بھی اپنے قریبیوں اور عزیزوں پر اسی طرح غمگین ہوتے ہیں۔ کیا وہ گوارا کریں گے کہ تم اپنے مقتول کے بدلے ان میں سے کئی آدمیوں کو قتل کر دو۔ پس

اَلْحُرُّ ہر آزاد برابر ہے بِالْحُرِّ دوسرے آزاد کے۔ اگرچہ اس نے از روئے علم یا نسب و جمال فضیلت حاصل کی ہو مثلاً ایک سید ہو اور دوسرا جولاہا۔ وَ اور اسی طرح اَلْعَبْدُ ہر

غلام برابر ہے بِالْعَبْدِ دوسرے غلام کے۔ اور اسی طرح ہر کنیز دوسری کنیز کے برابر ہے۔ اگرچہ ایک غلام بادشاہ کا چیلہ اور محبوب ہو اور دوسرا مویشی چرانے والا دیہاتی، اور ایک کنیز کسی بادشاہ کا حرم خاص ہو اور دوسری کوڑا کرکٹ اُٹھانے والی۔

وَ اور اسی طرح الْاُنْثٰی یعنی ہر عورت برابر ہے بِالْاُنْثٰی دوسرے عورت کے اگرچہ ایک محل میں بیٹھنے والی بیگم ہو اور دوسری کوچے میں پھرنے والی مزدور۔ اور یہاں جاننا چاہیے کہ اس آیت کا مدلول اسی قدر ہے کہ اہل ایمان کو چاہیے کہ خون کے مقدمے میں غصے اور کینے کی وجہ سے بے صبری نہ کریں، اور قتل کرنے میں حد شرع سے تجاوز نہ کریں۔ جس طرح کہ اہل جاہلیت عمل میں لاتے تھے کہ بڑے لوگ عام لوگوں سے کہتے تھے کہ ہم اپنے غلاموں کے عوض تمہارے آزاد آدمیوں کو قتل کریں گے، اور عورتوں کے بدلے مردوں کو قتل کریں گے۔ اور ایک شخص کے عوض دو آدمیوں کو قتل کریں گے۔ تم ایسا نہ کرنا بلکہ اس مقدمہ میں ہر آزاد آدمی کو آزاد آدمی کے برابر جانو، اور اسی طرح ہر غلام کو دوسرے غلام اور ہر عورت کو دوسری عورت کے برابر، نسبی شرافت یا عمدگی کی وجہ سے ایک کو دوسرے پر ترجیح اور فضیلت نہ دو، اور ایک کو چند آدمیوں کے برابر نہ کرو۔ اور اس آیت کا مفہوم مخالف کہ آزاد غلام کے برابر نہیں۔ اور اسی طرح غلام آزاد کے اور عورت مرد کے برابر نہیں تو یہ عام طور پر مراد نہیں ہے۔ بلکہ دیت لینے کی صورت میں۔

مرد اور عورت کی دیت کا فرق

اس لیے کہ آزاد مرد کی دیت یعنی خون بہا دو ہزار آٹھ سو (۲۸۰۰) روپیہ کے قریب ہے (یہ حضرت مفسر علام کے دور کی بات ہے۔ اب اس سے زیادہ ہے) جبکہ آزاد عورت کی دیت اس رقم کا نصف۔ اور غلام اور کنیز کی دیت ان کی قیمت ہے۔ لیکن خون کا معاوضہ خون کی صورت میں۔ پس کوئی فرق نہیں۔ حنفیہ کے نزدیک آزاد کو غلام کے عوض قتل کیا جا سکتا ہے بشرطیکہ غلام اس کا مملوک نہ ہو، اور مرد کو عورت کے عوض بالاجماع قتل کیا جا سکتا ہے۔ اور اکثر مفسرین جو کہ تغلیب کے طریقے سے القتلٰی کو مقتولوں اور قاتلوں میں شامل کر کے مقتولوں کے برابر کرنا مراد لیتے ہیں اس مفہوم مخالف میں تردد کرتے ہیں۔ اور بعض شافعی

حضرات اسے اپنے مذہب پر دلیل لاتے ہیں۔اور کہتے ہیں کہ آزاد کو غلام کے عوض قتل نہیں کرنا چاہیے۔اور حق یہ ہے کہ اس مذہب پر اس مفہوم مخالف کے ساتھ استدلال صحیح نہیں آتا۔اس لیے کہ اگر یہ معنی مراد ہو تو اس کا عکس بھی مراد ہوگا۔اور وہ اجماع کے خلاف ہے۔ نیز جب ہر عورت کو دوسری عورت کے برابر فرمایا گیا تو کنیز اور آزاد عورت برابر ہوئیں حالانکہ اگر غلام اور آزاد مرد میں فرق کیا جائے تو کنیز اور آزاد میں بھی فرق کرنا چاہیے،اور اس کے باوجود مرد اور عورت کے درمیان یہ مفہوم مخالف کسی طرف سے درست نہیں پڑتا، اور آیت النفس بالنفس کے عموم کے مخالف بھی ہے۔اور حدیث المسلمون یتکافؤ دماء ھم کے منافی بھی۔

ہاں اگر چند لوگ ایک شخص کو قتل کرنے میں شریک ہوں تو ان چند لوگوں کو ایک شخص کے عوض قتل کرنا ٹھیک ہے۔اس لیے کہ ان میں سے ہر ایک اس ایک کا قاتل ہوا،تو غیر قاتل قتل نہ کیا گیا،اور یہی معنی ہے حضرت امیر المومنین عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے قول کا کہ لو تمالا علیہ اھل صنعا لقلتھم کہ اگر مقتول پر سب اہل صنعاء ٹوٹ پڑتے تو میں انہیں قصاص میں قتل کرتا۔

نیز جاننا چاہیے کہ قصاص کے حکم سے چند صورتیں مستثنیٰ ہیں۔پہلی صورت یہ ہے کہ مسلمان حربی کافر کو قتل کر دے کہ بالاجماع اس صورت میں قصاص نہیں ہے۔اور اگر ذمی یا صلح کرنے والے کو قتل کیا تو اختلاف ہے۔شافعیہ کے نزدیک اس صورت میں بھی قصاص نہیں ہے۔اور حنفیہ کے نزدیک ہے۔لیکن صحیح حدیث لایقتل المسلم بکافر شافعیہ کے قول کی تائید کرتی ہے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ ایک مسلمان نے دوسرے مسلمان کو غلطی سے قتل کر دیا،اور اس کے دو طریقے ہیں۔پہلا یہ کہ پہچاننے میں خطا کرے۔اور اس مسلمان کو شکل اور لباس کی وجہ سے یا کفار کے ہمراہ ہونے کی وجہ سے کافر سمجھ کر قتل کرے۔اور دوسرا یہ کہ فعل میں خطا کرے جیسے تیر یا ڈھیلا شکار پر پھینکا تھا درمیان میں مسلمان کا گزر ہوا۔اور اسے لگ گیا اور وہ مارا گیا۔ان دونوں صورتوں میں قصاص لازم نہیں آتا بلکہ خون بہا واجب ہوتا ہے۔

جیسا کہ سورۃ النساء میں مذکور ہے۔

تیسری صورت یہ ہے کہ باپ یا ماں اپنے بیٹے یا بیٹی یا پوتے یا نواسے کو مار دیں کہ اس صورت میں بھی قصاص واجب نہیں ہے، خون بہا لینا چاہیے۔

چوتھی صورت یہ ہے کہ مالک اپنے غلام یا لونڈی کو قتل کر دے۔ اور اس صورت میں قصاص آتا ہے نہ خون بہا لیکن مالک پر کفارہ دینا لازم ہوتا ہے۔

چند جواب طلب سوالات

یہاں چند جواب طلب سوالات باقی رہ گئے۔ پہلا سوال یہ ہے کہ اس کلام سے مخاطب کون لوگ ہیں؟ اگر قاتل ہیں تو ان پر واجب نہیں کہ اپنے آپ کو قتل کریں بلکہ یہ فعل حرام ہے۔ اور اگر مقتول کے ورثاء ہیں تو وہ لوگ اس سلسلہ میں بااختیار ہیں اگر چاہیں تو قصاص لیں اور اگر چاہیں تو معاف کر دیں بلکہ معاف کرنا بہتر ہے والعافین عن الناس کی دلیل سے، اور اگر کوئی ان دونوں کے علاوہ ہے تو وہ کون ہے؟ اور اس کے ساتھ کسی دوسرے پر مقدمہ خون میں بالاتفاق کوئی چیز واجب نہیں ہوتی خون بہا دینا نہ قصاص لینا۔

اس کا جواب یہ ہے کہ قصاص برابر کرنے سے عبارت ہے۔ اور مقتولوں میں برابری کی رعایت سب مسلمانوں پر اس طرح واجب ہے کہ جب قصاص واجب ہونے کے شرائط جمع ہو جائیں انہیں جائز نہیں کہ اس وقت برابری کی رعایت نہ کریں۔ قاتل کو برابری کی رعایت سے اپنے آپ کو پیش کرنا واجب ہو جاتا ہے۔ اور مقتول کے وارث کو برابری کا مطالبہ کرنا چاہیے نہ کہ زیادتی کا، اور بادشاہوں اور حاکموں کو بھی قتل کرنے میں برابری کرنا چاہیے۔ پس اس خطاب سے تمام مسلمان مخاطب ہیں۔ لیکن چونکہ کسی کی بات حاکم کی تائید کے بغیر آگے نہیں بڑھتی اس بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ اس کلام کے مخاطب صرف حکام ہیں۔

دوسرا سوال یہ ہے کہ اس آیت کا ظاہر تقاضا کرتا ہے کہ خون بہا لینے کے وقت برابری واجب ہے۔ لیکن یہ کہ خون کے عوض خون لینا واجب ہے تو اس آیت سے سمجھا نہیں جاتا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ہاں اس آیت سے یہ مضمون سمجھا نہیں جاتا اور جو آیت خون کا معاوضہ واجب ہونے پر دلالت کرتی ہے دوسری آیت ہے۔ جو کہ سورۃ مائدہ میں تورات

سے منقول ہے کہ النفس بالنفس، اور علاوہ ازیں اس کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ جو برابری اس آیت میں واجب ہوئی ہے اس سے مراد قتل میں برابری ہے۔ اور قتل میں برابری قتل کی صفت ہے۔ اور صفت کا واجب ہونا ذات کو واجب کرنے کا متقاضی ہے جو کہ اس صفت سے موصوف ہو۔ تو اس راستے سے وجوب قتل بھی اس آیت سے سمجھ میں آ گیا لیکن وجوب قتل کی شرائط درکار ہیں۔ جیسے خون کا وارثوں کا مطالبہ، اور قتل کا بلا شبہ جان بوجھ کر ہونا۔

تیسرا سوال یہ ہے کہ قتل میں برابری سے سمجھا جاتا ہے کہ قتل کی کیفیت میں بھی برابری کی رعایت کرنا چاہیے مثلاً اگر قاتل نے آگ میں جلایا ہو تو اسے بھی آگ میں جلایا جانا چاہیے، اور اگر پانی میں غرق کیا ہو تو اسے بھی پانی میں غرق کرنا چاہیے، اور اگر ہاتھ پاؤں کاٹ کر یا آنکھیں نکال کر یا کان اور ناک کاٹ کر قتل کیا تو اس کے ساتھ بھی اسی قسم کا سلوک کرنا چاہیے۔ جیسا کہ حدیث شریف، میں بخاری کی روایت سے وارد ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ مبارک میں ایک خبیث یہودی نے ایک انصاری کی بیٹی کو اس کا زیور حاصل کرنے کے لیے فریب دے کر اُجاڑ میں لے جا کر اس کے سر کو پتھر کے ساتھ کچل دیا۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اس کے اقرار کے بعد اس یہودی کو اسی طرح قتل کرنے کا حکم دیا، اور امام شافعی رحمتہ اللہ علیہ کا یہی مذہب ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ کیفیت قتل میں برابری اس آیت سے معلوم نہیں ہوتی۔ اس لیے کہ فی القتلیٰ فرمایا ہے نہ کہ فی القتل۔ علاوہ ازیں عام طور پر کیفیت قتل میں برابری کی رعایت ہو ہی نہیں سکتی۔ مثلاً اگر کسی شخص نے کسی کو جادو کے ساتھ قتل کیا ہے تو شافعیہ کے نزدیک بھی اسے جادو کے ساتھ نہیں مارا جا سکتا۔ اس لیے کہ جادو فعل حرام ہے۔ اور اسی طرح اگر کسی شخص نے چھوٹے بچے کو لواطت کے ساتھ مار دیا اسے اس طریقے کے ساتھ نہیں مارا جا سکتا بلکہ تلوار کے ساتھ۔ ہاں وہ جو حدیث پاک میں منقول ہے صرف اسی قدر پر دلالت کرتا ہے کہ مقتول کے وارثوں کی تشفی کے لیے کیفیت قتل میں برابری بھی بہتر ہے۔

چوتھا سوال یہ ہے کہ اگر قاتل نے اپنے کیے سے توبہ نہ کی اور اس نے توبہ ترک کرنے پر اصرار کیا تو اس پر قصاص واجب کرتا۔ البتہ عقل میں آتا ہے کہ گناہ کے عوض خدا تعالیٰ کی

طرف سے ایک سزا ہے۔ لیکن اگر اس نے تہہ دل سے توبہ کرلی اور اس پر نادم ہوا تو پھر بھی اس پر قتل واجب کرنے کی حکمت کیا ہے؟ ظاہر ہے کہ قبول توبہ کے بعد سزا نہیں ہوسکتی۔

اس کا جواب یہ ہے کہ توبہ جو کہ ماضی پر ندامت اور مستقبل میں گناہ ترک کرنے پر پختہ ارادے سے عبارت ہے دل کا کام ہے۔ جس پر مخلوق کو اطلاع نہیں ہوسکتی۔ اور اگر توبہ کو قصاص لینے سے روکنے والی قرار دیتے تو قصاص کا حکم ہرگز جاری نہ ہوتا۔ ہر قاتل قتل کے بعد کہتا کہ میں نے توبہ کرلی۔ اور یہاں یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اس کا جھوٹ بولنا مخلوق کے نزدیک تو چل سکتا ہے۔ خالق تو اس کے باطن کے حال سے باخبر ہے۔ اس لیے کہ قصاص لینے کا فرض بھی مخلوق پر ہے پس قصاص ترک کرنے کے لیے مخلوق کا اس کی توبہ کی قبولیت پر مطلع ہونا درکار ہے۔

حقیقت توبہ

جبکہ اس کے باوجود محققین نے فرمایا ہے کہ حقوق العباد میں توبہ کی حقیقت یہ ہے کہ ندامت اور ترک گناہ کے ساتھ ساتھ صاحب حق کو بھی راضی کرے۔ اور یہاں صاحب حق کا راضی ہونا قصاص کے لیے جان سپرد کردینا ہوسکتا ہے۔ نیز توبہ کرنے والے پر قصاص واجب کرنے میں بھی کئی حکمتیں ہیں۔ پہلی حکمت قاتل کے بارے میں ہے۔ اس لیے کہ جب وہ شروع سے جانے کہ اگر میں کسی کو قتل کروں گا۔ تو اس کے عوض مجھے قتل کردیں گے، اور توبہ کا عذر سنا نہیں جائے گا۔ یہ جاننا اسے خون ناحق سے مانع ہوجائے گا۔ دوسری حکمت مقتول کے وارث کے بارے میں ہے کہ اس غم کے مارے اور آفت کے ستائے ہوئے کی تسلی اسی کے ساتھ ہے۔ تیسری حکمت سب لوگوں کے بارے میں ہے کہ عبرت پکڑیں۔ اور اس قسم کے بُرے کاموں سے باز رہیں۔ اور اس کے باوجود خون کا معاوضہ لینا واجب نہیں ہے تو اگر مقتول کے ورثاء قاتل کو دیکھیں گے کہ اس نے توبہ نصوح کرلی ہے۔ اور اس کی توبہ نصوح مقتول کے وارثوں کے پاس حاضر ہوئے، اپنے گناہ کا اعتراف کئے، اور مال دینے یا ان کا کوئی کام کرنے کی خوشامد یا چاپلوسی کرکے اپنی طرف سے راضی کئے بغیر پوری نہیں ہوتی لازماً اس کے خون سے درگزر کریں گے۔ اور معاف کردیں گے۔ اور اگر ضرورت کی وجہ سے مال

ہیں یا کسی دوسری منفعت میں رغبت کریں گے تو اسے قبول کرلیں گے۔

لیکن اگر قاتل کے خون سے معافی دیں اور درگزر کریں تو اس کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ تمام ورثاء ثواب آخرت کے لیے کسی مال یا منفعت کے عوض کے بغیر معاف کر دیں تو اس صورت میں خود شرع شریف میں قاتل کے ذمے کوئی چیز واجب نہ رہی۔ مگر یہ کہ ان کی اس نعمت کا دل و جان کے ساتھ شکر بجالائے، اور ان کے لیے ہمیشہ دعائے خیر کرے۔ دوسری صورت یہ کہ بالکل معاف نہ کریں بلکہ ابھی مطالبہ رکھیں، اور اس صورت کے متعلق شرع شریف میں چند احکام مقرر ہیں۔

فَمَنْ عُفِیَ لَهٗ تو جسے معاف کردی گئی مِنْ اَخِیْهِ اس کے دینی بھائی کے خون سے شَیْءٌ کوئی چیز۔ اس طرح کہ بعض وارثوں نے معاف کر دیا۔ اور بعض نے نہ کیا، اور چونکہ خون ایک ایسی چیز ہے۔ جو کہ منقسم نہیں ہوتی کہ بعض کے حصے کو قتل کردیں اور بعض کے حصے کو قتل نہ کریں۔ مجبوراً اس صورت میں حکم شرع یہ ہے کہ اس کا قتل کرنا گر گیا، اور جن وارثوں نے معاف نہ کیا ہو خون بہا سے اپنا حصہ لے لیں یا سب ورثائے مقتول اس کے خون سے درگزر کریں۔ لیکن اس مال کے عوض جو کہ اس سے لینا مقرر کریں خواہ خون بہا کی مقدار پر ہو یا اس سے زیادہ یا اس سے کم، اور ان دونوں صورتوں میں عضو کامل نہیں کہ قاتل کی ذمہ داری مطلقاً ختم ہو جائے۔ لیکن جو چیز کہ ابھی اس کی گردن پر باقی رہی۔

فَاتِّبَاعٌ تو معاف کرنے والے کی مرضی کے تابع ہے اس کی جو مرضی ہو قبول کرے۔ لیکن بِالْمَعْرُوْفِ اس طرح جو شرع شریف میں معاملات اور معاوضوں میں مروج اور معمول ہے نہ اس طرح جو کہ خلاف شرع ہو۔ مثلاً اگر مقتول کا وارث کہے کہ میں نے تیرے خون سے درگزر کی لیکن اس شرط پر کہ تو اپنے بیٹے کو میرا غلام بنائے یا میں تمہاری بیٹی سے بدکاری کروں۔ یا تو میرے لیے شراب تیار کرے۔ یا تو نماز روزہ ترک کردے یا میرے لیے تو فلاں کو قتل کر یا اس قدر مال ڈاکے اور چوری کر کے لا کہ اس قسم کی تمام شرائط مردود ہیں۔ ان صورتوں میں اس کی مرضی کی پیروی نہیں کرنا چاہیے۔

وَ اور قاتل کے ذمہ بھی واجب ہے اَدَآءٌ ادا کرنا اس چیز کا جو کہ اس کے کہنے پر قبول کی

ہے۔ اِلَیۡہِ اس معاف کرنے والے کی طرف نہ کہ حاکم، قاضی یا وکیل کو رشوت دے کر اسے محروم کرے۔ گو اسی قدر رقم خرچ کر دے اور ادا کرنا بھی چاہیے کہ بِاِحۡسَانٍ نیکی، خوش اسلوبی اوا اپنے آپ پر احسان قبول کرنے کے ساتھ ہو نہ کہ ترش روئی، وعدہ خلافی اور میعاد مقررہ سے دیر کرنے یا مقدار مقرر سے کم کرنے یا کھرے مسبلغات کی بجائے کھوٹے دینے اور فی الوقت کی بجائے بعد میں دینے کے ساتھ۔ اس لیے کہ

ذَالِكَ وہ یعنی ورثاء مقتول کی طرف سے خون کی معافی قبول کرنا تمہارے لیے ایک خاصی نعمت ہے۔ جو کہ یہودیوں کی شریعت میں نہ تھی۔ کیونکہ ان کی شریعت میں خون کا بدلہ خون لینا مقرر تھا، اور اسی طرح نصاریٰ کی شریعت میں خون بہا لینا مقرر تھا۔ تو یہ عظیم وسعت کہ اگر چاہو ثواب آخرت کے لیے مفت معاف کر دو، اور اگر مال کی ضرورت ہے تو خون بہا لے لو اور اگر ہر صورت میں غصے اور کینے کی تسلی منظور ہے تو قتل کر دو۔

تَخۡفِيۡفٌ تم پر شرعی ذمہ داری کو ہلکا کرنا ہے مِنۡ رَّبِّكُمۡ تمہارے پروردگار سے وَرَحۡمَةٌ اور اس دربارے مہربانی ہے قاتل پر بھی کہ ورثائے مقتول کو چاپلوسی اور خوشامد کے ساتھ معاف کرنے یا خون بہا لینے پر راضی کر کے زندہ رہ سکتا ہے۔ اور ورثائے مقتول پر بھی کہ اگر انہیں کچھ مال کی ضرورت ہو تو لے سکتے ہیں۔ اور اگر ثواب آخرت کے طالب ہوں تو بھی حاصل کر سکتے ہیں۔

فَمَنِ اعۡتَدٰى تو جو تعدی کرے بَعۡدَ ذَالِكَ اس تخفیف اور رحمت کے بعد۔ اس طرح کہ چند آدمیوں کو ایک کے بدلے قتل کرے یا قاتل کے غیر کو قتل کرے یا قاتل کو پہلے معافی یا خون بہا کی قبولیت کے ساتھ مطمئن کر کے قتل کرے یا قاتل خون بہا ادا کرنے سے پھر جائے یا وعدہ خلافی کرے یا دشواری کے ساتھ ادا کرے یا مقرر مقدار سے کم کرے یا کھرے کی بجائے کھوٹا دے۔ فَلَهٗ عَذَابٌ اَلِيۡمٌ تو اسے آخرت میں دردناک عذاب ہے۔ اور بیہقی کی روایت کے ساتھ حدیث میں وارد ہے کہ جسے کسی کی طرف سے قتل یا عضو کے نقصان کے ساتھ آفت پہنچی تو اس مقتول کا وارث اور وہ زخمی تین چیزوں میں بااختیار ہے یا قصاص لے لے یا معاف کر دے یا دیت قبول کرے۔ اور اگر ان تین چیزوں کے سوا

چوتھی چیز چاہے تو اس کے دونوں ہاتھوں کو پکڑ لو اور نہ کرنے دو، اور اگر بالفرض تعدی کر کے کوئی اور چیز عمل میں لائے فَلَهٗ نَارُ جَهَنَّمَ خَالِدًا فِيهَا اَبَدًا تو اس کے لیے جہنم کی آگ ہے۔ جس میں ہمیشہ رہے گا۔

نیز ابن جریر اور دوسرے محدثین نے روایت کی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے تھے لا اعافی احدا قتل بعد اخذ الدية میں اسے ہرگز معاف نہیں کروں گا جس نے خون بہا لینے کے بعد قاتل کو قتل کر دیا گو اس کے وارث نے معاف کر دیا ہو۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے فَمَنِ اعْتَدٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَلَهٗ عَذَابٌ اَلِيْمٌ۔

اور تم میں سے کسی کے دل میں خیال گزرے کہ ان احکام میں تخفیف اور رحمت کی وجہ ظاہر ہے۔ اس لیے کہ معاف کرنے کو جائز قرار دینا قاتل کے حق میں بھی مہربانی ہے کہ وہ زندہ رہتا ہے۔ اور مقتول کے وارث کے حق میں بھی کہ اس کا مقتول تو واپس نہیں آئے گا ثواب ہاتھ سے کیوں جانے دے۔ اور بندۂ خدا کو کیوں قتل کرے، اور اسی طرح خون بہا لینے میں کہ مال کی وجہ سے مقتول کے وارث کو بالفعل ایک فراخی نصیب ہوگی۔ اور اس کے کام پورے ہوں گے۔ اور قاتل کو بھی عبرت اور سزا ہو جائے گی۔ کہ آئندہ اصلاح پر رہے۔ اور ناحق خون نہ کرے۔ لیکن قصاص میں ظاہر نہیں ہے۔ کیونکہ آدمی کو قتل کرنا گویا رب تعالیٰ کی بنائی ہوئی عمارت کو گرانا ہے۔ اور اس کے ساتھ جان کا ضائع کرنا بھی ہے کہ اس کے جانے کے بعد آخرت کی ترقی، اس مقام کا ثواب حاصل کرنے اور نقصان کو پورا کرنے کی راہ بند ہو جاتی ہے۔ اور انسانی وجود کے ساتھ جو دنیوی فائدے ہوتے ہیں ایک دم مٹ جاتے ہیں۔

ہم کہتے ہیں کہ اگر تم غور کرو۔ ساری تخفیف اور رحمت قصاص واجب کرنے میں ہے۔ اگر ہم قصاص کو واجب نہ کرتے تو قاتل کو معافی کی نعمت کس طرح دریافت ہوتی اور آخرت کا ثواب مقتول کے وارث کو کیسے حاصل ہوتا۔ اور اسی طرح خون بہا قاتل کو کیسے ہلکا معلوم ہوتا، اور مقتول کا وارث طاقت اور غلبے کے ساتھ مال کا مطالبہ کیوں کر سکتا۔ اور اس کے ساتھ قصاص میں اگرچہ ایک جان جاتی ہے۔ لیکن بہت سی جانیں محفوظ رہتی ہیں۔

وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ اور تمہارے لیے اے سب مسلمانو! قصاص کے مقدمہ میں ایک قسم کی زندگی ہے۔ جسے تم سمجھ نہیں سکتے۔ اس لیے کہ جب قاتل کو قصاص میں قتل کریں۔ اور وہ اپنی جان فرمان خداوندی کی اطاعت میں مقتول کے وارثوں کو سپرد کر دے تو قیامت کے دن گناہ کی آلائش سے پاک اُٹھے۔ اور جہنم کے عذاب سے چھٹکارا پائے، اور ابدی زندگی پائے۔ بلکہ برزخ اور قبر میں بھی اس کے ساتھ عفو اور رحمت کا معاملہ واقع ہوا۔ اور اسے راحت اور ریحان نصیب ہو۔ تو یہ قتل ہونا اس کے حق میں صرف مصیبتوں کے گھر سے مقام راحت کی طرف منتقل ہونا ہوگا۔

اور مقتول کو اس وجہ سے کہ اس کا خون لے لیا گیا اور اس کا قتل ہونا رائگاں نہ گیا، پسماندگان میں نام اور مرتبہ حاصل ہوا، اور اس کی عزت بڑھی، اور مثل مشہور ہے کہ ذکر الفتی عیشه الثانی، اور روح کو جو ناحق مارے جانے سے دکھ ہوا نہیں رہا۔ جہانِ قبر میں فارغ البالی کے ساتھ وقت گزرتا ہے۔ اور اس کی اس جہان کی زندگی تلخ اور بے مزہ نہیں ہوتی۔ اور مقتول کے وارثوں کی عزت اور مرتبہ بھی بڑھ گیا کہ انہوں نے اپنے مقتول کے بدلے قاتل کو قتل کر دیا، اور دکھ اور غم بھی کم ہوا۔ اور غصہ کی تسکین حاصل ہوئی۔ اور قاتل کے قبیلوں اور کنبوں کو مقتول کے وارثوں کی طرف سے بے خوفی اور اطمینان حاصل ہوا۔ ورنہ وہ جسے پاتے قتل کر دیتے جیسا کہ دور جاہلیت کی رسم تھی، اور اب بھی جاہل فرقوں میں یہ رسم جاری ہے کہ ایک خون واقع ہونے کے بعد دونوں طرف سے صدیوں اور پشتوں تک بے شمار خون ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اور دونوں کی طرف سے کوئی بھی دوسرے سے مطمئن نہیں ہوتا، اور دونوں طرف زندگی بہت تلخی سے گزرتی ہے۔ اور مہلہل کا قصہ جس نے اپنے بھائی کلیب کے بدلے ہزاروں کو قتل کیا حتیٰ کہ بکر بن وائل کے قبیلے کو فنا کے قریب پہنچا دیا عرب کی تاریخوں میں مشہور ہے۔ اور اسی قیاس پر پہاڑی افغانوں، راجپوتوں اور دیہاتیوں کا معمول ہے اور سب لوگوں کو ایک عبرت اور سزا مل گئی کہ ناحق کرنے والے کو یہ روزہ سیاہ درپیش آتا ہے۔ تو جسے قوت غضبیہ کے غلبے کی وجہ سے غیرت کے کھولنے کے ساتھ ناحق قتل کرنے کی خواہش دل میں کھٹکے یہ عبرت اسے قتل سے مانع ہو۔ اور وہ بھی زندہ رہے۔

اور جسے قتل کرنا چاہتا ہے وہ بھی زندہ رہے۔ تو اس حکم کو بطور شریعت جاری کرنا نری رحمت اور عام مخلوق کی زندگی کا باعث ہے۔ لیکن اس قسم کی زندگی کو تم دریافت کرو

یَا اُولِی الْاَلْبَابِ اے خالص عقل والو، جو کہ بات کے مغز تک پہنچتے ہو اور اس کی کھال پر قناعت نہیں کرتے ہو، اور حقائق کے بواطن میں اُتر جاتے ہو اور امور کے ظواہر پر اکتفاء نہیں کرتے ہو، نہ یہ کہ خالص عقلیں نہیں رکھتے ہو، اور قصاص سے سوائے جان ضائع کرنے کے کچھ نہیں سمجھتے ہو، اور اللہ تعالیٰ نے اس حکم کو جاری نہیں فرمایا۔ مگر اس لیے کہ

لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ شاید کہ تم اپنے غصے میں حد سے گزرنے سے پرہیز کرو تا کہ تم غضب خداوندی سے محفوظ رہو، اور خدا تعالیٰ کی تعمیر کو بلا وجہ نہ گراؤ، اور خود کو اور اپنے غیر کو ضائع ہونے سے بچاؤ۔

چند بحثیں

یہاں چند بحثیں باقی رہ گئیں۔ پہلی بحث یہ ہے کہ دین کے قاعدوں کی رو سے مقرر ہے کہ اگر مقتول کو کوئی قتل نہ کرتا تو اپنی موت کے ساتھ ضرور مرتا اس لیے کہ اس کی مقدر عمر اسی قدر تھی۔ اور اسی طرح اگر کسی شخص نے کسی کو قتل کرنے کا قصد کیا اور قصاص کے خوف سے باز رہا وہ شخص اپنی موت سے ضرور مرے گا اگرچہ یہ شخص اسے نہ مارے اس بنا پر کہ جو وقت اس کے قتل کا وقت قرار دیا گیا وہی وقت اس کی موت کا وقت ہے۔ تو قصاص جاری کرنے سے زندگی کے حصول کا تصور کس طرح کیا جا سکتا ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے ہر چیز کا ایک سبب مقرر فرمایا ہے کہ وہ چیز وجود اور عدم میں اپنے اس سبب کے تابع ہوتی ہے۔ اگر سبب موجود ہو جائے وہ چیز بھی موجود ہو جائے۔ اگر سبب موجود نہ ہو وہ چیز بھی موجود نہ ہو۔ اور قصاص کی مشروعیت بھی اسی طریقے پر سبب زندگی ہے کہ قصاص کے خوف کی وجہ سے قتل کرنے سے باز رہتا ہے۔ اور یہ شخص اور وہ شخص زندہ رہتا ہے۔ جیسا کہ تفاوت کے بغیر تمام اسباب اور مسببات اور جو اسباب کا منکر ہو وہ عقل، شرع اور عرف کا مخالف ہو جاتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک قابل مذمت، اور لوگوں کے نزدیک قابل ملامت ہوتا ہے۔ اور تمام اسباب کی سببیت میں اسی قسم کے شبہات

آتے ہیں۔ لیکن قضا وقدر کے راز کی معرفت کی وجہ سے کہ اسباب اور مسببات کے سلسلے کو ایک دوسرے کے ساتھ مربوط کیا ہے دور ہو جاتے ہیں۔

دوسری بحث یہ ہے کہ اس مضمون کو نزول قرآن سے پہلے عرب لوگ بھی جانتے تھے، اور مختلف عبارات کے ساتھ اس کی تعبیر کرتے تھے۔ بعض کہتے تھے قتل البعض احیاء لجمیع یعنی بعض کو قتل کرنا سب کو زندہ کرنا ہے۔ اور بعض کہتے تھے کہ اکثرو القتل لیقل القتل یعنی قتل زیادہ کروتا کہ قتل کم ہو جائیں، اور تمام عبارات سے مختصر وہ عبارت تھی جو کہ مثال کے طور پر ان میں شائع تھی کہ القتل انفی للقتل یعنی قتل کرنا قتل کی زیادہ نفی کرنے والا ہے۔

بلاغت قرآنی کا نمونہ

حق تعالیٰ نے اعجاز پر مبنی کلام میں ان مشہور عبارت کو ترک کر کے یہ لفظ ارشاد فرمائے وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ۔ اسی بنا پر علمائے بلاغت نے اس مشہور مثال پر اس قرآنی عبارت کی ترجیح میں کئی باتیں کہی ہیں۔ اور ان کی باتوں کا خلاصہ دس وجوہ کی طرف لوٹتا ہے۔

پہلی وجہ یہ ہے کہ وہ مثل مشہور صحیح کلمہ نہیں ہوتا اس لیے کہ جو قتل کہ ظلم و تعدی کے طریقے سے ناحق ہوتا ہے از روئے قصاص قتل کو دور کرنے والا نہیں ہے۔ بلکہ قصاص کے قتل کی زیادتی کا موجب ہے۔ اور اگر مثل مشہور میں دونوں جگہ قید کا اعتبار کریں۔ اور کہیں القتل قصاصاً انفی للقتل ظلما تو کلام بہت دراز ہو جاتی ہے۔ جبکہ آیت قرآنی اس معنی کو بے تکلف ادا فرماتی ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ قصاص کا قتل جو کہ قتل ناحق کو دور کرتا ہے اس حیثیت سے دور نہیں کرتا کہ قتل ہے۔ بلکہ اس حیثیت سے کہ قصاص ہے۔ اور اس حیثیت کا علم آیت سے ہوتا ہے نہ کہ مثل مشہور سے۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ آدمی کی اصل غرض زندگی میں ہے۔ اور قتل کی نفی حصول زندگی کے لیے مطلوب ہوتی ہے۔ تو غرض مقصود کی تصریح زیادہ بہتر ہے۔ جیسا کہ آیت مبارکہ

میں ہے۔

چوتھی وجہ یہ ہے کہ لفظ کا تکرار ضرورت کے بغیر قبیح ہے۔ جیسا کہ مثل مشہور میں واقع ہے نہ کہ آیت میں۔

پانچویں وجہ یہ ہے کہ آیت کے ملفوظ حروف کہ کلام کا اختصار انہیں حروف سے ہے آیت میں صرف دس حروف ہیں۔ جبکہ مثل مشہور میں چودہ ہیں۔ تو آیت کی عبارت زیادہ مختصر ہوئی۔

چھٹی وجہ یہ ہے کہ مثل مشہور میں غالباً ہلکے اسباب واقع ہوئے ہیں۔ اور یہ ترکیب کی سلاست میں باعث خلل ہے۔ جبکہ کمال اختصار کے باوجود آیت میں سبب و وتد اور فاصلہ سبھی ہیں (سبب علم عروض کے مطابق دوحرفی کلمے کو کہتے ہیں جب کے دونوں حرف متحرک یا پہلا متحرک اور دوسرا ساکن ہو، اور وتد علم عروض کے مطابق ۳ (تین) حرفی کلمے کو کہتے ہیں)۔

ساتویں وجہ یہ ہے کہ مثل مشہور کا ظاہری مضمون اس بات کا متقاضی ہوتا ہے کہ ایک چیز بعینہٖ اپنے آپ کی نفی کرنے کا سبب ہو اور وہ محال ہے۔ جبکہ آیت میں قصاص کو زندگی کی ایک قسم کا سبب گردانا گیا ہے۔ اور دونوں بظاہر ایک دوسرے کا غیر ہیں۔

آٹھویں وجہ یہ ہے کہ آیت میں لفظ قصاص اور حیات میں صنعت تضاد کو کام میں لایا گیا ہے۔ جبکہ مثل مشہور اس صنعت سے خالی ہے۔

نویں وجہ یہ ہے کہ آیت کے لفظ مبارک ہیں ان سے اچھی فال لی جاسکتی ہے کہ زندگی کے ذکر پر مشتمل ہے۔ جبکہ مثل مشہور بدفالی کا کلام کہ نفی کو دونوں طرف سے قتل کے ساتھ گھیرا گیا ہے۔

دسویں وجہ یہ ہے کہ آیت دو اسموں اور ایک حرف پر مشتمل ہے۔ جبکہ مثل مشہور تین اسموں اور ایک حرف پر۔ اور اگر حرف تعریف کو شمار کریں تو آیت میں ایک بار آیا اور مثل مشہور میں دو بار۔ اور اگر تنوین کو بھی شمار کریں تو حروف برابر ہو جاتے ہیں۔ لیکن اسماء کی زیادتی مثل مشہور میں باقی رہتی ہے۔

علاوہ ازیں جب افعل التفضیل کو لام اور اضافت کے بغیر استعمال کریں تو من تفضیلیہ خواہ مخواہ مقدر ہوتا ہے تو مثل مشہور میں کلام کی تقدیر یوں ہوئی کہ القتل انفی للقتل من کل شئ، تو اختصار کہاں رہا۔

تیسری بحث یہ ہے کہ اس آیت سے معلوم ہوا کہ آدمی کی زندگی جس طرح بھی ہو مطلوب شرع ہے۔ اور اسی لیے مرنے والے کے ذکر خیر کو مستحب قرار دیا گیا ہے۔ اور اس کے جانشینوں کو تاکید فرمائی گئی کہ اس کے قریبیوں اور دوستوں کی رعایت کریں بلکہ اسی راز کی بنا پر اس کی میراث اور وصیت کو جاری رکھا، کہ موت کے بعد اس کے خاندان اور نشانات کی بقا کا سبب ہو، اور اسی لیے

كُتِبَ عَلَيْكُمْ تم پر لکھ دیا گیا ہے اے مسلمانو! اگرچہ یہ حکم ایمان کا مقتضیٰ نہیں ہے۔ تاکہ تمہیں اس حکم سے پہلے یاایھا الذین آمنوا کے ساتھ خطاب کیا جائے۔ کیونکہ وارثوں کے پاس مال چھوڑنا ہر انسان کی جبلت ہے۔ اور اسی لیے تمام فرقوں میں اس کا رواج اور معمول ہے۔ لیکن تم پر لازم کی گئی

اِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ جب میں تم سے کسی کو موت حاضر آئے۔ اور اس کی علامتیں ظاہر ہونا شروع ہوں قوتوں کے مضمحل ہونے اور بیماری کے یہاں تک سخت ہونے کی وجہ سے کہ طبیعت مغلوب ہو جائے لیکن

اِنْ تَرَكَ خَيْرًا اور اگر کوئی مال چھوڑتا ہے۔ جو کہ تجہیز و تکفین اور سوگواری کے لوازم کے خرچ سے زاید ہو۔ الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ وصیت کرنا والدین اور دوسرے قریبیوں کے لیے اس طرح کہ میرے ماں باپ کو یہ دے دو اور میرے فلاں قریبی کو یہ دے دو۔ اس لیے کہ معمول اور مروج یہ ہے کہ جب کوئی شخص مرتا ہے تو اس کے سارے مال پر عورتیں اور بیٹے قابض ہو جاتے ہیں۔ اور ماں باپ اور دوسرے قریبیوں کو کچھ نہیں دیتے حالانکہ شرع میں ماں باپ کے لیے ایک حق مقرر ہے۔ اور بعض دوسرے قریبیوں کے لیے بھی جیسا کہ بیٹوں کے باوجود دادا اور دادی کا حق مقرر ہے۔ لیکن یہ لوگ حکم شرع کا پاس نہیں کرتے جبکہ مرنے والے کی وصیت کو زیادہ پکا سمجھتے ہیں۔ اور بعض قریبیوں کے لیے بھی

جن کا کوئی حق مقرر نہیں ہے تہائی مال سے وصیت کے حکم کے ساتھ کچھ دینا پسندیدہ اور مستحب ہے۔ تاکہ آخرت کی راہ کا توشہ ہو۔ مگر چاہیے کہ یہ وصیت ہو بِالْمَعْرُوْفِ شرع کے معروف طریقے کے مطابق۔ تو اگر اپنے قریبیوں میں سے محتاج کو محروم رکھا اور امیر کے لیے وصیت کر دی تو یہ معروف طریقہ نہ ہوا۔ اور اسی طرح اگر والدین کو چچازاد بھائیوں کے برابر کر دیا تو بھی طریق معروف نہیں ہوا بلکہ جس کا شرع میں حصہ مقرر ہے اس کے لیے اس حصہ سے زیادہ کی وصیت کرنا طریقۂ معروف کے خلاف ہے۔ بہرحال جب کسی شخص نے اس طرح وصیت کی اس وقت ہو جاتا ہے حَقًّا ایک حق جو لازم ہے۔ جاری کرنا ہے عَلَى الْمُتَّقِيْنَ متقیوں پر۔ اگرچہ فاسق لوگ اس کی پرواہ نہیں کرتے، اور کسی کو اسے بدلنے کا حق نہیں پہنچتا اس لیے کہ شرع کے خلاف نہیں۔

فَمَنْ بَدَّلَهٗ تو جس نے اسے بدل دیا خواہ مرنے والے کا وارث ہو۔ خواہ وہ جس کے لیے وصیت کی ہے۔ اور خواہ گواہ بَعْدَ مَا سَمِعَهٗ اس کے بعد کہ اس نے اس حق لازم کو وصیت کرنے والے سے سنا ہو۔ اگرچہ اسے گواہ نہ بنایا ہو۔ فَاِنَّمَا اِثْمُهٗ عَلَى الَّذِيْنَ يُبَدِّلُوْنَهٗ تو اس کا گناہ نہیں ہے مگر ان لوگوں پر جو اس حق کو بدلتے ہیں، نہ کہ اس پر جو اس کے اظہار کے مطابق حکم دے یا فتویٰ دے۔ اس لیے کہ

اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ تحقیق خدا تعالیٰ سننے والا ہے وصیت کرنے والے کے قول کو اور تبدیل کرنے والے کے قول کو عَلِيْمٌ جاننے والا ہے اسے جس نے تبدیل کیا ہے۔ اور اس قدر کو جتنی تبدیل کی۔ مگر یہ اس صورت میں ہے کہ وصیت کے بدلنے میں کوئی شرعی اور عرفی مصلحت نہ ہو۔

فَمَنْ خَافَ مِنْ مُّوْصٍ جَنَفًا تو جو وصیت کرنے والے سے غلطی کا خوف کرے جو کہ احکام شرعیہ سے جہالت کی وجہ سے اس نے جا بجا کی اَوْ اِثْمًا یا صریح گناہ کا کہ جان بوجھ کر غیر مستحق کو دلایا اور مستحق کو محروم کیا یا اس کے حق کو کم کیا

فَاَصْلَحَ بَيْنَهُمْ پس اس نے صلح کرا دی وصیت کرنے والے کے وارثوں کے درمیان جو کہ مال کے قابض ہیں۔ اور اس کے قائم مقام ہیں۔ اور ان لوگوں کے درمیان

جن کے لیے وصیت کی ہے۔ فَلَآ اِثْمَ عَلَیْہِ تو اس پر کوئی گناہ نہیں ہے۔ اگر چہ اصلاح میں وصیت کے بارے میں قدرے تبدیلی رونما ہو۔ اس لیے کہ اِنَّ اللّٰہَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ تحقیق اللہ تعالیٰ بخشنے والا مہربان ہے۔ ان لوگوں کو جو کہ بُری نیتوں کے ساتھ گناہ کا ارتکارب کرتے ہیں، معاف کر دیتا ہے۔ اور بخش دیتا ہے تو اس اصلاح کرنے والے کو جو کہ اس تبدیل کرنے میں اچھی نیت رکھتا ہے کیوں نہیں بخشتا۔

چند بحثیں

یہاں چند بحثیں باقی رہ گئیں: پہلی بحث یہ ہے کہ یہ وصیت جو کہ اس آیت میں مذکور ہے ظاہر ہے کہ کتب کی دلیل سے واجب ہے۔ حالانکہ وصیت کہیں واجب نہیں ہوتی ہے۔ شرع کے مطابق اس کے انتہا یہ ہے کہ مستحب اور پسندیدہ ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ وصیت کبھی واجب بھی ہوتی ہے مثلاً آدمی کے ذمہ کسی کا فرض ہے۔ اس قرض کے متعلق کوئی دستاویز اور گواہ موجود نہیں ہے۔ اور اس شخص کے ورثاء کو اس قرض کی اطلاع نہیں ہے۔ یا کسی کی امانت اس کے پاس اور اس کے مال میں مخلوط ہے۔ اور وارث مطلع نہیں ہیں تا کہ اس امانت کے مالک کو پہنچا دیں۔ اس صورت میں بالا جماع وصیت واجب ہو جاتی ہے۔ اور اسی قسم کی وصیت میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت کے ساتھ صحیحین کی حدیث وارد ہوئی کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا مسلمان آدمی کے لائق نہیں ہے کہ تین رات کی قدر گزرنے دے مگر یہ کہ اس کی وصیت اس کے نزدیک لکھی ہوئی موجود ہو۔ ہاں یہ وصیت جو کہ یہاں مذکور ہے اب واجب نہیں ہے۔ لیکن اسلام کی ابتدا میں واجب تھی۔ اس لیے کہ میت کے مال سے فرائض اور قریبیوں کے حصے رائج اور معمول نہیں ہوئے تھے۔ لوگ میت کے تمام مال کو اس کی عورت اور لڑکوں کا حق سمجھتے تھے۔ اور ماں باپ اور دادا اور دادی بلکہ بیٹیوں اور نواسوں کے باوجود بھائیوں کو نہیں دیتے تھے۔ جبکہ ان کے ذہن میں میت کی وصیت کی عظیم قدر و وقعت تھی، اور سمجھتے تھے کہ اس کی وصیت کے خلاف کرنا گویا اس پر ظلم کرنا اور اسے تکلیف دینا ہے۔ اس بنیاد پر اس وقت یہ حکم واجب ہو گیا، اور اب جبکہ فرائض کے احکام مروج اور معمول ہو گئے۔ اور ہر کس و ناکس نے جان لیا تو میت کے وصیت کرنے

کی ضرورت نہ رہی۔

اب حکم یہ ہے کہ اگر میت کے قریبی اس کے وارث ہوتے ہیں تو اپنے حصوں کے مطابق لے لیں گے۔ان کے حصے سے زیادہ وصیت کرنا جائز اور نافذ نہیں ہوتا ہے۔ چنانچہ صحیحین کی حدیث میں آیا کہ خبردار! اللہ تعالیٰ نے ہر صاحب حق کو اس کا حق عطا فرمایا ہے۔ تو وارث کے لیے کوئی وصیت نہیں۔اور اگر اس کے قریبی مانع کی وجہ سے میراث سے محروم ہیں مثلاً اس میت کے ماں باپ کافر ہیں۔اور یہ مسلمان یا کنیز اور غلام ہیں۔اور یہ آزاد یا دوسرے وارث کے پائے جانے کی وجہ سے مجوب ہیں انہیں میراث نہیں پہنچتی۔ جیسے نواسے بھائیوں اور چچا زادگان کے ہوتے ہوئے تو اس صورت میں ان پر وصیت مستحب ہے مگر مال کے تہائی حصہ سے۔ اگر وہ تہائی حصہ ان کی وصیت کو ادا کرے تو فبہا ورنہ جہاں تک کہ پہنچے اسی سے دیا جانا چاہیے،اور تہائی حصہ سے زیادہ وارثوں کی رضامندی کے بغیر وصیت میں خرچ نہیں کرنا چاہیے،اور یہی حکم ہے اس وصیت کا جو کہ اجنبی،محتاجوں اور مستحقوں اور دوسرے دوستوں اور شناساؤں کے لیے کرے۔

دوسری بحث:

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی بہت سی روایات میں ان ترک خیرا کی مال ایک معین مقدار کے ساتھ تفسیر کی گئی ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے کہ جس نے ساٹھ دینار چھوڑے اسے نہیں کہا جا سکتا کہ ترک خیرا،اور بیہقی نے حضرت امیر المومنین مرتضیٰ علی کرم اللہ وجہہ سے روایت کی کہ آپ اپنے ایک آزاد غلام کی موت کے وقت اس کے پاس تشریف لے گئے۔اس نے عرض کی کہ میں چاہتا ہوں کہ وصیت کروں۔آپ نے فرمایا کہ تمہارا مال کس قدر ہے؟ اس نے عرض کی کہ چھ سو یا سات سو درم۔فرمایا اس قدر مال کو نہیں کہا جا سکتا کہ ترک خیرا۔وصیت مت کر،اور اپنا مال اپنے ورثاء کے لیے چھوڑ دے۔

نیز حضرت ام المومنین عائشہ رضی اللہ عنہا سے لائے کہ ایک شخص نے ان سے پوچھا کہ میں چاہتا ہوں کہ وصیت کروں۔آپ نے فرمایا کہ تمہارا مال کس قدر ہے؟ اس نے عرض کی تین ہزار یا چار ہزار درہم ہیں۔آپ نے فرمایا یہ تھوڑے ہیں ان ترک خیرا فرمایا گیا

ہے۔ اسے اپنے عیال کے لئے رہنے دے کہ یہی بہتر ہے، حالانکہ لفظ خیر عرب کے عرف میں مطلق مال کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اور وصیت اور میراث بھی ہر تھوڑے اور بہت میں جاری ہے۔ ان تخصیصات کی وجہ کیا ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ ان بزرگوں کی مراد یہ ہے کہ مستحب وصیت غیر وارثوں کے لیے اس وقت کی جانی چاہیے جبکہ مال زیادہ ہو۔ اور ورثاء وصیت کے باوجود مستغنی ہوں۔ ورنہ وصیت اچھی نہیں، کہ وارث کا حق تلف کرنا ہے نہ یہ کہ لفظ خیر کی عرف لغت کے مطابق اس مقدار کے ساتھ تخصیص کریں یا میراث اور واجب وصیت کو ان قیود کے ساتھ مقید کریں۔

تیسری چیز یہ ہے کہ خوف اس چیز میں ہوتا ہے۔ جس کا واقع ہونا ضمن میں ہو اور ابھی واقع نہ ہوئی ہو جبکہ یہاں وصیت واقع ہو چکی۔ اور یقین کے ساتھ معلوم ہوگئی پھر لفظ خوف کس طرح صحیح ہوگا؟ اس بحث کا جواب دو طریقوں سے دیا گیا ہے ایک تو یہ کہ اصلاح کرنے والا شخص وصیت کرنے والے کی زندگی میں اس سے پہلے کہ وصیت کے کام کا انتظام کیا جائے۔ اور لکھنا پڑھنا اور گواہوں کا حاضر ہونا درمیان میں آئے حالی اور قالی قرآئن کے ساتھ وصیت کرنے والے کا حال دریافت کرے کہ یہ شخص خلاف شرع وصیت کرے گا۔ اور اسی وقت اس وصیت کنندہ کو سمجھا کر اسے غلط ارادے سے پھیرے۔ اور اگر وہ لوگ کہ جنہیں اس کی وصیت کے ساتھ نفع پہنچتا یا ورثاء جو کہ اس سے ضرر اٹھاتے ہیں اس وقت اختلاف اور جھگڑا کرتے ہیں تو دونوں گروہوں کے درمیان اصلاح کی کوشش کریں۔ پس خوف کا معنی حقیقتاً یہاں متحقق ہوگیا۔ اور اس لفظ کا استعمال درست ہوا۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جب تک وصیت کنندہ زندہ ہے اس وصیت کے نسخ کا احتمال قائم ہے۔ پس اس وصیت کے وقوع کا یقین کہاں۔

ہاں وصیت کنندہ کی موت کے بعد وصیت متعین اور اس کا وقوع یقینی ہوتا ہے۔ لیکن اس لفظ کے استعمال کو اس حالت پر کیوں محمول کرنا چاہیے کہ اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ دوسرا یہ کہ یہاں خوف بمعنے علم ہے۔ اور عربوں کی بعض عبارات میں بھی خوف بمعنے علم

استعمال ہوا، اوراس صورت میں کوئی اشکال نہیں ہے۔

چوتھی بحث یہ ہے کہ اس آیت سے معلوم ہوا کہ جس طرح اجنبیوں کے مقابلہ میں قریبیوں پر صدقات اور خیرات مقدم ہیں اسی طرح قریبیوں کے لیے وصیت اس سے مقدم ہے کہ اجنبیوں کے لیے ہو۔لیکن قریبیوں میں دوشرائط ہیں ایک یہ کہ فی الحال وارث نہ ہوں اگر چہ وارث ہونے کے لائق ہوں۔ دوسری یہ کہ اس مال کے محتاج ہوں نہ کہ مستغنی، اور جاہلیت کے عربوں کا قاعدہ تھا کہ نام حاصل کرنے کے لیے دور و دراز کے اجنبیوں کے لیے وصیت کر جاتے تھے۔تا کہ زمانے میں مشہور ہوں جبکہ قریبیوں کو فقر و فاقہ میں گرفتار چھوڑ جاتے تھے۔اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو اسی بُری عادت کو دور کرنے کے لیے نازل فرمایا، اور اس آیت میں صرف قریبیوں کے ذکر پر اکتفاء فرمایا۔گویا یوں ارشاد ہوا کہ نزدیکیوں کے لیے وصیت بمنزلۂ فرض ہے۔اور اجنبیوں کے لیے بمنزلہ مستحبات۔فرض کو چھوڑ کر مستحب کی طرف دوڑنا کمال بے وقوفی ہے۔اور اسی تاکید اور تقدیم پر امام ضحاک کا قول محمول ہے کہ من مات ولم یوص لاقرباء ہ فقد ختم عمله بمعصية یعنی جو مر گیا حالانکہ اس نے اپنے اقارب کے لیے وصیت نہیں کی تو اس کے عمل کا خاتمہ معصیت پر ہوا۔اور طاؤس کا قول ان اوصٰی للاجانب وترك الاقارب نزع عنهم فرد الی الاقارب یعنی اگر اس نے اجنبیوں کے لئے وصیت کی اور قریبیوں کو ترک کر دیا تو ان سے کھینچ لی جائے اور قریبیوں کی طرف لوٹائی جائے۔اور حسن بصری۔علاء بن زیاد مسروق اور مسلم بن یسار کا قول الآیه ثابة ولیست بمنسوخة' لان القریب قریبان. قریب یرث وقریب لا یرث فالذی یرث فقداعطی الله حقه والذی لایرث فله الوصیه یعنی آیت ثابت ہے۔اور منسوخ نہیں۔کیونکہ قریبی دو قسم پر ہیں ایک وہ جو وارث ہیں۔اور ایک وہ جو وارث نہیں ہیں۔تو جو وارث ہے اسے تو اللہ تعالیٰ نے اس کا حق عطا فرما دیا، اور جو وارث نہیں تو اس کے لیے وصیت ہے۔اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے قریب انہیں معنوں میں منقول ہوا۔

پانچویں بحث یہ کہ قرآن مجید میں ہر جگہ قریبیوں کو ذوی القربیٰ اور اولی القربیٰ کے لفظ

کے ساتھ یاد فرمایا ہے۔ مگر وصیت اور میراث کے ذکر میں لفظ اقربین ارشاد ہوا۔ اس تبدیلی میں کیا نکتہ ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ احسان اور ادائیگی حقوق قرابت کے مقام میں تمام اقارب برابر ہیں۔ ہر ایک کو اس کے استحقاق کے اندازے کے مطابق احسان اور حسن سلوک کا حصہ دینا چاہیے۔ اور اسی لیے ان مقامات میں ذوی القربی اور اولی القربی کا لفظ استعمال ہوا جبکہ وصیت اور میراث میں جو زیادہ قریب ہے مقدم ہے۔ اور بعید کو روکنے والا۔ پس یہاں لفظ اقربینْ موزوں ہے۔ تاکہ قرابت کے قرب کی ترجیح اور اس کی قوت سمجھ آئے۔

چھٹی بحث یہ ہے کہ اذا کا لفظ اپنے مابعد کو مستقبل کے معنی میں کرتا ہے تو اذا حضر مستقبل کے معنوں میں ہو گیا۔ جبکہ کتب فعل ماضی ہے۔ فعل ماضی کا مستقبل کے ساتھ تعلق کیونکر درست ہوگا۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اذا حضر تقدیم وتاخیر کی وجہ پر وصیت کے ساتھ متعلق ہے۔ جو کہ وصیت کرنے کے معنوں میں ہے نہ کہ کتب کے ساتھ۔

ساتویں بحث یہ ہے کہ علیکم کا خطاب تمام مسلمانوں کے لیے ہے۔ اور اذا حضر احدکم الموت وصیت کے ساتھ متعلق ہے تو لازم آتا ہے کہ ایک شخص کی موت قریب ہونے کے وقت سب مسلمانوں پر وصیت فرض ہو جائے۔ اور یہ معنی باطل ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ ایک جماعت سے ایک غیر معین شخص کا حکم بدلیت کے طریقے سے پوری جماعت کے ساتھ متعلق ہے۔ پس مخاطبین میں سے کسی ایک کی موت کا وقت قریب ہونے پر جس کسی کا بھی تصور کریں علی سبیل البدلیۃ سب مخاطبین کے ساتھ متعلق ہوا، اور یہ معنی صحیح ہے اس میں باطل ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔

آٹھویں بحث یہ ہے کہ اس آیت میں دو آدمیوں کے درمیان جو کہ جھگڑے اور اختلاف میں گرفتار ہوں صلح کرانے کے جواز پر دلیل ہے۔ اس لیے کہ باہمی جھگڑا غالب طور پر ممنوعات شرع میں سے کسی ممنوع فعل کے ارتکاب تک لے جاتا ہے۔ تو دو جھگڑنے والوں کے درمیان شروع سے ہی صلح کرانا غیر شرعی کام کو بند کرتا ہے۔

نیز اس آیت میں اس بات پر دلیل ہے کہ صلح کراتے وقت گفتگو میں اگر کمی بیشی واقع ہو اور کسی قرارداد میں تغیر و تبدل لازم آئے تو کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ اور یہ گناہ کا موجب نہیں۔

تین جگہ خلاف واقعہ بات کرنا درست ہے۔ اور اس کی شرط

اسی لیے حدیث شریف میں وارد ہے کہ تین جگہ خلاف واقع کہنا درست ہے پہلا مقام دو آدمیوں کے درمیان صلح کرانے کے وقت، دوسرا مقام جنگ کے دوران دشمن کو غافل کرنے کے لیے، تیسرا مقام اپنی عورت کو راضی کرنے کے وقت، لیکن شرط یہ ہے کہ خلاف واقع کہنے سے کسی عہد کو توڑنا اور غدر کرنا لازم نہ آئے ورنہ حرام ہو جاتا ہے۔

نویں بحث یہ ہے کہ علماء کے اجماع کے ساتھ وصیت جاری نہیں ہوتی مگر مال کے تیسرے حصے میں، اور تیسری حصے سے زیادہ وصیت کرنا نہیں ہے۔ بلکہ تیسرے حصے سے کم کرنا مستحب ہے۔ اس لیے صحیحین میں آیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، حضرت سعد رضی اللہ عنہ کی بیماری پرسی کے لیے تشریف لے گئے۔ انہوں نے عرض کی یارسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)! میں مال دار آدمی ہوں۔ اور ایک بیٹی کے سوا میرا کوئی وارث نہیں ہے۔ اگر آپ فرمائیں تو میں اپنے مال کے دو حصوں میں وصیت کروں؟ فرمایا نہیں۔ انہوں نے عرض کی اپنے مال کے نصف کی وصیت کروں؟ فرمایا نہیں۔ عرض کی پس مال کے تیسرے حصے کی وصیت کروں؟ فرمایا: ہاں۔ اور مال کا تیسرا حصہ بہت ہے۔ اگر تو اپنے ورثاء کو غنی چھوڑ کر جائے تو تیرے لیے اس سے بہتر ہے کہ تو اپنے قریبیوں کو گداگری کی سپرد کر دے۔

نیز علماء نے لکھا ہے کہ اگر کسی کا وصیت کرنے کا قصد ہو تو اصل یہ ہے کہ اپنے غیر وارث قریبیوں کو مقدم کرے۔ اور ان میں سے وہ لوگ جو کہ محرمیت رکھتے ہیں۔ جیسے خالہ، پھوپھی، بہن، بھتیجا، بھانجا، چچا، ماموں اور بھائی کو مقدم کرے۔ پھر ان لوگوں کو جو کہ دودھ شریک ہیں۔ پھر وہ لوگ جو مصاہرت رکھتے ہیں۔ پھر وہ جو موالات رکھتے ہیں۔ پھر وہ جو ہمسائیگی رکھتے ہیں۔ جس طرح کہ اس احسان میں ترتیب کی رعایت کی جاتی ہے جو زندگی کی حالت میں کرتے ہیں۔

اور اگر اپنے وارثوں میں سے ایک کے لیے اس کے حق سے زیادہ وصیت کی تو دوسرے ورثاء کی اجازت پر موقوف ہے۔ اگر جائز قرار دیں تو نافذ ہوگی، اور اپنے مال کے تیسرے حصے سے زائد کی وصیت کی تو یہ بھی وارثوں کی اجازت پر موقوف ہے۔

جب قصاص اور وصیت کے حکم سے فراغت ہوئی۔ اب فرمایا ہے کہ ان دونوں حکموں سے سمجھو کہ موذی کو قتل کرنا اور بے گناہ کی زندگی میں کوشش کرنا کتنی نیکی رکھتا ہے۔ یہاں تک کہ میت کی وصیت کو اس کی موت کے بعد کسی تبدیلی کے بغیر جاری کرنا کہ گویا اس کے حکم کو زندہ رکھنا ہے اللہ تعالیٰ کی رضا اور درگاہ عالی کی پسندیدہ چیز ہے۔ پس

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اے وہ لوگو! جو ایمان لائے ہو تمہارے ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ اپنے نفس کو مارنے کے درپے رہو کہ دین کی راہ کا موذی ہے۔ اور اپنی روح کو زندہ کرنے میں کوشش کرو کہ اصل میں عالم پاک سے ہے۔ اور بے گناہ۔ اس لیے کُتِبَ عَلَیْکُمُ الصِّیَامُ تم پر روزہ فرض کیا گیا ہے۔

وقت روزہ کے تعین کی حکمت

جو کہ نفس کو کھانے پینے کی چیزوں اور جماع سے صبح صادق سے لے کر غروب آفتاب تک روکنے سے عبارت ہے۔ بشرطیکہ صاحب روزہ حیض اور نفاس سے پاک ہو۔ اس لیے کہ نفس زیادہ تر انہیں چیزوں کا راغب ہوتا ہے اسے اس کی مرغوب چیز نہ دینا اسے مارنے کے معنوں میں ہے۔ اور زیادہ تر اس کی رغبت اسی وقت ہے کہ نیند سے بیدار ہوتا ہے۔ اور اس کی خواہش تر و تازہ ہوتی ہے۔ اور اس کے حواس کھلے ہوئے۔ ہر چیز کو دیکھتا ہے۔ اور اس کا نام سنتا ہے۔ اور خیال کرتا اور آرزو کرتا ہے۔ اور اپنے ہم جنسوں میں سے دوسروں کو دیکھتا ہے کہ کھاتے ہیں۔ اور پیتے ہیں۔ اور عورتوں کے ساتھ اختلاط کرتے ہیں، نہ کہ رات کے وقت کہ اس وقت ہر شخص مردوں کی طرح خواب غفلت میں پڑا ہے۔ نہ کوئی چیز دیکھتا ہے۔ اور نہ اس کا نام سنتا ہے۔ اور نہ اپنے ہم جنسوں کو لذتوں میں مشغول دیکھ کر رغبت کرتا ہے۔ اسی لیے سب مخلوقات کا معمول ہے کہ رات کے وقت سونے کے بغیر کوئی کام نہیں کرتے۔ لیکن ہمارا جو کہ نیند کے وقت واقع ہوتا ہے غور و فکر کے مطابق وہ نفس کا تقاضا

نہیں ہوتا۔ کہ شکل، عادات، لباس، زیور، ادائیں اور عورتوں کی حرکات دیکھ کر فریفتہ ہو کر اس میں مشغول ہوتا ہے۔ بلکہ وہ جماع طبیعت کے دفع کرنے سے قبیل ہے۔ جو کہ منی کی گزرگاہوں کو پر کر دیتی ہے۔ اور وہ شخص اس پر ہونے کی تکلیف کو دور کرنے کے لیے اس تاریک وقت میں کہ دیو کی شکل سے پری کی شکل ممتاز معلوم نہیں ہوتی اس منی کو بہر حال کسی جگہ گراتا ہے۔ اور ہلکا پن حاصل کرتا ہے۔ اور اسی لیے اس قسم کا جماع جب اپنی بیوی کے ساتھ واقع ہو تو پاک کرنے والی چیزوں کے قبیلے سے ہے۔ جیسے بول و براز سے فراغت حاصل کرنا جو کہ روح کے حال کی اچھائی کا موجب ہیں نہ کہ قوت نفس کا سبب۔ ہاں بعض ناقص فطرت کے لوگ چاہتے ہیں کہ نفس پروری کے لیے رات کو دن کریں، اور مشعلوں، چراغوں اور ساز کے تاروں کے نغمات کے ساتھ نفس کو حرکت دے کر جو کام دن کو کیا جا سکتا ہے اس سے بہتر رات کو کرتے ہیں۔ لیکن پھر بھی فرق بہت ہے۔ اور بے خوابی کی کوفت، حواس کی تھکاوٹ، عقل کی کمزوری اور دن کی لذتوں سے پوری طرح بہرہ ور ہونے سے محرومی اس شغل کو لازم ہے۔ ان امور کی بنا پر رات کو دن کی جگہ نہیں بنایا جا سکتا۔ کہ طبعی طور پر سکون کا وقت اور شہوتوں اور لذتوں کو ترک کرنے کا موقعہ ہے۔ اور اگر اسے روزے کا محل قرار دیتے تو عادت سے عبادت اور تقاضائے طبعی سے حکم شرعی ممتاز نہیں ہوتا تھا، اور اسی راز کے لیے نماز تہجد، تلاوت اور مناجات کا وقت رات کو قرار دیا گیا ہے نہ کہ دن کو۔ خصوصیت کے ساتھ روزے کی راتوں کو ادائے تراویح کا وقت قرار دیا تا کہ تقاضائے طبعی کی پوری مخالفت متحقق ہو جائے کہ طبیعت روزے کی تھکاوٹ کو دور کرنے کے لیے آرام اور راحت چاہتی ہے۔

لیکن چاہیے کہ تم اپنے روزے میں ہندوؤں اور صابیوں کے طریقے پر عمل نہ کرو کہ خود اُگنے والی جنس، بعض میوے اور پھل اور دودھ کھاتے اور پیتے ہیں۔ اور ان میں سے بعض رات کے وقت کھانے پینے سے رکتے ہیں نہ کہ دن میں۔ اور اسے شبہ کا نام دیتے ہیں۔ جیسا کہ صابیوں کے دساتیر میں موجود ہے۔ کیونکہ یہ طریقہ شرائع الٰہیہ کے طریقے کے خلاف ہے۔ بلکہ روزہ تم پر فرض ہوا ہے

كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ جس طرح کہ ان لوگوں پر فرض کیا گیا تھا جو تم سے پہلے تھے۔ شریعتوں اور دینوں والے کہ روزے کے دنوں میں مطلقاً کھانا پینا اور عورتوں کے ساتھ صحبت کرنا ان پر دن کے وقت روزانہ حرام تھا۔ حضرت آدم علیہ السلام کے عہد سے لے کر شریعتوں میں آخری شریعت تک جو کہ نصرانیت ہے اسی وضع پر رہے۔

روزے کا بیان

ہاں روزے کے دنوں کے تعین میں اُمتیں مختلف تھیں۔ حضرت آدم علیہ السلام پر ہر مہینے سے ایام بیض کے روزے فرض تھے، اور یہودیوں پر یوم عاشورہ اور ہر ہفتے میں ہفتے کے دن کا روزہ اور چند دوسرے دنوں کا روزہ فرض تھا۔ اور نصاریٰ پر ماہ رمضان، لیکن نصاریٰ نے جب سردیوں اور گرمیوں کی شدت میں روزہ رکھنا مشکل سمجھا تو یوں مقرر کیا کہ موسم بہار میں رمضان کے عوض پچاس روزے ادا کریں۔ اور اس تبدیلی کے تدارک کے لیے بیس روزے بڑھا دیے، اور حضرت امیر المومنین مرتضیٰ علی کرم اللہ تعالیٰ وجہہ سے مروی ہے کہ روزہ ایک اصلی پرانی عبادت ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کے عہد سے لے کر اب تک کوئی اُمت اس کی فرضیت سے خالی نہ رہی۔ یہ گمان نہ کرنا کہ یہ تکلیف ہم نے صرف تم پر مقرر کی ہے۔

اور ابن جریر نے روایت کی ہے کہ اسی لفظ سے مسلمانوں نے کھوج لگایا کہ روزے کا طریقہ سابقہ شریعتوں والوں سے حاصل کرنا چاہیے۔ پس یوں قرار پایا کہ اہل کتاب کے مطابق کھانا پینا سونے کے بعد بند کر دینا چاہیے۔ اور اسی طرح عورتوں کی صحبت۔ یہاں تک کہ یہ معمول آئندہ آیت کے ساتھ منسوخ ہوا، اور عبد بن حمید اور ابن ابی حاتم نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے اور ابن عساکر نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی اس مضمون کو روایت کیا ہے۔ حاصل کلام یہ کہ تم پر بھی یہ عبادت فرض کی گئی اس مقصد کے لیے کہ

لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ شاید تم تقویٰ اختیار کرو۔ دو جہتوں سے، پہلی جہت یہ کہ نفس کو اس کی الفت اور رغبت والی چیزوں سے بند کرنے کی مشق حاصل کرو۔ اور جس طرح روزے میں

اللہ تعالیٰ کے حکم کی وجہ سے اپنی ضروریات سے جن کی تمہیں عادت ہے باز رہتے ہو گو تمہارا نفس شدید تقاضا کرتا ہے۔اسی طرح سارے ایام میں اللہ تعالیٰ کی منع کی ہوئی چیزوں سے باز رہ سکتے ہو اگرچہ تمہیں ان کی محبت اور رغبت ہو۔پس اس عبادت کو فرض کرنے میں تمہیں نفس کو اس کے تقاضوں سے روکنے کی ورزش حاصل ہو۔اور جانوروں اور بچوں کی ریاضت کی طرح کہ الفت کی چیزیں ترک کرنے میں پہلے انہیں سکھا کر پھر مقصد کے کام میں مشغول کرتے ہیں۔دوسری جہت یہ کہ زیادہ تر گناہ قوت شہوت وغضب کی شدت اور تیزی سے پیدا ہوتے ہیں۔اور یہ عبادت ان دونوں چیزوں کو توڑتی ہے۔اس لیے کہ شہوت اور غضب دونوں کا مدار مزاج کی قوت او روح کی مضبوطی پر ہے۔اور روح غذاؤں اور شربتوں سے پیدا ہوتی ہے۔اور جب تم غذا اور مشروبات میں کمی کی کوشش کرو گے تو روح نرم اور نازک ہوگی،اور اس میں شہوت اور غضب کو جاری کرنے کی طاقت نہیں رہے گی،اور مجبور ہو کر ان دونوں بُری عادتوں کو ترک کر دے گی۔اس لیے یہ عبادت تمہارے حق میں مقرر کی گئی ہے

اَيَّامًا مَّعْدُوْدَاتٍ چند گنتی کے دن۔کہ نہ بالکل کم ہوں کہ قوت شہو یہ اور غضبیہ کو توڑنے میں کوئی اثر نہ کریں۔اس لیے کہ نفس ایک دوبار اپنی مالوفات کو ترک کرنے کے صدمہ کو خاطر میں نہیں لاتا۔اور اسے کچھ نہیں سمجھتا۔نہ بہت زیادہ کہ قوت شہو یہ اور غضبیہ کو توڑنے کے ساتھ تم میں مزاج کے اعتدال اور طاعت وعبادت کی طاقت کو بھی نہ چھوڑے، اور اس وجہ سے دوسری عبادات جیسے نفل نماز، حج، جہاد اور طلب علم کے سفر، دین کی کتابوں کے مطالعہ، بیماروں کی عیادت، جنازوں کے ساتھ چلنے اور قریبیوں اور محتاجوں کی ضرورتوں میں کوشش کرنے سے بھی رہ جاؤ،اور تمہارے تقویٰ کی جہت میں ایک کمی واقع ہو جائے۔

اور وہ گنتی کے دن پورے ایک ماہ کے ایام ہیں۔اس لیے کہ ایک ماہ کی مدت درمیانی مدت ہے۔ایک ہفتہ کی مدت جو کہ بہت کم ہے۔اور سال کی مدت کے درمیان جو کہ بہت زیادہ ہے۔پس درمیانہ ہونے کی رعایت کے وقت اسی مدت کا اعتبار کرنا مناسب ہوا۔

نیز آسمانی اطوار کی جدتوں پر بطور فرع مرتب ہونے والی حقیقی گردشیں سب کی سب

تین ہیں۔ پہلی رات اور دن کی گردش جو کہ پہلی حرکت کے ساتھ وابستہ ہے دوسری مہینے کی گردش جو کہ چاند کی حرکت کے ساتھ وابستہ ہے، تیسری گردش سال کی جو کہ حرکت آفتاب کے ساتھ وابستہ ہے۔ اور ان تین گردشوں کے علاوہ دوسری معروف گردشیں جیسے ہفتہ یا قمری سال کی گردشیں تو یہ حقیقی گردشیں نہیں ہیں۔ بلکہ ایک گردش کے تکرار سے حاصل ہوتی ہیں۔ اور ان تینوں گردشوں میں سے اگر رات اور دن کی گردش اختیار کرتے تو دخول بہشت گردش میں لازم آتا، اور اس کے ساتھ روز و شب کی ایک گردش بہت تھوڑی ہے کوئی اثر نہیں رکھتی۔ مگر جب اسے تکرار دی جائے۔ اور اس گردش کی تکرار اس طرح کہ ہر دو گردشوں کے درمیان فاصلہ ہو بھی اعتماد تاثیر نہیں رکھتی۔ تکرار متصل دوسری گردش کی طرف راجع ہو جاتی ہے یا دوسری کی طرح، اور اسی طرح سال کی گردش اگر قرار پاتی تو فصلوں اور ہواؤں کی تبدیلی مدت کی طوالت کی وجہ سے مزاجوں میں خلل کا موجب ہوتی۔ پس دوسری گردش کو اختیار کرنا مقرر ہوا۔

ایک ماہ کے روزے مقرر کرنے کا راز

اور اس کے ساتھ مہینہ مقرر کرنے میں ایک اور راز بھی ہے کہ قرآن پاک نزول پہلے لوح محفوظ سے پہلے آسما پر واقع ہوا اس مقام پر جسے بیت العزت کہتے ہیں۔ تو اسی آسمان کی حرکت کی گردش کی مدت کو اس عبارت میں اعتبار کرنا چاہیے جو کہ نزول قرآن کے ساتھ پوری مناسبت رکھتی ہے۔

اور اگر کوئی کہے کہ اَيَّامًا مَّعْدُوْدَاتٍ کے لفظ سے اسی قدر پتہ چلتا ہے کہ وہ ایام گنے ہوئے ہیں۔ اس لفظ کے ساتھ ایک کامل مہینے کی مدت کس طرح دریافت ہوئی ہم کہتے ہیں کہ وہ ایام جن کا بیان شمار یعنی گنتی کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ اور شمار کے سوا دوسرا نام نہیں رکھتے مہینے کے ایام ہیں۔ جبکہ ہفتے کے ایام کو ان کے ناموں سے شمار کرتے ہیں نہ کہ اعداد کے ساتھ۔ پس معدودات کا لفظ ان پر صادق نہیں آتا۔ اس لیے کہ اس لفظ میں یہ جتلایا گیا ہے کہ ان دونوں کے ناموں میں گنتی بھی معتبر ہے۔ پس دوسروں کا احتمال باقی نہ رہا سوائے مہینے کے دونوں کے۔ اس لیے کہ مہینے کی تاریخیں ہیں جو کہ گنتی کے ساتھ بیان کی جاتی

ہیں۔ جیسے دوسری، تیسری، چوتھی، اور عدد کے ذکر کی انتہا مہینہ پورا ہونے کی مدت ہے۔ اس کے بعد مہینے کے پورا ہونے کو بمنزلے ایک قرار دے کر پورا کر کے با کسروں کے ساتھ یاد کرتے ہیں۔ پس گہری نظر دیکھنے کے بعد ایاما معدودات کا ذکر گویا اس بات کی تصریح ہے کہ وہ ایام ایک پورے مہینے کے ایام ہیں۔

اس لیے فرمایا ہے کہ اگر تمہارے دل میں یہ وسوسہ گزرے کہ یہ مدت، لمبی مدت ہے شاید اس مدت کے روزے رکھنے میں شروع ہونے کے بعد ہم میں سے کسی کو کوئی بیماری در پیش آئے یا ضروری سفر کرنا پڑے تو ہم سے یہ عبادت کس طرح پوری ہوگی۔ تو جان لو کہ اگرچہ اس عبادت کی اصل فرضیت تم سب پر ہے خواہ مریض ہوں خواہ مسافر، لیکن اس کی فی الفور ادائیگی فرض نہیں ہے مگر تندرست پر جو کہ مسافر نہ ہو۔

فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَرِيضًا تو تم میں سے جو مریض ہو ایسی مرض کے ساتھ کہ روزہ اسے نقصان دیتا ہے

اَوْ عَلٰى سَفَرٍ یا سفر پر سوار ہو اور اس پر روزہ ناگوار ہو اور روزہ چھوڑ دے فَعِدَّةٌ پس اس کے ذمے اتنے دنوں کا شمار ہے جتنے دنوں مہینے سے روزہ چھوڑا ہو۔ مِنْ اَيَّامٍ اُخَرَ دوسرے دنوں سے ان گنتی کے دنوں کے سوا جن کے روزے رکھنے شروع کیے تھے، خواہ وہ دوسرے ایام پے در پے ہوں۔ خواہ فاصلے کے ساتھ۔ اور اس کے ساتھ اس وقت جو کہ اسلام کا ابتدائی دور ہے۔ اور تم روزے کی مشقت کے عادی نہیں ہوئے ہو۔ باوجودیکہ تمہیں مرض اور سفر کا کوئی عذر نہ ہو۔ اگر تم میں سے بعض کو روزے کی توفیق نہ ہو تو نراخی کے لیے ہم نے روزے کا بھی ایک بدل مقرر کیا ہے۔

وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ اور ان لوگوں پر کہ جنہیں روزہ رکھنے کی طاقت ہے۔ لیکن عادت نہ ہونے کی وجہ سے پورا مہینہ پے در پے روزے نہیں رکھ سکے۔

فِدْيَةٌ ایک بدل ہے۔ اور وہ بدل طَعَامُ مِسْكِيْنٍ ایک مسکین کی خوراک ہے۔ ہر روزے کے عوض۔ اگر پکا کر دے تو اتنا دے کہ دونوں وقت سالن کے ساتھ روٹی پیٹ بھر کر کھائے، اور اگر کچا دے تو دو سیر گندم دے (امام اہل سنت مجدد دین وملت اعلیٰ حضرت مولانا

الشاہ احمد رضا خاں صاحب بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کی تحقیق انیق کے مطابق پرانے سوا دو سیر بنتے ہیں) کہ اس میں بعض کو غذا بنائے اور بعض سے غذا کی درستی کی چیزیں حاصل کرے جیسے گھی، ایندھن، پانی، نمک اور سالن اور یہ بدل اس لیے مقرر کیا گیا کہ جب یہ شخص خود تو اللہ تعالیٰ کے لیے کھانا، پینا اور نمک ترک نہیں کر سکتا۔ تو اتنا کرے کہ ایک بندۂ خدا کو جو کہ مسلمان ہو رات دن کی بھوک سے نجات دے، اور وہ مسلمان بندہ اس دوران جو عبادت اور نیکی بجالائے حتیٰ کہ اس دن کا روزہ اس میں اس شخص کا کوئی دخل متحقق ہو، اور کسی وجہ سے اس کے اعمال نامے میں ثابت ہو۔ نیز جب اس نے اللہ تعالیٰ کے لیے یہ مقدار دی تو بالمعنی اس نے اس مقدار سے جو کہ ایک آدمی کی خوراک ہو سکتی ہے اپنے آپ کو باز رکھا، اور کچھ نہ کچھ روزے کے ساتھ ایک مشابہت پیدا کی کہ ایک دن کی خوراک سے باز رہنے کی حقیقت ہے۔ اور یہ بدل کم از کم حد ہے ورنہ

فَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا تو جو طاعت میں نیکی زیادہ کرے اس طرح کہ اس مقدار سے زیادہ ایک مسکین کو دے یا یہی مقدار چند مسکینوں کو دے۔